

معجاز القرآن

جلد اول

سورۃ فاتحہ و سورۃ بقرہ
پارہ اول تا پارہ ۳ رکوع ۸

حضرت لانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم پاکستان

آسان ترجمہ قرآن

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

ادارۃ المعارف دارالکتاب



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
الحمد لله الذي هدانا لهذا الذي كنا لنهتدي لولا أن هدانا الله

نَحْمَدُكَ وَنُتَعِّينُكَ وَنُتَغْفِرُكَ وَنُؤْمِنُ بِكَ وَنُتَوَكَّلُ عَلَيْكَ
وَنَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ رَأْفَتِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا
مَنْ يَحْيِدَ اللَّهُ فَلَا مَصْنَعَ لَهُ وَمَنْ تُصْنِلِهِ فَلَا هَادِيَ لَهُ
وَنُشْهِدُكَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ
وَنُشْهِدُكَ أَنْ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٌ عَبْدُكَ وَرَسُولُكَ
صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْكَ وَعَلَى آلِكَ وَصَحْبِكَ أَجْمَعِينَ

مَعَارِفُ الْقُرْآنِ

جلد اول

سورۃ فاتحہ و سورۃ بقرہ □ پارہ: ۱ تا پارہ: ۳، رُکوع: ۸

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مفتی اعظم پاکستان

مع

آسان ترجمہ قرآن

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

ادارۃ المعارف کراچی

دفتر ریسرچ و رجسٹریشن آفیسر اوقاف حکومت سندھ

0300-3311811

الوزارہ کراچی



سچائی کی سرگودھا

021-99332012

نشان تجاریہ: آر۔ آر۔ اد (اوقاف)

R.O. 38-2021

مورخہ 04-02-2021

تصدیق نامہ

ہم نے ”اِذَاةُ الْمَجَارِفِ كَرَّاجِي“ احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی، کی مطبوعہ تفسیر ”مَجَارِفُ الْفَرَانِ“ مصنفہ حضرت لانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علم پاکستان، جلد اول کی اپنی نگرانی میں مولانا مفتی محمد حنیف خالد صاحب (رجسٹرڈ پروف ریڈر محکمہ اوقاف سندھ) سے پروف ریڈنگ کروائی ہے۔ تفسیر ”مَجَارِفُ الْفَرَانِ“ کے مکمل متن کو بغور پڑھا گیا، جو اغلاط تھیں، انہیں بحمد اللہ درست کر دیا گیا ہے۔
لہذا تصدیق کی جاتی ہے کہ تفسیر ”مَجَارِفُ الْفَرَانِ“ حتی الامکان لفظی اور اعرابی اغلاط سے ان شاء اللہ تعالیٰ پاک و مبرا ہے۔

نوٹ:- حکومت پاکستان کے قانون کے مطابق کاپی رائٹس رجسٹریشن نمبر 2736 کے تحت تفسیر ”مَجَارِفُ الْفَرَانِ“ (جلد اول) کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔
المصدق

جلد ۱
۱۶-۲-۲۰۲۱



مولانا مفتی منیر احمد طارق
ریسرچ و رجسٹریشن آفیسر اوقاف سندھ
حکومت سندھ

مفتی منیر احمد طارق
ریسرچ و رجسٹریشن آفیسر اوقاف سندھ
حکومت سندھ

عرض ناشر:- اگرچہ ”مَجَارِفُ الْفَرَانِ“ کی تصحیح کا اہتمام کیا جاتا ہے، لیکن کبھی کبھی کمپیوٹر کمپوزنگ کتابت، طباعت اور جلد بندی وغیرہ میں سہواً غلطی ہو جاتی ہے، اگر کسی صاحب کو ایسی غلطی کا علم ہو تو برائے کرم مطلع فرمائیں۔

باہتمام : مجلہ مشتاق سنیتی
طبع جدید : محرم ۱۴۴۲ھ - اگست ۲۰۲۲ء (۳)
مطبع : شمس پرنٹنگ پریس کراچی
ناشر : اِذَاةُ الْمَجَارِفِ كَرَّاجِي

اِذَاةُ الْمَجَارِفِ كَرَّاجِي

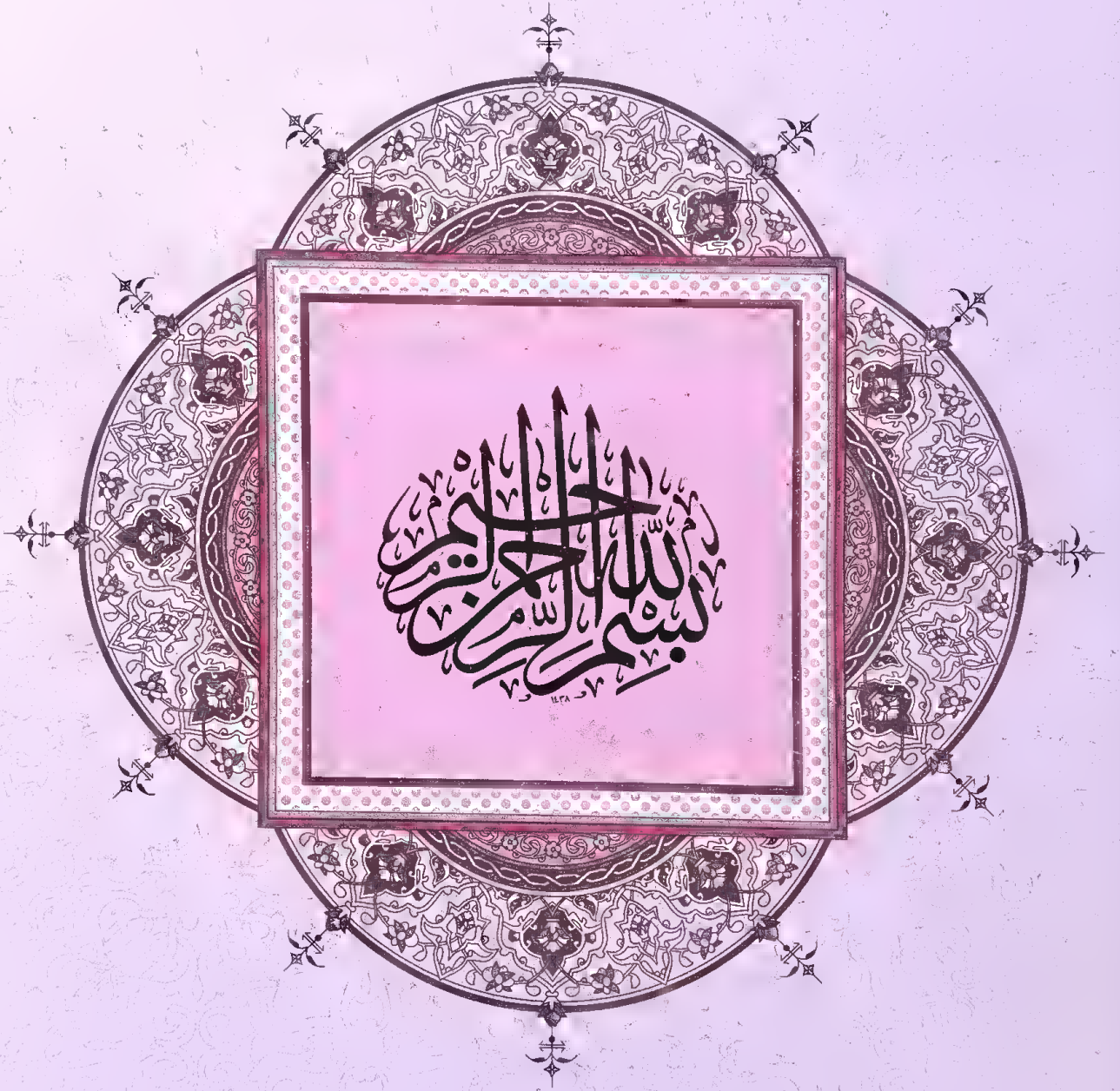
احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی، کورنگی انڈسٹریل ایریا، کراچی پوسٹ کوڈ: 75180

فون: 021-35123161, 021-35032020

موبائل: 0300 - 2831960

ای میل: imaarif@live.com





شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	جمع قرآن کے سلسلے میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا طریق کار	۲۵	پیش لفظ — مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ
۴۷	”امم“ کی خصوصیات	۲۷	مقدمہ
۴۹	حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں جمع قرآن تلاوت میں آسانی پیدا کرنے کے اقدامات	۲۷	علوم قرآن اور علم تفسیر سے متعلق ضروری معلومات
۵۳	نقطے	۲۸	پیش لفظ — مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ
۵۳	حرکات	۲۹	وحی اور اس کی حقیقت
۵۴	احزاب یا منزلیں	۲۹	وحی کی ضرورت
۵۴	اجزاء یا پارے	۳۱	حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کے طریقے
۵۵	انجاس اور اعشار	۳۳	تاریخ نزول قرآن
۵۵	رکوع	۳۴	سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت
۵۶	رموز اوقاف	۳۵	مکی اور مدنی آیات
۵۸	قرآن کریم کی طباعت	۳۶	مکی و مدنی آیتوں کی خصوصیات
۵۸	علم تفسیر	۳۷	قرآن کریم کا تدریجی نزول
۵۹	تفسیر قرآن کے مآخذ	۳۸	شان نزول
۵۹	۱- قرآن کریم	۳۹	قرآن کریم کے سات حروف اور قراءتیں
۶۰	۲- حدیث	۴۰	سات حروف سے مراد سات نوعیتیں ہیں
۶۰	۳- صحابہ کے اقوال	۴۱	قراءت میں قبولیت کا معیار
۶۱	۴- تابعین کے اقوال	۴۲	سات قراء
۶۱	۵- لغت عرب	۴۳	دس اور چودہ قراءتیں
۶۱	۶- تدبر اور استنباط	۴۴	تاریخ حفاظت قرآن
۶۲	اسرائیلیات کا حکم	۴۴	عہد رسالت میں حفاظت قرآن
۶۳	تفسیر قرآن کے بارے میں ایک شدید غلط فہمی	۴۵	کتابت وحی
		۴۶	حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جمع قرآن

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	تلاوت قرآن اور ہر مہم کام کو بسم اللہ سے شروع کرنے کا حکم	۶۵	مشہور تفسیریں
۸۶	ہر کام کو بسم اللہ سے شروع کرنے کی حکمت	۶۶	تفسیر ابن جریر
۸۷	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کی تفسیر	۶۶	تفسیر ابن کثیر
۸۸	حکمت	۶۶	تفسیر القرطبی
۹۰	احکام و مسائل	۶۷	تفسیر کبیر
۹۰	مسئلہ تعویذ	۶۷	تفسیر البحر المحیط
۹۱	احکام بسم اللہ	۶۸	احکام القرآن للخصاص
۹۲	آسان ترجمہ قرآن	۶۸	تفسیر الدد المنثور
۹۲	خلاصہ تفسیر	۶۸	تفسیر مظہری
۹۳	معارف و مسائل	۶۹	روح المعانی
۹۳	سورہ فاتحہ کے مضامین	۷۰	تمہید
۹۴	رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کی تفسیر	۷۱	دنیا کی سب سے بڑی نعمت قرآن ہے
۹۷	روز جزا کی حقیقت اور عقلاً اُس کی ضرورت	۷۲	مختصر سرگزشت مصنف
۹۹	مالک کون ہے؟		تفسیر ”معارف القرآن“ کی تصنیف قدرتی
۱۰۲	تکمیل الدراہ فی تفصیل درجات الہدایہ	۷۵	اسباب سے
۱۰۶	صراطِ مستقیم کونسا راستہ ہے؟		بہ نیرنگ تقدیر ایک شدید و طویل بیماری تکمیل تفسیر کا
	صراطِ مستقیم کتاب اللہ اور رجال اللہ دونوں کے	۷۷	سبب بن گئی
۱۰۸	مجموعہ سے ملتا ہے	۸۰	”معارف القرآن“ کی خصوصیات و التزامات
۱۰۹	فرقہ دارانہ اختلافات کا بڑا سبب	۸۴	سُورَةُ الْفَاتِحَةِ
۱۰۹	سورہ فاتحہ کے متعلق احکام و مسائل	۸۵	سورہ فاتحہ کے فضائل اور خصوصیات
۱۱۰	دعا کرنے کا طریقہ	۸۶	بسم اللہ قرآن کی ایک آیت ہے
۱۱۰	اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا انسان کا فطری فرض ہے		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۲۹	تیسرا مسئلہ: اللہ کی راہ میں خرچ کرنا	۱۱۲	خود اپنی مدح و ثنا کسی انسان کے لئے جائز نہیں
۱۳۰	ایمان اور اسلام میں فرق		لفظ ”رَبِّ“ اللہ تعالیٰ کا خاص نام ہے، غیر اللہ کو
۱۳۲	مسئلہ ختم نبوت کی ایک واضح دلیل	۱۱۳	رَبِّ کہنا جائز نہیں
۱۳۳	متقین کی تفسیر میں صفت ایمان بالآخرۃ		استعانت کے معنی کی تشریح اور مسئلہ توسل کی تحقیق
۱۳۳	آخرت پر ایمان ایک انقلابی عقیدہ ہے		اللہ کے سوا کسی کی عبادت روا نہیں، اس کی عبادت
۱۳۵	آسان ترجمہ قرآن		میں کسی کو شریک کرنا حرام اور ناقابل معافی جرم ہے
۱۳۵	خلاصہ تفسیر		مسئلہ استعانت و توسل کی تحقیق اور احکام کی تفصیل
۱۳۵	معارف و مسائل		صراطِ مستقیم کی ہدایت دُنیا و دین میں کلیدِ کامیابی ہے
۱۳۵	خلاصہ مضمون مع ربط		
۱۳۷	کفر کی تعریف	۱۱۹	سُورَةُ النِّسَاءِ
۱۳۷	انذار کے معنی	۱۲۱	نام اور تعداد آیات
۱۳۸	۱- گناہوں کی دُنوی سزا سلبِ توفیق	۱۲۱	زمانہ نزول
	۲- نصیحتِ ناصح کے لئے ہر حال میں مفید ہے،	۱۲۲	فضائل سورۃ بقرہ
۱۳۹	مخاطب قبول کرے یا نہ کرے	۱۲۳	احکام و مسائل
۱۳۹	ایک شبہ کا جواب	۱۲۴	آسان ترجمہ قرآن
۱۴۲	آسان ترجمہ قرآن	۱۲۵	خلاصہ تفسیر
۱۴۳	خلاصہ تفسیر	۱۲۵	حل لغات
۱۴۴	معارف و مسائل	۱۲۶	معارف و مسائل
۱۴۴	ربط آیات		حروفِ مقطوعہ جو بہت سی سورتوں کے شروع میں
	۱- کیا کفر و نفاق عہدِ نبوی کے ساتھ مخصوص تھا یا	۱۲۶	آتے ہیں اُن کی تحقیق
۱۴۷	اب بھی موجود ہے؟	۱۲۸	متقین کی خاص صفات
۱۴۸	۲- ایمان و کفر کی حقیقت	۱۲۸	پہلا مسئلہ: ایمان کی تعریف
۱۴۹	۳- کفر و ایمان کا ضابطہ	۱۲۹	دوسرا مسئلہ: اقامتِ صلوٰۃ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۶۷	وجہ اعجاز قرآنی	۱۴۹	ایک شبہ کا ازالہ
۱۷۰	اعجاز قرآنی کی دوسری وجہ	۱۴۹	۴- جھوٹ ایک گھناؤنی چیز ہے
۱۷۵	تیسری وجہ	۵- انبیاء و اولیاء کے ساتھ براسلوک کرنا اللہ تعالیٰ	
۱۷۶	چوتھی وجہ	۱۵۰	کے ساتھ برائی کرنا ہے
۱۷۶	پانچویں وجہ	۱۵۰	۶- جھوٹ بولنے کا وبال
۱۷۶	چھٹی وجہ	۷- اصلاح و فساد کی تعریف اور مصلح و مفسد کی پہچان	
۱۷۷	ساتویں وجہ	۱۵۳	آسان ترجمہ قرآن
۱۷۷	آٹھویں وجہ	۱۵۳	خلاصہ تفسیر
۱۷۸	نویں وجہ	۱۵۳	معارف و مسائل
۱۷۸	دسویں وجہ	۱۵۳	ربط آیات
۱۸۳	چند شبہات اور جوابات	۱۵۶	کائنات زمین و آسمان میں قدرت حق کے مظاہر
۱۸۸	آسان ترجمہ قرآن	۱۵۶	پہلی نعمت
۱۸۸	خلاصہ تفسیر	۱۶۱	کسی کا عمل اس کی نجات اور جنت کا یقینی سبب نہیں
۱۸۸	ربط آیات		عقیدہ توحید ہی دنیا میں امن و امان اور سکون
۱۸۹	معارف و مسائل	۱۶۱	و اطمینان کا ضامن ہے
۱۹۰	آسان ترجمہ قرآن	۱۶۲	رسالت محمدی کا اثبات بذریعہ اعجاز قرآن
۱۹۰	خلاصہ تفسیر	۱۶۳	آسان ترجمہ قرآن
۱۹۱	معارف و مسائل	۱۶۳	خلاصہ تفسیر
۱۹۱	ربط آیات	۱۶۳	معارف و مسائل
	مثال میں کسی حقیر و ذلیل یا شرمناک چیز کا ذکر کرنا	۱۶۳	ربط آیات و خلاصہ مضمون
۱۹۲	کوئی عیب نہیں ہے		قرآن ایک زندہ اور قیامت تک باقی رہنے والا
	تعلقات کے حقوق شرعیہ ادا کرنا واجب ہے، اس	۱۶۶	معجزہ ہے
۱۹۲	کے خلاف کرنا گناہ عظیم	۱۶۷	اعجاز قرآنی کی تشریح

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۱۲	خلاصہ تفسیر	۱۹۵	آسان ترجمہ قرآن
۲۱۳	معارف و مسائل	۱۹۵	خلاصہ تفسیر
۲۱۳	ربط آیات	۱۹۵	معارف و مسائل
۲۱۳	کیا سجدہ کا حکم جنات کو بھی تھا؟	۱۹۵	ربط آیات
	سجدہ تعظیمی پہلی امتوں میں جائز تھا، اسلام میں	۱۹۷	حیات برزخی
۲۱۴	ممنوع ہے	۱۹۸	دنیا کی ہر چیز نفع بخش ہے، کوئی شے بیکار نہیں
۲۱۶	ابلیس کا کفر محض عملی نافرمانی کا نتیجہ نہیں	۱۹۸	اشیائے عالم میں اصل اباحت ہے یا حرمت؟
۲۱۶	ابلیس کو "طاؤس الملائکہ" کہا جاتا تھا	۲۰۰	آسان ترجمہ قرآن
۲۱۷	آسان ترجمہ قرآن	۲۰۱	خلاصہ تفسیر
۲۱۷	خلاصہ تفسیر	۲۰۲	معارف و مسائل
۲۱۸	معارف و مسائل	۲۰۲	ربط آیات
۲۲۰	آیات مذکورہ سے متعلقہ مسائل و احکام شرعیہ	۲۰۳	تخلیق آدم کی گفتگو فرشتوں سے کس مصلحت پر مبنی تھی؟
۲۲۱	غذا و خوراک میں بیوی شوہر کے تابع نہیں	۲۰۷	واضع لغت خود حق تعالیٰ ہیں
۲۲۱	ہر جگہ چلنے پھرنے کی آزادی انسان کا فطری حق ہے	۲۰۷	آدم علیہ السلام کا تفوق فرشتوں پر
۲۲۱	سد ذرائع کا مسئلہ	۲۰۷	خلافت ارض کا مسئلہ
۲۲۲	مسئلہ عصمت انبیاء		آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زمین میں اللہ کے آخری
۲۲۳	آسان ترجمہ قرآن	۲۰۸	خلیفہ ہیں اور آپ کی خصوصیات
۲۲۵	خلاصہ تفسیر	۲۱۰	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نظام خلافت
۲۲۵	معارف و مسائل	۲۱۱	خلافت راشدہ کے بعد
۲۲۵	ربط آیات	۲۱۱	مغربی جمہوریت اور اسلامی شوریات میں فرق
۲۲۷	تَوَابُّ اور تَائِب میں فرق		آیت مذکورہ سے دستور مملکت کی چند اہم دفعات
	گناہ سے توبہ قبول کرنے کا اختیار خدا تعالیٰ کے سوا	۲۱۲	کا ثبوت
۲۲۸	کسی کو نہیں	۲۱۲	آسان ترجمہ قرآن

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۴۴	باجماعت نماز کے احکام	۲۲۸	آدم علیہ السلام کا زمین پر اترنا سزا کے طور پر نہیں بلکہ ایک مقصد کی تکمیل کے لئے تھا
۲۴۴	مسجد کے سوا کسی اور جگہ جماعت	۲۲۸	رنج و غم سے نجات صرف اُن لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو اللہ کے فرمانبردار ہیں
۲۴۶	بے عمل واعظ کی مذمت	۲۳۱	آسان ترجمہ قرآن
۲۴۶	کیا فاسق وعظ و نصیحت نہیں کر سکتا؟	۲۳۱	خلاصہ تفسیر
۲۴۸	دو نفسیاتی بیماریاں اور اُن کا علاج	۲۳۲	معارف و مسائل
۲۴۹	خشوع کی حقیقت	۲۳۲	ربط آیات
۲۵۰	نماز میں خشوع کی فقہی حیثیت	۲۳۴	۱- اُمتِ محمدیہ کی ایک خاص فضیلت
۲۵۱	نماز خشوع کے بغیر بھی بالکل بے فائدہ نہیں	۲۳۴	۲- ایفاء عہد واجب اور عہد شکنی حرام ہے
۲۵۲	آسان ترجمہ قرآن	۲۳۴	۳- جو شخص کسی گناہ یا ثواب کا سبب بنتا ہے، اس پر بھی کرنے والوں کا گناہ یا ثواب لکھا جاتا ہے
۲۵۲	خلاصہ تفسیر	۲۳۵	۴- وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا
۲۵۳	آسان ترجمہ قرآن	۲۳۵	۵- تعلیم قرآن پر اُجرت لینا جائز ہے
۲۵۳	خلاصہ تفسیر	۲۳۶	۶- ایصالِ ثواب کے لئے ختم قرآن پر اُجرت لینا باتفاق جائز نہیں
۲۵۴	آسان ترجمہ قرآن	۲۳۶	۷- حق بات کو چھپانا یا اس میں خلط ملط کرنا حرام ہے
۲۵۴	خلاصہ تفسیر	۲۳۶	حضرت ابو حازم تابعی رحمہ اللہ، سلیمان بن عبد الملک رحمہ اللہ کے دربار میں
۲۵۵	آسان ترجمہ قرآن	۲۴۰	آسان ترجمہ قرآن
۲۵۵	خلاصہ تفسیر	۲۴۰	خلاصہ تفسیر
۲۵۶	آسان ترجمہ قرآن	۲۴۱	معارف و مسائل
۲۵۶	خلاصہ تفسیر	۲۴۱	ربط آیات
۲۵۷	آسان ترجمہ قرآن		
۲۵۷	خلاصہ تفسیر		
۲۵۸	آسان ترجمہ قرآن		
۲۵۸	خلاصہ تفسیر		
۲۵۹	آسان ترجمہ قرآن		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۷۵	خلاصہ تفسیر	۲۵۹	خلاصہ تفسیر
۲۷۶	آسان ترجمہ قرآن	۲۵۹	آسان ترجمہ قرآن
۲۷۶	خلاصہ تفسیر	۲۶۰	خلاصہ تفسیر
۲۷۷	معارف و مسائل	۲۶۱	آسان ترجمہ قرآن
	دینی معاملات میں کوئی ایسا حیلہ جس سے اصل حکم	۲۶۱	خلاصہ تفسیر
۲۷۷	شرعی باطل ہو جائے حرام ہے	۲۶۲	آسان ترجمہ قرآن
۲۷۷	واقعہ مسخ صورت یہود	۲۶۳	خلاصہ تفسیر
۲۷۸	ممسوخ قوم کی نسل نہیں چلتی	۲۶۳	معارف و مسائل
۲۷۸	آسان ترجمہ قرآن	۲۶۳	کلام میں لفظی تغیر و تبدل کا حکم شرعی
۲۷۹	خلاصہ تفسیر	۲۶۶	آسان ترجمہ قرآن
۲۸۰	آسان ترجمہ قرآن	۲۶۶	خلاصہ تفسیر
۲۸۱	خلاصہ تفسیر	۲۶۷	معارف و مسائل
۲۸۲	آسان ترجمہ قرآن	۲۶۸	آسان ترجمہ قرآن
۲۸۲	خلاصہ تفسیر	۲۶۹	خلاصہ تفسیر
۲۸۳	آسان ترجمہ قرآن	۲۷۰	معارف و مسائل
۲۸۴	خلاصہ تفسیر		یہودیوں پر ابدی ذلت کا مطلب اور اسرائیل کی
۲۸۵	آسان ترجمہ قرآن	۲۷۰	موجودہ حکومت سے شبہ اور اس کا جواب
۲۸۵	خلاصہ تفسیر	۲۷۲	آسان ترجمہ قرآن
۲۸۶	آسان ترجمہ قرآن	۲۷۲	خلاصہ تفسیر
۲۸۶	خلاصہ تفسیر	۲۷۳	آسان ترجمہ قرآن
۲۸۸	آسان ترجمہ قرآن	۲۷۴	خلاصہ تفسیر
۲۸۸	خلاصہ تفسیر	۲۷۴	ایک شبہ کا ازالہ
۲۸۹	آسان ترجمہ قرآن	۲۷۵	آسان ترجمہ قرآن

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۰۱	خلاصہ تفسیر	۲۸۹	خلاصہ تفسیر
۳۰۲	آسان ترجمہ قرآن	۲۹۰	آسان ترجمہ قرآن
۳۰۳	خلاصہ تفسیر	۲۹۱	خلاصہ تفسیر
۳۰۴	آسان ترجمہ قرآن	۲۹۱	خلود فی النار کا ضابطہ
۳۰۴	خلاصہ تفسیر	۲۹۲	آسان ترجمہ قرآن
۳۰۵	آسان ترجمہ قرآن	۲۹۲	خلاصہ تفسیر
۳۰۵	خلاصہ تفسیر	۲۹۲	تعلیم و تبلیغ میں سخت کلامی کافر سے بھی درست نہیں
۳۰۶	آسان ترجمہ قرآن	۲۹۳	آسان ترجمہ قرآن
۳۰۷	خلاصہ تفسیر	۲۹۳	خلاصہ تفسیر
۳۰۹	آسان ترجمہ قرآن	۲۹۵	آسان ترجمہ قرآن
۳۰۹	خلاصہ تفسیر	۲۹۵	خلاصہ تفسیر
۳۱۰	آسان ترجمہ قرآن	۲۹۵	معارف و مسائل
۳۱۰	خلاصہ تفسیر	۲۹۷	آسان ترجمہ قرآن
۳۱۱	آسان ترجمہ قرآن	۲۹۷	خلاصہ تفسیر
۳۱۱	خلاصہ تفسیر	۲۹۸	آسان ترجمہ قرآن
۳۱۲	آسان ترجمہ قرآن	۲۹۸	خلاصہ تفسیر
۳۱۲	خلاصہ تفسیر	۲۹۹	آسان ترجمہ قرآن
۳۱۳	آسان ترجمہ قرآن	۲۹۹	خلاصہ تفسیر
۳۱۳	خلاصہ تفسیر	۳۰۰	آسان ترجمہ قرآن
۳۱۴	آسان ترجمہ قرآن	۳۰۰	خلاصہ تفسیر
۳۱۵	خلاصہ تفسیر	۳۰۱	ایک شبہ اور اس کا جواب
۳۱۶	معارف و مسائل	۳۰۱	آسان ترجمہ قرآن

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	نسلی مسلمان ہو یا یہودی و نصرانی، اللہ کے یہاں	۳۱۸	سحر کی حقیقت
	اس کی کوئی قیمت نہیں، اصل چیز ایمان	۳۱۹	سحر کے اقسام
۳۳۹	اور عمل صالح ہے	۳۲۲	سحر اور معجزے میں فرق
۳۴۳	آسان ترجمہ قرآن	۳۲۳	کیا انبیاء پر بھی جادو کا اثر ہو سکتا ہے؟
۳۴۳	خلاصہ تفسیر	۳۲۳	سحر کے احکام شرعیہ
۳۴۵	فوائد از "بیان القرآن"	۳۲۵	آسان ترجمہ قرآن
۳۴۶	معارف و مسائل	۳۲۵	خلاصہ تفسیر
۳۴۸	تحویل قبلہ کی بحث	۳۲۷	آسان ترجمہ قرآن
۳۵۱	آسان ترجمہ قرآن	۳۲۷	خلاصہ تفسیر
۳۵۱	خلاصہ تفسیر	۳۲۸	آسان ترجمہ قرآن
۳۵۲	فوائد	۳۲۸	خلاصہ تفسیر
۳۵۳	آسان ترجمہ قرآن	۳۲۹	معارف و مسائل
۳۵۳	خلاصہ تفسیر	۳۲۹	احکام الہیہ میں نسخ کی حقیقت
۳۵۴	آسان ترجمہ قرآن	۳۳۰	جاہلانہ شبہات
۳۵۴	خلاصہ تفسیر		نسخ کے مفہوم میں متقدمین و متاخرین کی اصطلاحوں
۳۵۵	آسان ترجمہ قرآن	۳۳۱	میں فرق
۳۵۵	خلاصہ تفسیر	۳۳۳	آسان ترجمہ قرآن
۳۵۶	آسان ترجمہ قرآن	۳۳۳	خلاصہ تفسیر
۳۵۶	خلاصہ تفسیر	۳۳۴	آسان ترجمہ قرآن
۳۵۷	آسان ترجمہ قرآن	۳۳۵	خلاصہ تفسیر
۳۵۷	خلاصہ تفسیر	۳۳۶	آسان ترجمہ قرآن
۳۵۸	آسان ترجمہ قرآن	۳۳۷	خلاصہ تفسیر
۳۵۸	خلاصہ تفسیر	۳۳۸	معارف و مسائل

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۸۲	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خصوصیات	۳۵۹	معارف و مسائل
۳۸۳	بعثت رسول کے تین مقاصد	۳۵۹	حضرت خلیل اللہ کے عظیم امتحانات اور مضامین امتحان
۳۸۳	پہلا مقصد تلاوت آیات		اللہ تعالیٰ کے نزدیک علمی مویشگافیوں سے زیادہ
	قرآن کریم کے الفاظ اگر بے سمجھے بھی پڑھے جائیں	۳۶۰	قابل قدر اخلاق و کردار کی عملی ثابت قدمی ہے
۳۸۴	توبیکار نہیں، بلکہ موجب ثواب عظیم ہیں	۳۶۶	آسان ترجمہ قرآن
۳۸۵	دوسرا مقصد تعلیم کتاب	۳۶۶	حل لغات
۳۸۷	تیسرا مقصد تزکیہ	۳۶۶	خلاصہ تفسیر
۳۸۷	ہدایت و اصلاح کے دو سلسلے، کتاب اللہ اور رجال اللہ	۳۶۶	معارف و مسائل
	اصلاح انسان کے لئے صرف تعلیم صحیح بھی کافی نہیں،		حضرت خلیل اللہ کی ہجرت مکہ اور بناء بیت اللہ کا
۳۹۱	اخلاقی تربیت بھی ضروری ہے	۳۶۶	تفصیلی واقعہ
۳۹۲	آسان ترجمہ قرآن	۳۷۰	احکام و مسائل متعلقہ حرم محترم
۳۹۲	حل لغات	۳۷۵	آسان ترجمہ قرآن
۳۹۲	خلاصہ تفسیر	۳۷۵	خلاصہ تفسیر
۳۹۵	معارف و مسائل	۳۷۶	معارف و مسائل
	ملت ابراہیمی کا بنیادی اصول اسلام، یعنی اطاعت	۳۷۶	حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں
۳۹۶	حق ہے وہ صرف اسلام میں منحصر ہے	۳۷۸	حکمت ابراہیمی
۴۰۱	آسان ترجمہ قرآن	۳۷۸	رزق ثمرات تمام ضروریات زندگی کو شامل ہے
۴۰۱	خلاصہ تفسیر	۳۷۸	حضرت خلیل اللہ کی احتیاط
۴۰۱	معارف و مسائل	۳۷۹	اپنے نیک عمل پر بھروسہ اور قناعت نہ کرنے کی تعلیم
	اولاد کے لئے کوئی دولت دین و اخلاق سکھانے	۳۸۰	آسان ترجمہ قرآن
۴۰۲	کے برابر نہیں	۳۸۱	خلاصہ تفسیر
۴۰۴	بعض مسائل متعلقہ مسئلہ توریث المجد	۳۸۱	تشریح لغات
۴۰۴	آباء و اجداد کے اعمال کی جزا و سزا اولاد پر نہیں ہوگی	۳۸۲	معارف و مسائل

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۱۴	خلاصہ تفسیر	۴۰۵	آسان ترجمہ قرآن
۴۱۴	معارف و مسائل	۴۰۶	خلاصہ تفسیر
نماز میں خاص بیت اللہ کا استقبال ضروری نہیں اس کی سمت کا استقبال بھی بیرونی دنیا کے لئے کافی ہے۔ ۴۱۷		۴۰۶	معارف و مسائل
۴۲۰	آسان ترجمہ قرآن	۴۰۷	آسان ترجمہ قرآن
۴۲۰	خلاصہ تفسیر	۴۰۷	اللغات والبلغة
۴۲۰	معارف و مسائل	۴۰۸	خلاصہ تفسیر
۴۲۰	امت محمدیہ کا خاص اعتدال	۴۰۸	معارف و مسائل
اعتدال امت کی حقیقت، اہمیت اور اس کی کچھ تفصیل ۴۲۱		۴۰۸	ایمان کی مختصر اور جامع تفسیر
۴۲۳	امت محمدیہ میں ہر قسم کا اعتدال	فرشتہ اور رسول کی عظمت و محبت میں اعتدال مطلوب ہے، غلو گمراہی ہے ۴۰۹	
۴۲۵	اعتقادی اعتدال	نبی و رسول کی اختراعی قسمیں، ظلی، بروزی، لغوی سب گمراہی ہے ۴۰۹	
۴۲۶	عمل اور عبادت میں اعتدال	ایمان بالآخرۃ کی تاویلات باطلہ مردود ہیں ۴۱۰	
۴۲۶	معاشرتی اور تمدنی اعتدال	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے لے لی ۴۱۰	
۴۲۷	اقتصادی اور مالی اعتدال	دین و ایمان ایک گہرا رنگ ہے جو انسان کے چہرہ بشرہ سے نظر آنا چاہئے ۴۱۰	
۴۲۸	شہادت کے لئے عدل وثقہ ہونا شرط ہے	آسان ترجمہ قرآن ۴۱۲	
۴۲۸	اجماع کا حجت ہونا	خلاصہ تفسیر ۴۱۲	
۴۲۹	آسان ترجمہ قرآن	معارف و مسائل ۴۱۳	
۴۲۹	خلاصہ تفسیر	اخلاص کی حقیقت ۴۱۳	
۴۳۰	معارف و مسائل	آسان ترجمہ قرآن ۴۱۳	
۴۳۰	کعبہ کے قبلہ نماز ہونے کی ابتدا کب ہوئی		
۴۳۱	بعض احکام متعلقہ		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۴۶	تحويل قبلہ کی حکمتیں		کبھی سنت کو قرآن کے ذریعہ بھی منسوخ کیا جاتا ہے
۴۴۷	مذہبی مسائل میں فضول بحثوں سے اجتناب کی ہدایت	۴۳۱	خبر واحد جبکہ قرآن قویہ اس کے ثبوت پر موجود ہوں
۴۴۷	عبادات اور نیک اعمال میں بلا وجہ تاخیر کرنا مناسب نہیں، مسارعہ کرنا چاہئے	۴۳۲	اس سے قرآنی حکم منسوخ سمجھا جاسکتا ہے
۴۴۸	کیا ہر نماز کا اول وقت میں پڑھنا افضل ہے؟		آلہ بکبر الصوت کی آواز پر نماز میں نقل و حرکت کے
۴۴۹	آسان ترجمہ قرآن	۴۳۳	مفسد نماز نہ ہونے پر استدلال
۴۴۹	خلاصہ تفسیر	۴۳۵	آسان ترجمہ قرآن
۴۵۰	معارف و مسائل	۴۳۶	خلاصہ تفسیر
۴۵۱	ذکر اللہ کے فضائل	۴۳۶	معارف و مسائل
۴۵۱	ذکر اللہ کی اصل حقیقت	۴۳۷	مسئلہ استقبال قبلہ
۴۵۲	آسان ترجمہ قرآن		سمت قبلہ معلوم کرنے کے لئے شرعاً آلاتِ رصدیہ
۴۵۲	ربط	۴۳۸	اور حساباتِ ریاضیہ پر مدار نہیں
۴۵۲	خلاصہ تفسیر	۴۴۱	آسان ترجمہ قرآن
۴۵۲	معارف و مسائل	۴۴۱	خلاصہ تفسیر
۴۵۲	صبر اور نماز ہر مشکل کا حل اور ہر تکلیف کا علاج ہیں	۴۴۱	معارف و مسائل
۴۵۳	صبر کی اصل حقیقت	۴۴۲	آسان ترجمہ قرآن
	صبر اور نماز تمام مشکلات و مصائب سے نجات کا سبب اس لئے ہے کہ صبر سے اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے	۴۴۲	خلاصہ تفسیر
۴۵۴	آسان ترجمہ قرآن	۴۴۳	معارف و مسائل
۴۵۵	ربط	۴۴۴	آسان ترجمہ قرآن
۴۵۵	خلاصہ تفسیر	۴۴۵	خلاصہ تفسیر
		۴۴۵	تحويل قبلہ کی تیسری حکمت
		۴۴۶	معارف و مسائل

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۶۷	آسان ترجمہ قرآن	۴۵۶	معارف و مسائل
۴۶۷	ربط		شہداء اور انبیاء کی حیاتِ برزخی اور اس کے درجات
۴۶۷	خلاصہ تفسیر	۴۵۶	میں تقاضا
۴۶۸	معارف و مسائل	۴۵۸	مصائب پر صبر کے آسان کرنے کی خاص تدبیر
۴۶۸	توحید کا وسیع مفہوم		مصیبت میں اِنَّا لِلّٰہ کو سمجھ کر پڑھا جائے تو تسکین
۴۷۰	آسان ترجمہ قرآن	۴۵۸	قلب کا بہترین علاج ہے
۴۷۰	ربط	۴۵۹	آسان ترجمہ قرآن
۴۷۰	خلاصہ تفسیر	۴۵۹	ربط
۴۷۱	آسان ترجمہ قرآن	۴۶۰	خلاصہ تفسیر
۴۷۱	ربط	۴۶۰	معارف و مسائل
۴۷۲	خلاصہ تفسیر	۴۶۰	بعض لغات کی تحقیق
۴۷۳	آسان ترجمہ قرآن	۴۶۰	صفا و مروہ کے درمیان سعی واجب ہے
۴۷۳	خلاصہ تفسیر	۴۶۱	آسان ترجمہ قرآن
۴۷۳	معارف و مسائل	۴۶۲	ربط
۴۷۳	حل اللغات	۴۶۲	خلاصہ تفسیر
۴۷۵	آسان ترجمہ قرآن	۴۶۳	معارف و مسائل
۴۷۵	خلاصہ تفسیر		علم دین کا اظہار اور پھیلانا واجب اور اس کا چھپانا
۴۷۶	معارف و مسائل	۴۶۳	سخت حرام ہے
۴۷۶	جاہلانہ تقلید اور ائمہ مجتہدین کی تقلید میں فرق	۴۶۵	حدیث رسول بھی قرآن کے حکم میں ہے
۴۷۸	آسان ترجمہ قرآن		بعض گناہوں کا وبال ایسا ہوتا ہے کہ اس پر ساری
۴۷۸	خلاصہ تفسیر	۴۶۵	مخلوق لعنت کرتی ہے
۴۷۸	ربط		کسی معین شخص پر لعنت اس وقت تک جائز نہیں
۴۷۹	معارف و مسائل	۴۶۵	جب تک اس کے کفر پر مرنے کا یقین نہ ہو

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۹۹	آسان ترجمہ قرآن	۴۷۹	حلال کھانے کی برکت اور حرام کھانے کی نحوست
۴۹۹	ربط آیات اور خلاصہ تفسیر	۴۸۰	میتہ
۵۰۰	حکم اوّل: قصاص	۴۸۱	بندوق کی گولی سے شکار
۵۰۰	معارف و مسائل	۴۸۲	خون کے مسائل
	قصاص کے متعلق اسلام کا عادلانہ قانون اور قصاص کے مسائل	۴۸۳	مریض کو دوسرے کا خون دینے کا مسئلہ
۵۰۱	آسان ترجمہ قرآن	۴۸۴	تحريم خنزیر
۵۰۳	ربط آیات و خلاصہ تفسیر	۴۸۵	مَا أَهْلَ بِهِ لَعْنَةُ اللَّهِ کی تین صورتیں
۵۰۴	حکم دوم از ابواب البر: ”وصیت“	۴۸۸	نذر غیر اللہ کا مسئلہ
۵۰۵	معارف و مسائل	۴۸۸	اضطرار و مجبوری کے احکام
۵۰۵	دوسرا حکم: وصیت کا فرض ہونا	۴۸۹	اہم فائدہ
	تیسرا حکم: وصیت ایک تہائی مال سے زیادہ کی جائز نہیں	۴۸۹	حالتِ اضطرار میں دوا کے طور پر حرام چیزوں کا استعمال
۵۰۶	آسان ترجمہ قرآن		غیر اضطراری حالت میں عام علاج و دوا کے لئے
۵۰۸	خلاصہ تفسیر	۴۹۰	حرام چیز کا استعمال
۵۰۸	حکم سوم: صوم	۴۹۲	آسان ترجمہ قرآن
۵۰۹	معارف و مسائل	۴۹۲	خلاصہ تفسیر و ربط آیات
۵۰۹	پچھلی اُمتوں میں روزے کا حکم	۴۹۳	دین فروشی کی سزا
۵۱۰	مریض کا روزہ	۴۹۳	معارف و مسائل
۵۱۰	مسافر کا روزہ	۴۹۴	آسان ترجمہ قرآن
۵۱۱	روزہ کی قضا	۴۹۴	ربط از ”بیان القرآن“
۵۱۱	روزہ کا فدیہ	۴۹۵	خلاصہ تفسیر
۵۱۲	فدیہ کی مقدار اور متعلقہ مسائل	۴۹۵	ابواب البر
		۴۹۶	معارف و مسائل
		۴۹۸	فائدہ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۲۸	شان نزول	۵۱۴	آسان ترجمہ قرآن
۵۳۰	مالِ حلال کی برکات اور حرام کی نحوست	۵۱۴	خلاصہ تفسیر اور ربطِ آیات
۵۳۱	محشر میں ہر انسان سے پانچ سوالات	۵۱۴	تعیین ایامِ صیام
۵۳۳	آسان ترجمہ قرآن	۵۱۵	معارف و مسائل
۵۳۴	ربطِ آیات	۵۱۷	آسان ترجمہ قرآن
۵۳۴	خلاصہ تفسیر	۵۱۸	خلاصہ تفسیر مع ربطِ آیات
۵۳۴	حکم ہفتم: اعتبار حسابِ قمری درجہ وغیرہ	۵۲۰	آسان ترجمہ قرآن
۵۳۴	حکم ہشتم: اصلاحِ رسمِ جاہلیت	۵۲۰	خلاصہ تفسیر
۵۳۵	حکم نہم: قتالِ کفار	۵۲۰	حکم چہارم: رمضان کی راتوں میں جماع
۵۳۶	معارف و مسائل	۵۲۱	حکم پنجم: اعتکاف
۵۳۶	قمری اور شمسی حساب کی شرعی حیثیت	۵۲۱	معارف و مسائل
۵۳۸	حکم نہم: جہاد و قتال		ثبوت احکام شرعیہ کے لئے قولِ رسولِ کریم بھی
۵۴۱	آسان ترجمہ قرآن	۵۲۲	بحکم قرآن ہے
۵۴۱	خلاصہ تفسیر	۵۲۲	سحری کھانے کا آخری وقت
۵۴۲	حکم دہم: انفاق فی الجہاد	۵۲۴	اعتکاف اور اس کے مسائل
۵۴۲	معارف و مسائل	۵۲۴	روزے کے معاملے میں احتیاط کا حکم
۵۴۳	دسواں حکم: جہاد کے لئے مال خرچ کرنا	۵۲۵	آسان ترجمہ قرآن
۵۴۷	آسان ترجمہ قرآن	۵۲۵	ربطِ آیات و خلاصہ تفسیر
۵۴۸	خلاصہ تفسیر	۵۲۵	حکم ششم: مالِ حرام سے بچنا
۵۴۸	گیارہواں حکم متعلق حج و عمرہ	۵۲۵	معارف و مسائل
۵۵۱	معارف و مسائل		کسبِ مال کے اچھے برے ذرائع اور اچھائی برائی
۵۵۱	احکام حج و عمرہ	۵۲۶	کا معیار
۵۵۱	عمرہ کا حکم	۵۲۶	اسلامی نظامِ معاش ہی دنیا میں امن عام قائم کر سکتا ہے

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۶۸	معارف و مسائل	۵۵۲	احرام کے بعد کوئی مجبوری پیش آجائے حج و عمرہ ادا نہ کر سکیں تو کیا کریں؟
۵۷۰	آسان ترجمہ قرآن	۵۵۳	حالت احرام میں بال منڈانے پر کوئی مجبور ہو جائے تو وہ کیا کرے؟
۵۷۰	ربط آیات	۵۵۳	حج کے مہینوں میں حج و عمرہ کو جمع کرنے کے احکام
۵۷۰	خلاصہ تفسیر	۵۵۴	تمتع و قرآن
۵۷۱	معارف و مسائل	۵۵۴	احکام حج و عمرہ میں خلاف ورزی اور کوتاہی موجب عذاب ہے
۵۷۳	آسان ترجمہ قرآن	۵۵۴	احکام حج کی آٹھ آیتوں میں سے دوسری آیت اور اس کے مسائل
۵۷۳	ربط آیات	۵۵۷	بلاغت قرآن
۵۷۳	خلاصہ تفسیر	۵۵۷	سفر حج میں تجارت یا مزدوری کرنا کیسا ہے؟
۵۷۴	معارف و مسائل	۵۵۹	عرفات میں وقوف اور اس کے بعد مزدلفہ کا وقوف
۵۷۵	آسان ترجمہ قرآن	۵۶۱	انسانی مساوات کا زریں سبق اور اس کی بہترین عملی صورت
۵۷۵	ربط آیات	۵۶۱	رُسوم جاہلیت کی اصلاح، منیٰ میں فضول اجتماعات کی ممانعت
۵۷۶	خلاصہ تفسیر	۵۶۲	ایک اور رسم جاہلیت کی اصلاح، دین و دنیا کی طلب میں اسلامی اعتدال
۵۷۶	معارف و مسائل	۵۶۳	منیٰ میں دو یا تین دن کا قیام اور ذکر اللہ کی تاکید
۵۸۰	مسائل	۵۶۷	آسان ترجمہ قرآن
۵۸۲	آسان ترجمہ قرآن	۵۶۷	ربط آیات
۵۸۳	ربط آیات	۵۶۸	خلاصہ تفسیر
۵۸۳	خلاصہ تفسیر		
۵۸۳	معارف و مسائل		
۵۸۴	آسان ترجمہ قرآن		
۵۸۵	خلاصہ تفسیر		
۵۸۵	بارہواں حکم: صدقہ کے مصارف		
۵۸۵	معارف و مسائل		
۵۸۹	آسان ترجمہ قرآن		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۶۱۲	ایک اور فقہی ضابطہ	۵۹۰	خلاصہ تفسیر
۶۱۳	آسان ترجمہ قرآن	۵۹۰	تیرہواں حکم: فرضیت جہاد
۶۱۴	خلاصہ تفسیر	۵۹۰	چودھواں حکم: تحقیق قتال در شہر حرام
۶۱۴	سولہواں حکم: مقدار انفاق	۵۹۱	انجام ارتداد
۶۱۴	سترہواں حکم: مخالطت یتیم	۵۹۱	وعدہ ثواب بر اخلاص نیت
۶۱۵	اٹھارواں حکم: مناکحت کفار	۵۹۲	معارف و مسائل
۶۱۵	فوائد از ”بیان القرآن“	۵۹۲	بعض احکام جہاد
۶۱۶	معارف و مسائل	۵۹۳	اشرہ حرم میں قتال کا حکم
۶۱۶	مسلم و کافر کا باہمی ازدواج ممنوع ہے	۵۹۵	انجام ارتداد
۶۱۹	آسان ترجمہ قرآن	۵۹۶	آسان ترجمہ قرآن
۶۱۹	خلاصہ تفسیر	۵۹۷	خلاصہ تفسیر
۶۱۹	حکم نمبر ۱۹: حیض میں جماع کی حرمت اور پاکی کی شرائط	۵۹۷	پندرہواں حکم: متعلقہ شراب و قمار
۶۲۰	آسان ترجمہ قرآن	۵۹۷	معارف و مسائل
۶۲۱	خلاصہ تفسیر	۵۹۷	حرمت شراب اور اس کے متعلقہ احکام
۶۲۱	حکم نمبر ۲۰: نیک کام نہ کرنے کی قسم کی ممانعت	۵۹۹	حرمت شراب کے تدریجی احکام
۶۲۱	آسان ترجمہ قرآن	۶۰۰	صحابہ رضی اللہ عنہم میں تعمیل حکم کا بے مثال جذبہ
۶۲۱	خلاصہ تفسیر	۶۰۲	اسلامی سیاست اور عام ملکی سیاستوں کا فرق عظیم
۶۲۱	حکم نمبر ۲۱: جھوٹی قسمیں کھانے کا حکم	۶۰۳	شراب کے مفاسد اور فوائد میں موازنہ
۶۲۲	آسان ترجمہ قرآن	۶۰۶	تشریح و تفسیر
۶۲۲	خلاصہ تفسیر	۶۰۷	حرمت قمار (جوا)
۶۲۲	حکم نمبر ۲۲: ایلاء کا حکم	۶۰۹	قمار کے سماجی اور اجتماعی نقصانات
۶۲۳	آسان ترجمہ قرآن	۶۱۲	چند فقہی ضابطے اور فوائد

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۶۲۲	حضرت فاروق اعظمؓ کا واقعہ اور اس پر اشکال جواب	۶۲۲	خلاصہ تفسیر
۶۲۹	آسان ترجمہ قرآن	۶۲۳	حکم نمبر ۲۳ و ۲۴: مطلقہ کی عدت اور مدت رجعت
۶۵۰	خلاصہ تفسیر	۶۲۳	کابیان
۶۵۰	حکم نمبر ۲۸: عورتوں کو معلق رکھنے کی ممانعت	۶۲۳	مسائل متعلقہ آیت از "بیان القرآن"
۶۵۰	حکم نمبر ۲۹: عورتوں کو نکاح ثانی سے منع کرنے کی ممانعت	۶۲۵	معارف و مسائل
۶۵۰	معارف و مسائل	۶۲۵	مرد و عورت کے فرق اور میاں بیوی کے باہمی حقوق
۶۵۰	احکام طلاق کے بعد رجعت یا انقطاع نکاح دونوں کے لئے خاص ہدایات	۶۲۵	دورجات پر ایک جامع آیت
۶۵۳	نکاح و طلاق کو کھیل نہ بناؤ	۶۲۵	اسلام میں عورت کا موقف
۶۵۳	طلاق میں اصل یہی ہے کہ صریح اور رجعی طلاق دی جائے	۶۲۶	اسلام سے پہلے معاشرہ میں عورت کا درجہ
۶۵۳	مطلقہ عورتوں کو اپنی مرضی کی شادی کرنے سے بلا وجہ شرعی روکنا حرام ہے	۶۲۸	عورتوں کو مردوں کی سیادت اور نگرانی سے بالکل آزاد کر دینا بھی فسادِ عالم کا بہت بڑا سبب ہے
۶۵۳	قانون سازی اور اس کی تنفیذ میں قرآن کریم کا بے نظیر حکیمانہ اصول	۶۲۹	مرد و عورت میں درجہ کا تفوق دنیوی معاملات میں ہے، آخرت کی فضیلت میں اس کا کوئی اثر نہیں
۶۵۹	آسان ترجمہ قرآن	۶۳۳	آسان ترجمہ قرآن
۶۵۹	خلاصہ تفسیر	۶۳۳	خلاصہ تفسیر
۶۵۹	حکم نمبر ۳۰: رضاعت	۶۳۳	حکم نمبر ۲۵: طلاق رجعی کی تعداد
۶۶۰	معارف و مسائل	۶۳۳	حکم نمبر ۲۶: خلع
۶۶۰	دودھ پلانا ماں کے ذمہ واجب ہے	۶۳۴	حکم نمبر ۲۷: تین طلاقیں کے بعد حلالہ
۶۶۱	پوری مدت رضاعت	۶۳۴	معارف و مسائل
۶۶۱	بچے کو دودھ پلانا ماں کے ذمہ اور ماں کا نان و نفقہ	۶۳۴	نکاح و طلاق کی شرعی حیثیت اور حکیمانہ نظام
۶۶۱	ضروریات باپ کے ذمہ ہیں	۶۳۸	تین طلاق اور اس کے احکام کی تفصیل
		۶۴۱	اگر کسی غیر مستحسن یا غیر مشروع طریقہ سے تین طلاق دے دی تو اس کا اثر کیا ہوگا؟

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۶۷۱	حکم نمبر ۳۴: نمازوں کی حفاظت کا بیان	۶۶۱	زوجہ کا نفقہ شوہر کی حیثیت کے مناسب ہونا چاہئے
۶۷۲	معارف و مسائل	۶۶۲	یا زوجہ کی؟
۶۷۳	آسان ترجمہ قرآن	۶۶۲	ماں کو دودھ پلانے پر مجبور کرنے یا نہ کرنے کی تفصیل
۶۷۴	خلاصہ تفسیر	۶۶۲	عورت جب تک نکاح میں ہے تو اپنے بچے کو دودھ پلانے کی اجرت کا مطالبہ نہیں کر سکتی، طلاق و عدت کے بعد کر سکتی ہے
۶۷۴	حکم نمبر ۳۵: بیوہ عورت کی سکونت اور متاع کی بعض اقسام کا بیان	۶۶۳	یتیم بچے کے دودھ پلوانے کی ذمہ داری کس پر ہے؟
۶۷۴	معارف و مسائل	۶۶۳	دودھ چھڑانے کے احکام
۶۷۶	آسان ترجمہ قرآن	۶۶۳	ماں کے سوا دوسری عورت کا دودھ پلوانے کے احکام
۶۷۶	خلاصہ تفسیر	۶۶۵	آسان ترجمہ قرآن
۶۷۶	معارف و مسائل	۶۶۶	خلاصہ تفسیر
۶۷۹	مسائل متعلقہ	۶۶۶	حکم نمبر ۳۱: شوہر کی وفات ہونے کی صورت میں عدت کا بیان
۶۷۹	تدبیر پر تقدیر غالب ہے	۶۶۶	حکم نمبر ۳۲: عدت میں نکاح کا پیغام دینا
۶۷۹	جس بستی میں کوئی و باطاعون وغیرہ ہو اس میں جانایا وہاں سے بھاگ کر کہیں اور جانادونوں ناجائز ہیں	۶۶۷	معارف و مسائل
۶۸۱	در بارہ طاعون ارشاد نبوی کی حکمتیں	۶۶۷	عدت کے بعض احکام
۶۸۳	بعض خاص صورتوں کا استثناء	۶۶۸	آسان ترجمہ قرآن
۶۸۴	آسان ترجمہ قرآن	۶۶۹	خلاصہ تفسیر
۶۸۴	خلاصہ تفسیر	۶۶۹	حکم نمبر ۳۳: طلاق قبل الدخول کی صورت میں مہر کے وجوب اور عدم وجوب کا بیان
۶۸۴	جہاد وغیرہ کا خیر میں انفاق کی ترغیب	۶۷۰	معارف و مسائل
۶۸۵	معارف و مسائل	۶۷۱	آسان ترجمہ قرآن
۶۸۹	آسان ترجمہ قرآن	۶۷۱	خلاصہ تفسیر
۶۹۰	خلاصہ تفسیر		
۶۹۰	رابط آیات		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۷۰۶	معارف و مسائل	۶۹۰	طالوت اور جالوت کا قصہ
۷۰۷	آسان ترجمہ قرآن	۶۹۲	معارف و مسائل
۷۰۷	خلاصہ تفسیر	۶۹۳	آسان ترجمہ قرآن
۷۰۸	معارف و مسائل	۶۹۴	خلاصہ تفسیر
۷۰۹	آسان ترجمہ قرآن	۶۹۴	نبوت محمدیہ پر استدلال
۷۰۹	خلاصہ تفسیر	۶۹۵	آسان ترجمہ قرآن
۷۱۱	آسان ترجمہ قرآن	۶۹۵	خلاصہ تفسیر
۷۱۱	خلاصہ تفسیر	۶۹۵	بعض انبیاء اور اُمتوں کے کچھ احوال
۷۱۲	معارف و مسائل	۶۹۵	معارف و مسائل
	حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی درخواستِ حیات	۶۹۷	آسان ترجمہ قرآن
۷۱۲	بعد الموت کا مشاہدہ اور شبہات کا ازالہ	۶۹۷	خلاصہ تفسیر
۷۱۴	واقعہ مذکورہ پر چند سوالات مع جوابات	۶۹۷	انفاق فی سبیل اللہ میں تعجیل کرنا
۷۱۸	آسان ترجمہ قرآن	۶۹۷	معارف و مسائل
۷۱۸	خلاصہ تفسیر	۶۹۹	آسان ترجمہ قرآن
۷۲۰	معارف و مسائل	۶۹۹	خلاصہ تفسیر
۷۲۱	اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ایک مثال	۶۹۹	معارف و مسائل
۷۲۲	قبولیت صدقات کی مثبت شرائط	۶۹۹	آیت الکرسی کے خاص فضائل
۷۲۳	قبولیت صدقہ کی منفی شرائط	۷۰۳	آسان ترجمہ قرآن
۷۲۸	آسان ترجمہ قرآن	۷۰۴	خلاصہ تفسیر
۷۲۹	خلاصہ تفسیر	۷۰۴	معارف و مسائل
۷۳۱	معارف و مسائل	۷۰۶	آسان ترجمہ قرآن
۷۳۱	عشر اراضی کے احکام	۷۰۶	خلاصہ تفسیر

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۷۷۷	ضابطہ شہادت کے چند اہم اصول	۷۳۲	حکمت کے معنی اور تفسیر
	گواہی کے لئے دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا	۷۳۷	آسان ترجمہ قرآن
۷۷۷	ضروری ہیں	۷۳۷	خلاصہ تفسیر
۷۷۷	گواہوں کی شرائط	۷۳۹	معارف و مسائل
۷۷۷	گواہی دینے سے بلا عذر شرعی انکار کرنا گناہ ہے	۷۵۳	مسئلہ سود و ربا کی کچھ مزید تشریح و تفصیل
	اسلام میں عدل و انصاف قائم کرنے کا اہم اصول		اصل ”ربا“ کی تعریف میں کبھی کوئی ابہام نہیں رہا،
۷۷۸	کہ گواہوں کو کوئی نقصان یا تکلیف نہ پہنچے	۷۵۳	ایک مغالطہ کا جواب
۷۷۹	آسان ترجمہ قرآن	۷۵۸	اس تفصیل سے چند چیزیں واضح ہو گئیں
۷۸۰	خلاصہ تفسیر	۷۵۹	حرمت سود کی حکمت و مصلحت
۷۸۰	معارف و مسائل	۷۶۱	سود و ربا کی معاشی خرابیاں
۷۸۲	آسان ترجمہ قرآن	۷۶۲	خویش پروری اور ملت کشی کی ایک اور چال
۷۸۲	خلاصہ تفسیر	۷۶۵	ایک شبہ اور اس کا جواب
۷۸۵	معارف و مسائل		فریضہ زکوٰۃ ایک حیثیت سے تجارت کی ترقی کا
۷۸۵	ان دو آیتوں کے خاص فضائل	۷۶۶	ضامن ہے
		۷۶۶	سود کی روحانی بیماریاں
		۷۶۷	کیا سود کے بغیر کوئی تجارت نہیں چل سکتی؟
			سود کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
		۷۶۹	کے ارشادات
		۷۷۳	آسان ترجمہ قرآن
		۷۷۴	خلاصہ تفسیر
		۷۷۵	معارف و مسائل
			قرض اور ادھار کے لئے اقرار نامہ لکھنے کی ہدایت
		۷۷۵	اور متعلقہ احکام



پیش لفظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰی، وَسَلَّمَ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَلَفٰی

اما بعد: اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہمارے والد ماجد مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کی تفسیر ”معارف القرآن“ کو جو مقبولیت اور نافعیت عطا فرمائی ہے، اس کی نظیر دوسری کتابوں میں خال خال ہی مل سکتی ہے۔ اگرچہ حضرت والد ماجد قدس سرہ نے یہ تفسیر اپنی عمر کے آخری پانچ سالوں میں تالیف فرمائی جبکہ ایک طرف آپ پر ضعف و علالت کا غلبہ تھا، اور دوسری طرف آپ گونا گوں مشاغل میں گھرے ہوئے تھے۔ لیکن جب اللہ تبارک و تعالیٰ کی توفیق خاص شامل حال ہوتی ہے تو یہ رکاوٹیں رکاوٹیں نہیں رہتیں، چنانچہ حضرت نے ان تمام عوائق کے باوجود کراماتی رفتار سے یہ تفسیر مکمل فرمائی، اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس کی نافعیت چار دہائیوں تک عالم میں پھیلی۔ اسی مقبولیت کا یہ ثمرہ ہے کہ اس کے ترجمے انگریزی، فارسی، بنگلہ، پشتو، سندھی اور ناطل زبانوں میں بھی ہوئے جو اپنے اپنے علاقوں کو سیراب کر رہے ہیں، اور اب عربی زبان میں بھی اس کا ترجمہ سہ ماہی ”البلاغ“ عربی میں قسط وار شائع ہو رہا ہے۔

اب تک یہ کتاب پرانے طرز کی کتابت میں شائع ہوتی رہی ہے جس میں متعدد کاتبوں کے قلم لگے ہیں، اور کتابت کی اغلاط بھی وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہی ہیں جن کی مختلف اوقات میں تصحیح بھی ہوتی رہی۔ لیکن اب اس بات کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ اسے کمپیوٹر پر کمپوز کر کے جدید انداز میں شائع کیا جائے اور حتی الامکان کتابت کی غلطیوں کو بھی مزید درست کیا جائے۔

جب اس کام کا ارادہ کیا گیا تو قارئین کی طرف سے متعدد فرمائشیں تھیں، ان کو بھی اس نئے ایڈیشن میں پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ نئی کمپوزنگ کے علاوہ اس ایڈیشن میں مندرجہ ذیل کام کئے گئے ہیں:-

(۱) قرآن کریم کا عربی متن ایک تصحیح شدہ سافٹ ویئر خرید کر اس سے لیا گیا ہے جس کے بارے میں قوی اُمید

ہے کہ انشاء اللہ وہ اغلاط سے خالی ہوگا۔

(۲) زمانے کی تبدیلی سے قارئین کی اردو زبان کی سمجھ میں بھی کمی آرہی ہے، اور یہ شکایت بکثرت ملتی رہتی تھی کہ

قرآن کریم کے جو ترجمے ”معارف القرآن“ میں شامل ہیں وہ قارئین کی سمجھ سے بالاتر ہو گئے ہیں۔ اس لئے اس ایڈیشن

میں بندہ کا کیا ہوا ”آسان ترجمہ قرآن“ بھی شامل کر دیا گیا ہے جس کے بارے میں ابھی تک لوگوں کا یہ تبصرہ سامنے آیا ہے کہ وہ ان کی سمجھ سے قریب تر ہے۔ چنانچہ اب اس اڈیشن میں قرآن کریم کے تین ترجمے بیک وقت قارئین کے سامنے ہوں گے۔ یعنی ایک تو شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ کا ترجمہ، دوسرے حکیم الامہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کا ترجمہ مع خلاصہ تفسیر۔ اور تیسرے بندہ کا ”آسان ترجمہ قرآن“۔

(۳) اب تک معارف القرآن کے قارئین کی طرف سے کتابت وغیرہ کی جن اغلاط کی نشاں دہی کی گئی تھی، بفضلہ تعالیٰ ان سب کو دارالعلوم کراچی کے مستند علماء کرام کے ذریعے درست کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے، اور بیشتر مواقع پر بندہ نے خود اس کام کی نگرانی کی ہے۔

(۴) ہماری درخواست پر مولانا محمد حنیف خالد صاحب استاذ دارالعلوم کراچی نے پوری تفسیر کو از اول تا آخر پڑھ کر جہاں ضروری سمجھا، اصل مسودے سے اس کا مقابلہ کیا ہے اور جہاں کتابت وغیرہ کی غلطی محسوس کی، وہاں اس کو درست کر دیا ہے۔ نیز تفسیر میں جہاں جہاں دوسری آیتیں مذکور ہیں، اُن کی سورت اور آیت نمبر کا حوالہ درج کر دیا ہے۔ آیات قرآنی اور احادیث نبوی پر حرکات لگادی گئی ہیں۔

(۵) تفسیر کے دوران حضرت مصنف قدس سرہ نے بکثرت عربی یا فارسی کے اشعار درج فرمائے تھے، قارئین کی فرمائش کے مطابق ان کا ترجمہ درج کر دیا گیا ہے۔

(۶) ”معارف و مسائل“ میں جو تفسیری اقوال یا فقہی مسائل مذکور ہیں، ان کی تخریج کی بھی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ چنانچہ مولانا طاہر اقبال صاحب استاذ دارالعلوم کراچی نے بڑی محنت سے ان تمام حوالوں کی مکمل تخریج فرمائی ہے، اور ان کے مآخذ صفحہ اور جلد نمبر کی تفصیل کے ساتھ ذکر فرمائے ہیں۔ ان دونوں حضرات کی خدمت کے لئے ادارہ تہ دل سے شکر گزار ہے، جزاھما اللہ تعالیٰ خیراً۔

برادر عزیز محمد شہباز سیٹھی صاحب نے اس اڈیشن کی تیاری میں جو محنت کی ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اس کی بہترین جزا دینا و آخرت میں عطا فرمائیں۔ آمین

اس طرح اُمید ہے کہ انشاء اللہ اس نئے لباس میں اس عظیم اور شہرہ آفاق تفسیر کی افادیت اور زیادہ عام اور تمام ہوگی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اس خدمت کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائیں، اور یہ مسلمانوں کے لئے مزید نفع اور حضرت مؤلف قدس سرہ کے لئے درجات میں مزید بلندی کا ذریعہ بنے۔ آمین

بندہ محمد تقی عثمانی

۲۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ



از

محمد تقی عثمانی

استاذ حدیث جامعہ دارالعلوم کراچی

(فرزند حضرت مولف رحمۃ اللہ علیہ)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کی تفسیر ”معارف القرآن“ کو اللہ تعالیٰ نے عوام و خواص میں غیر معمولی مقبولیت عطا فرمائی، اور جلد اول کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ ختم ہو گیا۔ دوسرے ایڈیشن کی طباعت کے وقت حضرت مصنف مدظلہم نے جلد اول پر مکمل طور سے نظر ثانی فرمائی، اور اس میں کافی ترمیم و اضافہ عمل میں آیا۔ اسی کے ساتھ حضرت موصوف مدظلہم کی خواہش تھی کہ دوسری اشاعت کے وقت جلد اول کے شروع میں علوم قرآن اور اصول تفسیر سے متعلق ایک مختصر مقدمہ بھی تحریر فرمائیں، تاکہ تفسیر کے مطالعے سے پہلے قارئین ان ضروری معلومات سے مستفید ہو سکیں، لیکن متواتر امراض اور ضعف کی بناء پر موصوف کے لئے بذات خود اس مقدمے کی تصنیف مشکل تھی، چنانچہ حضرت موصوف نے یہ ذمہ داری احقر کے سپرد فرمائی۔

احقر نے تعمیل حکم اور تحصیل سعادت کے لئے یہ کام شروع کیا تو یہ مقدمہ بہت طویل ہو گیا، اور علوم قرآن کے موضوع پر خاصی مفصل کتاب کی صورت بن گئی، اس پوری کتاب کو ”معارف القرآن“ کے شروع میں بطور مقدمہ شامل کرنا مشکل تھا، اس لئے حضرت والد صاحب مدظلہم کے ایماء پر احقر نے اس مفصل کتاب کی تلخیص کی، اور صرف وہ مباحث باقی رکھے جن کا مطالعہ تفسیر ”معارف القرآن“ کے مطالعہ کرنے والے کے لئے ضروری تھا، اور جو ایک عام قاری کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتے تھے۔ یہ تلخیص ”معارف القرآن“ جلد اول کے زیر نظر ایڈیشن میں بطور مقدمہ شامل کی جا رہی ہے، اللہ تعالیٰ اسے مسلمانوں کے لئے نافع اور مفید بنائے اور اس ناچیز کے لئے ذخیرہ آخرت ثابت ہو۔

ان موضوعات پر مبسوط علمی مباحث احقر کی اس مفصل کتاب میں مل سکیں گے جو ان شاء اللہ عنقریب مستقل کتابی صورت میں شائع ہوگی، لہذا جو حضرات تحقیق اور تفصیل کے طالب ہوں، وہ اس کتاب کی طرف رجوع فرمائیں۔

وَمَا تَوْفِیْقِیَ إِلَّا بِاللّٰهِ ۖ عَلَیْہِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَیْہِ اُنِیْبُ

احقر

محمد تقی عثمانی

۲۳ ربیع الاول ۱۳۹۴ھ

جامعہ دارالعلوم کراچی

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
الْحَمْدُ لِلَّهِ وَكَفَى وَسَلَامٌ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى

وحی اور اس کی حقیقت

قرآن کریم چونکہ سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعہ نازل کیا گیا ہے، اس لئے سب سے پہلے وحی کے بارے میں چند ضروری باتیں سمجھ لینی چاہئیں۔

وحی کی ضرورت

ہر مسلمان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں آزمائش کے لئے بھیجا ہے، اور اس کے ذمہ کچھ فرائض عائد کر کے پوری کائنات کو اس کی خدمت میں لگا دیا ہے، لہذا دنیا میں آنے کے بعد انسان کے لئے دو کام ناگزیر ہیں، ایک یہ کہ وہ اس کائنات سے اور اس میں پیدا کی ہوئی اشیاء سے ٹھیک ٹھیک کام لے، اور دوسرے یہ کہ اس کائنات کو استعمال کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکام کو مد نظر رکھے، اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو۔ ان دونوں کاموں کے لئے انسان کو ”علم“ کی ضرورت ہے، اس لئے کہ جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی کوئی چیز کے کیا خواص ہیں؟ ان سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے؟ اس وقت تک وہ دنیا کی کوئی بھی چیز اپنے فائدے کے لئے استعمال نہیں کر سکتا، نیز جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کیا ہے؟ وہ کونسے کاموں کو پسند اور کن کو ناپسند فرماتا ہے؟ اس وقت تک اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا ممکن نہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تین چیزیں ایسی پیدا کی ہیں جن کے ذریعہ اسے مذکورہ باتوں کا علم حاصل ہوتا ہے، ایک انسان کے حواس، یعنی آنکھ، کان، منہ اور ہاتھ پاؤں، دوسرے عقل، اور تیسرے وحی، چنانچہ انسان کو بہت سی باتیں اپنے حواس کے ذریعہ معلوم ہو جاتی ہیں، بہت سی عقل کے ذریعہ، اور جو باتیں ان دونوں ذرائع سے معلوم نہیں ہو سکتیں ان کا علم وحی کے ذریعے عطا کیا جاتا ہے۔

علم کے ان تینوں ذرائع میں ترتیب کچھ ایسی ہے کہ ہر ایک کی ایک خاص حد اور مخصوص دائرہ کار ہے، جس کے آگے وہ کام نہیں دیتا، چنانچہ جو چیزیں انسان کو اپنے حواس سے معلوم ہو جاتی ہیں اُن کا علم نری عقل سے نہیں ہو سکتا، مثلاً ایک دیوار کو آنکھ سے دیکھ کر آپ کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ اس کا رنگ سفید ہے، لیکن اگر آپ اپنی آنکھوں کو بند کر کے صرف عقل کی مدد سے اس دیوار کا رنگ معلوم کرنا چاہیں تو یہ ناممکن ہے۔ اسی طرح جن چیزوں کا علم عقل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے وہ صرف حواس سے معلوم نہیں ہو سکتیں، مثلاً آپ آنکھوں سے دیکھ کر یا ہاتھوں سے چھو کر یہ پتہ نہیں لگا سکتے کہ اس دیوار کو کسی انسان نے بنایا ہے، بلکہ اس نتیجے تک پہنچنے کے لئے عقل کی ضرورت ہے۔

غرض جہاں تک حواسِ خمسہ کام دیتے ہیں وہاں تک عقل کوئی رہنمائی نہیں کرتی، اور جہاں حواسِ خمسہ جواب دے دیتے ہیں وہیں سے عقل کا کام شروع ہوتا ہے، لیکن اس عقل کی رہنمائی بھی غیر محدود نہیں ہے، یہ بھی ایک حد پر جا کر رک جاتی ہے، اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا علم نہ حواس کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے اور نہ عقل کے ذریعے، مثلاً اسی دیوار کے بارے میں یہ معلوم کرنا کہ اس کو کس طرح استعمال کرنے سے اللہ تعالیٰ راضی اور کس طرح استعمال کرنے سے ناراض ہوگا، یہ نہ حواس کے ذریعے ممکن ہے نہ عقل کے ذریعے، اس قسم کے سوالات کا جواب انسان کو دینے کے لئے جو ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے اسی کا نام ”وحی“ ہے، اور اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی کو منتخب فرما کر اسے اپنا پیغمبر قرار دے دیتا ہے اور اس پر اپنا کلام نازل فرماتا ہے، اسی کلام کو ”وحی“ کہا جاتا ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ وحی انسان کے لئے وہ اعلیٰ ترین ذریعہ علم ہے جو اسے اس کی زندگی سے متعلق اُن سوالات کا جواب مہیا کرتا ہے جو عقل اور حواس کے ذریعے حل نہیں ہو سکتے، لیکن ان کا علم حاصل کرنا اس کے لئے ضروری ہے، اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ صرف عقل اور مشاہدہ انسان کی رہنمائی کے لئے کافی نہیں، بلکہ اس کی ہدایت کے لئے وحی الہی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اور چونکہ بنیادی طور پر وحی کی ضرورت پیش ہی اُس جگہ آتی ہے جہاں عقل کام نہیں دیتی، اس لئے یہ ضروری نہیں کہ وحی کی ہر بات کا ادراک عقل سے ہو ہی جائے، بلکہ جس طرح کسی چیز کا رنگ معلوم کرنا عقل کا کام نہیں بلکہ حواس کا کام ہے، اسی طرح بہت سے دینی عقائد کا علم عطا کرنا بھی عقل کے بجائے وحی کا منصب ہے، اور ان کے ادراک کے لئے نری عقل پر بھروسہ کرنا درست نہیں۔

جو شخص (معاذ اللہ) خدا کے وجود ہی کا قائل نہ ہو، اس سے تو وحی کے مسئلہ پر بات کرنا بالکل بے سود ہے، لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی قدرتِ کاملہ پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے وحی کی عقلی ضرورت، اس کے امکان اور حقیقی وجود کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں، اگر آپ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ یہ کائنات ایک قادرِ مطلق نے پیدا کی ہے، وہی اس کے مربوط اور مستحکم نظام کو اپنی حکمتِ بالغہ سے چلا رہا ہے، اور اسی نے انسان کو کسی خاص مقصد کے تحت یہاں بھیجا ہے،

تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد اُسے بالکل اندھیرے میں چھوڑ دیا ہو، اور اُسے یہ تک نہ بتایا ہو کہ وہ کیوں اس دنیا میں آیا ہے؟ یہاں اس کے ذمہ کیا فرائض ہیں؟ اس کی منزل مقصود کیا ہے؟ اور وہ کس طرح اپنے مقصدِ زندگی کو حاصل کر سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص جس کے ہوش و حواس سلامت ہوں ایسا کر سکتا ہے کہ اپنے کسی نوکر کو ایک خاص مقصد کے تحت کسی سفر پر بھیج دے، اور اُسے نہ چلتے وقت سفر کا مقصد بتائے، اور نہ بعد میں کسی پیغام کے ذریعہ اُس پر یہ واضح کرے کہ اُسے کس کام کے لئے بھیجا گیا ہے؟ اور سفر کے دوران اس کی ڈیوٹی کیا ہوگی؟ جب ایک معمولی عقل کا انسان بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا تو آخر اس خداوندِ قدّوس کے بارے میں یہ تصور کیسے کیا جاسکتا ہے جس کی حکمتِ بالغہ سے کائنات کا یہ سارا نظام چل رہا ہے؟ یہ آخر کیسے ممکن ہے کہ جس ذات نے چاند، سورج، آسمان، زمین، ستاروں اور سیاروں کا ایسا محیر العقول نظام پیدا کیا ہو وہ اپنے بندوں تک پیغامِ رسانی کا کوئی ایسا انتظام بھی نہ کر سکے جس کے ذریعہ انسانوں کو ان کے مقصدِ زندگی سے متعلق ہدایات دی جاسکیں؟ اگر اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ پر ایمان ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس نے اپنے بندوں کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا، بلکہ ان کی رہنمائی کے لئے کوئی باقاعدہ نظام ضرور بنایا ہے، بس رہنمائی کے اسی باقاعدہ نظام کا نام وحی و رسالت ہے۔

اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ ”وحی“ محض ایک دینی اعتقاد ہی نہیں بلکہ ایک عقلی ضرورت ہے، جس کا انکار درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا انکار ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کے طریقے

وحی و رسالت کا یہ مقدس سلسلہ سرکارِ دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا، اب کسی انسان پر نہ وحی نازل ہوگی اور نہ اس کی ضرورت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف طریقوں سے وحی نازل ہوتی تھی، صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت حارث بن ہشامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کبھی تو مجھے گھنٹی کی سی آواز سنائی دیتی ہے، اور وحی کی یہ صورت میرے لئے سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے، پھر جب یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے تو جو کچھ اس آواز نے کہا ہوتا ہے، مجھے یاد ہو چکا ہوتا ہے، اور کبھی فرشتہ میرے سامنے ایک مرد کی صورت میں آ جاتا ہے۔^[۱]

اس حدیث میں آپ نے ”وحی“ کی آواز کو گھنٹیوں کی آواز سے جو تشبیہ دی ہے، شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ایک تو وحی کی آواز گھنٹی کی طرح مسلسل ہوتی ہے اور بیچ میں ٹوٹی نہیں، دوسرے گھنٹی جب مسلسل بجتی

ہے تو عموماً سننے والے کو اس کی آواز کی سمت متعین کرنا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ اس کی آواز ہر جہت سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اور کلامِ الہی کی بھی یہ خصوصیت ہے کہ اس کی کوئی ایک سمت نہیں ہوتی، بلکہ ہر جہت سے آواز سنائی دیتی ہے، اس کیفیت کا صحیح ادراک تو بغیر مشاہدہ کے ممکن نہیں، لیکن اس بات کو عام ذہنوں سے قریب کرنے کے لئے آپ نے اُسے گھنٹیوں کی آواز سے تشبیہ دی ہے۔^۱

جب اس طریقے سے آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ پر بہت زیادہ بوجھ پڑتا تھا، حضرت عائشہؓ اسی حدیث کے آخر میں فرماتی ہیں کہ میں نے سخت جاڑوں کے دن میں آپ پر وحی نازل ہوتے ہوئے دیکھی ہے، ایسی سردی میں بھی جب وحی کا سلسلہ ختم ہوتا تو آپ کی مبارک پیشانی پسینے سے شرابور ہو چکی ہوتی تھی۔ ایک اور روایت میں حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کا سانس رکنے لگتا، چہرہ انور متغیر ہو کر کھجور کی شاخ کی طرح زرد پڑ جاتا، سامنے کے دانت سردی سے کپکپانے لگتے، اور آپ کو اتنا پسینہ آتا کہ اس کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے۔^۲

وحی کی اس کیفیت میں بعض اوقات اتنی شدت پیدا ہو جاتی کہ آپ جس جانور پر اُس وقت سوار ہوتے وہ آپ کے بوجھ سے دب کر بیٹھ جاتا۔ اور ایک مرتبہ آپ نے اپنا سر اقدس حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے زانو پر رکھا ہوا تھا کہ اسی حالت میں وحی نازل ہونی شروع ہو گئی، اس سے حضرت زیدؓ کی ران پر اتنا بوجھ پڑا کہ وہ ٹوٹنے لگی۔^۳

بعض اوقات اس وحی کی ہلکی ہلکی آواز دُوروں کو بھی محسوس ہوتی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کے چہرہ انور کے قریب شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آواز سنائی دیتی تھی۔^۴

وحی کی دوسری صورت یہ تھی کہ فرشتہ کسی انسانی شکل میں آپ کے پاس آ کر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیتا تھا، ایسے مواقع پر عموماً حضرت جبریل علیہ السلام مشہور صحابی حضرت وحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت میں تشریف لایا کرتے تھے، البتہ بعض اوقات کسی دوسری صورت میں بھی تشریف لائے ہیں۔ بہر کیف! جب حضرت جبریل انسانی شکل میں وحی لے کر آتے تو نزولِ وحی کی یہ صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سب سے آسان ہوتی تھی۔^۵

وحی کی تیسری صورت یہ تھی کہ حضرت جبریل علیہ السلام کسی انسان کی شکل اختیار کئے بغیر اپنی اصل صورت میں دکھائی دیتے تھے، لیکن ایسا آپ کی تمام عمر میں صرف تین مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ اس وقت جب آپ نے خود حضرت جبریل علیہ السلام کو ان کی اصل شکل میں دیکھنے کی خواہش ظاہر فرمائی تھی، دوسری مرتبہ معراج میں، اور تیسری بار نبوت کے

۱۔ الإقتان ج: ۱ ص: ۲۶

۲۔ فیض الباری ج: ۱ ص: ۱۹ و ۲۰

۳۔ تبویب مسند احمد، کتاب السیرۃ النبویہ ج: ۲۰ ص: ۲۱۲

۴۔ زاد المعاد ج: ۱ ص: ۱۸ و ۱۹

۵۔ الإقتان ج: ۱ ص: ۲۶

بالکل ابتدائی زمانے میں مکہ مکرمہ کے مقام ”أجیاد“ پر۔ پہلے دو واقعات تو صحیح سند سے ثابت ہیں، البتہ یہ آخری واقعہ سنداً کمزور ہونے کی وجہ سے مشکوک ہے۔^۱

چوتھی صورت براہ راست اور بلا واسطہ اللہ تبارک و تعالیٰ سے ہم کلامی کی ہے، یہ شرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیداری کی حالت میں صرف ایک بار، یعنی معراج کے وقت حاصل ہوا ہے، البتہ ایک مرتبہ خواب میں بھی آپ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے ہیں۔^۲

وحی کی پانچویں صورت یہ تھی کہ حضرت جبریل علیہ السلام کسی بھی صورت میں سامنے آئے بغیر آپ کے قلب مبارک میں کوئی بات القاء فرمادیتے تھے، اسے اصطلاح میں ”نفث فی الروع“ کہتے ہیں۔^۳

تاریخ نزول قرآن

قرآن کریم دراصل کلام الہی ہے، اس لئے ازل سے لوح محفوظ میں موجود ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے: **بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ۝۱۱ فِی لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ ۝۱۲** (البروج) (بلکہ یہ قرآن مجید ہے، لوح محفوظ میں)۔ پھر لوح محفوظ سے اس کا نزول دو مرتبہ ہوا ہے، ایک مرتبہ یہ پورے کا پورا آسمان دُنیا کے بیتِ عزت میں نازل کر دیا گیا تھا، بیتِ عزت (جسے البیت المعمور بھی کہتے ہیں) کعبۃ اللہ کے محاذات میں آسمان پر فرشتوں کی عبادت گاہ ہے، یہ نزول لیلۃ القدر میں ہوا تھا، پھر دوسری مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھوڑا تھوڑا کر کے حسب ضرورت نازل کیا جاتا رہا، یہاں تک کہ تیس سال میں اس کی تکمیل ہوئی، نزول قرآن کی یہ دو صورتیں خود قرآن کریم کے اندازِ بیان سے بھی واضح ہیں، اس کے علاوہ نسائی، بیہقی اور حاکم وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں، جن کا خلاصہ یہی ہے کہ قرآن کریم کا پہلا نزول یکبارگی آسمان دُنیا پر ہوا، اور دوسرا نزول بتدریج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر۔^۴

قرآن کریم کو پہلی مرتبہ آسمان دُنیا پر نازل کرنے کی حکمت امام ابو شامہؒ نے یہ بیان کی ہے کہ اس سے قرآن کریم کی رفعتِ شان کو ظاہر کرنا مقصود تھا، اور ملائکہ کو یہ بات بتانی تھی کہ یہ اللہ کی آخری کتاب ہے جو اہل زمین کی ہدایت کے لئے اُتاری جانے والی ہے۔

شیخ زرقانیؒ نے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ اس طرح دو مرتبہ اُتارنے سے یہ بھی جتنا مقصود تھا کہ یہ کتاب ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کے علاوہ یہ دو جگہ اور بھی محفوظ ہے، ایک لوح محفوظ میں

۱۔ فتح الباری ج: ۱ ص: ۱۸ و ۱۹

۲۔ الإقنان ج: ۱ ص: ۳۱

۳۔ بحوالہ بالا۔

اور دوسرے بیتِ عزت میں۔^۱

اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ قرآن کریم کا دوسرا تاریخی نزول جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر ہوا، اس کا آغاز اس وقت ہوا جب آپ کی عمر چالیس سال تھی، اس نزول کی ابتداء بھی صحیح قول کے مطابق لیلة القدر میں ہوئی ہے اور یہی وہ تاریخ تھی جس میں چند سال بعد غزوہ بدر پیش آیا۔ لیکن یہ رات رمضان کی کونسی تاریخ میں تھی؟ اس بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی، بعض روایات سے رمضان کی سترہویں، بعض سے انیسویں اور بعض سے ستائیسویں شب معلوم ہوتی ہے۔^۲

سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت

صحیح قول یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم کی سب سے پہلی جو آیتیں اُتریں وہ سورہ علق کی ابتدائی آیات ہیں، صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ اس کا واقعہ یہ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کی ابتدا تو سچے خوابوں سے ہوئی تھی، اس کے بعد آپ کو خلوت میں عبادت کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور اس دوران آپ غارِ حراء میں کئی کئی راتیں گزارتے، اور عبادت میں مشغول رہتے تھے، یہاں تک کہ ایک دن اسی غار میں آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرشتہ آیا، اور اس نے سب سے پہلی بات یہ کہی کہ ”اِقْرَأْ“ (یعنی پڑھو) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”میں پڑھا ہوا نہیں ہوں“ اس کے بعد خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعہ بیان کیا کہ میرے اس جواب پر فرشتے نے مجھے پکڑا اور مجھے اس زور سے بھینچا کہ مجھ پر مشقت کی انتہا ہو گئی، پھر اُس نے مجھے چھوڑ دیا، اور دوبارہ کہا کہ ”اِقْرَأْ“ میں نے جواب دیا کہ ”میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں“ فرشتے نے مجھے پھر پکڑا اور دوبارہ اس زور سے بھینچا کہ مجھ پر مشقت کی انتہا ہو گئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ کر کہا کہ ”اِقْرَأْ“ میں نے جواب دیا کہ ”میں پڑھا ہوا نہیں ہوں“ اس پر اُس نے مجھے تیسری مرتبہ پکڑا اور بھیج کر چھوڑ دیا، پھر کہا:-

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝۳ (علق)

”پڑھو، اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو منجمد خون سے پیدا کیا،

پڑھو، اور تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کریم ہے۔“ الخ

یہ آپ پر نازل ہونے والی پہلی آیات تھیں، اس کے بعد تین سال تک وحی کا سلسلہ بند رہا، اسی زمانہ کو ”فترتِ وحی“ کا زمانہ کہتے ہیں، پھر تین سال کے بعد وہی فرشتہ جو غارِ حراء میں آیا تھا، آپ کو آسمان وزمین کے درمیان دکھائی دیا، اور اس

نے سورہ مدثر کی آیات آپ کو سنائیں، اس کے بعد وحی کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

مکی اور مدنی آیات

آپ نے قرآن کریم کی سورتوں کے عنوان میں دیکھا ہوگا کہ کسی سورۃ کے ساتھ ”مکی“ اور کسی کے ساتھ ”مدنی“ لکھا ہوتا ہے، اس کا صحیح مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے، مفسرین کی اصطلاح میں ”مکی آیت“ کا مطلب وہ آیت ہے جو آپ کے بغرض ہجرت مدینہ طیبہ پہنچنے سے پہلے نازل ہوئی، اور ”مدنی آیت“ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ آپ کے مدینہ پہنچنے کے بعد نازل ہوئی۔ بعض لوگ ”مکی“ کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شہر مکہ میں نازل ہوئی، اور ”مدنی“ کا یہ کہ وہ شہر مدینہ میں اُتری، لیکن یہ مطلب درست نہیں، اس لئے کہ کئی آیتیں ایسی ہیں جو شہر مکہ میں نازل نہیں ہوئیں لیکن چونکہ ہجرت سے پہلے نازل ہو چکی تھیں اس لئے انہیں ”مکی“ کہا جاتا ہے، چنانچہ جو آیات منیٰ، عرفات یا سفرِ معراج کے دوران نازل ہوئیں ان کو بھی ”مکی“ کہا جاتا ہے، یہاں تک کہ جو آیتیں سفرِ ہجرت کے دوران مدینہ کے راستے میں نازل ہوئیں ان کو بھی ”مکی“ کہا جاتا ہے، اسی طرح بہت سی آیات ایسی ہیں جو شہر مدینہ میں نازل نہیں ہوئیں، مگر وہ ”مدنی“ ہیں، چنانچہ ہجرت کے بعد آپ کو بہت سے سفر پیش آئے جن میں آپ مدینہ طیبہ سے سینکڑوں میل دور بھی تشریف لے گئے، ان تمام مقامات پر نازل ہونے والی آیتیں ”مدنی“ ہی کہلاتی ہیں، یہاں تک کہ ان آیتوں کو بھی ”مدنی“ کہا جاتا ہے جو فتح مکہ یا غزوہ حدیبیہ کے موقع پر خاص شہر مکہ یا اس کے مضافات میں نازل ہوئیں، چنانچہ آیت قرآنی **إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَوَدُّوا إِلَّا مَتَّ إِلَيَّ أَهْلَهَا** (النساء: ۵۸) مدنی ہے، حالانکہ وہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔

پھر بعض سورتیں تو ایسی ہیں کہ وہ پوری کی پوری مکی، یا پوری کی پوری مدنی ہیں، مثلاً سورہ مدثر پوری مکی ہے، اور سورہ آل عمران پوری مدنی ہے، لیکن بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے کہ پوری سورت مکی ہے، لیکن اس میں ایک یا چند آیات مدنی بھی آگئی ہیں، اور بعض مرتبہ اس کے برعکس بھی ہوا ہے، مثلاً سورہ اعراف مکی ہے، لیکن اس میں **وَسَلِّهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ** (الاعراف: ۱۶۳) سے لے کر **وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ الْخِيَارَ** (الاعراف: ۱۷۲) تک کی آیات مدنی ہیں۔ اسی طرح سورہ حج مدنی ہے، لیکن اس میں چار آیتیں ہیں یعنی **وَمَا أَمْرُ سَلَامٍ مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى** سے لے کر **عَذَابٌ يَوْمَ عَقِيبِهِ** (الحج: ۵۲ تا ۵۵) تک مکی ہیں۔

اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کسی سورت کا مکی یا مدنی ہونا عموماً اس کی اکثر آیتوں کے اعتبار سے ہوتا ہے، اور اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ جس سورت کی ابتدائی آیات ہجرت سے پہلے نازل ہو گئیں اُسے مکی قرار دے دیا گیا، اگرچہ بعد میں

اس کی بعض آیتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہوں۔^۱

مکی ومدنی آیتوں کی خصوصیات

علمائے تفسیر نے مکی اور مدنی سورتوں کا استقراء کر کے ان کی بعض ایسی خصوصیات بیان فرمائی ہیں جن سے پہلی نظر میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سورت مکی ہے یا مدنی؟ ان میں سے بعض خصوصیات قاعدہ کلیہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اور بعض اکثری ہیں، قواعد کلیہ یہ ہیں:-

- ۱- ہر وہ سورت جس میں لفظ ”کَلَّا“ (ہرگز نہیں) آیا ہے، وہ مکی ہے، یہ لفظ پندرہ سورتوں میں ۳۳ مرتبہ استعمال ہوا ہے، اور یہ ساری آیتیں قرآن کریم کے آخری نصف حصہ میں ہیں۔
 - ۲- ہر وہ سورت جس میں (حنفی مسلک کے مطابق) کوئی سجدے کی آیت آئی ہے، مکی ہے۔^۲
 - ۳- سورہ بقرہ کے سوا ہر وہ سورت جس میں آدمؑ و ابلیس کا واقعہ مذکور ہے وہ مکی ہے۔
 - ۴- ہر وہ سورت جس میں جہاد کی اجازت یا اس کے احکام مذکور ہیں، مدنی ہے۔
 - ۵- ہر وہ آیت جس میں منافقوں کا ذکر آیا ہے، مدنی ہے۔
- اور مندرجہ ذیل خصوصیات عمومی اور اکثری ہیں، یعنی کبھی کبھی ان کے خلاف بھی ہو جاتا ہے لیکن اکثر و بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے۔

- ۱- مکی سورتوں میں عموماً **يَا أَيُّهَا النَّاسُ** (اے لوگو) کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے، اور مدنی سورتوں میں **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا** (اے ایمان والو) کے الفاظ سے۔
- ۲- مکی آیتیں اور سورتیں عموماً چھوٹی اور مختصر ہیں، اور مدنی آیات و سورتیں طویل اور مفصل ہیں۔
- ۳- مکی سورتیں زیادہ تر توحید، رسالت اور آخرت کے اثبات، حشر و نشر کی منظر کشی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و تسلی کی تلقین اور پچھلی اُمتوں کے واقعات پر مشتمل ہیں، اور ان میں احکام و قوانین کم بیان ہوئے ہیں، اس کے برعکس مدنی سورتوں میں خاندانی اور تمدنی قوانین، جہاد و قتال کے احکام اور حدود و فرائض بیان کئے گئے ہیں۔
- ۴- مکی سورتوں میں زیادہ تر مقابلہ بت پرستوں سے ہے، اور مدنی سورتوں میں اہل کتاب اور منافقین سے۔
- ۵- مکی سورتوں کا اُسلوب بیان زیادہ پر شکوہ ہے، اس میں استعارات و تشبیہات اور تمثیلیں زیادہ ہیں، اور

۱ منہل العرفان ج: ۱ ص: ۱۹۲

۲ یہ قاعدہ ”اِقْتَان“ وغیرہ سے ماخوذ ہے، اور یہ اس قول کے مطابق تو درست ہے جس کی زد سے سورہ حج مکی ہے، لیکن اگر اسے مدنی قرار دیا جائے جیسا کہ بعض صحابہؓ و تابعینؓ سے مروی ہے تو سورہ حج اس قاعدے سے مستثنیٰ ہوگی۔ محمد تقی عثمانی

ذخیرہ الفاظ بہت وسیع ہے، اس کے برخلاف مدنی سورتوں کا انداز نسبتاً سادہ ہے۔

مکی اور مدنی سورتوں کے انداز و اسلوب میں یہ فرق دراصل حالات، ماحول اور مخاطبوں کے اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، مکی زندگی میں مسلمانوں کا واسطہ چونکہ زیادہ تر عرب کے بت پرستوں سے تھا اور کوئی اسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی تھی، اس لئے اس دور میں زیادہ زور عقائد کی درستی، اخلاق کی اصلاح، بت پرستوں کی مدلل تردید اور قرآن کریم کی شانِ اعجاز کے اظہار پر دیا گیا، اس کے برخلاف مدینہ طیبہ میں ایک اسلامی ریاست وجود میں آچکی تھی، لوگ جوق در جوق اسلام کے سائے تلے آرہے تھے، عملی سطح پر بت پرستی کا ابطال ہو چکا تھا اور تمام تر نظریاتی مقابلہ اہل کتاب سے تھا، اس لئے یہاں احکام و قوانین اور حدود و فرائض کی تعلیم اور اہل کتاب کی تردید پر زیادہ توجہ دی گئی، اور اسی کے مناسب اسلوب بیان اختیار کیا گیا۔

قرآن کریم کا تدریجی نزول

پیچھے آچکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم دفعۃً اور یکبارگی نازل نہیں ہوا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے تقریباً تیس سال میں اتارا گیا ہے، بعض اوقات جبریل علیہ السلام ایک چھوٹی سی آیت بلکہ آیت کا کوئی ایک جزو لے کر بھی تشریف لے آتے، اور بعض مرتبہ کئی آیتیں بیک وقت نازل ہو جاتیں، قرآن کریم کا سب سے چھوٹا حصہ جو مستقلاً نازل ہوا وہ **غَيْرُ اُولَى الصَّمَرِ** (النساء: ۹۵) ہے، جو ایک طویل آیت کا ٹکڑا ہے، دوسری طرف پوری سورہ انعام ایک ہی مرتبہ نازل ہوئی ہے۔^[۱]

قرآن کریم کو یکبارگی نازل کرنے کے بجائے تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں نازل کیا گیا؟ یہ سوال خود مشرکین عرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا، باری تعالیٰ نے اس سوال کا جواب خود ان الفاظ میں دیا ہے:-

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذَلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلاً ۝۳۱ وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ۝۳۲ (الفرقان)

”اور کافروں نے کہا کہ آپ پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ اسی طرح (ہم نے قرآن کو تدریجاً اتارا ہے) تاکہ ہم آپ کے دل کو مطمئن کر دیں، اور ہم نے اس کو رفتہ رفتہ پڑھا ہے، اور وہ کوئی بات آپ کے پاس نہیں لائیں گے، مگر ہم آپ کے پاس حق لائیں گے، اور (اس کی) عمدہ تفسیر پیش کریں گے۔“

امام رازیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں قرآن کریم کے تدریجی نزول کی جو حکمتیں بیان فرمائی ہیں یہاں ان کا خلاصہ سمجھ لینا کافی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:-

۱- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمی تھے، لکھتے پڑھتے نہیں تھے، اس لئے اگر سارا قرآن ایک مرتبہ نازل ہو گیا ہوتا تو اس کا یاد رکھنا اور ضبط کرنا دشوار ہوتا، اس کے برخلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اس لئے اُن پر توراۃ ایک ہی مرتبہ نازل کر دی گئی۔

۲- اگر پورا قرآن ایک دفعہ نازل ہو جاتا تو تمام احکام کی پابندی فوراً لازم ہو جاتی، اور یہ اس حکیمانہ تدریج کے خلاف ہوتا جو شریعت محمدی میں ملحوظ رہی ہے۔

۳- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کی طرف سے ہر روز نئی اذیتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں، جبریل علیہ السلام کا بار بار قرآن کریم لے کر آنا ان اذیتوں کے مقابلے کو آسان بنا دیتا تھا، اور آپ کی تقویتِ قلب کا سبب بنتا تھا۔

۴- قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ لوگوں کے سوالات کے جواب اور مختلف واقعات سے متعلق ہے، اس لئے ان آیتوں کا نزول اسی وقت مناسب تھا جس وقت وہ سوالات کئے گئے، یا وہ واقعات پیش آئے، اس سے مسلمانوں کی بصیرت بھی بڑھتی تھی، اور قرآن کریم کی غیبی خبریں بیان کرنے سے اس کی حقانیت اور زیادہ آشکار ہو جاتی تھی۔

شان نزول

قرآن کریم کی آیتیں دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے از خود نازل فرمائیں، کوئی خاص واقعہ یا کسی کا کوئی سوال وغیرہ اُن کے نزول کا سبب نہیں بنا۔ دوسری آیات ایسی ہیں کہ جن کا نزول کسی خاص واقعہ کی وجہ سے یا کسی سوال کے جواب میں ہوا، جسے ان آیتوں کا پس منظر کہنا چاہئے، یہ پس منظر مفسرین کی اصطلاح میں ”سبب نزول“ یا ”شان نزول“ کہلاتا ہے، مثلاً سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۲۱ ہے:-

وَلَا تَنْكِحُوا النَّسْرَةَ حَتَّىٰ يُوْمِنَ ۖ وَلَا مَٰمُۢمً مِّنْهُ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ ۚ وَلَوْ اَعَجَبْتُمْ

”مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں، اور بلاشبہ ایک مومن کنیز ایک مشرک سے بہتر ہے خواہ مشرک تمہیں پسند ہو۔“

یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی تھی، زمانہ جاہلیت میں حضرت مرثد بن ابی مرثد غنویؓ کے عناق نامی ایک عورت سے تعلقات تھے، اسلام لانے کے بعد یہ مدینہ طیبہ چلے آئے، اور وہ عورت مکہ مکرمہ میں رہ گئی، ایک

مرتبہ حضرت مرثدؓ کسی کام سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو عناق نے انہیں گناہ کی دعوت دی، حضرت مرثدؓ نے صاف انکار کر کے فرمایا کہ اسلام میرے اور تمہارے درمیان حائل ہو چکا ہے، لیکن اگر تم چاہو تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت کے بعد تم سے نکاح کر سکتا ہوں۔ مدینہ طیبہ تشریف لا کر حضرت مرثدؓ نے آپ سے نکاح کی اجازت چاہی اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور اس نے مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت کر دی۔^۱

یہ واقعہ مذکورہ بالا آیت کا ”شان نزول“ یا ”سبب نزول“ ہے۔ قرآن کریم کی تفسیر میں ”شان نزول“ نہایت اہمیت کا حامل ہے، بہت سی آیتوں کا مفہوم اس وقت تک صحیح طور سے سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک اُن کا شان نزول معلوم نہ ہو۔

قرآن کریم کے سات حروف اور قراءتیں

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی تلاوت میں آسانی پیدا کرنے کے لئے اُمت محمدیہ (علیٰ صاحبہا السلام) کو ایک سہولت یہ عطا فرمائی ہے کہ اس کے الفاظ کو مختلف طریقوں سے پڑھنے کی اجازت دی ہے، کیونکہ بعض اوقات کسی شخص سے کوئی لفظ ایک طریقہ سے نہیں پڑھا جاتا تو اسے دوسرے طریقہ سے پڑھ سکتا ہے۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ بنو غفار کے تالاب کے پاس تشریف فرما تھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام آ گئے، اور انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ اپنی اُمت کو حکم دیں کہ وہ قرآن کو ایک ہی حرف پر پڑھے، آپ نے فرمایا کہ میں اللہ سے اس کی معافی اور مغفرت طلب کرتا ہوں، میری اُمت میں اس کی طاقت نہیں ہے، پھر جبریل علیہ السلام دوبارہ آپ کے پاس آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی اُمت قرآن کریم کو دو حروف پر پڑھے، آپ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں، میری اُمت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے۔ پھر وہ تیسری بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی اُمت قرآن کریم کو تین حروف پر پڑھے، آپ نے پھر فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت چاہتا ہوں، میری اُمت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے، پھر وہ چوتھی بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی اُمت قرآن کو سات حروف پر پڑھے، پس وہ ان میں سے جس حرف پر پڑھیں گے اُن کی قراءت دُرست ہوگی۔^۲

۱ اسباب النزول للواحدی ص: ۳۸

۲ بحوالہ مناهل العرفان ج: ۱ ص: ۱۳۳

سات حروف سے مراد سات نوعیتیں ہیں

چنانچہ ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ أُنْزِلَ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرَفٍ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ^(۱)

”یہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، پس ان میں سے جو تمہارے لئے آسان ہو اس طریقہ سے پڑھ لو۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں سات حروف سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں۔^(۲) لیکن محقق علماء کے نزدیک اس میں راجح مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی جو قراءتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں، ان میں باہمی فرق و اختلاف کل سات نوعیتوں پر مشتمل ہے، اور وہ سات نوعیتیں یہ ہیں:-

۱- اسماء کا اختلاف: جس میں افراد، تشنیہ، جمع اور تذکیر و تانیث دونوں کا اختلاف داخل ہے، مثلاً ایک قراءت میں تَبَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ (الانعام: ۱۱۵) ہے، اور دوسری قراءت میں تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ۔

۲- افعال کا اختلاف: کہ کسی قراءت میں صیغہ ماضی ہے، کسی میں مضارع اور کسی میں امر، مثلاً ایک قراءت میں رَبَّنَا بَعْدَ بَيْنٍ أَسْفَرْنَا (سبا: ۱۹) ہے، اور دوسری میں رَبَّنَا بَعْدَ بَيْنٍ أَسْفَرْنَا اور تیسری میں رَبَّنَا بَعْدَ بَيْنٍ أَسْفَرْنَا، نیز فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ (السجدة: ۱۷) میں مَنَا أُخْفِيَ کو یاء کے سکون کے ساتھ مضارع واحد متکلم کے صیغے سے اور یاء کے فتح کے ساتھ مَنَا أُخْفِيَ ماضی کے صیغے سے پڑھا گیا ہے۔

۳- وجوہ اعراب کا اختلاف: جس میں اعراب یازیر، زبر، پیش کا فرق پایا جاتا ہے، مثلاً لَا يُضَارُّ كَاتِبٌ (البقرة: ۲۸۲) کی جگہ لَا يُضَارُّ كَاتِبٌ، اور ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ (البروج: ۱۵) کی جگہ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيد۔

۴- الفاظ کی کمی بیشی کا اختلاف: کہ ایک قراءت میں کوئی لفظ کم اور دوسری میں زیادہ ہو، مثلاً ایک قراءت میں تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ اور دوسری میں تَجْرِي تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ۔

۵- تقدیم و تاخیر کا اختلاف: کہ ایک قراءت میں کوئی لفظ مقدم ہے اور دوسری میں مؤخر ہے، مثلاً وَقَتَلُوا وَقُتِلُوا (آل عمران: ۱۹۵) اور وَقَتَلُوا وَقُتِلُوا، نیز فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعَدَّا عَلَيْهِ حَقًّا (التوبة: ۱۱۱) اور فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعَدَّا عَلَيْهِ حَقًّا۔

۶- بدلیت کا اختلاف: کہ ایک قراءت میں ایک لفظ ہے اور دوسری قراءت میں اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ مثلاً

۱ صحیح بخاری مع القسطلانی ج: ۷ ص: ۳۵۳

۲ ان اقوال کی تفصیل اور اس مسئلے کی مبسوط تحقیق کے لئے ملاحظہ فرمائیے ”علوم القرآن“ احقر کی مفصل کتاب - ۱۲

نُشْرُهَا (البقرة: ۲۵۹) اور نُنْشُرْهَا، نِزْ فَتَبَيَّنُوا (الحجرات: ۶) اور فَتَتَبَّنُوا، بِضَنَيْنِ (التكوير: ۲۴) اور بِضَنَيْنِ۔

۷۔ لہجوں کا اختلاف: جس میں تفخیم، ترقیق، امالہ، مد، قصر، ہمز، اظہار اور ادغام وغیرہ کے اختلافات داخل ہیں، یعنی اس میں لفظ تو نہیں بدلتا، لیکن اس کے پڑھنے کا طریقہ بدل جاتا ہے، مثلاً **مُوسٰی** کو ایک قراءت میں مُوسٰی کی طرح پڑھا جاتا ہے۔

بہر حال! اختلاف قراءت کی ان سات نوعیتوں کے تحت بہت سی قراءتیں نازل ہوئی تھیں، اور ان کے باہمی فرق سے معنی میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں ہوتا تھا، صرف تلاوت کی سہولت کے لئے ان کی اجازت دی گئی تھی۔

شروع میں چونکہ لوگ قرآن کریم کے اُسلوب کے پوری طرح عادی نہیں تھے، اس لئے اُن سات اقسام کے دائرے میں بہت سی قراءتوں کی اجازت دے دی گئی تھی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ ہر سال رمضان میں جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم کا دور کیا کرتے تھے، جس سال آپ کی وفات ہوئی، اس سال آپ نے دو مرتبہ دور فرمایا، اس دور کو ”عرضہ اخیرہ“ کہتے ہیں، اس موقع پر بہت سی قراءتیں منسوخ کر دی گئیں، اور صرف وہ قراءتیں باقی رکھی گئیں جو آج تک تواتر کے ساتھ محفوظ چلی آتی ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تلاوت قرآن کے معاملہ میں غلط فہمیاں رفع کرنے کے لئے اپنے عہد خلافت میں قرآن کریم کے سات نسخے تیار کرائے، اور ان سات نسخوں میں تمام قراءتوں کو اس طرح سے جمع فرمایا کہ قرآن کریم کی آیتوں پر نقطے اور زیر، زبر، پیش نہیں ڈالے، تاکہ انہی مذکورہ قراءتوں میں سے جس قراءت کے مطابق چاہیں پڑھ سکیں، اس طرح اکثر قراءتیں اس رسم الخط میں سما گئیں، اور جو قراءتیں رسم الخط میں نہ سما سکیں اُن کو محفوظ رکھنے کا طریقہ آپ نے یہ اختیار فرمایا کہ ایک نسخہ آپ نے ایک قراءت کے مطابق لکھا اور دوسرا دوسری قراءت کے مطابق، اُمت نے ان نسخوں میں جمع شدہ قراءتوں کو یاد رکھنے کا اس قدر اہتمام کیا کہ علم قراءت ایک مستقل علم بن گیا اور سینکڑوں علماء، قراء اور حفاظ نے اس کی حفاظت میں اپنی عمریں خرچ کر دیں۔

قراءت میں قبولیت کا معیار

دراصل ہوا یہ تھا کہ جس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کے سات نسخے مختلف خطوں میں بھیجے تو ان کے ساتھ ایسے قاریوں کو بھی بھیجا تھا جو اُن کی تلاوت سکھا سکیں، چنانچہ یہ قاری حضرات جب مختلف علاقوں میں پہنچے تو انہوں نے اپنی اپنی قراءتوں کے مطابق لوگوں کو قرآن کی تعلیم دی، اور یہ مختلف قراءتیں لوگوں میں پھیل گئیں، اس موقع پر بعض حضرات نے ان مختلف قراءتوں کو یاد کرنے اور دوسروں کو سکھانے ہی کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، اور اس طرح ”علم قراءت“ کی بنیاد پڑ گئی، اور ہر خطے کے لوگ اس علم میں کمال حاصل کرنے کے لئے ائمہ قراءت سے رُجوع

کرنے لگے، کسی نے صرف ایک قراءت یاد کی، کسی نے دو، کسی نے تین، کسی نے سات اور کسی نے اس سے بھی زیادہ، اس سلسلے میں ایک اصولی ضابطہ پوری امت میں مسلم تھا، اور ہر جگہ اسی کے مطابق عمل ہوتا تھا، اور وہ یہ کہ صرف وہ ”قراءت“ قرآن ہونے کی حیثیت سے قبول کی جائے گی جس میں تین شرائط پائی جاتی ہوں:-

۱- مصاحف عثمانی کے رسم الخط میں اس کی گنجائش ہو۔

۲- عربی زبان کے قواعد کے مطابق ہو۔

۳- وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو اور ائمہ رقرأت میں مشہور ہو۔

جس قراءت میں ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو اسے قرآن کا جز نہیں سمجھا جاسکتا، اس طرح متواتر قراءتوں کی ایک بڑی تعداد نسلاً بعد نسل نقل ہوتی رہی، اور سہولت کے لئے ایسا بھی ہوا کہ ایک امام نے ایک یا چند قراءتوں کو اختیار کر کے انہی کی تعلیم دینی شروع کر دی، اور وہ قراءت اُس امام کے نام سے مشہور ہو گئی، پھر علماء نے ان قراءتوں کو جمع کرنے کے لئے کتابیں لکھنا شروع کیں، چنانچہ سب سے پہلے امام ابو عبید قاسم بن سلام، امام ابو حاتم سبستانی، قاضی اسماعیل اور امام ابو جعفر طبری نے اس فن پر کتابیں مرتب کیں جن میں بیس سے زیادہ قراءتیں جمع تھیں، پھر علامہ ابوبکر ابن مجاہد (متوفی ۲۴۲ھ) نے ایک کتاب لکھی، جس میں صرف سات قاریوں کی قراءتیں جمع کی گئی تھیں، اُن کی یہ تصنیف اس قدر مقبول ہوئی کہ یہ سات قراءت کی قراءتیں دوسرے قراء کے مقابلہ میں بہت زیادہ مشہور ہو گئیں، بلکہ بعض لوگ یہ سمجھنے لگے کہ صحیح اور متواتر قراءتیں صرف یہی ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ علامہ ابن مجاہد نے محض اتفاقاً ان سات قراءتوں کو جمع کر دیا تھا، اُن کا منشاء یہ ہرگز نہیں تھا کہ ان کے سوا دوسری قراءتیں غلط یا ناقابل قبول ہیں، علامہ ابن مجاہد کے اس عمل سے دوسری غلط فہمی یہ بھی پیدا ہوئی کہ بعض لوگ ”سبعة احرف“ کا مطلب یہ سمجھنے لگے کہ ان سے یہی سات قراءتیں مراد ہیں، جنہیں ابن مجاہد نے جمع کیا ہے، حالانکہ پیچھے بتایا جا چکا ہے کہ یہ سات قراءتیں صحیح قراءتوں کا محض ایک حصہ ہیں، ورنہ ہر وہ قراءت جو مذکورہ بالا تین شرائط پر پوری اُترتی ہو، صحیح، قابل قبول اور ان سات حروف میں داخل ہے جن پر قرآن کریم نازل ہوا۔

سات قراءت

بہر حال! علامہ ابن مجاہد کے اس عمل سے جو سات قاری سب سے زیادہ مشہور ہوئے وہ یہ ہیں:-

۱- نافع بن عبد الرحمن بن ابی نعیم (متوفی ۱۶۹ھ) آپ نے ستر ایسے تابعین سے استفادہ کیا تھا جو براہ راست حضرت ابی بن کعب، عبد اللہ بن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کے شاگرد تھے، آپ کی قراءت مدینہ طیبہ میں زیادہ مشہور ہوئی اور آپ کے راویوں میں ابو موسیٰ قالون (متوفی ۲۲۰ھ) اور ابو سعید ورش (متوفی ۱۹۷ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

۲- عبد اللہ بن کثیر الداری (متوفی ۱۲۰ھ) آپ نے صحابہ میں سے حضرت انس بن مالک، عبد اللہ بن زبیر اور

ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہم کی زیارت کی تھی، اور آپ کی قراءت مکہ مکرمہ میں زیادہ مشہور ہوئی، اور آپ کی قراءت کے راویوں میں بڑی اور قنبل زیادہ مشہور ہیں۔

۳- ابوعمرو زبان بن العلاء (متوفی ۱۵۴ھ) آپ نے حضرت مجاہد اور سعید بن جبیر کے واسطے سے حضرت ابن عباسؓ اور ابی بن کعبؓ سے روایت کی ہے، اور آپ کی قراءت بصرہ میں کافی مشہور ہوئی، آپ کی قراءت کے راویوں میں ابوعمر الدوری (متوفی ۲۳۶ھ) اور ابو شعیب سوسی (متوفی ۲۶۱ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

۴- عبد اللہ الجھمی، جو ابن عامر کے نام سے معروف ہیں (متوفی ۱۱۸ھ) آپ نے صحابہؓ میں سے حضرت نعمان بن بشیرؓ اور حضرت واثلہ بن اسقعؓ کی زیارت کی تھی، اور قراءت کا فن حضرت مغیرہ بن شہاب مخزومیؓ سے حاصل کیا تھا جو حضرت عثمانؓ کے شاگرد تھے، آپ کی قراءت کا زیادہ رواج شام میں رہا، اور آپ کی قراءت کے راویوں میں ہشامؓ اور ابن ذکوانؓ زیادہ مشہور ہیں۔

۵- حمزہ بن حبیب الزیات مولیٰ عکرمہ بن ربیع التیمی (متوفی ۱۵۶ھ) آپ سلیمان اعمشؓ کے شاگرد ہیں، وہ یحییٰ بن وثابؓ کے، وہ زبیر بن جہیشؓ کے اور انہوں نے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے استفادہ کیا تھا، آپ کے راویوں میں خلف بن ہشام (متوفی ۲۲۹ھ) اور خالد بن خالد (متوفی ۲۲۰ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

۶- عاصم بن ابی النجود الاسدی (متوفی ۱۲۷ھ) آپ زبیر بن جہیشؓ کے واسطے سے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور ابو عبد الرحمن سلمیؓ کے واسطے سے حضرت علیؓ کے شاگرد ہیں، آپ کی قراءت کے راویوں میں شعبہ بن عیاشؓ (متوفی ۱۹۳ھ) اور حفص بن سلیمانؓ (متوفی ۱۸۰ھ) زیادہ مشہور ہیں۔ آج کل عموماً تلاوت انہی حفص بن سلیمانؓ کی روایت کے مطابق ہوتی ہے۔

۷- ابوالحسن علی بن حمزہ الکسائی النخوی (متوفی ۱۸۹ھ) ان کے راویوں میں ابوالحارث مروزیؓ (متوفی ۲۴۰ھ) اور ابوعمر الدوریؓ (جو ابوعمرو کے راوی بھی ہیں) زیادہ مشہور ہیں، مؤخر الذکر تینوں حضرات کی قراءتیں زیادہ تر کوفہ میں رائج ہوئیں۔

دس اور چودہ قراءتیں

لیکن جیسا کہ پیچھے عرض کیا جا چکا ہے ان سات کے علاوہ اور بھی کئی قراءتیں متواتر اور صحیح ہیں، چنانچہ بعد میں جب یہ غلط فہمی پیدا ہونے لگی کہ صحیح قراءتیں ان سات ہی میں منحصر ہیں تو متعدد علماء (مثلاً علامہ شذائیؒ اور ابوبکر بن مہرانؒ) نے سات کے بجائے دس قراءتیں ایک کتاب میں جمع فرمائیں، چنانچہ ”قراءت عشرہ“ کی اصطلاح مشہور ہو گئی، ان دس قراءتوں میں مندرجہ بالا سات قراءت کے علاوہ ان تین حضرات کی قراءتیں بھی شامل کی گئیں:-

۱- ابو جعفر یزید بن القعقاعؓ (متوفی ۱۳۰ھ) جن کی قراءت مدینہ طیبہ میں زیادہ رائج ہوئی۔

- ۲- یعقوب بن اسحاق حضرمیؒ (متوفی ۲۰۵ھ) آپ کی قراءت زیادہ تر بصرہ میں مشہور ہوئی۔
- ۳- خلف بن ہشامؒ (متوفی ۲۲۹ھ) جو حمزہ کی قراءت کے بھی راوی ہیں، آپ کی قراءت کوفہ میں زیادہ رائج تھی۔
- اس کے علاوہ بعض حضرات نے چودہ قاریوں کی قراءتیں جمع کیں اور مذکورہ دس حضرات پر مندرجہ ذیل قراء کی قراءتوں کا اضافہ کیا:-

- ۱- حسن بصریؒ (متوفی ۱۱۰ھ) جن کی قراءت کا مرکز بصرہ تھا۔
- ۲- محمد بن عبد الرحمن ابن مُحَیصِنؒ (متوفی ۱۲۳ھ) جن کا مرکز مکہ مکرمہ میں تھا۔
- ۳- یحییٰ بن مبارک یزیدیؒ (متوفی ۲۰۲ھ) جو بصرہ کے باشندے تھے۔
- ۴- ابوالفرج شنبوذیؒ (متوفی ۳۸۸ھ) جو بغداد کے باشندے تھے۔
- بعض حضرات نے چودہ قاریوں میں حضرت شنبوذیؒ کے بجائے حضرت سلیمان اعمشؒ کا نام شمار کیا ہے، ان میں سے پہلی دس قراءتیں صحیح قول کے مطابق متواتر ہیں، اور ان کے علاوہ شاذ ہیں۔^[۱]

تاریخ حفاظتِ قرآن

عہدِ رسالت میں حفاظتِ قرآن

قرآن کریم چونکہ ایک ہی دفعہ پورا کا پورا نازل نہیں ہوا، بلکہ اس کی مختلف آیات ضرورت اور حالات کی مناسبت سے نازل کی جاتی رہی ہیں، اس لئے عہدِ رسالت میں یہ ممکن نہیں تھا کہ شروع ہی سے اُسے کتابی شکل میں لکھ کر محفوظ کر لیا جائے، چنانچہ ابتدائے اسلام میں قرآن کریم کی حفاظت کے لئے سب سے زیادہ زور حافظہ پر دیا گیا، شروع شروع میں جب وحی نازل ہوتی تو آپ اُس کے الفاظ کو اُسی وقت دُہرانے لگتے تھے، تاکہ وہ اچھی طرح یاد ہو جائیں، اس پر سورہ قیامہ کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہدایت فرمائی کہ قرآن کریم کو یاد رکھنے کے لئے آپ کو عین نزولِ وحی کے وقت جلدی جلدی الفاظ دُہرانے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ خود آپ میں ایسا حافظہ پیدا فرمادے گا کہ ایک مرتبہ نزولِ وحی کے بعد آپ اُسے بھول نہیں سکیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ ادھر آپ پر آیات قرآنی نازل ہوتیں اور ادھر آپ کو یاد ہو جاتیں، اس طرح سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک قرآن کریم کا سب سے زیادہ محفوظ گنجینہ تھا، جس میں کسی ادنیٰ غلطی یا ترمیم و تغیر کا امکان نہیں تھا، پھر آپ مزید احتیاط کے طور پر ہر سال رمضان کے مہینے میں حضرت جبریل علیہ السلام کو قرآن سنایا کرتے تھے، اور جس سال آپ کی وفات ہوئی، اس سال آپ نے دو مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ دور کیا۔^[۲]

پھر آپ صحابہ کرام کو قرآن کریم کے معانی کی تعلیم ہی نہیں دیتے تھے، بلکہ انہیں اس کے الفاظ بھی یاد کراتے تھے، اور خود صحابہ کرام کو قرآن کریم سیکھنے اور اسے یاد رکھنے کا اتنا شوق تھا کہ ہر شخص اس معاملہ میں دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا تھا۔ بعض عورتوں نے اپنے شوہروں سے سوائے اس کے کوئی مہر طلب نہیں کیا کہ وہ انہیں قرآن کریم کی تعلیم دیں گے۔ سینکڑوں صحابہ نے اپنے آپ کو ہر غم ماسوا سے آزاد کر کے اپنی زندگی اسی کام کے لئے وقف کر دی تھی، وہ قرآن کریم کو نہ صرف یاد کرتے بلکہ راتوں کو نماز میں اسے دُہراتے رہتے تھے، حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص ہجرت کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ آتا تو آپ اُسے ہم انصاریوں میں سے کسی کے حوالے فرما دیتے، تاکہ وہ اسے قرآن سکھائے، اور مسجد نبوی میں قرآن سیکھنے سکھانے والوں کی آوازوں کا اتنا شور ہونے لگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تاکید فرمانا پڑی کہ اپنی آوازیں پست کرو، تاکہ کوئی مغالطہ پیش نہ آئے۔^[۱]

چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں صحابہ کرام کی ایک ایسی بڑی جماعت تیار ہو گئی جسے قرآن کریم از بر حفظ تھا، اس جماعت میں خلفائے راشدینؓ کے علاوہ حضرت طلحہؓ، حضرت سعدؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت حذیفہ بن یمانؓ، حضرت سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عمرو بن عاصؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن السائبؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت ام سلمہؓ وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔^[۲]

غرض ابتدائے اسلام میں زیادہ زور حفظ قرآن پر دیا گیا، اور اس وقت کے حالات میں یہی طریقہ زیادہ محفوظ اور قابل اعتماد تھا، اس لئے کہ اس زمانے میں لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی، کتابوں کو شائع کرنے کے لئے پریس وغیرہ کے ذرائع موجود نہ تھے، اس لئے اگر صرف لکھنے پر اعتماد کیا جاتا تو نہ قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہو سکتی، اور نہ اُس کی قابل اعتماد حفاظت، اس کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اہل عرب کو حافظے کی ایسی قوت عطا فرمادی تھی کہ ایک ایک شخص ہزاروں اشعار کا حافظ ہوتا تھا، اور معمولی معمولی دیہاتیوں کو اپنے اور اپنے خاندان ہی کے نہیں، اُن کے گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد ہوتے تھے، اس لئے قرآن کریم کی حفاظت میں اسی قوت حافظہ سے کام لیا گیا، اور اسی کے ذریعہ قرآن کریم کی آیات اور سورتیں عرب کے گوشے گوشے میں پہنچ گئیں۔

کتابتِ وحی

قرآن کریم کو حفظ کرانے کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کو لکھوانے کا بھی خاص اہتمام فرمایا۔ حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ میں آپ کے لئے وحی کی کتابت کرتا تھا، جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کو

سخت گرمی لگتی، اور آپ کے جسم اطہر پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے، پھر جب آپ سے یہ کیفیت ختم ہو جاتی تو میں مونڈھے کی کوئی ہڈی یا (کسی اور چیز کا) ٹکڑا لے کر خدمت میں حاضر ہوتا، آپ لکھواتے رہتے اور میں لکھتا جاتا، یہاں تک کہ جب میں لکھ کر فارغ ہوتا تو قرآن کو نقل کرنے کے بوجھ سے مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میری ٹانگ ٹوٹنے والی ہے، اور میں کبھی چل نہیں سکوں گا۔ بہر حال! جب میں فارغ ہوتا تو آپ فرماتے ”پڑھو!“ میں پڑھ کر سناتا، اگر اس میں کوئی فروگزاشت ہوتی تو آپ اس کی اصلاح فرما دیتے اور پھر اسے لوگوں کے سامنے لے آتے۔^[۱]

حضرت زید بن ثابتؓ کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہؓ کتابتِ وحی کے فرائض انجام دیتے تھے، جن میں خلفائے راشدینؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ، حضرت خالد بن الولیدؓ، حضرت ثابت بن قیسؓ، حضرت ابان بن سعیدؓ وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔^[۲]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپ کا تبِ وحی کو یہ ہدایت بھی فرما دیتے تھے کہ اسے فلاں سورت میں فلاں آیات کے بعد لکھا جائے۔^[۳] اُس زمانے میں چونکہ عرب میں کاغذ کیاب تھا، اس لئے یہ قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سلوں، چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں، درخت کے پتوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں، البتہ کبھی کبھی کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال کئے گئے۔^[۴]

اس طرح عہدِ رسالت میں قرآن کریم کا ایک نسخہ تو وہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں لکھوایا تھا، اگرچہ وہ مرتب کتاب کی شکل میں نہیں تھا، بلکہ متفرق پارچوں کی شکل میں تھا، اس کے ساتھ ہی بعض صحابہ کرامؓ بھی اپنی یادداشت کے لئے آیاتِ قرآنی اپنے پاس لکھ لیتے تھے، اور یہ سلسلہ اسلام کے ابتدائی عہد سے جاری تھا، چنانچہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے پہلے ہی اُن کی بہن اور بہنوئی کے ایک صحیفہ میں آیاتِ قرآنی لکھی ہوئی تھی۔^[۵]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جمع قرآن

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن کریم کے جتنے نسخے لکھے گئے تھے اُن کی کیفیت یہ تھی کہ یا تو وہ متفرق اشیاء پر لکھے ہوئے تھے، کوئی آیت چمڑے پر، کوئی درخت کے پتے پر، کوئی ہڈی پر، یا وہ مکمل نسخے نہیں تھے، کسی صحابیؓ کے پاس ایک سورت لکھی ہوئی تھی، کسی کے پاس دس پانچ سورتیں اور کسی کے پاس صرف چند آیات، اور بعض صحابہؓ کے پاس آیات کے ساتھ تفسیری جملے بھی لکھے ہوئے تھے۔

[۲] تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری ج: ۹ ص: ۱۸ اور زاد المعاد ج: ۱ ص: ۳۰۔

[۱] مجمع الزوائد ج: ۱ ص: ۱۵۶ بحوالہ طبرانی۔

[۵] سیرت ابن ہشام۔

[۳] ایضاً ج: ۹ ص: ۱۱۔

[۴] فتح الباری ج: ۹ ص: ۱۸۔

اس بناء پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہ ضروری سمجھا کہ قرآن کریم کے ان منتشر حصوں کو یکجا کر کے محفوظ کر دیا جائے، انہوں نے یہ کارنامہ جن محرکات کے تحت اور جس طرح انجام دیا، اس کی تفصیل حضرت زید بن ثابتؓ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جنگ یمامہ کے فوراً بعد حضرت ابو بکرؓ نے ایک روز مجھے پیغام بھیج کر بلوایا، میں ان کے پاس پہنچا تو وہاں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، حضرت ابو بکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ ”عمر نے ابھی آ کر مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ جنگ یمامہ میں قرآن کریم کے حفاظ کی ایک بڑی جماعت شہید ہو گئی، اور اگر مختلف مقامات پر قرآن کریم کے حافظ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ ناپید نہ ہو جائے، لہذا میری رائے یہ ہے کہ آپ اپنے حکم سے قرآن کریم کو جمع کروانے کا کام شروع کر دیں۔ میں نے عمر سے کہا کہ جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ ہم کیسے کریں۔

عمر نے جواب دیا کہ اللہ کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد عمر مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے یہاں تک کہ مجھے بھی اس پر شرح صدر ہو گیا اور اب میری رائے بھی وہی ہے جو عمر کی ہے۔“ اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ ”تم نو جوان اور سمجھ دار آدمی ہو، ہمیں تمہارے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں ہے، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کتابت وحی کا کام بھی کرتے رہے ہو لہذا تم قرآن کریم کی آیتوں کو تلاش کر کے انہیں جمع کرو۔“

حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ ”اللہ کی قسم! اگر یہ حضرات مجھے کوئی پہاڑ ڈھونے کا حکم دیتے تو مجھ پر اس کا اتنا بوجھ نہ ہوتا جتنا جمع قرآن کے کام کا ہوا، میں نے اُن سے کہا کہ آپ وہ کام کیسے کر رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا؟“ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ ”اللہ کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے۔“ اس کے بعد حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ اسی کے لئے کھول دیا جو حضرت ابو بکر و عمر کی رائے تھی، چنانچہ میں نے قرآنی آیات کو تلاش کرنا شروع کیا، اور کھجور کی شاخوں، پتھر کی تختیوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآن کریم کو جمع کیا۔

جمع قرآن کے سلسلے میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا طریق کار

اس موقع پر جمع قرآن کے سلسلے میں حضرت زید بن ثابتؓ کے طریق کار کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے، جیسا کہ پیچھے ذکر آچکا ہے، وہ خود حافظ قرآن تھے، لہذا وہ اپنی یادداشت سے پورا قرآن لکھ سکتے تھے، اُن کے علاوہ بھی سینکڑوں حفاظ اُس وقت موجود تھے، اُن کی ایک جماعت بنا کر بھی قرآن کریم لکھا جاسکتا تھا۔

نیز قرآن کریم کے جو نسخے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لکھے گئے تھے، حضرت زیدؓ ان سے بھی قرآن کریم نقل فرما سکتے تھے، لیکن انہوں نے احتیاط کے پیش نظر صرف کسی ایک طریقہ پر بس نہیں کیا، بلکہ ان تمام ذرائع سے بیک وقت کام لے کر اس وقت تک کوئی آیت اپنے صحیفوں میں درج نہیں کی جب تک اس کے متواتر ہونے کی تحریری اور زبانی شہادتیں نہیں مل گئیں، اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی جو آیات اپنی نگرانی میں لکھوائی تھیں، وہ مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں، حضرت زیدؓ نے انہیں یکجا فرمایا تاکہ نیا نسخہ ان سے ہی نقل کیا جائے، چنانچہ یہ اعلان عام کر دیا گیا کہ جس شخص کے پاس قرآن کریم کی جتنی آیات لکھی ہوئی موجود ہوں وہ حضرت زیدؓ کے پاس لے آئے، اور جب کوئی شخص اُن کے پاس قرآن کریم کی کوئی لکھی ہوئی آیت لے کر آتا تو وہ مندرجہ ذیل چار طریقوں سے اس کی تصدیق کرتے تھے:-

۱- سب سے پہلے اپنی یادداشت سے اس کی توثیق کرتے۔

۲- پھر حضرت عمرؓ بھی حافظ قرآن تھے، اور روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے اُن کو بھی اس کام میں حضرت زیدؓ کے ساتھ لگا دیا تھا، اور جب کوئی شخص کوئی آیت لے کر آتا تھا تو حضرت زیدؓ اور حضرت عمرؓ دونوں مشترک طور پر اسے وصول کرتے تھے۔

۳- کوئی لکھی ہوئی آیت اُس وقت تک قبول نہیں کی جاتی تھی جب تک دو قابل اعتماد گواہوں نے اس بات کی گواہی نہ دے دی ہو کہ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھی۔

۴- اس کے بعد ان لکھی ہوئی آیتوں کا اُن مجموعوں کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا تھا جو مختلف صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جمع قرآن کا یہ طریق کار ذہن میں رہے تو حضرت زید بن ثابتؓ کے اس ارشاد کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آ سکتا ہے کہ ”سورۃ براءۃ کی آخری آیات لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ الْغَا (التوبة: ۱۲۸) مجھے صرف حضرت ابو خزیمہؓ کے پاس ملیں، ان کے سوا کسی اور کے پاس نہیں ملیں۔“ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ یہ آیتیں سوائے حضرت ابو خزیمہؓ کے کسی اور کو یاد نہیں تھیں، یا کسی اور کے پاس لکھی ہوئی نہ تھیں، اور اُن کے سوا کسی کو ان کا جزء قرآن ہونا معلوم نہ تھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھوائی ہوئی متفرق آیتیں لے لے کر آرہے تھے اُن میں سے یہ آیتیں سوائے حضرت ابو خزیمہؓ کے کسی کے پاس نہیں ملیں، ورنہ جہاں تک ان آیات کے جزو قرآن ہونے کا تعلق ہے یہ بات تواتر کے ساتھ سب کو معلوم تھی، کیونکہ سینکڑوں صحابہؓ کو یاد بھی تھی، اور جن حضرات کے

پاس آیات قرآنی کے مکمل مجموعے تھے اُن کے پاس لکھی ہوئی بھی تھیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں الگ لکھی ہوئی صرف حضرت ابو خزیمہؓ کے پاس ملیں، کسی اور کے پاس نہیں۔^۱

”اُم“ کی خصوصیات

بہر کیف! حضرت زید بن ثابتؓ نے اس زبردست احتیاط کے ساتھ آیات قرآنی کو جمع کر کے انہیں کاغذ کے صحیفوں پر مرتب شکل میں تحریر فرمایا۔^۲ لیکن ہر سورت علیحدہ صحیفے میں لکھی گئی، اس لئے یہ نسخہ بہت سے صحیفوں پر مشتمل تھا، اصطلاح میں اس نسخے کو ”اُم“ کہا جاتا ہے، اور اس کی خصوصیات یہ تھیں:-

۱- اس نسخہ میں آیات قرآنی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق مرتب تھیں، لیکن سورتیں مرتب نہیں تھیں، بلکہ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی۔^۳

۲- اس نسخہ میں قرآن کے ساتوں حروف (جن کی تشریح پیچھے آچکی ہے) جمع تھے۔^۴

۳- اس میں وہ تمام آیتیں جمع کی گئی تھیں جن کی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی تھی۔

۴- اس نسخہ کو لکھوانے کا مقصد یہ تھا کہ ایک مرتب نسخہ تمام اُمت کی اجماعی تصدیق کے ساتھ تیار ہو جائے، تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی طرف رجوع کیا جاسکے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لکھوائے ہوئے یہ صحیفے آپ کی حیات میں آپ کے پاس رہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس رہے، حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد انہیں اُم المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس منتقل کر دیا گیا، پھر حضرت حفصہؓ کی وفات کے بعد مروان بن الحکمؓ نے اسے اس خیال سے نذر آتش کر دیا کہ اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے تیار کرائے ہوئے مصاحف تیار ہو چکے تھے اور اس بات پر اُمت کا اجماع منعقد ہو چکا تھا کہ رسم الخط اور سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے ان مصاحف کی پیروی لازم ہے، مروان بن الحکم نے سوچا کہ اب کوئی ایسا نسخہ باقی نہ رہنا چاہئے جو اس رسم الخط اور ترتیب کے خلاف ہو۔^۵

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں جمع قرآن

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اسلام عرب سے نکل کر روم اور ایران کے دُور دراز علاقوں تک پہنچ چکا تھا، ہر نئے علاقے کے لوگ جب مسلمان ہوتے تو وہ ان مجاہدین اسلام یا اُن تاجروں سے قرآن کریم سیکھتے جن کی بدولت

[۳] إتيان، خوالہ بالا۔

[۲] إتيان ج: ۱ ص: ۶۰۔

[۱] البرهان ج: ۱ ص: ۲۳۲ و ۲۳۵۔

[۵] فتح الباری ج: ۹ ص: ۱۶۔

[۴] مناهل العرفان ج: ۱ ص: ۲۳۶، وتاريخ القرآن للكردي ص: ۲۸۔

انہیں اسلام کی نعمت حاصل ہوئی تھی، ادھر آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا تھا، اور مختلف صحابہ کرام نے اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف قراءتوں کے مطابق سیکھا تھا، اس لئے ہر صحابی نے اپنے شاگردوں کو اسی قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا، جس کے مطابق خود انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا تھا، اس طرح قراءتوں کا یہ اختلاف دُور دراز ممالک تک پہنچ گیا، جب تک لوگ اس حقیقت سے واقف تھے کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، اُس وقت تک اس اختلاف سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی، لیکن جب یہ اختلاف دُور دراز ممالک میں پہنچا اور یہ بات اُن میں پوری طرح مشہور نہ ہو سکی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، تو اس وقت لوگوں میں جھگڑے پیش آنے لگے، بعض لوگ اپنی قراءت کو صحیح اور دُوسرے کی قراءت کو غلط قرار دینے لگے، ان جھگڑوں سے ایک طرف تو یہ خطرہ تھا کہ لوگ قرآن کریم کی متواتر قراءتوں کو غلط قرار دینے کی سنگین غلطی میں مبتلا ہوں گے، دُوسرے سوائے حضرت زیدؓ کے لکھے ہوئے ایک نسخہ کے جو مدینہ طیبہ میں موجود تھا، پورے عالم اسلام میں کوئی ایسا معیاری نسخہ موجود نہ تھا جو پوری اُمت کے لئے حجت بن سکے، کیونکہ دُوسرے نسخے انفرادی طور پر لکھے ہوئے تھے، اور ان میں ساتوں حروف کو جمع کرنے کا کوئی اہتمام نہیں تھا، اس لئے ان جھگڑوں کے تصفیہ کی قابلِ اعتماد صورت یہی تھی کہ ایسے نسخے پورے عالم اسلام میں پھیلا دیئے جائیں، جن میں ساتوں حروف جمع ہوں اور انہیں دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ کونسی قراءت صحیح اور کونسی غلط ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں یہی عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔

اس کارنامے کی تفصیل روایاتِ حدیث سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ آرمینیا اور آذربائیجان کے محاذ پر جہاد میں مشغول تھے، وہاں انہوں نے دیکھا کہ لوگوں میں قرآن کریم کی قراءتوں کے بارے میں اختلاف ہو رہا ہے، چنانچہ مدینہ طیبہ واپس آتے ہی وہ سیدھے حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے اور جا کر عرض کیا کہ امیر المؤمنین! قبل اس کے کہ یہ اُمت اللہ کی کتاب کے بارے میں یہود و نصاریٰ کی طرح اختلافات کی شکار ہو، آپ اس کا علاج کیجئے۔ حضرت عثمانؓ نے پوچھا بات کیا ہے؟ حضرت حذیفہؓ نے جواب میں کہا کہ میں آرمینیا کے محاذ پر جہاد میں شامل تھا، وہاں میں نے دیکھا کہ شام کے لوگ اُبی بن کعبؓ کی قراءت پڑھتے ہیں، جو اہل عراق نے نہیں سنی ہوتی، اور اہل عراق عبد اللہ بن مسعودؓ کی قراءت پڑھتے ہیں جو اہل شام نے نہیں سنی ہوتی، اس کے نتیجے میں ایک دُوسرے کو کافر قرار دے رہے ہیں۔

حضرت عثمانؓ خود بھی اس خطرے کا احساس پہلے ہی کر چکے تھے، انہیں یہ اطلاع ملی تھی کہ خود مدینہ طیبہ میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ قرآن کریم کے ایک معلم نے اپنے شاگردوں کو ایک قراءت کے مطابق قرآن پڑھایا، اور دُوسرے معلم نے دُوسری قراءت کے مطابق، اس طرح مختلف اساتذہ کے شاگرد جب باہم ملتے تو ان میں اختلاف ہوتا، اور بعض مرتبہ یہ اختلاف اساتذہ تک پہنچ جاتا، اور وہ بھی ایک دُوسرے کی قراءت کو غلط قرار دیتے، جب حضرت حذیفہ بن

یمانؓ نے بھی اس خطرے کی طرف توجہ دلائی تو حضرت عثمانؓ نے جلیل القدر صحابہؓ کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا اور فرمایا کہ ”مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ بعض لوگ ایک دوسرے سے اس قسم کی باتیں کہتے ہیں کہ میری قراءت تمہاری قراءت سے بہتر ہے، اور بات کفر کی حد تک پہنچ سکتی ہے، لہذا آپ لوگوں کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟“ صحابہؓ نے خود حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ ”آپ نے کیا سوچا ہے؟“ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ ”میری رائے یہ ہے کہ ہم تمام لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دیں تاکہ کوئی اختلاف اور افتراق پیش نہ آئے“ صحابہؓ نے اس رائے کو پسند کر کے حضرت عثمانؓ کی تائید فرمائی۔

چنانچہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا، اور اس میں فرمایا کہ تم لوگ مدینہ طیبہ میں میرے قریب ہوتے ہوئے قرآن کریم کی قراءتوں کے بارے میں ایک دوسرے کی تکذیب اور ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہو، اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ مجھ سے دور ہیں وہ تو اور بھی زیادہ تکذیب اور اختلاف کرتے ہوں گے، لہذا تمام لوگ مل کر قرآن کریم کا ایسا نسخہ تیار کریں جو سب کے لئے واجب الاقتداء ہو۔

اس غرض کے لئے حضرت عثمانؓ نے حضرت حصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ کے پاس (حضرت ابوبکرؓ کے تیار کرائے ہوئے) جو صحیفے موجود ہیں وہ ہمارے پاس بھیج دیجئے، ہم اُن کو مصاحف میں نقل کر کے آپ کو واپس کر دیں گے۔ حضرت حصہؓ نے وہ صحیفے حضرت عثمانؓ کے پاس بھیج دیئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چار صحابہؓ کی ایک جماعت بنائی، جو حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سعید بن العاصؓ اور حضرت عبدالرحمن بن حارث بن ہشامؓ پر مشتمل تھی، اس جماعت کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے صحیفوں سے نقل کر کے کئی ایسے مصاحف تیار کرے جن میں سورتیں بھی مرتب ہوں، ان چار صحابہؓ میں سے حضرت زیدؓ انصاری تھے، اور باقی تینوں حضرات قریشی، اسی لئے حضرت عثمانؓ نے ان سے فرمایا کہ ”جب تمہارا اور زیدؓ کا قرآن کے کسی حصہ میں اختلاف ہو (یعنی اس میں اختلاف ہو کہ کونسا لفظ کس طرح لکھا جائے؟) تو اسے قریش کی زبان کے مطابق لکھنا، اس لئے کہ قرآن کریم انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔“

بنیادی طور پر تو یہ کام مذکورہ چار حضرات ہی کے سپرد کیا گیا تھا، لیکن پھر دوسرے صحابہؓ کو بھی ان کی مدد کے لئے ساتھ لگادیا گیا، ان حضرات نے کتابت قرآن کے سلسلے میں مندرجہ ذیل کام انجام دیئے:-

- ۱- حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جو نسخہ تیار ہوا تھا اس میں سورتیں مرتب نہیں تھیں، بلکہ ہر سورت الگ لکھی ہوئی تھی، ان حضرات نے تمام سورتوں کو ترتیب کے ساتھ ایک ہی مصحف میں لکھا۔^[۲]
- ۲- قرآن کریم کی آیات اس طرح لکھیں کہ ان کے رسم الخط میں تمام متواتر قراءتیں سما جائیں، اسی لئے اُن پر نہ نقطے

لگائے گئے اور نہ حرکات (زیر، زبر، پیش) تاکہ اسے تمام متواتر قراءتوں کے مطابق پڑھا جاسکے، مثلاً **نَسْرُهَا** لکھا تاکہ اسے **نَسْرُهَا** اور **نُسْرُهَا** دونوں طرح پڑھا جاسکے کیونکہ یہ دونوں قراءتیں درست ہیں۔^[۱]

۳- اب تک قرآن کریم کا مکمل معیاری نسخہ جو پوری اُمت کی اجتماعی تصدیق سے تیار کیا گیا ہو صرف ایک تھا، ان حضرات نے اس نئے مرتب مصحف کی ایک سے زائد نقلیں تیار کیں، عام طور سے مشہور یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے پانچ مصاحف تیار کرائے تھے، لیکن ابو حاتم بھتانیؒ کا ارشاد ہے کہ کل سات نسخے تیار کئے گئے تھے، جن میں سے ایک مکہ مکرمہ، ایک شام، ایک یمن، ایک بحرین، ایک بصرہ اور ایک کوفہ بھیج دیا گیا، اور ایک مدینہ طیبہ میں محفوظ رکھا گیا۔^[۲]

۴- مذکورہ بالا کام کرنے کے لئے ان حضرات نے بنیادی طور پر تو انہی صحیفوں کو سامنے رکھا جو حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں لکھے گئے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی مزید احتیاط کے لئے وہی طریق کار اختیار کیا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اختیار کیا گیا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی جو متفرق تحریریں مختلف صحابہؓ کے پاس محفوظ تھیں انہیں دوبارہ طلب کیا گیا اور ان کے ساتھ اُسر نو مقابلہ کر کے یہ نسخے تیار کئے گئے، اس مرتبہ سورہ احزاب کی ایک آیت نمبر ۲۳ **مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ** علیحدہ لکھی ہوئی صرف حضرت خزیمہ بن ثابت انصاریؓ کے پاس ملی۔ پیچھے ہم لکھ چکے ہیں کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ آیت کسی اور شخص کو یاد نہیں تھی، کیونکہ حضرت زیدؓ خود فرماتے ہیں کہ: ”مصحف لکھتے وقت سورہ احزاب کی وہ آیت نہ ملی جو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا۔“ اس سے صاف واضح ہے کہ یہ آیت حضرت زیدؓ اور دوسرے صحابہؓ کو اچھی طرح یاد تھی، اسی طرح اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ یہ آیت کہیں اور لکھی ہوئی نہ تھی، کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں جو صحیفے لکھے گئے ظاہر ہے کہ یہ آیت اُن میں موجود تھی، نیز دوسرے صحابہؓ کے پاس قرآن کریم کے جو انفرادی طور پر لکھے ہوئے نسخے موجود تھے ان میں یہ آیت بھی شامل تھی، لیکن چونکہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے کی طرح اس مرتبہ بھی اُن تمام متفرق تحریروں کو جمع کیا گیا تھا جو صحابہ کرامؓ کے پاس لکھی ہوئی تھیں اس لئے حضرت زیدؓ وغیرہ نے کوئی آیت ان مصاحف میں اُس وقت تک نہیں لکھی جب تک اُن تحریروں میں بھی وہ نہ مل گئی، اس طرح دوسری آیتیں تو متعدد صحابہؓ کے پاس علیحدہ لکھی ہوئی بھی ملیں، لیکن سورہ احزاب کی یہ آیت سوائے حضرت خزیمہؓ کے کسی اور کے پاس الگ لکھی ہوئی دستیاب نہیں ہوئی۔

۵- قرآن کریم کے یہ متعدد معیاری نسخے تیار فرمانے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ تمام انفرادی نسخے نذر آتش فرمادیئے جو مختلف صحابہؓ کے پاس موجود تھے تاکہ رسم الخط، مسئلہ قراءتوں کے اجتماع اور سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے تمام مصاحف یکساں ہو جائیں، اور ان میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس کارنامے کو پوری اُمت نے بہ نظرِ استحسان دیکھا، اور تمام صحابہؓ نے اس کام میں اُن کی تائید اور حمایت فرمائی، صرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اس معاملہ میں کچھ رنجش رہی جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، حضرت علیؓ فرماتے ہیں:-

”عثمان کے بارے میں کوئی بات اُن کی بھلائی کے سوانہ کہو، کیونکہ اللہ کی قسم! انہوں نے مصاحف کے معاملہ میں جو کام کیا وہ ہم سب کی موجودگی میں مشورے سے کیا۔“^[۲]

تلاوت میں آسانی پیدا کرنے کے اقدامات

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا کارنامے کے بعد اُمت کا اس پر اجماع ہو گیا کہ قرآن کریم کو رسم عثمانی کے خلاف کسی اور طریقے سے لکھنا جائز نہیں، چنانچہ اس کے بعد تمام مصاحف اسی طریقے کے مطابق لکھے گئے، اور صحابہؓ و تابعینؓ نے مصاحف عثمانی کی نقول تیار کر کر کے قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی۔

لیکن ابھی تک قرآن کریم کے نسخے چونکہ نقطوں اور زیر، پیش سے خالی تھے، اس لئے اہلِ عجم کو ان کی تلاوت میں دشواری ہوتی تھی، چنانچہ جب اسلام عجمی ممالک میں اور زیادہ پھیلا تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس میں نقطوں اور حرکات کا اضافہ کیا جائے، تاکہ تمام لوگ آسانی سے اس کی تلاوت کر سکیں، اس مقصد کے لئے مختلف اقدامات کئے گئے، جن کی مختصر تاریخ درج ذیل ہے:

نقطے

اہلِ عرب میں ابتداءً حروف پر نقطے لگانے کا رواج نہیں تھا، پڑھنے والے اس طرز کے اتنے عادی تھے کہ انہیں بغیر نقطوں کی تحریر پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی اور سیاق و سباق کی مدد سے مشتبہ حروف میں امتیاز بھی بہ آسانی ہو جاتا تھا، خاص طور سے قرآن کریم کے معاملے میں کسی اشتباہ کا امکان اس لئے نہیں تھا کہ اس کی حفاظت کا مدار کتابت پر نہیں، بلکہ حافظوں پر تھا، اور حضرت عثمانؓ نے جو نسخے عالم اسلام کے مختلف حصوں میں بھیجے تھے ان کے ساتھ قاری بھی بھیجے گئے تھے، جو اُسے پڑھنا سکھا سکیں۔

اس میں روایات مختلف ہیں کہ قرآن کریم کے نسخے پر سب سے پہلے کس نے نقطے ڈالے؟ بعض روایتیں یہ کہتی ہیں کہ یہ کارنامہ سب سے پہلے حضرت ابوالاسود دؤلیؓ نے انجام دیا،^[۳] بعض کا کہنا ہے کہ انہوں نے یہ کام حضرت علیؓ کی تلقین

[۱] اس کی تفصیل کے لئے احقر کی مفصل کتاب ”علوم القرآن“ ملاحظہ فرمائیے۔

[۲] فتح الباری ج: ۹ ص: ۱۵۰

[۳] البرہان ج: ۱ ص: ۲۵۰

کے تحت کیا، اور بعض نے کہا ہے کہ کوفہ کے گورنر زیاد بن ابی سفیان نے ان سے یہ کام کرایا، اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ کارنامہ حجاج بن یوسف نے حسن بصری، یحییٰ بن یعر اور نصر بن عاصم لیثی کے ذریعہ انجام دیا۔^۲

حرکات

نقطوں کی طرح شروع میں قرآن کریم پر حرکات (زیر، زبر، پیش) بھی نہیں تھیں، اور اس میں بھی روایات کا بڑا اختلاف ہے کہ سب سے پہلے کس نے حرکات لگائیں؟ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ کام سب سے پہلے ابوالاسود دؤلی نے انجام دیا، بعض کہتے ہیں کہ یہ کام حجاج بن یوسف نے یحییٰ بن یعر اور نصر بن عاصم لیثی سے کرایا۔^۳

اس سلسلے میں تمام روایات کو پیش نظر رکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حرکات سب سے پہلے ابوالاسود دؤلی نے وضع کیں، لیکن یہ حرکات اُس طرح کی نہ تھیں جیسی آج کل رائج ہیں، بلکہ زبر کے لئے حرف کے اوپر ایک نقطہ ”ـ“، زیر کے لئے حرف کے نیچے ایک نقطہ ”ـ“، اور پیش کے لئے حرف کے سامنے ایک نقطہ ”ـ“، اور تنوین کے لئے دو نقطے ”ـ“، ”ـ“ یا ”ـ“ یا ”ـ“ مقرر کئے گئے۔ بعد میں خلیل بن احمد نے ہمزہ اور تشدید کی علامتیں وضع کیں۔ اس کے بعد حجاج بن یوسف نے یحییٰ بن یعر، نصر بن عاصم لیثی اور حسن بصری رحمہم اللہ سے بیک وقت قرآن کریم پر نقطے اور حرکات دونوں لگانے کی فرمائش کی، اس موقع پر حرکات کے اظہار کے لئے نقطوں کے بجائے زیر، زبر، پیش کی موجودہ صورتیں مقرر کی گئیں، تاکہ حروف کے ذاتی نقطوں سے اُن کا التباس پیش نہ آئے، واللہ سبحانہ اعلم۔

احزاب یا منزلیں

صحابہؓ اور تابعینؓ کا معمول تھا کہ وہ ہر ہفتے ایک قرآن ختم کر لیتے تھے، اس مقصد کے لئے انہوں نے روزانہ تلاوت کی ایک مقدار مقرر کی ہوئی تھی جسے ”حزب“ یا ”منزل“ کہا جاتا ہے، اس طرح پورے قرآن کو کل سات احزاب پر تقسیم کیا گیا تھا۔^۵

اجزاء یا پارے

آج کل قرآن کریم تیس اجزاء پر منقسم ہے، جنہیں تیس پارے کہا جاتا ہے، یہ پاروں کی تقسیم معنی کے اعتبار سے نہیں، بلکہ بچوں کو پڑھانے کے لئے آسانی کے خیال سے تیس مساوی حصوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے، چنانچہ بعض اوقات بالکل

[۳] قرطبی ج: ۱ ص: ۶۳

[۴] تفسیر القرطبی ج: ۱ ص: ۶۳

[۱] صہم الأعشی ج: ۳ ص: ۱۵۵

[۵] البرہان ج: ۱ ص: ۲۵۰

[۲] صہم الأعشی ج: ۳ ص: ۱۶۰ و ۱۶۱

ادھوری بات پر پارہ ختم ہو جاتا ہے۔ یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ تیس پاروں کی تقسیم کس نے کی ہے؟ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت عثمانؓ نے مصاحف نقل کراتے وقت انہیں تیس مختلف صحیفوں میں لکھوایا تھا، لہذا یہ تقسیم آپ ہی کے زمانہ کی ہے، لیکن متقدمین کی کتابوں میں اس کی کوئی دلیل احقر کو نہیں مل سکی، البتہ علامہ بدرالدین زرکشیؒ نے لکھا ہے کہ قرآن کے تیس پارے مشہور چلے آتے ہیں اور مدارس کے قرآنی نسخوں میں اُن کا رواج ہے۔^[۱] بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقسیم عہد صحابہؓ کے بعد تعلیم کی سہولت کے لئے کی گئی ہے، واللہ اعلم۔

انحاس اور اعشار

قرونِ اولیٰ کے قرآنی نسخوں میں ایک اور علامت کا رواج تھا، اور وہ یہ کہ ہر پانچ آیتوں کے بعد (حاشیہ پر) لفظ ”خمس“ یا ”خ“ اور ہر دس آیتوں کے بعد لفظ ”عشر“ یا ”ع“ لکھ دیتے تھے۔ پہلی قسم کی علامتوں کو ”انحاس“ اور دوسری قسم کی علامتوں کو ”اعشار“ کہا جاتا تھا۔^[۲] علمائے متقدمین میں یہ اختلاف بھی رہا ہے کہ بعض حضرات ان علامتوں کو جائز اور بعض مکروہ سمجھتے تھے، یقینی طور سے یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ یہ علامتیں سب سے پہلے کس نے لگائیں؟ ایک قول یہ ہے کہ اس کا موجد حجاج بن یوسف تھا، اور دوسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے عباسی خلیفہ مأمون نے اس کا حکم دیا تھا۔^[۳] لیکن یہ دونوں اقوال اس لئے درست معلوم نہیں ہوتے کہ خود صحابہؓ کے زمانے میں ”اعشار“ کا تصور ملتا ہے، چنانچہ حضرت مسروقؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مصحف میں ”اعشار“ کا نشان ڈالنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔^[۴]

رُکوع

”انحاس“ اور ”اعشار“ کی علامتیں تو بعد میں متروک ہو گئیں، لیکن ایک اور علامت جو آج تک رائج چلی آتی ہے، رُکوع کی علامت ہے، اور اس کی تعیین قرآن کریم کے مضامین کے لحاظ سے کی گئی ہے، یعنی جہاں ایک سلسلہ کلام ختم ہو وہاں رُکوع کی علامت (حاشیہ پر حرف ع) بنا دی گئی، احقر کو جستجو کے باوجود مستند طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ رُکوع کی ابتدا کس نے اور کس دور میں کی؟ البتہ یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ اس علامت کا مقصد آیات کی ایسی متوسط مقدار کی تعیین ہے جو ایک رکعت میں پڑھی جاسکے، اور اس کو ”رُکوع“ اسی لئے کہتے ہیں کہ نماز میں اس جگہ پہنچ کر رُکوع کیا جائے۔

[۱] البرہان ج: ۱ ص: ۲۵۰ و مناهل العرفان ج: ۱ ص: ۴۰۲

[۲] مناهل العرفان ج: ۱ ص: ۴۰۳

[۳] البرہان ج: ۱ ص: ۲۵۱

[۴] مصنف ابن ابی شیبہ ج: ۲ ص: ۴۹۷

پورے قرآن میں ۵۴۰ رکوع ہیں، اس طرح اگر تراویح کی ہر رکعت میں ایک رکوع پڑھا جائے، تو ستائیسویں شب میں قرآن کریم ختم ہو سکتا ہے۔^۲

رُمُوزِ اَوْقَاف

تلاوت اور تجوید کی سہولت کے لئے ایک اور مفید کام یہ کیا گیا کہ مختلف قرآنی جملوں پر ایسے اشارے لکھ دیئے گئے جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ اس جگہ وقف کرنا (سانس لینا) کیسا ہے؟ ان اشارات کو ”رُمُوزِ اَوْقَاف“ کہتے ہیں، اور ان کا مقصد یہ ہے کہ ایک غیر عربی داں انسان بھی جب تلاوت کرے تو صحیح مقام پر وقف کر سکے، اور غلط جگہ سانس توڑنے سے معنی میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو، ان میں سے اکثر رُمُوز سب سے پہلے علامہ ابو عبد اللہ محمد بن طیفور سجاوندی رحمۃ اللہ علیہ نے وضع فرمائے۔^۳ ان رُمُوز کی تفصیل یہ ہے:-

ط یہ ”وقفِ مطلق“ کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں بات پوری ہو گئی ہے، اس لئے یہاں وقف کرنا بہتر ہے۔

ج یہ ”وقفِ جائز“ کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں وقف کرنا جائز ہے۔

ز یہ ”وقفِ مجوز“ کا مخفف ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وقف کرنا درست تو ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ وقف نہ کیا جائے۔

ص یہ ”وقفِ مرخص“ کا مخفف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس جگہ بات تو پوری نہیں ہوئی، لیکن جملہ چونکہ طویل ہو گیا ہے، اس لئے سانس لینے کے لئے دوسرے مقامات کے بجائے یہاں وقف کرنا چاہئے۔^۴

م یہ ”وقفِ لازم“ کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف نہ کیا جائے تو آیت کے معنی میں فحش غلطی کا امکان ہے، لہذا یہاں وقف کرنا زیادہ بہتر ہے۔ بعض حضرات اسے وقف واجب بھی کہتے ہیں، لیکن اس سے مراد فقہی واجب نہیں جس کے ترک سے گناہ ہو، بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ تمام اوقاف میں اس جگہ وقف کرنا سب سے زیادہ بہتر ہے۔^۵

[۱] فتاویٰ عالمگیریہ میں مشائخ بخارا کے حوالے سے رکوعات کی تعداد ۵۴۰ ہی بیان کی گئی ہے، لیکن جب ہم نے قرآن کریم کے مروّجہ نسخوں میں خود گنتی کی تو رکوعات کی تعداد ۵۵۸ پائی، اور بعض اصحاب نے ہمیں خط میں لکھا کہ ان کی گنتی کے مطابق رکوعات کی کل تعداد ۵۶۷ ہے، ہو سکتا ہے کہ رکوع کی علامات لگانے میں بھی مختلف نسخوں میں کچھ اختلاف رہا ہو۔ واللہ اعلم (ازناشر ۱۲/۱۲/۱۴۰۱ھ)

[۳] النشر فی القراءات العشر ج: ۱ ص: ۲۲۵۔

[۲] فتاویٰ عالمگیریہ، فصل فی التراویح ج: ۱ ص: ۱۱۸۔

[۵] النشر ج: ۱ ص: ۲۳۱۔

[۴] المنہم الفکرية ص: ۶۳۔

لا

یہ ”لَا تَقِفْ“ کا مخفف ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ”یہاں نہ ٹھہرو“ لیکن اس کا منشاء یہ نہیں کہ یہاں وقف کرنا ناجائز ہے، بلکہ اس میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں وقف کرنے میں کوئی حرج نہیں، اور اس کے بعد والے لفظ سے ابتدا کرنا بھی جائز ہے، لہذا اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں وقف کیا جائے تو بہتر یہ ہے کہ اسے دوبارہ لوٹا کر پڑھا جائے، اگلے لفظ سے ابتدا کرنا مستحسن نہیں۔^۱

ان رموز کے بارے میں تو یقینی طور پر ثابت ہے کہ یہ علامہ سجاوندی کے وضع کئے ہوئے ہیں، ان کے علاوہ بھی بعض رموز قرآن کریم کے نسخوں میں موجود ہیں، مثلاً:-

مع

یہ ”معانفہ“ کا مخفف ہے، یہ علامت اس جگہ لکھی جاتی ہے جہاں ایک ہی آیت کی دو تفسیریں ممکن ہیں، ایک تفسیر کے مطابق وقف ایک جگہ ہوگا، اور دوسری تفسیر کے مطابق دوسری جگہ، لہذا ان میں سے کسی ایک جگہ وقف کیا جاسکتا ہے، لیکن ایک جگہ وقف کرنے کے بعد دوسری جگہ وقف کرنا درست نہیں۔ مثلاً **ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَةِ** **وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ** **كَزُرْمٍ أَخْرَجَ شَطْئَهُ** الخ (الف: ۲۹) اس میں اگر **التَّوْرَةِ** پر وقف کر لیا تو **الْإِنْجِيلِ** پر وقف درست نہیں، اور اگر **الْإِنْجِيلِ** پر وقف کرنا ہے تو **التَّوْرَةِ** پر وقف درست نہیں، ہاں دونوں جگہ وقف نہ کریں تو درست ہے۔ اس کا ایک نام ”مقابلہ“ بھی ہے، اور اس کی سب سے پہلے نشاندہی امام ابو الفضل رازی نے فرمائی۔^۲

سکتہ

یہ ”سکتہ“ کی علامت ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس جگہ رُکنا چاہئے، لیکن سانس نہ ٹوٹنے پائے، یہ عموماً اس جگہ لایا جاتا ہے جہاں ملا کر پڑھنے سے معنی میں غلط فہمی کا اندیشہ ہو۔

وقفہ

اس جگہ ”سکتہ“ سے قدرے زیادہ دیر تک رُکنا چاہئے، لیکن سانس یہاں بھی نہ ٹوٹے۔

ق

یہ ”قِيلَ عَلَيْهِ الْوَقْفُ“ کا مخفف ہے، مطلب یہ ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک یہاں وقف ہے اور بعض کے نزدیک نہیں ہے۔

قف

یہ لفظ ”قف“ ہے، جس کے معنی ہیں ”ٹھہر جاؤ“، اور یہ اس جگہ لایا جاتا ہے جہاں پڑھنے والے کو یہ خیال ہو سکتا ہو کہ یہاں وقف درست نہیں۔

صلہ

یہ ”الْوَصْلُ أَوَّلِي“ کا مخفف ہے، جس کے معنی ہیں کہ ”ملا کر پڑھنا بہتر ہے“۔

صل

یہ ”قَدْ يُوَصَّلُ“ کا مخفف ہے، یعنی یہاں بعض لوگ ٹھہرتے ہیں اور بعض ملا کر پڑھنے کو پسند کرتے ہیں۔

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ ان مقامات پر لکھا جاتا ہے جہاں کسی روایت کی رو سے یہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت کرتے ہوئے اس جگہ وقف فرمایا تھا۔

قرآن کریم کی طباعت

جب تک پریس ایجاد نہیں ہوا تھا، قرآن کریم کے تمام نسخے قلم سے لکھے جاتے تھے، اور ہر دور میں ایسے کاتبوں کی ایک بڑی جماعت موجود رہی ہے جس کا کتابت قرآن کے سوا کوئی مشغلہ نہیں تھا، قرآن کریم کے حروف کو بہتر سے بہتر انداز میں لکھنے کے لئے مسلمانوں نے جو محنتیں کیں اور جس طرح اس عظیم کتاب کے ساتھ اپنے والہانہ شغف کا اظہار کیا، اس کی ایک بڑی مفصل اور دلچسپ تاریخ ہے، جس کے لئے مستقل تصنیف چاہئے، یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔

پھر جب پریس ایجاد ہوا تو سب سے پہلے ہمبرگ کے مقام پر ۱۱۱۳ھ میں قرآن کریم طبع ہوا، جس کا ایک نسخہ اب تک دارالکتب المصریہ میں موجود ہے، اس کے بعد متعدد مستشرقین نے قرآن کریم کے نسخے طبع کرائے، لیکن اسلامی دنیا میں ان کو قبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ اس کے بعد مسلمانوں میں سب سے پہلے مولائے عثمان نے رُوس کے شہر سینٹ پیٹرس برگ میں ۱۷۸۷ء میں قرآن کریم کا ایک نسخہ طبع کرایا، اسی طرح قازان میں بھی ایک نسخہ چھاپا گیا، ۱۸۲۸ء میں ایران کے شہر تہران میں قرآن کریم کو پتھر پر طبع کیا گیا، پھر اس کے مطبوعہ نسخے دنیا بھر میں عام ہو گئے۔^[۱]

علم تفسیر

اب کچھ ضروری معلومات علم تفسیر کے سلسلے میں پیش خدمت ہیں۔ عربی زبان میں ”تفسیر“ کے لفظی معنی ہیں ”کھولنا“ اور اصطلاح میں علم تفسیر اس علم کو کہتے ہیں جس میں قرآن کریم کے معانی بیان کئے جائیں، اور اس کے احکام اور حکمتوں کو کھول کر واضح کیا جائے۔^[۲] قرآن کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہے:-

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (النحل: ۴۴)

”اور ہم نے قرآن آپ پر اتارا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے وہ باتیں وضاحت سے بیان فرمادیں جو اُن کی طرف اتاری گئی ہیں۔“

نیز قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (آل عمران: ۱۶۴)

”بلاشبہ اللہ نے مسلمانوں پر بڑا احسان فرمایا جبکہ اُن کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو

اُن کے سامنے اللہ کی آیات کی تلاوت کرے، اور انہیں پاک صاف کرے، اور انہیں اللہ کی کتاب اور دانائی کی باتوں کی تعلیم دے۔“

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کو صرف قرآن کریم کے الفاظ ہی نہیں سکھاتے تھے، بلکہ اس کی پوری تفسیر بیان فرمایا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کو ایک ایک سورت پڑھنے میں بعض اوقات کئی کئی سال لگ جاتے تھے، جس کی تفصیل اِنْ شَاءَ اللہ آگے آئے گی۔

جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا میں تشریف فرما تھے اُس وقت تک کسی آیت کی تفسیر معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں تھا، صحابہ کرامؓ کو جہاں کوئی دُشواری پیش آتی وہ آپ سے رُجوع کرتے اور انہیں تسلی بخش جواب مل جاتا۔ لیکن آپ کے بعد اس بات کی ضرورت تھی کہ تفسیر قرآن کو ایک مستقل علم کی صورت میں محفوظ کیا جاتا، تاکہ اُمت کے لئے قرآن کریم کے الفاظ کے ساتھ ساتھ اس کے صحیح معنی بھی محفوظ ہو جائیں، اور ملحد و گمراہ لوگوں کے لئے اس کی معنوی تحریف کی گنجائش باقی نہ رہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی توفیق سے اس اُمت نے یہ کارنامہ اس حسن و خوبی سے انجام دیا کہ آج ہم یہ بات بلا خوف و تردید کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کی اس آخری کتاب کے صرف الفاظ ہی محفوظ نہیں ہیں بلکہ اس کی وہ صحیح تفسیر و تشریح بھی محفوظ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثار صحابہؓ کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے۔

تفسیر قرآن کے مآخذ

علم تفسیر کو اس اُمت نے کس کس طرح محفوظ کیا؟ اس راہ میں انہوں نے کیسی کیسی مشقتیں اُٹھائیں؟ اور یہ جدوجہد کتنے مراحل سے گزری؟ اس کی ایک طویل اور دلچسپ تاریخ ہے جس کا یہاں موقع نہیں۔ لیکن یہاں مختصر اُیہ بتانا ہے کہ تفسیر قرآن کے مآخذ کیا ہیں؟ اور علم تفسیر پر جو بے شمار کتابیں ہر زبان میں ملتی ہیں انہوں نے قرآن کریم کی تشریح میں کن سرچشموں سے استفادہ کیا ہے، یہ سرچشمے کل چھ ہیں:

۱۔ قرآن کریم

علم تفسیر کا پہلا مآخذ خود قرآن کریم ہے، چنانچہ ایسا بہ کثرت ہوتا ہے کہ کسی آیت میں کوئی بات مجمل اور تشریح طلب ہوتی ہے تو خود قرآن کریم ہی کی کوئی دُوسری آیت اس کے مفہوم کو واضح کر دیتی ہے، مثلاً سورہ فاتحہ کی دُعا میں یہ جملہ موجود ہے کہ ”صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ“، یعنی ”ہمیں اُن لوگوں کے راستہ کی ہدایت کیجئے جن پر آپ کا انعام ہوا۔“ اب یہاں یہ بات واضح نہیں ہے کہ وہ لوگ کون ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا، لیکن ایک دُوسری آیت میں ان کو واضح

طور سے متعین کر دیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:-

فَاُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيِّْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالشّٰهِدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (النساء: ۶۹)

”یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالح لوگ۔“

چنانچہ مفسرین کرام جب کسی آیت کی تفسیر کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر خود قرآن کریم ہی میں کسی اور جگہ موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہوتی ہے تو سب سے پہلے اسی کو اختیار فرماتے ہیں۔

۲- حدیث

”حدیث“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو کہتے ہیں، اور جیسا کہ پیچھے بیان کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ساتھ آپ کو مبعوث ہی اس لئے فرمایا تھا کہ آپ لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی صحیح تشریح کھول کھول کر بیان فرمادیں، چنانچہ آپ نے اپنے قول اور عمل دونوں سے یہ فریضہ بحسن و خوبی انجام دیا، اور درحقیقت آپ کی پوری مبارک زندگی قرآن ہی کی عملی تفسیر ہے، اس لئے مفسرین کرام نے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ زور حدیث پر دیا ہے، اور احادیث کی روشنی میں کتاب اللہ کے معنی متعین کئے ہیں، البتہ چونکہ حدیث میں صحیح، ضعیف اور موضوع ہر طرح کی روایات موجود ہیں، اس لئے محقق مفسرین اس وقت تک کسی روایت کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے جب تک وہ تنقید روایات کے اصولوں پر پوری نہ اُترتی ہو، لہذا جو روایت جہاں نظر آجائے اُسے دیکھ کر قرآن کریم کی کوئی تفسیر متعین کر لینا درست نہیں، کیونکہ وہ روایت ضعیف اور دوسری مضبوط روایتوں کے خلاف بھی ہو سکتی ہے، درحقیقت یہ معاملہ بڑا نازک ہے، اور اس میں قدم رکھنا انہی لوگوں کا کام ہے جنہوں نے اپنی عمریں ان علوم کو حاصل کرنے میں خرچ کی ہیں۔

۳- صحابہ کے اقوال

صحابہ کرام نے قرآن کریم کی تعلیم براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی، اس کے علاوہ نزول وحی کے وقت وہ بہ نفس نفیس موجود تھے، اور انہوں نے نزول قرآن کے پورے ماحول اور پس منظر کا بذات خود مشاہدہ کیا تھا، اس لئے فطری طور پر قرآن کریم کی تفسیر میں ان حضرات کے اقوال جتنے مستند اور قابل اعتماد ہو سکتے ہیں، بعد کے لوگوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا، لہذا جن آیتوں کی تفسیر قرآن یا حدیث سے معلوم نہیں ہوتی، ان میں سب سے زیادہ اہمیت صحابہ کرام کے اقوال کو حاصل ہے، چنانچہ اگر کسی آیت کی تفسیر پر صحابہ کا اتفاق ہو تو مفسرین کرام اسی کو اختیار کرتے ہیں اور اس کے خلاف کوئی اور تفسیر بیان کرنا جائز نہیں۔ ہاں! اگر کسی آیت کی تفسیر میں صحابہ کرام کے اقوال مختلف ہوں تو بعد کے مفسرین دوسرے دلائل کی روشنی میں یہ دیکھتے ہیں کہ کونسی تفسیر کو ترجیح دی جائے؟ اس معاملے میں اہم اصول اور قواعد

اُصول فقہ، اُصول حدیث اور اُصول تفسیر میں مدوّن ہیں، ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

۴۔ تابعین کے اقوال

صحابہ کے بعد تابعین کا نمبر آتا ہے، یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے قرآن کریم کی تفسیر صحابہ کرام سے سیکھی ہے، اس لئے اُن کے اقوال بھی علم تفسیر میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں، اگرچہ اس معاملے میں علماء کا اختلاف ہے کہ تابعین کے اقوال تفسیر میں حجت ہیں یا نہیں؟^[۱] لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

۵۔ لغت عرب

قرآن کریم چونکہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے، اس لئے تفسیر قرآن کے لئے اس زبان پر مکمل عبور حاصل کرنا ضروری ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں کہ ان کے پس منظر میں چونکہ کوئی شان نزول یا کوئی اور فقہی یا کلامی مسئلہ نہیں ہوتا، اس لئے اُن کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ و تابعین کے اقوال منقول نہیں ہوتے، چنانچہ اُن کی تفسیر کا ذریعہ صرف لغت عرب ہوتی ہے، اور لغت ہی کی بنیاد پر اس کی تشریح کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں کوئی اختلاف ہو تو مختلف آراء میں محاکمہ کے لئے بھی علم لغت سے کام لیا جاتا ہے۔

۶۔ تدبر اور استنباط

تفسیر کا آخری مأخذ ”تدبر اور استنباط“ ہے، قرآن کریم کے نکات و اسرار ایک ایسا بحرِ ناپیدا کنار ہے، جس کی کوئی حد و نہایت نہیں، چنانچہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اسلامی علوم میں بصیرت عطا فرمائی ہو، وہ جتنا جتنا اس میں غور و فکر کرتا ہے اُتنے ہی نئے نئے اسرار و نکات سامنے آتے ہیں، چنانچہ مفسرین کرام اپنے اپنے تدبر کے نتائج بھی اپنی تفسیروں میں بیان فرماتے ہیں، لیکن یہ اسرار و نکات اسی وقت قابل قبول ہوتے ہیں جبکہ وہ مذکورہ بالا پانچ مأخذ سے متصادم نہ ہوں، لہذا اگر کوئی شخص قرآن کی تفسیر میں کوئی ایسا نکتہ یا اجتہاد بیان کرے جو قرآن و سنت، اجماع، لغت یا صحابہ و تابعین کے اقوال کے خلاف ہو، یا کسی دوسرے شرعی اُصول سے ٹکراتا ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ بعض صوفیاء نے تفسیر میں اس قسم کے اسرار و نکات بیان کرنے شروع کئے تھے، لیکن اُمت کے محقق علماء نے انہیں قابل اعتبار نہیں سمجھا، کیونکہ قرآن و سنت اور شریعت کے بنیادی اُصولوں کے خلاف کسی کی شخصی رائے ظاہر ہے کہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔^[۲]

اسرائیلیات کا حکم

”اسرائیلیات“ اُن روایتوں کو کہتے ہیں جو اہل کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں سے ہم تک پہنچی ہیں۔ پہلے زمانے کے مفسرین کی عادت تھی کہ وہ کسی آیت کے ذیل میں ہر قسم کی وہ روایات لکھ دیتے تھے جو انہیں سند کے ساتھ پہنچتی تھیں، ان میں بہت سی روایتیں اسرائیلیات بھی ہوتی تھیں، اس لئے اُن کی حقیقت سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ ان کی حقیقت یہ ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ پہلے اہل کتاب کے مذہب سے تعلق رکھتے تھے، بعد میں جب وہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی تو انہیں قرآن کریم میں کچھلی اُمتوں کے بہت سے وہ واقعات نظر آئے جو انہوں نے اپنے سابقہ مذہب کی کتابوں میں بھی پڑھے تھے، چنانچہ وہ قرآنی واقعات کے سلسلے میں وہ تفصیلات مسلمانوں کے سامنے بیان کرتے تھے جو انہوں نے اپنے پُرانے مذہب کی کتابوں میں دیکھی تھیں، یہی تفصیلات ”اسرائیلیات“ کے نام سے تفسیر کی کتابوں میں داخل ہو گئی ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے، جو بڑے محقق مفسرین میں سے ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ اسرائیلیات کی تین قسمیں ہیں:-

۱- وہ روایات جن کی سچائی قرآن و سنت کے دوسرے دلائل سے ثابت ہے، مثلاً فرعون کا غرق ہونا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ طور پر تشریف لے جانا وغیرہ۔

۲- وہ روایات جن کا جھوٹ ہونا قرآن و سنت کے دوسرے دلائل سے ثابت ہے، مثلاً اسرائیلی روایات میں یہ مذکور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی آخری عمر میں (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے، اس کی تردید قرآن کریم سے ثابت ہے، ارشاد ہے کہ **وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنٌ وَلٰكِنَّ الشَّيْطٰنَ كَفَرُوْا** (البقرہ: ۱۰۲) (اور سلیمانؑ کا فر نہیں ہوئے، بلکہ شیاطین نے کفر کیا)۔ اسی طرح مثلاً اسرائیلی روایات میں مذکور ہے کہ (معاذ اللہ) حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے سپہ سالار ”اوریا“ کی بیوی سے زنا کیا، یا اُسے مختلف تدبیروں سے مروا کر اس کی بیوی سے نکاح کر لیا، یہ بھی کھلا جھوٹ ہے اور اس قسم کی روایتوں کو غلط سمجھنا لازم ہے۔

۳- وہ روایات جن کے بارے میں قرآن و سنت اور دوسرے شرعی دلائل خاموش ہیں، جیسے کہ توراۃ کے احکام وغیرہ، ایسی روایات کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ ان کے بارے میں سکوت اختیار کیا جائے، نہ اُن کی تصدیق کی جائے اور نہ تکذیب۔ البتہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا ایسی روایات نقل کرنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ حافظ ابن کثیرؒ نے قول فیصل یہ بیان کیا ہے کہ انہیں نقل کرنا جائز تو ہے، لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ شرعی اعتبار سے وہ حجت نہیں ہے۔

تفسیر قرآن کے بارے میں ایک شدید غلط فہمی

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ قرآن کریم کی تفسیر ایک انتہائی نازک اور مشکل کام ہے، جس کے لئے صرف عربی زبان جان لینا کافی نہیں، بلکہ تمام متعلقہ علوم میں مہارت ضروری ہے، چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ مفسر قرآن کے لئے ضروری ہے کہ وہ عربی زبان کے نحو و صرف اور بلاغت و ادب کے علاوہ علم حدیث، اصول فقہ و تفسیر اور عقائد و کلام کا وسیع و عمیق علم رکھتا ہو، کیونکہ جب تک ان علوم سے مناسبت نہ ہو، انسان قرآن کریم کی تفسیر میں کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا۔

افسوس ہے کہ کچھ عرصے سے مسلمانوں میں یہ خطرناک وبا چل پڑی ہے کہ بہت سے لوگوں نے صرف عربی پڑھ لینے کو تفسیر قرآن کے لئے کافی سمجھ رکھا ہے، چنانچہ جو شخص بھی معمولی عربی زبان پڑھ لیتا ہے، وہ قرآن کریم کی تفسیر میں رائے زنی شروع کر دیتا ہے، بلکہ بعض اوقات ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ عربی زبان کی نہایت معمولی شد بد رکھنے والے لوگ جنہیں عربی پر بھی مکمل عبور نہیں ہوتا، نہ صرف من مانے طریقے پر قرآن کی تفسیر شروع کر دیتے ہیں، بلکہ پرانے مفسرین کی غلطیاں نکالنے کے درپے ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض ستم ظریف تو صرف ترجمے کا مطالعہ کر کے اپنے آپ کو قرآن کا عالم سمجھنے لگتے ہیں، اور بڑے بڑے مفسرین پر تنقید کرنے سے نہیں چوکتے۔

خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ یہ انتہائی خطرناک طرز عمل ہے جو دین کے معاملہ میں نہایت مہلک گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔ دنیوی علوم و فنون کے بارے میں ہر شخص اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض انگریزی زبان سیکھ کر میڈیکل سائنس کی کتابوں کا مطالعہ کر لے تو دنیا کا کوئی صاحب عقل اسے ڈاکٹر تسلیم نہیں کر سکتا، اور نہ اپنی جان اس کے حوالے کر سکتا ہے، جب تک کہ اس نے کسی میڈیکل کالج میں باقاعدہ تعلیم و تربیت حاصل نہ کی ہو، اس لئے کہ ڈاکٹر بننے کے لئے صرف انگریزی سیکھ لینا کافی نہیں، بلکہ باقاعدہ ڈاکٹری کی تعلیم و تربیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح کوئی انگریزی داں انجینئرنگ کی کتابوں کا مطالعہ کر کے انجینئر بننا چاہے تو دنیا کا کوئی بھی باخبر انسان اسے انجینئر تسلیم نہیں کر سکتا، اس لئے کہ یہ کام صرف انگریزی زبان سیکھنے سے نہیں آ سکتا، بلکہ اس کے لئے ماہر اساتذہ کے زیر تربیت رہ کر ان سے باقاعدہ اس فن کو سیکھنا ضروری ہے۔ جب ڈاکٹر اور انجینئر بننے کے لئے یہ کڑی شرائط ضروری ہیں تو آخر قرآن و حدیث کے معاملہ میں صرف عربی زبان سیکھ لینا کیسے کافی ہو سکتا ہے؟ زندگی کے ہر شعبہ میں ہر شخص اس اصول کو جانتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے کہ ہر علم و فن کے سیکھنے کا ایک خاص طریقہ اور اس کی مخصوص شرائط ہوتی ہیں، جنہیں پورا کئے بغیر اس علم و فن میں اس کی رائے معتبر نہیں سمجھی جاتی، تو آخر قرآن و سنت اتنے لاوارث کیسے ہو سکتے ہیں کہ ان کی تشریح و تفسیر کے لئے

کسی علم و فن کے حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہو، اور اس کے معاملہ میں جو شخص چاہے رائے زنی شروع کر دے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ:-

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ (القمر: ۱۷)

”اور بلاشبہ ہم نے قرآن کریم کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے۔“

اور جب قرآن کریم ایک آسان کتاب ہے تو اس کی تشریح کے لئے کسی لمبے چوڑے علم و فن کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ استدلال ایک شدید مغالطہ ہے جو خود کم فہمی اور سطحیت پر مبنی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جن میں عام نصیحت کی باتیں، سبق آموز واقعات اور عبرت و موعظت کے مضامین بیان کئے گئے ہیں، مثلاً دُنیا کی ناپائیداری، جنت و دوزخ کے حالات، خوفِ خدا اور فکرِ آخرت پیدا کرنے والی باتیں، اور زندگی کے دوسرے سیدھے سادے حقائق، اس قسم کی آیتیں بلاشبہ آسان ہیں، اور جو شخص بھی عربی زبان سے واقف ہو وہ انہیں سمجھ کر نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ مذکورہ بالا آیت میں اسی قسم کی تعلیمات کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کو ہم نے آسان کر دیا ہے، چنانچہ خود اس آیت میں لفظ لِلذِّكْرِ (نصیحت کے واسطے) اس پر دلالت کر رہا ہے۔

اس کے برخلاف دوسری قسم کی آیتیں وہ ہیں جو احکام و قوانین، عقائد اور عملی مضامین پر مشتمل ہیں، اس قسم کی آیتوں کا کماحقہ سمجھنا اور ان سے احکام و مسائل مستنبط کرنا ہر شخص کا کام نہیں جب تک اسلامی علوم میں بصیرت اور پختگی حاصل نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کی مادری زبان اگرچہ عربی تھی، اور عربی سمجھنے کے لئے انہیں کہیں تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے میں طویل مدتیں صرف کرتے تھے۔ علامہ سیوطیؒ نے امام ابو عبد الرحمن سلمیٰؒ سے نقل کیا ہے کہ جن حضرات صحابہؓ نے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے، مثلاً حضرت عثمان بن عفانؓ اور عبد اللہ بن مسعودؓ وغیرہ انہوں نے ہمیں بتایا کہ جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی دس آیتیں سیکھتے تو اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک ان آیتوں کے متعلق تمام علمی اور عملی باتوں کا احاطہ نہ کر لیں، وہ فرماتے تھے کہ:-

فَتَعَلَّمْنَا الْقُرْآنَ وَالْعِلْمَ وَالْعَمَلَ جَمِيعًا۔

”ہم نے قرآن اور علم و عمل ساتھ ساتھ سیکھا ہے۔“

چنانچہ موطا امام مالکؒ میں روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے صرف سورہ بقرہ یاد کرنے میں پورے آٹھ سال صرف کئے، اور مسند احمد میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے جو شخص سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران پڑھ لیتا

ہماری نگاہوں میں اُس کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا تھا۔^۱

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ حضرات صحابہؓ جن کی مادری زبان عربی تھی، جو عربی کے شعروادب میں مہارت تامہ رکھتے تھے، اور جن کو لمبے لمبے قصیدے معمولی توجہ سے اُزبر ہو جایا کرتے تھے، انہیں قرآن کریم کو یاد کرنے اور اس کے معانی سمجھنے کے لئے اتنی طویل مدت کی کیا ضرورت تھی کہ آٹھ آٹھ سال صرف ایک سورت پڑھنے میں خرچ ہو جائیں؟ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ قرآن کریم اور اس کے علوم سیکھنے کے لئے صرف عربی زبان کی مہارت کافی نہیں تھی، بلکہ اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تعلیم سے فائدہ اٹھانا ضروری تھا۔ اب ظاہر ہے کہ جب صحابہ کرامؓ کو عربی زبان کی مہارت اور نزول وحی کا براہِ راست مشاہدہ کرنے کے باوجود ”عالم قرآن“ بننے کے لئے باقاعدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت تھی تو نزول قرآن کے سینکڑوں سال بعد عربی کی معمولی شد بد پیدا کر کے یا صرف ترجمے دیکھ کر مفسر قرآن بننے کا دعویٰ کتنی بڑی جسارت اور علم و دین کے ساتھ کیسا افسوسناک مذاق ہے؟ ایسے لوگوں کو جو اس جسارت کا ارتکاب کرتے ہیں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے کہ:-

مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔^۲

”جو شخص قرآن کے معاملے میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔“

اور:-

مَنْ تَكَلَّمَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَاصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ۔^۳

”جو شخص قرآن کے معاملہ میں (محض) اپنی رائے سے گفتگو کرے اور اس میں کوئی صحیح بات بھی کہہ دے تب بھی اس نے غلطی کی۔“

مشہور تفسیریں

عہد رسالت کے بعد سے قرآن کریم کی بے شمار تفسیریں لکھی گئی ہیں، بلکہ دنیا کی کسی کتاب کی بھی اتنی خدمت نہیں کی گئی، جتنی قرآن کریم کی کی گئی ہے، ان سب تفاسیر کا تعارف کسی مفصل کتاب میں بھی ممکن نہیں، چہ جائیکہ اس مختصر مقدمہ میں اس کا ارادہ کیا جائے۔ لیکن یہاں ہم اُن اہم تفسیروں کا مختصر تعارف کرانا چاہتے ہیں جو ”معارف القرآن“ کا

[۱] إبتقان ج: ۲ ص: ۱۷۶ نو: ۷۷

[۲] سنن ابی داؤد، کتاب العلم، باب التشدید فی الکذب علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، از إبتقان ج: ۲ ص: ۱۷۹

[۳] سنن ابی داؤد، بحوالہ بالا، نسائی، از إبتقان ج: ۲ ص: ۱۷۹

خاص مآخذ رہی ہیں، اور جن کا حوالہ ”معارف القرآن“ میں بار بار آیا ہے، اگرچہ ”معارف القرآن“ کی تصنیف کے دوران بہت سی تفاسیر اور سینکڑوں کتابیں پیش نظر رہی ہیں، لیکن یہاں صرف اُن تفاسیر کا تذکرہ مقصود ہے جن کے حوالے بکثرت آئیں گے۔

تفسیر ابن جریر

اس تفسیر کا اصل نام ”جامع البیان“ ہے، اور یہ علامہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۲۵۵ھ) کی تالیف ہے۔ علامہ طبریؒ اُنچے درجے کے مفسر، محدث اور مؤرخ ہیں، منقول ہے کہ وہ چالیس سال تک مسلسل لکھنے میں مشغول رہے، اور ہر روز چالیس ورق لکھنے کا معمول تھا۔^[۱] بعض حضرات نے ان پر شیعہ ہونے کا الزام عائد کیا ہے، لیکن محققین نے اس الزام کی تردید کی ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ اہل سنت کے جلیل القدر عالم ہیں، بلکہ ان کا شمار ائمہ مجتہدین میں ہوتا ہے۔

ان کی تفسیر تیس جلدوں میں ہے، اور بعد کی تفاسیر کے لئے بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے، وہ آیات کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال نقل کرتے ہیں، اور پھر جو قول اُن کے نزدیک رائج ہوتا ہے اُسے دلائل کے ذریعے ثابت کرتے ہیں۔ البتہ ان کی تفسیر میں صحیح و سقیم ہر طرح کی روایات جمع ہو گئی ہیں، اس لئے اُن کی بیان کی ہوئی ہر روایت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل اس تفسیر سے ان کا مقصد یہ تھا کہ تفسیر قرآن کے بارے میں جس قدر روایات انہیں دستیاب ہو سکیں اُن سب کو جمع کر دیا جائے، تاکہ اس جمع شدہ مواد سے کام لیا جاسکے، البتہ انہوں نے ہر روایت کے ساتھ اس کی سند بھی ذکر کی ہے، تاکہ جو شخص چاہے راویوں کی تحقیق کر کے روایت کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کر سکے۔

تفسیر ابن کثیر

یہ حافظ عماد الدین ابوالفداء اسماعیل بن کثیر دمشقی شافعی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۷۷۶ھ) کی تصنیف ہے، جو آٹھویں صدی کے ممتاز اور محقق علماء میں سے ہیں، اُن کی تفسیر چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، اس میں زیادہ زور تفسیری روایات پر دیا گیا ہے، اور خاص بات یہ ہے کہ مصنف روایتوں پر محدثانہ تنقید بھی کرتے ہیں، اور اس لحاظ سے یہ کتاب تمام کتب تفسیر میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔

تفسیر القرطبی

اس کا پورا نام ”الجامع لاحکام القرآن“ ہے، اندلس کے مشہور اور محقق عالم علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن

فرح القرطبی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۶۷۱ھ) کی تصنیف ہے، جو فقہ میں امام مالکؒ کے مسلک کے پیرو تھے، اور عبادت و زہد کے اعتبار سے شہرہ آفاق تھے۔ اصل میں اس کتاب کا بنیادی موضوع تو قرآن کریم سے فقہی احکام و مسائل کا استنباط تھا، لیکن اس ضمن میں انہوں نے آیتوں کی تشریح، مشکل الفاظ کی تحقیق، اعراب و بلاغت اور متعلقہ روایات کو بھی تفسیر میں خوب جمع کیا ہے، یہ کتاب بارہ جلدوں میں ہے، اور بار بار شائع ہو چکی ہے۔

تفسیر کبیر

یہ امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۶۰۶ھ) کی تصنیف ہے، اور اس کا اصلی نام ”مفتاح الغیب“ ہے، لیکن ”تفسیر کبیر“ کے نام سے مشہور ہے۔ امام رازی متکلمین اسلام کے امام ہیں، اس لئے ان کی تفسیر میں عقلی اور کلامی مباحث اور باطل فرقوں کی تردید پر بہت زور دیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حل قرآن کے لحاظ سے بھی یہ تفسیر اپنی نظیر آپ ہے، اور اس میں جس دلنشین انداز میں قرآن کریم کے معانی کی توضیح اور آیات قرآنی کے باہمی ربط کی تشریح کی گئی ہے، وہ بڑا قابل قدر ہے، اغلب یہ ہے کہ امام رازیؒ نے سورہ فتح تک کی تفسیر خود لکھی ہے، اس کے بعد وہ اسے پورا نہ کر سکے، چنانچہ سورہ فتح سے آخر تک کا حصہ قاضی شہاب الدین بن خلیل الخولی الدمشقیؒ (متوفی ۷۳۹ھ) یا شیخ نجم الدین احمد بن محمد القمویؒ (متوفی ۷۷۷ھ) نے مکمل فرمایا۔

امام رازیؒ نے اپنے زمانے کی ضرورت کے مطابق چونکہ کلامی بحث اور باطل فرقوں کی تردید پر خاص زور دیا ہے، اور اس ضمن میں ان کی بحثیں بہت سے مقامات پر انتہائی طویل ہو گئی ہیں، اس لئے بعض حضرات نے ان کی تفسیر پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ ”فِيهِ كُلُّ شَيْءٍ إِلَّا التَّفْسِيرُ“ (اس کتاب میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے)۔ لیکن یہ تبصرہ تفسیر کبیر پر بڑا ظلم ہے، اور حقیقت وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی، کہ حل قرآن کے لحاظ سے بھی اس تفسیر کا پایہ بہت بلند ہے، البتہ چند ایک مقامات پر انہوں نے جمہور اُمت کی راہ سے ہٹ کر آیات قرآنی کی تفسیر کی ہے، لیکن ایسے مقامات آٹھ ضخیم جلدوں کی اس کتاب میں خال خال ہیں۔

تفسیر البحر المحیط

یہ علامہ ابو حیان غرناطی اندلسی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۵۵۴ھ) کی تصنیف ہے، جو اسلامی علوم کے علاوہ علم نحو و بلاغت میں خصوصی مہارت رکھتے تھے، چنانچہ ان کی تفسیر میں نحو و بلاغت کا رنگ نمایاں ہے، وہ ہر آیت کے الفاظ کی تحقیق، ترکیبوں کے اختلاف اور بلاغت کے نکات بیان کرنے پر خاص زور دیتے ہیں۔

احکام القرآن للجصاص

یہ امام ابو بکر جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۷۷۳ھ) کی تصنیف ہے، جو فقہائے حنفیہ میں ایک ممتاز مقام کے حامل ہیں، ان کی اس کتاب کا موضوع قرآن کریم سے فقہی احکام و مسائل کا استنباط ہے، اور انہوں نے مسلسل آیتوں کی تفسیر کے بجائے صرف ان آیتوں کی فقہی تفصیلات بیان فرمائی ہیں جو فقہی احکام پر مشتمل ہیں۔ اس موضوع پر اور بھی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اس کتاب کو ان سب میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہے۔

تفسیر الدر المنثور

یہ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۹۱۰ھ) کی تصنیف ہے، اور اس کا پورا نام ”الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور“ ہے، اس میں علامہ سیوطی نے ان تمام روایات کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے جو قرآن کریم کی تفسیر سے متعلق ان کو ملی ہیں، ان سے پہلے بہت سے محدثین مثلاً حافظ ابن جریر، امام بغوی، ابن مردویہ، ابن حبان اور ابن ماجہ وغیرہ اپنے اپنے طور پر یہ کام کر چکے تھے۔ علامہ سیوطی نے ان سب کی بیان کردہ روایات کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے، البتہ انہوں نے روایات کے ساتھ ان کی پوری سند ذکر کرنے کے بجائے صرف اس مصنف کا نام ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے جس نے اس روایت کو اپنی سند سے بیان کیا ہے، تاکہ بوقت ضرورت اس کی مراجعت کر کے سند کی تحقیق کی جاسکے، چونکہ ان کا مقصد روایات کے ذخیرہ کو یکجا کرنا تھا، اس لئے اس کتاب میں بھی صحیح و سقیم ہر طرح کی روایتیں جمع ہو گئی ہیں، اور سند کی تحقیق کئے بغیر ان کی بیان کی ہوئی ہر روایت کو قابل اعتماد نہیں سمجھا جاسکتا۔ علامہ سیوطی بعض مرتبہ ہر روایت کے ساتھ یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ اس کی سند کس درجے کی ہے؟ لیکن چونکہ تقیید حدیث کے معاملہ میں وہ خاصے متساہل مشہور ہیں، اس لئے اس پر بھی کما حقہ اعتماد کرنا مشکل ہے۔

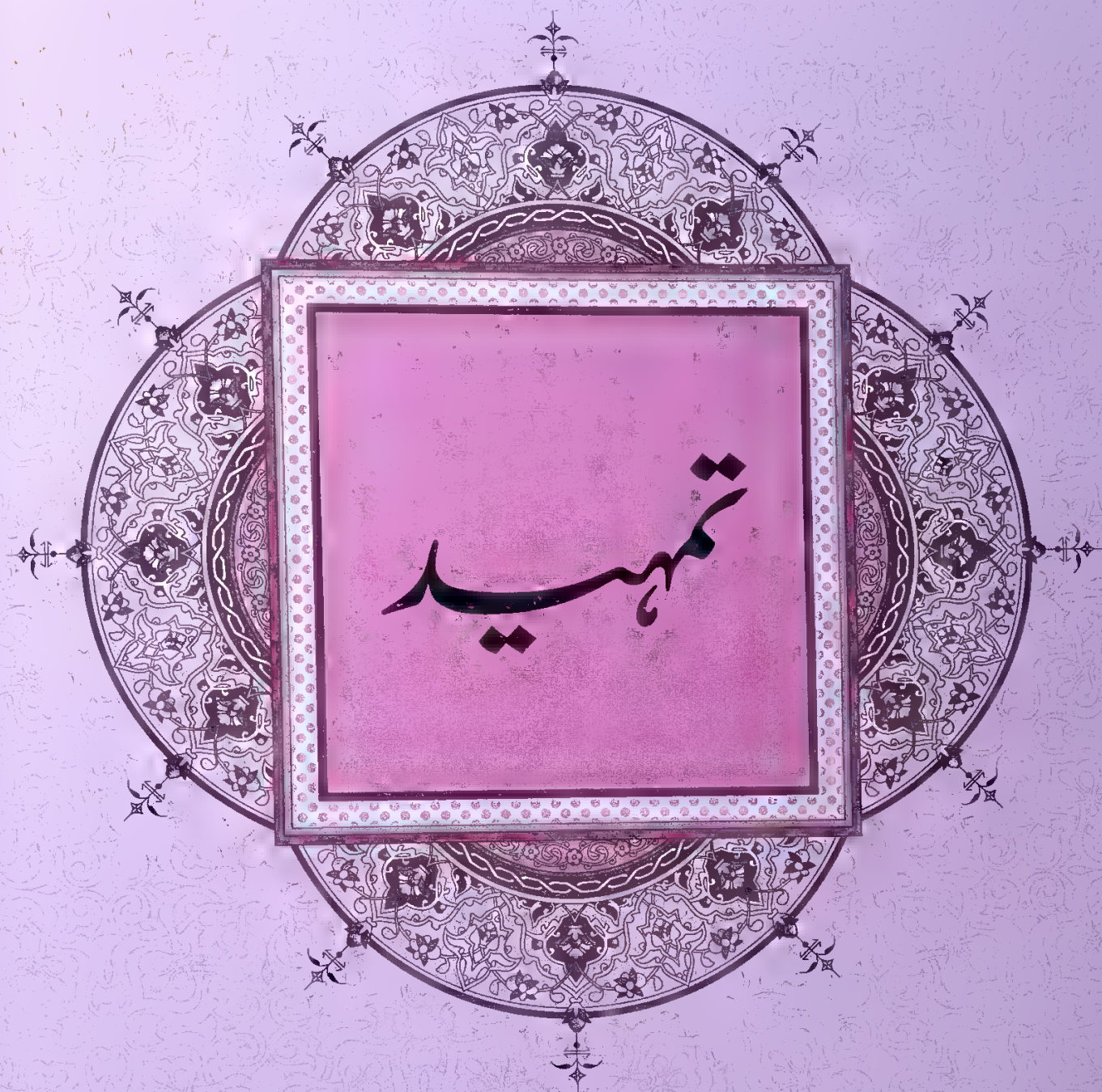
تفسیر مظہری

یہ علامہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۲۵ھ) کی تصنیف ہے، اور انہوں نے اپنے شیخ طریقت مرزا مظہر جان جاناں دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر اس تفسیر کا نام ”تفسیر مظہری“ رکھا ہے، ان کی یہ تفسیر بہت سادہ اور واضح ہے، اور اختصار کے ساتھ آیات قرآنی کی تشریح معلوم کرنے کے لئے نہایت مفید، انہوں نے الفاظ قرآنی کی تشریح کے ساتھ متعلقہ روایات کو بھی کافی تفصیل سے ذکر کیا ہے، اور دوسری تفسیروں کے مقابلے میں زیادہ چھان پھٹک کر روایات لینے کی کوشش کی ہے۔

روح المعانی

اس کا پورا نام ”روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی“ ہے، اور یہ بغداد کے آخری دور کے مشہور عالم علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۷۰ھ) کی تصنیف ہے، اور تیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اپنی اس تفسیر کو بڑی حد تک جامع بنانے کی کوشش کی ہے، لغت، نحو، ادب اور بلاغت کے علاوہ فقہ، عقائد، کلام، فلسفہ اور ہیئت، تصوّف اور متعلقہ روایات پر بھی مبسوط بحثیں کی ہیں، اور کوشش یہ کی ہے کہ آیت سے متعلق کوئی علمی گوشہ تشنہ نہ رہے۔ روایات حدیث کے معاملے میں بھی اس کے مصنف دوسرے مفسرین کے مقابلے میں محتاط رہے ہی، اس لحاظ سے یہ بڑی جامع تفسیر ہے، اور اب تفسیر قرآن کے سلسلے میں کوئی بھی کام اس کی مدد سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔





تمہید

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
 الْحَمْدُ لِلَّهِ عَدَدَ خَلْقِهِ وَزِينَةَ عَرْشِهِ وَمِدَادَ كَلِمَاتِهِ وَرِضَىٰ نَفْسِهِ
 وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَىٰ صَفْوَةِ رُسُلِهِ وَخَيْرِ خَلْقِهِ سَيِّدِنَا
 مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَصَحْبِهِ وَجَمِيعِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ
 أَمَّا بَعْدُ

دنیا کی سب سے بڑی نعمت قرآن ہے

قرآن کریم اس جہان میں وہ نعمت ہے کہ سارا جہان آسمان وزمین اور ان میں پیدا ہونے والی مخلوقات اس کا بدل نہیں بن سکتیں۔

انسان کی سب سے بڑی سعادت اور خوش نصیبی اپنی مقدور بھر قرآن کریم میں اشتغال اور اس کو حاصل کرنا ہے، اور سب سے بڑی شقاوت و بد نصیبی اس سے اعراض اور اُسے چھوڑنا ہے، اس لئے ہر مسلمان کو اس کی فکر تو فرض عین اور ضروری ہے کہ قرآن کریم کو صحت لفظی کے ساتھ پڑھنے اور اولاد کو پڑھانے کی کوشش کرے، اور پھر جس قدر ممکن ہو اس کے معانی اور احکام کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی فکر میں لگا رہے، اور اس کو اپنی پوری عمر کا وظیفہ بنائے، اور اپنے حوصلے اور ہمت کے مطابق اس کا جو حصہ بھی نصیب ہو جائے اُس کو اس جہان کی سب سے بڑی نعمت سمجھے۔



مختصر سرگزشت مصنف

ناکارہ خلاق بندہ محمد شفیع ابن مولانا محمد یسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس نعمت کا شکر ادا نہیں کر سکتا کہ حق تعالیٰ نے اس کا مولد و وطن مرکز علوم اسلامیہ دیوبند کو بنادیا، اور ایسے والد محترم کی آغوش میں پرورش کا موقع عطا فرمایا جو حافظ قرآن اور عالم دین ہونے کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے ہم عمر تھے، دارالعلوم دیوبند کے بنیان علمائے ربانی کی صحبتوں سے فیض یاب ہونے کے مواقع اُن کو ہمیشہ میسر رہے، اُن کا وجود اُن بزرگوں کا زندہ تذکرہ تھا، اور اُن کی زندگی بچپن سے وفات تک دارالعلوم دیوبند ہی میں پوری ہوئی، وہیں تعلیم حاصل کی، وہیں مدرس ہو کر ساری عمر تعلیم کی خدمت گزاری کی۔

احقر کی ابتداء تعلیم قرآن والد محترم کی تجویز سے دارالعلوم کے اساتذہ قرآن حافظ عبدالعلیم صاحب اور حافظ نامدار خان صاحب رحمۃ اللہ علیہما کے پاس ہوئی، اور پھر خود والد محترم کی خدمت میں رہ کر اردو، فارسی، حساب، ریاضی اور ابتدائی عربی کی تعلیم حاصل کی، پھر ۱۳۳۱ھ میں دارالعلوم کے درجہ عربی میں باقاعدہ داخلہ لے کر ۱۳۳۵ھ تک درس نظامی کا نصاب اُن ماہرین اساتذہ کی خدمت میں رہ کر پورا کیا جن کی نظیر آج دنیا کے کسی گوشے میں ملنا مشکل ہے۔ بچپن سے متوسط تعلیم عربی تک شیخ العرب والجم سیدی حضرت مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہند قدس سرہ کی خدمت میں حاضری دی، کبھی کبھی درس بخاری کی غیر رسمی حاضری نصیب رہی، مالٹا جیل سے واپس تشریف لانے کے بعد انہی کے دستِ حق پرست پر بیعت طریقت نصیب ہوئی۔ اور علوم عربیہ کی باقاعدہ تعلیم حضرات ذیل سے حاصل کی، حافظ حدیث جامع العلوم حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری، عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب، عالم ربانی حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا محمد اعجاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہم اجمعین، اور ماہر علوم معقول و منقول حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب و حضرت مولانا محمد رسول خان صاحب، افسوس ہے کہ ان سطور کی تحریر کے وقت آخر الذکر دو بزرگوں کے سوا سب اس دارِ فانی سے رحلت فرما چکے ہیں، حق تعالیٰ ان دونوں بزرگوں کا سایہ تادیر بعافیت قائم رکھیں، اور اہل علم کو ان سے فیض یاب ہونے کا زیادہ سے زیادہ موقع عطا فرمائیں۔

(۱) ۲۳ شعبان ۱۳۹۳ھ کو جبکہ ”معارف القرآن“ پر نظر ثانی کا کام شروع ہوا تو یہ دونوں بزرگ بھی رخصت ہو چکے ہیں، حق تعالیٰ ان کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائیں، اور درجاتِ عالیہ نصیب فرمائیں۔ ۱۲ منہ

اساتذہ اور اکابرِ دارالعلوم کی نظرِ شفقت و عنایتِ اول ہی سے اس ناکارہ پر مبذول تھی، ۱۳۳۶ھ میں احقر نے فنون کی بقیہ چند کتابیں ”قاضی“ اور ”میرزاہد“ اور امورِ عامہ وغیرہ پڑھنا شروع کیا تھا کہ اسی سال میں اکابرِ دارالعلوم نے احقر کو کچھ سبق پڑھانے کے لئے دے دیئے، اس طرح ۱۳۳۶ھ میری تعلیم و تعلّم کا مشترک سال تھا، ۱۳۳۷ھ سے باقاعدہ دارالعلوم میں تدریس کی خدمت پر لگادیا گیا، بارہ سال مسلسل مختلف علوم و فنون کی متوسط اور اعلیٰ کتابوں کے درس کی خدمت انجام دی، ۱۳۴۹ھ میں مجھے صدر مفتی کی حیثیت سے دارالعلوم کا منصبِ فتویٰ سپرد کیا گیا، اس کے ساتھ کچھ کتابیں حدیث و تفسیر کی بھی زیرِ درس رہیں، اور بالآخر ۱۳۶۲ھ میں تحریک پاکستان کی جدوجہد اور کچھ دوسرے اسباب کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہو گیا۔

دارالعلوم کی چھبیس سالہ خدمتِ درس و فتویٰ کے ساتھ خاص خاص موضوعات پر تصنیف کا بھی سلسلہ جاری رہا، ان تمام مشاغل اور بزرگانِ دارالعلوم کی صحبت سے اپنے حوصلے کے مطابق قرآن و حدیث سے کچھ مناسبت ہو گئی تھی، حضرت مجدد الملتِ حکیم الامت سیّدی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کی خدمت میں حاضری کا شرف تو طالب علمی کے زمانے میں بھی ہوتا رہتا تھا مگر ۱۳۴۶ھ سے تجدید بیعت کے ساتھ مسلسل حاضر باشی کا شرف حاصل ہوا جو تقریباً بیس سال حضرت اقدس کی وفاتِ رجب ۱۳۶۲ھ تک جاری رہا۔ حضرت قدس سرہ کو حق تعالیٰ نے جملہ علوم و فنون کی کامل مہارت عطا فرمائی تھی، اور ان میں سے خصوصاً تفسیر اور تصوف آپ کے مخصوص فن تھے، ان دونوں علوم میں آپ کی تصانیف ”بیان القرآن“، ”التّکشف“ اور ”التّشرف“ و دیگر رسائل تصوف اس پر کافی شاہد ہیں، حضرت قدس سرہ نے اپنی آخری عمر میں یہ ضرورت محسوس فرمائی کہ احکام القرآن پر کوئی ایسی کتاب لکھی جائے جس میں عصرِ حاضر کے مسائل کو بھی جس قدر قرآن کریم سے ثابت ہوتے ہیں واضح کیا جائے، اس کام کو جلد پورا کرانے کے خیال سے چند اصحاب میں تقسیم فرمایا، اس کا ایک حصہ احقر کے بھی سپرد ہوا، جس کا کچھ حصہ تو حضرت قدس سرہ کی حیات ہی میں آپ کی زیرِ نگرانی لکھا گیا، باقی حضرت کی وفات کے بعد بعونہ تعالیٰ پورا ہو گیا، اور دو جلدوں میں شائع بھی ہو چکا، یہ مجموعہ عربی زبان میں ہے۔

اس سلسلے نے حضرت کی برکت سے بحمد اللہ قرآن کریم کے ساتھ ایک خصوصی تعلق اور طلب پیدا کر دی، اس کے بعد قضاء و قدر سے زندگی میں ایک نئے انقلاب کا دروازہ کھلا، ۱۳۶۵ھ یعنی ۱۹۴۶ء میں پاکستان کی تحریک قوی ہو کر پورے ملک میں پھیلی، حضرت قدس سرہ کے سابقہ ایماء اور موجودہ اکابر کے ارشاد پر اس تحریک میں حصہ لیا، اور دو سال کے شب و روز اس جدوجہد میں صرف کئے، مگر اس سے پشاور تک اور مغرب میں کراچی تک پورے ملک کے دورے کئے، یہی تحریک پاکستان اور اس کی جدوجہد بالآخر دارالعلوم دیوبند سے استعفاء دینے پر منتہی ہوئی، اور آخر کار اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی یہ دیرینہ تمنا پوری فرمادی کہ ہندوستان تقسیم ہو کر مسلمانوں کے لئے خالص اسلام کے نام پر دُنیا کی سب سے

بڑی اسلامی سلطنت پاکستان کے نام سے وجود میں آگئی۔

اسلامی سلطنت، اسلامی نظام، اسلامی قانون کی قدیم تمنائیں اب اُمید کی صورت میں تبدیل ہونے لگیں، اور اس کے ساتھ وطنِ مالوف کو ترک کرنے اور پاکستان کو وطن بنانے کی کشمکش دل میں موجزن ہوئی، وطنِ اصلی دیوبند کے علومِ اسلامیہ کا مرکز اور منتخب علمائے اُمت کا مرجع ہونے پر نظر جاتی تو سعدی شیرازیؒ کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

تولّٰے مردانِ ایں پاک بوم
برائے ختمِ خاطر از شام و روم^[۱]

لیکن جب ملک کے سیاسی حالات اور ہندوستان میں مسلمانوں اور ان کے اداروں کے مستقبل پر نظر جاتی تو کوئی روشن پہلو سامنے نہ آتا، اس کے خلاف پاکستان میں ہر طرح کی صلاح و فلاح کی اُمید بظاہر اسبابِ نظر آتی تھی، ادھر یہ کشمکش جاری تھی اور دوسری طرف پورے ملک میں بد امنی اور قتل و غارت گری کے قیامت خیز ہنگامے کھڑے ہو گئے، ہندوستان میں مسلمانوں پر عرصہٴ حیات تنگ کر دیا گیا، لاکھوں انسانوں کو ہجر پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا، اور پھر جانے والوں کو عافیت کے ساتھ جانے کا موقع بھی نہ دیا گیا، جا بجا قتل عام، خوں ریزی، لوٹ مار اور اغوا کے رُوح فرسا نظارے تھے، کسی کا صحیح سالم پاکستان پہنچ جانا ایک اعجوبہ یا کرامت سمجھا جاتا تھا۔ آٹھ ماہ کے بعد یہ ہنگامے کچھ فرو ہوئے تو میرے اُستادِ محترم اور پھوپھی زاد بھائی شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور چند عمائدِ کراچی نے یہ ارادہ کیا کہ پاکستان کے لئے اسلامی دستور کا ایک خاکہ مرتب کر کے حکومت کے سامنے رکھا جائے، تاکہ جس مقصد کے لئے پاکستان بنا ہے، وہ جلد سے جلد بروئے کار آ سکے، اس تجویز کے لئے من جملہ چند علماء کے احقر کو بھی ہندوستان سے کراچی آنے کی دعوت دی گئی۔

۲۰ جمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ - یکم مئی ۱۹۴۸ء میری عمر میں عظیم انقلاب کا دن تھا، جس میں وطنِ مالوف، مرکزِ علومِ دیوبند کو خیر باد کہہ کر صرف چھوٹے بچوں اور ان کی والدہ کو ساتھ لے کر پاکستان کا رخ کیا، والدہ محترمہ اور اکثر اولاد اور سب عزیزوں اور گھر بار کو چھوڑنے کا دل گداز منظر، اور جس طرف جا رہا ہوں وہاں ایک غریب الوطن کی حیثیت سے وقت گزارنے کی مشکلات کے ساتھ ایک نئی اسلامی حکومت کا وجود اور اس میں دینی رجحانات کے بروئے کار آنے کی خوش کن اُمیدوں کے ملے جلے تصورات میں غلطیاں و پیچاں۔

دہلی اور چند مقامات پر اُترتے ہوئے ۲۶ جمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ - ۶ مئی ۱۹۴۸ء کو اللہ تعالیٰ نے حدودِ پاکستان میں پہنچا دیا، اور کراچی غیر اختیاری طور پر اپنا وطن بن گیا، یہاں آئے ہوئے اس وقت پندرہ سال پورے

[۱] ترجمہ:- اس پاک وطن کے لوگوں کے ساتھ تعلق کی وجہ سے میرا دل شام اور روم سے اکھڑ گیا ہے۔

ہو کر تین ماہ زیادہ ہو رہے ہیں، اس پندرہ سال میں کیا کیا اور کیا دیکھا، اس کی سرگزشت بہت طویل ہے، یہ مقام اُس کے لکھنے کا نہیں، جن مقاصد کے لئے پاکستان محبوب و مطلوب تھا اور اس کے لئے سب کچھ قربان کیا تھا، حکومتوں کے انقلابات نے ان کی حیثیت ایک لذیذ خواب سے زیادہ باقی نہ چھوڑی ۔

بلبل ہمہ تن خوں شد و گل شد ہمہ تن چاک

اے وائے بہارے اگر ایں ست بہارے

حکومت کے راستے سے کسی دینی انقلاب اور نمایاں اصلاح کی اُمیدیں خواب و خیال ہوتی جاتی ہیں، تاہم عام مسلمانوں میں دینی بیداری اور اُمور دین کا احساس بجز اللہ ابھی تک سرمایہ زندگی بنا ہوا ہے، ان میں اہل صلاح و تقویٰ کی بجز اللہ خاصی تعداد موجود ہے، اسی احساس نے یہاں دینی خدمتوں کی راہیں کھولی ہوئی ہیں۔

حکومت کے پیمانے پر اصلاحی کوششوں کے علاوہ عوامی طرز سے اصلاحی جدوجہد اور اس کے لئے کچھ اداروں کا قیام جو شروع سے پیش نظر تھا اُس کی ابتداء ۱۳۵۰ھ - ۱۹۵۰ء میں اس طرح ہوئی کہ آرام باغ کراچی کے متصل مسجد باب الاسلام میں روزانہ بعد صبح درس قرآن شروع ہوا اور ہر طرف سے آنے والے سوالات کے جواب میں جو فتاویٰ مسلسل لکھے جاتے اور بغیر نقل کے روانہ کر دیئے جاتے تھے، اب اس کا انتظام اسی مسجد میں ایک دارالافتاء کے قیام کی صورت میں عمل میں آیا، یہ درس قرآن اُمید سے زیادہ مفید و موثر ثابت ہوا، سننے والوں کی زندگی میں انقلاب کے آثار دیکھے گئے، احقرنا کارہ کو زندگی کا ایک اچھا مشغلہ مل گیا، بعد نماز فجر روزانہ ایک گھنٹے کے عمل سے سات سال میں بجز اللہ یہ درس قرآن مکمل ہو گیا۔

یہاں تک کی تمہید ماہ صفر ۱۳۸۳ھ میں اُس وقت لکھی گئی تھی جبکہ تفسیر ”معارف القرآن“ کو کتابی صورت میں لانے کا ارادہ ہوا تھا، پھر ۱۳۸۸ھ تک یہ سلسلہ ملتوی رہا، ۱۳۸۸ھ سے اس پر کام شروع ہوا جو ۱۳۹۲ھ تک پانچ سال میں بجز اللہ مکمل ہو گیا، اس تمہید کا آگے آنے والا حصہ تکمیل تفسیر کے بعد ۱۳۹۲ھ میں لکھا گیا۔

تفسیر ”معارف القرآن“ کی تصنیف قدرتی اسباب سے

احقرنا کارہ گناہگار بے علم و بے عمل کی یہ جرأت کبھی بھی نہ ہوتی کہ قرآن کریم کی تفسیر لکھنے کا ارادہ کرتا، مگر نیرنگ تقدیر سے اس کے اسباب اس طرح شروع ہوئے کہ ریڈیو پاکستان سے روزانہ نشر ہونے والے درس قرآن کے

ترجمہ:- بلبل کا پورا بدن خون میں لت پت ہے اور پھول کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، اگر موسم بہار یہی ہے تو ایسے موسم بہار پر سخت افسوس ہے۔

متعلق مجھ سے فرمائش کی گئی جس کو چند اعدا کی بناء پر میں قبول نہ کر سکا، پھر انہوں نے ایک دوسری تجویز پیش کی کہ روزانہ درس کے سلسلہ سے الگ ایک ہفتہ واری درس بنام ”معارف القرآن“ جاری کیا جائے، جس میں پورے قرآن کی تفسیر پیش نظر نہ ہو بلکہ عام مسلمانوں کی موجودہ ضرورت کے پیش نظر خاص خاص آیات کا انتخاب کر کے اُن کی تفسیر اور متعلقہ احکام بیان ہوا کریں۔ احقر نے اس کو اس شرط کے ساتھ منظور کر لیا کہ درس کا کوئی معاوضہ نہ لوں گا اور کسی ایسی پابندی کو بھی قبول نہ کروں گا جو میرے نزدیک درس قرآن کے مناسب نہ ہو، یہ شرط منظور کر لی گئی۔

بنام خدا تعالیٰ یہ درس بنام ”معارف القرآن“ ۳۱ شوال ۱۳۷۳ھ - ۲ جولائی ۱۹۵۴ء سے شروع ہوا، اور تقریباً گیارہ سال پابندی سے جاری رہا، یہاں تک کہ جون ۱۹۶۴ء میں ریڈیو پاکستان کی اپنی نئی پالیسی کے تحت اس درس کو ختم کر دیا گیا۔ یہ درس ”معارف القرآن“ تیرہویں پارے اور سورہ ابراہیم پر ختم ہو گیا، جس میں ان تیرہ پاروں کی مکمل تفسیر نہیں بلکہ منتخب آیات کی تفسیر تھی، احقر نے ایسی درمیانی آیات کو اس میں شامل نہیں کیا تھا جو خالص علمی مضامین پر مشتمل تھیں اور ریڈیائی تقریر کے ذریعہ عوام کے ذہن نشین کرنا اس کا مشکل تھا، یا وہ آیات جو مکرر سہ کر آتی ہیں۔

جس وقت یہ کام شروع کر رہا تھا، اس کا کوئی دُور دُور خیال نہ تھا کہ یہ کسی وقت کتابی صورت میں ایک مستقل تفسیر کے انداز پر شائع ہوگی، مگر ہوا یہ کہ جب یہ درس نشر ہونا شروع ہوا تو پاکستان کے سب علاقوں سے اور ان سے زیادہ غیر ممالک افریقہ، یورپ وغیرہ میں بسنے والے مسلمانوں کی طرف سے بے شمار خطوط ریڈیو پاکستان کو اور خود احقر کو وصول ہوئے جن سے معلوم ہوا کہ بہت سے دین دار اور نو تعلیم یافتہ مسلمان اس درس سے بہت شغف رکھتے ہیں، افریقہ میں چونکہ یہ درس آخر شب یا بالکل صبح صادق کے وقت پہنچتا تھا، وہاں کے لوگوں نے اس کو ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے محفوظ کر کے بعد میں سب کو بار بار سنانے کا اہتمام کیا، اور جگہ جگہ سے اس کا تقاضا ہوا کہ اس درس کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ عام مسلمانوں کے اس اشتیاق نے اس ناکارہ کی ہمت بڑھادی اور امراض وضعف کے باوجود گیارہ سال تک یہ سلسلہ بڑی پابندی سے جاری رکھا، ۱۳۸۳ھ اور ۱۹۶۴ء میں جب درس کا سلسلہ بند ہوا تو بہت سے حضرات کی طرف سے یہ تقاضا ہوا کہ جتنا ہو چکا ہے اس کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے، اور درمیان میں جو آیات چھوڑی گئی ہیں ان کی بھی تکمیل کر دی جائے۔ بنام خدا یہ ارادہ کر لیا کہ موجودہ پر نظر ثانی اور درمیان سے باقی ماندہ آیات کی تکمیل کا کام شروع کیا جائے، چنانچہ ۱۶ صفر ۱۳۸۳ھ میں سورہ فاتحہ کی تفسیر پر نظر ثانی مکمل ہو گئی، اور سورہ بقرہ پر کام شروع کیا، اس میں احکام کی آیات مشککہ بہت ہیں جو ریڈیو پر نشری تقریر میں نہیں آئی تھیں، یہ کام بہت محنت اور فرصت کا متقاضی تھا، ہجوم مشاغل اور امراض نے فرصت نہ دی اور تقریباً یہ کام ذہول میں پڑ گیا۔

بہ نیرنگ تقدیر ایک شدید و طویل بیماری تکمیل تفسیر کا سبب بن گئی

۱۳۸۸ھ کے شعبان میں احقر کے اسفل بدن میں کچھ پھوڑے کی شکل نمودار ہوئی، اور رفتہ رفتہ بڑھتی گئی، آخر رمضان میں اس نے کھڑے ہونے سے معذور کر دیا، آخری آٹھ روزے بھی قضا ہوئے، گھر میں بیٹھ کر نماز ہونے لگی، اس کے ساتھ پاؤں میں نفرس کا پُرانا درد شروع ہوا، اس کا جو علاج پہلے کارگر ہو جاتا تھا وہ بھی کامیاب نہ ہوا، اور دونوں پاؤں سے معذور ہو گیا، تقریباً دس مہینے اسی طرح معذوری و بیماری کے ساتھ موت و حیات کی کشمکش میں گزرے، جب چلنے پھرنے اور ہر کام سے معذور ہو گیا، زندگی کی اُمید بھی مضحک ہو گئی تو اب اس پر افسوس ہوا کہ یہ تفسیری اوراق جس قدر ہو چکے تھے اُن پر نظرِ ثانی اور تکمیل بھی نہ ہو سکی، اب یہ اوراق یونہی ضائع ہو جائیں گے، حق تعالیٰ نے قلب میں ہمت عطا فرمائی اور شوال ۱۳۸۸ھ کے آخر میں بسترِ علالت پر ہی اللہ تعالیٰ نے اس کام کو شروع کر دیا، اور ۲۵ رذیقعدہ ۱۳۸۸ھ کو سورہ بقرہ کی تکمیل ہو کر کتابت و طباعت کے لئے دے دی، اس کے بعد سے عین بیماری و معذوری کی حالت میں یہ کام تدریجی رفتار سے چلتا رہا، اللہ تعالیٰ نے اس کی برکت سے دس ماہ کے بعد معذوری بھی رفع فرمادی تو رجب ۱۳۸۹ھ سے کام کسی قدر تیز ہوا، مگر اسی کے ساتھ ملک میں جدید انتخابات نے سیاسی ہنگاموں کا ایک طوفان کھڑا کر دیا، میں اگرچہ عرصہ دراز سے سیاست سے بالکل یکسو ہو چکا تھا، مگر ان انتخابات نے پاکستان میں خالص اسلامی حکومت کے بجائے کمیونزم اور سوشلزم پھیل جانے کے خطرات قوی کر دیئے، اور سوشلزم کو عین اسلام باور کرانے کے لئے جدوجہد اور جلسے و جلوس عام ہو گئے، اس مسئلے کی نزاکت نے پھر اس پر آمادہ کر دیا کہ کم از کم اسلام اور سوشلزم میں فرق اور سوشلزم کے خطرناک نتائج سے قوم کو آگاہ کرنے کی حد تک اس سیاسی میدان میں حصہ لیا جائے، اس کے لئے تحریری مقالے بھی لکھنے پڑے، اور مشرقی و مغربی پاکستان کے اہم مواقع میں جلسوں میں شرکت بھی کرنا پڑی، مسئلہ کی وضاحت تو مقدور بھر پوری ہو گئی، مگر سیاست کے میدان میں مسائل اور حقائق سے زیادہ زور و زکام کرتے ہیں، انتخابات کا نتیجہ بالکل خلاف اور برعکس نکلا، اس کے اثر سے پاکستان پر جو زوال آنا تھا وہ آ گیا، **لِلّٰهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ**۔

انتخابات کے بعد احقر نے پھر سیاست سے مستعفی ہو کر اپنا یہ کام شروع کیا، اور الحمد للہ علی کرمہ کہ رجب ۱۳۹۰ھ تک تیرہ پاروں کی ”معارف القرآن“ پر نظرِ ثانی اور درمیانی متروکہ آیات کی تفسیر بھی مکمل ہو گئی، اور سورہ ابراہیم سے سورہ نحل تک دو پاروں کی مزید تفسیر بھی لکھی گئی، اب قرآن مجید نصف کے قریب ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ہمت عطا فرمائی اور باقی ماندہ قرآن کی تفسیر لکھنا شروع کیا، اس کا اس وقت کوئی تصور نہیں تھا کہ پچھتر سال کی عمر اور سقوطِ قویٰ، اس کے ساتھ

مختلف قسم کے امراض کے تسلسل میں یہ تفسیر پوری ہو سکے گی، مگر یہ سمجھ کر کہ قرآن کو ختم کرنا مقصود نہیں، قرآن میں اپنی عمر کو ختم کرنا ہے، اللہ کے نام پر یہ سلسلہ شروع کر دیا، شعبان ۱۳۹۰ھ سے سورہ بنی اسرائیل کی تفسیر شروع ہوئی اور ۲۳ صفر ۱۳۹۱ھ کو قرآن کی چوتھی منزل سورہ فرقان پارہ ۱۹ تک مکمل ہو گئی۔

آگے قرآن کی تین منزلیں یعنی تقریباً ایک تہائی قرآن کریم باقی تھا، عمر کے ضعف اور مختلف قسم کے امراض کی بناء پر یہ خیال آیا کہ اس سب کی تکمیل تو شاید مجھ سے نہ ہو سکے، مگر درمیانی پانچویں اور چھٹی منزل کی تفسیر احقر نے ”احکام القرآن“ میں بزبان عربی لکھ دی ہے جو شائع بھی ہو چکی ہے، اگر میں اس کو نہ لکھ سکا تو میرے بعد بھی کوئی اللہ کا بندہ اسی ”احکام القرآن“ کی تفسیر کو اردو میں منتقل کر کے یہ حصہ پورا کر دے گا، اور اس کی وصیت بھی چند حضرات کو کر دی، اور درمیان کی یہ دو منزلیں چھوڑ کر آخری ساتویں منزل سورہ ق سے لکھنا شروع کر دیا، حق تعالیٰ کی مدد نے دستگیری فرمائی اور ۱۲ ربیع الاول ۱۳۹۱ھ سے شروع ہو کر شوال ۱۳۹۱ھ تک یہ آخری منزل پوری ہو گئی، صرف معوذتین یعنی آخری دو سورتیں چھوڑ دی گئیں۔

اب درمیانی دو منزلیں سورہ شعراء سے سورہ حجرات تک باقی تھیں، اللہ کے نام پر ان کو بھی شروع کر دیا، ان میں سورہ ص، صافات، زخرف تو برخوردار عزیزی مولوی محمد تقی سلمہ سے لکھوائی، اور خود اس پر نظر ثانی کر کے مکمل کیا، باقی سورتیں خود لکھنا شروع کیں، اور قرآن مجید کا تقریباً ڈیڑھ پارہ باقی رہ گیا تھا کہ ۲۲ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ - ۸ جون ۱۹۷۲ء کو اچانک مجھے قلب کا ایک شدید مرض پیش آیا کہ موت کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا، دیکھنے والے تھوڑی دیر کا مہمان سمجھتے تھے، کراچی میں امراض قلب کے ہسپتال میں غیر شعوری طور پر پہنچا دیا گیا، تین روز کے بعد ڈاکٹروں نے کچھ اطمینان کا اظہار کیا، جب کچھ ہوش و حواس درست ہوئے تو باقی ماندہ تفسیر کا خیال ایک حسرت بن کر رہ گیا، برخوردار عزیزی مولوی محمد تقی سلمہ کو وصیت کر دی کہ بقیہ کی تکمیل وہ کر دیں، اس طرح قلب کا کچھ بوجھ ہلکا ہو گیا، اللہ تعالیٰ کا ہزاراں ہزار شکر کہ اس نے اس مرض سے صحت بھی عطا فرمائی، اور تین مہینے کے بعد اتنی طاقت تھی کہ کچھ لکھنے پڑھنے کی ہمت ہونے لگی، مگر تھوڑی دیر کام کرنے سے دماغ، دل و نگاہ سب تھک جاتے تھے، محض حق تعالیٰ کا فضل و کرم ہی تھا کہ اس نے اسی حالت میں یہ بقیہ تفسیر ۲۱ شعبان ۱۳۹۲ھ روز شنبہ کو مکمل کرادی، اور حسن اتفاق سے یہی روز ۱۳۱۴ھ میں میری ولادت کا دن تھا، اس روز میری عمر کی ستتر منزلیں پوری ہو کر اٹھتر واں سال شروع ہوا۔

اس تفسیر کا آغاز ۱۳۸۸ھ کی شدید بیماری میں ہوا اور خاتمہ پانچ سال کے بعد ۱۳۹۲ھ کی شدید بیماری کے متصل بعد ہوا، یہ پانچ سال آخر عمر کے طبعی ضعف، مختلف قسم کے امراض کے تسلسل، افکار کے ہجوم اور ملک میں انقلابی ہنگاموں

کے سال تھے، انہی میں حق تعالیٰ نے اس تفسیر کے تقریباً سات ہزار صفحات اس ناکارہ کے قلم سے لکھوادیئے، اور یہ بات آنکھوں سے دکھادی کہ ۔

إِنَّ الْمَقَادِيرَ إِذَا سَاعَدَتْ

الْحَقَّ الْعَاجِزَ بِالْقَادِرِ

”یعنی جب تقدیر الہی مدد کرتی ہے تو عاجز کو قادر کے ساتھ ملا دیتی ہے۔“

علم و عمل پہلے ہی برائے نام تھا، اس ضعف و پیری اور امراض و مشاغل و ذواہل نے وہ رہا سہا بھی رخصت کر دیا، ان حالات میں کسی تصنیف خصوصاً قرآن کریم کی تفسیر کا ارادہ کرنا بھی ایک بڑی جسارت تھی، اطمینان اس پر تھا کہ اس میں میری اپنی کوئی چیز نہیں، اکابر علماء اور سلف صالحین کی تفسیر کو آسان زبان میں اہل عصر کی طبائع کے قریب بنانا میری ساری محنت کا حاصل تھا۔ میں نے آخر عمر کے پانچ سال کی یہ محنت شاقہ اس تمنا میں صرف کی کہ عصر جدید کے مسلمان جو عموماً علمی اصطلاحات اور علمی زبان سے بیگانہ ہو چکے ہیں، اکابر کی تفسیر کو ان کے لئے اقرب الی الفہم کر دوں تو شاید اس زمانے کے مسلمانوں کو اس سے نفع پہنچے، اور میرے لئے زادِ آخرت بن جائے۔ علمائے محققین اپنی علمی تحقیقات کے کمالات دکھلاتے ہیں، اس ناکارہ نے اپنی بے علمی کو اس پردے میں چھپایا ہے، اللہ تعالیٰ مجھ سے اپنی ستاری کا معاملہ فرمادیں، اور اس ناچیز کی خدمت کو قبول فرمادیں، جس میں کسی علمی کمال کا تو کوئی دخل نہیں، البتہ اپنے آپ کو تھکایا ضرور ہے، اور یہ تھکانا بھی اللہ ہی کی توفیق سے تھا، ورنہ ایک قدم چلنے کی بھی کیا مجال تھی، کاش! اللہ تعالیٰ میرے اس تھکنے پر نظر فرمائیں اور میری تقصیرات کو جو اس کی کتاب کریم کے حقوق ادا کرنے میں ہوئی معاف فرما کر اس کو شرف قبولیت عطا فرمادیں ۔

نہ بحرف ساختہ سرخوشم

نہ بہ نقش بستہ مشوشم

نفسے بیاد تو مے زخم

چہ عبارت وچہ معانیم

تصنیف کتاب کی یہ لمبی کہانی احقر کے لئے تو ایک یادداشت اور شکرگزاری کے لئے ایک تذکرہ ہے، مگر عام

یہ بھی اس حال میں کہ دارالعلوم کی انتظامی ذمہ داریوں اور فتوے کی مستقل خدمات کے علاوہ دوسرے اہم موضوعات پر دس مختصر اور مفصل کتابیں اور بھی لکھی گئیں جو شائع ہو چکی ہیں: ۱۔ احکام الحج (جو مختصر اور سلیس ہونے کے ساتھ تمام ضروری احکام کو جامع بھی ہے)۔ ۲۔ الیواقیت فی احکام المواعیت (مواعیت حج اور جدہ سے احرام کی تحقیق)۔ ۳۔ منہج النیر فی الحج عن الغیر (یعنی حج بدل کے احکام)۔ ۴۔ مقام صحابہؓ (مشاجرات صحابہ اور عدالت صحابہ کی مکمل بحث اور سلف صالحین کا طرز عمل)۔ ۵۔ اسلامی ذبیحہ (ذبیحہ کے شرعی احکام مفصل، یہود و نصاریٰ کے ذبیحہ کی حیثیت، تحریفات کی تردید)۔ ۶۔ اعضائے انسانی کی پیوندکاری۔ ۷۔ بیمہ زندگی۔ ۸۔ پراویڈنٹ فنڈ۔ ۹۔ اسلام اور سوشلزم۔ ۱۰۔ اسلامی نظام میں اقتصادی اصلاحات۔ فللہ الحمد والمنة۔ ۱۲ منہ

ترجمہ:- نہ حرف جوڑ کر میں خوش ہوں، نہ نقش و نگار بنا کر مجھے کچھ تشویش ہے، آپ کی یاد میں سانس لے رہا ہوں، کیا میری عبارت اور کیا اس کے معانی؟

لوگوں کے ذوق کی چیز نہیں، اس کے باوجود اس لئے لکھا کہ لوگوں کو میری اس جسارت کا عذر معلوم ہو جائے۔
جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ تفسیر قرآن پر مستقل تصنیف کے لئے جرأت کرنے کا میرے لئے دُور دُور بھی کوئی احتمال نہ تھا، مگر غیر ارادی طور پر اس کے اسباب ہوتے چلے گئے، البتہ زمانہ دراز سے ایک تمنا دل میں تھی کہ حکیم الامت مجدد الملت سیدی حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کی تفسیر ”بیان القرآن“ جو ایک بے نظیر، مختصر مگر جامع تفسیر اور سلف صالحین کی تفسیروں کا لب لباب ہے، لیکن وہ علمی زبان اور علمی اصطلاحات میں لکھی گئی ہے، آج کل کے عوام اس سے استفادہ کرنے سے قاصر ہو گئے ہیں، اس کے مضامین کو سہل زبان میں پیش کر دیا جائے، مگر یہ کام بھی کافی محنت اور فرصت چاہتا تھا، پاکستان میں آنے سے پہلے کچھ شروع بھی کیا، پھر رہ گیا تھا۔ ”معارف القرآن“ کی اس تحریر نے بحمد اللہ وہ آرزو بھی پوری کر دی، کیونکہ اس تفسیر کی بنیاد احقر نے ”بیان القرآن“ ہی کو بنایا ہے، جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

”معارف القرآن“ کی خصوصیات و التزامات

۱- تفسیر قرآن جو عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں ہو، اس میں سب سے اہم اور احتیاط کی چیز قرآن کا ترجمہ ہے، کیونکہ وہ اللہ کے کلام کی حکایت ہے، اس میں ادنیٰ سی کمی بیشی بھی اپنی طرف سے روا نہیں، اس لئے میں نے خود کوئی ترجمہ لکھنے کی ہمت نہیں کی، اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی، کیونکہ اکابر علماء یہ کام بڑی احتیاط کے ساتھ انجام دے چکے ہیں، اُردو زبان میں اس خدمت کو سب سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے دو فرزند ارجمند حضرت شاہ رفیع الدین اور حضرت شاہ عبدالقادر نے اپنے اپنے طرز میں انجام دیا، اول الذکر ترجمہ میں بالکل تحت اللفظ ترجمہ کو اختیار کیا گیا ہے، اُردو محاورہ کی بھی زیادہ رعایت نہیں رکھی گئی، اور بڑے کمال کے ساتھ قرآن کے الفاظ کو اُردو میں منتقل فرمایا ہے۔ اور دوسرے ترجمہ میں تحت اللفظ کے ساتھ اُردو محاورہ کی رعایت بھی ہے، جس کو حضرت شاہ عبدالقادر نے چالیس سال مسجد میں معتکف رہ کر پورا کیا ہے، یہاں تک کہ آپ کا جنازہ مسجد ہی سے نکلا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا فرمانا ہے کہ بلاشبہ یہ ترجمہ الہامی ہے، انسان کے بس کی بات نہیں کہ ایسا ترجمہ کر سکے۔ شیخ العرب والجم سیدی حضرت مولانا محمود الحسن صاحب نے اپنے وقت میں جب یہ دیکھا کہ اب بہت سے محاورات بدل جانے کی وجہ سے بعض مقامات میں ترمیم کی ضرورت ہے تو انہوں نے اسی ترجمہ کی یہ خدمت انجام دی، جو ”ترجمہ شیخ الہند“ کے نام سے معروف و مشہور ہوا، احقر نے قرآن کریم کے زیر متن اسی ترجمے کو بیعینہ لیا ہے۔

۲- سیدی حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ نے اصل تفسیر ”بیان القرآن“ کو اس انداز میں لکھا ہے کہ متن قرآن کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ ہی اس کی تفسیر و توضیح تو سین کے درمیان فرمائی ہے، ترجمہ کو اس کے اوپر خط دے کر اور تفسیر کو

بین القوسین لکھ کر ممتاز کر دیا ہے، اس طرح خط کشیدہ الفاظ میں ترجمہ قرآن ہے، اور بین القوسین اس کی تفسیر ہے، بہت سے لوگوں نے اسی خط کشیدہ ترجمہ کو الگ کر کے قرآن مجید کے زیرِ متن ترجمہ حکیم الامت کے نام سے خود حضرت کے زمانے میں شائع بھی کر دیا تھا۔

مجھے چونکہ ”بیان القرآن“ کی تسہیل کا کام پہلے سے پیش نظر تھا، اس وقت احقر نے حضرت کی اس تفسیر کو بنام ”خلاصہ تفسیر“ شروع میں بعینہ صرف ایک تصرف کے ساتھ نقل کر دیا ہے، وہ یہ کہ اس تفسیر میں جس جگہ خاص اصطلاحی اور مشکل الفاظ آئے تھے، وہاں ان کو آسان لفظوں میں منتقل کر دیا، اور اس کا نام ”خلاصہ تفسیر“ رکھنا اس لئے موزوں ہوا کہ خود حضرت نے ”خطبہ بیان القرآن“ میں اس کے متعلق فرمایا ہے کہ اس کو تفسیر مختصراً ترجمہ مطول کہا جاسکتا ہے۔

اور اگر کوئی مضمون ہی خالص علمی اور مشکل تھا تو اس کو یہاں سے الگ کر کے ”معارف و مسائل“ میں اپنی آسان عبارت میں لکھ دیا، تاکہ مشغول آدمی اگر زیادہ نہ دیکھ سکے تو اس ”خلاصہ تفسیر“ سے ہی کم از کم مفہوم قرآنی کو پورا سمجھ لے، ان دونوں چیزوں کا التزام جلد اول کی طبع اول میں پارہ اللہ کے رُبع اول آیت نمبر ۴۴، معارف جلد اول صفحہ: ۲۱۲ تک نہیں ہو سکا تھا، اب طبع ثانی میں اس حصے کو بھی مکمل کر کے پوری تفسیر کے مطابق کر دیا گیا ہے، البتہ ایک التزام جو جلد ثانی سے شروع ہوا کہ متن قرآن کے نیچے ترجمہ شیخ الہند لکھا جائے، یہ پہلی طباعت کی پوری جلد اول میں نہیں تھا، طبع ثانی میں اس کو بھی تحت المتن لکھ کر سب کے مطابق کر دیا گیا، یہ دونوں کام تو اکابر علماء کے تھے۔

۳- تیسرا کام جو احقر کی طرف منسوب ہے وہ ”معارف و مسائل“ کا عنوان ہے، اس میں بھی غور کیا جائے تو احقر کی صرف اردو عبارت ہی ہے، مضامین سب علمائے سلف کی تفسیر سے لئے ہوئے ہیں جن کے حوالے ہر جگہ لکھ دیئے ہیں، اس میں احقر نے چند چیزوں کا التزام کیا ہے:-

(الف) علماء کے لئے تفسیر قرآن میں سب سے پہلا اور اہم کام لغات کی تحقیق، نحوی ترکیب، فن بلاغت کے نکات اور اختلاف قراءت کی بحثیں ہیں، جو بلاشبہ اہل علم کے لئے فہم قرآن میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، اسی کے ذریعہ قرآن کے صحیح مفہوم کو پایا جاسکتا ہے۔ لیکن عوام تو عوام ہیں، آج کل کے بہت سے اہل علم بھی ان تفصیلات میں الجھن محسوس کرتے ہیں، بالخصوص عوام کے لئے تو یہ بحثیں ان کی فہم سے بالا اور اصل مقصد میں مغل بنتی ہیں، وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ قرآن کو سمجھ کر پڑھنا مشکل کام ہے، حالانکہ قرآن کریم کا جو اصل مقصد ہے کہ انسان کا تعلق اپنے رب کے ساتھ قوی ہو اور اس کے نتیجے میں مادی تعلقات اعتدال پر آجائیں کہ وہ دین کی راہ میں رُکاوٹ نہ بنیں، دُنیا سے زیادہ آخرت کی فکر پیدا ہو، اور انسان اپنے ہر قول و فعل پر یہ سوچنے کا عادی ہو جائے کہ اس میں کوئی چیز اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کے خلاف تو

نہیں، اس چیز کو قرآن نے اتنا آسان کر دیا ہے کہ معمولی لکھا پڑھا آدمی خود دیکھ کر اور بالکل اُن پڑھ جاہل سن کر بھی یہ فائدہ حاصل کر سکتا ہے، قرآن کریم نے خود اس کا اعلان فرما دیا ہے: **وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَكِّرٍ** ^(۱) (القمر)۔ تفسیر ”معارف القرآن“ میں عوام کی سہولت کے پیش نظر اُن علمی اور اصطلاحی بحثوں کی تفصیل نہیں لکھی گئی، بلکہ ائمہ تفسیر کے اقوال میں جس کو جمہور نے رائج قرار دیا ہے اس کے مطابق تفسیر لے لی گئی اور کہیں کہیں بضرورت یہ بحث بھی لی گئی ہے تو وہاں بھی اس کا لحاظ رکھا گیا کہ خالص علمی اصطلاحات اور غیر معروف اور مشکل الفاظ نہ آئیں، اور اسی لئے ایسی مباحث علمیہ کو بھی چھوڑ دیا گیا ہے جو عوام کے لئے غیر ضروری اور اُن کی سطح سے بلند ہیں۔

(ب) مستند و معتبر تفاسیر سے ایسے مضامین کو اہمیت کے ساتھ نقل کیا گیا ہے جو انسان کے دل میں قرآن کی عظمت اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی عظمت و محبت کو بڑھائیں، اور قرآن پر عمل اور اپنے اعمال کی اصلاح کی طرف مائل کریں۔

(ج) اس پر تو مومن کا ایمان ہے کہ قرآن کریم قیامت تک آنے والی نسلوں کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے، اور قیامت تک پیدا ہونے والے تمام مسائل کا حل اس میں موجود ہے، بشرطیکہ قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان و تشریح کی روشنی میں دیکھا اور پڑھا جائے، اور اس میں پورے تدبر سے کام لیا جائے، اسی لئے ہر زمانہ کے علمائے تفسیر نے اپنی اپنی تفسیروں میں اُن جدید مسائل اور مباحث پر زیادہ زور دیا ہے جو اُن کے زمانہ میں پیدا ہوئے، یا ملحدین اہل باطل کی طرف سے شکوک و شبہات کی صورت میں پیدا کر دیئے گئے، اسی لئے قرونِ متوسطہ کی تفسیریں معتزلہ، جہمیہ، صفوانیہ وغیرہ فرقوں کی تردید اور ان کے شبہات کے ازالہ سے پُر نظر آتی ہیں۔ احقر ناکارہ نے بھی اسی اصول کے تحت ایسے ہی مسائل اور مباحث کو اہمیت دی ہے جو یا تو اس زمانے کے مشینی دور نے نئے نئے پیدا کر دیئے، اور یا اس زمانہ کے ملحدین اور یہودی اور نصرانی مستشرقین نے مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لئے کھڑے کر دیئے، جدید مسائل کے حل کے لئے مقدور بھر اس کی کوشش کی ہے کہ قرآن و سنت یا فقہائے اُمت کے اقوال میں اس کا کوئی ثبوت ملے یا کم از کم اس کی کوئی نظیر ملے، اور الحمد للہ اس میں کامیابی ہوئی، ایسے مسائل میں دوسرے علمائے عصر سے مشورہ لینے کا بھی التزام کیا گیا ہے اور ملحدانہ شکوک و شبہات کے ازالہ میں بھی مقدور بھر اس کی کوشش رہی ہے کہ جوابِ اطمینان بخش ہو، اور اس جوابِ دہی کے لئے اسلامی مسائل میں ادنیٰ ترمیم کو گوارا نہیں کیا جیسا کہ دورِ حاضر کے بعض مصنفین نے اس جوابِ دہی میں خود اسلامی مسائل میں تاویلیں کر کے ترمیم کر ڈالنے کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ یہ سب کچھ اپنی معلومات اور اپنی کوشش کی حد تک ہے، جس میں بہت سی خطاؤں اور لغزشوں کا احتمال ہے، اللہ تعالیٰ معاف

فرمائیں اور ان کی اصلاح کا راستہ نکال دیں۔

مذکورہ الصدرات التزامات نے تفسیر ”معارف القرآن“ کو مندرجہ ذیل چیزوں کا جامع بنا دیا ہے:-

۱- قرآن مجید کے دو مستند ترجمے ایک حضرت شیخ الہندؒ کا جو دراصل شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا ترجمہ ہے، دوسرا حضرت حکیم الامت تھانویؒ کا ترجمہ۔

۲- ”خلاصہ تفسیر“ جو درحقیقت ”بیان القرآن“ کا خلاصہ مع تسہیل ہے جس کو علیحدہ بھی قرآن مجید کے حاشیہ پر طبع کر لیا جائے تو تھوڑی فرصت والوں کے لئے فہم قرآن کا مستند اور بہترین ذریعہ ہے، اس نے ایک اور ضرورت کو پورا کر دیا جس کی طرف مجھے انہی فی اللہ مولانا بدر عالم صاحب مہاجر مدینہ منورہ نے علامہ فرید وجدیؒ کی ایک مختصر تفسیر حاشیہ قرآن پر دکھلا کر توجہ دلائی تھی کہ کاش اردو میں بھی کوئی ایسی تفسیر ہوتی جو اس کی طرح مختصر اور آسان ہو، اللہ تعالیٰ نے اس سے یہ آرزو بھی پوری فرمادی، یہ دونوں چیزیں تو اکابر علماء کی مستند اور معروف ہیں۔

۳- تیسری چیز ”معارف و مسائل“ ہیں جو میری طرف منسوب ہیں، اور میری محنت کا محور ہیں، الحمد للہ کہ اس میں بھی میرا اپنا کچھ نہیں، سب اسلاف اُمت ہی سے لیا ہوا ہے، آج کل کے اہل علم و اہل قلم اکثر اس فکر میں رہتے ہیں کہ اپنی کوئی تحقیق اور اپنی طرف سے کوئی نئی چیز پیش کریں، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ اس سب کام میں میرا اپنا کچھ نہیں۔

ایں ہمہ گفتیم ولیک اندر پیچ

بے عنایات خدا پیچیم و پیچ

وَاللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰی اَسْأَلُ الصَّوَابَ وَالسَّدَادَ فِی الْمَبْدِئِ وَالْمَعَادِ وَبِهِ اَسْتَعِیْنُ مِنْ زَلَّةِ الْقَدَمِ فِیْمَا عَلِمْتُ وَمَا لَا اَعْلَمُ وَاِیَّاهُ اَسْأَلُ اَنْ یَّجْعَلَ خَالِصًا لِّوَجْهِهِ الْكَرِیْمِ وَاَنْ یَّتَقَبَّلَ مِنِّیْ كَمَا تَقْبَلُ مِنْ صَالِحِیْ عِبَادَةٍ وَاَنْ یَّنْفَعَنِیْ بِهٖ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ اَوَّلًا وَاٰخِرًا وَّظَاهِرًا وَّبَاطِنًا وَصَلِّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهِ وَصَفْوَةِ رُّسُلِهِ خَاتَمِ اَنْبِیَآئِهِ وَعَلٰی اٰلِهِ وَاَصْحَابِهِ اَجْمَعِیْنَ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا كَثِیْرًا۔

بندہ ضعیف و ناکارہ

محمد شفیع

خادم دارالعلوم کراچی

۲۵ شعبان ۱۳۹۲ھ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ

یہ مکی سورت ہے جس میں سات آیتیں ہیں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○

سورۃ فاتحہ کے فضائل اور خصوصیات

سورۃ فاتحہ کو قرآن کریم میں بہت سی خصوصیات حاصل ہیں، اول یہ کہ قرآن اسی سے شروع ہوتا ہے، نماز اسی سے شروع ہوتی ہے، اور نزول کے اعتبار سے بھی سب سے پہلی سورت جو مکمل طور پر نازل ہوئی یہی سورت ہے، سورۃ اقرأ، منزل اور مدثر کی چند آیات ضرور اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں، مگر مکمل سورت سب سے پہلے فاتحہ ہی نازل ہوئی ہے، جن حضرات صحابہؓ سے سورۃ فاتحہ کا اول منزل یعنی نزول میں سب سے پہلی سورت ہونا منقول ہے، اُن کا مطلب غالباً یہی ہے کہ پوری سورت اس سے پہلے اور کوئی نازل نہیں ہوئی، شاید اسی وجہ سے اس سورت کا نام بھی ”فاتحة الكتاب“ رکھا گیا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ سورت ایک حیثیت سے پورے قرآن کا متن اور سارا قرآن اس کی شرح ہے، خواہ اس وجہ سے کہ پورے قرآن کے مقاصد ایمان اور عمل صالح میں دائر ہیں، اور ان دونوں چیزوں کے بنیادی اصول اس سورت میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔ تفسیر ”روح المعانی“ اور ”روح البیان“ میں اس کا تفصیلی بیان ہے، اسی وجہ سے سورۃ فاتحہ کے نام اُمّ القرآن، اُمّ الكتاب اور قرآن عظیم بھی احادیث صحیحہ میں آئے ہیں۔ (قرطبی)

یا اس وجہ سے کہ اس سورت میں اس شخص کے لئے جو قرآن کی تلاوت یا مطالعہ شروع کرے ایک خاص ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اس کتاب کو اپنے تمام پچھلے خیالات اور نظریات سے خالی الذہن ہو کر خالص طلب حق اور راہ راست کی جستجو کے لئے پڑھے اور دیکھے، اور اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا بھی کرے کہ صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا ہو، اور شروع سورت میں اُس ذات کی حمد و ثنا کا بیان ہے جس کی بارگاہ میں یہ درخواست ہدایت پیش کرتا ہے، اور اسی درخواست کا جواب پورا قرآن ہے، جو اَللّٰهُمَّ اِنِّكَ الْكَتُوبُ سے شروع ہوتا ہے، گویا انسان نے جو اللہ تعالیٰ سے راہ راست طلب کی تھی اس کے جواب میں اِنِّكَ الْكَتُوبُ فرما کر اشارہ کر دیا گیا کہ جو تم مانگتے ہو وہ اس کتاب میں موجود ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ سورۃ فاتحہ کی نظیر

نہ توراۃ میں نازل ہوئی نہ انجیل اور زبور میں اور نہ خود قرآن کریم میں کوئی دوسری سورت اس کی مثل ہے۔ (رواہ الترمذی^[۱] عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ وَقَالَ: حَسَنٌ صَحِيحٌ، وَالْحَاكِمُ وَقَالَ: صَحِيحٌ عَلَى شَرْطِ مُسْلِمٍ، مِنَ الْمَظْهَرِ) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۃ فاتحہ ہر بیماری کی شفا ہے۔ (رواہ البیہقی فی شُعَبِ الْإِيمَانِ بِسَنَدٍ صَحِيحٍ، مَظْهَرِ)^[۲]

سورۃ فاتحہ کا ایک نام حدیث میں سورۃ شفاء بھی آیا ہے (قرطبی)،^[۳] اور صحیح بخاری^[۴] میں بروایت انسؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن کریم کی سب سورتوں میں عظیم ترین الحمد للہ رب العلمین ہے۔ (قرطبی)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

بسم اللہ قرآن کی ایک آیت ہے

اس پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ قرآن میں سورۃ نمل کا جزو ہے، اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ سوائے سورۃ توبہ کے ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ لکھی جاتی ہے، اس میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے کہ بسم اللہ سورۃ فاتحہ کا یا تمام سورتوں کا جزء ہے یا نہیں؟ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ بسم اللہ بجز سورۃ نمل کے اور کسی سورت کا جزء نہیں، بلکہ ایک مستقل آیت ہے جو ہر سورت کے شروع میں دو سورتوں کے درمیان فصل اور امتیاز ظاہر کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے۔

تلاوت قرآن اور ہر مہم کام کو بسم اللہ سے شروع کرنے کا حکم

اہل جاہلیت کی عادت تھی کہ اپنے کاموں کو بتوں کے نام سے شروع کیا کرتے تھے، اس رسم جاہلیت کو مٹانے کے لئے قرآن کی سب سے پہلی آیت جو جبریل امین لے کر آئے اس میں قرآن کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کا حکم دیا گیا: اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ - (علق: ۱)^[۵]

[۱] جامع الترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ما جاء في فاتحة الكتاب ج: ۲، ص: ۱۱۵

[۲] شعب الإيمان للبيهقي رقم الحديث: ۲۲۷۷، والتفسير المظهر ج: ۱، ص: ۲

[۳] تفسير القرطبي ج: ۱، ص: ۱۱۲

[۴] صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب ما جاء في فاتحة الكتاب ج: ۲، ص: ۲۲۲ وتفسير القرطبي ج: ۱، ص: ۱۱۲

[۵] ترجمہ:- پڑھو اپنے پروردگار کا نام لے کر۔

علامہ سیوطیؒ نے فرمایا کہ قرآن کے سوا دوسری تمام آسمانی کتابیں بھی بسم اللہ سے شروع کی گئی ہیں، اور بعض علماء نے فرمایا ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قرآن اور اُمتِ محمدیہ کی خصوصیات میں سے ہے، دونوں قول کی تطبیق یہ ہے کہ اللہ کے نام سے شروع کرنا تو تمام آسمانی کتابوں میں مشترک ہے، مگر الفاظ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قرآن کی خصوصیت ہے، جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ابتدا میں ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کے لئے ”بِسْمِکَ اَللّٰهُمَّ“ کہتے اور لکھتے تھے، جب آیت بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نازل ہوئی تو انہیں الفاظ کو اختیار فرمالیا، اور ہمیشہ کے لئے یہ سنت جاری ہو گئی۔ (قرطبی و روح المعانی) [۱]

قرآن کریم میں جا بجا اس کی ہدایت ہے کہ ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کیا جائے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مہم کام جو بِسْمِ اللّٰهِ سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت رہتا ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ گھر کا دروازہ بند کرو تو بِسْمِ اللّٰهِ کہو، چراغ گل کرو تو بِسْمِ اللّٰهِ کہو، برتن ڈھکو تو بِسْمِ اللّٰهِ کہو، کھانا کھانے، پانی پینے، وضو کرنے، سواری پر سوار ہونے اور اُترنے کے وقت بِسْمِ اللّٰهِ پڑھنے کی ہدایات قرآن و حدیث میں بار بار آئی ہیں۔ (قرطبی) [۲]

ہر کام کو بسم اللہ سے شروع کرنے کی حکمت

اسلام نے ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کی ہدایت دے کر انسان کی پوری زندگی کا رُخ اللہ تعالیٰ کی طرف اس طرح پھیر دیا ہے کہ وہ قدم قدم پر اس حلف و فاداری کی تجدید کرتا رہے کہ میرا وجود اور میرا کوئی کام بغیر اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادے اور اس کی امداد کے نہیں ہو سکتا، جس نے اس کی ہر نقل و حرکت اور تمام معاشی اور دنیوی کاموں کو بھی ایک عبادت بنادیا۔

عمل کتنا مختصر ہے کہ نہ اس میں کوئی وقت خرچ ہوتا ہے نہ محنت، اور فائدہ کتنا کیمیائی اور بڑا ہے کہ دُنیا بھی دین بن گئی۔ ایک کافر بھی کھانا پیتا ہے اور ایک مسلمان بھی، مگر مسلمان اپنے لقمے سے پہلے بسم اللہ کہہ کر یہ اقرار کرتا ہے کہ یہ لقمہ زمین سے پیدا ہونے سے لے کر پک کر تیار ہونے تک آسمان و زمین اور سیاروں اور ہوا و فضائی مخلوقات کی طاقتیں، پھر لاکھوں انسانوں کی محنت صرف ہو کر تیار ہوا ہے، اس کا حاصل کرنا میرے بس میں نہ تھا، اللہ ہی کی ذات ہے جس نے ان تمام مراحل سے گزار کر یہ لقمہ یا گھونٹ مجھے عطا فرمایا ہے۔ مومن و کافر دونوں سوتے جاگتے بھی ہیں، چلتے پھرتے بھی ہیں، مگر ہر مومن سونے سے پہلے اور بیدار ہونے کے وقت اللہ کا نام لے کر اللہ کے ساتھ اسی طرح اپنے رابطے کی تجدید کرتا

ہے جس سے یہ تمام دُنیاوی اور معاشی ضرورتیں ذِکرِ خدا بن کر عبادت میں لکھی جاتی ہیں۔ مؤمن سواری پر سوار ہوتے ہوئے بسم اللہ کہہ کر گویا یہ شہادت دیتا ہے کہ اس سواری کا پیدا کرنا یا مہیا کرنا، پھر اس کو میرے قبضے میں دے دینا انسان کی قدرت سے باہر چیز ہے، رَبِّ الْعِزَّتِ ہی کے بنائے ہوئے نظامِ محکم کا کام ہے کہ کہیں کی لکڑی، کہیں کا لوہا، کہیں کی مختلف دھاتیں، کہیں کے کاریگر، کہیں کے چلانے والے سب کے سب میری خدمت میں لگے ہوئے ہیں، چند پیسے خرچ کرنے سے اتنی بڑی خلقِ خدا کی محنت کو ہم اپنے کام میں لا سکتے ہیں، اور وہ پیسے بھی ہم اپنے ساتھ کہیں سے نہیں لائے تھے، بلکہ اس کے حاصل کرنے کے تمام اسباب بھی اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ غور کیجئے کہ اسلام کی صرف اسی ایک ہی مختصر سی تعلیم نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ **بِسْمِ اللّٰهِ** ایک نسخہٴ اکسیر ہے جس سے تانبے کا نہیں بلکہ خاک کا سونا بنتا ہے، فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ عَلَى دِينِ الْاِسْلَامِ وَتَعْلِيْمَاتِهِ۔

مسئلہ:- قرآن کی تلاوت شروع کرنے کے وقت اول اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ اور پھر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھنا سنت ہے، اور درمیانِ تلاوت بھی سورۃ براءت کے علاوہ ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا سنت ہے۔

اس تمہید کے بعد آیت **بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ** کی تفسیر دیکھئے:-

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کی تفسیر

بِسْمِ اللّٰهِ، یہ کلمہ تین لفظوں سے مرکب ہے، ایک حرفِ باء، دوسرے اسم، تیسرے اللہ۔ حرفِ باء عربی زبان میں بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتی ہے، جن میں سے تین معنی مناسب مقام ہیں، ان میں سے ہر ایک معنی اس جگہ لئے جاسکتے ہیں:-

اول: مصاحبت، یعنی کسی چیز کا کسی چیز سے متصل ہونا۔ دوسرے: استعانت، یعنی کسی چیز سے مدد حاصل کرنا۔ تیسرے: تبرک، یعنی کسی چیز سے برکت حاصل کرنا۔

لفظ **اِسْم** میں لغوی اور علمی تفصیلات بہت ہیں، جن کا جاننا عوام کے لئے ضروری نہیں، اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اُردو میں اس کا ترجمہ ”نام“ سے کیا جاتا ہے۔

لفظ اللہ، اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سب سے بڑا اور سب سے زیادہ جامع نام ہے، اور بعض علماء نے اسی کو اسمِ اعظم کہا ہے، اور یہ نام اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا، اس لئے اس لفظ کا شنیہ اور جمع نہیں آتے، کیونکہ اللہ واحد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نام ہے اس موجود حق کا جو تمام صفاتِ کمال کا جامع اور صفاتِ رُبوبیت کے ساتھ متصف، یکتا اور بے مثال ہے۔

اس لئے کلمہ بِسْمِ اللّٰہ کے معنی حرفِ باء کے مذکورہ تین معنی کی ترتیب سے یہ ہوئے:-

اللہ کے نام کے ساتھ، اللہ کے نام کی مدد سے، اللہ کے نام کی برکت سے،

لیکن تینوں صورتوں میں یہ ظاہر ہے کہ یہ کلام نامکمل ہے، جب تک اس کام کا ذکر نہ کیا جائے جو اللہ کے نام کے ساتھ یا اس کے نام کی برکت سے کرنا مقصود ہے، اس لئے نحوی قاعدے کے مطابق یہاں کوئی فعل مناسب مقام محذوف ہوتا ہے، مثلاً ”شروع کرتا ہوں یا پڑھتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ۔“

اور مناسب یہ ہے کہ یہ فعل بھی بعد میں محذوف مانا جائے، تاکہ حقیقت شروع اسم اللہ ہی سے ہو، وہ فعل محذوف بھی اسم اللہ سے پہلے نہ آئے، صرف حرفِ باء کا اسم اللہ سے پہلے آنا عربی زبان کے لحاظ سے ضروری و ناگزیر ہے، اس میں بھی مصحف عثمانی میں باجماع صحابہؓ یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ حرفِ باء رسم الخط کے قاعدے سے ”الف“ کے ساتھ ملا کر لکھنا چاہئے تھا، اور لفظ ”اسم“ الگ، جس کی صورت ہوتی: ”بسم اللہ“، لیکن مصحف عثمانی کے رسم الخط میں حرفِ ہمزہ کو حذف کر کے حرفِ باء کو ”سین“ کے ساتھ ملا کر صورت ”اسم“ کا جزء بنادیا، تاکہ شروع اسم اللہ سے ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ دوسرے مواقع میں یہ حرفِ الف حذف نہیں کیا جاتا، جیسے اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ (علق: ۱) میں ”ب“ کو ”الف“ کے ساتھ لکھا جاتا ہے، یہ صرف بسم اللہ کی خصوصیت ہے کہ حرفِ باء کو ”سین“ کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔

الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ، یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، رَحْمٰن کے معنی عام الرحمة کے اور رَحِیْم کے معنی تام الرحمة کے ہیں، عام الرحمة سے مطلب یہ ہے کہ وہ ذات جس کی رحمت سارے عالم اور ساری کائنات اور جو کچھ اب تک پیدا ہوا ہے اور جو کچھ ہوگا سب پر حاوی اور شامل ہو، اور تام الرحمة کا مطلب یہ ہے کہ اس کی رحمت کامل و مکمل ہو۔

یہی وجہ ہے کہ لفظ رَحْمٰن اللہ جل شانہ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، کسی مخلوق کو ”رحمن“ کہنا جائز نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں ہو سکتا جس کی رحمت سے عالم کی کوئی چیز خالی نہ رہے، اسی لئے جس طرح لفظ ”اللہ“ کا جمع اور تشبیہ نہیں آتا ”رحمن“ کا بھی جمع و تشبیہ نہیں آتا، کیونکہ وہ ایک ہی ذاتِ پاک کے ساتھ مخصوص ہے، دوسرے اور تیسرے کا وہاں احتمال ہی نہیں۔ (تفسیر قرطبی) بخلاف لفظ رَحِیْم کے کہ اس کے معنی میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کا پایا جانا مخلوق میں ناممکن ہو، کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص کسی شخص سے پوری پوری رحمت کا معاملہ کرے۔

اسی لئے لفظ رَحِیْم انسان کے لئے بھی بولا جاسکتا ہے، قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی یہ لفظ استعمال فرمایا ہے: بِاِسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ رَءَوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۷۸﴾ - (التوبہ)

مسئلہ:- اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آج کل ”عبدالرحمن“، ”فضل الرحمن“ وغیرہ ناموں میں تخفیف کر کے ”رحمن“ کہتے ہیں، اور اس شخص کو اس لفظ سے خطاب کرتے ہیں، یہ ناجائز و گناہ ہے۔

حکمت

بسم اللہ میں اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور صفات کمال میں سے صرف دو صفتیں ذکر کی گئی ہیں، اور وہ دونوں لفظِ رحمت سے مشتق ہیں، اور وسعتِ رحمت اور کمالِ رحمت پر دلالت کرنے والی ہیں، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تخلیقِ عالم اور آسمان، زمین اور تمام کائنات کے پیدا کرنے اور ان کو پالنے وغیرہ کا منشا اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت ہے، نہ اس کو ان چیزوں کی خود کوئی ضرورت تھی نہ کوئی دوسرا ان چیزوں کے پیدا کرنے پر مجبور کرنے والا تھا، صرف اسی کی رحمت کے تقاضے سے یہ ساری چیزیں اور ان کی پرورش کے سارے انتظامات وجود میں آئے ہیں۔

ما نبودیم وتقاضا ما نبود

لطف تو ناگفتہ ما می شنود

احکام و مسائل

مسئلہ تعوذ

تعوذ کے معنی ہیں اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ پڑھنا، قرآنِ کریم میں ارشاد ہے: فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِْذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ① (النحل) یعنی ”جب تم قرآن کی تلاوت کرو تو اللہ سے پناہ مانگو شیطانِ مردود کے شر سے۔“
قراءتِ قرآن سے پہلے تعوذ پڑھنا باجماع امت سنت ہے، خواہ تلاوت نماز کے اندر ہو یا خارج نماز (شرح منیہ)۔
تعوذ پڑھنا تلاوتِ قرآن کے ساتھ مخصوص ہے، علاوہ تلاوت کے دوسرے کاموں کے شروع میں صرف بسم اللہ پڑھی جائے، تعوذ مسنون نہیں۔ (عالمگیری، باب رابع، من الکراہیۃ)

جب قرآن شریف کی تلاوت کی جائے اس وقت اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اور بِسْمِ اللّٰهِ دونوں پڑھی جائیں، درمیانِ تلاوت

① ترجمہ:- ہم نہیں تھے اور ہماری طرف سے کوئی تقاضا بھی نہیں تھا، آپ کی مہربانی نے ہماری وہ دعا بھی سن لی جو ہم نے نہیں مانگی تھی۔

② شرح منیہ ص: ۳۰۳، ۳۰۴

③ ج: ۵ ص: ۳۱۶

میں جب ایک سورت ختم ہو کر دوسری شروع ہو تو سورہ براءت کے علاوہ ہر سورت کے شروع میں مکرر بسم اللہ پڑھی جائے، اعوذ باللہ نہیں، اور سورہ براءت اگر درمیان تلاوت میں آجائے تو اس پر بسم اللہ نہ پڑھے، اور اگر قرآن کی تلاوت سورہ براءت ہی سے شروع کر رہا ہے تو اس کے شروع میں اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھنا چاہئے۔ (عالمگیریہ عن المحيط)^[۱]

احکام بسم اللہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قرآن مجید میں سورہ نمل میں آیت کا جزء ہے، اور ہر دو سورتوں کے درمیان مستقل آیت ہے، اس لئے اس کا احترام قرآن مجید ہی کی طرح واجب ہے، اس کو بے وضو ہاتھ لگانا جائز نہیں (علی مختار الکرنی صاحب الکافی والہدایہ، شرح منیہ)۔ اور جنابت یا حیض و نفاس کی حالت میں اس کو بطور تلاوت پڑھنا بھی پاک ہونے سے پہلے جائز نہیں، ہاں کسی کام کے شروع میں، جیسے کھانے پینے سے پہلے بطور دعا پڑھنا ہر حال میں جائز ہے۔ (شرح منیہ کبیر)^[۲]

مسئلہ:- پہلی رکعت کے شروع میں اَعُوْذُ بِاللّٰهِ کے بعد **بِسْمِ اللّٰهِ** پڑھنا مسنون ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آواز سے پڑھا جائے یا آہستہ، امام اعظم ابو حنیفہ اور بہت سے دوسرے ائمہ آہستہ پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

پہلی رکعت کے بعد دوسری رکعتوں کے شروع میں بھی **بِسْمِ اللّٰهِ** پڑھنا چاہئے، اس کے مسنون ہونے پر سب کا اتفاق ہے، اور بعض روایات میں ہر رکعت کے شروع میں **بِسْمِ اللّٰهِ** پڑھنے کو واجب کہا گیا ہے۔ (شرح منیہ)^[۳]

مسئلہ:- نماز میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ شروع کرنے سے پہلے **بِسْمِ اللّٰهِ** نہیں پڑھنا چاہئے، خواہ جہری نماز ہو یا سری، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین سے ثابت نہیں ہے، شرح منیہ میں اسی کو امام اعظم اور ابو یوسف کا قول لکھا ہے، اور شرح منیہ، درمختار، برہان وغیرہ میں اسی کو ترجیح دی ہے، مگر امام محمد کا قول یہ ہے کہ سری نمازوں میں پڑھنا بہتر ہے، بعض روایات میں یہ قول ابو حنیفہ کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے، اور شامی نے بعض فقہاء سے اس کی ترجیح بھی نقل کی ہے، ”بہشتی زیور“ میں بھی اسی کو اختیار کیا گیا ہے، اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ کوئی پڑھ لے تو مکروہ نہیں۔ (شامی)^[۴]

[۲] شرح منیہ کبیر ص: ۵۷

[۱] بحوالہ بالا۔

[۳] شرح منیہ ص: ۳۰۸، ۳۰۹

[۲] شرح منیہ ص: ۳۰۶

[۴] ج: ۱ ص: ۲۹۰

[۵] حصہ دوم ص: ۲۰

آیتھا ۷ ۱ سُورَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ ۵ رکوعمَا ۱

اس میں سات آیتیں ہیں، سورہ فاتحہ مکہ میں نازل ہوئی، اور ایک رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۱

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۱ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۲ مُلِكِ يَوْمِ الدِّينِ ۳

سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو پالنے والا سارے جہان کا۔ بے حد مہربان نہایت رحم والا۔ مالک روزِ جزا کا۔

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۴ اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۵ صِرَاطَ

تیری ہی ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ بتلا ہم کو راہِ سیدھی۔ راہ

الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۶ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۷

اُن لوگوں کی جن پر تو نے فضل فرمایا، جن پر نہ تیرا غصہ ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے

آسان ترجمہ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

تمام تعریفیں اللہ کی ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے ۱ جو سب پر مہربان، بہت مہربان ہے ۲ جو روزِ جزا کا

مالک ہے ۳ (اے اللہ!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں ۴ ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت

عطا فرما ۵ اُن لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام کیا ہے ۶ نہ کہ اُن لوگوں کے راستے کی جن پر غضب نازل ہوا

ہے، اور نہ اُن کے راستے کی جو بھٹکے ہوئے ہیں ۷

خلاصہ تفسیر

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں، الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ سب تعریفیں

اللہ کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے (مخلوقات الگ الگ جنس ایک ایک عالم کہلاتا ہے، مثلاً عالم ملائکہ، عالم انسان، عالم جن)، الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں، مَلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ جو مالک ہیں روزِ جزا کے (مراد قیامت کا دن ہے جس میں ہر شخص اپنے عمل کا بدلہ پاوے گا)، اِیَّاكَ تَعْبُدُوْا اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواستِ اعانت کی کرتے ہیں، اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ بتلا دیجئے ہم کو راستہ سیدھا (مراد دین کا راستہ ہے)، صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا (مراد دین کا انعام ہے)، غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّالِّیْنَ نہ راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ کا غضب ہوا، اور نہ اُن لوگوں کا جو راستہ سے گم ہو گئے (راہِ ہدایت چھوڑنے کی دو وجہ ہوا کرتی ہیں، ایک تو یہ کہ اس کی پوری تحقیق ہی نہ کرے، ضَالِّیْنَ سے ایسے لوگ مراد ہیں، دوسری وجہ یہ ہے کہ تحقیق پوری ہونے کے باوجود اس پر عمل نہ کرے، مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ سے ایسے لوگ مراد ہیں، کیونکہ جان بوجھ کر خلاف کرنا زیادہ ناراضی کا سبب ہوتا ہے)۔

معارف مسائل

سورۃ فاتحہ کے مضامین

سورۃ فاتحہ سات آیتوں پر مشتمل ہے، جن میں سے پہلی تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے، اور آخری تین آیتوں میں انسان کی طرف سے دُعا و درخواست کا مضمون ہے، جو ربِّ العزت نے اپنی رحمت سے خود ہی انسان کو سکھایا ہے، اور درمیانی ایک آیت میں دونوں چیزیں مشترک ہیں، کچھ حمد و ثنا کا پہلو ہے، کچھ دُعا و درخواست کا۔ صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ منقول ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نماز (یعنی سورۃ فاتحہ) میرے اور میرے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے، نصف میرے لئے ہے اور نصف میرے بندے کے لئے، اور جو کچھ میرا بندہ مانگتا ہے وہ اس کو دیا جائے گا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ جب کہتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”میرے بندے نے میری حمد کی ہے“ اور جب وہ کہتا ہے: الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”میرے بندے نے میری تعریف و ثناء بیان کی ہے“ اور جب بندہ کہتا ہے: مَلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی ہے“ اور جب بندہ کہتا ہے: اِیَّاكَ تَعْبُدُوْا اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے“ کیونکہ اس میں ایک پہلو حق تعالیٰ کی حمد و ثنا کا ہے، اور دوسرا پہلو بندے کی دُعا و درخواست کا، اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا کہ: ”میرے بندے کو وہ چیز ملے گی جو اس نے مانگی۔“ پھر جب بندہ کہتا ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (آخر تک) تو

حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”یہ سب میرے بندے کے لئے ہے، اور اس کو وہ چیز ملے گی جو اس نے مانگی۔“ (مظہری) ^۱
اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کے معنی یہ ہیں کہ سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں، یعنی دنیا میں جہاں کہیں کسی چیز کی تعریف کی جاتی ہے، وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی تعریف ہے، کیونکہ اس جہاں رنگ و بو میں جہاں ہزاروں حسین مناظر اور لاکھوں دل کش نظارے اور کروڑوں نفع بخش چیزیں انسان کے دامنِ دل کو ہر وقت اپنی طرف کھینچتی رہتی ہیں اور اپنی تعریف پر مجبور کرتی ہیں، اگر ذرا نظر کو گہرا کیا جائے تو ان سب چیزوں کے پردے میں ایک ہی دستِ قدرت کا فرمانظر آتا ہے، اور دنیا میں جہاں کہیں کسی چیز کی تعریف کی جاتی ہے اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں جیسے کسی نقش و نگار یا تصویر کی یا کسی صنعت کی تعریف کی جائے کہ یہ سب تعریفیں درحقیقت نقاش اور مصور کی یا صانع کی ہوتی ہیں، اس جملے نے کثرتوں کے تلاطم میں پھنسے ہوئے انسان کے سامنے ایک حقیقت کا دروازہ کھول کر یہ دکھلادیا کہ یہ ساری کثرتیں ایک ہی وحدت سے مربوط ہیں، اور ساری تعریفیں درحقیقت اسی ایک قادرِ مطلق کی ہیں، ان کو کسی دوسرے کی تعریف سمجھنا نظر و بصیرت کی کوتاہی ہے۔

حمد ربا تو نسبت است درست

بردر ہر کہ رفت بر در تست ^۲

اور یہ ظاہر ہے کہ جب ساری کائنات میں لائقِ حمد درحقیقت ایک ہی ذات ہے تو عبادت کی مستحق بھی وہی ذات ہو سکتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ **اَلْحَمْدُ لِلّٰہ** اگرچہ حمد و ثنا کے لئے لایا گیا ہے، لیکن اس ضمن میں ایک معجزانہ انداز سے مخلوق پرستی کی بنیاد ختم کر دی گئی، اور دل نشین طریق پر توحید کی تعلیم دی گئی ہے۔

غور کیجئے کہ قرآن کے اس مختصر سے ابتدائی جملے میں ایک طرف تو حق تعالیٰ کی حمد و ثنا کا بیان ہوا، اسی کے ساتھ مخلوقات کی رنگینوں میں اُلجھے ہوئے دل و دماغ کو ایک حقیقت کی طرف متوجہ کر کے مخلوق پرستی کی جڑ کاٹ دی گئی، اور معجزانہ انداز سے ایمان کے سب سے پہلے رکن توحید باری کا نقش اس طرح جمادیا گیا کہ جو دعویٰ ہے اس میں غور کرو تو وہی اپنی دلیل بھی ہے: **فَتَبَارَكَ اللهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ** ^۳ (المؤمنون)

رَبِّ الْعَالَمِينَ کی تفسیر

اس مختصر ابتدائی جملے کے بعد اللہ تعالیٰ کی پہلی صفت **رَبِّ الْعَالَمِينَ** ذکر کی گئی ہے، مختصر الفاظ میں اس کی بھی

تشریح دیکھئے:-

^۱ التفسیر المظہری ج: ۱ ص: ۱۱، صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب وجوب قراءة الفاتحة الخ ج: ۱ ص: ۱۶۹

^۲ ترجمہ:- حمد کی نسبت صرف تیری طرف درست ہے، کوئی جس دروازے پر بھی چلا جائے وہ تیرے ہی دروازے پر ہے۔

^۳ ترجمہ:- غرض بڑی شان ہے اللہ کی جو سارے کارگروں سے بڑھ کر کارگر ہے!

لفظ ”رَبِّ“ کے معنی عربی لغت کے اعتبار سے تربیت و پرورش کرنے والے کے ہیں، اور تربیت اس کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کو اس کے تمام مصالح کی رعایت کرتے ہوئے درجہ بدرجہ آگے بڑھایا جائے یہاں تک کہ وہ حدِ کمال کو پہنچ جائے۔ یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک کے لئے مخصوص ہے، کسی مخلوق کو بدونِ اضافت کے رَبِّ کہنا جائز نہیں، کیونکہ ہر مخلوق خود محتاجِ تربیت ہے، وہ کسی دوسرے کی کیا تربیت کر سکتا ہے۔

الْعَالَمِينَ عالم کی جمع ہے، جس میں دُنیا کی تمام اجناس، آسمان، چاند، سورج اور تمام ستارے اور ہوا و فضا، برق و باران، فرشتے، جنات، زمین اور اس کی تمام مخلوقات، حیوانات، انسان، نباتات، جمادات سب ہی داخل ہیں، اس لئے رَبِّ الْعَالَمِينَ کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ تمام اجناس کا سنات کی تربیت کرنے والے ہیں، اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ جیسا یہ ایک عالم ہے جس میں ہم بستے ہیں اور اس کے نظامِ شمسی و قمری اور برق و باران اور زمین کی لاکھوں مخلوقات کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں، یہ سارا ایک ہی عالم ہو، اور اسی جیسے اور ہزاروں لاکھوں دوسرے عالم ہوں جو اس عالم سے باہر کی خلا میں موجود ہوں، امام رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں فرمایا ہے کہ اس عالم سے باہر ایک لامتناہی خلا کا وجود دلائلِ عقلیہ سے ثابت ہے، اور یہ بھی ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت ہے، اُس کے لئے کیا مشکل ہے کہ اُس نے اس لامتناہی خلا میں ہمارے پیشِ نظر عالم کی طرح کے اور بھی ہزاروں لاکھوں عالم بنا رکھے ہوں۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے منقول ہے کہ ”عالم چالیس ہزار ہیں، یہ دُنیا مشرق سے مغرب تک ایک عالم ہے، باقی اس کے سوا ہیں۔“ اسی طرح حضرت مقاتلؓ امام تفسیر سے منقول ہے کہ ”عالم اسی ہزار ہیں“ (قرطبی)۔ اس پر جو یہ شبہ کیا جاتا تھا کہ خلا میں انسانی مزاج کے مناسب ہونا نہیں ہوتی، اس لئے انسان یا کوئی حیوان وہاں زندہ نہیں رہ سکتا، امام رازیؒ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ کیا ضروری ہے کہ اس عالم سے خارج خلا میں جو دوسرے عالم کے باشندے ہوں اُن کا مزاج بھی ہمارے عالم کے باشندوں کی طرح ہو جو خلا میں زندہ نہ رہ سکیں، یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ اُن عالموں کے باشندوں کے مزاج و طبائع، ان کی غذا و ہوا یہاں کے باشندوں سے بالکل مختلف ہو۔

یہ مضمون تو آب سے سات سو ستتر سال پہلے کے اسلامی فلاسفر امام رازیؒ کا لکھا ہوا ہے، جبکہ فضا و خلا کی سیر اور اس کی پیمائش کے آلات و ذرائع ایجاد نہ ہوئے تھے، آج راکٹوں اور اسپینکوں کے زمانے میں خلا کے مسافروں نے جو کچھ آکر بتلایا وہ بھی اس سے زیادہ نہیں کہ اس عالم سے باہر کی خلا کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے، اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس غیر متناہی خلا میں کیا کچھ موجود ہے، اس دُنیا سے قریب ترین سیاروں، چاند اور مریخ کی آبادی کے بارے میں جو قیاسات

تفصیل کے لئے دیکھئے التفسیر الکبیر ج: ۱ ص: ۲۲۸

تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۱۳۸

آج کے جدید ترین ماہرین سائنس پیش کر رہے ہیں وہ بھی یہی ہیں کہ اگر ان سیارات کے اوپر کچھ لوگ آباد ہیں تو یہ ضروری نہیں کہ وہ انہیں خصوصیات اور اسی مزاج و طبیعت کے ہوں جو اس عالم کے انسان اور حیوانات و نباتات کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں، بلکہ قرین قیاس یہ ہے کہ اُن کے مزاج و طبیعت، ان کی غذا و ضروریات یہاں کے لوگوں سے بالکل مختلف ہوں، اس لئے ایک کو دوسرے پر قیاس کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

امام رازیؒ کی تائید اور اس سلسلے کی جدید معلومات کے لئے وہ مقالہ کافی ہے جو امریکی خلائی مسافر جان گلین نے حال میں خلا کے سفر سے واپس آ کر شائع کرایا ہے، جس میں شعاعی سال کا نام دے کر ایک طویل مدت و مسافت کا پیمانہ قائم کیا، اور اس کے ذریعے اپنی وسعت فکر کی حد تک خلا کا کچھ اندازہ لگایا اور پھر یہ اقرار کیا کہ کچھ نہیں بتلایا جاسکتا کہ خلا کی وسعت کتنی اور کہاں تک ہے۔

قرآن کے اس مختصر جملے کے ساتھ اب تمام عالم اور اس کی کائنات پر نظر ڈالئے، اور پنچشم بصیرت دیکھئے کہ حق تعالیٰ نے تربیتِ عالم کا کیسا مضبوط اور محکم، محیر العقول نظام بنایا ہے، افلاک سے لے کر عناصر تک، سیارات و نجوم سے لے کر ذرات تک ہر چیز اس سلسلہ نظام میں بندھی ہوئی، اور حکیم مطلق کی خاص حکمت بالغہ کے ماتحت ہر چیز اپنے اپنے کام میں مصروف ہے۔ ایک لقمہ جو انسان کے منہ تک پہنچتا ہے، اگر اس کی پوری حقیقت پر انسان غور کرے تو معلوم ہوگا کہ اس کی تیاری میں آسمان اور زمین کی تمام قوتیں اور کروڑوں انسانوں اور جانوروں کی محنتیں شامل ہیں، سارے عالم کی قوتیں مہینوں مصروفِ خدمت رہیں جب یہ لقمہ تیار ہوا، اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ انسان اس میں غور و تدبر سے کام لے اور سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے لے کر زمین تک اپنی تمام مخلوقات کو اس کی خدمت میں لگا رکھا ہے، تو جس ہستی کو اس نے مخدوم کائنات بنا رکھا ہے وہ بھی بیکار و بیہودہ نہیں ہو سکتی، اس کا بھی کوئی کام ہوگا، اس کے ذمے بھی کوئی خدمت ہوگی۔

ابر و باد و مه و خورشید و فلک در کار اند

تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرمانبردار

شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبیری

قرآن حکیم نے انسانی آفرینش اور اس کے مقصدِ حیات کو اس آیت میں واضح فرمایا ہے:-

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴿۵۱﴾ (الذاریات)

۱ ترجمہ:- بادل، ہوا، چاند، سورج اور آسمان سب تیرے کام میں لگے ہوئے ہیں، تاکہ تو روٹی ہاتھ میں لے کر غفلت کے ساتھ نہ کھائے۔

۲ ترجمہ:- سب تیرے لئے پریشان اور تیرے فرمانبردار ہیں تو اگر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہ کرے تو یہ انصاف نہیں ہے۔

”میں نے جن اور انسان کو اور کسی کام کے لئے نہیں بنایا بجز اس کے کہ وہ میری عبادت کریں۔“
تقریر مذکور سے معلوم ہوا کہ رَبِّ الْعَالَمِينَ ایک حیثیت سے پہلے جملے الْحَمْدُ لِلّٰہ کی دلیل ہے کہ جب تمام کائنات کی تربیت و پرورش کی ذمہ دار صرف ایک ذات اللہ تعالیٰ کی ہے تو حمد و ثنا کی حقیقی مستحق بھی وہی ذات ہو سکتی ہے، اس لئے پہلی آیت الْحَمْدُ لِلّٰہ رَبِّ الْعَالَمِينَ میں حمد و ثنا کے ساتھ ایمان کے سب سے پہلے رکن توحید باری تعالیٰ کا بیان بھی مؤثر انداز میں آگیا۔

دوسری آیت میں صفتِ رحمت کا ذکر بلفظ صفت رَحْمٰن و رَحِیْم کیا گیا ہے، یہ دونوں صیغے مبالغہ کے ہیں، جن میں رحمتِ خداوندی کی وسعت و کثرت اور کمال کا بیان ہے، اس صفت کے ذکر کرنے میں شاید اس طرف اشارہ ہے کہ یہ تمام کائنات و مخلوقات کی تربیت و پرورش کی ذمہ داری جو حق تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے وہ کسی اپنی ضرورت یا دباؤ اور مجبوری سے نہیں، بلکہ یہ سب کچھ اس کی صفتِ رحمت کا تقاضا ہے، اگر پوری کائنات نہ ہو تو اس کا کچھ نقصان نہیں، اور ہو جائے تو اس پر کچھ بار نہیں۔

نہ تنہا بدی چونکہ خلقت نبود

نہ چوں کردہ شد بر تو زحمت فزود

مَلِکِ یَوْمِ الدِّینِ لفظ مَلِک سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز پر ایسا قبضہ کہ وہ اس میں تصرف کرنے کی جائز قدرت رکھتا ہو (قاموس)۔ لفظ دِین کے معنی جزا دینا، مَلِکِ یَوْمِ الدِّینِ کا لفظی ترجمہ ہوا ”مالک روزِ جزا کا“، یعنی روزِ جزا میں ملکیت رکھنے والا، وہ ملکیت کس چیز پر ہوگی؟ اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ تفسیر کشاف میں ہے کہ اس میں اشارہ عموم کی طرف ہے، یعنی روزِ جزا میں تمام کائنات اور تمام اُمور کی ملکیت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہوگی۔ (کشاف)

روزِ جزا کی حقیقت اور عقلاً اُس کی ضرورت

اب یہاں چند باتیں قابلِ غور ہیں:-

اول یہ کہ روزِ جزا کس دن کا نام ہے، اور اس کی کیا حقیقت ہے؟

دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت تمام کائنات پر جس طرح روزِ جزا میں ہوگی ایسے ہی آج بھی ہے، پھر روزِ جزا کی کیا خصوصیت ہے؟

[۱] ترجمہ:- جب مخلوق نہیں تھی اس وقت بھی اللہ تعالیٰ اکیلا نہیں تھا، جب مخلوق پیدا کر دی گئی تو اللہ تعالیٰ پر کسی زحمت کا اضافہ نہیں ہوا۔

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ روزِ جزا اس دن کا نام ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نیک و بد اعمال کا بدلہ دینے کے لئے مقرر فرمایا ہے، لفظ ”روزِ جزاء“ سے ایک عظیم الشان فائدہ یہ حاصل ہوا کہ دنیا نیک و بد اعمال کی جزا و سزا کی جگہ نہیں، بلکہ ایک دارِ العمل فرض ادا کرنے کا دفتر ہے، تنخواہ یا صلہ وصول کرنے کی جگہ نہیں، اس سے معلوم ہو گیا کہ دنیا میں کسی کو عیش و عشرت، دولت و راحت سے مالا مال دیکھ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اللہ کے نزدیک مقبول و محبوب ہے، یا کسی کو رنج و مصیبت میں مبتلا پا کر یہ نہیں قرار دیا جاسکتا کہ وہ اللہ کے نزدیک معتب و مبغوض ہے۔ جس طرح دنیا کے دفتروں اور کارخانوں میں کسی کو اپنا فرض ادا کرنے میں مصروفِ محنت دیکھا جائے تو کوئی عقل مند اس کو مصیبت زدہ نہیں کہتا، اور نہ وہ خود اپنی مشقت کے باوجود اپنے آپ کو گرفتارِ مصیبت سمجھتا ہے، بلکہ وہ اس محنت و مشقت کو اپنی سب سے بڑی کامیابی تصور کرتا ہے، اور کوئی مہربان اُس کو اس مشقت سے سبکدوش کرنا چاہے تو وہ اس کو اپنا بدترین دشمن خیال کرتا ہے، کیونکہ وہ اس تیس روزہ محنت کے پس پردہ اُس راحت کو دیکھ رہا ہے جو اس کو تنخواہ کی شکل میں ملنے والی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں انبیاء علیہم السلام اور ان کے بعد اولیاء اللہ سب سے زیادہ مصیبت و بلا میں مبتلا ہوتے ہیں، اور وہ اپنی اس حالت پر نہایت مطمئن اور بسا اوقات مسرور نظر آتے ہیں۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی^۱

الغرض دنیا کی عیش و عشرت حق و صداقت کی اور رنج و مصیبت بد عملی کی یقینی علامت نہیں ہے، ہاں کبھی کبھی کسی عمل کی جزایا سزا کا ہلکا سا نمونہ دنیا میں بھی ظاہر کر دیا جاتا ہے، وہ اس کا پورا بدلہ نہیں ہوتا، محض متنبہ کرنے کے لئے ایک نمونہ ہوتا ہے، اس کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے:-

وَلَنَذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۱۱﴾ (السجدة)

”یعنی ہم لوگوں کو (آخرت کے) بڑے عذاب سے پہلے (بعض اوقات) دنیا میں ایک عذاب قریب کا مزہ چکھا دیتے ہیں تاکہ وہ باز آجائیں۔“
اور دوسری جگہ ارشاد ہے:-

كَذَٰلِكَ الْعَذَابُ ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ مَوْكَائِوًا يَعْلَمُونَ ﴿۳۷﴾ (القلم)

”ایسا ہوتا ہے عذاب، اور آخرت کا عذاب بہت بڑا ہے، اگر وہ سمجھیں۔“

الغرض دنیا کی راحت و مصیبت بعض اوقات تو امتحان اور آزمائش ہوتی ہے، اور کبھی عذاب بھی ہوتی ہے، مگر وہ

۱ ترجمہ:- خدا کرے کہ میرا دشمن تیری تلوار سے ہلاک نہ ہو (بلکہ میں ہوں) دوستوں کا سر سلامت رہے تم خنجر آزمائو۔

عمل کا پورا بدلہ نہیں ہوتا، بلکہ ایک نمونہ ہوتا ہے، کیونکہ یہ سب کچھ چند روزہ اور محض عارضی ہے، مدار و معیار وہ راحت و کلفت ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے، اور جو اس عالم سے گزرنے کے بعد عالم آخرت میں آنے والی ہے، اسی کا نام روزِ جزا ہے، اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ نیک و بد عمل کا بدلہ یا پورا بدلہ اس دُنیا میں نہیں ملتا، اور عدل و انصاف اور عقل کا تقاضا ہے کہ نیک و بد، اچھا اور برا برابر نہ رہے، بلکہ ہر عمل کی جزا یا سزا ملنا چاہئے۔

اس لئے ضروری ہے کہ اس عالم کے بعد کوئی دُوسرا عالم ہو، جس میں ہر چھوٹے بڑے اور اچھے برے عمل کا حساب اور اس کی جزا یا سزا انصاف کے مطابق ملے، اسی کو قرآن کی اصطلاح میں روزِ جزا یا قیامت یا آخرت کہا جاتا ہے، قرآن نے خود اس مضمون کو سورہ مؤمن میں وضاحت سے بیان فرمایا ہے:-

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ ۝۸۱ إِنَّ
السَّاعَةَ لَا تَكُونُ لَكَ يَمِينٌ وَلَا شِمَالٌ ۚ لَكِنَّا أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ۝۸۲ (المؤمن)

”یعنی بینا اور نابینا اور (ایک) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اور (دُوسرے) بدکردار باہم برابر نہیں ہو سکتے، تم لوگ بہت ہی کم سمجھتے ہو، قیامت تو ضرور ہی آکر رہے گی (تاکہ ہر ایک عمل کا پورا بدلہ اس کو مل جائے) اس کے آنے میں کسی طرح کا شک ہے ہی نہیں، مگر اکثر لوگ نہیں ایمان لاتے۔

مالک کون ہے؟

مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ میں دُوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ ہر اہل عقل کے نزدیک یہ بات بدیہی اور بالکل ظاہر ہے کہ حقیقی مالک تمام کائنات کے ذرے ذرے کی وہی ذاتِ پاک ہے، جس نے ان کو پیدا کیا، بڑھایا، تربیت کی، اور جس کی ملکیت ہر چیز پر مکمل ہے، ظاہر پر بھی، باطن پر بھی، زندہ پر بھی، مردہ پر بھی، اور جس کی ملکیت کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا، بخلاف انسان کی ملکیت کے کہ وہ ابتدا و انتہا کے دائرے میں محدود ہے، پہلے نہیں تھی اور پھر نہ رہے گی، نیز اس کی ملکیت و تصرف اشیاء کے ظاہر پر ہے، باطن پر نہیں، زندہ پر ہے، مردہ پر نہیں، اس لئے ہر اہل بصیرت کے نزدیک صرف روزِ جزا کی نہیں بلکہ دُنیا میں بھی تمام کائنات کی حقیقی ملکیت صرف حق تعالیٰ ہی کی ہے، پھر اس آیت میں اللہ تعالیٰ کو خاص روزِ جزا کا مالک فرمانے میں کیا حکمت ہے؟

سو قرآن کی دُوسری آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوا کہ دُنیا میں بھی اگرچہ حقیقی اور مکمل ملکیت تمام کائنات پر صرف پروردگارِ عالم ہی کی ہے، لیکن اسی نے اپنے کرم اور حکمت بالغہ سے ایک قسم کی ناقص ملکیت انسان کو بھی عطا فرما رکھی

ہے، اور دُنیا کے قوانین میں اس کی ملکیت کا کافی احترام بھی کیا گیا ہے، آج کی دُنیا میں انسان مال و دولت کا مالک ہے، زمین جائیداد کا مالک ہے، کوٹھی، بنگلہ اور فرنیچر کا مالک ہے، حشم و خدم کا مالک ہے، اور یہ ناقص سی ملکیت جو اس کو محض آرائش کے لئے دی گئی تھی، وہ اسی میں مغرور و بدمست ہو گیا، اس آیت میں حق تعالیٰ نے **مِلْكُ يَوْمِ الدِّينِ** فرما کر اس مغرور و غافل انسان کو آگاہ فرمایا کہ یہ ملکیتیں اور سب تعلقات و روابط صرف چند روز کے لئے ہیں، ایک دن ایسا آنے والا ہے جس میں کوئی کسی چیز کا ظاہری طور پر بھی مالک نہ رہے گا، نہ کوئی کسی کا خادم رہے گا، نہ مخدوم، نہ کوئی کسی کا آقا رہے گا نہ غلام، تمام کائنات کی ملک اور ملک صرف ایک ذاتِ پاک اللہ تعالیٰ ہی کی ہوگی۔

اس آیت کی پوری تفسیر اور روزِ جزا کی وضاحت سورہ مؤمن کی ان آیات میں ہے:-

يَوْمَ هُمْ بَارِزُونَ لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۚ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿١١﴾ أَلْيَوْمَ تُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿١٢﴾ (المؤمن)

اس میں روزِ جزا کا بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

”جس دن سب لوگ (خدا کے) سامنے آ موجود ہوں گے (کہ) ان کی کوئی بات خدا سے (صورۃ) بھی مخفی نہ رہے گی، آج کے روز کس کی حکومت ہوگی؟ بس اللہ ہی کی ہوگی، جو یکتا اور غالب ہے، آج ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائے گا، آج کسی پر ظلم نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والے ہیں۔“

سورہ فاتحہ کے شروع میں بیان کیا گیا تھا کہ اس سورت کی تین ابتدائی آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کا بیان ہے، یہ تینوں آیتیں آچکیں، اور ان کی تفسیر میں آپ یہ بھی معلوم کر چکے کہ پہلی دو آیتوں میں حمد و ثنا کے ضمن میں ایمان کے بنیادی اصول، اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید کا بیان بھی ایک معجزانہ انداز میں آ گیا ہے، اس تیسری آیت کی تفسیر میں آپ نے اب معلوم کر لیا کہ اس کے صرف دو لفظوں میں حمد و ثنا کے ساتھ اسلام کے عظیم الشان انقلابی عقیدہ یعنی قیامت و آخرت کا بیان بھی مع دلیل کے آ گیا، اب چوتھی آیت کا بیان آتا ہے۔

إِيَّاكَ تَعْبُدُ وَإِيَّاكَ تَسْتَعِينُ، اس آیت میں ایک پہلو حمد و ثنا کا اور دوسرا دعا و درخواست کا ہے۔ **تَعْبُدُ** عبادت سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی کی انتہائی تعظیم و محبت کی وجہ سے اس کے سامنے اپنی انتہائی عاجزی اور فرمانبرداری کا اظہار۔ **تَسْتَعِينُ** استعانت سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی سے مدد مانگنا، آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ ”ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں“ انسان پر تین حالات گزرتے ہیں، ماضی، حال، مستقبل، پچھلی تین آیتوں میں سے **الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ** اور **الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ** میں انسان کو اس پر متنبہ کر دیا گیا کہ وہ اپنے ماضی اور حال میں صرف اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے کہ اس کو ماضی میں نابود سے بود کیا، اور اس کو تمام کائنات سے زیادہ بہترین شکل و صورت اور

عقل و بصیرت عطا فرمائی، اور حال میں اس کی پرورش اور تربیت کا سلسلہ جاری ہے، اور **مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ** میں یہ بتا دیا کہ مستقبل میں بھی وہ خدا ہی کا محتاج ہے، کہ روزِ جزا میں اس کے سوا کسی کا کوئی مددگار نہیں ہو سکتا، اور جب ان تینوں آیتوں نے یہ واضح کر دیا کہ انسان اپنی زندگی کے تینوں دور میں خدا ہی کا محتاج ہے تو اس کا طبعی اور عقلی تقاضا یہ ہوا کہ عبادت بھی صرف اسی کی کی جائے، کیونکہ عبادت جو انتہائی تعظیم و محبت کے ساتھ اپنی انتہائی عاجزی اور تذلل کا نام ہے، وہ کسی دوسری ہستی کے لائق نہیں، اس کا نتیجہ لازمی یہ ہے کہ ایک عاقل انسان پکار اٹھے کہ ہم تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے، اسی مقتضائے طبع کو **إِيَّاكَ تَعْبُدُ** میں ظاہر فرمایا گیا ہے، اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ حاجت روا صرف ایک ہی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے تو اقتضائے عقلی و طبعی یہ ہے کہ اپنے کاموں میں مدد بھی صرف اسی سے مانگنا چاہئے، اسی اقتضائے عقل و طبع کو **وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ** میں ذکر فرمایا گیا ہے۔ (روح البیان) [۱]

غرض اس چوتھی آیت میں ایک حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے کہ عبادت و اعانت کے لائق صرف وہی ہے، اور دوسری حیثیت سے انسان کی دُعا و درخواست ہے کہ ہماری مدد فرمائے اور تیسری حیثیت اور بھی ہے کہ اس میں انسان کو اس کی تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرے، اور حقیقی طور پر اللہ کے سوا کسی کو حاجت روا نہ سمجھے، اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے، کسی نبی یا ولی وغیرہ کو وسیلہ قرار دے کر اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگنا اس کے منافی نہیں۔

اس آیت میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ارشاد یہ ہے کہ ”ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں“ کس کام میں مدد مانگتے ہیں اس کا ذکر نہیں، جمہور مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کا ذکر نہ کرنے میں عموم کی طرف اشارہ ہے کہ ہم اپنی عبادت اور ہر دینی و دنیوی کام اور ہر مقصد میں صرف آپ ہی کی مدد چاہتے ہیں۔

پھر عبادت صرف نماز روزے کا نام نہیں، امام غزالیؒ نے اپنی کتاب اربعین میں عبادت کی دس قسمیں لکھی ہیں:

- ۱- نماز، ۲- زکوٰۃ، ۳- روزہ، ۴- حج، ۵- تلاوتِ قرآن، ۶- ہر حالت میں اللہ کا ذکر کرنا، ۷- حلال روزی کے لئے کوشش کرنا، ۸- پڑوسی اور ساتھی کے حقوق ادا کرنا، ۹- لوگوں کو نیک کاموں کا حکم کرنا اور برے کاموں سے منع کرنا، ۱۰- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کرنا۔ [۲]

اس لئے عبادت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنے کے معنی یہ ہو گئے کہ نہ کسی کی محبت اللہ تعالیٰ کے برابر ہو، نہ کسی کا خوف اس کے برابر ہو، نہ کسی سے اُمید اس کی طرح ہو، نہ کسی پر بھروسہ اللہ کے مثل ہو، نہ کسی کی اطاعت و خدمت اور کام کو اتنا ضروری سمجھے جتنا اللہ تعالیٰ کی عبادت کو، نہ اللہ تعالیٰ کی طرح کسی کی نذر اور منت مانے، نہ اللہ تعالیٰ کی

[۱] تفسیر روح البیان ج: ۱ ص: ۱۳

[۲] کتاب اربعین فی اصول الدین ص: ۲۶ تا ۸۹

طرح کسی دوسرے کے سامنے اپنی مکمل عاجزی اور تذلل کا اظہار کرے، نہ وہ افعال کسی دوسرے کے لئے کرے جو انتہائی تذلل کی علامات ہیں، جیسے رکوع و سجدہ۔

آخری تین آیتیں جن میں انسان کی دعا و درخواست کا مضمون ہے اور ایک خاص دعا کی تلقین ہے یہ ہیں: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ: ”بتلا دیجئے ہم کو راستہ سیدھا، راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا، نہ راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا، اور نہ اُن لوگوں کا جو راستہ سے گم ہو گئے۔“

ان تینوں آیات میں چند باتیں قابل غور ہیں:-

تکمیل الدراہ فی تفصیل درجات الہدایہ^[۱]

یہاں پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ صراطِ مستقیم کی ہدایت کے لئے دعا جو اس آیت میں تعلیم فرمائی گئی ہے اس کے مخاطب جس طرح تمام انسان اور عامہ مومنین ہیں، اسی طرح اولیاء اللہ اور حضراتِ انبیاء علیہم السلام بھی اس کے مأمور ہیں، جو بلاشبہ ہدایت یافتہ بلکہ دوسروں کے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہیں، پھر اس حاصل شدہ چیز کی بار بار دعا مانگنے کا کیا مطلب ہے؟

اس کا جواب ہدایت کی پوری حقیقت معلوم کرنے پر موقوف ہے، اس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، جس سے سوالِ مذکور کے علاوہ ان تمام اشکالات کا بھی جواب معلوم ہو جائے گا جو مفہومِ ہدایت کے متعلق قرآن کریم کے بہت سے مقامات میں عموماً پیش آتے ہیں، اور ہدایت کی حقیقت سے نا آشنا قرآن کی بہت سی آیات میں باہمی تضاد و اختلاف محسوس کرنے لگتا ہے۔

لفظ ”ہدایت“ کی بہترین تشریح امام راغب اصفہانیؒ نے ”مفردات القرآن“ میں تحریر فرمائی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہدایت کے اصل معنی ہیں کسی شخص کو منزلِ مقصود کی طرف مہربانی کے ساتھ رہنمائی کرنا، اور ہدایت کرنا حقیقی معنی میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہے، جس کے مختلف درجات ہیں:-

ایک درجہ ہدایت کا عام ہے، جو کائنات و مخلوقات کی تمام اقسام جمادات، نباتات، حیوانات وغیرہ کو شامل ہے، یہاں آپ یہ خیال نہ کریں کہ ان بے جان، بے شعور چیزوں کو ہدایت سے کیا کام؟

[۱] ترجمہ:- ہدایت کے مختلف درجات۔

[۲] المفردات فی غریب القرآن ص: ۵۳۸ تا ۵۴۱

کیونکہ قرآنی تعلیمات سے یہ واضح ہے کہ کائنات کی تمام اقسام اور ان کا ذرہ ذرہ اپنے اپنے درجے کے موافق حیات و احساس بھی رکھتا ہے اور عقل و شعور بھی، یہ دوسری بات ہے کہ یہ جو ہر کسی نوع میں کم کسی میں زیادہ ہے، اسی وجہ سے جن اشیاء میں یہ جو ہر بہت کم ہے اُن کو بے جان، بے شعور سمجھا اور کہا جاتا ہے، احکامِ الہیہ میں بھی اُن کے ضعفِ شعور کا اتنا اثر آیا کہ ان کو احکام کا مکلف نہیں بنایا گیا، جن مخلوقات میں حیات کے آثار تو نمایاں ہیں مگر عقل و شعور نمایاں نہیں، ان کو ذی حیات، جاندار مگر بے عقل و شعور کہا جاتا ہے، اور جن میں حیات کے ساتھ عقل و شعور کے آثار بھی نمایاں نظر آتے ہیں اُن کو ذوی العقول کہا جاتا ہے، اور اسی اختلافِ درجات اور عقل و شعور کی کمی بیشی کی وجہ سے تمام کائنات میں احکامِ شرعیہ کا مکلف صرف انسان اور جنات کو قرار دیا گیا ہے کہ ان میں عقل و شعور بھی مکمل ہے، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسری انواع و اقسام میں حیات و احساس یا عقل و شعور بالکل نہیں، کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يَسْبِيحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ^ط (بنی اسرائیل: ۴۴)

”یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی (قالا یا حالاً) بیان نہ کرتی ہو، لیکن تم لوگ اُن کی پاکی بیان کرنے کو سمجھتے نہیں ہو۔“

اور سورہ نور میں ارشاد ہے:-

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْبِيحُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرِ وَالصَّخْرِ كُلُّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ^ط وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ^{۴۵} (النور)

”یعنی کیا تجھ کو معلوم نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے ہیں سب جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں (مخلوقات) ہیں، اور (بالخصوص) پرندے جو پر پھیلانے ہوئے اڑتے پھرتے ہیں، سب کو اپنی اپنی دُعا اور تسبیح معلوم ہے، اور اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں کے سب افعال کا پورا علم ہے۔“

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور اس کی پاکی بیان کرنا اللہ تعالیٰ کی معرفت پر موقوف ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہی سب سے بڑا علم ہے، اور یہ علم بدون عقل و شعور کے نہیں ہو سکتا، اس لئے ان آیات سے ثابت ہوا کہ تمام کائنات کے اندر رُوح و حیات بھی ہے، ادراک و احساس بھی، عقل و شعور بھی، مگر بعض کائنات میں یہ جو ہر اتنا کم اور مخفی ہے کہ عام دیکھنے والوں کو اس کا احساس نہیں ہوتا، اسی لئے عرف میں ان کو بے جان یا بے عقل کہا جاتا ہے، اور اس بنا پر اُن کو احکامِ شرعیہ کا مکلف بھی نہیں بنایا گیا، قرآن کا یہ فیصلہ اُس وقت کا ہے جب دُنیا میں نہ کہیں کوئی فلسفی تھا، نہ کوئی فلسفہ مدون تھا، بعد میں آنے والے فلاسفوں نے بھی اپنے اپنے وقت میں اس کی تصدیق کی، قدیم فلاسفہ میں بھی اس خیال کے کچھ لوگ گزرے ہیں، اور جدید فلاسفہ اور اہل سائنس نے تو پوری وضاحت کے ساتھ اس کو ثابت کیا ہے۔

الغرض ہدایتِ خداوندی کا یہ درجہ اولیٰ تمام مخلوقات، جمادات، نباتات، حیوانات، انسان اور جنات کو شامل ہے، اسی ہدایتِ عامہ کا ذکر قرآن کریم کی آیت: اَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَى ۵۰ (طہ) میں فرمایا گیا ہے، یعنی ”اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اس کی خلقت عطا فرمائی، پھر اس خلقت کے مناسب اس کو ہدایت دی۔“ اور یہی مضمون سورہ اعلیٰ میں ان الفاظ سے ارشاد ہوا:-

سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی ۱ الَّذِیْ خَلَقَ فَسُوِّی ۲ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۳ (الاعلیٰ)
 ”یعنی آپ اپنے پروردگارِ عالی شان کی تسبیح کیجئے جس نے ساری مخلوقات کو بنایا، پھر ٹھیک بنایا، اور جس نے تجویز کیا، پھر راہ بتائی۔“

یعنی جس نے تمام مخلوقات کے لئے خاص خاص مزاج اور خاص خاص خدمتیں تجویز فرما کر ہر ایک کو اس کے مناسب ہدایت کر دی۔

اسی ہدایتِ عامہ کا نتیجہ ہے کہ کائناتِ عالم کے تمام انواع و اَصناف اپنا اپنا مقررہ فرض نہایت سلیقہ سے ادا کر رہے ہیں، جو چیز جس کام کے لئے بنادی ہے وہ اس کو ایسی خوبی کے ساتھ ادا کر رہی ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، حضرت مولانا رومیؒ نے اسی مضمون کو بیان فرمایا ہے۔

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند

بامن و تو مردہ، باحق زندہ اند

زبان سے ہونے والی آواز کے معنی کا ادراک نہ ناک کر سکتی ہے نہ آنکھ، حالانکہ یہ زبان سے زیادہ قریب ہیں، اس ادراک کا فریضہ اللہ تعالیٰ نے کانوں کے سپرد کیا ہے، وہی زبان کی بات کو لیتے ہیں اور ادراک کر لیتے ہیں، دانائے رُومؒ نے خوب فرمایا۔

مرزباں را مشتری جز گوش نیست

واقفِ این رازِ جز بے ہوش نیست

اسی طرح کانوں سے دیکھنے یا سونگھنے کا کام نہیں لیا جاسکتا، ناک سے دیکھنے یا سننے کا کام نہیں لیا جاسکتا، سورہ مریم میں اسی مضمون کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:-

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا اَتٰی الرَّحْمٰنَ عَبْدًا ۝۶۱ (مریم)

۱ ترجمہ:- مٹی، تیز ہوا، پانی اور آگ سب اللہ کے فرمانبردار ہیں، میں اور تو ان کو مردہ سمجھتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ زندہ ہیں۔

۲ ترجمہ:- میری زبان کا خریدار سوائے کان کے اور کوئی نہیں، بے ہوش آدمی کے سوا اس راز کو جاننے والا اور کوئی نہیں۔

”یعنی کوئی نہیں آسمان اور زمین میں جو نہ آوے رحمن کا بندہ ہو کر۔“

دوسرا درجہ ہدایت کا اس کے مقابلے میں خاص ہے، یعنی صرف اُن چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے جو عرف میں دَوِیٰ العقول کہلاتی ہیں، یعنی انسان اور جن، یہ ہدایت انبیاء اور آسمانی کتابوں کے ذریعہ ہر انسان کو پہنچتی ہے، پھر کوئی اس کو قبول کر کے مؤمن و مسلم ہو جاتا ہے، کوئی رد کر کے کافر ٹھہرتا ہے۔

تیسرا درجہ ہدایت کا اس سے بھی زیادہ خاص ہے کہ صرف مؤمنین و متقین کے ساتھ مخصوص ہے، یہ ہدایت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلا واسطہ انسان پر فائز ہوتی ہے، اس ہدایت کا دوسرا نام توفیق ہے، یعنی ایسے اسباب اور حالات پیدا کر دینا کہ قرآنی ہدایات کا قبول کرنا اور اُن پر عمل کرنا آسان ہو جائے، اور اُن کی خلاف ورزی دُشوار ہو جائے۔ اس تیسرے درجے کی وسعت غیر محدود اور اس کے درجات غیر متناہی ہیں، یہی درجہ انسان کی ترقی کا میدان ہے، اعمالِ صالحہ کے ساتھ ساتھ اس درجہ ہدایت میں زیادتی ہوتی رہتی ہے۔ قرآن کریم کی متعدد آیات میں اس زیادتی کا ذکر ہے، مثلاً: وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادْنَا لَهُمْ هُدًى (محمد: ۱۷)، وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ اللَّهُ قَلْبَهُ (التغابن: ۱۱) ”جو شخص اللہ پر ایمان لائے اس کے دل کو ہدایت کر دیتے ہیں۔“

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت: ۶۹)

”جو لوگ ہمارے راستے میں مجاہدہ کرتے ہیں، ہم اُن کو اپنے راستوں کی مزید ہدایت کر دیتے ہیں۔“

یہی وہ میدان ہے جہاں ہر بڑے سے بڑا نبی و رسول اور ولی اللہ آخر عمر تک زیادتی ہدایت و توفیق کا طالب نظر آتا ہے، اسی مقام ہدایت کے متعلق مولانا رومیؒ نے فرمایا۔

اے برادر بے نہایت در گہے ست

ہر چہ بروے میری بروے مائیت^[۲]

اور سعدی شیرازیؒ نے فرمایا۔

نگویم کہ بر آب قادر نیند

کہ بر ساحل نیل مستقی اند^[۳]

درجات ہدایت کی اس تشریح سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ ہدایت ایک ایسی چیز ہے جو سب کو حاصل بھی ہے، اور اس کے مزید درجاتِ عالیہ حاصل کرنے سے کسی بڑے سے بڑے انسان کو استغناء بھی نہیں، اسی لئے سورہ فاتحہ کی اہم

[۱] ترجمہ:- اور جن لوگوں نے ہدایت کا راستہ اختیار کیا ہے، اللہ نے انہیں ہدایت میں اور ترقی دی ہے۔

[۲] ترجمہ:- اے بھائی! اس درگاہ کی کوئی انتہا نہیں ہے، تم جس مقام پر بھی پہنچ جاؤ اس کو آخری سمجھ کر وہیں رک نہ جاؤ۔

[۳] ترجمہ:- میں یہ نہیں کہتا کہ ان کے پاس پانی نہیں ہے بلکہ وہ تو نیل کے کنارے پر ہیں (مگر) پھر بھی پانی کے طلب گار ہیں۔

ترین دُعا ہدایت کو قرار دیا گیا، جو ایک ادنیٰ مومن کے لئے بھی مناسب حال ہے، اور بڑے سے بڑے رسول اور ولی کے لئے بھی اتنی ہی اہم ہے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر عمر میں سورہ فتح کے اندر فتح مکہ کے فوائد و ثمرات بتلاتے ہوئے یہ بھی ارشاد ہوا کہ: وَيَهْدِيكَ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ۝ (الفتح) یعنی ”مکہ مکرمہ اس لئے آپ کے ہاتھوں فتح کرایا گیا تاکہ آپ کو صراطِ مستقیم کی ہدایت ہو۔“ ظاہر ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے نہ صرف ہدایت یافتہ بلکہ دُوسروں کے لئے بھی ہدایت مجسم تھے، پھر اس موقع پر آپ کو ہدایت ہونے کے اس کے سوا کوئی معنی نہیں ہو سکتے کہ ہدایت کا کوئی بہت اعلیٰ مقام آپ کو اس وقت حاصل ہوا۔

ہدایت کی اس تشریح سے آپ کے لئے فہم قرآن میں بہت سے فوائد حاصل ہو گئے:-

اول یہ کہ قرآن میں کہیں تو ہدایت کو ہر مومن و کافر کے لئے بلکہ کل مخلوقات کے لئے عام فرمایا گیا ہے، اور کہیں اس کو محض متقین کے ساتھ مخصوص لکھا گیا، جس میں ناواقف کو تعارض کا شبہ ہو سکتا ہے، ہدایت کے عام و خاص درجات معلوم ہونے کے بعد یہ شبہ خود بخود رفع ہو جاتا ہے کہ ایک درجہ سب کو عام اور شامل ہے، اور دُوسرا درجہ مخصوص ہے۔

دُوسرا فائدہ یہ ہے کہ قرآن میں ایک طرف تو جگہ جگہ یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالمین یا فاسقین کو ہدایت نہیں فرماتے، اور دُوسری طرف مکرر یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت فرماتے ہیں، اس کا جواب بھی درجات کی تفصیل سے واضح ہو گیا کہ ہدایت عامہ سب کو کی جاتی ہے، اور ہدایت کا تیسرا مخصوص درجہ ظالمین و فاسقین کو نصیب نہیں ہوتا۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ ہدایت کے تین درجات میں سے پہلا اور تیسرا درجہ بلا واسطہ حق تعالیٰ کا فعل ہے، اس میں کسی نبی یا رسول کا دخل نہیں، انبیاء علیہم السلام اور رسولوں کا کام صرف دُوسرے درجہ ہدایت سے متعلق ہے۔

قرآن کریم میں جہاں کہیں انبیاء علیہم السلام کو ہادی قرار دیا ہے، وہ اسی دُوسرے درجے کے اعتبار سے ہے، اور جہاں یہ ارشاد ہے: إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ (القصص: ۵۶) یعنی ”آپ ہدایت نہیں کر سکتے جس کو چاہیں“ تو اس میں ہدایت کا تیسرا درجہ مراد ہے، یعنی توفیق دینا آپ کا کام نہیں۔

الغرض اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ایک جامع اور اہم ترین دُعا ہے، جو انسان کو سکھلائی گئی ہے، انسان کا کوئی فرد اس سے بے نیاز نہیں، دین اور دُنیا دونوں میں صراطِ مستقیم کے بغیر فلاح و کامیابی نہیں، دُنیا کی الجھنوں میں بھی صراطِ مستقیم کی دُعا نسخہ اکسیر ہے، مگر لوگ توجہ نہیں کرتے، ترجمہ اس آیت کا یہ ہے کہ ”بتلا دیجئے ہم کو راستہ سیدھا۔“

صراطِ مستقیم کو نسا راستہ ہے؟

سیدھا راستہ وہ ہے جس میں موڑ نہ ہوں، اور مراد اس سے دین کا وہ راستہ ہے جس میں افراط و تفریط نہ ہو،

”افراط“ کے معنی حد سے آگے بڑھنا اور ”تفریط“ کے معنی کوتاہی کرنا، پھر اس کے بعد کی دو آیتوں میں اُس صراطِ مستقیم کا پتہ دیا گیا ہے جس کی دُعا اس آیت میں تلقین کی گئی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: **صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ** یعنی ”راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا“ اور وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا ان کی تفصیل ایک دوسری آیت میں اس طرح آئی ہے: **الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصَّادِقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ** (النساء: ۶۹) یعنی ”وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا، یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین“ مقبولانِ بارگاہِ الہی کے یہ چار درجات ہیں جن میں سب سے اعلیٰ انبیاء علیہم السلام ہیں، اور صدیقین وہ لوگ ہیں جو انبیاء کی اُمت میں سب سے زیادہ رتبے کے ہوتے ہیں، جن میں کمالاتِ باطنی بھی ہوتے ہیں، عرف میں اُن کو اولیاء کہا جاتا ہے، شہداء وہ ہیں جنہوں نے دین کی محبت میں اپنی جان تک دے دی، اور صلحاء وہ ہیں جو شریعت کے پورے متبع ہوتے ہیں، واجبات میں بھی، مستحبات میں بھی، جن کو عرف میں نیک دین دار کہا جاتا ہے۔

اس آیت میں پہلے مثبت اور ایجابی طریق سے صراطِ مستقیم کو متعین کیا گیا ہے کہ ان چار طبقوں کے حضرات جس راستے پر چلیں وہ صراطِ مستقیم ہے، اس کے بعد آخر کی آیت میں سلبی اور منفی صورت سے اس کی تعین کی گئی ہے، ارشاد ہے:-

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ یعنی ”نہ راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا، اور نہ اُن لوگوں کا جو راستے سے گم ہو گئے۔“ **مَغْضُوبٍ عَلَيْهِمْ** سے وہ لوگ مراد ہیں جو دین کے احکام کو جاننے پہچاننے کے باوجود شرارت یا نفسانی اغراض کی وجہ سے اُن کی خلاف ورزی کرتے ہیں، یا دوسرے لفظوں میں احکامِ الہیہ کی تعمیل میں کوتاہی (یعنی تفریط) کرتے ہیں، جیسے عام طور پر یہود کا حال تھا کہ دُنیا کے ذلیل مفاد کی خاطر دین کو قربان کرتے اور انبیاء کی توہین کرتے تھے۔ اور **ضَالِّينَ** سے مراد وہ لوگ ہیں جو ناواقفیت اور جہالت کے سبب دین کے معاملے میں غلط راستے پر پڑ گئے، اور دین کی مقررہ حدود سے نکل کر افراط اور غلو میں مبتلا ہو گئے، جیسے عام طور پر نصاریٰ تھے کہ نبی کی تعظیم میں اتنے بڑھے کہ انہیں کو خدا بنا لیا، ایک طرف یہ ظلم کہ اللہ کے انبیاء کی بات نہ مانیں، انہیں قتل تک کرنے سے گریز نہ کریں، اور دوسری طرف یہ زیادتی کہ ان کو خدا بنا لیں۔

آیت کا حاصلِ مطلب یہ ہوا کہ ہم وہ راستہ نہیں چاہتے جو اغراضِ نفسانی کے تابع بدعمل اور دین میں تفریط کرنے والوں کا ہے، اور نہ وہ راستہ چاہتے ہیں جو جاہل گمراہ اور دین میں غلو (افراط) کرنے والوں کا ہے، بلکہ اُن کے درمیان کا سیدھا راستہ چاہتے ہیں جس میں نہ افراط ہے نہ تفریط، اور جو شہوات اور اغراضِ نفسانی کے اتباع سے نیز شبہات اور عقائدِ فاسدہ سے پاک ہے۔

سورۃ فاتحہ کی ساتوں آیات کی تفسیر ختم ہوگئی، اس پوری سورت کا خلاصہ اور حاصلِ مطلب یہ دُعا ہے کہ یا اللہ!

ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرما، اور چونکہ دُنیا میں صراطِ مستقیم کا پہچاننا ہی سب سے بڑا علم اور بڑی کامیابی ہے، اور اسی کی پہچان میں غلطی ہونے سے اقوامِ عالم تباہ ہوتی ہیں، ورنہ خدا طلبی اور اس کے لئے مجاہدات کی تو بہت سے کفار میں بھی کوئی کمی نہیں، اسی لئے قرآن نے صراطِ مستقیم کو پوری وضاحت کے ساتھ ایجابی اور سلبی دونوں پہلوؤں سے واضح فرمایا ہے۔

صراطِ مستقیم کتابِ اللہ اور رجالِ اللہ دونوں کے مجموعہ سے ملتا ہے

یہاں ایک بات قابلِ غور ہے اور اس میں غور کرنے سے ایک بڑے علم کا دروازہ کھلتا ہے، وہ یہ کہ صراطِ مستقیم کی تعین کے لئے بظاہر صاف بات یہ تھی کہ ”صراطِ الرسول“ یا ”صراطِ القرآن“ فرمادیا جاتا جو مختصر بھی تھا اور واضح بھی، کیونکہ پورا قرآن درحقیقت صراطِ مستقیم کی تشریح ہے، اور پوری تعلیماتِ رسول اسی کی تفصیل، لیکن قرآن کی اس مختصر سورت میں اختصار اور وضاحت کے اس پہلو کو چھوڑ کر صراطِ مستقیم کی تعین کے لئے اللہ تعالیٰ نے مستقل دو آیتوں میں ایجابی اور سلبی پہلوؤں سے صراطِ مستقیم کو اس طرح متعین فرمایا کہ اگر سیدھا راستہ چاہتے ہو تو ان لوگوں کو تلاش کرو اور ان کے طریق کو اختیار کرو، قرآنِ کریم نے اس جگہ نہ یہ فرمایا کہ قرآن کا راستہ اختیار کرو، کیونکہ محض کتابِ انسانی تربیت کے لئے کافی نہیں، اور نہ یہ فرمایا کہ رسول کا راستہ اختیار کرو، کیونکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بقاء اس دُنیا میں دائمی نہیں، اور آپ کے بعد کوئی دوسرا رسول اور نبی نہیں، اس لئے صراطِ مستقیم جن لوگوں کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے اُن میں غنّیین کے علاوہ ایسے حضرات بھی شامل کر دیئے گئے جو تاقیامت ہمیشہ موجود رہیں گے، مثلاً صدیقین، شہداء اور صالحین۔

خلاصہ یہ ہے کہ سیدھا راستہ معلوم کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے کچھ رجال اور انسانوں کا پتہ دیا، کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا، ایک حدیث میں ہے کہ جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو خبر دی کہ پچھلی اُمتوں کی طرح میری اُمت بھی ستر فرقوں میں بٹ جائے گی، اور صرف ایک جماعت ان میں حق پر ہوگی، تو صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا کہ وہ کونسی جماعت ہے؟ اس پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جواب دیا ہے اس میں بھی کچھ رجالِ اللہ ہی کا پتہ دیا گیا ہے، فرمایا: ”مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي“ یعنی حق پر وہ جماعت ہوگی جو میرے اور میرے صحابہؓ کے طرز پر ہو۔

اس خاص طرز میں شاید اس کی طرف اشارہ ہو کہ انسان کی تعلیم و تربیت محض کتابوں اور روایتوں سے نہیں ہو سکتی، بلکہ رجالِ ماہرین کی صحبت اور ان سے سیکھ کر حاصل ہوتی ہے، یعنی درحقیقت انسان کا معلم اور مربی انسان ہی ہو سکتا ہے، محض کتاب معلم اور مربی نہیں ہو سکتی، بقول اکبر مرحوم ۔

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں

آدمی، آدمی بناتے ہیں

اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو دنیا کے تمام کاروبار میں مشاہد ہے کہ محض کتابی تعلیم سے نہ کوئی کپڑا سینا سیکھ سکتا ہے، نہ کھانا پکانا، نہ ڈاکٹری کی کتاب پڑھ کر کوئی ڈاکٹر بن سکتا ہے، نہ انجینئری کی کتابوں کے محض مطالعے سے کوئی انجینئر بنتا ہے، اسی طرح قرآن وحدیث کا محض مطالعہ انسان کی تعلیم اور اخلاقی تربیت کے لئے ہرگز کافی نہیں ہو سکتا، جب تک اس کو کسی محقق ماہر سے باقاعدہ حاصل نہ کیا جائے۔ قرآن وحدیث کے معاملے میں بہت سے لکھے پڑھے آدمی اس مغالطے میں مبتلا ہیں کہ محض ترجمے یا تفسیر دیکھ کر وہ قرآن کے ماہر ہو سکتے ہیں، یہ بالکل فطرت کے خلاف تصور ہے، اگر محض کتاب کافی ہوتی تو رسولوں کے بھیجنے کی ضرورت نہ تھی، کتاب کے ساتھ رسول کو معلم بنا کر بھیجنا اور صراطِ مستقیم کو متعین کرنے کے لئے اپنے مقبول بندوں کی فہرست دینا، اس کی دلیل ہے کہ محض کتاب کا مطالعہ تعلیم و تربیت کے لئے کافی نہیں، بلکہ کسی ماہر سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان کی صلاح وفلاح کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں، ایک کتاب اللہ جس میں انسانی زندگی کے ہر شعبے سے متعلق احکام موجود ہیں، دوسرے رجال اللہ، یعنی اللہ والے، ان سے استفادے کی صورت یہ ہے کہ کتاب اللہ کے معروف اصول پر رجال اللہ کو پرکھا جائے، جو اس معیار پر نہ اتریں، ان کو رجال اللہ ہی نہ سمجھا جائے، اور جب رجال اللہ صحیح معنی میں حاصل ہو جائیں تو ان سے کتاب اللہ کا مفہوم سیکھنے اور عمل کرنے کا کام لیا جائے۔

فرقہ وارانہ اختلافات کا بڑا سبب

یہی ہے کہ کچھ لوگوں نے صرف کتاب اللہ کو لے لیا، رجال اللہ سے قطع نظر کر لی، ان کی تفسیر و تعلیم کو کوئی حیثیت نہ دی، اور کچھ لوگوں نے صرف رجال اللہ کو معیار حق سمجھ لیا، اور کتاب اللہ سے آنکھ بند کر لی، اور ان دونوں طریقوں کا نتیجہ گمراہی ہے۔

سورہ فاتحہ کے متعلق احکام و مسائل

سورہ فاتحہ میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء ہے، پھر صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کا اقرار اور اس کا اظہار ہے کہ ہم اس کے سوا کسی کو اپنا حاجت روا نہیں سمجھتے، یہ گویا حلف وفاداری ہے جو انسان اپنے رب کے ساتھ کرتا ہے، اس کے بعد پھر ایک اہم دُعا ہے جو تمام انسانی مقاصد و ضروریات پر حاوی ہے، اور اس میں بہت سے فوائد اور مسائل ضمنی آئے ہیں، ان میں سے چند اہم مسائل کو لکھا جاتا ہے۔

دُعا کرنے کا طریقہ

۱- اس خاص اُسلوب کلام کے ذریعہ انسان کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب اللہ جل شانہ سے کوئی دُعا در خواست کرنا ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کی حمد و ثنا کا فرض بجالا کر پھر حلف و فاداری اس بات کا کرو کہ ہم اس کے سوانہ کسی کو لائقِ عبادت سمجھتے ہیں اور نہ کسی کو حقیقی معنی میں مشکل کشا اور حاجت روائانتے ہیں، اس کے بعد اپنے مطلب کی دُعا کرو، اس طریقہ سے جو دُعا کی جائے گی اس کے قبول ہونے کی قوی اُمید ہے۔ (احکام بھاص) [۱]

اور دُعا میں بھی ایسی جامع دُعا اختیار کرو جس میں اختصار کے ساتھ انسان کے تمام مقاصد داخل ہو جائیں، جیسے ہدایتِ صراطِ مستقیم کہ دُنیا و دین کے ہر کام میں اگر انسان کا راستہ سیدھا ہو جائے تو کہیں ٹھوکر لگنے اور نقصان پہنچنے کا خطرہ نہیں رہتا، غرض اس جگہ خود حق تعالیٰ کی طرف سے اپنی حمد و ثنایاں کرنے کا اصل مقصد انسان کو تعلیم دینا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا انسان کا فطری فرض ہے

۲- اس سورت کے پہلے جملے میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرنے کی تعلیم و ترغیب ہے، مگر حمد کسی نعمت یا صفت کی بنا پر ہوا کرتی ہے، یہاں کسی نعمت یا صفت کا ذکر نہیں، اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار ہیں، اُن کا کوئی انسان احاطہ نہیں کر سکتا، جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے: وَإِنْ تَعَدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تَحْصُوهَا (ابراہیم: ۳۴) یعنی ”اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔“ انسان اگر سارے عالم کو چھوڑ کر اپنے ہی وجود پر نظر ڈال لے تو معلوم ہوگا کہ اس کا وجود خود ایک عالم اصغر ہے، جس میں عالم اکبر کے سارے نمونے موجود ہیں، اس کا بدن زمین کی مثال ہے، اُس پر اُگنے والے بال نباتات کی مثال ہیں، اُس کی ہڈیاں پہاڑوں کی شبیہ ہیں، اس کے بدن کی رگیں جس میں خون رواں ہے زمین کے نیچے بہنے والے چشموں اور نہروں کی مثال ہیں۔

انسان دو جزء سے مرکب ہے، ایک بدن، دوسرے رُوح، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قدر و قیمت کے اعتبار سے رُوح اصل، اعلیٰ اور افضل ہے، بدن محض اس کے تابع اور ادنیٰ درجہ رکھتا ہے، اس ادنیٰ جزء کے متعلق بدن انسان کی تحقیق کرنے والے اطباء اور اہل تشریح نے بتلایا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے تقریباً پانچ ہزار مصالح اور منافع رکھے ہیں، اس کے بدن میں تین سو سے زیادہ جوڑے ہیں، ہر ایک جوڑے کو اللہ تعالیٰ ہی کی قدرتِ کاملہ نے ایسا مستحکم بنایا ہے کہ ہر وقت کی حرکت کے باوجود نہ وہ گھستا ہے، نہ اس کی مرمت کی ضرورت ہوتی ہے، عادتاً انسان کی عمر ساٹھ ستر سال ہوتی ہے، پوری عمر اس کے یہ نرم و نازک اعضاء اور اُن کے سب جوڑے اکثر اوقات اس طرح حرکت میں رہتے ہیں کہ فولاد بھی ہوتا تو گھس جاتا، مگر

حق تعالیٰ نے فرمایا: نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ (الدھر: ۲۸) یعنی ”ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا، اور ہم نے ہی اس کے جوڑ بند مضبوط کئے۔“ اسی قدرتی مضبوطی کا نتیجہ ہے کہ عام عادت کے مطابق یہ نرم و نازک جوڑ ستر برس اور اس سے بھی زیادہ عرصہ تک کام دیتے ہیں، انسانی اعضاء میں سے صرف ایک آنکھ ہی کو لے لیجئے، اس میں جو اللہ تعالیٰ جل شانہ کی حکمت بالغہ کے مظاہر موجود ہیں، انسان کو عمر بھر خرچ کر کے بھی اُن کا پورا ادراک آسان نہیں۔

پھر اس آنکھ کے صرف ایک مرتبہ کے عمل کو دیکھ کر یہ حساب لگائیے کہ اس ایک منٹ کے عمل میں حق تعالیٰ کی کتنی نعمتیں کام کر رہی ہیں تو حیرت ہوتی ہے، کیونکہ آنکھ اٹھی اور اس نے کسی چیز کو دیکھا، اس میں جس طرح آنکھ کی اندرونی طاقتوں نے عمل کیا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی بیرونی مخلوقات کا اس میں بڑا حصہ ہے، اگر آفتاب کی روشنی نہ ہو تو آنکھ کے اندر کی روشنی کام نہیں دے سکتی، پھر آفتاب کے لئے بھی ایک فضا کی ضرورت ہوتی ہے، انسان کے دیکھنے اور آنکھ کو کام میں لانے کے لئے غذا، ہوا وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ ایک مرتبہ نظر اٹھ کر جو کچھ دیکھتی ہے اس میں پورے عالم کی طاقتیں کام کرتی ہیں، یہ ایک مرتبہ کا عمل ہوا، پھر آنکھ دن میں کتنی مرتبہ دیکھتی اور سال میں کتنی مرتبہ، عمر میں کتنی مرتبہ، یہ ایسا سلسلہ ہے جس کے اعداد و شمار انسانی طاقت سے خارج ہیں۔

اسی طرح کان، زبان، ہاتھ، پاؤں کے جتنے کام ہیں اُن سب میں پورے عالم کی قوتیں شامل ہو کر کام پورا ہوتا ہے، یہ تو وہ نعمت ہے جو ہر زندہ انسان کو میسر ہے، اُس میں شاہ و گدا، امیر و غریب کا کوئی امتیاز نہیں، اور اللہ جل شانہ کی بڑی بڑی نعمتیں سب ایسی ہی وقف عام ہیں کہ ہر فرد انسانی اُن سے نفع اٹھاتا ہے، آسمان، زمین ان دونوں میں اور اُن کے درمیان پیدا ہونے والی تمام کائنات، چاند، سورج، ثوابت اور سیارے، ہوا، فضا کا نفع ہر جاندار کو پہنچ رہا ہے۔

اس کے بعد اللہ جل شانہ کی نعمائے خاصہ جو انسان کے افراد میں تقاضائے حکمت کم و بیش کر کے عطا ہوتی ہیں، مال اور دولت، عزت اور جاہ، راحت اور آرام سب اسی قسم میں داخل ہیں، اور اگرچہ یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ نعمائے عامہ جو تمام انسانوں میں مساوی طور پر مشترک ہیں، جیسے آسمان، زمین اور ان کی تمام مخلوقات یہ نعمتیں بہ نسبت نعمائے خاصہ مال، دولت وغیرہ کے زیادہ اہم اور اشرف ہیں، مگر بھولا بھالا انسان تمام افراد انسان میں عام ہونے کی بنا پر کبھی ان عظیم الشان نعمتوں کی طرف التفات بھی نہیں کرتا ہے کہ یہ کوئی نعمت ہے، صرف گرد و پیش کی معمولی چیزیں، کھانے پینے، رہنے سہنے کی خصوصی چیزوں ہی پر اس کی نظر رُک جاتی ہے۔

بہر حال یہ ایک سرسری نمونہ ہے اُن نعمتوں کا جو ہر انسان پر ہر وقت مبذول ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا ہی چاہئے کہ انسان اپنی مقدور بھران احسانات و انعامات کرنے والے کی حمد و ثنا کرے، اور کرتا رہے، اسی کے تقاضائے

فطرت کی تلقین کے لئے قرآن کی سب سے پہلی سورت کا سب سے پہلا کلمہ **الْحَمْدُ** لایا گیا ہے، اور اللہ کی حمد و ثنا کو عبادت میں بڑا درجہ دیا گیا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو کوئی نعمت عطا فرمائیں اور وہ اس پر ”الحمد لله“ کہے تو ایسا ہو گیا کہ گویا جو کچھ اس نے لیا ہے اس سے افضل چیز دے دی۔ (قرطبی از ابن ماجہ بروایت انس) ^[۱]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ”اگر ساری دنیا کی نعمتیں کسی ایک شخص کو حاصل ہو جائیں اور وہ اس پر ”الحمد لله“ کہہ لے تو یہ ”الحمد لله“ اُن ساری دنیا کی نعمتوں سے افضل ہے۔“ قرطبی نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ”الحمد لله“ زبان سے کہنا بھی اللہ ہی کی ایک نعمت ہے، اور یہ نعمت ساری دنیا کی نعمتوں سے افضل ہے۔ اور حدیث صحیح میں ہے کہ ”الحمد لله“ سے میزانِ عمل کا آدھا پلہ بھر جاتا ہے، اور ”حمد“ کی حقیقت حضرت شقیق بن ابراہیمؒ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تمہیں کوئی چیز عطا فرمائے تو اول اس کے دینے والے کو پیچانو، پھر جو کچھ اس نے دیا ہے اس پر راضی ہو جاؤ، پھر جب تک تمہارے جسم میں اس کی عطا کی ہوئی قوت موجود ہے، اس کی نافرمانی کے قریب نہ جاؤ۔ (قرطبی) ^[۲]

دوسرا کلمہ **لِلّٰهِ** ہے، اس میں لفظ ”اللہ“ کے ساتھ شروع میں حرف لام لگا ہوا ہے، جس کو عربیت کے قاعدے سے لامِ اختصاص کہا جاتا ہے، جو کسی حکم یا وصف کی خصوصیت پر دلالت کرتا ہے، اس جگہ معنی یہ ہیں کہ صرف یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا انسان کا فرض ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حمد و ثنا صرف اُسی کی ذاتِ قدوس کے ساتھ مخصوص ہے، حقیقی طور پر اس کے سوا عالم میں کوئی مستحق حمد و ثنا کا نہیں ہو سکتا، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ہاں اس کے ساتھ یہ بھی اس کا انعام ہے کہ انسان کو تہذیبِ اخلاق سکھانے کے لئے اس کو یہ بھی حکم دے دیا کہ میری نعمت و احسان جن واسطوں سے تمہارے ہاتھ آئے ان کا بھی شکر ادا کرو، کیونکہ جو شخص اپنے محسن انسان کا شکر ادا کرنے کا خوگر نہ ہو وہ خدا کا بھی شکر ادا نہیں کرے گا۔

خود اپنی مدح و ثنا کسی انسان کے لئے جائز نہیں

۳- خود اپنی حمد و ثنا کا بیان کرنا کسی مخلوق کے لئے جائز نہیں، قرآن کریم میں ارشاد ہے:-

فَلَا تَرْكُؤْاْ اَنْفُسَكُمْ ۖ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی ﴿۳۱﴾ (النجم)

”یعنی تم اپنی پاکی اور صفائی کا دعویٰ نہ کرو، اللہ ہی جانتا ہے کہ کون تقویٰ شعار ہے۔“

[۱] ابن ماجہ، ابواب الادب، باب فضل الخامدین ج: ۲ ص: ۲۷۰

[۲] صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب فضل الوضوء ج: ۱ ص: ۱۱۸

[۳] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۱۳۳

مطلب یہ ہے کہ انسان کی تعریف اور مدح کا مدار تقویٰ پر ہے، اور اس کا حال اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ کس کا تقویٰ کس درجے کا ہے، اور حق تعالیٰ نے جو اپنی حمد و ثنا خود بیان فرمائی، اس کی وجہ یہ ہے کہ بیچارہ انسان اس کی استعداد نہیں رکھتا کہ بارگاہِ عزت و جلال کی حمد و ثنا کیسے بیان کرے، اور کسی کی تو کیا مجال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان حمد و ثنا کر سکے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ“ یعنی ”میں آپ کی ثنا کا حقہ نہیں کر سکتا۔“ [۱] اس لئے اللہ جل شانہ نے خود ہی حمد و ثنا کا طریقہ انسان کو تعلیم فرمادیا۔

لفظ ”رَبُّ“ اللہ تعالیٰ کا خاص نام ہے، غیر اللہ کو رَبُّ کہنا جائز نہیں

۴۔ لفظ ”رَبُّ“ کو ایسے شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی چیز کا مالک ہو اور اس کی تربیت و اصلاح کی تدبیر اور پوری نگرانی بھی کرتا ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ ساری کائنات و مخلوقات کا ایسا رَبُّ سوائے خدا تعالیٰ کے اور کوئی نہیں ہو سکتا، اس لئے یہ لفظ اپنے اطلاق کے وقت حق تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، غیر اللہ کو ”رَبُّ“ کہنا جائز نہیں، صحیح مسلم کی حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے کہ کوئی غلام یا نوکر اپنے آقا کو ”رَبُّ“ کہے، البتہ کسی خاص چیز کی طرف اضافت کر کے انسان وغیرہ کے لئے یہ بھی لفظ بولا جاسکتا ہے مثلاً ”رَبُّ الْمَالِ، رَبُّ الدَّارِ“ وغیرہ۔ (قرطبی) [۲]

استعانت کے معنی کی تشریح اور مسئلہ توسل کی تحقیق

۵۔ اِيَّاكَ تَعْبُدُ وَاِيَّاكَ تَسْتَعِيْنُ کے معنی مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ بیان فرمائے ہیں کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے، اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں، تیرے سوا کسی سے نہیں مانگتے۔ (ابن جریر، ابن ابی حاتم) [۳]

بعض سلف صالحینؒ نے فرمایا کہ سورہ فاتحہ پورے قرآن کا راز (خلاصہ) ہے، اور آیت اِيَّاكَ تَعْبُدُ وَاِيَّاكَ تَسْتَعِيْنُ پوری سورہ فاتحہ کا راز (خلاصہ) ہے، کیونکہ اس کے پہلے جملے میں شرک سے بری ہونے کا اعلان ہے، اور دوسرے جملے میں اپنی قوت و قدرت سے بری ہونے کا اظہار ہے کہ بندہ عاجز بغیر اللہ تعالیٰ کی مدد کے کچھ نہیں کر سکتا، جس کا نتیجہ اپنے سب کاموں کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے، جس کی ہدایت قرآن کریم میں جا بجا آئی ہے: فَاَعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ

[۱] جامع الترمذی، ابواب الدعوات، باب ما جاء في عقد التسبيح باليد ج: ۲، ص: ۱۸۹

[۲] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۱، ص: ۱۳۶، ۱۳۷

[۳] تفسیر ابن ابی حاتم رقم الحديث: ۲۷

عَلَيْهِ^۱ (ہود: ۱۲۳)، قُلْ هُوَ الرَّحْمَنُ اِمْنًا بِهِ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا^۲ (الملك: ۲۹)، رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ^۳ وَكِيلًا^① (الزلزل)

ان تمام آیات کا حاصل یہی ہے کہ مومن اپنے ہر عمل میں اعتماد اور بھروسہ نہ اپنی قابلیت پر کرے، نہ کسی دوسرے کی مدد پر بلکہ کلی اعتماد صرف اللہ تعالیٰ ہی پر ہونا چاہئے، وہی کارسازِ مطلق ہے۔
اس سے دو مسئلے اصول عقائد کے ثابت ہوئے، اول یہ کہ:-

اللہ کے سوا کسی کی عبادت روا نہیں، اس کی عبادت میں کسی کو شریک کرنا حرام اور ناقابلِ معافی جرم ہے

عبادت کے معنی اوپر معلوم ہو چکے ہیں کہ کسی ذات کی انتہائی عظمت و محبت کی بنا پر اس کے سامنے اپنی انتہائی عاجزی اور تذلل کا اظہار ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے تو یہی شرک کہلاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ شرک صرف اسی کو نہیں کہتے کہ بت پرستوں کی طرح کسی پتھر کی مورتی وغیرہ کو خدائی اختیارات کا مالک سمجھے، بلکہ کسی کی عظمت، محبت، اطاعت کو وہ درجہ دینا جو اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے، یہ بھی شرکِ جلی میں داخل ہے، قرآن مجید میں یہود و نصاریٰ کے شرک کا بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:-

اتَّخَذُوا أَحْبَابَهُمْ وَرُءُوسًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ (التوبة: ۳۱)

”یعنی ان لوگوں نے اپنے دینی عالموں کو اپنا رب بنا لیا ہے۔“

حضرت عدی بن حاتمؓ جو مسلمان ہونے سے پہلے نصرانی تھے، انہوں نے اس آیت کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم تو اپنے علماء کی عبادت نہیں کرتے تھے، پھر قرآن میں ان کو معبود بنانے کا الزام ہم پر کیسے لگایا گیا، آپ نے فرمایا: کیا ایسا نہیں ہے کہ تمہارے علماء بہت سی ایسی چیزوں کو حرام قرار دے دیتے ہیں جن کو اللہ نے حلال کیا ہے، اور تم اپنے علماء کے کہنے پر ان کو حرام ہی سمجھتے ہو، اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے، تمہارے علماء ان کو حلال کر دیتے ہیں، تو تم ان کے کہنے کا اتباع کر کے حلال کر لیتے ہو۔ عدی بن حاتمؓ نے عرض کیا کہ: بیشک ایسا تو ہے، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی تو ان کی عبادت ہے۔^②

① ترجمہ:- لہذا (اے پیغمبر!) اُس کی عبادت کرو، اور اُس پر بھروسہ رکھو۔

② ترجمہ:- کہہ دو کہ: وہ رحمن ہے، ہم اس پر ایمان لائے ہیں، اور اسی پر ہم نے بھروسہ کیا ہے۔

③ ترجمہ:- وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس لئے اُسی کو کارساز بنا لو۔

④ المعجم الكبير للطبرانی رقم الحديث: ۱۳۶۷۳

اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے حلال یا حرام قرار دینے کا حق صرف حق تعالیٰ کا ہے، جو شخص اس میں کسی دوسرے کو شریک قرار دے اور اللہ تعالیٰ کے احکام حرام و حلال معلوم ہونے کے باوجود ان کے خلاف کسی دوسرے کے قول کو واجب الاتباع سمجھے وہ گویا اس کی عبادت کرتا ہے اور شرک میں مبتلا ہے۔

عام مسلمان جو قرآن و سنت کو براہ راست سمجھنے کی اور ان سے احکام شرعیہ نکالنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اس لئے کسی امام، مجتہد یا عالم مفتی کے قول پر اعتماد کر کے عمل کرتے ہیں، اُس کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ وہ درحقیقت قرآن و سنت ہی پر عمل ہے اور احکام خداوندی ہی کی اطاعت ہے، اور خود قرآن کریم نے اس کی ہدایت فرمائی ہے:-

فَسْئَلُوا أَهْلَ الدِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۳۳﴾ (النحل)

”یعنی اگر تم خود احکام الہیہ کو نہیں جانتے، تو اہل علم سے پوچھ لو۔“

اور جس طرح احکام حلال و حرام میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو شریک کرنا شرک ہے، اسی طرح کسی کے نام کی نذر (منت) ماننا بھی شرک میں داخل ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو حاجت روا، مشکل کشا سمجھ کر اُس سے دُعا مانگنا بھی شرک ہے، کیونکہ حدیث میں دُعا کو عبادت فرمایا گیا ہے۔

اسی طرح ایسے اعمال و افعال جو علامات شرک کی سمجھے جاتے ہیں ان کا ارتکاب بھی بحکم شرک ہے، جیسے حضرت عدی بن حاتمؓ نے فرمایا کہ (مسلمان ہونے کے بعد) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو میرے گلے میں صلیب پڑی ہوئی تھی، آپ نے مجھ سے فرمایا کہ اس بت کو اپنے گلے سے نکال دو۔^[۱]

اگرچہ اُس وقت عدی بن حاتمؓ کا عقیدہ صلیب کے متعلق وہ نہ تھا جو نصرانیوں کا ہوتا ہے، مگر ظاہری طور پر بھی علامت شرک سے اجتناب کو ضروری سمجھ کر یہ ہدایت کی گئی۔ افسوس کہ آج کل ہزاروں مسلمان ریڈ کر اس کا صلیبی نشان لگائے ہوئے پھرتے ہیں، اور کوئی پروا نہیں کرتے کہ بلا وجہ ایک مشرک نہ جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اسی طرح کسی کو زکوٰۃ، سجدہ کرنا، یا بیت اللہ کے سوا کسی دوسری چیز کے گرد طواف کرنا، یہ سب علامات شرک ہیں جن سے اجتناب اِيَّاكَ تَعْبُدُ کے اقرار یا حلف و فاداری کا جزء ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ استعانت اور استغاثہ صرف اللہ تعالیٰ ہی سے کرنا ہے، کسی دوسرے سے جائز نہیں۔

مسئلہ استعانت و توسل کی تحقیق اور احکام کی تفصیل

یہ دوسرا مسئلہ کسی سے مدد مانگنے کا ذرا تشریح طلب ہے، کیونکہ ایک مدد تو مادی اسباب کے ماتحت ہر انسان

دوسرے انسان سے لیتا ہے، اس کے بغیر اس دُنیا کا نظام چل ہی نہیں سکتا، صنعت کار اپنی صنعت کے ذریعہ ساری مخلوق کی خدمت کرتا ہے، مزدور، معمار، بڑھی، لوہار سب مخلوق کی مدد میں لگے ہوئے ہیں، اور ہر شخص ان سے مدد لینے مانگنے پر مجبور ہے، ظاہر ہے کہ یہ کسی دین اور شریعت میں ممنوع نہیں، وہ اُس استعانت میں داخل نہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، اسی طرح غیر مادی اسباب کے ذریعہ کسی نبی یا ولی سے دُعا کرنے کی مدد مانگنا یا ان کا وسیلہ دے کر براہِ راست اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگنا روایاتِ حدیث اور ارشاداتِ قرآن سے اس کا بھی جواز ثابت ہے، وہ بھی اُس استعانت میں داخل نہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص اور غیر اللہ کے لئے حرام اور شرک ہے۔

اب وہ مخصوص استعانت و امداد جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور غیر اللہ کے لئے شرک ہے، کونسی ہے؟ اس کی دو قسمیں ہیں، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی فرشتے یا پیغمبر یا ولی یا کسی اور انسان کو خدا تعالیٰ کی طرح قادرِ مطلق اور مختارِ مطلق سمجھ کر اس سے اپنی حاجت مانگے، یہ تو ایسا کھلا ہوا کفر ہے کہ عام مشرکین بت پرست بھی اس کو کفر سمجھتے ہیں، اپنے بتوں، دیوتاؤں کو بالکل خدا تعالیٰ کی مثل قادرِ مطلق اور مختارِ مطلق یہ کفار بھی نہیں مانتے۔

دوسری قسم وہ ہے جس کو کفار اختیار کرتے ہیں، اور قرآن اور اسلام اس کو باطل و شرک قرار دیتا ہے، اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں یہی مراد ہے کہ ایسی استعانت و امداد ہم اللہ کے سوا کسی سے نہیں چاہتے، وہ یہ ہے کہ اللہ کی کسی مخلوق فرشتے یا پیغمبر یا ولی یا کسی دیوتا کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ اگرچہ قادرِ مطلق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور کامل اختیارات اسی کے ہیں، لیکن اس نے اپنی قدرت و اختیار کا کچھ حصہ فلاں شخص کو سونپ دیا ہے، اور اُس دائرے میں وہ خود مختار ہے، یہی وہ استعانت و استمداد ہے جو مومن و کافر میں فرق اور اسلام و کفر میں امتیاز کرتی ہے، قرآن اس کو شرک و حرام قرار دیتا ہے، بت پرست مشرکین اس کے قائل اور اس پر عامل ہیں۔

اس معاملے میں دھوکا یہاں سے لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بہت سے فرشتوں کے ہاتھوں دُنیوی نظام کے بہت سے کام جاری کرتے ہیں، دیکھنے والا اس معاملے میں پڑ سکتا ہے کہ اس فرشتے کو اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار سپرد کر دیا ہے، یا انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ بہت سے ایسے کام وجود میں آتے ہیں جو عام انسانوں کی قدرت سے خارج ہیں، جن کو ”معجزات“ کہا جاتا ہے، اسی طرح اولیاء اللہ کے ذریعے بھی ایسے ہی بہت سے کام وجود میں آتے ہیں جن کو ”کرامات“ کہا جاتا ہے، یہاں سرسری نظروالوں کو یہ مغالطہ لگ جاتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کاموں کی قدرت و اختیار ان کو سپرد نہ کرتا تو اُن کے ہاتھ سے یہ کیسے وجود میں آتے؟ اس سے وہ ان انبیاء و اولیاء کے ایک درجے میں مختار کار ہونے کا عقیدہ بنا لیتے ہیں، حالانکہ حقیقت یوں نہیں، بلکہ معجزات اور کرامات براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، صرف اس کا ظہور پیغمبر یا ولی کے ہاتھوں پر ان کی عظمت ثابت کرنے کے لئے کیا جاتا ہے، پیغمبر اور ولی کو اس کے وجود میں لانے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا،

قرآن مجید کی بے شمار آیات اس پر شاہد ہیں، مثلاً آیت: وَمَا مَرَّمِيَّتْ إِذْ مَرَّمِيَّتْ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (الانفال: ۱۷) میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معجزے کا ذکر ہے جس میں آپ نے دشمن کے لشکر کی طرف ایک مٹھی کنکریوں کی پھینکی، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وہ سارے لشکر کی آنکھوں میں جا لگیں، اس کے متعلق ارشاد ہے کہ ”یہ آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی“، جس سے معلوم ہوا کہ معجزہ جو نبی کے واسطے سے صادر ہوتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کو جب اُن کی قوم نے کہا کہ اگر آپ سچے ہیں تو جس عذاب سے ڈرا رہے ہیں وہ بلا لیجئے، تو انہوں نے فرمایا: اٰثْمَا يٰۤاَيُّكُمْ بِهٖ اللّٰهُ اِنْ شَاءَ (ہود: ۳۳) یعنی ”معجزہ کے طور پر آسمانی عذاب نازل کرنا میرے قبضے میں نہیں، اللہ تعالیٰ اگر چاہے گا تو یہ عذاب آجائے گا، پھر تم اس سے بھاگ نہ سکو گے۔“

سورہ ابراہیم میں انبیاء و رسل کی ایک جماعت کا یہ قول ذکر فرمایا ہے: وَمَا كَانَ لَنَا اَنْ نَّاتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (ابراہیم: ۱۱) یعنی ”کسی معجزہ کا صادر کرنا ہمارے ہاتھ میں نہیں، اللہ تعالیٰ کے اذن و مشیت کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔“ اسی وجہ سے کوئی پیغمبر یا کوئی ولی جب چاہے جو چاہے معجزہ یا کرامت دکھادے، یہ قطعاً کسی کے بس میں نہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء سے بہت سے معین معجزات کا مطالبہ مشرکین نے کیا، مگر جس کو اللہ تعالیٰ نے چاہا ظاہر کر دیا، جس کو نہ چاہا نہیں ہوا، پورا قرآن اس کی شہادتوں سے بھرا ہوا ہے۔

ایک محسوس مثال سے اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ آپ جس کمرے میں بیٹھے ہیں اس میں بجلی کی روشنی بلب سے اور ہوا برقی پنکھے سے آپ کو پہنچ رہی ہے، مگر یہ بلب اور پنکھا اس روشنی اور ہوا پہنچانے میں قطعاً خود مختار نہیں، بلکہ ہر آن اس جوڑ (کنکشن) کے محتاج ہیں جو تار کے ذریعے پاؤں اور ہاؤس کے ساتھ اُن کو حاصل ہے، ایک سیکنڈ کے لئے یہ جوڑ ٹوٹ جائے تو نہ بلب آپ کو روشنی دے سکتا ہے، نہ پنکھا ہوا دے سکتا ہے، کیونکہ درحقیقت وہ عمل بلب اور پنکھے کا ہے ہی نہیں، بلکہ بجلی کی روکا ہے، جو پاؤں اور ہاؤس سے یہاں پہنچ رہی ہے۔ انبیاء و اولیاء اور سب فرشتے ہر عمل میں، ہر کام میں ہر آن حق تعالیٰ کے محتاج ہیں، اسی کی قدرت و مشیت سے سب کام وجود میں آتے ہیں، اگرچہ ظہور اس کا بلب اور پنکھے کی طرح انبیاء و اولیاء کے ہاتھوں پر ہوتا ہے۔

اس مثال سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ان چیزوں کے صدور اور وجود میں اگرچہ اختیار انبیاء و اولیاء کا نہیں مگر اُن کا وجود باوجود اُن سے بالکل بے دخل بھی نہیں، جیسے بلب اور پنکھے کے بغیر آپ کو روشنی اور ہوا نہیں پہنچ سکتی، یہ معجزات و کرامات بھی انبیاء و اولیاء کے بغیر نہیں ملتے، اگرچہ یہ فرق ضرور ہے کہ پوری فنگ اور کنکشن کے درست ہونے کے باوجود آپ کو بغیر بلب کے روشنی اور بغیر پنکھے کے ہوا کا ملنا عادتاً ناممکن ہے، اور معجزات و کرامات میں حق تعالیٰ کو سب کچھ قدرت ہے کہ بغیر واسطہ کسی پیغمبر و ولی کے بھی اس کا ظہور فرمادیں، مگر عادتاً اللہ یہی ہے کہ اُن کا صدور بغیر واسطہ اولیاء و انبیاء کے

نہیں ہوتا، کیونکہ ایسے خوارقِ عادات کے اظہار سے جو مقصد ہے وہ اس کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔

اس لئے معلوم ہوا کہ عقیدہ تو یہی رکھنا ہے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت سے ہو رہا ہے، اس کے ساتھ انبیاء و اولیاء کی عظمت و ضرورت کا بھی اعتراف ضروری ہے، اس کے بغیر رضائے الہی اور طاعتِ احکامِ خداوندی سے محروم رہے گا، جس طرح کوئی شخص بلب اور سچکے کی قدر نہ پہچانے اور ان کو ضائع کر دے تو روشنی اور ہوا سے محروم رہتا ہے۔ وسیلہ، استعانت اور استمداد کے مسئلے میں بکثرت لوگوں کو اشکال رہتا ہے، اُمید ہے کہ اس تشریح سے اصل حقیقت واضح ہو جائے گی، اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ انبیاء و اولیاء کو وسیلہ بنانا نہ مطلقاً جائز ہے اور نہ مطلقاً ناجائز، بلکہ اس میں وہ تفصیل ہے جو اوپر ذکر کی گئی ہے کہ کسی کو مختار مطلق سمجھ کر وسیلہ بنایا جائے تو شرک و حرام ہے، اور محض واسطہ اور ذریعہ سمجھ کر کیا جائے تو جائز ہے، اس میں عام طور پر لوگوں میں افراط و تفریط کا عمل نظر آتا ہے۔

وَاللّٰهُ اَسْأَلُ الصَّوَابَ وَالسَّدَادَ وَبِيَدِهِ الْمُبْدَأُ وَالْمَعَادُ

صراطِ مستقیم کی ہدایت دُنیا و دین میں کلیدِ کامیابی ہے

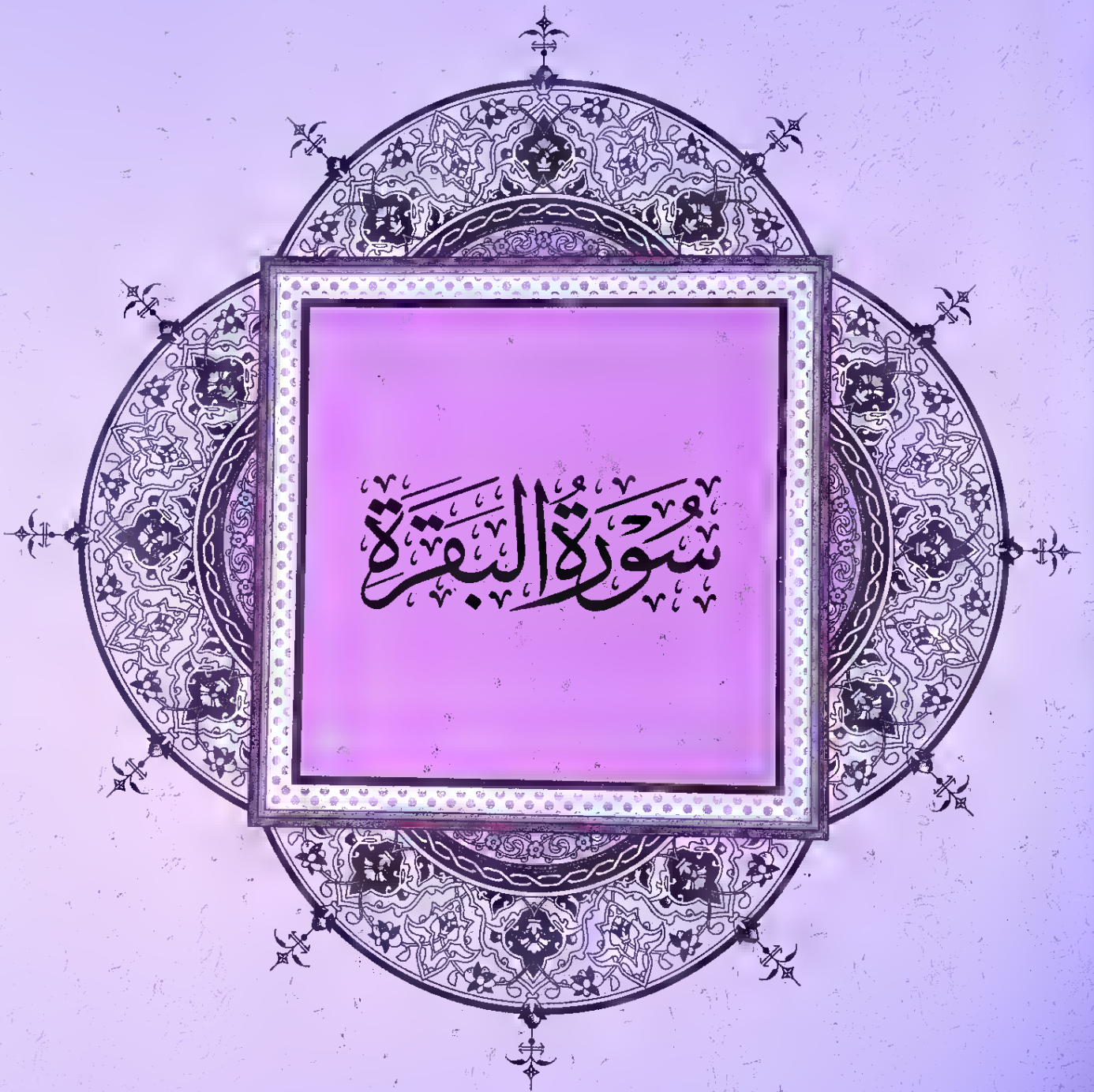
۶۔ اصل تفسیر میں یہ بات وضاحت سے آگئی ہے کہ قرآن کریم نے جس دُعا کو ہر شخص کے لئے ہر کام کے لئے ہر حال میں انتخاب فرمایا ہے وہ صراطِ مستقیم کی ہدایت کی دُعا ہے، جس طرح آخرت کی کامیابی اُس صراطِ مستقیم پر موقوف ہے جو انسان کو جنت کی طرف لے جائے، اسی طرح دُنیا کے سارے کاموں میں بھی غور کرو تو کامیابی کا مدار صراطِ مستقیم ہی ہے، جس کام میں وہ آلات و ذرائع اختیار کئے گئے جس کے نتیجے میں مقصد کا حصول عادتاً لازمی ہے تو کامیابی عادتاً لازمی ہوتی ہے، جہاں کہیں انسان اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا تو اگر وہ غور کرے تو معلوم ہو جائے گا کہ کام کے کسی مرحلے میں اس نے غلطی کی ہے، صحیح راستہ ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا، اس لئے ناکامیابی ہوئی۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ صراطِ مستقیم کی ہدایت صرف آخرت اور دین کے کاموں کے ساتھ مخصوص نہیں، دُنیا کے سب کاموں کی دُرستی اور کامیابی بھی اسی پر موقوف ہے، اس لئے یہ دُعا ایسی ہے کہ مومن کو ہر وقت حرزِ جان بنانے کے قابل ہے، شرط یہ ہے کہ استحضار اور نیت کے ساتھ کی جائے، محض الفاظ کا پڑھ لینا نہ ہو، وَاللّٰهُ الْمُؤَقِّقُ وَالْمُعِينُ۔

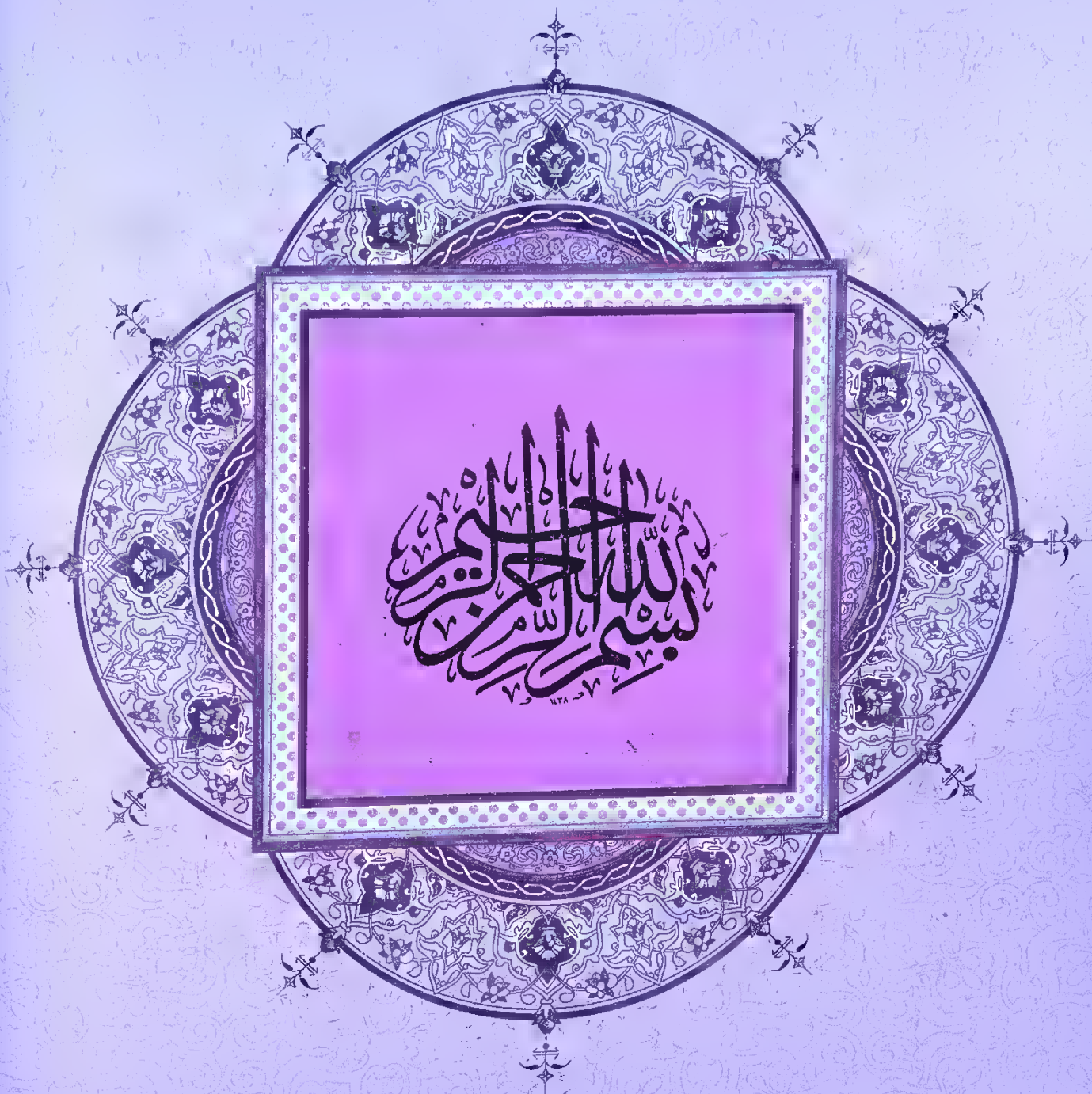
بعونہ تعالیٰ تفسیر سورہ فاتحہ ختم ہوئی،

وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اَوَّلُهُ وَاٰخِرُهُ وَظَاهِرُهُ وَبَاطِنُهُ

سُورَةُ الْبَقَرَةِ



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ





نام اور تعداد آیات

اس سورت کا نام سورہ بقرہ ہے، اور اسی نام سے حدیث اور آثارِ صحابہ میں اس کا ذکر موجود ہے، جس روایت میں سورہ بقرہ کہنے کو منع کیا ہے، وہ صحیح نہیں (ابن کثیر)۔ تعداد آیات دو سو چھیاسی ہے، اور کلمات چھ ہزار دو سو اکیس اور حروف پچیس ہزار پانچ سو ہیں۔ (ابن کثیر)

زمانہ نزول

یہ سورت مدنی ہے، یعنی ہجرت مدینہ طیبہ کے بعد نازل ہوئی، اگرچہ اس کی بعض آیات مکہ مکرمہ میں حج کے وقت نازل ہوئی ہیں، مگر وہ بھی باصطلاح مفسرین مدنی کہلاتی ہیں۔

سورہ بقرہ قرآن کریم کی سب سے بڑی سورت ہے، اور مدینہ طیبہ میں سب سے پہلے اس کا نزول شروع ہوا، اور مختلف زمانوں میں مختلف آیتیں نازل ہوتی رہیں، یہاں تک کہ ربّانی سود کے متعلق جو آیات ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں فتح مکہ کے بعد نازل ہوئیں، اور اس کی ایک آیت: **وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ** (البقرہ: ۲۸۱) تو قرآن کی بالکل آخری آیت ہے جو ۱۰ھ میں ۱۰ رذی الحجہ کو منی کے مقام پر نازل ہوئی جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے فرائض ادا کرنے میں مشغول تھے (قرطبی)۔ اور اس کے اسی نوے دن کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اور وحی الہی کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

فضائل سورۃ بقرہ

یہ قرآن کریم کی سب سے بڑی سورت اور بہت سے احکام پر مشتمل ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: ”سورۃ بقرہ کو پڑھا کرو، کیونکہ اس کا پڑھنا برکت ہے، اور اس کا چھوڑنا حسرت اور بد نصیبی ہے، اور اہل باطل اس پر قابو نہیں پاسکتے۔“^۱

قرطبی نے حضرت معاویہؓ سے نقل کیا ہے کہ اس جگہ اہل باطل سے مراد جادوگر ہیں، مراد یہ ہے کہ اس سورت کے پڑھنے والے پر کسی کا جادو نہ چلے گا۔ (قرطبی از مسلم بروایت ابو امامہ باہلی)^۲

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس گھر میں سورۃ بقرہ پڑھی جائے شیطان وہاں سے بھاگ جاتا ہے۔ (ابن کثیر از حاکم)^۳

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”سورۃ بقرہ سنام القرآن اور ذرۃ القرآن ہے۔“ ”سنام“ اور ”ذرۃ“ ہر چیز کے اعلیٰ و افضل حصے کو کہا جاتا ہے، اس کی ہر آیت کے نزول کے وقت اسی فرشتے اس کے جلو میں نازل ہوئے ہیں (ابن کثیر از مسند احمد)۔ اور حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ اس سورت میں ایک آیت ایسی ہے جو تمام آیات قرآن میں اشرف و افضل ہے، اور وہ آیت الکرسی ہے۔ (ابن کثیر از ترمذی)^۴

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ: ”سورۃ بقرہ کی دس آیتیں ایسی ہیں کہ اگر کوئی شخص اُن کورات میں پڑھ لے تو اس رات کو جن، شیطان گھر میں داخل نہ ہوگا، اور اس کو اور اس کے اہل و عیال کو اس رات میں کوئی آفت، بیماری، رنج و غم وغیرہ ناگوار چیز پیش نہ آئے گی، اور اگر یہ آیتیں کسی مجنون پر پڑھی جائیں تو اس کو افاقہ ہو جائے گا۔“ وہ دس آیتیں یہ ہیں: چار آیتیں شروع سورۃ بقرہ کی، پھر تین آیتیں درمیانی یعنی آیت الکرسی اور اس کے بعد کی دو آیتیں، پھر آخر سورۃ بقرہ کی تین آیتیں۔

۱ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، باب فضل قراءة القرآن وسورة البقرة ج: ۱ ص: ۲۷۰

۲ بحوالہ بالا۔

۳ مستدرک حاکم رقم الحدیث: ۲۰۶۰، ومسند احمد رقم الحدیث: ۷۴۸۷

۴ مسند احمد رقم الحدیث: ۱۹۳۱۵ وتفسیر ابن کثیر ج: ۱ ص: ۱۵۰

۵ جامع الترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ما جاء في سورة البقرة وآية الكرسي ج: ۲ ص: ۱۱۵

۶ شعب الإيمان رقم الحدیث: ۲۳۱۴

احکام و مسائل

مضامین و مسائل کے اعتبار سے بھی سورۃ بقرہ کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے، ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ سورۃ بقرہ میں ایک ہزار اُمّ، اور ایک ہزار نہی، اور ایک ہزار حکمتیں، ایک ہزار خبر اور قصص ہیں (قرطبی وابن کثیر)۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروقِ اعظمؓ نے جب سورۃ بقرہ کو تفسیر کے ساتھ پڑھا تو اس کی تعلیم میں بارہ سال خرچ ہوئے، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے یہ سورت آٹھ سال میں پڑھی۔ (قرطبی) ^[۲]

سورۃ فاتحہ درحقیقت پورے قرآن کا خلاصہ ہے، اس کے بنیادی مضامین تین ہیں: اوّل اللہ تعالیٰ کی رُبوبیت، یعنی پروردگارِ عالم ہونے کا بیان، دوسرے اس کا مستحقِ عبادت ہونا، اور اس کے سوا کسی کا لائقِ عبادت نہ ہونا، تیسرے طلبِ ہدایت۔ سورۃ فاتحہ کا آخری مضمون صراطِ مستقیم کی ہدایت طلب کرنا ہے اور درحقیقت پورا قرآن اس کے جواب میں ہے کہ جو شخص صراطِ مستقیم چاہتا ہے قرآن ہی میں ملے گا۔

اسی لئے فاتحہ کے بعد پہلی سورت سورۃ بقرہ رکھی گئی، اور اس کو ذٰلِكَ الْكِتَابُ سے شروع کر کے اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ جس صراطِ مستقیم کو تم ڈھونڈتے ہو وہ یہ کتاب ہے۔

اس کے بعد اس سورت میں اوّل ایمان کے بنیادی اُصول، توحید، رسالت، آخرت اجمالی طور پر اور آخر سورت میں ایمانِ مفصل بیان فرمایا گیا ہے، اور درمیان میں ہر شعبہ زندگی: عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق، اصلاحِ ظاہر و باطن کے متعلق ہدایات کے بنیادی اُصول اور اُن کے ساتھ بہت سی جزئیات بیان ہوئی ہیں۔



[۱] تفسیر ابن کثیر ج: ۱ ص: ۱۵۴ والقرطبی ج: ۱ ص: ۱۵۴

[۲] تفسیر القرطبی ج: ۱ ص: ۱۵۴

ایاتھا ۲۸۶ ﴿۲﴾ سُورَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ ۸۷ ﴿۱﴾ رُكُوعَاتُهَا ۲۰ ﴿۲﴾

سورہ بقرہ مدنی ہے، اس میں ۲۸۶ آیتیں ہیں اور ۲۰ رُکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الْم ﴿۱﴾ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ

اس کتاب میں کچھ شک نہیں راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو۔ جو کہ

يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳﴾

یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو ہم نے روزی دی ہے اُن کو اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ﴿۴﴾ وَبِالْاٰخِرَةِ

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تیری طرف اور اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تجھ سے پہلے اور آخرت کو

هُمْ يُوقِنُوْنَ ﴿۵﴾ اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًى مِّنْ رَبِّهِمْ ﴿۶﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۷﴾

وہ یقینی جانتے ہیں۔ وہی لوگ ہیں ہدایت پر اپنے پروردگار کی طرف سے اور وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے۔

آسان ترجمہ قرآن

شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے

الْم ﴿۱﴾ یہ کتاب ایسی ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں، یہ ہدایت ہے ان ڈر رکھنے والوں کے لئے ﴿۲﴾ جو بے دیکھی

چیزوں پر ایمان لاتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اُس میں سے (اللہ کی خوشنودی کے

کاموں میں) خرچ کرتے ہیں ﴿۳﴾ اور جو اُس (وحی) پر بھی ایمان لاتے ہیں جو آپ پر اتاری گئی اور اُس پر بھی جو آپ سے

پہلے اُتاری گئی، اور آخرت پر وہ مکمل یقین رکھتے ہیں ④ یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے پروردگار کی طرف سے صحیح راستے پر ہیں، اور یہی وہ لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں ⑤

خلاصہ تفسیر

یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں (یعنی قرآن کے من جانب اللہ ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں، اگرچہ کوئی نا فہم اس میں شبہ رکھتا ہو، کیونکہ یقینی بات کسی کے شبہ کرنے سے بھی حقیقت میں یقینی ہی رہتی ہے) راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو جو یقین لاتے ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر (یعنی جو چیزیں اُن کے حواس و عقل سے پوشیدہ ہیں صرف اللہ و رسول کے فرمانے سے ان کو صحیح مان لیتے ہیں) اور قائم رکھتے ہیں نماز کو (قائم رکھنا یہ ہے کہ اس کو پابندی کے ساتھ اس کے وقت میں پورے شرائط و ارکان کے ساتھ ادا کریں) اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں (یعنی نیک کاموں میں) اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اُتاری گئی ہے اور اُن کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اُتاری جا چکی ہیں (مطلب یہ ہے کہ اُن کا ایمان قرآن پر بھی ہے اور پہلی کتابوں پر بھی، اور ایمان سچا سمجھنے کو کہتے ہیں، عمل کرنا دوسری بات ہے، جتنی کتابیں اللہ نے پہلے انبیاء پر نازل فرمائی ہیں ان کو سچا سمجھنا فرض اور شرط ایمان ہے، یعنی یہ سمجھے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی تھیں وہ صحیح ہیں، خود غرض لوگوں نے جو اس میں تبدیل و تحریف کی ہے وہ غلط ہے، رہ گیا عمل سو وہ صرف قرآن پر ہوگا، پہلی کتابیں سب منسوخ ہو گئیں، اُن پر عمل جائز نہیں) اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں، بس یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو اُن کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب (یعنی ایسے لوگوں کو دُنیا میں تو یہ نعمت ملی کہ راہِ حق ملی اور آخرت میں ہر طرح کی کامیابی اُن کے لئے ہے)۔

حل لغات

ذٰلِكَ کسی دُور کی چیز کی طرف اشارہ کے لئے استعمال ہوتا ہے، رَیْبُ شک و شبہ، هُدًی ہدایت سے بنا ہے، اور ہدایت کے معنی رہنمائی، مُتَّقِیْنَ جن میں صفت تقویٰ ہو، تقویٰ کے لفظی معنی بچنے کے ہیں، مراد اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنا ہے، غَیْبِ لفظی معنی ہر وہ چیز جو انسان کی نظر اور دُوسرے حواس سماعت وغیرہ سے باہر ہو، یُقِيمُونَ اقامت سے بنا ہے، جس کے معنی سیدھا کرنے کے ہیں، اور نماز کا سیدھا کرنا یہ ہے کہ آداب اور خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کی جائے، رَزَقْنَاهُمْ رِزْق سے بنا ہے، جس کے معنی ہیں روزی اور گزارے کا سامان دینا، یُنْفِقُونَ انفاق سے بنا ہے، خرچ کرنے کے معنی میں آتا ہے، اخْرَجَ لغت میں مؤخر اور بعد میں آنے والی چیز کو آخرت کہا جاتا ہے، اس جگہ عالم دُنیا کے مقابلے میں

عالم آخرت بولا گیا، یُقْتَنُونَ اِیقَان سے ہے اور وہ یقین سے بنا ہے، اور یقین اس کو کہتے ہیں جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو، مُفْلِحُونَ اِفْلَاح سے اور وہ فَلَاح سے بنا ہے، فلاح کے معنی پوری کامیابی۔

معارف و مسائل

حروفِ مقطعه جو بہت سی سورتوں کے شروع میں آتے ہیں اُن کی تحقیق

الْم، بہت سی سورتوں کے شروع میں چند حروفوں سے مرکب ایک کلمہ لایا گیا ہے جیسے: اَلْم، اَلْحَمْد، اَلْبَقَرَة، وغیرہ، ان کو اصطلاح میں حروفِ مقطعه کہا جاتا ہے، ان میں سے ہر حرف جدا جدا سا کن پڑھا جاتا ہے، الف، لام، میم۔

حروفِ مقطعه جو اوائلِ سور میں آئے ہیں، اُن کے متعلق بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ اُن سورتوں کے نام ہیں، بعض حضرات نے فرمایا کہ اسمائے الہیہ کے رُموز ہیں، مگر جمہور صحابہؓ و تابعینؓ اور علمائے اُمت کے نزدیک رائج یہ ہے کہ یہ حروف رُموز اور اسرار ہیں، جس کا علم سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں، اور ہو سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم بطور ایک راز کے دیا گیا ہو، جس کی تبلیغ اُمت کے لئے روک دی گئی ہو، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان حروف کی تفسیر و تشریح کچھ منقول نہیں، امام تفسیر قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار فرمایا ہے، اُن کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

”عامر شعمیؒ، سفیان ثوریؒ اور ایک جماعت محدثین نے فرمایا ہے کہ ہر آسمانی کتاب میں اللہ تعالیٰ کے کچھ خاص رُموز و اسرار ہوتے ہیں، اسی طرح یہ حروفِ مقطعه قرآن میں حق تعالیٰ کا راز ہے، اس لئے یہ اُن متشابہات میں سے ہیں جن کا علم صرف حق تعالیٰ ہی کو ہے، ہمارے لئے ان میں بحث و گفتگو بھی جائز نہیں، مگر اس کے باوجود وہ ہمارے فائدے سے خالی نہیں، اول تو اُن پر ایمان لانا، پھر اُن کا پڑھنا ہمارے لئے ثوابِ عظیم ہے، دوسرے اُن کے پڑھنے کے معنوی فوائد و برکات ہیں، جو اگرچہ ہمیں معلوم نہ ہوں مگر غیب سے وہ ہمیں پہنچتے ہیں۔“

پھر فرمایا:-

”حضرت صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ، عبد اللہ بن مسعودؓ وغیرہ جمہور صحابہ کا ان حروف کے متعلق یہی عقیدہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسرار ہیں، ہمیں اُن پر ایمان لانا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں، اور جس طرح آئے ہیں اُن کی تلاوت کرنا چاہئے، مگر معنی معلوم کرنے کی فکر میں پڑنا درست نہیں۔“^[۱]

ابن کثیرؒ نے بھی قرطبیؒ سے نقل کر کے اسی مضمون کو ترجیح دی ہے، اور بعض اکابر علماء سے جو ان حروف کے معنی منقول ہیں اس سے صرف تمثیل و تنبیہ اور تسہیل مقصود ہے، یہ نہیں کہ مراد حق تعالیٰ کی یہ ہے، اس لئے اس کو بھی غلط کہنا تحقیق علماء کے خلاف ہے۔

ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ ۚ لَفْظُ ذَلِكَ کسی دُور کی چیز کی طرف اشارے کے لئے آتا ہے، اور کِتَاب سے مراد قرآن کریم ہے، رَيْب کے معنی شک و شبہ، معنی یہ ہیں کہ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں، یہ موقع بظاہر اشارہ بعید کا نہیں تھا، کیونکہ اسی قرآن کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو لوگوں کے سامنے ہے، مگر اشارہ بعید سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ سورہ فاتحہ میں جس صراطِ مستقیم کی درخواست کی گئی تھی یہ سارا قرآن اس درخواست کا جواب بصورتِ قبولیت اور صراطِ مستقیم کی تشریح و تفصیل ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے یہ دُعا سن لی اور قرآن بھیج دیا، جو ہدایت کا آفتاب ہے، جو شخص ہدایت چاہتا ہے وہ اس کو پڑھے، سمجھے اور اس کے مقتضی پر عمل کرے۔

اور پھر اس کے متعلق ارشاد ہے کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں، کیونکہ کسی کلام میں شک و شبہ کی دو صورتیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ خود کلام میں غلطی ہو، تو وہ کلام محلِ شک و شبہ ہو جاتا ہے، دُوسرے یہ کہ سمجھنے والے کی فہم میں غلطی ہو، اس صورت میں کلام محلِ شک و شبہ نہیں ہوتا، گوج نہی یا کم نہی کی وجہ سے کسی کو شبہ ہو جائے، جس کا ذکر خود قرآن کریم میں چند آیتوں کے بعد وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنْهُ

اس لئے ہزاروں کم فہموں یا کج فہموں کے شبہات و اعتراضات کے باوجود یہ کہنا صحیح ہے کہ اس کتاب میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۝ ہدایت ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لئے، یعنی مخصوص ہدایت جو نجاتِ آخرت کا ذریعہ بنے، وہ متقین ہی کا حصہ ہے، اگرچہ قرآن کی ہدایت نہ صرف نوعِ بشر کے لئے بلکہ تمام کائناتِ عالم کے لئے عام ہے، سورہ فاتحہ کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ ہدایت کے تین درجے ہیں، ایک درجہ تمام نوعِ انسان بلکہ تمام حیوانات وغیرہ کے لئے بھی عام اور شامل ہے، دُوسرا درجہ مومنین کے لئے خاص اور تیسرا درجہ مقررینِ خاص کے لئے مخصوص ہے، پھر اس کے درجات کی کوئی حد و انتہا نہیں، قرآن کریم کے مختلف مواقع میں کہیں ہدایت عامہ کا ذکر آیا ہے، کہیں ہدایتِ خاصہ کا، اس جگہ ہدایتِ خاصہ کا ذکر ہے، اس لئے متقین کی تخصیص کی گئی ہے، اس پر یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہدایت کی زیادہ ضرورت تو ان لوگوں کو ہے جو متقی نہیں، کیونکہ مذکورہ تحقیق سے معلوم ہو گیا کہ اس جگہ متقین کی خصوصیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن غیر متقی لوگوں کے لئے ہدایت نہیں ہے۔

متقین کی خاص صفات

اس کے بعد دو آیتوں میں متقین کی مخصوص صفات و علامات بیان کر کے یہ بتلادیا گیا ہے کہ یہ جماعت ہدایت یافتہ ہے، انہیں کا راستہ صراطِ مستقیم ہے، جس کو سیدھا راستہ مطلوب ہو، اس جماعت میں شامل ہو جائے، اُن کے ساتھ رہے، اُن کے عقائد و نظریات اور اعمال و اخلاق کو اپنا نصب العین بنائے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ متقین کی مخصوص صفات بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے: **أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝** یعنی یہی لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو اُن کے رب کی طرف سے ملی ہے، اور یہی لوگ ہیں پورے کامیاب۔

متقین کی صفات جو ان دو آیتوں میں بیان ہوئی ہیں ان میں ایمان کی اجمالی تعریف اور اس کے بنیادی اصول بھی آگئے ہیں، اور عملِ صالح کے بنیادی اصول بھی، اس لئے ان صفات کو ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۝ یعنی ”خدا سے ڈرنے والے لوگ ایسے ہیں کہ یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا، اور قائم رکھتے ہیں نماز کو، اور جو ہم نے روزی دی ہے اُس میں سے کچھ خرچ کرتے ہیں۔“

اس آیت میں متقین کی تین صفات بیان کی گئی ہیں: ایمان بالغیب، اقامتِ صلوٰۃ، اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔ اس کے ضمن میں بہت سے اہم مسائل آگئے ہیں، ان کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔

پہلا مسئلہ: - ایمان کی تعریف

ایمان کی تعریف کو قرآن نے **يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ** کے صرف دو لفظوں میں پورا بیان کر دیا ہے، لفظ ایمان اور غیب کے معنی سمجھ لئے جاویں تو ایمان کی پوری حقیقت اور تعریف سمجھ میں آ جاتی ہے۔

لغت میں کسی کی بات کو کسی کے اعتماد پر یقینی طور سے مان لینے کا نام ”ایمان“ ہے، اسی لئے محسوسات و مشاہدات میں کسی کے قول کی تصدیق کرنے کو ایمان نہیں کہتے، مثلاً کوئی شخص سفید کپڑے کو سفید یا سیاہ کو سیاہ کہہ رہا ہے اور دوسرا اس کی تصدیق کرتا ہے اس کو تصدیق کرنا تو کہیں گے، ایمان لانا نہیں کہا جائے گا، کیونکہ اس تصدیق میں قائل کے اعتماد کو کوئی دخل نہیں، بلکہ یہ تصدیق مشاہدہ کی بنا پر ہے، اور اصطلاحِ شرع میں خبرِ رسول کو بغیر مشاہدہ کے محض رسول کے اعتماد پر یقینی طور سے مان لینے کا نام ایمان ہے۔ لفظ ”غیب“ لغت میں ایسی چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے جو نہ بدیہی طور پر انسان کو معلوم ہوں، اور نہ انسان کے حواسِ خمسہ اس کا پتہ لگا سکیں، یعنی نہ وہ آنکھ سے نظر آئیں، نہ کان سے سنائی دیں، نہ ناک

سے سونگھ کر یا زبان سے چکھ کر اُن کا علم ہو سکے، اور نہ ہاتھ سے چھو کر اُن کو معلوم کیا جاسکے۔

قرآن میں لفظ ”غیب“ سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جن کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، اور ان کا علم بداہت عقل اور حواسِ خمسہ کے ذریعہ نہیں ہو سکتا، اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات بھی آجاتی ہیں، تقدیری اُمور، جنت و دوزخ کے حالات، قیامت اور اس میں پیش آنے والے واقعات بھی، فرشتے، تمام آسمانی کتابیں اور تمام انبیائے سابقین بھی، جس کی تفصیل اسی سورہ بقرہ کے ختم پر اَقْنِ الرَّسُولُ میں بیان کی گئی ہے، گویا یہاں ایمانِ مجمل کا بیان ہوا ہے، اور آخری آیت میں ایمانِ مفصل کا۔

تو اب ایمان بالغیب کے معنی یہ ہو گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ہدایات و تعلیمات لے کر آئے ہیں اُن سب کو یقینی طور پر دل سے ماننا، شرط یہ ہے کہ اس تعلیم کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہونا قطعی طور پر ثابت ہو، جمہور اہل اسلام کے نزدیک ایمان کی یہی تعریف ہے۔ (عقیدہ طحاوی، عقائد نفی وغیرہ)

اس تعریف میں ماننے کا نام ایمان بتلایا گیا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ محض جاننے کو ایمان نہیں کہتے، کیونکہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے وہ تو ابلیس و شیطان اور بہت سے کفار کو بھی حاصل ہے کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق کا یقین تھا، مگر اس کو ماننا نہیں، اس لئے وہ مؤمن نہیں۔

دوسرا مسئلہ:- اقامتِ صلوٰۃ

اقامت کے معنی محض نماز پڑھنے کے نہیں، بلکہ نماز کو ہر جہت اور ہر حیثیت سے درست کرنے کا نام اقامت ہے، جس میں نماز کے تمام فرائض، واجبات، مستحبات اور پھر اُن پر دوام و التزام، یہ سب اقامت کے مفہوم میں داخل ہیں، اور صحیح یہ ہے کہ اس جگہ نماز سے کوئی خاص نماز مراد نہیں، بلکہ فرائض و واجبات اور نفلی نمازوں کو یہ لفظ شامل ہے، خلاصہ مضمون یہ ہوا کہ وہ لوگ جو نمازوں کی پابندی بھی قواعد شرعیہ کے مطابق کرتے ہیں، اور اُن کے پورے آداب بھی بجالاتے ہیں۔

تیسرا مسئلہ:- اللہ کی راہ میں خرچ کرنا

اس میں بھی صحیح اور تحقیقی بات جس کو جمہور مفسرین نے اختیار فرمایا ہے، یہی ہے کہ ہر قسم کا وہ خرچ داخل ہے جو اللہ کی راہ میں کیا جائے، خواہ فرض زکوٰۃ ہو، یا دوسرے صدقاتِ واجبہ یا نفلی صدقات و خیرات، کیونکہ قرآن کریم میں جہاں کہیں لفظ انفاق استعمال ہوا ہے عموماً نفلی صدقات میں یا عام معنی میں استعمال کیا گیا ہے، زکوٰۃ فرض کے لئے عموماً لفظ ”زکوٰۃ“ ہی آیا ہے۔

اس مختصر جملہ میں لفظ مَنَارَ ذَمُّهُمْ پر غور کیجئے تو ایک طرف یہ لفظ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا ایک قوی داعیہ

شریف انسان کے دل میں پیدا کر دیتا ہے کہ جو کچھ مال ہمارے پاس ہے یہ سب خدا ہی کا عطا کیا ہوا اور اسی کی امانت ہے، اگر ہم اس تمام مال کو بھی اللہ کی راہ میں اس کی رضا کے لئے خرچ کر دیں تو حق اور بجا ہے، اس میں بھی ہمارا کوئی احسان نہیں۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس پر مزید اضافہ لفظ **مِمَّا** نے کر دیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے دیئے ہوئے مال کو بھی پورا خرچ کرنا نہیں، بلکہ اس کا کچھ حصہ خرچ کرنا ہے۔

یہاں متقین کی صفات کا بیان کرتے ہوئے اول ایمان بالغیب کا ذکر فرمایا گیا، پھر اقامت نماز اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا۔ ایمان کی اہمیت تو سب کو معلوم ہے کہ وہی اصل الاصول اور سارے اعمال کی مقبولیت کا دار و مدار ہے، لیکن جب ایمان کے ساتھ اعمال کا بیان کیا جائے تو ان کی فہرست طویل اور فرائض و واجبات کی تعداد کثیر ہے، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اعمال میں سے صرف دو عمل نماز اور انفاق مال کے ذکر پر اکتفا کرنے میں کیا راز ہے؟

اس میں غالباً اسی طرف اشارہ ہے کہ جتنے اعمال انسان پر فرض یا واجب ہیں، ان کا تعلق یا انسان کی ذات اور بدن سے ہے یا اس کے مال سے، بدنی اور ذاتی عبادات میں سب سے اہم نماز ہے، اس کا ذکر کرنے پر اکتفا کیا گیا، اور مالی عبادات سب کی سب لفظ انفاق میں داخل ہیں، اس لئے درحقیقت یہ تہا دو اعمال کا ذکر نہیں، بلکہ تمام اعمال و عبادات اُن کے ضمن میں آگئے، اور پوری آیت کے یہ معنی ہو گئے کہ متقین وہ لوگ ہیں جن کا ایمان بھی کامل ہے اور عمل بھی، اور ایمان و عمل کے مجموعہ کا نام ہی اسلام ہے، گویا اس آیت میں ایمان کی مکمل تعریف کے ساتھ اسلام کے مفہوم کی طرف بھی اشارہ ہو گیا، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس جگہ اس کی بھی وضاحت کر دی جائے کہ ایمان اور اسلام میں کیا فرق ہے؟

ایمان اور اسلام میں فرق

لغت میں ایمان کسی چیز کی دل سے تصدیق کرنے کا نام ہے اور اسلام اطاعت و فرمانبرداری کا۔ ایمان کا محل قلب ہے، اور اسلام کا بھی قلب اور سب اعضاء و جوارح لیکن شرعاً ایمان بغیر اسلام کے اور اسلام بغیر ایمان کے معتبر نہیں، یعنی اللہ اور اس کے رسول کی محض دل میں تصدیق کر لینا شرعاً اس وقت تک معتبر نہیں جب تک زبان سے اس تصدیق کا اظہار اور اطاعت و فرمانبرداری کا اقرار نہ کرے، اسی طرح زبان سے تصدیق کا اظہار یا فرمانبرداری کا اقرار اس وقت تک معتبر نہیں جب تک دل میں اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ لغت کے اعتبار سے ایمان اور اسلام الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں، اور قرآن و حدیث میں اسی لغوی

مفہوم کی بنا پر ایمان اور اسلام میں فرق کا ذکر بھی ہے، مگر شرعاً ایمان بدون اسلام کے اور اسلام بدون ایمان کے معتبر نہیں۔
جب اسلام یعنی ظاہری اقرار و فرمانبرداری کے ساتھ دل میں ایمان نہ ہو تو اس کو قرآن کی اصطلاح میں ”نفاق“ کا نام دیا گیا ہے، اور اس کو کھلے کفر سے زیادہ شدید جرم ٹھہرایا ہے:-

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرَجَةِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء: ۱۴۵)

”یعنی منافقین جہنم کے سب سے نیچے کے طبقے میں رہیں گے۔“

اسی طرح ایمان یعنی تصدیق قلبی کے ساتھ اگر اقرار و اطاعت نہ ہو تو اس کو بھی قرآنی نصوص میں کفر ہی قرار دیا ہے، ارشاد ہے: يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبْنَاءَهُمْ (البقرة: ۱۴۶) یعنی ”یہ کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی حقانیت کو ایسے یقینی طریق پر جانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں۔“
اور دوسری جگہ ارشاد ہے:-

وَجَعَلُوا بَيْنَهُمَا سِتْرًا لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الْآيَاتِ الدُّنْيَا (النمل: ۱۴) یعنی ”یہ لوگ ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں، حالانکہ اُن کے دلوں میں اُن کا یقین کامل ہے، اور اُن کی یہ حرکت محض ظلم و تکبر کی وجہ سے ہے۔“

میرے اُستاد محترم حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اس مضمون کو اس طرح بیان فرماتے تھے کہ ایمان اور اسلام کی مسافت ایک ہے، فرق صرف ابتدا و انتہا میں ہے، یعنی ایمان قلب سے شروع ہوتا ہے اور ظاہر عمل پر پہنچ کر مکمل ہوتا ہے، اور اسلام ظاہر عمل سے شروع ہوتا ہے اور قلب پر پہنچ کر مکمل سمجھا جاتا ہے، اگر تصدیق قلبی ظاہری اقرار و اطاعت تک نہ پہنچے وہ تصدیق ایمان معتبر نہیں، اسی طرح اگر ظاہری اطاعت و اقرار تصدیق قلبی تک نہ پہنچے تو وہ اسلام معتبر نہیں۔

امام غزالیؒ اور امام سبکیؒ کی بھی یہی تحقیق ہے، اور امام ابن ہمامؒ نے مسامرہ میں اس تحقیق پر تمام اہل حق کا اتفاق ذکر کیا ہے۔

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۖ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ﴿۲﴾ یعنی ”متقین ایسے ہیں کہ ایمان رکھتے ہیں اُس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اتاری گئی اور اُن کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری جا چکی ہیں اور آخرت پر بھی وہی لوگ یقین رکھتے ہیں۔“

اس آیت میں متقین کی باقی صفات کا بیان ہے جس میں ایمان بالغیب کی کچھ تفصیل اور ایمان بالآخرت کا ذکر ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ عہد رسالت میں

مؤمنین متقین دو طرح کے حضرات تھے، ایک وہ جو پہلے مشرکین میں سے تھے پھر مشرف باسلام ہوئے، دوسرے وہ جو پہلے اہل کتاب یہودی یا نصرانی تھے پھر مسلمان ہو گئے، اس سے پہلی آیت میں پہلے طبقے کا ذکر تھا، اور اس آیت میں دوسرے طبقے کا ذکر ہے، اسی لئے اس آیت میں قرآن پر ایمان لانے کے ساتھ کچھلی آسمانی کتابوں پر ایمان لانے کی بھی تصریح فرمائی گئی کہ وہ حسب تصریح حدیث دہرے ثواب کے مستحق ہیں، ایک کچھلی کتابوں کے زمانے میں ان پر ایمان لانے اور عمل کرنے کا ثواب، دوسرے قرآن کے زمانے میں قرآن پر ایمان لانے اور عمل کرنے کا ثواب۔ کچھلی آسمانی کتابوں پر ایمان لانا آج بھی ہر مسلمان کے لئے لازم ہے، فرق اتنا ہے کہ آج ان کتابوں پر ایمان اس طرح ہوگا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں میں نازل فرمایا تھا، وہ سب حق ہے، اور اُس زمانے کے لئے وہی واجب العمل تھا، مگر قرآن نازل ہونے کے بعد چونکہ کچھلی کتابیں اور شریعتیں سب منسوخ ہو گئیں، تو اب عمل صرف قرآن ہی پر ہوگا۔

مسئلہ ختم نبوت کی ایک واضح دلیل

آیت کے اس طرز بیان سے ایک اہم اصولی مسئلہ بھی نکل آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں، اور آپ کی وحی آخری وحی، کیونکہ اگر قرآن کے بعد کوئی اور کتاب یا وحی بھی نازل ہونے والی ہوتی تو جس طرح اس آیت میں کچھلی کتابوں اور وحی پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے اسی طرح آئندہ نازل ہونے والی کتاب اور وحی پر ایمان لانے کا ذکر بھی ضروری ہوتا، بلکہ اس کی ضرورت زیادہ تھی، کیونکہ توراۃ و انجیل اور تمام کتب سابقہ پر ایمان لانا تو پہلے سے جاری اور معلوم تھا، اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی سلسلہ وحی اور نبوت جاری ہوتا تو ضرورت اس کی تھی کہ اس کتاب اور اس نبی کا ذکر زیادہ اہتمام سے کیا جاتا جو بعد میں آنے والے ہوں تاکہ کسی کو اشتباہ نہ رہے۔

مگر قرآن نے جہاں ایمان کا ذکر کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نازل ہونے والی وحی اور پہلے انبیاء کا ذکر فرمایا، بعد میں آنے والی کسی وحی یا نبی کا کہیں قطعاً ذکر نہیں، پھر صرف اسی آیت میں نہیں بلکہ قرآن کریم میں یہ مضمون اول سے آخر تک مختلف مقامات میں چالیس پچاس آیتوں میں آیا ہے، سب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاء، پہلی وحی، پہلی کتابوں کا ذکر ہے، کسی ایک آیت میں اس کا اشارہ تک نہیں کہ آئندہ بھی کوئی وحی یا نبی آنے والا ہے، جس پر ایمان لانا ہے، مثلاً ارشاد ہے:-

- ۱- وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ
- ۲- وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ
- ۳- وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا

(النحل: ۴۳)

(المؤمن: ۷۸)

(الروم: ۴۷)

۴- وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (النساء: ۶۰)

۵- وَلَقَدْ أَوْحَىٰ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ (الزمر: ۶۵)

۶- كَذَلِكَ يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ (الشورى: ۳)

۷- كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ (البقرة: ۱۸۳)

۸- سُنَّةٌ مَن قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُسُلِنَا (بنی اسرائیل: ۷۷)

ان آیات میں اور ان کی امثال دوسری آیات میں جہاں کہیں نبی یا رسول یا وحی و کتاب بھیجنے کا ذکر ہے سب کے ساتھ مِنْ قَبْلُ اور مِنْ قَبْلِكَ کی قید لگی ہوئی ہے، کہیں مِنْ بَعْدُ کا اشارہ تک نہیں، اگر ختم نبوت اور انقطاع وحی کا دوسری آیات میں صراحتہ ذکر نہ ہوتا تو قرآن کا یہ طرز ہی اس مضمون کی شہادت کے لئے کافی تھا، مسئلہ ختم نبوت پر قرآنی تصریحات اور احادیث متواترہ کی شہادت اور امت کا اجماع تفصیل کے ساتھ دیکھنا ہو تو میرا رسالہ ”ختم نبوت“ دیکھا جائے۔

متقین کی تفسیر میں صفت ایمان بالآخرۃ

اس آیت میں متقین کی دوسری صفت یہ بیان فرمائی گئی کہ وہ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، آخرت سے مراد وہ دائر آخرت ہے جس کو قرآن میں دائر القرار، دائر الحیوان اور عقبی کے نام سے بھی ذکر کیا گیا ہے، اور پورا قرآن اس کے ذکر اور اس کے ہولناک حالات سے بھرا ہوا ہے۔

آخرت پر ایمان ایک انقلابی عقیدہ ہے

آخرت پر ایمان لانا اگرچہ ایمان بالغیب کے لفظ میں آچکا ہے، مگر اس کو پھر صراحتہ اس لئے ذکر کیا گیا کہ یہ جزائے ایمان میں اس حیثیت سے سب میں اہم جزء ہے کہ مقتضائے ایمان پر عمل کا جذبہ پیدا کرنا اسی کا اثر ہے۔ اور اسلامی عقائد میں یہی وہ انقلابی عقیدہ ہے جس نے دنیا کی کاپی لٹ کر رکھ دی، اور جس نے آسمانی تعلیم پر عمل کرنے والوں کو پہلے اخلاق و اعمال میں اور پھر دنیا کی سیاست میں بھی تمام اقوام عالم کے مقابلے میں ایک امتیازی مقام عطا فرمایا، اور جو عقیدہ توحید و رسالت کی طرح تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام شرائع میں مشترک اور متفق علیہ چلا آتا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے سامنے صرف دنیا کی زندگی اور اسی کی عیش و عشرت ان کا انتہائی مقصود ہے، اسی کی تکلیف کو تکلیف سمجھتے ہیں، آخرت کی زندگی اور اعمال کے حساب کتاب اور جزا و سزا کو وہ نہیں مانتے، وہ جب جھوٹ، سچ اور حلال حرام کی تفریق کو اپنی عیش و عشرت میں خلل انداز ہوتے دیکھیں تو اُن کو جرائم سے روکنے والی کوئی چیز باقی نہیں رہتی،

حکومت کے تعزیری قوانین قطعاً انسدادِ جرائم اور اصلاحِ اخلاق کے لئے کافی نہیں، عادی مجرم تو اُن سزاؤں کے عادی ہو ہی جاتے ہیں، کوئی شریف انسان اگر تعزیری سزا کے خوف سے اپنی خواہشات کو ترک بھی کرے تو اسی حد تک کہ اس کو حکومت کی دار و گیر کا خطرہ ہو، خلوتوں میں اور رازدارانہ طریقوں پر جہاں حکومت اور اس کے قوانین کی رسائی نہیں، اُسے کون مجبور کر سکتا ہے کہ اپنی عیش و عشرت اور خواہش کو چھوڑ کر پابندیوں کا طوق اپنے گلے میں ڈال لے۔

ہاں وہ صرف عقیدہ آخرت اور خوفِ خدا ہی ہے جس کی وجہ سے انسان کی ظاہری اور باطنی حالت جلوت و خلوت میں یکساں ہو سکتی ہے، وہ یقین رکھتا ہے کہ مکان کے بند دروازوں اور اُن پر پہرہ چوکیوں میں اور رات کی تاریکیوں میں بھی کوئی دیکھنے والا مجھے دیکھ رہا ہے، کوئی لکھنے والا میرے اعمال کو لکھ رہا ہے۔

یہی وہ عقیدہ تھا جس پر پورا عمل کرنے کی وجہ سے اسلام کے ابتدائی دور میں ایسا پاکباز معاشرہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی صورت دیکھ کر، چال چلن دیکھ کر لوگ دل و جان سے اسلام کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ اس آیت میں بِالْآخِرَةِ کے ساتھ لفظ يُؤْمِنُونَ نہیں بلکہ يُؤْمِنُونَ استعمال فرمایا گیا ہے، کیونکہ ایمان کا مقابل تکذیب ہے، اور ایقان کا مقابل شک و تردّد، اس میں اشارہ ہے کہ آخرت کی زندگی کی محض تصدیق کرنا مقصد کو پورا نہیں کرتا، بلکہ اس کا ایسا یقین ضروری ہے جیسے کوئی چیز آنکھوں کے سامنے ہو، متقین کی یہی صفت ہے کہ آخرت میں حق تعالیٰ کے سامنے پیشی اور حساب کتاب، پھر جزا و سزا کا نقشہ ہر وقت اُن کے سامنے رہتا ہے۔

وہ شخص جو دوسروں کا حق غصب کرنے کے لئے جھوٹے مقدمے لڑتا ہے، جھوٹی گواہی دے رہا ہے، اللہ تعالیٰ کے فرمان کے خلاف حرام مال کمانے اور کھانے میں لگا ہوا ہے، یا دنیا کے ذلیل مقاصد حاصل کرنے کے لئے خلافِ شرع ذرائع اختیار کر رہا ہے، وہ ہزار بار آخرت پر ایمان لانے کا اقرار کرے اور ظاہرِ شریعت میں اس کو مؤمن کہا بھی جائے، لیکن قرآن جس ایقان کا مطالبہ کرتا ہے وہ اسے حاصل نہیں، اور وہ ہی انسان کی زندگی میں انقلاب لانے والی چیز ہے، اُسی کے نتیجے میں متقین کو ہدایت اور کامیابی کا وہ انعام دیا گیا ہے جس کا ذکر سورہ بقرہ کی پانچویں آیت میں ہے: **أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ** ⑤ یعنی ”بس یہی لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو اُن کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے، اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب۔“

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ

بے شک جو لوگ کافر ہو چکے برابر ہے اُن کو تو ڈرائے یا نہ ڈرائے،

لَا يُؤْمِنُونَ ۝ خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ

وہ ایمان نہ لائیں گے۔ مہر کردی اللہ نے اُن کے دلوں پر اور اُن کے کانوں پر اور اُن کی آنکھوں پر

غَشَاوَةً ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

پردہ ہے، اور اُن کے لئے بڑا عذاب ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر اپنالیا ہے، اُن کے حق میں دونوں باتیں برابر ہیں، چاہے آپ ان کو ڈرائیں، یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے ۝ اللہ نے اُن کے دلوں پر اور اُن کے کانوں پر مہر لگا دی ہے، اور اُن کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے، اور اُن کے لئے زبردست عذاب ہے ۝

خلاصہ تفسیر

بے شک جو لوگ کافر ہو چکے ہیں برابر ہے اُن کے حق میں خواہ آپ اُن کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہ لاویں گے (یہ بات اُن کافروں کے متعلق ہے جن کی نسبت خدا تعالیٰ کو معلوم ہے کہ ان کا خاتمہ کفر پر ہوگا، عام کافر مراد نہیں، ان میں بہت سے لوگ بعد میں مسلمان ہو گئے) بند لگا دیا ہے اللہ نے اُن کے دلوں پر اور اُن کے کانوں پر اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور ان کے لئے سزا بڑی ہے۔

معارف مسائل

خلاصہ مضمون مع رابط

سورہ بقرہ کی پہلی پانچ آیتوں میں قرآن کریم کا کتاب ہدایت اور ہر شک و شبہ سے بالاتر ہونا بیان کرنے کے بعد اُن خوش نصیب لوگوں کا ذکر تھا جنہوں نے اس کتاب ہدایت سے پورا فائدہ اٹھایا، جن کو قرآن کی اصطلاح میں مؤمنین اور متقین کا لقب دیا گیا ہے، اور ان حضرات کی مخصوص صفات و علامات بھی بیان کی گئیں، اس کے بعد پندرہ آیتوں میں اُن

لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے اس ہدایت کو قبول نہیں کیا، بلکہ انکار و عناد سے پیش آئے۔

پھر اُن لوگوں میں دو گروہ تھے، ایک وہ جنہوں نے کھل کر انکار و مخالفت کا راستہ اختیار کیا جن کو قرآن کی اصطلاح میں کافر کہا گیا، دوسرے وہ لوگ جو اپنی اخلاقی پستی اور دُنیا کی ذلیل اغراض کی بنا پر یہ جرات بھی نہ کر سکے کہ اپنے ضمیر کی آواز اور دلی عقیدے کو صاف طور پر ظاہر کر دیتے، بلکہ دھوکا اور فریب کی راہ اختیار کی، مسلمانوں سے یہ کہتے کہ ہم مسلمان ہیں، قرآن اور اس کی ہدایات کو مانتے ہیں، تمہارے ساتھ ہیں، اور دلوں میں اُن کے کفر و انکار تھا، کفار کی مجلسوں میں جا کر یہ کہتے کہ ہم تمہارے عقیدے پر اور تمہارے ساتھ ہیں، مسلمانوں کو دھوکا دینے اور ان کے راز معلوم کرنے کے لئے ہم اُن سے ملتے ہیں۔

اس گروہ کا نام قرآن کی اصطلاح میں منافق ہے، یہ پندرہ آیتیں ہیں جو قرآن نہ ماننے والوں کے متعلق نازل ہوئی ہیں، ان میں سے مذکورہ دو آیتوں میں کھلے کافروں کا ذکر ہے، اور آگے تیرہ آیتوں میں منافقین کا ذکر اور ان کے متعلقہ حالات و علامات اور ان کا انجام مذکور ہے۔

ان تمام آیات کی تفصیل پر یکجا نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم نے سورہ بقرہ کی ابتدائی بیس آیتوں میں ایک طرف تو چشمہ ہدایت کا پتہ دے دیا کہ وہ قرآن ہے، اور دوسری طرف تمام اقوامِ عالم کو اسی ہدایت کے قبول یا انکار کے معیار سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا، ایک ہدایت یافتہ جن کو مؤمنین و متقین کہا جاتا ہے، دوسرے ہدایت سے انحراف و انکار کرنے والے جن کو کافر یا منافق کہا جاتا ہے۔

پہلی قسم وہ ہے جن کا راستہ صراطِ الذین اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں طلب کیا گیا ہے، اور دوسری قسم وہ ہے جن کے راستے سے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّیْنَ میں پناہ مانگی گئی ہے۔

قرآن کریم کی اس تعلیم سے ایک اصولی مسئلہ یہ بھی نکل آیا کہ اقوامِ عالم کے حصوں یا گروہوں میں ایسی تقسیم جو اصول پر اثر انداز ہو سکے وہ صرف اصول و نظریات ہی کے اعتبار سے ہو سکتی ہے، نسب، وطن، زبان، رنگ اور جغرافیائی حالات ایسی چیزیں نہیں جن کے اشتراک یا اختلاف سے قوموں کے ٹکڑے کئے جاسکیں، قرآن کریم کا اس بارے میں واضح فیصلہ بھی سورہ تغابن میں مذکور ہے:-

خَلَقَكُمْ مِنْكُمْ كَافِرًا وَمِنْكُمْ مُّؤْمِنًا (التغابن: ۲)

”یعنی اللہ نے تم سب کو پیدا کیا، پھر کچھ لوگ تم میں سے مؤمن اور کچھ کافر ہو گئے۔“

مذکور الصدر دو آیتوں میں حق تعالیٰ نے اُن کافروں کا ذکر فرمایا ہے جو اپنے کفر و انکار میں ضد اور عناد تک پہنچ گئے تھے، اور اس ضد کی وجہ سے وہ کسی حق بات کو سننے اور روشن دلیل کو دیکھنے کے لئے بھی تیار نہ تھے، ایسے لوگوں کے بارے میں

سے اللہ یہی ہے کہ ان کو ایک سزا اسی جہان میں نقد یہ دی جاتی ہے کہ اُن کے دلوں پر مہر لگا دی جاتی ہے، کانوں، آنکھوں کو حق و صدق کے قبول کرنے سے بند کر دیا جاتا ہے، اُن کا حال حق و صدق کے بارے میں ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا نہ اُن کو سمجھنے کی عقل، نہ دیکھنے کے لئے آنکھیں، نہ سننے کے لئے کان۔

آخر آیت میں ایسے لوگوں کا عذابِ عظیم میں مبتلا ہونا ذکر کیا گیا ہے۔

کفر کی تعریف

”کفر“ کے لفظی معنی چھپانے کے ہیں، ناشکری کو بھی کفر اس لئے کہتے ہیں کہ محسن کے احسان کو چھپانا ہے۔ اصطلاحِ شریعت میں جن چیزوں پر ایمان لانا فرض ہے ان میں سے کسی چیز کے انکار کا نام ”کفر“ ہے، مثلاً ایمان کا خلاصہ یہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں اور اس کا ثبوت قطعی و یقینی ہے اُن سب چیزوں کی دل سے تصدیق کرنا، اور حق سمجھنا، اس لئے جو شخص رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن تعلیمات میں سے جن کا ثبوت یقینی اور قطعی ہے کسی ایک کو بھی حق نہ سمجھے اور اس کی تصدیق نہ کرے وہ کافر کہلائے گا۔

انذار کے معنی

لفظ ”انذار“ ایسی خبر دینا جس سے خوف پیدا ہو، جیسا کہ ”ابشار“ ایسی خبر دینے کو کہتے ہیں جس سے سرور پیدا ہوا، اُردو زبان میں اس کا ترجمہ ”ڈرانے“ سے کیا جاتا ہے، مگر درحقیقت مطلقاً ڈرانے کو انذار نہیں کہتے، بلکہ ایسا ڈرانا جو شفقت و رحمت کی بنا پر ہو، جیسے اولاد کو آگ سے، سانپ بچھو اور درندوں سے ڈرایا جاتا ہے، اسی لئے جوڈاکو، چور، ظالم کسی انسان کو دھمکاتے ڈراتے ہیں اس کو ”انذار“ اور ان لوگوں کو ”نذیر“ نہیں کہا جاتا۔ انبیاء علیہم السلام کو خصوصیت سے ”نذیر“ کا لقب دیا جاتا ہے، کہ وہ ازراہ شفقت آئندہ آنے والے مصائب سے ڈراتے ہیں، انبیاء علیہم السلام کے لئے اس لفظ کو اختیار کرنے میں اس کی ہدایت ہے کہ مصلح، مبلغ کے لئے ضروری ہے کہ مخاطب کی خیر خواہی کے ساتھ ہمدردی سے گفتگو کرے، محض ایک کلمہ پہنچا دینا مقصد نہ ہو۔

اس آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لئے یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ ضدی اور معاند کفار جو حقیقت کو پہچاننے کے باوجود کفر و انکار پر جے ہوئے ہیں، یا اپنے تکبر اور کج رائی کی بنا پر کسی حق بات کو سننے اور روشن دلائل کو دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں، ان کی اصلاح اور ایمان کے متعلق جو آپ کوشش کرتے ہیں اُن کے لئے مؤثر ثابت نہ ہوگی، بلکہ آپ کا کوشش کرنا اور نہ کرنا اُن کے حق میں برابر ہے۔

اس کی وجہ اگلی آیت میں یہ بتلائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے، اور ان کی

آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے، سوچنے سمجھنے کے جتنے راستے تھے، وہ سب بند ہیں، اس لئے ان سے اصلاح کی توقع رکھنا درودِ سری ہے۔

کسی چیز پر مہر اس لئے لگائی جاتی ہے کہ باہر سے کوئی چیز اس میں داخل نہ ہو سکے، ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگانے کا یہی مطلب ہے کہ ان میں قبولِ حق کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

اُن کی اس حالت کو دلوں اور کانوں پر تو مہر کرنے سے تعبیر فرمایا ہے، مگر آنکھوں کے لئے مہر کے بجائے پردہ پڑنے کا ذکر کیا گیا، اس میں حکمت یہ ہے کہ دلوں میں آنے والا کوئی مضمون یا کوئی فکر و خیال کسی ایک سمت سے نہیں آتا، ہر طرف سے آسکتا ہے، اسی طرح کانوں میں پہنچنے والی آواز بھی ہر سمت اور جہت سے آسکتی ہے، ان کی بندش جب ہی ہو سکتی ہے جب اُن پر مہر کر دی جائے، بخلاف آنکھوں کے کہ ان کا ادراک صرف ایک سمت یعنی سامنے سے ہو سکتا ہے، اور جب سامنے پردہ پڑ جائے تو آنکھوں کا ادراک ختم ہو جاتا ہے۔ (مظہری)

۱۔ گناہوں کی دُنیوی سزا سلبِ توفیق

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ کفر اور ہر گناہ کی اصل سزا تو آخرت میں ملے گی، مگر بعض گناہوں کی کچھ سزا دُنیا میں بھی مل جاتی ہے، پھر یہ دُنیا کی سزا بعض اوقات یہ شکل اختیار کرتی ہے کہ اصلاحِ حال کی توفیق سلب ہو جاتی ہے، انسان آخرت کے حساب و کتاب سے بے فکر ہو کر اپنی نافرمانیوں اور گناہوں میں بڑھتا چلا جاتا ہے، اور اس کی برائی کا احساس بھی اس کے دل سے جاتا رہتا ہے، ایسے حال کے متعلق بعض بزرگوں کا ارشاد ہے: ”إِنَّ مِنْ جَزَاءِ السَّيِّئَةِ السَّيِّئَةُ بَعْدَهَا وَإِنَّ مِنْ جَزَاءِ الْحَسَنَةِ الْحَسَنَةُ بَعْدَهَا“ یعنی ”گناہ کی ایک سزا یہ بھی ہوتی ہے کہ ایک گناہ دوسرے گناہ کو کھینچ لاتا ہے، جس طرح نیکی کا نقد بدلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک نیکی دوسری نیکی کو کھینچ لاتی ہے۔“

اور حدیث میں ہے کہ انسان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، اور جس طرح سفید کپڑے پر ایک سیاہ نقطہ انسان کو ناگوار نظر آتا ہے، پہلے نقطہ گناہ سے بھی انسان پریشان ہوتا ہے، لیکن اگر اس نے گناہ سے توبہ نہ کی اور دوسرا گناہ کر لیا تو ایک دوسرا نقطہ سیاہ لگ جاتا ہے، اور اسی طرح ہر گناہ پر سیاہ نقطے لگتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ یہ سیاہی سارے قلب پر محیط ہو جاتی ہے، اور اب اس کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ وہ نہ کسی اچھی چیز کو اچھا سمجھ سکتا ہے نہ بری چیز کو برا، غرض نیکی بدی کا امتیاز اس کے دل سے اُٹھ جاتا ہے۔ اور پھر فرمایا کہ اسی ظلمت و سیاہی کا نام

قرآن کریم میں ”ران“ یا ”رین“ آیا ہے: **كَلَّا بَلْ عَصَاكَ اَنْتَ اَيُّسُبُوْنَ ۝۱۳** (المطففين) (مشکوٰۃ از مسند احمد و ترمذی)۔ اور ترمذی نے سند صحیح کے ساتھ بروایت ابو ہریرہؓ نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے، پھر اگر وہ توبہ کر لے تو صاف ہو جاتا ہے۔ (قرطبی)

۲۔ نصیحت ناصح کے لئے ہر حال میں مفید ہے، مخاطب قبول کرے یا نہ کرے

اس آیت میں ازلی کافروں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وعظ و نصیحت کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر قرار دیئے گئے ہیں، مگر اُن کے ساتھ **عَلَيْهِمْ** کی قید لگا کر بتلادیا کہ یہ برابری کفار کے حق میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نہیں، بلکہ اُن کو تو تبلیغ و تعلیم اور اصلاح خلق کی کوشش کا ثواب بہر حال ملے گا، اسی لئے پورے قرآن کریم کی کسی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے لوگوں کو بھی دعوت ایمان دینے سے روکا نہیں گیا، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص دعوت دین اور اصلاح کا کام کرتا ہے خواہ موثر ہو یا نہ ہو، اس کو بہر حال اپنے عمل کا ثواب ملتا ہے۔

ایک شبہ کا جواب

اس آیت کا مضمون وہی ہے جو سورہ مطففین کی اس آیت کا ہے: **كَلَّا بَلْ عَصَاكَ اَنْتَ اَيُّسُبُوْنَ ۝۱۳** (المطففين) یعنی ”ایسا نہیں، بلکہ اُن کے دلوں پر ان کے اعمال کا زنگ بیٹھ گیا ہے“ جس میں حقیقت واضح کر دی گئی ہے کہ ان کی بد اعمالیاں اور سرکشی ہی ان کے دلوں کا زنگ بن گیا ہے، اسی زنگ کو آیت مذکورہ میں ”مہر“ یا ”پردہ“ کے لفظوں سے تعبیر کیا گیا ہے، اس لئے اس پر یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہی اُن کے دلوں پر مہر کر دی، اور حواس کو مآوَف کر دیا ہے تو یہ اپنے کفر میں معذور ہو گئے، پھر اُن کو عذاب کیسا؟ وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے شرارت و عناد کر کے باختیار خود اپنی استعداد برباد کر لی ہے، اس لئے اس تباہی استعداد کے فاعل اور مسبب یہ خود ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے تمام افعال کے خالق ہونے کی حیثیت سے اس جگہ مہر کرنے کو اپنی طرف نسبت کر کے یہ بتلادیا کہ جب ان لوگوں نے قبول حق کی صلاحیت و استعداد کو اپنے اختیار سے تباہ کرنا چاہا تو سنت الہیہ کے مطابق ہم نے وہ بد استعداد کی کیفیت اُن کے قلوب اور حواس میں پیدا کر دی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَالْآخِرَةِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ ۝۸

اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور دن قیامت پر اور وہ ہرگز مؤمن نہیں۔

ترجمہ:- ہرگز نہیں! بلکہ جو بول یہ کرتے رہے ہیں، اُس نے ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے۔

مشکوٰۃ، باب الاستغفار والتوبة، ج: ۱، ص: ۲۰۳

يُخْدَعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا

دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے اور دراصل کسی کو دغا نہیں دیتے مگر اپنے آپ کو اور نہیں

يَشْعُرُونَ ۙ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ ۖ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ

سوچتے۔ اُن کے دلوں میں بیماری ہے پھر بڑھادی اللہ نے اُن کی بیماری اور اُن کے لئے عذاب

أَلِيمٌ ۚ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ۝۱۰ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ ۚ

دردناک ہے اس بات پر کہ جھوٹ کہتے تھے۔ اور جب کہا جاتا ہے اُن کو فساد نہ ڈالو ملک میں

قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ۝۱۱ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِنْ

تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں، جان لو وہی ہیں خرابی کرنے والے لیکن

لَا يَشْعُرُونَ ۝۱۲ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا

نہیں سمجھتے۔ اور جب کہا جاتا ہے ان کو ایمان لاؤ جس طرح ایمان لائے سب لوگ تو کہتے ہیں:

أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۚ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَكِنْ

کیا ہم ایمان لائیں جس طرح ایمان لائے بیوقوف، جان لو وہی ہیں بیوقوف لیکن

لَا يَعْلَمُونَ ۝۱۳ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا ۖ وَإِذَا خَلَوْا

نہیں جانتے۔ اور جب ملاقات کرتے ہیں مسلمانوں سے تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے ہیں، اور جب تنہا ہوتے ہیں

إِلَىٰ شَيْطَانِهِمْ ۚ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ ۚ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُونَ ۝۱۴

اپنے شیطانوں کے پاس تو کہتے ہیں کہ بے شک ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو ہنسی کرتے ہیں (یعنی مسلمانوں سے)۔

اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝۱۵ أُولَٰئِكَ

اللہ ہنسی کرتا ہے اُن سے اور ترقی دیتا ہے اُن کو اُن کی سرکشی میں (اور) حالت یہ ہے کہ وہ عقل کے اندھے ہیں۔ یہ وہی ہیں

الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ ۖ فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا

جنہوں نے مولیٰ گمراہی ہدایت کے بدلے، سو نافع نہ ہوئی ان کی سوداگری اور نہ ہوئے

مُهْتَدِينَ ۝۱۶ مَثَلُ الَّذِينَ اسْتَوْقَدُوا نَارًا ۖ فَلَمَّا أَضَاءَتْ

راہ پانے والے۔ اُن کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی پھر جب روشن کر دیا آگ نے

مَاحَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٍ ۖ لَا يَبْصُرُونَ ۝۱۷ صُمُّوا بَكُمْ

اس کے آس پاس کو تو زائل کر دی اللہ نے اُن کی روشنی اور چھوڑا ان کو اندھیروں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے۔ بہرے ہیں، گونگے ہیں،

عَمٰی فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝۱۸ أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّيِّءِ فِيهِ ظُلُمٌ

اندھے ہیں، سو وہ نہیں لوٹیں گے۔ یا اُن کی مثال ایسی ہے جیسے زور سے مینہ پڑ رہا ہو آسمان سے، اس میں اندھیرے ہیں

وَرَاعِدٌ يَّرْقُ ۚ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۖ

اور گرج اور بجلی، دیتے ہیں انگلیاں اپنے کانوں میں مارے کڑک کے موت کے ڈر سے

وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ۝۱۹ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطِفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا

اور اللہ احاطہ کرنے والا ہے کافروں کا۔ قریب ہے کہ بجلی اُچک لے اُن کی آنکھیں، جب

أَضَاءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيهِ ۖ وَإِذَا آظَلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۖ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ

چمکتی ہے اُن پر تو چلنے لگتے ہیں اس کی روشنی میں اور جب اندھیرا ہوتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں، اور اگر چاہے اللہ تو لے جائے

بِسْمِعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝۲۰

ان کے کان اور آنکھیں، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

کچھ لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لے آئے، حالانکہ وہ (حقیقت میں) مؤمن نہیں ہیں ۱۸ وہ اللہ کو اور اُن لوگوں کو جو (واقعی) ایمان لاچکے ہیں، دھوکا دیتے ہیں۔ اور (حقیقت تو یہ ہے کہ) وہ اپنے سوا کسی اور کو دھوکا نہیں دے رہے، لیکن انہیں اس بات کا احساس نہیں ہے ۱۹ ان کے دلوں میں روگ ہے، چنانچہ اللہ نے ان کے روگ میں اور اضافہ کر دیا ہے، اور ان کے لئے دردناک سزا تیار ہے، کیونکہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے ۲۰ اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تم زمین میں فساد نہ مچاؤ تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ۲۱ یاد رکھو! یہی لوگ فساد پھیلانے والے ہیں، لیکن انہیں اس بات کا احساس نہیں ہے ۲۲ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی اسی طرح ایمان لے آؤ جیسے دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لائیں جیسے بے وقوف لوگ ایمان لائے ہیں؟ خوب اچھی طرح سن لو کہ یہی لوگ بے وقوف ہیں، لیکن وہ یہ بات نہیں جانتے ۲۳ اور جب یہ اُن لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لاچکے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، اور جب یہ اپنے شیطانوں کے پاس تنہائی میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو مذاق کر رہے تھے ۲۴ اللہ ان سے مذاق (کا معاملہ) کرتا ہے اور انہیں ایسی ڈھیل دیتا ہے کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں ۲۵ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے، لہذا نہ اُن کی تجارت میں نفع ہوا، اور نہ انہیں صحیح راستہ نصیب ہوا ۲۶ اُن کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس نے ایک آگ روشن کی، پھر جب اس (آگ نے) اس کے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے اُن کا نور سلب کر لیا اور انہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ انہیں کچھ سجھائی نہیں دیتا ۲۷ وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، چنانچہ اب وہ واپس نہیں آئیں گے ۲۸ یا پھر (ان منافقوں کی مثال ایسی ہے) جیسے آسمان سے برستی ایک بارش ہو، جس میں اندھیریاں بھی ہوں، اور گرج بھی اور چمک بھی۔ وہ کڑکوں کی آواز پر موت کے خوف سے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں دے لیتے ہیں۔ اور اللہ نے کافروں کو گھیرے میں لے رکھا ہے ۲۹ ایسا لگتا ہے کہ بجلی اُن کی آنکھوں کو اچک لے جائے گی۔ جب بھی بجلی اُن کے لئے روشنی کر دیتی ہے، وہ اُس (روشنی) میں چل پڑتے ہیں، اور جب وہ اُن پر اندھیرا کر دیتی ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں، اور اگر اللہ چاہتا تو اُن کے سننے اور دیکھنے کی طاقتیں چھین لیتا، بیشک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۳۰

خلاصہ تفسیر

اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخری دن پر حالانکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں (بلکہ) چال بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں، اور واقع میں کسی کے ساتھ بھی چال بازی نہیں کرتے بجز اپنی ذات کے اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے (یعنی اس چال بازی کا انجام بد خود اپنے ہی کو بھگتنا پڑے گا) اُن کے دلوں میں بڑا مرض ہے، سو اور بھی بڑھا دیا اللہ نے اُن کا مرض (اس مرض میں اُن کی بد اعتقادی اور اسلام اور مسلمانوں کی ترقی دیکھ کر حسد میں جلنا اور ہر وقت اپنا کفر ظاہر ہو جانے کی فکر و غلبان سب داخل ہیں، مسلمانوں کی ترقی سے اُن کا مرض حسد اور بڑھنا واضح ہے) اور ان کے لئے سزائے دردناک ہے اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے (یعنی ایمان کا جھوٹا دعویٰ کیا کرتے تھے) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ فساد مت کرو زمین میں تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح ہی کرنے والے ہیں (ان کی دورِ خنی رَوش سے جب فتنے فساد واقع ہونے لگے اور کسی خیر خواہ نے فہمائش کی کہ ایسی کارروائی موجب فساد ہوا کرتی ہے اس کو چھوڑ دو تو اس کے جواب میں یہ اپنے آپ کو بجائے مفسد کے مصلح بتاتے ہیں یعنی اپنے فساد ہی کو اصلاح سمجھتے ہیں) یاد رکھو بے شک یہی لوگ مفسد ہیں لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے (یہ تو ان کی جہالت اور غباوت کا بیان ہے کہ اپنے عیب ہی کو ہنر سمجھتے ہیں، آگے دوسری جہالت کا بیان ہے کہ دُوسروں کے ہنر کو یعنی ایمانِ خالص کو عیب اور حقیر سمجھتے ہیں) اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی ایمان لے آؤ جیسا ایمان لائے ہیں اور لوگ، تو کہتے ہیں کہ کیا ہم ایمان لاویں گے جیسا ایمان لے آئے ہیں یہ بیوقوف، یاد رکھو کہ بے شک یہی ہیں بیوقوف لیکن اس کا علم نہیں رکھتے (یہ منافق ایسی کھلی ہوئی بات بظاہر غریب مسلمانوں کے سامنے کر لیتے ہوں گے جن سے اُن کو کوئی اندیشہ نہ تھا، ورنہ عام طور پر تو وہ اپنے کفر کو چھپاتے پھرتے تھے) اور جب ملتے ہیں وہ منافقین اُن لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، اور جب خلوت میں پہنچتے ہیں اپنے شریر سرداروں کے پاس تو کہتے ہیں کہ ہم بے شک تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو (مسلمانوں سے) صرف استہزاء کیا کرتے ہیں (یعنی ہم مسلمانوں سے بطور تمسخر کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں ورنہ ہم تو تمہارے ہم مشرب ہیں، آگے اُن کے استہزاء کا جواب ہے کہ) اللہ تعالیٰ ہی استہزاء کر رہے ہیں ان کے ساتھ اور ڈھیل دیتے چلے جاتے ہیں اُن کو کہ وہ اپنی سرکشی میں حیران و سرگرداں ہو رہے ہیں (وہ اللہ کا استہزاء یہی ہے کہ ان کو مہلت دی جا رہی ہے، جب وہ خوب کفر میں کامل ہو جاویں اور جرم سنگین ہو جاوے اس وقت اچانک پکڑ لئے جاویں گے، چونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ فعل اُن کے استہزاء کے مقابلہ میں تھا اس لئے اس کو استہزاء کے عنوان سے تعبیر کر دیا گیا) یہ

وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے گمراہی لے لی بجائے ہدایت کے تو نفع بخش نہ ہوئی اُن کی یہ تجارت اور نہ یہ ٹھیک طریقے پر چلے (یعنی اُن کو تجارت کا سلیقہ نہ ہوا کہ ہدایت جیسی قیمتی چیز کے بدلے میں گمراہی لے لی) اُن کی حالت اُس شخص کی حالت کے مشابہ ہے جس نے کہیں آگ جلائی ہو پھر جب روشن کر دیا ہو اس آگ نے اس شخص کے گردا گرد کی سب چیزوں کو، ایسی حالت میں سلب کر لیا ہو اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی کو اور چھوڑ دیا ہو ان کو اندھیروں میں کہ کچھ دیکھتے بھالتے نہ ہوں (تو جس طرح یہ شخص اور اس کے ساتھی روشنی کے بعد اندھیرے میں رہ گئے اسی طرح منافقین حق واضح ہو کر سامنے آ جانے کے بعد گمراہی کے اندھیرے میں جا پھنسے اور جس طرح آگ جلانے والوں کی آنکھ، کان، زبان، اندھیرے میں بیکار ہو گئے، اسی طرح گمراہی کے اندھیرے میں پھنس کر ان کی یہ حالت ہو گئی کہ گویا وہ) بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں سو یہ اب رُجوع نہ ہوں گے (کہ ان کے حواس حق کو دیکھنے سننے سمجھنے کے قابل نہ رہے، یہ مثال تو اُن منافقین کی تھی جو خوب دل کھول کر کفر پر جمے ہوئے ہیں، کبھی ایمان کا دھیان بھی دل میں نہیں آتا، آگے منافقین کے اُس گروہ کی مثال ہے جو فی الواقع تردد میں تھے، کبھی کبھی اسلام کی حقانیت دیکھ کر اس کی طرف مائل ہونے لگتے، پھر جب اغراض نفسانی کا غلبہ ہوتا تو یہ میلان بدل جاتا تھا) یا اُن منافقوں کی ایسی مثال ہے جیسے آسمان کی طرف سے بارش ہو اس میں اندھیری بھی ہو اور رعد برق بھی ہو، (جو لوگ اس بارش میں چل رہے ہیں) وہ ٹھونسے لیتے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کڑک کے سبب اندیشہ موت سے، اور اللہ تعالیٰ احاطے میں لئے ہوئے ہے کافروں کو، برق کی یہ حالت ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان کی بینائی اس نے لے لی، جہاں ذرا اُن کو بجلی کی چمک ہوئی تو اس کی روشنی میں چلنا شروع کر دیا، اور جب اُن پر تاریکی ہوئی پھر کھڑے کے کھڑے رہ گئے، اور اگر اللہ تعالیٰ ارادہ کرتے تو ان کے کان اور آنکھ سب سلب کر لیتے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں (تو جس طرح یہ لوگ کبھی طوفانِ باد و باران میں کبھی چلنے سے رہ جاتے ہیں، کبھی موقع پا کر آگے چلنے لگتے ہیں، یہی حال ان متردد منافقین کا ہے)۔

معارفِ مائل

ربطِ آیات

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سورہ بقرہ کے شروع میں قرآنِ کریم کا شک و شبہ سے بالاتر ہونا بیان کرنے کے بعد بیس آیتوں میں اُس کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے حالات کا ذکر کیا گیا ہے، اول پانچ آیتوں میں ماننے والوں کا تذکرہ ”متقین“ کے عنوان سے ہے، پھر دو آیتوں میں ایسے نہ ماننے والوں کا ذکر ہے جو کھلے طور پر قرآن کا

معاندانہ انکار کرتے تھے، ان تیرہ آیتوں میں ایسے منکرین و کفار کا ذکر ہے جو ظاہر میں اپنے آپ کو مؤمن مسلمان کہتے تھے، مگر حقیقت میں مؤمن نہ تھے، ان لوگوں کا نام قرآن میں ”منافقین“ رکھا گیا ہے۔

مذکورہ بالا آیات میں پہلی دو آیتوں میں منافقین کے متعلق فرمایا کہ ”لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر، حالانکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں، بلکہ وہ چال بازی کرتے ہیں اللہ سے اور اُن لوگوں سے جو ایمان لاکچے ہیں، اور واقع میں کسی کے ساتھ بھی چال بازی نہیں کرتے بجز اپنی ذات کے، اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔“ اس میں اُن کے دعویٰ ایمان کو غلط اور جھوٹ قرار دیا گیا، اور یہ کہ ان کا یہ دعویٰ محض فریب ہے، یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی فریب نہیں دے سکتا، اور غالباً یہ لوگ بھی ایسا نہ سمجھتے ہوں گے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دے سکتے ہیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے ساتھ اُن کی چال بازی کو ایک حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ چال بازی قرار دے کر فرمایا گیا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ چال بازی کرتے ہیں۔ (قرطبی عن الحسن)

اسی لئے اس کا نتیجہ یہ بتلایا گیا کہ یہ بیوقوف اپنے سوا کسی کے ساتھ چال بازی نہیں کر رہے ہیں، کیونکہ اللہ جل شانہ تو ہر دھوکہ و فریب سے بالاتر ہیں ہی، ان کے رسول اور مومنین بھی وحی الہی کی وجہ سے ہر دھوکہ، فریب سے محفوظ ہو جاتے ہیں، کوئی نقصان اُن کو نہیں پہنچتا، البتہ ان کے دھوکہ، فریب کا وبال دُنیا و آخرت میں خود انہیں پر پڑتا ہے۔

تیسری آیت میں فرمایا کہ ”اُن کے دلوں میں بڑا مرض ہے، سوا اور بھی بڑھا دیا اللہ نے اُن کے مرض کو، مرض اور بیماری اس کیفیت کو کہتے ہیں جس سے انسان اپنے اعتدال مناسب سے نکل جائے، اور اس کے افعال میں خلل پیدا ہو جائے، جس کا آخری نتیجہ ہلاکت اور موت ہوتا ہے۔

قرآن وحدیث کی اصطلاح میں اُن نفسانی کیفیات کو بھی مرض کہا جاتا ہے جو نفسِ انسانی کے کمال میں خلل انداز ہوں، اور جن کی وجہ سے انسان اپنے انسانی اعمال سے محروم ہوتا چلا جائے، جس کا آخری نتیجہ روحانی موت و ہلاکت ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دلوں کے امراض خواہشاتِ نفسانی کے اتباع سے پیدا ہوتے ہیں، جیسے بدنِ انسان کے امراض اخلاطِ انسان کی بے اعتدالی سے پیدا ہوتے ہیں، اس آیت میں اُن کے دلوں میں مخفی کفر کو مرض فرمایا گیا ہے جو روحانی اور جسمانی دونوں اعتبار سے بڑا مرض ہے، روحانی مرض ہونا تو ظاہر ہے کہ اول تو اپنے پیدا کرنے والے، پالنے والے کی ناشکری اور اس کے احکام سے سرکشی جس کا نام کفر ہے، یہ خود روحِ انسانی کے لئے سب سے بڑا مرض اور شرافتِ انسانی کے لئے بدترین داغ ہے۔ دوسرے دُنیا کی ذلیل اغراض کی خاطر اس کو چھپاتے رہنا اور اپنے دل کی بات کو ظاہر کرنے کی بھی جرأت نہ کرنا، یہ دوسری دنائت ہے جو روح کا بہت بڑا مرض ہے۔ اور نفاق کا جسمانی

مرض ہونا اس بنا پر ہے کہ منافق کے دل میں ہمیشہ یہ دغدغہ رہتا ہے کہ کہیں میرا اصلی حال کھل نہ جائے، شب و روز اس کی فکر میں رہنا خود ایک جسمانی مرض ہے، اس کے علاوہ اس مرض کا لازمی نتیجہ حسد ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کو دیکھ کر منافق کو جلن ہوگی، مگر وہ مسکین اپنے دل کی سوزش کا اظہار بھی نہیں کر سکتا، یہ اسباب اُن کے جسمانی مرض بھی بن جاتے ہیں۔

اور یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا مرض اور بھی بڑھا دیا، اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ لوگ اسلام اور مسلمانوں کی ترقی سے جلتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو یہ ترقی دینا ہے، اور ہر وقت اس کے مشاہدات ہوتے رہتے ہیں، اس لئے اُن کا یہ مرض بڑھتا ہی رہتا ہے۔

چوتھی اور پانچویں آیتوں میں منافقین کا یہ مغالطہ مذکور ہے کہ فساد کو اصلاح سمجھتے اور اپنے آپ کو مصلح کہتے تھے، قرآن کریم نے واضح کیا کہ فساد و اصلاح زبانی دعووں پر دائر نہیں ہوتے، ورنہ کوئی چور ڈاکو بھی اپنے آپ کو مفسد کہنے کو تیار نہیں، بلکہ مدارِ کار اس کام پر ہے جو کیا جا رہا ہے، وہ فساد ہے، تو کرنے والے کو مفسد ہی کہا جائے گا، خواہ اس کی نیت فساد کی نہ ہو۔

چھٹی آیت میں منافقین کے سامنے صحیح ایمان کا ایک معیار رکھا گیا کہ **اٰمَنُوْا كَمَا اٰمَنَ النَّاسُ** یعنی ”ایمان لاؤ جیسے ایمان لائے ہیں اور لوگ“ اس میں لفظ **”نَاس“** سے مراد باتفاق مفسرین صحابہ کرام ہیں، کیونکہ وہی حضرات ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت ایمان لائے تھے، کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف وہی ایمان معتبر ہے جو صحابہ کرام کے ایمان کی طرح ہو، جن چیزوں میں جس کیفیت کے ساتھ ان کا ایمان ہے اسی طرح کا ایمان دُوسروں کا ہوگا تو ایمان کہا جائے گا، ورنہ نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کا ایمان ایک کسوٹی ہے، جس پر باقی ساری اُمت کے ایمان کو پرکھا جائے گا، جو اس کسوٹی پر صحیح نہ ہو اس کو شرعاً ایمان اور ایسا کرنے والے کو مؤمن نہ کہا جائے گا، اس کے خلاف کوئی عقیدہ اور عمل خواہ ظاہر میں کتنا ہی اچھا نظر آئے اور کتنی ہی نیک نیتی سے کیا جائے اللہ کے نزدیک ایمان معتبر نہیں۔ ان لوگوں نے صحابہ کرام کو ”سفہاء“ یعنی بیوقوف کہا، اور یہی ہر زمانے کے گمراہوں کا طریقہ رہا ہے کہ جو اُن کو صحیح راہ بتلائے اس کو بیوقوف جاہل قرار دیتے ہیں، مگر قرآن کریم نے بتلادیا کہ درحقیقت وہ خود ہی بیوقوف ہیں کہ ایسی کھلی نشانیوں پر ایمان نہیں رکھتے۔

ساتویں آیت میں منافقین کے نفاق اور دوزخی پالیسی کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ یہ لوگ جب مسلمانوں سے ملتے تو کہتے تھے کہ ہم مؤمن مسلمان ہو گئے، اور جب اپنی قوم کے کافر لوگوں سے ملتے تو کہتے تھے کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھی ہیں، اور تمہاری قوم کے فرد ہیں، اور مسلمانوں کے ساتھ تو محض تمسخر و استہزاء کے لئے، یعنی ان کو بیوقوف بنانے کے لئے ملتے ہیں۔

آٹھویں آیت میں اُن کی اس احمقانہ گفتگو کا جواب ہے کہ یہ بے شعور سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمانوں سے استہزاء کرتے ہیں اور ان کو بیوقوف بنا رہے ہیں، حالانکہ درحقیقت خود بیوقوف بن رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم و کرم سے

اُن کو ڈھیل دے کر خود انہی کے استہزاء کا سامان کر دیا ہے کہ ظاہر میں کسی عذاب کے نہ آنے سے وہ اور غفلت میں پڑ گئے، اور اپنی سرکشی میں بڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ ان کا جرم اور سنگین ہو گیا، پھر دفعۃً پکڑ لئے گئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ عمل چونکہ ان کے استہزاء کے جواب میں تھا اس لئے اس عمل کو بھی استہزاء سے تعبیر کیا گیا۔

نویں آیت میں منافقین کے اس حال کا ذکر ہے کہ انہوں نے اسلام کو بھی قریب سے دیکھا، اس کا ذائقہ بھی چکھا، اور کفر میں تو پہلے سے مبتلا ہی تھے، پھر کفر و اسلام دونوں کو دیکھنے سمجھنے کے بعد انہوں نے اپنی ذلیل دنیاوی اغراض کی خاطر اسلام کے بدلے کفر ہی کو ترجیح دی، اُن کے اس عمل کو قرآن کریم نے تجارت (بیوپار) کا نام دے کر یہ بتلایا کہ ان لوگوں کو بیوپار کا بھی سلیقہ نہ آیا کہ بہترین قیمتی چیز یعنی ایمان دے کر ردی اور تکلیف دہ چیز یعنی کفر خرید لیا۔

آخری چار آیتوں میں منافقین کے حال کی دو مثالیں دے کر اس کا قابل نفرت ہونا بیان فرمایا گیا، دو مثالیں اس بنا پر دی گئیں کہ منافقین میں دو طرح کے آدمی تھے، ایک وہ جو اپنے کفر میں بالکل پختہ تھے، ایمان کا اظہار صرف دُنیوی مصلحت کی وجہ سے کرتے تھے، ایمان و اسلام سے اُن کو کوئی واسطہ نہ تھا، دوسرے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر کبھی کبھی سچے مسلمان ہونے کا ارادہ بھی کر لیتے تھے، مگر پھر دُنیوی اغراض سامنے آ کر ان کو اس ارادے سے روک دیتی تھیں، اسی طرح وہ ایک تذبذب اور تردد کے حال میں رہتے۔

اسی مضمون کے ضمن میں ان ظالموں کو یہ تنبیہ بھی کر دی گئی کہ وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے احاطہ قدرت سے باہر نہیں، ہر وقت ہر حال میں ہلاک بھی کر سکتے ہیں، اور بینائی و شنوائی کی طاقتیں بھی سلب کر سکتے ہیں۔ یہ تیرہ آیتیں منافقین کے حال و مثال پر مشتمل ہیں، ان میں بہت سے احکام و مسائل اور اہم ہدایات بھی ہیں۔

۱۔ کیا کفر و نفاق عہد نبوی کے ساتھ مخصوص تھا یا اب بھی موجود ہے؟

اس معاملہ میں صحیح یہ ہے کہ منافق کے نفاق کو پہچاننا اور اس کو منافق قرار دینا دو طریقوں سے ہوتا تھا، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی بتلا دیا کہ فلاں شخص دل سے مسلمان نہیں منافق ہے، دوسرے یہ کہ اُس کے کسی قول و فعل سے، کسی عقیدہ اسلام کے خلاف کوئی بات یا اسلام کی مخالفت کا کوئی عمل ظاہر اور ثابت ہو جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انقطاع وحی کے سبب اُن کے پہچاننے کی پہلی صورت تو باقی نہ رہی، مگر دوسری صورت اب بھی موجود ہے، جس شخص کے کسی قول و فعل سے اسلامی قطعی عقائد کی مخالفت یا اُن پر استہزاء یا تحریف ثابت ہو جائے، مگر وہ اپنے ایمان و اسلام کا مدعی بنے تو وہ منافق سمجھا جائے گا، ایسے منافق کا نام قرآن کی اصطلاح میں ”لحد“ ہے: الَّذِينَ يُلْجِدُونَ فِيْ اٰیٰتِنَا (حم السجدة: ۴۰)، اور حدیث میں اُس کو ”زندیق“ کے نام سے موسوم کیا گیا، مگر

چونکہ اس کا کفر دلیل سے ثابت اور واضح ہو گیا، اس لئے اس کا حکم سب کفار جیسا ہو گیا، الگ کوئی حکم اس کا نہیں ہے، اسی لئے علمائے اُمت نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد منافقین کا قضیہ ختم ہو گیا، اب جو مومن نہیں وہ کافر کہلائے گا۔

حضرت امام مالکؒ سے ”عمدہ“ شرح بخاری میں نقل کیا گیا ہے کہ بعد زمانہ نبوت کے نفاق کی یہی صورت ہے جس کو پہچانا جاسکتا ہے، اور ایسا کرنے والے کو منافق کہا جاسکتا ہے۔

۲- ایمان و کفر کی حقیقت

آیات مذکورہ میں غور کرنے سے ایمان و اسلام کی پوری حقیقت واضح ہو جاتی ہے، اور اس کے بالمقابل کفر کی بھی، کیونکہ ان آیات میں منافقین کی طرف سے ایمان کا دعویٰ اِمتنا باللہ میں، اور قرآن کریم کی طرف سے اُن کے اس دعوے کا غلط ہونا وَمَا لَهُمْ بِمُؤْمِنِينَ میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں چند باتیں غور طلب ہیں:-

اول یہ کہ جن منافقین کا حال قرآن کریم میں بیان فرمایا گیا ہے، وہ اصل میں یہودی تھے، اور اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان لانا یہود کے مذہب میں بھی ثابت اور مُسَلَّم ہے، اور جو چیز اُن کے عقیدہ میں نہیں تھی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کو ماننا اور آپ پر ایمان لانا، اس کو انہوں نے اپنے بیان میں ذکر نہیں کیا، بلکہ صرف دو چیزیں ذکر کیں: ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر، جس میں اُن کو جھوٹا نہیں کہا جاسکتا، پھر قرآن کریم میں اُن کو جھوٹا قرار دینا اور اُن کے ایمان کا انکار کرنا کس بنا پر ہے؟

بات یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنی من مانی صورتوں میں خدا تعالیٰ یا آخرت کا اقرار کر لینا ایمان نہیں، یوں تو مشرکین بھی کسی نہ کسی انداز سے اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں اور سب سے بڑا قادرِ مطلق مانتے ہیں، اور مشرکین ہندوستان تو ”پرو“ کا نام دے کر قیامت کا ایک نمونہ بھی تسلیم کرتے ہیں، مگر قرآن کی نظر میں یہ ایمان نہیں، بلکہ صرف وہ ایمان معتبر ہے جو اس کی بتلائی ہوئی تمام صفات کے ساتھ ہو، اور آخرت پر ایمان وہ معتبر ہے جو قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے حالات و اوصاف کے ساتھ ہو۔

ظاہر ہے کہ یہود اس معنی کے اعتبار سے نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر، کیونکہ ایک طرف تو وہ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں، اور آخرت کے معاملے میں بھی یہ غلط اعتقاد رکھتے ہیں کہ انبیاء کی اولاد کچھ بھی کرتی رہے وہ بہر حال اللہ تعالیٰ کی محبوب ہے، اُن سے آخرت میں کوئی باز پرس نہ ہوگی، اور کچھ عذاب ہوا بھی تو بہت معمولی ہوگا، اس لئے قرآنی اصطلاح کے اعتبار سے اُن کا یہ کہنا کہ ہم اللہ اور روز قیامت پر ایمان لائے ہیں، غلط اور جھوٹ ہوا۔

۳۔ کفر و ایمان کا ضابطہ

قرآن کی اصطلاح میں ایمان وہ ہے جس کا ذکر اُپر سورہ بقرہ کی تیرہویں آیت میں آچکا ہے: **وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ**، جس سے معلوم ہوا کہ ایمان کا دعویٰ صحیح یا غلط کے جانچنے کا معیار صحابہ کرام کا ایمان ہے، جو اس کے مطابق نہیں وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ایمان نہیں۔

اگر کوئی شخص قرآنی عقیدہ کا مفہوم قرآنی تصریح یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح کے خلاف قرار دے کر یہ کہے کہ میں تو اس عقیدے کو مانتا ہوں تو یہ ماننا شرعاً معتبر نہیں، جیسا کہ آج کل قادیانی گروہ کہتا ہے کہ ہم بھی عقیدہ ختم نبوت کو مانتے ہیں، مگر اس عقیدہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات اور صحابہ کرام کے ایمان سے بالکل مختلف تحریف کرتے ہیں، مرزا غلام احمد کی نبوت کے لئے جگہ نکالتے ہیں۔ قرآن کریم کی اس تصریح کے مطابق وہ اسی کے مستحق ہیں کہ ان کو **مَاهُمْ بِمُؤْمِنِينَ** کہا جائے، یعنی وہ ہرگز مومن نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایمان صحابہ کے خلاف کوئی شخص کسی عقیدہ کا نیا مفہوم بنائے، اور اس عقیدہ کا پابند ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو مومن مسلمان بتلائے اور مسلمانوں کے نماز روزہ میں شریک بھی ہو، مگر جب تک وہ قرآن کے اس بتلائے ہوئے معیار کے مطابق ایمان نہیں لائے گا، اس وقت تک وہ قرآن کی اصطلاح میں مومن نہیں کہلائے گا۔

ایک شبہ کا ازالہ

حدیث وفقہ کا یہ مشہور مقولہ کہ ”اہل قبلہ کو کافر نہیں کہا جاسکتا“ اس کا مطلب بھی آیت مذکورہ کے تحت میں یہ متعین ہو گیا کہ اہل قبلہ سے مراد صرف وہ لوگ ہیں جو ضروریات دین میں سے کسی چیز کے منکر نہیں، ورنہ یہ منافقین بھی تو قبلہ کی طرف سب مسلمانوں کی طرح نماز پڑھتے تھے، مگر یہ صرف رُوبہ قبلہ نماز پڑھنا ان کے ایمان کے لئے اس بنا پر کافی نہ ہوا کہ ان کا ایمان صحابہ کرام کی طرح تمام ضروریات دین پر نہیں تھا۔

۴۔ جھوٹ ایک گھناؤنی چیز ہے

یہاں منافقین کے قول: **اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ** میں غور کیجئے کہ یہ لوگ پرلے درجے کے کافر ہونے کے باوجود اپنی دانست میں جھوٹ بولنے سے اجتناب کرتے ہیں، کیونکہ دعویٰ ایمان کے لئے صرف اللہ اور روز قیامت پر ایمان کا ذکر کرتے ہیں، ایمان بالرسول کا ذکر اس لئے نہیں کرتے کہ جھوٹ نہ ہو جائے، اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ ایسی گندی اور گھناؤنی چیز ہے کہ کوئی شریف آدمی خواہ کافر، فاسق ہو، جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتا۔

یہ دوسری بات ہے کہ ان کا دعویٰ ایمان باللہ وبالیوم الآخر بھی قرآنی اصطلاح کے خلاف ہونے کی وجہ سے نتیجتاً جھوٹ ثابت ہوا۔

۵۔ انبیاء و اولیاء کے ساتھ براسلوک کرنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ برائی کرنا ہے

آیات مذکورہ میں منافقین کا ایک حال یہ بتلایا ہے: **يُخَادِعُونَ اللَّهَ**، یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں، اور اس کے ساتھ چال بازی کرتے ہیں، حالانکہ گروہ منافقین میں شاید کوئی بھی ایسا نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کا قصد رکھتا ہو، یا یہ سمجھتا ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کو فریب دے سکتا ہے، بلکہ حقیقت یہ تھی کہ یہ لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو دھوکہ دینے کے قصد سے شنیع حرکتیں کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ میں اس کو اللہ کو دھوکہ دینا قرار دے کر یہ بتلادیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے کسی رسول یا ولی کے ساتھ کوئی برا معاملہ کرتا ہے، وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے کے حکم میں ہے۔ دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعت شان کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ آپ کی شان میں کوئی گستاخی کرنا ایسا ہی جرم ہے جیسا اللہ جل شانہ کی شان میں گستاخی جرم ہے۔

۶۔ جھوٹ بولنے کا وبال

آیات مذکورہ میں منافقین کے عذاب الیم کی وجہ **بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ** یعنی اُن کے جھوٹ بولنے کو قرار دیا ہے، حالانکہ ان کے کفر و نفاق کا جرم سب سے بڑا تھا، اور دوسرے جرائم مسلمانوں سے حسد، اُن کے خلاف سازشیں بھی بڑے جرائم تھے، مگر عذاب الیم کا سبب ان کے جھوٹ بولنے کو قرار دیا، اس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ جھوٹ بولنے کی عادت ان کا اصلی جرم تھا، اسی بری عادت نے اُن کو کفر و نفاق تک پہنچا دیا تھا، اس لئے جرم کی حیثیت اگرچہ کفر و نفاق کی بڑھی ہوئی ہے، مگر ان سب خرابیوں کی جڑ اور بنیاد جھوٹ بولنا ہے، اسی لئے قرآن کریم نے جھوٹ بولنے کو بت پرستی کے ساتھ جوڑ کر اس طرح ارشاد فرمایا ہے:-

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ (الحج)

”یعنی بچو بت پرستی کی نجاست سے اور بچو جھوٹ بولنے سے۔“

۷۔ اصلاح و فساد کی تعریف اور مصلح و مفسد کی پہچان

آیات مذکورہ میں گزر چکا ہے کہ جب کوئی ان منافقین سے یہ کہتا کہ اپنے نفاق کے ذریعہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو وہ بڑے زور اور تاکید سے کہتے تھے: **إِنَّمَا خُنْ مُّصْلِحُونَ**، اس میں لفظ **إِنَّمَا** جو حصروا انحصار کے لئے بولا جاتا ہے اس کی

وجہ سے معنی اس جملہ کے یہ ہیں کہ ہم تو مصلح ہی ہیں، یعنی ہمارے کسی عمل کا فساد سے کوئی واسطہ نہیں، مگر قرآن کریم نے اُن کے جواب میں فرمایا: **آلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِنْ لَا يَشْعُرُونَ** ① یعنی ”یاد رکھو کہ یہی لوگ مفسد ہی ہیں مگر ان کو اس کا شعور نہیں۔“

اس میں دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ منافقین کی حرکات حقیقۂ زمین میں فتنہ و فساد پھیلنے کا سبب تھیں، دوسری بات یہ کہ منافقین فتنہ و فساد پھیلانے کی نیت اور قصد سے یہ کام نہ کرتے تھے بلکہ ان کو معلوم بھی نہ تھا کہ اس کا نتیجہ فتنہ و فساد ہے، جیسا کہ قرآن کی تصریح **وَلَكِنْ لَا يَشْعُرُونَ** سے معلوم ہوتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ زمین میں فتنہ و فساد جن چیزوں سے پھیلتا ہے اُن میں کچھ تو ایسی چیزیں ہیں جن کو ہر شخص فساد سمجھتا ہے، جیسے قتل، غارتگری، چوری، دھوکا، فریب، اغواء، بدکاری وغیرہ ہر سمجھ دار آدمی ان کو شر و فساد سمجھتا ہے، اور ہر شریف آدمی ان سے بچتا ہے، اور کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو اپنی ظاہری سطح کے اعتبار سے کوئی فتنہ و فساد نہیں ہوتیں، مگر اُن کی وجہ سے انسانوں کے اخلاق برباد ہوتے ہیں، اور انسانوں کی اخلاقی گراؤٹ سارے فتنوں اور فسادوں کے دروازے کھول دیتی ہے، ان منافقین کا بھی یہی حال تھا کہ چوری، ڈاکا، بدکاری وغیرہ سے بچتے تھے، اسی لئے بڑی زور سے اپنے مفسد ہونے کا انکار اور مصلح ہونے کا اثبات کیا۔

مگر نفاق اور کینہ و حسد اور اس کے ماتحت دشمنوں سے سازشیں، یہ چیزیں انسان کے اخلاق کو ایسا تباہ کر دیتی ہیں کہ انسان بہت سے حیوانوں کی سطح سے بھی نیچے آ جاتا ہے، اور ایسے کام کرنے پر اُتر آتا ہے جو کبھی کسی بھلے مانس سے متصور نہیں ہوتے، اور جب انسان اپنے انسانی اخلاق کھو بیٹھا، تو انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں فساد ہی فساد آ جاتا ہے، فساد بھی ایسا عظیم جو نہ درندے جانوروں سے متوقع ہے، نہ ڈاکوؤں اور چوروں سے، کیونکہ ان کے فساد کو قانون اور حکومت کی طاقت سے روکا جاسکتا ہے، مگر قانون تو انسان ہی جاری کرتے ہیں، جب انسان انسان ہی نہ رہا تو قانون کی جوگت بنے گی اس کا تماشا آج کھلی آنکھوں ہر شخص ہر محکمہ اور ہر ادارہ میں دیکھتا ہے، آج دنیا کا تمدن ترقی پذیر ہے، تعلیم و تعلم کے اداروں کا جال گاؤں گاؤں تک پھیلا ہوا ہے، ”تہذیب، تہذیب“ کے الفاظ ہر شخص کی زبان پر ہیں، قانون سازی کی مجلس کا بازار گرم ہے، تنفیذ قانون کے بے شمار ادارے اربوں روپے کے خرچ سے قائم ہیں، دفتری انتظامات کی بھول بھلیاں ہے، مگر جرائم اور فتنے و فساد روز بروز بڑھتے ہی جاتے ہیں، وجہ اس کے سوا نہیں کہ کوئی قانون خود کار مشین نہیں ہوتا، بلکہ اس کو انسان چلاتے ہیں، جب انسان اپنی انسانیت کھو بیٹھا تو پھر اس فساد کا علاج نہ قانون سے ہو سکتا ہے نہ حکومت اور محکموں کے چکر سے، اسی لئے انسانیت کے عظیم ترین محسن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام تر توجہ اس پر مرکوز فرمائی ہے کہ

انسان کو صحیح معنی میں انسان بنادیں، تو پھر فساد و جرائم خود بخود ختم ہو جاتے ہیں، نہ پولیس کی زیادہ ضرورت رہتی ہے، نہ عدالتوں کے اس پھیلاؤ کی جو دنیا میں پایا جاتا ہے، اور جب تک دنیا کے جس حصہ میں آپ کی تعلیمات و ہدایات پر عمل ہوتا رہا دنیا نے وہ امن و امان دیکھا جس کی نظیر نہ پہلے کبھی دیکھی گئی نہ ان تعلیمات کو چھوڑنے کے بعد متوقع ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کی روح ہے اللہ تعالیٰ کا خوف، اور قیامت کے حساب کتاب کی فکر، اس کے بغیر کوئی قانون و دستور اور کوئی محکمہ اور کوئی مدرسہ اور یونیورسٹی انسان کو جرائم سے باز رکھنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

آج کی دنیا میں جن لوگوں کے ہاتھ میں اختیار کی باگ ہے وہ جرائم کے اسداد کے لئے نئے سے نئے انتظام کو تو سوچتے ہیں، مگر اس روح انتظام یعنی خوفِ خدا سے نہ صرف غفلت برتتے ہیں بلکہ اس کو فنا کرنے کے اسباب مہیا کرتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ ہمیشہ یہی سامنے آتا رہتا ہے کہ ۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کھلے طور پر فساد مچانے والے چوروں، غارت گروں کا علاج سہل ہے، مگر ان انسانیت فراموش انسانوں کا فساد ہمیشہ برنگِ اصلاح ہوتا ہے، وہ کوئی دلچسپ و فریبِ اصلاحی اسکیم بھی سامنے رکھ لیتے ہیں، اور خالص ذاتی اغراضِ فاسدہ کو اصلاح کا رنگ دے کر اِثْنَانِ حُنْ مُصْلِحُونَ کے نعرے لگاتے رہتے ہیں، اسی لئے حق تعالیٰ سبحانہ نے جہاں فساد سے روکا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (البقرہ: ۲۲۰) یعنی ”اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ مفسد کون ہے اور مصلح کون؟“ جس میں اشارہ فرمادیا کہ فساد و صلاح کی اصل حقیقت حق تعالیٰ ہی جانتے ہیں جو دلوں کے حال اور نیّتوں سے بھی واقف ہیں، اور ہر عمل کے خواص و نتائج کو بھی جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ صلاح ہوگا یا فساد، اس لئے اصلاح کے لئے صرف نیتِ اصلاح کافی نہیں، بلکہ عمل کا رخ بھی شریعت کے مطابق صحیح ہونا ضروری ہے، بعض اوقات کوئی عمل پوری نیک نیتی اور اصلاح کے قصد سے کیا جاتا ہے مگر اس کا اثر فساد و فتنہ ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ

اے لوگو! بندگی کرو اپنے رب کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم

تَتَّقُونَ ﴿۲۱﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بَنَاءً ۖ وَأَنْزَلَ

پرہیزگار بن جاؤ۔ جس نے بنایا واسطے تمہارے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت اور اُتارا

مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا

آسمان سے پانی، پھر نکالے اس سے میوے تمہارے کھانے کے واسطے، سو نہ ٹھہراؤ کسی کو

لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۲۲﴾

اللہ کے مقابل اور تم تو جانتے ہو۔

آسان ترجمہ قرآن

اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور ان لوگوں کو پیدا کیا جو تم سے پہلے گزرے ہیں، تاکہ تم متقی بن جاؤ ﴿۲۲﴾ (وہ پروردگار) جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا بنایا، اور آسمان کو چھت، اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے تمہارے رزق کے طور پر پھل نکالے، لہذا اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ، جبکہ تم (یہ سب باتیں) جانتے ہو ﴿۲۲﴾

خلاصہ تفسیر

اے لوگو! عبادت اختیار کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، عجب نہیں کہ تم دوزخ سے بچ جاؤ (شاہی محاورہ میں ”عجب نہیں“ کا لفظ وعدہ کے موقع پر بولا جاتا ہے) وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت اور برسایا آسمان سے پانی، پھر (پردہ عدم سے) نکالا بذریعہ اس پانی کے پھلوں سے غذا کو تم لوگوں کے واسطے، اب تو مت ٹھہراؤ اللہ پاک کے مقابل اور تم تو جانتے بوجھتے ہو، (یعنی یہ جانتے ہو کہ یہ تمام تصرفات خدا تعالیٰ کے سوا کوئی کرنے والا نہیں، پھر خدا کے مقابلہ میں دوسری چیزوں کو معبود بنانا کیسے درست ہو سکتا ہے)۔

معارف و مسائل

ربط آیات

سورہ بقرہ کی دوسری آیت میں اُس دُعا و درخواست کا جواب تھا جو سورہ فاتحہ میں آئی ہے، یعنی: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ

الْمُسْتَقِيمَ ۝ یعنی جو صراطِ مستقیم تم طلب کرتے ہو وہ اس کتاب میں ہے، کیونکہ قرآن کریم اول سے آخر تک صراطِ مستقیم ہی کی تشریح ہے۔

اس کے بعد قرآنی ہدایات کو قبول کرنے اور نہ کرنے کے اعتبار سے انسان کے تین گروہوں کو بیان کیا گیا، پہلی تین آیات میں مؤمنین متقین کا ذکر ہوا، جنہوں نے ہدایاتِ قرآنی کو اپنا نصب العین بنالیا، بعد کی دو آیتوں میں اُس گروہ کا ذکر کیا جس نے کھلے طور پر اُس ہدایت کی مخالفت کی، اس کے بعد تیرہ آیتوں میں اُس خطرناک گروہ کے حالات بیان کئے گئے جو حقیقت میں تو قرآنی ہدایات کے مخالف تھے، مگر دنیا کی ذلیل اغراض یا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے خیال سے اپنے کفر و مخالفت کو چھپا کر مسلمانوں میں شامل رہتے اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے۔

اسی طرح سورہ بقرہ کی ابتدائی بیس آیتوں میں ہدایت کے قبول کرنے اور نہ کرنے کے معیار پر کل انسانوں کو تین گروہوں میں بانٹ دیا گیا، جس میں اس طرف بھی اشارہ پایا گیا کہ انسانوں کی گروہی اور قومی تقسیم، نسب اور وطن یا زبان اور رنگ کی بنیادوں پر معقول نہیں، بلکہ اس کی صحیح تقسیم مذہب کی بنیاد پر ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی ہدایت کو ماننے والے ایک قوم، اور نہ ماننے والے دوسری قوم جن کو سورہ مجادلہ میں ”حزب اللہ“ اور ”حزب الشیطان“ کا نام دیا گیا۔

غرض سورہ بقرہ کی ابتدائی بیس آیتوں میں قرآنی ہدایات کو ماننے یا نہ ماننے کی بنیاد پر انسان کو تین قوموں میں تقسیم کر کے ہر ایک کا کچھ حال بیان فرمایا گیا۔

اس کے بعد مذکورہ ایکسویں اور بائیسویں آیتوں میں تینوں گروہوں کو خطاب کر کے وہ دعوت پیش کی گئی ہے جس کے لئے قرآن نازل ہوا، اس میں مخلوق پرستی سے باز آنے اور ایک خدا کی عبادت کرنے کی طرف دعوت ایسے انداز سے دی گئی ہے کہ اس میں دعویٰ کے ساتھ اس کے واضح دلائل بھی موجود ہیں، جن میں ادنیٰ سمجھ بوجھ والا انسان بھی ذرا سا غور کرے تو توحید کے اقرار پر مجبور ہو جائے۔

پہلی آیت میں يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ سے خطاب شروع ہوا، لفظ النَّاسُ عربی زبان میں مطلق انسان کے معنی میں آتا ہے، اس لئے مذکورہ تینوں گروہ اس میں داخل ہیں، جن کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا: اَعْبُدُوا رَبَّكُمْ، عبادت کے معنی ہیں اپنی پوری طاقت مکمل فرمانبرداری میں صرف کرنا، اور خوف و عظمت کے پیش نظر نافرمانی سے دُور رہنا (روح البیان)۔ اور لفظ ”رَب“ کے معنی ”پروردگار“ کے ہیں، جس کی پوری تشریح پہلے گزر چکی ہے، ترجمہ یہ ہوا کہ ”عبادت کرو اپنے رب کی۔“ یہاں پر لفظ ”رَب“ کی جگہ لفظ ”اللہ“ یا اسمائے حسنیٰ میں سے کوئی اور نام بھی لایا جاسکتا تھا، مگر ان میں سے اس جگہ لفظ ”رَب“ کا انتخاب کرنے میں یہ حکمت ہے کہ اس مختصر سے جملے میں دعوے کے ساتھ دلیل بھی آگئی، کیونکہ عبادت کی

مستحق صرف وہ ذات ہو سکتی ہے جو انسان کی پرورش کی کفیل ہو، جو اس کو ایک قطرہ سے تدریجی تربیت کے ساتھ ایک بھلا چنگا، سمیع و بصیر، عقل و ادراک والا ماہر انسان بنا دے، اور اس کی بقا و ارتقا کے وسائل مہیا کرے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ انسان کتنا ہی جاہل ہو، اور اپنی بصیرت کو برباد کر چکا ہو، جب بھی ذرا غور کرے گا تو اس کا یقین کرنے میں اُسے ہرگز تامل نہیں ہوگا کہ یہ شانِ ربوبیت بجز حق تعالیٰ کے اور کسی میں نہیں، اور انسان پر یہ مربیانہ انعامات نہ کسی پتھر کے تراشے ہوئے بت نے کئے ہیں، اور نہ کسی اور مخلوق نے، اور وہ کیسے کرتے جبکہ وہ سب خود اپنے وجود اور بقا میں اُسی ”ذاتِ واحد“ کے محتاج ہیں، ایک محتاج دوسرے محتاج کی کیا حاجت روائی کر سکتا ہے؟ اور اگر ظاہری طور پر کرے بھی تو وہ بھی درحقیقت اُسی ذات کی تربیت ہوگی جس کی طرف یہ دونوں محتاج ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس جگہ لفظ ”رَب“ لا کر یہ واضح کر دیا گیا کہ جس ذات کی عبادت کی طرف دعوت دی گئی ہے، اس کے سوا کوئی دوسری ہستی عبادت کی مستحق ہو ہی نہیں سکتی۔

اس جملہ میں انسانوں کے تینوں گروہوں کو خطاب ہے، اور ہر مخاطب کے لئے اس جملہ کا معنی و مطلب جدا ہے، مثلاً جب کہا گیا کہ اپنے رب کی عبادت کرو، تو کفار کے لئے اس خطاب کے معنی یہ ہوئے کہ مخلوق پرستی چھوڑ کر تو حید اختیار کرو، اور منافقین کے لئے اس کے یہ معنی ہوئے کہ نفاق چھوڑ کر اخلاص پیدا کرو، گناہگار مسلمانوں کے لئے معنی یہ ہوئے کہ گناہ سے باز آ جاؤ اور کامل اطاعت اختیار کرو، اور متقی مسلمانوں کے لئے اس جملہ کے یہ معنی ہوئے کہ اپنی طاعت و عبادت پر ہمیشہ قائم رہو، اور اس میں ترقی کی کوشش کرو۔ (روح البیان)

اس کے بعد ”رَب“ کی چند صفاتِ خاصہ کا ذکر کر کے اس مضمون کی مزید توضیح فرمادی گئی، ارشاد ہوتا ہے: **الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ**، یعنی ”تمہارا پروردگار وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، اور ان قوموں کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں“، اس میں ”رَب“ کی وہ صفت بتلائی گئی ہے جو اللہ جل شانہ کے سوا کسی مخلوق میں پائے جانے کا کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا، کہ نیست سے ہست اور نابود سے بود کرنا، پھر بطنِ مادر کی تاریکیوں اور گندگیوں میں ایسا حسین و جمیل، پاک و صاف انسان بنا دینا کہ فرشتے بھی اس کی پاکی پر رشک کریں، یہ سوائے اُس ذاتِ حق کے کس کا کام ہو سکتا ہے جو کسی کا محتاج نہیں، اور سب اُس کے محتاج ہیں۔

اس آیت میں **خَلَقَكُمْ** کے ساتھ **الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ** کا اضافہ کر کے ایک تو یہ بتلادیا کہ تم اور تمہارے آباء و اجداد یعنی تمام بنی نوعِ انسان کا خالق وہی پروردگار ہے۔ دوسرے صرف **مِنْ قَبْلِكُمْ** کا ذکر فرمایا، من بعد کم یعنی بعد میں پیدا ہونے والے لوگوں کا ذکر نہیں کیا، اس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے

بعد کوئی دوسری امت یا دوسری ملت نہیں ہوگی، کیونکہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نہ کوئی نبی مبعوث ہوگا، نہ اس کی کوئی جدید امت ہوگی۔

اس کے بعد اسی آیت کا آخری جملہ ہے: **لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ** (۲۱) یعنی دنیا میں گمراہی اور آخرت میں عذاب سے نجات پانے کی اُمید تمہارے لئے صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ توحید کو اختیار کرو، اور شرک سے باز آؤ۔

کائناتِ زمین و آسمان میں قدرتِ حق کے مظاہر

پھر دوسری آیت میں ”رَبِّ“ کی دوسری صفات کا بیان اس طرح فرمایا گیا ہے: **الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِيْ اَشَاءِ السَّمَاءِ بِنَاءٍ ۚ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ**، یعنی ”رَبِّ وہ ذات ہے جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو فرش، اور آسمان کو چھت اور برسایا آسمان سے پانی، پھر اس پانی کے ذریعے پردہٴ عدم سے نکالی پھلوں کی غذا تمہارے لئے۔“

پہلی نعمت

اس سے پہلی آیت میں اُن انعامات کا ذکر تھا جو انسان کی ذات سے متعلق ہیں، اور اس آیت میں اُن انعامات کا ذکر ہے جو انسان کے گرد و پیش کی چیزوں سے متعلق ہیں، یعنی پہلی آیت میں ”انفسی“ اور دوسری میں ”آفاقی“ نعمتوں کا ذکر فرما کر تمام اقسامِ نعمت کا احاطہ فرمایا گیا۔

ان ”آفاقی“ نعمتوں میں سے زمین کی پیدائش کا ذکر ہے کہ اس کو انسان کے لئے فرش بنادیا، نہ پانی کی طرح نرم ہے، جس پر قرار نہ ہو سکے، اور نہ لوہے، پتھر کی طرح سخت ہے کہ ہم اسے اپنی ضرورت کے مطابق آسانی سے استعمال نہ کر سکیں، بلکہ نرمی اور سختی کے درمیان ایسا بنایا گیا جو عام انسانی ضروریاتِ زندگی میں کام دے سکے۔

”فِرَاش“ کے لفظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ زمین گول نہ ہو، کیونکہ زمین کا یہ عظیم الشان کرہ گول ہونے کے باوجود دیکھنے میں ایک سطح نظر آتا ہے، اور قرآن کا عام طرزِ یہی ہے کہ ہر چیز کی وہ کیفیت بیان کرتا ہے جس کو ہر دیکھنے والا عالم، جاہل، شہری، دیہاتی سمجھ سکے۔

دوسری نعمت یہ ہے کہ آسمان کو ایک مزین اور نظر فریب چھت بنادیا، تیسری نعمت یہ ہے کہ آسمان سے پانی برسایا، پانی آسمان سے برسانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ بادل کا واسطہ درمیان میں نہ ہو، بلکہ محاورات میں ہر اُدپر سے آنے والی چیز کو ”آسمان سے آنا“ بولتے ہیں۔

خود قرآن کریم نے متعدد مقامات میں بادلوں سے پانی برسانے کا ذکر فرمایا ہے، مثلاً ارشاد ہے:-

ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمْوُكُم مِّنَ الْمُنْزِلِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُونَ ﴿۲۹﴾ (الواقعه)

”کیا بارش کا پانی سفید بادلوں سے تم نے اُتارا ہے یا ہم اس کے اُتارنے والے ہیں۔“

دوسری جگہ ارشاد ہے:-

وَاَنْزَلْنَا مِّنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا ﴿۱۳﴾ (النبا)

”ہم نے اُتارا پانی بھرے ہوئے بادلوں سے پانی کا ریلا۔“

چوتھی نعمت اس پانی کے ذریعے پھل پیدا کرنا اور پھلوں سے انسان کی غذا پیدا کرنا ہے۔ پروردگارِ عالم کی چار مذکورہ صفات میں سے پہلی تین باتیں تو ایسی ہیں کہ ان میں انسان کی سعی و عمل تو کیا خود اس کے وجود کو بھی دخل نہیں، بیچارے انسان کا نام و نشان بھی نہ تھا، جب زمین اور آسمان پیدا ہو چکے تھے اور بادل اور بارش اپنا کام کر رہے تھے، ان کے متعلق تو کسی بیوقوف جاہل کو بھی یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ کام سوائے حق جل شانہ کے کسی انسان یا بت یا کسی اور مخلوق نے کئے ہوں گے۔

ہاں زمین سے پھل اور پھلوں سے انسانی غذا نکالنے میں کسی سادہ لوح اور سطحی نظر رکھنے والے کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ انسانی سعی و عمل اور اس کی دانش مندانہ تدبیروں کا نتیجہ ہیں کہ وہ زمین کو نرم کرنے اور کمانے میں، پھر بیج ڈالنے اور جمانے میں، پھر اس کی تربیت اور حفاظت میں اپنی محنت خرچ کرتا ہے۔

لیکن قرآن کریم نے دوسری آیات میں اس کو بھی صاف کر دیا کہ انسان کی سعی اور محنت کو درخت اُگانے یا پھل نکالنے میں قطعاً کوئی دخل نہیں، بلکہ اس کی ساری تدبیروں اور محنتوں کا حاصل ”رُکاوٹوں کو دُور کرنے“ سے زیادہ کچھ نہیں، یعنی انسان کا کام صرف اتنا ہی ہے کہ پیدا ہونے والے درخت کی راہ سے رُکاوٹیں دُور کرے اور بس۔

غور کیجئے کہ زمین کا کھودنا، اس میں ہل چلانا، اس میں سے جھاڑ جھنکاڑ کو دُور کرنا، اس میں کھا دُال کر زمین کو نرم کرنا جو کاشتکاروں کا ابتدائی کام ہے، اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ بیج یا گٹھلی کے اندر سے جو نازک کوئیل قدرتِ خداوندی سے نکلے گی زمین کی سختی یا کوئی جھاڑ جھنکاڑ اس کی راہ میں حائل نہ ہو جائیں، بیج میں سے کوئیل نکالنے اور اس میں پھول پیتاں پیدا کرنے میں اس بیچارے کاشتکار کی محنت کا کیا دخل ہے؟

اسی طرح کاشتکار کا دُوسرا کام زمین میں بیج ڈالنا، پھر اس کی حفاظت کرنا، پھر جو کوئیل نکلے اس کی سردی گرمی اور جانوروں سے حفاظت کرنا ہے، اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ قدرتِ خداوندی سے پیدا ہونے والے کوئیلوں کو ضائع ہونے سے بچایا جائے، ان سب کاموں کو کسی درخت کے نکلنے یا پھلنے پھولنے میں بجز دفعِ موانع کے اور کیا دخل ہے؟ ہاں

پانی سے جنمے والے بیج کی اور اس سے نکلنے والے درخت کی غذا تیار ہوتی ہے، اور اسی سے وہ پھلتا پھولتا ہے، لیکن پانی کاشتکار کا پیدا کیا ہوا نہیں، اس میں بھی کاشتکار کا کام صرف اتنا ہے کہ قدرت کے پیدا کئے ہوئے پانی کو قدرت ہی کے پیدا کئے ہوئے درخت تک ایک مناسب وقت میں اور مناسب مقدار میں پہنچا دے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ درخت کی پیدائش اور اس کے پھلنے پھولنے میں اول سے آخر تک انسان کی محنت اور تدبیر کا اس کے سوا کوئی اثر نہیں کہ نکلنے والے درخت کے راستے سے روڑے ہٹا دے، یا اس کو ضائع ہونے سے بچالے، باقی رہی درخت کی پیدائش، اس کا بڑھنا، اس میں پتے اور شاخیں پھر پھول اور پھل پیدا کرنا، سو اس میں سوائے خدا تعالیٰ کی قدرت کے اور کسی کا کوئی دخل نہیں۔

اسی مضمون کو قرآن کریم نے اس طرح بیان فرمایا ہے:-

أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ ﴿٦٣﴾ ءَأَنْتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ﴿٦٤﴾ (الواقعه)

”بتلاؤ جو کچھ تم بوتے ہو، اُسے تم اُگاتے ہو یا ہم اُگانے والے ہیں؟“

قرآن کے اس سوال کا جواب انسان کے پاس بجز اس کے اور کیا ہے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی ان سب درختوں کو اُگانے والے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ جس طرح زمین اور آسمان کی پیدائش اور برق و باران کے منظم سلسلہ کار میں انسانی سعی و محنت کا کوئی دخل نہیں، اسی طرح کھیتی اور درختوں کے پیدا ہونے اور ان سے پھول پھل نکلنے، اور ان سے انسان کی غذائیں تیار ہونے میں بھی اس کا دخل صرف برائے نام ہے، اور حقیقت میں یہ سب کار و بار صرف حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کا نتیجہ ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ کی ایسی چار صفات کا بیان ہے جو سوائے اس کے اور کسی مخلوق میں پائی ہی نہیں جاسکتیں، اور جب ان دونوں آیتوں سے یہ معلوم ہو گیا کہ انسان کو عدم سے وجود میں لانا اور پھر اس کی بقا و ترقی کے سامان زمین اور آسمان، بارش اور پھل پھول کے ذریعے مہیا کرنا سوائے ذات حق جل شانہ کے اور کسی کا کام نہیں، تو ہر آدمی سمجھ بوجھ رکھنے والے انسان کو اس پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ عبادت و اطاعت کے لائق اور مستحق بھی صرف وہی ذات ہے، اور اس سے بڑا کوئی ظلم نہیں کہ انسان کے بود و وجود اور اس کے بقا و ارتقا کے سارے سامان تو اللہ تعالیٰ پیدا کرے، اور غافل انسان دُوسروں کی چوکھٹوں پر سجدہ کرتا پھرے، دُوسری چیزوں کی بندگی میں مشغول ہو جائے، مولانا رومیؒ نے اسی غافل انسان کی زبان پر فرمایا ہے:-

نعمت را خوردہ عصیاں میکنم

نعمت از تو من بغیرے می تم

اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی ساری مخلوقات کا سردار اس لئے بنایا تھا کہ ساری کائنات اس کی خدمت کرے، اور یہ صرف رب کائنات کی خدمت اور عبادت میں مشغول رہے، اور کسی کی طرف نظر نہ کرے، اس کا یہ رنگ ہو جائے۔

بگذر از یاد گل و گلبن کہ ہمچم یاد نیست

در زمین و آسمان جز ذکر حق آباد نیست^۱

لیکن غافل انسان نے اپنی حماقت سے اللہ تعالیٰ ہی کو بھلا دیا تو اسے ایک خدا کی غلامی کے بجائے ستر کروڑ

دیوتاؤں کی غلامی کرنا پڑی۔

ایک در چھوڑ کے ہم ہو گئے لاکھوں کے غلام

ہم نے آزادی عرفی کا نہ سوچا انجام

اسی غیروں کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے اس آیت کے آخر میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ**

اَنْدَادًا وَاَنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ (۲۲) ”اب تو مت ٹھہراؤ اللہ کا مقابل اور تم تو جانتے بوجھتے ہو۔“ یعنی جب تم نے یہ جان لیا کہ تم کو

نیست سے ہست کرنے والا، تمہاری تربیت اور پرورش کے سارے سامان مہیا کر کے ایک قطرہ سے حسین و جمیل، حساس

اور عاقل انسان بنانے والا، تمہارے رہن سہن کے لئے زمین اور دوسری ضروریات کے لئے آسمان بنانے والا، آسمان

سے پانی برسانے والا، پانی سے پھل اور پھل سے غذا مہیا کرنے والا بجز حق تعالیٰ کے کوئی نہیں تو عبادت و بندگی کا مستحق

دوسرا کون ہو سکتا ہے کہ اس کو خدا کا مقابل یا سہیم و شریک ٹھہرایا جائے، اگر ذرا بھی غور کیا جائے تو اس جہان میں اس سے

بڑھ کر کوئی ظلم اور بیوقوفی و بے عقلی نہیں ہو سکتی کہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر مخلوق سے دل لگایا جائے اور اس پر بھروسہ کیا جائے۔

آنا نکہ بجز روی تو جائے نگر اند

کو تہ نظر اند چہ کو تہ نظر اند^۲

خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں اس چیز کی دعوت دی گئی ہے جو تمام آسمانی کتابوں کے اور تمام انبیاء کے

بھیجے کا اصل مقصد ہے، یعنی صرف ایک خدا کی عبادت و بندگی جس کا نام توحید ہے۔

۱ ترجمہ:- تیری نعمت کھا کر، تیری نافرمانی کرتا ہوں، نعمت تیری ہے وہ ایسی کسی اور کے ساتھ ہے۔

۲ ترجمہ:- پھول اور باغ کی یاد کو چھوڑ دو کیونکہ مجھے کچھ یاد نہیں ہے، زمین اور آسمان میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کے سوا کچھ یاد نہیں ہے۔

۳ ترجمہ:- جو لوگ آپ کی ذات کو چھوڑ کر کسی اور طرف جارہے ہیں ان کی عقل کمزور ہے، کتنی زیادہ کمزور ہے۔

اور یہ وہ انقلابی نظریہ ہے جو انسان کے تمام اعمال و احوال اور اخلاق و معاشرت پر گہرا اثر رکھتا ہے، کیونکہ جو شخص یہ یقین کرے کہ تمام عالم کا خالق و مالک اور تمام نظامِ عالم میں متصرف اور تمام چیزوں پر قادر صرف ایک ذات ہے، بغیر اس کی مشیت اور ارادے کے نہ کوئی ذرہ حرکت کر سکتا ہے، نہ کوئی کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے، تو اس کی پوری توجہ ہر مصیبت و راحت اور ہر تنگی و فراخی میں صرف ایک ذات کی طرف ہو جائے گی، اور اس کو وہ بصیرت حاصل ہو جائے گی جس کے ذریعے وہ اسبابِ ظاہرہ کی حقیقت کو پہچان لے گا کہ یہ سلسلہ اسباب درحقیقت ایک پردہ ہے جس کے پیچھے دستِ قدرت کار فرما ہے۔

برق اور بھاپ کے پوجنے والے دانایانِ یورپ اگر اس حقیقت کو سمجھ لیں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ برق اور بھاپ سے آگے بھی کوئی حقیقت ہے، اور حقیقی پاور اور طاقت نہ برق میں ہے نہ بھاپ میں، بلکہ سب طاقتوں اور قوتوں کا سرچشمہ اسی ذاتِ حق تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، جس نے یہ برق اور بھاپ پیدا کئے، اس کو سمجھنے کے لئے بصیرت چاہئے، اور جس نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا وہ دنیا میں کتنا ہی دانش مند و فلاسفر کہلاتا ہو مگر اس کی مثال اس دیہاتی بیوقوف کی سی ہے جو کسی ریلوے اسٹیشن پر پہنچا اور دیکھا کہ گاڑی کے ہاتھ میں دو جھنڈیاں سرخ اور سبز ہیں، سبز کے دکھلانے سے ریل چلنے لگتی ہے، اور سرخ جھنڈی دکھلانے سے ریل تھم جاتی ہے، یہ دیکھ کر وہ ان جھنڈیوں ہی کو ڈنڈوت کرنے لگے، اور یہ سمجھے کہ یہ جھنڈیاں ہی طاقت کی مالک ہیں کہ اتنی بڑی تیز رفتار پہاڑ کی طرح بوجھل گاڑی کو چلانا اور روکنا ان کا کام ہے۔ جس طرح دنیا اس دیہاتی پرہنستی ہے کہ اس جاہل کو یہ خبر نہیں کہ جھنڈیاں محض علامت ہیں اور کام درحقیقت ڈرائیور کا ہے کہ وہ ریل کو چلاتا ہے اور روکتا ہے، بلکہ اس کا بھی نہیں مشین کے کل پرزوں کا ہے، اور جس نے ذرا نگاہ کو اور گہرا کر لیا تو اُسے یہ نظر آ جاتا ہے کہ درحقیقت اُس کا چلانا نہ ڈرائیور کا کام ہے، نہ انجن کے کل پرزوں کا، بلکہ اصل طاقت اس اسٹیم کی ہے جو انجن کے اندر پیدا ہو رہی ہے۔ اسی طرح ایک موحد انسان ان سب عقل مندوں پر ہنستا ہے کہ حقیقت کو تم نے بھی نہیں پایا، فکر و نظر کی منزل ابھی اور آگے ہے، ذرا نگاہ کو تیز کرو اور غور سے کام لو، تو معلوم ہوگا کہ اسٹیم اور آگ و پانی بھی کچھ نہیں، طاقت و قوت صرف اسی ذات کی ہے جس نے آگ اور پانی پیدا کئے ہیں، اور اسی کی مشیت و امر کے ماتحت یہ سب چیزیں اپنی ڈیوٹی ادا کر رہی ہیں۔

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند

بامن و تو مردہ، باحق زندہ اند

۱ ترجمہ: مٹی، ہوا، پانی، آگ اللہ کی مخلوق ہیں، یہ چیزیں میرے اور تیرے ہاں مردہ ہیں مگر اللہ کے ہاں زندہ ہیں۔

کسی کا عمل اس کی نجات اور جنت کا یقینی سبب نہیں

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۲۱﴾ اس جملے میں لفظ ”لَعَلَّ“ استعمال فرمایا ہے جو ”رجاء“ یعنی اُمید کے معنی میں آتا ہے، اور ایسے مواقع پر بولا جاتا ہے جہاں کسی فعل کا وقوع یقینی نہ ہو، حکم ایمان و توحید کے نتیجے میں نجات اور جنت کا حصول وعدہ الہیہ کے مطابق یقینی ہے، مگر اس یقینی شے کو اُمید و رجاء کے عنوان سے بیان کرنے میں حکمت یہ بتلانا ہے کہ انسان کا کوئی عمل اپنی ذات میں نجات و جنت کی قیمت نہیں بن سکتا، بلکہ فضل خداوندی اس کا اصل سبب ہے، ایمان و عمل کی توفیق ہونا اس فضل خداوندی کی علامت ہے، علت نہیں۔

عقیدہ توحید ہی دُنیا میں امن و امان اور سکون و اطمینان کا ضامن ہے

عقیدہ توحید جو اسلام کا سب سے پہلا بنیادی عقیدہ ہے، یہ صرف ایک نظریہ نہیں، بلکہ انسان کو صحیح معنی میں انسان بنانے کا واحد ذریعہ ہے جو انسان کی تمام مشکلات کا حل، اور ہر حالت میں اس کے لئے پناہ گاہ، اور ہر غم و فکر میں اس کا نگہسار ہے، کیونکہ عقیدہ توحید کا حاصل یہ ہے کہ عناصر کے کون و فساد اور ان کے سارے تغیرات صرف ایک ہستی کی مشیت کے تابع اور اس کی حکمت کے مظاہر ہیں۔

ہر تغیر ہے غیب کی آواز

ہر تجدد میں ہیں ہزاروں راز

اور ظاہر ہے کہ جب یہ عقیدہ کسی کے قلب و دماغ پر چھا جائے اور اس کا حال بن جائے تو یہ دُنیا ہی اس کے لئے جنت بن جائے گی، سارے جھگڑے فساد اور ہر فساد کی بنیادیں ہی منہدم ہو جائیں گی، کیونکہ اس کے سامنے یہ سبق ہوگا۔

اَزْ خُذَادَاں خِلَافِ دُشْمَن و دُوسَت

کہ دِل ہر دو در تصرفِ اوست ﴿۱﴾

اس عقیدہ کا مالک ساری دُنیا سے بے نیاز ہر خوف و خطر سے بالا تر زندگی گزارتا ہے، اُس کا حال یہ ہوتا ہے۔

موحد چہ برپائے ریزی زرش

چہ فولاد ہندی نہی بر سرش

امید و ہراسش نباشد ز کس

ہمیں است بنیاد توحید و بس ﴿۲﴾

۱ ترجمہ:- دشمن اور دوست کا فرق اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھو کیونکہ دونوں کے دل اسی کے اختیار میں ہیں۔

۲ ترجمہ:- موحد وہ ہے کہ جس کے قدموں میں سونا لا کر ڈال دیا اس کے سر پر تلوار رکھ دو، وہ نہ تو کسی سے کوئی لالچ رکھتا ہے، نہ کسی سے ڈرتا ہے، توحید کی بنیاد بس یہی ہے۔

کلمہ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ جو کلمہ توحید کہلاتا ہے اس کا یہی مفہوم ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ توحید کا محض زبانی اقرار اس کے لئے کافی نہیں، بلکہ سچے دل سے اس کا یقین اور یقین کے ساتھ استحضار ضروری ہے، کیونکہ توحید خدا ”واحد دین بود نہ واحد گفتن“^۱

کلمہ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ کے پڑھنے والے تو آج دنیا میں کروڑوں ہیں، اور اتنے ہیں کہ کسی زمانے میں اتنے نہیں ہوئے، لیکن عام طور پر یہ صرف زبانی جمع خرچ ہے، توحید کا رنگ ان میں رچا نہیں ورنہ اُن کا بھی وہی حال ہوتا جو پہلے بزرگوں کا تھا کہ نہ کوئی بڑی سے بڑی قوت و طاقت ان کو مرعوب کر سکتی تھی، اور نہ کسی قوم کی عددی اکثریت اُن پر اثر انداز ہو سکتی تھی، نہ کوئی بڑی سے بڑی دولت و سلطنت اُن کے قلوب کو خلاف حق اپنی طرف جھکا سکتی تھی، ایک پیغمبر کھڑا ہو کر ساری دنیا کو لٹکا کر کہہ دیتا تھا کہ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کَيْدُونِ فَلَا تُنْظَرُونَ (الاعراف: ۱۹۵)۔ انبیاء علیہم السلام کے بعد صحابہ و تابعین جو تھوڑی سی مدت میں دنیا پر چھا گئے اُن کی طاقت و قوت اسی حقیقی توحید میں مضمر تھی، اللہ تعالیٰ ہمیں اور سب مسلمانوں کو یہ دولت نصیب فرمائے۔

رسالت محمدی کا اثبات

بذریعہ اعجاز قرآن

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّمَّنْ مِثْلِهِ^۲

اور اگر تم شک میں ہو اس کلام سے جو اُتارا ہم نے اپنے بندے پر، تو لے آؤ ایک سورت اس جیسی

وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ^۳ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا

اور بلاؤ اس کو جو تمہارا مددگار ہو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔ پھر اگر ایسا نہ کر سکو،

۱ ترجمہ:- خدا کی توحید ایک جانتا ہے، ایک کہنا نہیں۔

۲ ترجمہ:- پھر میرے خلاف کوئی سازش کرو، اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو۔

۳ الحمد للہ یہ مضمون الگ سے کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ (ناشر)

وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّاسَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ^ط

اور ہرگز نہ کر سکو گے، تو پھر بچو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں،

أَعَدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۝۲۴

تیار کی ہوئی ہے کافروں کے واسطے۔

آسان ترجمہ قرآن

اور اگر تم اس (قرآن) کے بارے میں ذرا بھی شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر اتارا ہے، تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنالاء، اور اگر سچے ہو تو اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو ۝۲۴ پھر بھی اگر تم یہ کام نہ کر سکو، اور یقیناً کبھی نہیں کر سکو گے، تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، وہ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ ۝۲۴

خلاصہ تفسیر

اگر تم لوگ کچھ خلجان میں ہو اس کتاب کی نسبت جو ہم نے نازل فرمائی ہے اپنے بندے خاص پر تو اچھا پھر تم بنالاء ایک محدود ٹکڑا جو اس کا ہم پلہ ہو (کیونکہ تم بھی عربی زبان جانتے ہو اور اس کی نظم و نثر کے مشاق ہو، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کوئی مشق بھی نہیں کی، اور جب اس کے باوجود تم قرآن کے ایک ٹکڑے کی بھی مثل نہ بنا سکو تو بشرط انصاف بے تامل ثابت ہو جاوے گا کہ یہ معجزہ من جانب اللہ ہے اور آپ اللہ کے پیغمبر ہیں) اور بلا لو اپنے حمایتیوں کو (جو) خدا سے الگ (الگ تجویز کر رکھے ہیں) اگر تم سچے ہو، پھر اگر تم یہ کام نہ کر سکو اور قیامت تک بھی نہ کر سکو گے تو پھر ذرا بچتے رہو دوزخ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، تیار رکھی ہوئی ہے کافروں کے واسطے۔

معارف و مسائل

رابط آیات و خلاصہ مضمون

یہ سورہ بقرہ کی تیسویں اور چوبیسویں آیتیں ہیں، اس سے پہلی دو آیتوں میں توحید کا ثبوت تھا، ان دونوں آیتوں

میں رسالت محمدی کا اثبات ہے (علیہ الصلوٰۃ والسلام)۔ وہ ہدایت جو قرآن لے کر آیا ہے اس کے دو عمود ہیں: توحید اور رسالت، پہلی دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے چند مخصوص کام ذکر کر کے توحید ثابت کی گئی تھی، ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کا کلام پیش کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ثابت فرمائی گئی ہے، اور طریق اثبات دونوں کا ایک ہی ہے کہ پہلی دو آیتوں میں چند ایسے کام مذکور تھے جو سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں کر سکتا، مثلاً زمین اور آسمان کا پیدا کرنا، آسمان سے پانی اتارنا، پانی سے پھل پھول پیدا کرنا۔

اور خلاصہ استدلال یہ تھا کہ جب یہ کام اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تو مستحق عبادت بھی اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، اور ان دونوں آیتوں میں ایک ایسا کلام پیش کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا، اور نہ کوئی انسانی فرد یا جماعت اس کی مثال و نظیر لاسکتی ہے، جس طرح زمین و آسمان کی بناوٹ، پانی برسانے اور اس سے پھل پھول نکالنے سے انسانی طاقت کا عاجز ہونا اس کی دلیل تھی کہ یہ کام صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں، اسی طرح کلام الہی کا مثل یا نظیر پیش کرنے سے پوری مخلوق کا عاجز رہنا اس کی دلیل ہے کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، کسی مخلوق کا نہیں، اس آیت میں قرآن نے پوری دنیا کے انسانوں کو خطاب کر کے چیلنج دیا ہے کہ اگر تم اس کلام کو اللہ کا کلام نہیں، بلکہ کسی انسان کا کلام سمجھتے ہو تو تم بھی انسان ہو، تمہیں بھی ایسا کلام پیش کرنے پر قدرت ہونا چاہئے، پورا کلام تو کیا تم اس کلام کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی نظیر و مثال بنا کر دکھلا دو، اور اس پر تمہارے لئے یہ مزید آسانی دی جاتی ہے کہ تنہا کوئی آدمی نہ بنا سکے تو تمہیں اختیار ہے سارے جہان سے اپنے حمایتی اور مددگار جمع کر لو، اور ایک بین العالمی کانفرنس کر کے اس قرآن کی چھوٹی سی سورت کی مثال بنا لاؤ۔

پھر اسی پر بس نہیں کیا، دوسری آیت میں اُن کو غیرت دلائی کہ تمہاری مجال نہیں کہ اس جیسی ایک سورت بنا سکو، پھر عذاب سے ڈرایا کہ جب تم اس کلام کی مثال بنانے سے اپنا عجز محسوس کرتے ہو، اور یہ صاف اس کی دلیل ہے کہ یہ انسان کا کلام نہیں، بلکہ ایسی ہستی کا کلام ہے جو تمام مخلوق سے مافوق اور بلند و بالا ہے، جس کی قدرتِ کاملہ سب پر حاوی ہے، تو پھر اس پر ایمان نہ لانا اپنے ہاتھوں جہنم میں اپنا ٹھکانا کرنا ہے، اس سے بچو۔

حاصل یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں قرآن کریم کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلیٰ معجزہ بتلا کر آپ کی رسالت اور سچائی کا ثبوت پیش کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات تو ہزاروں ہیں اور بڑے بڑے حیرت انگیز ہیں، لیکن اُن سب میں سے اس جگہ آپ کے علمی معجزے یعنی قرآن کے ذکر پر اکتفا کر کے یہ بتلا دیا گیا کہ آپ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے، اور اس معجزے کو انبیاء علیہم السلام کے عام معجزات میں بھی ایک خاص امتیاز یہ حاصل ہے کہ عام دستور یہ ہے کہ ہر نبی و رسول کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے کچھ معجزات ظاہر فرماتے ہیں، مگر یہ معجزات ان رسولوں کے

اس پر غور کیا جائے کہ جو قوم اسلام اور قرآن کی مخالفت اور اس کو گرانے مٹانے کے لئے اپنی جان، مال، آبرو، اولاد سب کچھ قربان کرنے کے لئے تلی ہوئی تھی، اس کو یہ آسان موقع دیا جاتا ہے کہ قرآن کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کی مثال بنالاء تو تم اپنے مطلب میں کامیاب ہو سکتے ہو، اور یہ کہہ کر ان کی غیرت کو جوش میں لایا جاتا ہے کہ تم ہرگز یہ کام نہ کر سکو گے، مگر پوری قوم میں کوئی بھی اس کام کے لئے آگے نہ بڑھا، اس سے بڑھ کر کونسا اعتراف اپنے عجز کا اور قرآن کریم کے کلام اللہ ہونے کا ہو سکتا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا کھلا ہوا معجزہ ہے جس نے تمام سرکشوں کی گردنیں جھکا دیں۔

قرآن ایک زندہ اور قیامت تک باقی رہنے والا معجزہ ہے

تمام انبیاء علیہم السلام کے معجزات صرف ان کی حیات تک معجزہ ہوتے، لیکن قرآن کا معجزہ بعد وفات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح معجزہ کی حیثیت میں باقی ہے، آج بھی ایک ادنیٰ مسلمان ساری دنیا کے اہل علم و دانش کو لکار کر دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کی مثال نہ کوئی پہلے لاسکا، نہ آج لاسکتا ہے، اور جس کو ہمت ہو پیش کر کے دکھلائے۔

شیخ جلال الدین سیوطی مفسر جلالین نے اپنی کتاب ”خصائص کبریٰ“ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو معجزوں کے متعلق بحوالہ حدیث لکھا ہے کہ قیامت تک باقی ہیں، ایک قرآن کا معجزہ، دوسرے یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! ایام حج میں تینوں جمرات پر لاکھوں آدمی تین روز تک مسلسل کنکریاں پھینکتے ہیں، پھر کوئی ان کنکریوں کے ڈھیر کو یہاں سے اٹھاتا بھی نظر نہیں آتا، اور ایک مرتبہ پھینکی ہوئی کنکر کو دوبارہ استعمال کرنا بھی ممنوع ہے، اس لئے ہر حاجی اپنے لئے مزدلفہ سے کنکریاں نئی لے کر آتا ہے، اس کا مقتضی تو یہ تھا کہ جمرات کے گرد ایک ہی سال میں ٹیلہ لگ جاتا جس میں جمرات چھپ جاتے اور چند سال میں تو پہاڑ ہو جاتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہاں مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو مقرر کر رکھا ہے کہ جس جس شخص کا حج قبول ہو اس کی کنکریاں اٹھالی جائیں، تو اب اس جگہ صرف ان کم نصیبوں کی کنکریاں باقی رہ جاتی ہیں جن کا حج مقبول نہیں ہوا، اس لئے اس جگہ پڑی ہوئی کنکریاں بہت کم نظر آتی ہیں، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو یہاں پہاڑ کھڑا ہو گیا ہوتا۔ یہ روایت سنن بیہقی میں موجود ہے۔

یہ ایک ایسی حدیث ہے جس کے ذریعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی تصدیق ہر سال اور ہر زمانے میں ہو سکتی ہے، کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ حج میں لاکھوں آدمی ہر سال جمع ہوتے ہیں، اور ہر شخص ہر جمرہ پر ہر روز سات سات

کنکریاں پھینکتا ہے، اور بعض جاہل تو بڑے بڑے پتھر پھینکتے ہیں، اور یہ بھی یقینی طور پر معلوم ہے کہ ان کنکریوں کو یہاں سے اٹھانے اور صاف کرنے کا حکومت یا کوئی جماعت بھی روزانہ انتظام نہیں کرتی، نہ اٹھائی جاتی ہیں، اور جیسا قدیم سے دستور چلا آتا ہے کہ اس جگہ سے کنکریاں اٹھائی ہی نہیں جاتیں، تو اگلے سال اس کا دُگنا اور تیسرے سال تکنا ہو جائے گا، پھر کیا شبہ ہے کہ چند سال میں یہ حصہ زمین مع جمرات کے اُن کنکریوں میں چھپ جائے گا، اور بجائے جمرات کے ایک پہاڑ کھڑا نظر آئے، مگر مشاہدہ اس کے خلاف ہے، اور یہ مشاہدہ ہر زمانے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق اور آپ پر ایمان لانے کے لئے کافی ہے۔ سنا ہے کہ اب یہاں سے کنکریاں اٹھانے کا کچھ انتظام ہونے لگا ہے، مگر تیرہ سو برس تک کا عمل بھی اس مضمون کی تصدیق کے لئے کافی ہے۔

اسی طرح معجزہ قرآن ایک زندہ اور ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ ہے، جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اس کی نظیر یا مثال پیش نہیں کی جاسکی، آج بھی نہیں کی جاسکتی۔

اعجاز قرآنی کی تشریح

اس اجمالی بیان کے بعد آپ کو یہ معلوم کرنا ہے کہ قرآن کریم کو کس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرار دیا گیا، اور اس کا اعجاز کن کن وجوہ سے ہے، اور کیوں ساری دُنیا اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہو گئی۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ چودہ سو برس کے عرصے میں قرآن کی زبردست تحدی (چیلنج) کے باوجود کوئی اس کی یا اس کے کسی ٹکڑے کی مثال پیش نہیں کر سکا، یہ تاریخی حیثیت سے کیا وزن رکھتا ہے، یہ دونوں باتیں طویل الذکر اور تفصیل کی طالب ہیں۔

وجوہ اعجاز قرآنی

پہلی بات کہ قرآن کو معجزہ کیوں کہا گیا؟ اور وہ کیا وجوہ ہیں جن کے سبب ساری دُنیا اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے، اس پر قدیم و جدید علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، اور ہر مفسر نے اپنے اپنے طرز میں اس مضمون کو بیان کیا ہے، میں اختصار کے ساتھ چند ضروری چیزیں عرض کرتا ہوں۔

اس جگہ سے سب سے پہلے غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ یہ عجیب و غریب کل علوم کی جامع کتاب، کس جگہ، کس ماحول میں اور کس پر نازل ہوئی؟ اور کیا وہاں کچھ ایسے علمی سامان موجود تھے جن کے ذریعے دائرۂ اسباب میں ایسی جامع بے نظیر کتاب تیار ہو سکے، جو علومِ اولین و آخری کی جامع، اور انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کے متعلق بہترین

ہدایت پیش کر سکے، جس میں انسان کی جسمانی اور روحانی تربیت کا مکمل نظام ہو، اور تدبیر منزل سے لے کر سیاستِ ممالک تک ہر نظام کے بہترین اصول ہوں۔

جس سرزمین اور جس ذات پر یہ کتاب مقدس نازل ہوئی اس کی جغرافیائی کیفیت اور تاریخی حالت معلوم کرنے کے لئے آپ کو ایک ریگستانی خشک اور گرم علاقہ سے سابقہ پڑے گا جس کو بطحاء مکہ کہتے ہیں، اور جو نہ زرعی ملک ہے نہ صنعتی، نہ اس ملک کی آب و ہوا کچھ ایسی خوشگوار ہے جس کے لئے باہر کے آدمی وہاں پہنچنے کی رغبت کریں، نہ راستے ہی کچھ ہموار ہیں جن سے وہاں تک پہنچنا آسان ہو، اکثر دنیا سے کٹا ہوا ایک جزیرہ نما ہے، جہاں خشک پہاڑوں اور گرم ریگ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، اور دور تک نہ کہیں بستی نظر آتی ہے نہ کوئی کھیت نہ درخت۔

اس پورے خطہ ملک میں کچھ بڑے شہر بھی نہیں، چھوٹے چھوٹے گاؤں اور ان میں اونٹ بکریاں پال کر اپنی زندگی گزارنے والے انسان بستے ہیں، اس کے چھوٹے دیہات کا تو دیکھنا کیا، جو برائے نام چند شہر کہلاتے ہیں ان میں بھی کسی قسم کے علم و تعلیم کا کوئی چرچا نہیں، نہ وہاں کوئی اسکول اور کالج ہے، نہ کوئی بڑی یونیورسٹی یا دارالعلوم، وہاں کے باشندوں کو اللہ تعالیٰ نے محض قدرتی اور پیدائشی طور پر فصاحت و بلاغت کا ایک فن ضرور دے دیا ہے، جس میں وہ ساری دنیا سے فائق اور ممتاز ہیں، وہ نثر اور نظم میں ایسے قادر الکلام ہیں کہ جب بولتے ہیں تو رعد کی طرح کڑکتے اور بادل کی طرح برستے ہیں، ان کی ادنیٰ ادنیٰ چھوکریاں ایسے فصیح و بلیغ شعر کہتی ہیں کہ دنیا کے ادیب حیران رہ جائیں۔

لیکن یہ سب کچھ اُن کا فطری فن ہے، جو کسی مکتب یا مدرسے میں حاصل نہیں کیا جاتا، غرض نہ وہاں تعلیم و تعلم کا کوئی سامان ہے، نہ وہاں کے رہنے والوں کو اُن چیزوں سے کوئی لگاؤ یا دل بستگی ہے، اُن میں کچھ لوگ شہری زندگی بسر کرنے والے ہیں تو وہ تجارت پیشہ ہیں، مختلف اجناس مال کی درآمد و برآمدان کا مشغلہ ہے۔

اس ملک کے قدیم شہر مکہ کے ایک شریف گھرانہ میں وہ ذات مقدس پیدا ہوئی ہے جو مہبطِ وحی ہے، جس پر قرآن اُتر ہے، اب اُس ذات مقدس کا حال سنئے:-

ولادت سے پہلے ہی والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، پیدا ہونے سے پہلے یتیم ہو گئے، ابھی سات سال کی بھی عمر نہ تھی کہ والدہ کی بھی وفات ہو گئی، آغوشِ مادر کا گہوارہ بھی نصیب نہ رہا، شریف آباء و اجداد کی فیاضی اور بے مثل سخاوت نے اپنے گھر میں کوئی اندوختہ نہ چھوڑا تھا، جس سے یتیم کی پرورش اور آئندہ زندگی کا سامان ہو سکے، نہایت عسرت کی زندگی پھر ماں باپ کا سایہ سر پر نہیں، ان حالات میں آپ نے پرورش پائی، اور عمر کا ابتدائی حصہ گزارا جو تعلیم و تعلم کا اصلی وقت ہے، اس وقت اگر مکہ میں کوئی دارالعلوم یا اسکول و کالج بھی ہوتا تو بھی آپ کے لئے اس سے استفادہ مشکل تھا، مگر معلوم ہو چکا کہ وہاں سرے سے یہ علمی مشغلہ اور اس سے دلچسپی ہی کسی کو نہ تھی، اسی لئے یہ پوری قوم عرب اُمیین کہلاتے تھے،

قرآن کریم نے بھی اُن کے متعلق یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ آپ ہر قسم کی تعلیم و تعلّم سے بے خبر رہے، وہاں کوئی بڑا عالم بھی ایسا نہ تھا جس کی صحبت میں رہ کر یہ علوم حاصل کئے جاسکیں، جن کا قرآن حامل ہے، پھر قدرت کو تو ایک فوق العادہ معجزہ دکھانا تھا، آپ کے لئے خصوصی طور پر ایسے سامان ہوئے، معمولی نوشت و خواند جو ہر جگہ کے لوگ کسی نہ کسی طرح سیکھ ہی لیتے ہیں، آپ نے وہ بھی نہ سیکھی، بالکل اُمی محض رہے کہ اپنا نام تک بھی نہ لکھ سکتے تھے، عرب کا مخصوص فن شعر و سخن تھا، جس کے لئے خاص خاص اجتماعات کئے جاتے اور مشاعرے منعقد ہوتے، اور اس میں ہر شخص مسابقت کی کوشش کرتا تھا، آپ کو حق تعالیٰ نے ایسی فطرت عطا فرمائی تھی کہ ان چیزوں سے بھی دلچسپی نہ تھی، نہ کبھی کوئی شعر یا قصیدہ لکھا، نہ کسی ایسی مجلس میں شریک ہوئے۔

ہاں اُمی محض ہونے کے ساتھ بچپن ہی سے آپ کی شرافتِ نفس، اخلاقِ فاضلہ، فہم و فراست کے غیر معمولی آثار، دیانت و امانت کے اعلیٰ ترین شاہکار آپ کی ذاتِ مقدس میں ہر وقت مشاہدہ کئے جاتے تھے، جن کا نتیجہ یہ تھا کہ عرب کے بڑے بڑے مغرور و متکبر سردار آپ کی تعظیم کرتے تھے، اور سارے مکہ میں آپ کو ”امین“ کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ یہ اُمی محض چالیس سال تک مکہ میں اپنی برادری کے سامنے رہتے ہیں، کسی دوسرے ملک کا سفر بھی نہیں کرتے، جس سے یہ خیال پیدا ہو سکے کہ وہاں جا کر علوم حاصل کئے ہوں گے، صرف ملکِ شام کے دو تجارتی سفر ہوئے، وہ بھی گئے چنے چند دن کے لئے جس میں اس کا کوئی امکان نہیں۔

اس اُمی محض ذاتِ مقدس کی زندگی کے چالیس سال مکہ میں اپنی برادری میں اس طرح گزرے کہ نہ کبھی کسی کتاب یا قلم کو ہاتھ لگایا، نہ کسی مکتب میں گئے، نہ کسی مجلس میں کوئی نظم و قصیدہ ہی پڑھا، ٹھیک چالیس سال کے بعد اُن کی زبانِ مبارک پر وہ کلام آنے لگا جس کا نام ”قرآن“ ہے، جو اپنی لفظی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اور معنوی علوم و فنون کے لحاظ سے محیر العقول کلام ہے، اگر صرف اتنا ہی ہوتا تو بھی اس کے معجزہ ہونے میں کسی انصاف پسند کو کیا شبہ رہ سکتا ہے، مگر یہاں یہی نہیں بلکہ اس نے ساری دُنیا کو تحدی کی، چیلنج دیا کہ کسی کو اس کے کلامِ الہی ہونے میں شبہ ہو تو اس کا مثل بنالائے۔

اب ایک طرف قرآن کی یہ تحدی اور چیلنج اور دوسری طرف ساری دُنیا کی مخالف طاقتیں جو اسلام اور پیغمبرِ اسلام کو شکست دینے کے لئے اپنی مال، جان، اولاد، آبرو سب گنوا دینے کو تیار ہیں، مگر اتنا کام کرنے کے لئے کوئی جرأت نہیں کرتا کہ قرآن کی ایک چھوٹی سی سورت کی مثال بنالائے، فرض کر لیجئے کہ یہ کتاب بے مثال و بے نظیر بھی نہ ہوتی، جب بھی ایک اُمی محض کی زبان سے اس کا ظہور اعجازِ قرآن اور وجوہِ اعجاز کی تفصیل میں جائے بغیر بھی قرآن کریم کے معجزہ ہونے کے لئے کم نہیں جس کو ہر عالم و جاہل سمجھ سکتا ہے۔

اعجازِ قرآنی کی دوسری وجہ

اب اعجازِ قرآن کی دوسری وجہ دیکھئے، یہ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن اور اس کے احکام ساری دُنیا کے لئے آئے، لیکن اس کے بلا واسطہ اور پہلے مخاطب عرب تھے، جن کو اور کوئی علم و فن آتا تھا یا نہیں مگر فصاحت و بلاغت ان کا فطری ہنر اور پیدائشی وصف تھا، جس میں وہ اقوامِ دُنیا سے ممتاز سمجھے جاتے تھے، قرآن اُن کو مخاطب کر کے چیلنج کرتا ہے کہ اگر تمہیں میرے کلامِ الہی ہونے میں کوئی شبہ ہے تو تم میری ایک سورت کی مثال بنا کر دکھلا دو، اگر قرآن کی یہ تحدی (چیلنج) صرف اپنے حسنِ معنوی یعنی حکیمانہ اُصول اور علمی معارف و اسرار ہی کی حد تک ہوتی تو قومِ اُمّیین کے لئے اس کی نظیر پیش کرنے سے عذر معقول ہوتا، لیکن قرآن نے صرف حسنِ معنوی ہی کے متعلق تحدی نہیں کی، بلکہ لفظی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی پوری دُنیا کو چیلنج دیا ہے، اس چیلنج کو قبول کرنے کے لئے اقوامِ عالم میں سب سے زیادہ مستحقِ عرب ہی تھے، اگر فی الواقع یہ کلامِ قدرتِ بشر سے باہر کسی مافوقِ قدرت کا کلام نہیں تھا تو بلغائے عرب کے لئے کیا مشکل تھا کہ ایک اُمّی شخص کے کلام کی مثال بلکہ اس سے بہتر کلام فوراً پیش کر دیتے، اور ایک دو آدمی یہ کام نہ کر سکتے تو قرآن نے ان کو یہ سہولت بھی دی تھی کہ ساری قوم مل کر بنالائے، مگر قرآن کے اس بلند بانگِ دعوے اور پھر طرح طرح سے غیرت دلانے پر بھی عرب کی غیور قوم پوری کی پوری خاموش ہے، چند سطریں بھی مقابلہ پر نہیں پیش کرتی۔

عرب کے سرداروں نے قرآن اور اسلام کے مٹانے اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو مغلوب کرنے میں جس طرح اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگایا، وہ کسی لکھے پڑھے آدمی سے مخفی نہیں، شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے گئے چنے رُفقاء کو طرح طرح کی ایذائیں دے کر چاہا کہ وہ کلمہ اسلام کو چھوڑ دیں، مگر جب دیکھا کہ ”یاں وہ نشہ نہیں جسے ترشی اُتار دے“ تو خوشامد کا پہلو اختیار کیا، عرب کا سردار عتبہ ابن ربیعہ قوم کا نمائندہ بن کر آپ کے پاس حاضر ہوا، اور عرب کی پوری دولت و حکومت اور بہترین حسن و جمال کی لڑکیوں کی پیشکش اس کام کے لئے کی کہ آپ اسلام کی تبلیغ چھوڑ دیں، آپ نے اس کے جواب میں قرآن کی چند آیتیں سنا دینے پر اکتفا فرمایا۔ جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو جنگ و مقابلہ کے لئے تیار ہو کر قبل از ہجرت اور بعد از ہجرت جو قریش عرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے مقابلہ میں سردھڑکی بازی لگائی، جان، مال، اولاد، آبرو، سب کچھ اس مقابلہ میں خرچ کرنے کے لئے تیار ہوئے، یہ سب کچھ کیا، مگر یہ کسی سے نہ ہوسکا کہ قرآن کے چیلنج کو قبول کرتا، اور چند سطریں مقابلہ پر پیش کر دیتا، کیا ان حالات میں سارے عرب کا اس کے مقابلہ سے سکوت اور عجز اس کی کھلی ہوئی شہادت نہیں کہ یہ انسان کا کلام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس کے کام یا کلام کی نظیر انسان کیا ساری مخلوق کی قدرت سے باہر ہے۔

پھر صرف اتنا ہی نہیں کہ عرب نے اس کے مقابلہ سے سکوت کیا، بلکہ اپنی خاص مجلسوں میں سب نے اس کے بے مثل ہونے کا اعتراف کیا، اور جوان میں سے منصف مزاج تھے، انہوں نے اس اعتراف کا اظہار بھی کیا، پھر اُن میں سے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے، اور کچھ اپنی آبائی رسوم کی پابندی یا بنی عبد مناف کی ضد کی وجہ سے اسلام قبول کرنے سے باوجود اعتراف کے محروم رہے۔ قریش عرب کی تاریخ ان واقعات پر شاہد ہے، میں اس میں سے چند واقعات اس جگہ بیان کرتا ہوں جس سے اندازہ ہو سکے کہ پورے عرب نے اس کلام کے بے مثل، بے نظیر ہونے کو تسلیم کیا، اور اس کی مثال پیش کرنے کو اپنی رسوائی کے خیال سے چھوڑ دیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا چرچا مکہ سے باہر حجاز کے دوسرے مقامات میں ہونے لگا، اور حج کا موسم آیا تو قریش مکہ کو اس کی فکر ہوئی کہ اب اطراف عرب سے حجاج آئیں گے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کلام سنیں گے تو فریفتہ ہو جائیں گے، اور غالب خیال یہ ہے کہ مسلمان ہو جائیں گے۔ اس کے انسداد کی تدبیر سوچنے کے لئے قریش نے ایک اجلاس منعقد کیا، اس اجلاس میں عرب کے بڑے بڑے سردار موجود تھے، اُن میں ولید بن مغیرہ عمر میں سب سے بڑے اور عقل میں ممتاز سمجھے جاتے تھے، سب نے ولید بن مغیرہ کو یہ مشکل پیش کی کہ اب اطراف ملک سے لوگ آئیں گے، اور ہم سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق پوچھیں گے تو ہم کیا کہیں؟ ہمیں آپ کوئی ایسی بات بتلائیے کہ ہم سب وہی بات کہہ دیں، ایسا نہ ہو کہ خود ہمارے بیانات میں اختلاف ہو جائے۔ ولید بن مغیرہ نے کہا کہ تم ہی کہو کیا کہنا چاہئے؟

لوگوں نے کہا کہ ہمارے خیال میں ہم سب یہ کہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) (معاذ اللہ) مجنون ہیں، اُن کا کلام مجنونانہ بڑ ہے۔ ولید بن مغیرہ نے کہا کہ تم ایسا ہرگز نہ کہنا، کیونکہ یہ لوگ جب اُن کے پاس جائیں گے، اور اُن سے ملاقات و گفتگو کریں گے، اور ان کو ایک فصیح و بلیغ عاقل انسان پائیں گے تو انہیں یقین ہو جائے گا کہ تم نے جھوٹ بولا ہے۔ پھر کچھ لوگوں نے کہا کہ اچھا ہم ان کو یہ کہیں کہ وہ ایک شاعر ہیں۔ ولید نے اس سے بھی منع کیا، اور کہا کہ جب لوگ ان کا کلام سنیں گے تو وہ شعر و شاعری کے ماہر ہیں، انہیں یقین ہو جائے گا کہ یہ شعر نہیں اور نہ آپ شاعر ہیں، نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ سب لوگ تمہیں جھوٹا سمجھیں گے۔ پھر کچھ لوگوں نے کہا کہ تو پھر ہم ان کو کاہن قرار دیں جو شیاطین و جنات سے سن کر غیب کی خبریں دیا کرتے ہیں۔ ولید نے کہا: یہ بھی غلط ہے، کیونکہ جب لوگ اُن کا کلام سنیں گے تو پتہ چل جائے گا کہ یہ کلام کسی کاہن کا نہیں ہے، وہ پھر بھی تمہیں ہی جھوٹا سمجھیں گے۔ اس کے بعد قرآن کے بارے میں جو ولید بن مغیرہ کے تاثرات تھے اُن کو ان الفاظ میں بیان کیا:-

”خدا کی قسم! تم میں کوئی آدمی شعر و شاعری اور اشعار عرب سے میرے برابر واقف نہیں، خدا کی

قسم! اس کلام میں خاص حلاوت ہے، اور ایک خاص رونق ہے، جو میں کسی شاعر یا فصیح و بلیغ کے کلام میں نہیں پاتا۔“

پھر اُن کی قوم نے دریافت کیا کہ آپ ہی بتلایئے پھر ہم کیا کریں؟ اور اُن کے بارے میں لوگوں سے کیا کہیں؟ ولید نے کہا: میں غور کرنے کے بعد کچھ جواب دوں گا۔ پھر بہت سوچنے کے بعد کہا کہ اگر کچھ کہنا ہی ہے تو تم اُن کو ساحر کہو کہ اپنے جادو سے باپ بیٹے اور میاں بیوی میں تفرقہ ڈال دیتے ہیں۔

قوم اس پر مطمئن اور متفق ہو گئی، اور سب سے یہی کہنا شروع کیا، مگر خدا کا چراغ کہیں پھونکوں سے بجھنے والا تھا؟ اطرافِ عرب کے لوگ آئے، قرآن سنا اور بہت سے مسلمان ہو گئے، اور اطرافِ عرب میں اسلام پھیل گیا۔ (خصائصِ کبریٰ) اسی طرح ایک قریشی سردار نضر بن حارث نے ایک مرتبہ اپنی قوم کو خطاب کر کے کہا:-

”اے قوم قریش! آج تم ایک مصیبت میں گرفتار ہو کہ اس سے پہلے کبھی ایسی مصیبت سے سابقہ نہیں پڑا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہاری قوم کے ایک نوجوان تھے، اور تم سب اُن کے عادات و اخلاق کے گرویدہ اور اپنی قوم میں اُن کو سب سے زیادہ سچا اور سب سے زیادہ امانت دار جانتے اور کہتے تھے، اب جبکہ اُن کے سر میں سفید بال آنے لگے، اور انہوں نے ایک بے مثل کلام اللہ کی طرف سے پیش کیا تو تم ان کو جادوگر کہنے لگے، خدا کی قسم! وہ جادوگر نہیں، ہم نے جادو گروں کو دیکھا اور برتا ہے، اُن کے کلام سننے ہیں اور طریقوں کو سمجھا ہے، وہ بالکل اس سے مختلف ہیں۔

اور کبھی تم ان کو کاہن کہنے لگے، خدا کی قسم! وہ کاہن بھی نہیں، ہم نے بہت کاہنوں کو دیکھا اور اُن کے کلام سنے ہیں، ان کو ان کے کلام سے کوئی مناسبت نہیں۔

اور کبھی تم ان کو شاعر کہنے لگے، خدا کی قسم! وہ شاعر بھی نہیں، ہم نے خود شعر، شاعری کے تمام فنون کو سیکھا سمجھا ہے، اور بڑے بڑے شعراء کے کلام ہمیں یاد ہیں، اُن کے کلام سے اُس کو کوئی مناسبت نہیں۔ پھر کبھی تو ان کو مجنون بتاتے ہو، خدا کی قسم! وہ مجنون بھی نہیں، ہم نے بہت سے مجنوں کو دیکھا بھالا، ان کی بکواس سنی ہے، اُن کے مختلف اور مختلط کلام سنے ہیں، یہاں یہ کچھ نہیں، اے میری قوم! تم انصاف کے ساتھ اُن کے معاملہ میں غور کرو، یہ سرسری ٹلا دینے کی چیز نہیں۔“ (خصائصِ کبریٰ ج: ۱ ص: ۱۱۴)

حضرت ابوذر صحابی فرماتے ہیں کہ میرا بھائی اُنیس ایک مرتبہ مکہ معظمہ گیا، اُس نے واپس آ کر مجھے بتلایا کہ مکہ میں ایک شخص ہے جو یہ کہتا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔ میں نے پوچھا کہ وہاں کے لوگ اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ بھائی نے کہا کہ کوئی ان کو شاعر کہتا ہے، کوئی کاہن بتلاتا ہے، کوئی جادوگر کہتا ہے۔ میرا بھائی اُنیس خود بڑا شاعر اور کہانت وغیرہ سے واقف آدمی تھا، اس نے مجھ سے کہا کہ جہاں تک میں نے غور کیا لوگوں کی یہ سب باتیں غلط ہیں، اُن کا کلام نہ

شعر ہے نہ کہانت ہے، نہ مجنونانہ کلمات ہیں، بلکہ مجھے وہ کلام صادق نظر آتا ہے۔

ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ بھائی سے یہ کلمات سن کر میں نے مکہ کا سفر کیا، اور مسجد حرام میں آ کر پڑ گیا، تیس روز میں نے اس طرح گزارے کہ سوائے زمزم کے پانی کے میرے پیٹ میں کچھ نہیں گیا، اس تمام عرصہ میں نہ مجھے بھوک کی تکلیف معلوم ہوئی نہ کوئی ضعف محسوس کیا۔ (خصائص ج: ۱ ص: ۱۱۶)

واپس گئے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے روم اور فارس کے فصحاء وبلغاء کے کلام بہت سنے ہیں، اور کاہنوں کے کلمات اور حمیر کے مقالات بہت سنے ہیں، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام کی مثال میں نے آج تک کہیں نہیں سنی، تم سب میری بات مانو اور آپ کا اتباع کرو۔ چنانچہ فتح مکہ کے سال میں ان کی پوری قوم کے تقریباً ایک ہزار آدمی مکہ پہنچ کر مسلمان ہو گئے۔ (خصائص ج: ۱ ص: ۱۱۶)

اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے دشمن ابو جہل اور اخنس بن شریق وغیرہ بھی لوگوں سے چھپ کر قرآن سنا کرتے، اور اس کے عجیب و غریب، بے مثل و بے نظیر اثرات سے متاثر ہوتے تھے، مگر جب قوم کے کچھ لوگوں نے ان کو کہا کہ جب تم اس کلام کو ایسا بے نظیر پاتے ہو تو اس کو قبول کیوں نہیں کرتے؟ تو ابو جہل کا جواب یہ تھا کہ تمہیں معلوم ہے کہ بنی عبد مناف میں اور ہمارے قبیلہ میں ہمیشہ سے رقابت اور معاصرانہ مقابلہ چلتا رہتا ہے، وہ جس کام میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں ہم بھی اس کا جواب دیتے ہیں، اب جبکہ ہم اور وہ دونوں برابر حیثیت کے مالک ہیں تو اب وہ یہ کہنے لگے کہ ہم میں ایک نبی پیدا ہوا ہے جس پر آسمان سے وحی آتی ہے، اب ہم اس میں کیسے ان کا مقابلہ کریں، میں تو کبھی اس کا اقرار نہ کروں گا۔ (خصائص)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن کے اس دعوے اور چیلنج پر صرف یہی نہیں کہ پورے عرب نے ہار مان لی اور سکوت کیا، بلکہ اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے اور اپنے عجز کا کھلے طور پر اعتراف بھی کیا ہے، اگر یہ کسی انسان کا کلام ہوتا تو اس کی کوئی وجہ نہ تھی کہ سارا عرب بلکہ ساری دنیا اس کا مثل لانے سے عاجز ہو جاتی۔

قرآن اور پیغمبر قرآن کے مقابلہ میں جان و مال، اولاد و آبرو سب کچھ قربان کرنے کے لئے تو وہ تیار ہو گئے، مگر اس کے لئے کوئی آگے نہ بڑھا کہ قرآن کے چیلنج کو قبول کر کے دوسطریں اس کے مقابلہ میں پیش کر دیتا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ اپنے جاہلانہ اعمال و افعال کے باوجود منصف مزاج تھے، جھوٹ کے پاس نہ جاتے تھے، جب انہوں نے قرآن کو سن کر یہ سمجھ لیا کہ جب درحقیقت اس کلام کی مثل ہم نہیں لاسکتے تو محض دھاندلی اور کٹھ جتی کے طور پر کوئی کلام پیش کرنا اپنے لئے عار سمجھا، کیونکہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہم نے کوئی چیز پیش بھی کر دی تو پورے عرب کے فصحاء وبلغاء اس امتحانی مقابلہ میں ہمیں فیل کر دیں گے، اور خواہ مخواہ کی رسوائی ہوگی، اسی لئے پوری قوم نے سکوت اختیار

کیا، اور جو زیادہ منصف مزاج تھے انہوں نے صاف طور پر اقرار و تسلیم بھی کیا جس کے کچھ وقائع پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ اسی سلسلہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ عرب کے سردار اسعد بن زرارہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کے سامنے اقرار کیا کہ:-

”ہم نے خواہ مخواہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کر کے اپنے رشتے ناتے توڑے، اور تعلقات خراب کئے، میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ بلاشبہ اللہ کے رسول ہیں، ہرگز جھوٹے نہیں، اور جو کلام وہ لائے ہیں بشر کا کلام نہیں ہو سکتا۔“ (خصائص ج: ۱ ص: ۱۱۶)

قبیلہ بنی سلیم کا ایک شخص مسیٰ قیس بن نسیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ سے قرآن سنا، اور چند سوالات کئے، جن کا جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا، تو یہ اُسی وقت مسلمان ہو گئے، اور پھر اپنی قوم میں واپس گئے، تو لوگوں سے کہا:-

”میں نے روم و فارس کے فصحاء و بلغاء کے کلام سنے ہیں، بہت سے کاہنوں کے کلمات سننے کا تجربہ ہوا ہے، حمیر کے مقالات سنتا رہا ہوں، مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی مثل میں نے آج تک کہیں نہیں سنا، تم سب میری بات مانو اور ان کا اتباع کرو۔“

انہی کی تحریک و تلقین پر ان کی قوم کے ایک ہزار آدمی فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ (خصائص ج: ۱ ص: ۱۱۶)

یہ اقرار و تسلیم صرف ایسے ہی لوگوں سے منقول نہیں جو آپ کے معاملات سے یکسو اور غیر جانب دار تھے، بلکہ وہ لوگ جو ہر وقت ہر طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں لگے ہوئے تھے، قرآن کے متعلق ان کا بھی یہی حال تھا، مگر اپنی ضد اور حسد کی وجہ سے اس کا اظہار لوگوں پر نہ کرتے تھے۔

علامہ سیوطیؒ نے خصائص کبریٰ میں بحوالہ بیہقی نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ ابو جہل اور ابوسفیان اور اخنس بن شریق رات کو اپنے اپنے گھروں سے اس لئے نکلے کہ چھپ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنیں، ان میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ نکلا، ایک کی دوسرے کو خبر نہ تھی، اور علیحدہ علیحدہ گوشوں میں چھپ کر قرآن سننے لگے، تو اس میں ایسے محو ہوئے کہ ساری رات گزر گئی، جب صبح ہو گئی تو سب واپس ہوئے، اتفاقاً راستہ میں مل گئے، اور ہر ایک نے دوسرے کا قصہ سنا، تو سب آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے کہ تم نے یہ بری حرکت کی، اور کسی نے یہ بھی کہا کہ آئندہ کوئی ایسا نہ کرے، کیونکہ اگر عرب کے عوام کو اس کی خبر ہو گئی تو وہ سب مسلمان ہو جائیں گے۔

یہ کہہ سن کر سب اپنے اپنے گھر چلے گئے، اگلی رات آئی تو پھر ان میں سے ہر ایک کے دل میں یہی ٹیس اٹھی کہ

قرآن سنیں، اور پھر اسی طرح چھپ چھپ کر ہر ایک نے قرآن سنا، یہاں تک کہ رات گزر گئی، اور صبح ہوتے ہی یہ لوگ واپس ہوئے، تو پھر آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے، اور اس کے ترک کرنے پر سب نے اتفاق کیا۔ مگر تیسری رات آئی تو پھر قرآن کی لذت و حلاوت نے انہیں چلنے اور سننے پر مجبور کر دیا، پھر پہنچے اور رات بھر قرآن سن کر لوٹنے لگے، تو پھر راستہ میں اجتماع ہو گیا، تو اب سب نے کہا کہ آؤ آپس میں معاہدہ کر لیں کہ آئندہ ہم ہرگز ایسا نہ کریں گے، چنانچہ اس معاہدہ کی تکمیل کی گئی، اور سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ صبح کو اخنس بن شریق نے اپنی لاٹھی اٹھائی اور پہلے ابوسفیان کے پاس پہنچا کہ بتلاؤ اس کلام کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اُس نے دبے دبے لفظوں میں قرآن کی حقانیت کا اعتراف کیا، تو اخنس نے کہا کہ بخدا میری بھی یہی رائے ہے۔ اس کے بعد وہ ابو جہل کے پاس پہنچا، اور اُس سے بھی یہی سوال کیا کہ تم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام کو کیسا پایا؟

ابو جہل نے کہا کہ صاف بات یہ ہے کہ ہمارے خاندان اور بنو عبد مناف کے خاندان میں ہمیشہ سے چشمک چلی آتی ہے، قوم کی سیادت و قیادت میں وہ جس محاذ پر آگے بڑھنا چاہتے ہیں ہم ان کا مقابلہ کرتے ہیں، انہوں نے سخاوت و بخشش کے ذریعے قوم پر اپنا اثر جمانا چاہا تو ہم نے اُن سے بڑھ کر یہ کام کر دکھایا، انہوں نے لوگوں کی ذمہ داریاں اپنے سر لیں تو ہم اس میدان میں بھی ان سے پیچھے نہیں رہے، یہاں تک کہ پورا عرب جانتا ہے کہ ہم دونوں خاندان برابر حیثیت کے مالک ہیں۔

ان حالات میں اُن کے خاندان سے یہ آواز اُٹھی کہ ہمارے میں ایک نبی پیدا ہوا ہے جس پر آسمان سے وحی آتی ہے، اب ظاہر ہے کہ اس کا مقابلہ ہم کیسے کریں، اس لئے ہم نے تو یہ طے کر لیا ہے کہ ہم زور اور طاقت سے اُن کا مقابلہ کریں گے، اور ہرگز ان پر ایمان نہ لائیں گے۔ (خصائص ج: ۱ ص: ۱۱۵)

یہ ہے قرآن کا وہ کھلا ہوا معجزہ جس کا دشمنوں کو بھی اعتراف کرنا پڑا ہے، یہ تمام واقعات علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے ”خصائص کبریٰ“ میں نقل کئے ہیں۔

تیسری وجہ

تیسری وجہ اعجازِ قرآنی کی یہ ہے کہ اس میں غیب کی اور آئندہ پیش آنے والے واقعات کی بہت سی خبریں ہیں جو قرآن نے دیں، اور ہو بہو اسی طرح واقعات پیش آئے جس طرح قرآن نے خبر دی تھی، مثلاً قرآن نے خبر دی کہ روم و فارس کے مقابلہ میں ابتداءً اہل فارس غالب آئیں گے اور رومی مغلوب ہوں گے، لیکن ساتھ ہی یہ خبر دی کہ دس سال گزرنے نہ پائیں گے کہ پھر رومی اہل فارس پر غالب آجائیں گے، مکہ کے سرداروں نے قرآن کی اس خبر پر حضرت صدیق

اکبر سے ہارجیت کی شرط کر لی، اور پھر ٹھیک قرآن کی خبر کے مطابق رومی غالب آگئے تو سب کو اپنی ہار ماننا پڑی، اور ہارنے والے پر جو مال دینے کی شرط کی تھی، وہ مال ان کو دینا پڑا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مال کو قبول نہیں فرمایا، کیونکہ وہ ایک قسم کا جوا تھا۔ اسی طرح اور بہت سے واقعات اور خبریں ہیں جو امور غیبیہ کے متعلق قرآن میں دی گئیں اور ان کی سچائی بالکل روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی۔

چوتھی وجہ

چوتھی وجہ اعجازِ قرآنی کی یہ ہے کہ اس میں پچھلی اُمتوں اور ان کی شرائع اور تاریخی حالات کا ایسا صاف تذکرہ ہے کہ اُس زمانہ کے بڑے بڑے علمائے یہود و نصاریٰ جو پچھلی کتابوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے ان کو بھی اتنی معلومات نہ تھیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کبھی نہ کسی مکتب میں قدم رکھا، نہ کسی عالم کی صحبت اُٹھائی، نہ کسی کتاب کو ہاتھ لگایا، پھر یہ ابتداءً دُنیا سے آپ کے زمانہ تک تمام اقوامِ عالم کے تاریخی حالات اور نہایت صحیح اور سچے سوانح اور ان کی شریعتوں کی تفصیلات کا بیان ظاہر ہے کہ بجز اس کے نہیں ہو سکتا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہو، اور اللہ تعالیٰ نے ہی آپ کو یہ خبریں دی ہوں۔

پانچویں وجہ

یہ ہے کہ اس کی متعدد آیات میں لوگوں کے دل کی چھپی ہوئی باتوں کی اطلاع دی گئی اور پھر ان کے اقرار سے ثابت ہو گیا کہ وہ بات صحیح اور سچ تھی، یہ کام بھی عالم الغیب والشہادۃ ہی کر سکتا ہے، کسی بشر سے عادتاً ممکن نہیں، مثلاً ارشادِ قرآنی ہے :-

اِذْ هَبَّتْ طَائِفَتَيْنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا^۱ (آل عمران: ۱۲۲)

”جب تمہاری دو جماعتوں نے دل میں ارادہ کیا کہ پسپا ہو جائیں۔“

اور یہ ارشاد کہ :-

وَيَقُولُونَ فِيْ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ^۲ (المجادلہ: ۸)

”وہ لوگ اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ ہمارے انکار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔“

یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کو انہوں نے کسی سے ظاہر نہیں کیا، قرآن کریم نے ہی ان کا انکشاف کیا ہے۔

چھٹی وجہ

چھٹی وجہ اعجازِ قرآنی کی، وہ آیات ہیں جن میں قرآن نے کسی قوم یا فرد کے متعلق یہ پیشین گوئی کی کہ وہ فلاں کام

نہ کر سکیں گے، اور پھر وہ لوگ باوجود ظاہری قدرت کے اس کام کو نہ کر سکے، جیسے یہود کے متعلق قرآن نے اعلان کیا کہ اگر وہ فی الواقع اپنے آپ کو اللہ کے دوست اور ولی سمجھتے ہیں تو انہیں اللہ کے پاس جانے سے محبت ہونا چاہئے، وہ ذرا موت کی تمنا کر کے دکھائیں، اور پھر ارشاد فرمایا:-

وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا (البقرة: ۹۵) ”وہ ہرگز موت کی تمنا نہ کر سکیں گے۔“

موت کی تمنا کرنا کسی کے لئے مشکل نہ تھا، خصوصاً اُن لوگوں کے لئے جو قرآن کو جھٹلاتے تھے، قرآن کے ارشاد کی وجہ سے اُن کو تمنائے موت میں خوف و ہراس کی کوئی وجہ نہ تھی، یہود کے لئے تو مسلمانوں کو شکست دینے کا یہ موقع بڑا غنیمت تھا کہ فوراً تمنائے موت کا ہر مجلس و محفل میں اعلان کرتے۔

مگر یہود ہوں یا مشرکین، زبان سے کتنا ہی قرآن کو جھٹلائیں ان کے دل جانتے تھے کہ قرآن سچا ہے، اس کی کوئی بات غلط نہیں ہو سکتی، اگر موت کی تمنا ہم اس وقت کریں گے تو فوراً مرجائیں گے، اس لئے قرآن کے اس کھلے ہوئے چیلنج کے باوجود کسی یہودی کی ہمت نہ ہوئی کہ ایک مرتبہ زبان سے تمنائے موت کا اظہار کر دے۔

ساتویں وجہ

وہ خاص کیفیت ہے جو قرآن کے سننے سے ہر خاص و عام اور مؤمن و کافر پر طاری ہوتی ہے، جیسے حضرت جبریل بن مطعم رضی اللہ عنہ کو اسلام لانے سے پہلے پیش آیا کہ اتفاقاً انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز مغرب میں سورہ طور پڑھتے ہوئے سنا، جب آپ آخری آیت پر پہنچے تو جبریل کہتے ہیں کہ میرا دل گویا اُڑنے لگا، اور یہ سب سے پہلا دن تھا کہ میرے دل میں اسلام نے اثر کیا، وہ آیات یہ ہیں:-

أَمْرُ خُلُقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ ۖ أَمْرُهُمُ الْخُلُقُونَ ﴿٣٥﴾ أَمْرُ خُلُقُوا السُّلُوبَ وَالْأَمْرَ ۖ بَلْ لَا يُؤْقِنُونَ ﴿٣٦﴾ أَمْرٌ عِنْدَهُمْ خَذَّ آيِنُ رَبِّكَ أَمْرُهُمُ الْهَضْبُطُونَ ﴿٣٧﴾ (الطور)

”کیا وہ بن گئے ہیں آپ ہی آپ، یا وہی ہیں بنانے والے، یا انہوں نے بنائے ہیں آسمان اور زمین؟ کوئی نہیں، پر یقین نہیں کرتے، کیا اُن کے پاس ہیں خزانے تیرے رب کے، یا وہی داروغہ ہیں۔“

آٹھویں وجہ

یہ ہے کہ اس کو بار بار پڑھنے اور سننے سے کوئی اُکتاتا نہیں، بلکہ جتنا زیادہ پڑھا جاتا ہے اُس کا شوق اور بڑھتا ہے، دُنیا کی کوئی بہتر سے بہتر مرغوب کتاب لے لیجئے، اس کو دو چار مرتبہ پڑھا جائے تو انسان کی طبیعت اُکتا جاتی ہے، پھر نہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے نہ سننے کو، یہ صرف قرآن کا خاصہ ہے کہ جتنا کوئی اس کو زیادہ پڑھتا ہے اتنا ہی اس کو شوق و رغبت

بڑھتا جاتا ہے، یہ بھی قرآن کے کلامِ الہی ہونے ہی کا اثر ہے۔

نویں وجہ

یہ ہے کہ قرآن نے اعلان کیا ہے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے، وہ قیامت تک بغیر کسی ادنیٰ تغیر و ترمیم کے باقی رہے گا، اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدے کو اس طرح پورا فرمایا کہ جب سے قرآن نازل ہوا ہے آج چودہ سو برس کے قریب ہونے کو آئے ہیں، ہر قرن، ہر زمانے میں لاکھوں انسان ایسے رہے ہیں اور رہیں گے جن کے سینوں میں پورا قرآن اس طرح محفوظ رہا کہ ایک زیروزبر کی غلطی کا امکان نہیں، ہر زمانے میں مرد، عورت، بچے، بوڑھے اس کے حافظ ملتے ہیں، بڑے سے بڑا عالم اگر کہیں ایک زیروزبر کی غلطی کر جائے تو ذرا ذرا سے بچے وہیں غلطی پکڑ لیں گے، دُنیا کا کوئی مذہب اپنی مذہبی کتاب کے متعلق اس کی مثال تو کیا اس کا دسواں حصہ بھی پیش نہیں کر سکتا، بہت سے مذاہب کی کتابوں میں تو آج یہ پتہ چلانا بھی مشکل ہو گیا ہے کہ اس کی اصل کس زبان میں آئی تھی، اور اس کے کتنے اجزاء تھے۔

کتاب کی صورت میں بھی ہر قرن، ہر زمانے میں جتنی اشاعت قرآن کی ہوئی شاید دُنیا کی کسی کتاب کو یہ بات نصیب نہیں، حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کی تعداد دُنیا میں بہ نسبت منکرین اور کافروں کے بہت کم رہی، اور ذرائع نشر و اشاعت بھی جتنے غیر مسلموں کو حاصل رہے ہیں مسلمانوں کو اس کا کوئی معتد بہ حصہ نصیب نہ تھا، مگر ان باتوں کے باوجود کسی قوم کسی مذہب کی کوئی کتاب دُنیا میں اتنی شائع نہیں ہوئی جتنا قرآن شائع ہوا۔

پھر قرآن کی حفاظت کو اللہ تعالیٰ نے صرف کتابوں اور صحیفوں پر موقوف نہیں رکھا، جن کے جل جانے اور مٹو ہو جانے کا امکان ہو، بلکہ اپنے بندوں کے سینوں میں بھی محفوظ کر دیا، اگر آج ساری دُنیا کے قرآن (معاذ اللہ) نابود کر دیئے جائیں، تو اللہ کی یہ کتاب پھر بھی اسی طرح محفوظ رہے گی، چند حافظ مل کر بیٹھ جائیں تو چند گھنٹوں میں پھر ساری کی ساری لکھی جاسکتی ہے، یہ بے نظیر حفاظت بھی صرف قرآن ہی کا خاصہ اور اس کے کلامِ الہی ہونے کا نمایاں ثبوت ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات ہمیشہ باقی رہنے والی ہے اس پر کسی مخلوق کا تصرف نہیں چل سکتا، اسی طرح اس کا کلام بھی ہمیشہ تمام مخلوقات کی دستبرد اور تصرفات سے بالاتر ہو کر ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گا، قرآن کی یہ پیشین گوئی چودہ سو برس تک مشاہدہ میں آچکی ہے، اور تا قیامت ان شاء اللہ تعالیٰ آتی رہے گی، اس کھلے معجزے کے بعد قرآن کے کلامِ الہی ہونے میں کیا کسی کو شک و شبہ کی گنجائش رہ سکتی ہے۔

دسویں وجہ

وہ علوم و معارف ہیں جن کا احاطہ نہ آج تک کسی کتاب نے کیا ہے، نہ آئندہ امکان ہے کہ اتنے مختصر حجم اور محدود

کلمات میں اتنے علوم و فنون جمع کئے جاسکیں جو تمام کائنات کی دائمی ضروریات کو حاوی اور انسان کی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر حال سے متعلق پورا مرتب اور بہترین نظام پیش کر سکے، شخصی پھر عائلی زندگی سے لے کر قبائلی اور شہری زندگی تک، اور پھر عمرانیات و اجتماعیات اور سیاست ممالک کے ہر پہلو پر حاوی نظام پیش کر دے۔

پھر صرف نظری اور علمی طور پر نظام پیش کرنا ہی نہیں عملی طور پر اس کا رواج پانا اور تمام نظام ہائے دنیا پر غالب آکر قوموں کے مزاج، اخلاق، اعمال، معاشرت اور تمدن میں وہ انقلاب عظیم پیدا کرنا جس کی نظیر نہ قرونِ اولیٰ میں مل سکتی ہے نہ قرونِ مابعد میں، یہ حیرت انگیز انقلاب کیا کسی انسان کی قدرت اور اس کی حکمتِ عملی کا نتیجہ ہو سکتا ہے؟ خصوصاً جبکہ وہ انسان بھی اُمتی اور اس کی قوم بھی اُمتی ہو۔

مخدرات سرا پر دہائے قرآنی

چہ دلبرند کہ دل می برند پنهانی^[۱]

یہی وہ محیر العقول تاثیرات ہیں کہ جن کی وجہ سے قرآن کو کلامِ الہی ماننے پر ہر وہ شخص مجبور ہے جس کی عقل و بصیرت کو تعصب و عناد نے بالکل ہی برباد نہ کر دیا ہو۔

یہاں تک کہ اس دورِ مادہ پرستی کے مسیحی مصنفین جنہوں نے کچھ بھی قرآن میں غور و فکر سے کام لیا، اس اقرار پر مجبور ہو گئے کہ یہ ایک بے مثل و بے نظیر کتاب ہے۔

فرانس کا مشہور مستشرق ڈاکٹر مارڈریس جس کو حکومتِ فرانس کی وزارتِ معارف نے قرآنِ حکیم کی باسٹھ سورتوں کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کرنے پر مامور کیا تھا، اس نے اعتراف کیا ہے، جس کا اُردو ترجمہ یہ ہے:-

”بے شک قرآن کا طرزِ بیان خالقِ جل و علا کا طرزِ بیان ہے، بلاشبہ جن حقائق و معارف پر یہ کلام حاوی ہے وہ ایک کلامِ الہی ہی ہو سکتا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اس میں شک و شبہ کرنے والے بھی جب اس کی تاثیر عظیم کو دیکھتے ہیں تو تسلیم و اعتراف پر مجبور ہوتے ہیں، پچاس کروڑ مسلمان جو سطحِ زمین کے ہر حصے پر پھیلے ہوئے ہیں اُن میں قرآن کی خاص تاثیر کو دیکھ کر مسیحی مشن میں کام کرنے والے بالا جماع اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں کیا جاسکتا کہ جس مسلمان نے اسلام اور قرآن کو سمجھ لیا وہ کبھی مرتد ہو یا قرآن کا منکر ہو گیا ہو۔“

مسلمانوں میں تاثیرِ قرآنی کا یہ اعتراف اس مسیحی مستشرق سے ایک ایسے دور میں ہو رہا ہے جبکہ خود مسلمان اسلام اور قرآن سے بیگانہ، اس کی تعلیمات سے دُور، اس کی تلاوت سے غافل ہو چکے ہیں، کاش! یہ مصنفِ اسلام اور قرآن کے

اُس دور کو دیکھتا جبکہ مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں قرآن کا عمل تھا اور ان کی زبانوں پر قرآن کی آیات تھیں۔

اسی طرح دوسرے مسیحی مصنفین نے بھی جو منصف مزاج ہیں اسی قسم کے اعتراف کئے ہیں، مسٹر ولیم میور نے اپنی کتاب ”حیات محمد“ میں واضح طور پر اس کا اعتراف کیا ہے، اور ڈاکٹر شبلی شملیل نے اس پر ایک مستقل مقالہ لکھا ہے۔

قرآن کے کلامِ الہی اور معجزہ نبوی ہونے پر دس وجوہ آپ سُن چکے ہیں، آخر میں ایک اجمالی نظر اس پر ڈالئے کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پیدائشی یتیم ہو کر دنیا میں تشریف لائے ہیں، عمر بھر کسی مکتب میں قدم نہیں رکھتے، قلم اور کتاب کو ہاتھ نہیں لگاتے، اپنا نام بھی خود نہیں لکھ سکتے، اسی میں جوان ہوتے ہیں، آپ کی طبیعت عزلت پسند ہے، کسی کھیل، تماشے، جلسوں ہنگاموں میں جانے کے بھی عادی نہیں، شعر و سخن سے بھی مناسبت نہیں، کسی قومی اجتماع میں کبھی کوئی خطبہ دینے یا تقریر کرنے کا بھی عمر بھر اتفاق نہیں ہوتا، چالیس سال ہونے کے بعد جبکہ ادھیڑ عمر میں پہنچ جاتے ہیں، اور عادت کسی علم کے سیکھنے سکھانے کا وقت ختم ہو جاتا ہے، اُس وقت آپ کی زبان مبارک پر ایک ایسا محیر العقول، جامع حقائق فصاحت و بلاغت میں اعجاز نما کلام آنے لگتا ہے، جو کسی بڑے سے بڑے عالم، ماہر اور فصیح و بلیغ سے بھی ممکن نہیں جس کے ذریعہ آپ عرب کے بڑے بڑے فصحاء و بلغاء کو خطاب فرماتے ہیں، ان کے جلسوں میں پہنچ کر خطبہ دیتے ہیں، اور پوری دنیا کے لئے عموماً، عرب کے لئے خصوصاً یہ چیلنج سناتے ہیں کہ کوئی اس کے کلامِ الہی ہونے میں شبہ کرے تو اس کے کسی چھوٹے سے حصے کی مثال بنا کر دکھلا دے، اس پر پوری قوم مثال پیش کرنے سے عاجز ہو جاتی ہے۔

پوری قوم جو آپ کو پہلے ”امین“ کے لقب سے پکارتی اور تعظیم کرتی تھی، آپ کی مخالف ہو جاتی ہے، اس کلام کی تبلیغ سے باز رکھنے کے لئے دولت، حکومت، اور ہر انسانی خواہش کی چیزیں پیش کرتی ہے، آپ ان میں سے کسی چیز کو قبول نہیں کرتے، پوری قوم آپ کو اور آپ کے رفقاء کو ستانے، ظلم کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے، آپ یہ سب کچھ برداشت کرتے ہیں، مگر اس کلام کی تبلیغ نہیں چھوڑتے، قوم آپ کے قتل کی سازشیں کرتی ہے، جنگ و جدل پر آمادہ ہو جاتی ہے، آپ کو اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ جانا پڑتا ہے، آپ کی قوم آپ کو وہاں بھی سکون سے نہیں بیٹھنے دیتی۔

سارا عرب اور اہل کتاب آپ کی مخالفت پر جمع ہو جاتے ہیں، آئے دن مدینہ پر حملے ہوتے ہیں، آپ کے مخالفین یہ سب کچھ کرتے ہیں، مگر قرآن کے چیلنج کو قبول کر کے ایک چھوٹی سی سورت قرآن کی مثل بنا کر پیش نہیں کرتے، قرآن ان کو غیرت دلاتا ہے، اس پر بھی ان کی رگ حمیت میں حرکت نہیں ہوتی۔

صرف یہی نہیں کہ پورا عرب قرآن کی مثال پیش کرنے سے عاجز رہا، بلکہ خود وہ ذاتِ اقدس جس پر یہ قرآن نازل ہوا، وہ بھی اس کی مثال اپنی طرف سے پیش نہیں کر سکتے، ان کا سارا کلام یعنی ”حدیث“ جس طرح کا ہے قرآن کا کلام یقیناً اس سے ممتاز ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے :-

قَالَ الَّذِينَ لَا يَدْرُونَ لِقَاءَ نَارٍ بَعُثْنَا غَيْرَ هَذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۖ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ (يونس: ۱۵)

”جو لوگ آخرت میں ہمارے سامنے آنے کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اسی جیسا ایک اور قرآن بنا دیجئے یا اس کو بدل دیجئے، تو آپ فرما دیجئے کہ میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس کو بدل ڈالوں۔“

ایک طرف تو قرآن کے یہ کھلے کھلے معجزات ہیں جو اس کے کلام الہی ہونے پر شاہد ہیں، دوسری طرف اس کے مضامین و مضمرات اور حقائق و معارف پر نظر ڈالئے تو وہ اس سے زیادہ محو حیرت بنا دینے والی چیز ہے۔

نزول قرآن کے ابتدائی دور کے چند سال تو اس حالت میں گزرے کہ قرآنی تعلیمات کو کھلے طور پر پیش کرنا بھی ممکن نہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خفیہ طور پر لوگوں کو اصول قرآنی کی طرف دعوت دیتے تھے، پھر بے شمار مزاحمتوں اور مخالفتوں کے نرغہ میں کچھ علانیہ دعوت بھی شروع کی جاتی ہے، مگر قرآن کریم کے مجوزہ قانون کی تنفیذ کا کوئی امکان نہ تھا۔

ہجرت مدینہ کے بعد صرف دس سال ایسے ملے جن کو مسلمانوں کے لئے آزادی کا زمانہ کہا جاسکتا ہے، جس میں قرآنی نظام کی مکمل تعلیم اور تنفیذ کی کوشش اور کوئی تعمیری کام کیا جاسکتا تھا۔

لیکن اُن دس سال میں بھی آپ تاریخ اسلام پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ابتدائی چھ سال دشمنوں کے نرغہ اور منافقین اور یہود مدینہ کی سازشوں سے کس کو فرصت تھی کہ کوئی تعمیری کام اور ایسا نظام جو ساری دنیا کے نظاموں سے مختلف ہے، عملی طور پر نافذ کر سکے، مسلمانوں کے خلاف سب بڑے بڑے معرکے انہیں چھ سال کے اندر پیش آئے، غزوہ بدر، احد، احزاب وغیرہ سب اسی مدت کے اندر ہوئے، ہجرت کے چھٹے سال دس سال کے لئے حدیبیہ کا صلح نامہ لکھا گیا اور صرف ایک سال اس معاہدہ پر قریش عرب قائم رہے، اس کے بعد انہوں نے اس کو بھی توڑ ڈالا، اور پھر جنگ و جہاد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ظاہر اسباب میں صرف یہ ایک دو سال ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کام کے لئے ملے کہ قرآن کی دعوت کو عام کر سکیں، اور اس کے نظام کو نافذ کرنے کی کوشش کر سکیں، اسی عرصہ میں آپ نے بڑے بڑے سلاطین دنیا کو خطوط لکھے، قرآن کی دعوت اُن کو پہنچائی، قرآنی نظام کو قائم کرنے، پھیلانے کی سعی فرمائی، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر عمر مبارک تک اس آزادی کے صرف چار سال ہوتے ہیں جن میں فتح مکہ کا جہاد بھی پیش آیا اور مکہ مکرمہ فتح ہوا۔

اب اس چار سال کی قلیل مدت کو دیکھئے، اور قرآن کے اس نفوذ و اثر پر نظر ڈالئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تقریباً پورے جزیرۃ العرب پر قرآن کی حکومت تھی، ایک طرف سرحد روم تک اور دوسری طرف عراق تک،

تیسری طرف عدن تک پہنچ چکی تھی۔

اگر اس سے بھی قطع نظر کر لی جائے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُمی تھے، اس کو بھی نظر انداز کیا جائے کہ آپ کی قوم ایک ایسی قوم تھی کہ جس نے کبھی کسی بادشاہ کی اطاعت قبول نہ کی تھی، اس کو بھی بھول جائیے کہ ساری دُنیا آپ کے خلاف تھی، اور مشرکین عرب، یہود و نصاریٰ سب کے سب مل کر آپ کو اور قرآن کو دُنیا سے مٹانے پر تلے ہوئے تھے، بالکل سازگار فضا مان لیجئے تو بھی ایک نئے نظام، نئے قانون اور نئے اُصول کی پہلے تو تدوین و ترتیب، پھر اس کی تعلیم و تفہیم، پھر اس کی عملی تنفیذ اور اس کے ذریعہ ایک پاکباز معاشرہ، اور ملک بھر میں امن و سکون پیدا کرنے کے لئے کتنی مدت، کتنا سرمایہ، کتنے آدمی درکار ہیں، اور کیا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کو حاصل تھے؟ آج کے نظاموں کو سامنے رکھ کر حساب لگائیے تو ایک اندھے کی بھی آنکھیں کھل جائیں گی کہ یہ نفوذ و اثر، یہ رُوحانی تاثیر بجز خاص قدرتِ الہیہ کے کسی طرح ظاہر نہیں ہو سکتی۔

اعجازِ قرآنی کے پورے وجوہ اور اُن کی تفصیلات کا بیان ایک نہایت طویل بحث ہے، علمائے اُمت نے اس پر بیسیوں مستقل کتابیں ہر زمانے میں مختلف زبانوں میں تصنیف فرمائی ہیں۔

سب سے پہلے تیسری صدی ہجری میں جاحظؒ نے ”نظم القرآن“ کے نام سے مستقل کتاب لکھی، پھر چوتھی صدی کے اوائل میں ابو عبد اللہ واسطیؒ نے بنام ”اعجاز القرآن“ ایک کتاب تصنیف کی، پھر اسی صدی میں ابن عسّی ربانیؒ نے ایک مختصر رسالہ بنام ”اعجاز القرآن“ لکھا، قاضی ابوبکر باقلانیؒ نے پانچویں صدی کے اوائل میں ”اعجاز القرآن“ کے نام سے ایک مفصل و مبسوط کتاب لکھی، علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے ”اتقان“ اور ”خصائص کبریٰ“ میں، امام رازیؒ نے ”تفسیر کبیر“ میں، قاضی عیاضؒ نے ”شفاء“ میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ اس مضمون کی تفصیل لکھی، آخری دور میں مصطفیٰ صادق رافعی مرحوم نے ”اعجاز القرآن“ کے نام سے اور جناب سید رشید رضا مصریؒ نے ”الوحی المجدی“ کے نام سے مستقل، جامع اور مبسوط کتابیں لکھیں، اُردو زبان میں اُستاد محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے ایک رسالہ بنام ”اعجاز القرآن“ تصنیف فرمایا۔

یہ بھی قرآن مجید کی خصوصیات میں سے ہے کہ اس کے ایک ایک مسئلہ پر مکمل تفسیروں کے علاوہ مستقل رسائل و کتابیں اتنی لکھی گئی ہیں کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

عرض کرنا یہ ہے کہ یہ مضمون اپنی پوری تفصیل کے ساتھ تو اس جگہ بیان نہیں ہو سکتا، لیکن جتنا بیان ہو چکا ہے، وہ بھی ایک منصف مزاج انسان کو اس پر مجبور کر دینے کے لئے کافی ہے کہ قرآن کو اللہ تعالیٰ کا کلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم الشان معجزہ تسلیم کر لے۔

چند شبہات اور جوابات

بعض لوگوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ بہت ممکن ہے کہ قرآن کے مقابلہ میں کتابیں اور مقالات لکھے گئے مگر وہ محفوظ نہ رہے ہوں۔

لیکن اگر ذرا بھی انصاف سے کام لیا جائے تو اس احتمال کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، کیونکہ دنیا جانتی ہے کہ جب سے قرآن نازل ہوا، پوری دنیا میں قرآن کے ماننے والے کم اور منکرین زیادہ رہے ہیں، اور یہ بھی معلوم ہے کہ ذرائع نشر و اشاعت جتنے منکرین قرآن کو حاصل رہے ہیں قرآن کے ماننے والوں کو اکثر قرون میں اس کا کوئی قابل ذکر حصہ حاصل نہیں رہا۔ قرآن اتنا بلند و بانگ دعویٰ اپنے مخالفین کے سامنے کرتا ہے، اُن کو چیلنج دیتا ہے، غیر تیس دلاتا ہے، اور مخالفین اسلام اس کے مقابلہ میں جان، مال اور اولاد سب کچھ قربان کرنے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں، اگر انہوں نے قرآن کا چیلنج قبول کر کے کوئی چیز مقابلہ کے لئے پیش کی ہوتی تو کیسے ممکن تھا کہ وہ ساری دنیا میں شائع نہ ہوتی، اور ہر زمانے میں منکرین قرآن مسلمانوں کے مقابلے میں اس کو پیش نہ کرتے، اور مسلمانوں کی طرف سے اس پر جرح و قدح میں سینکڑوں کتابیں نہ لکھی گئی ہوتیں۔

اسلام کے قرنِ اول میں صرف ایک واقعہ مسیلمہ کذاب یمامی کا پیش آیا کہ اس نے کچھ چند بے حیائی کے اُلٹے سیدھے کلمات لکھ کر یہ کہا تھا کہ یہ وحی آسمانی قرآن کی مثل ہے، مگر دنیا جانتی ہے کہ اُن کلمات کا کیا حشر ہوا، خود اس کی قوم نے اس کے منہ پر مار دیئے۔ وہ کلمات ایسے شرمناک، غیر مہذب تھے کہ کسی مہذب سوسائٹی میں ان کو بیان بھی نہیں کیا جاسکتا، اور بہر حال جیسے بھی تھے وہ آج تک کتابوں میں نقل ہوتے چلے آئے ہیں، اگر کسی اور شخص نے کوئی اچھا کلام قرآن کے مقابلہ میں پیش کیا ہوتا، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ دنیا کی تاریخ اس کو یکسر بھلا دیتی، اور منکرین قرآن اس کو ہر قیمت پر باقی رکھنے کی کوشش نہ کرتے۔

وہ لوگ جو قرآن کے مقابلہ پر ہر وقت سینہ سپر تھے، قرآن کے اس چیلنج کے جواب میں انہوں نے طرح طرح کی باتیں کیں جن کو قرآن میں نقل کر کے جواب دیا گیا، مگر اس کا ایک واقعہ نہیں کہ کوئی کلام مقابلہ پر پیش کر کے اس کے قرآن کا مثل ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہو۔ ایک رومی غلام جو مدینہ میں لوہار کا کام کیا کرتا تھا اور کچھ توراۃ و انجیل پڑھا ہوا تھا، کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا تھا، عرب کے کچھ جاہلوں نے تعصب و عناد سے یہ مشہور کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ قرآنی مضامین اس نے سکھائے ہیں، قرآن نے اُن کا یہ اعتراف نقل کر کے خود جواب دیا کہ جس شخص کی طرف سکھانے کی نسبت کرتے ہیں وہ تو خود عجمی ہے، عربی زبان کی بلاغت کو کیا جانے، اور یہ قرآن عربی کی انتہائی بلیغ کتاب ہے، سورہ

نحل کی آیت نمبر: ۱۰۳ دیکھئے:-

لِسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَبِي وَهَذَا السَّانُ عَرَبِيٌّ مُبِينٌ ﴿۱۰۳﴾ (النحل)

”(ہم جانتے ہیں کہ یہ مخالفین اسلام یہ کہتے ہیں کہ آپ کو یہ قرآن ایک آدمی سکھاتا ہے، حالانکہ وہ جس آدمی کی طرف نسبت کرتے ہیں وہ عجیبی ہے، اور قرآن ایک بلیغ عربی زبان میں ہے۔“
کچھ لوگوں نے قرآن کی تحدی کے جواب میں یہ کہا کہ:-

لَوْ شَاءَ لَقُلْنَا مِثْلَ هَذَا^۱ (الانفال: ۳۱) ”اگر ہم چاہتے تو ہم بھی قرآن کے مثل کلام کہہ دیتے۔“

لیکن کوئی ان سے پوچھے کہ پھر چاہا کیوں نہیں؟ قرآن کے مقابلہ کے لئے سارا ایڑی چوٹی کا زور تو خرچ کیا، جان و مال کی قربانی دی، اگر تمہیں اس کا مثل کلام لکھنے یا کہنے کی قدرت تھی تو قرآن کی اس تحدی کے بعد تم نے اس کی مثل کلام بنا کر فتح کا سہرا اپنے سر کیوں نہ لیا؟

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کے اس دعوے کے بعد مخالفین نے کچھ شریفانہ سکوت نہیں کر لیا بلکہ جو کچھ اُن کے منہ پر آیا اس کے مقابلہ پر کہتے رہے، لیکن یہ پھر بھی کسی نے نہ کہا کہ ہم میں سے فلاں آدمی نے قرآن جیسا فلاں کلام لکھا ہے اس لئے قرآن کا یہ دعویٰ یکتائی (معاذ اللہ) غلط ہے۔

بعض معاندین کو یہ سوجھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو قبل از نبوت چند روز کے لئے ملک شام تشریف لے گئے، اور راستے میں بحیراء راہب سے ملاقات ہوئی، وہ توراۃ کا ماہر تھا، اس سے آپ نے علوم سیکھے۔ مگر کوئی ان سے پوچھے کہ ایک دن کی ایک ملاقات میں اس سے یہ سارے علوم و معارف فصاحت و بلاغت کا اعجاز، اخلاقی تربیت، نظام خانگی، نظام مملکت کیسے سیکھ لئے۔

آج کل کے بعض معترضین نے کہا کہ کسی کلام کی مثل نہ بنایا جانا اس کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ خدا کا کلام یا معجزہ ہے، ہو سکتا ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کا ماہر بلاغت کوئی نثر یا نظم ایسی لکھے کہ دوسرے آدمی اس کی نظیر نہ لاسکیں۔

سعدی شیرازی کی گلستان، فیضی کی تفسیر بے نقط کو عام طور پر بے مثل و بے نظیر کتابیں کہا جاتا ہے، تو کیا وہ بھی معجزہ ہیں؟

لیکن اگر ذرا غور کریں تو انہیں معلوم ہوگا کہ سعدی اور فیضی کے پاس سامانِ تعلیم و تالیف کس قدر موجود تھا، کتنے عرصہ تک انہوں نے تعلیم حاصل کی، برسوں مدرسوں میں پڑے رہے، راتوں جاگے، مدتوں محنتیں کیں، بڑے بڑے علماء کے سامنے زانوئے ادب طے کئے، سالہا سال کی محنتوں اور دماغ سوزیوں کے نتیجے میں اگر بالفرض فیضی یا حریری یا متنبی یا کوئی اور عربی زبان میں اور سعدی فارسی میں اور ملٹن انگریزی میں، یا ہومر یونانی میں، یا کالی داس سنسکرت میں ایسے ہوئے

ہیں کہ ان کا کلام دوسروں کے کلام سے فائق ہو گیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

معجزہ کی تعریف تو یہ ہے کہ وہ اسباب متعارفہ کے توسط کے بغیر وجود میں آئے، کیا ان لوگوں کی باقاعدہ تحصیل علوم، اُستادوں کے ساتھ طویل ملازمت و صحبت، وسیع مطالعہ، مدتوں کی مشاقی، ان کی علمی مہارت کے کھلے ہوئے اسباب نہیں ہیں؟ اگر ان کے کلام دوسروں سے ممتاز ہوں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ جس نے کبھی کتاب و قلم کو ہاتھ نہ لگایا ہو، کسی مدرسہ و مکتب میں قدم نہ رکھا ہو، وہ ایسی کتاب دُنیا کے سامنے پیش کرے کہ ہزاروں سعدی اور لاکھوں فیضی اس پر قربان ہو جائے کو اپنا سرمایہ فخر سمجھیں، اور ان کو جو کچھ علم و حکمت حاصل ہوئے اس کو بھی آپ ہی کے فیضِ تعلیم کا اثر قرار دیں، اس کے علاوہ سعدی اور فیضی کے کلام کا مثل پیش کرنے کی کسی کو ضرورت بھی کیا تھی؟ کیا انہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا، اور اپنے کلام کے بے مثل و بے نظیر ہونے کو اپنا معجزہ کہا تھا، اور دُنیا کو اس کا چیلنج دیا تھا کہ ہمارے کلام کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی، جس کے نتیجہ میں لوگ اس کا مقابلہ کرنے اور مثال پیش کرنے کے لئے مجبور ہوتے۔

پھر قرآن کی صرف فصاحت و بلاغت اور نظم و ترتیب ہی بے مثال نہیں، لوگوں کے دل و دماغ پر اس کی تاثیرات عجیبہ اس سے زیادہ بے مثال اور حیرت انگیز ہیں، جن کی وجہ سے قوموں کے مزاج بدل گئے، انسانی اخلاق میں ایک کا یا پلٹ ہو گئی، عرب کے تند خو، گنوار، حلم و اخلاق اور علم و حکمت کے اُستاد مانے گئے، ان حیرت انگیز انقلابی تاثیرات کا اقرار صرف مسلمان نہیں موجودہ زمانے کے سینکڑوں غیر مسلموں نے بھی کیا ہے، یورپ کے مستشرقین کے مقالات اس بارے میں جمع کئے جائیں تو ایک مستقل کتاب ہو جائے، اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بنام ”شہادۃ الاقوام علی صدق الاسلام“ تحریر فرمائی ہے۔ اس جگہ چند حوالے نقل کئے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر گستاوی بان نے اپنی کتاب ”تمدنِ عرب“ میں صفائی سے اس حیرت انگیزی کا اعتراف کیا، اُن کے الفاظ کا ترجمہ اردو میں یہ ہے:-

”اس پیغمبرِ اسلام اس نبی اُمی کی بھی ایک حیرت انگیز سرگزشت ہے، جس کی آواز نے ایک قوم ناہنجار کو جو اُس وقت تک کسی ملک گیر کے زیرِ حکومت نہ آئی تھی، رام کیا، اور اس درجہ پر پہنچا دیا کہ اس نے عالم کی بڑی بڑی سلطنتوں کو زیر و زبر کر ڈالا، اور اس وقت بھی وہی نبی اُمی اپنی قبر کے اندر سے لاکھوں بندگانِ خدا کو کلمہ اسلام پر قائم رکھے ہوئے ہے۔“

مسٹر وڈول جس نے قرآن مجید کا ترجمہ اپنی زبان میں کیا ہے، لکھتا ہے کہ:-

”جتنا بھی ہم اس کتاب (یعنی قرآن) کو اُلٹ پلٹ کر دیکھیں اُسی قدر پہلے مطالعہ میں اس کی

نامرغوبی نئے نئے پہلوؤں سے اپنا رنگ جماتی ہے، لیکن فوراً ہمیں مسخر کر لیتی ہے، متحیر بنا دیتی ہے، اور آخر میں ہم سے تعظیم کرا کر چھوڑتی ہے، اس کا طرز بیان باعتبار اس کے مضامین و اغراض کے، عقیف، عالی شان اور تہدید آمیز ہے، اور جا بجا اس کے مضامین سخن کی غایت رفعت تک پہنچ جاتے ہیں۔ غرض یہ کتاب ہر زمانہ میں اپنا پُر زور اثر دکھاتی رہے گی۔“ (شہادۃ الاقوام ص: ۱۳)

مصر کے مشہور مصنف احمد فتحی بک زاغلول نے ۱۸۹۸ء میں مسٹر کونٹ ہنروی کی کتاب ”الاسلام“ کا ترجمہ عربی میں شائع کیا تھا، اصل کتاب فرنج زبان میں تھی، اس میں مسٹر کونٹ نے قرآن کے متعلق اپنے تاثرات ان الفاظ میں ظاہر کئے ہیں:-

”عقل حیران ہے کہ اس قسم کا کلام ایسے شخص کی زبان سے کیونکر ادا ہو جو بالکل اُمی تھا، تمام مشرق نے اقرار کر لیا ہے کہ نوع انسانی لفظاً و معنی ہر لحاظ سے اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، یہ وہ کلام ہے جس کی بلند انشا پر دازی نے عمر بن خطاب کو مطمئن کر دیا، اُن کو خدا کا معترف ہونا پڑا، یہ وہی کلام ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے متعلق اس کے جملے جعفر بن ابی طالب نے حبشہ کے بادشاہ کے دربار میں پڑھے تو اس کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے، اور بپ چلا اٹھا کہ یہ کلام اُسی سرچشمہ سے نکلا ہے جس سے عیسیٰ علیہ السلام کا کلام نکلا تھا۔“ (شہادۃ الاقوام ص: ۱۴)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد: ۱۶ ص: ۵۹۹ میں ہے:-

”قرآن کے مختلف حصص کے مطالب ایک دوسرے سے بالکل متفاوت ہیں، بہت سی آیات دینی و اخلاقی خیالات پر مشتمل ہیں، مظاہر قدرت، تاریخ، الہامات انبیاء کے ذریعے اس میں خدا کی عظمت، مہربانی اور صداقت کی یاد دلائی گئی ہے، بالخصوص حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واسطے سے خدا کو واحد اور قادر مطلق ظاہر کیا گیا ہے، بت پرستی اور مخلوق پرستی کو بلا لحاظ ناجائز قرار دیا گیا ہے، قرآن کی نسبت یہ بالکل بجا کہا جاتا ہے کہ وہ دُنیا بھر کی موجودہ کتابوں میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔“

انگلستان کے نامور مؤرخ ڈاکٹر گبن اپنی مشہور تصنیف (سلطنتِ روما کا انحطاط و زوال) کی جلد ۵ باب ۵۰ میں لکھتے ہیں:-

”قرآن کی نسبت بحر اٹلانٹک سے لے کر دریائے گنگا تک نے مان لیا ہے کہ یہ پارلیمنٹ کی رُوح ہے، قانون اساسی ہے، اور صرف اصولِ مذہب ہی کے لئے نہیں، بلکہ احکام تعزیرات کے لئے اور قوانین کے لئے بھی ہے جن پر نظام کا مدار ہے، جن سے نوع انسان کی زندگی وابستہ ہے، جن کو

حیاتِ انسانی کی ترتیب و تنسيق سے گہرا تعلق ہے، حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شریعت سب پر حاوی ہے، یہ شریعت ایسے دانش مندانہ اصول اور اس قسم کے قانونی انداز پر مرتب ہوئی ہے کہ سارے جہان میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔“

اس جگہ مستشرقین یورپ کے اقوال و اعترافات کا استیعاب کرنا نہیں کہ اس کی گنجائش نہیں، نمونہ کے طور پر چند اقوال نقل کئے گئے ہیں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ باعتبار فصاحت و بلاغت کے اور باعتبار اغراض و مقاصد کے اور باعتبار علوم و معارف کے قرآن کے بے نظیر و بے مثل ہونے کا اقرار صرف مسلمانوں نے نہیں، ہر زمانہ کے منصف مزاج غیر مسلموں نے بھی کیا ہے۔

قرآن نے ساری دنیا کو اپنی مثال لانے کا چیلنج دیا تھا اور کوئی نہ لاسکا، آج بھی ہر مسلمان دنیا کے ماہرینِ علم و سیاست کو چیلنج کر کے کہہ سکتا ہے کہ پوری دنیا کی تاریخ میں ایک واقعہ ایسا دکھلا دے کہ ایک بڑے سے بڑا ماہرِ حکیم فیلسوف کھڑا ہو اور ساری دنیا کے عقائد و نظریات اور رسوم و عادات کے خلاف ایک نیا نظام پیش کرے، اور اس کی قوم بھی اتنی جاہل گنوار ہو، پھر وہ اتنے قلیل عرصہ میں اس کی تعلیم کو بھی عام کر دے اور عملی تنفیذ کو بھی اس حد پر پہنچا دے کہ اس کی نظیر آج کے مضبوط و مستحکم نظاموں میں ملنا ناممکن ہے۔

دنیا کی پہلی تاریخ میں اگر اس کی کوئی نظیر نہیں تو آج تو بڑی روشنی، روشن خیالی، بڑی تیز رفتاری کا زمانہ ہے، آج کوئی کر کے دکھلا دے، اکیلا کوئی نہ کر سکے تو اپنی قوم کو بلکہ دنیا کی ساری اقوام کو جمع کر کے اس کی مثال پیدا کر دے۔

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أَعَدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴿۲۲﴾

”اگر تم اس کی مثال نہ لاسکے اور ہرگز نہ لاسکو گے تو پھر اس جہنم کی آگ سے ڈرو، جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، جو منکروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔“

وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا

اور خوش خبری دے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے کہ اُن کے واسطے باغ ہیں کہ بہتی ہیں ان کے نیچے

الْأَنْهَارُ ۖ كُلًّا رِزْقًا مِمَّا فِي شُرَاطِئِ رِزْقًا قَالُوا هَذَا الَّذِي رَزَقْنَا

نہیں، جب ملے گا ان کو وہاں کا کوئی پھل کھانے کو تو کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ملا تھا ہم کو

مِنْ قَبْلُ ۚ وَآتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا ۖ وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۖ

اس سے پہلے اور دیئے جائیں گے اُن کو پھل ایک صورت کے اور ان کے لئے وہاں عورتیں ہوں گی پاکیزہ

وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۵﴾

اور وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے۔

آسان ترجمہ قرآن

اور جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور انہوں نے نیک عمل کئے ہیں، ان کو خوشخبری دے دو کہ ان کے لئے ایسے باغات (تیار) ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جب کبھی ان کو ان (باغات) میں سے کوئی پھل رزق کے طور پر دیا جائے گا، تو وہ کہیں گے ”یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے بھی دیا گیا تھا“ اور انہیں وہ رزق ایسا ہی دیا جائے گا جو دیکھنے میں ملتا جلتا ہوگا، اور اُن کے لئے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی، اور وہ ان (باغات) میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے ﴿۲۵﴾

خلاصہ تفسیر

اور خوش خبری سنا دیجئے آپ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور کام کئے اچھے اس بات کی کہ بے شک ان کے واسطے بہشتیں ہیں کہ چلتی ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں جب کبھی دیئے جاویں گے وہ لوگ ان بہشتوں میں سے کسی پھل کی غذا تو ہر بار یہی کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہم کو ملتا تھا اس سے پہلے اور ملے گا بھی اُن کو دونوں بار کا پھل ملتا جلتا اور ان کے واسطے ان بہشتوں میں بیبیاں ہوں گی صاف پاک کی ہوئی اور وہ لوگ ان بہشتوں میں ہمیشہ کو بسنے والے ہوں گے (ہر بار میں ملتا جلتا پھل ملنا لطف کے واسطے ہوگا کہ دونوں مرتبہ پھلوں کی صورت ایک سی ہوگی، جس سے وہ سمجھیں گے کہ یہ پہلی ہی قسم کا پھل ہے، مگر کھانے میں مزہ دُوسرا ہوگا جس سے حظ و سرور بڑھے گا)۔

رابط آیات

اس سے پہلی آیت میں قرآن کریم کو نہ ماننے والوں کے عذاب کا بیان تھا، اس آیت میں ماننے والوں کے لئے بشارت اور خوشخبری مذکور ہے جس میں جنت کے عجیب و غریب پھلوں کا اور حور ان جنت کا ذکر ہے۔

معارج مسائل

اہل جنت کو مختلف پھل ایک ہی شکل و صورت میں پیش کرنے سے مقصد بھی ایک تفریح اور لطف کا سامان بنانا ہوگا، اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ پھلوں کے متشابہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ جنت کے پھل صورت شکل میں دُنیا کے پھلوں کی طرح ہوں گے، جب اہل جنت کو ملیں گے تو کہیں گے کہ یہ تو وہی پھل ہیں جو دُنیا میں ہمیں ملا کرتے تھے، مگر ذائقہ اور لذت میں دُنیا کے پھلوں سے اُن کو کوئی نسبت نہ ہوگی، صرف نام کا اشتراک ہوگا۔

جنت میں اُن لوگوں کو پاک صاف پیماں ملنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دُنیا کی تمام ظاہری اور اخلاقی گندگیوں سے پاک ہوں گی، بول و براز، حیض و نفاس اور ہر ایسی چیز سے پاک ہوں گی جس سے انسان کو نفرت ہوتی ہے، اسی طرح کج خلقی، بیوفائی معنوی عیوب سے بھی پاک ہوں گی۔

آخر میں فرمایا کہ پھر جنت کی نعمتوں کو دُنیا کی آنی فانی نعمتوں کی طرح نہ سمجھو جن کے فنا ہو جانے یا سلب ہو جانے کا ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے، بلکہ یہ لوگ ان نعمتوں میں ہمیشہ ہمیشہ خوش و خرم رہیں گے۔

یہاں مومنین کو جنت کی بشارت دینے کے لئے ایمان کے ساتھ عمل صالح کی بھی قید لگائی ہے کہ ایمان بغیر عمل صالح کے انسان کو اس بشارت کا مستحق نہیں بناتا، اگرچہ صرف ایمان بھی جہنم میں خلود اور دوام سے بچانے کا سبب ہے، اور مومن کتنا بھی گناہگار ہو کسی نہ کسی وقت میں وہ جہنم سے نکالا جائے گا اور جنت میں پہنچے گا، مگر عذاب جہنم سے بالکل نجات کا بغیر عمل صالح کے کوئی مستحق نہیں ہوتا۔ (روح البیان، قرطبی)

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيَ أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ

بے شک اللہ شرماتا نہیں اس بات سے کہ بیان کرے کوئی مثال چھھر کی یا اس چیز کو جو اس سے بڑھ کر ہے، سو جو لوگ

أَمَّنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنََّّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ

مومن ہیں وہ یقیناً جانتے ہیں کہ یہ مثال ٹھیک ہے جو نازل ہوئی اُن کے رب کی طرف سے، اور جو کافر ہیں سو کہتے ہیں

مَا ذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا ۖ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا ۖ وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ط

کیا مطلب تھا اللہ کا اس مثال سے، گمراہ کرتا ہے خدائے تعالیٰ اس مثال سے بہتوں کو اور ہدایت کرتا ہے اس سے بہتوں کو،

وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ﴿٢٦﴾ الَّذِينَ يَتَّقُونَ عَهْدَ اللَّهِ

اور گمراہ نہیں کرتا اس مثال سے مگر بدکاروں کو۔ جو توڑتے ہیں خدا کے معاہدہ کو

مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ ۚ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ

مضبوط کرنے کے بعد اور قطع کرتے ہیں اس چیز کو جس کو اللہ نے فرمایا ملانے کو اور فساد کرتے ہیں

فِي الْأَرْضِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿٢٧﴾

ملک میں، وہی ہیں ٹوٹے والے۔

آسان ترجمہ قرآن

بیشک اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ (کسی بات کو واضح کرنے کے لئے) کوئی بھی مثال دے، چاہے وہ چھڑ (جیسی معمولی چیز) کی ہو، یا کسی ایسی چیز کی جو چھڑ سے بھی زیادہ (معمولی) ہو، اب جو لوگ مؤمن ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ مثال ایک حق بات ہے جو ان کے پروردگار کی طرف سے آئی ہے۔ البتہ جو لوگ کافر ہیں، وہ یہی کہتے ہیں کہ بھلا اس (حقیر) مثال سے اللہ کا کیا مطلب ہے؟ (اس طرح) اللہ اس مثال سے بہت سے لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کرتا ہے، اور بہت سوں کو ہدایت دیتا ہے۔ (مگر) وہ گمراہ انہی کو کرتا ہے جو نافرمان ہیں ﴿۲۶﴾ وہ جو اللہ سے کئے ہوئے عہد کو پختہ کرنے کے بعد بھی توڑ دیتے ہیں، اور جن رشتوں کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، انہیں کاٹ ڈالتے ہیں، اور زمین میں فساد مچاتے ہیں، ایسے ہی لوگ بڑا نقصان اٹھانے والے ہیں ﴿۲۷﴾

خلاصہ تفسیر

(بعض مخالفین نے قرآن کے کلام الہی ہونے پر یہ اعتراض کیا تھا کہ اس میں بہت ہی حقیر و ذلیل چیزوں کا ذکر

تمثیلات میں کیا گیا ہے، جیسے مچھر، مکھی وغیرہ، اگر یہ خدا کا کلام ہوتا تو ایسی حقیر چیزوں کا ذکر اس میں نہ ہوتا، اس کا جواب دیا گیا کہ) ہاں واقعی اللہ تعالیٰ تو نہیں شرماتے کہ بیان کر دیں کوئی مثال بھی خواہ مچھر ہو خواہ اس سے بھی بڑھی ہوئی ہو (یعنی حقیر ہونے میں مچھر سے بھی بڑھی ہوئی ہو) سو جو لوگ ایمان لائے ہوئے ہیں (خواہ کچھ ہی ہو) وہ تو یہی یقین کریں گے کہ بے شک یہ مثال بہت ہی موقع کی ہے ان کے رب کی جانب سے اور رہ گئے وہ لوگ جو کافر ہو چکے ہیں (سو چاہے کچھ ہی ہو جائے) وہ یوں ہی کہتے رہیں گے کہ وہ کونسا مطلب ہوگا جس کا قصد کیا ہوگا اللہ تعالیٰ نے اس حقیر مثال سے، گمراہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس مثال کی وجہ سے بہتوں کو اور ہدایت کرتے ہیں اس کی وجہ سے بہتوں کو، اور گمراہ نہیں کرتے اللہ تعالیٰ اس مثال سے کسی کو مگر صرف نافرمانی کرنے والوں کو جو کہ توڑتے رہتے ہیں اس معاہدہ کو جو اللہ سے کر چکے تھے اس کے استحکام کے بعد (یعنی عہدِ ازل جس میں سب کی ارواح نے اللہ تعالیٰ کے رب ہونے کا اقرار کیا تھا) اور قطع کرتے رہتے ہیں اُن تعلقات کو کہ حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو جوڑنے کا (اس میں تمام تعلقات شرعیہ داخل ہیں خواہ وہ تعلقات ہوں جو بندہ اور خدا کے درمیان ہیں، یا وہ جو اس کے اور اقرباء اور رشتہ داروں کے درمیان ہیں، اور عام اہل اسلام کے درمیان ہیں اور جو عام انسانوں کے درمیان ہیں) اور فساد کرتے رہتے ہیں زمین میں (کفر و شرک خود بھی فساد ہے اور دوسروں پر ظلم اور ناحق شناسی جو کفر کے لوازم میں سے ہے، وہ بھی اس فساد میں شامل ہے) بس یہ لوگ ہیں پورے خسارہ میں پڑنے والے (کہ دنیا کی راحت اور آخرت کی نعمت سب ہاتھ سے دے بیٹھے، کیونکہ حاسد کی دُنیوی زندگی بھی ہمیشہ تلخ ہی رہتی ہے)۔

معارف و مسائل

رابطِ آیات

چند آیات پہلے قرآن کریم کا یہ دعویٰ مذکور ہے کہ قرآن کریم میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، اور اگر کسی کو کوئی شک اس کے کلامِ الہی ہونے میں ہو تو وہ اس کی چھوٹی سی سورت کی مثل بنا کر دکھلا دے، ان آیات میں منکرین قرآن کا ایک شبہ ذکر کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے، شبہ یہ تھا کہ قرآن کریم میں مکھی اور مچھر جیسے حقیر جانوروں کا ذکر آیا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی اور اس کے کلام کی عظمت کے خلاف ہے، اگر یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہوتا تو اس میں ایسی حقیر گھناؤنی چیزوں کا ذکر نہ ہوتا، کیونکہ بڑے لوگ ایسی چیزوں کے ذکر سے شرم و حیا محسوس کرتے ہیں۔

جواب یہ دیا گیا کہ جب کسی حقیر و ذلیل چیز کی مثال دینی ہو تو کسی ایسی ہی حقیر چیز سے مثال دینا مقتضائے عقل

وبلاغت ہے، اس غرض کے لئے کسی حقیر گناہ کوئی چیز کا ذکر کرنا شرم و حیا کے قطعاً منافی نہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ ایسی چیزوں کے ذکر سے نہیں شرماتے، اور یہ بھی بتلادیا کہ ایسے احمقانہ شبہات صرف اُن لوگوں کو پیدا ہوا کرتے ہیں جن کے قلوب اور دماغوں سے اُن کے کفر کی وجہ سے سمجھنے بوجھنے کی صلاحیت مفقود ہوگئی ہو، ایمان والوں کو کبھی ایسے شبہات دامن گیر نہیں ہوتے۔

اس کے بعد اس کی ایک اور حکمت بھی بتلادی کہ ایسی مثالوں سے لوگوں کا ایک امتحان بھی ہوتا ہے، نظر و فکر کرنے والوں کے لئے یہ مثالیں ہدایت کا سامان پیدا کرتی ہیں، اور بے پروائی برتنے والوں کے لئے اور زیادہ گمراہی کا سبب بنتی ہیں، اس کے بعد یہ بھی بتلادیا کہ قرآن کریم کی ان مثالوں سے صرف ایسے سرکش لوگ گمراہ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد کو توڑتے ہیں، اور جن تعلقات و روابط کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے یہ لوگ اُن کو توڑتے ہیں، جس کا نتیجہ زمین میں فساد پھیلانا ہوتا ہے۔

بَعُوضَةً فَمَا فَوَقَهَا اس لفظ کے معنی یہ ہیں کہ چمچر ہو یا اس سے بھی زیادہ، اس جگہ ”زیادہ“ سے مراد یہ ہے کہ حقارت میں زیادہ ہو۔ (مظہری)

يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا قرآن اور اس کی مثالوں کے ذریعہ بہت سی مخلوق کو ہدایت کرنا تو ظاہر ہے، مگر اس کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو گمراہ کرنا مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ قرآن اس کے ماننے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں کے لئے ذریعہ ہدایت ہے، اسی طرح اس کا انکار کرنے والوں اور مخالفت کرنے والوں کے لئے ذریعہ گمراہی بھی ہے۔

وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ فاسقین، فسق کے لفظی معنی خروج اور باہر نکل جانے کے ہیں، اصطلاح شرع میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل جانے کو ”فسق“ کہتے ہیں، اور اطاعتِ الہیہ سے نکل جانا کفر و انکار کے ذریعہ بھی ہوتا ہے، اور عملی نافرمانی کے ذریعہ بھی، اس لئے لفظ ”فاسق“ کافر کے لئے بھی بولا جاتا ہے، قرآن کریم میں بیشتر لفظ ”فاسقین“ کافروں ہی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اور مؤمن گناہگار کو بھی ”فاسق“ کہا جاتا ہے، فقہاء کی اصطلاح میں عموماً لفظ ”فاسق“ اسی معنی کے لئے استعمال ہوا ہے، ان کی اصطلاح میں فاسق کو کافر کے بالمقابل اس کی قسم قرار دیا گیا ہے، جو شخص کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرے، اور پھر اس سے توبہ بھی نہ کرے، یا صغیرہ گناہ پر اصرار کرے، اس کی عادت بنالے، وہ فقہاء کی اصطلاح میں ”فاسق“ کہلاتا ہے (مظہری)۔ اور جو شخص یہ فسق کے کام اور گناہ علانیہ جرأت کے ساتھ کرتا پھرے اس کو ”فاجر“ کہا جاتا ہے۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ قرآن کی ان مثالوں سے بہت سے لوگوں کو ہدایت ہوتی ہے، اور بہت سے لوگوں کے حصہ میں گمراہی آتی ہے، مگر ان مثالوں سے گمراہی صرف انہی لوگوں کا حصہ ہوتا ہے جو فاسق یعنی اطاعتِ خداوندی سے نکل جانے والے ہیں، اور جن میں کچھ بھی خدا تعالیٰ کا خوف ہوتا ہے وہ تو ہدایت ہی حاصل کرتے ہیں۔

الَّذِينَ يَتَّقُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ ۚ ”عہد“ اس صورتِ معاملہ اور معاہدے کو کہا جاتا ہے جو دو شخصوں کے درمیان طے ہو جائے، اور ”ميثاق“ ایسے معاہدے کو کہتے ہیں جو قسم کے ساتھ مضبوط و مستحکم کیا جائے۔

اس آیت میں پہلی آیت کے مضمون کی مزید تشریح ہے اور منکرینِ قرآن کے انجامِ بد کا ذکر ہے کہ قرآن کی ان مثالوں سے جن پر مشرکین نے اعتراض کیا ہے صرف وہی لوگ گمراہ ہوتے ہیں جو حق تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری سے سرکشی کرتے ہیں، جس کی دو وجہ ہیں:-

اول یہ کہ ایسا کرنے والے اُس ازلی معاہدے کو توڑ ڈالتے ہیں جو تمام انسانوں نے اپنے رب سے باندھا تھا، جبکہ تمام انسانوں کی اس عالم میں پیدائش سے پہلے حق تعالیٰ نے تمام پیدا ہونے والے انسانوں کی ارواح کو جمع کر کے ایک سوال فرمایا تھا کہ: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ (الاعراف: ۱۷۲) یعنی ”کیا میں تمہارا رب اور پروردگار نہیں ہوں؟“ اُس پر سب نے یک زبان ہو کر کہا تھا: بلی، یعنی ”آپ رب کیوں نہ ہوتے“ جس میں بڑی تاکید کے ساتھ اس کا اقرار ہے کہ اللہ جل شانہ ہمارے رب اور پروردگار ہیں، اور اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ہم اس کی اطاعت سے سرِ مو تجاوز نہ کریں، اس لئے یہ عہدِ ازلی انسان اور اللہ جل شانہ کے درمیان ہو چکا، اب دُنیا میں پیدا ہونے کے بعد تمام انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں اسی عہد کی تجدید اور یاد دہانی اور اس پر عمل کی تفصیلات بتلانے کے لئے آتے ہیں، جس نے اس معاہدے ہی کو توڑ ڈالا، اس سے کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی پیغمبر یا آسمانی کتاب سے فائدہ اٹھائے؟

دوسری وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اُن تمام تعلقات کو قطع کر ڈالا ہے جن کو جوڑے رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا، ان تعلقات میں وہ تعلق بھی داخل ہے جو بندے اور اللہ کے درمیان ہے، اور وہ تعلق بھی جو انسان کا اپنے ماں باپ اور دوسرے عزیزوں سے ہے، اور وہ تعلق بھی جو ایک انسان کا اپنے پڑوسی اور دوسرے شرکائے کار کے ساتھ ہے، اور وہ تعلق بھی جو عام مسلمانوں یا عام انسانوں کے ساتھ ہے، ان تمام تعلقات کے پورے حقوق ادا کرنے ہی کا نام اسلام، یا شریعتِ اسلام ہے، اور انہی میں کوتاہی کرنے سے ساری زمین میں فساد آتا ہے، اسی لئے اس جملے کے بعد فرمایا: وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ یعنی ”یہ لوگ زمین میں فساد مچاتے ہیں“ آخر آیت میں ان کے انجامِ بد کا ذکر فرمایا کہ یہ لوگ بڑے خسارے میں ہیں۔

مثال میں کسی حقیر و ذلیل یا شرمناک چیز کا ذکر کرنا کوئی عیب نہیں ہے

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي سے ثابت ہوا کہ کسی مفید مضمون کی توضیح میں کسی حقیر، ذلیل یا شرمناک چیز کا ذکر کرنا نہ کوئی عیب و گناہ ہے، اور نہ قائل کی عظمتِ شان کے منافی ہے، قرآن و سنت اور علمائے سلف کے اقوال میں بکثرت ایسی مثالیں بھی مذکور ہیں جو عرفاً شرمناک سمجھی جاتی ہیں، مگر قرآن و سنت نے اس عرفی شرم و حیا کی پروا کئے بغیر اصل مقصد پر نظر رکھ کر ان مثالوں سے اجتناب گوارا نہیں کیا۔

يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ سے ثابت ہوا کہ عہد و معاہدہ کی خلاف ورزی شدید گناہ ہے، جس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تمام نیکیوں سے محروم ہو جائے۔

تعلقات کے حقوق شرعیہ ادا کرنا واجب ہے، اس کے خلاف کرنا گناہِ عظیم

وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُؤْصَلَ سے معلوم ہوا کہ جن تعلقات کو قائم رکھنے کا شریعتِ اسلام نے حکم دیا ہے ان کا قائم رکھنا ضروری اور قطع کرنا حرام ہے، غور کیا جائے تو دین و مذہب نام ہی ان حدود و قیود کا ہے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے لئے مقرر کی گئی ہیں، اور اس عالم کا صلاح و فساد انہیں تعلقات کو درست رکھنے یا توڑنے پر موقوف ہے، اسی لئے ان تعلقات کے قطع کرنے کو **وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ** کے الفاظ میں وجہِ فسادِ عالم بتلایا ہے۔

أُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۲۸ میں خسارہ والا صرف اسی شخص کو قرار دیا ہے جو مذکورہ احکام کی خلاف ورزی کرے، اس میں اشارہ ہے کہ اصل خسارہ اور نقصان آخرت ہی کا ہے، دُنیا کا خسارہ کوئی قابلِ توجہ چیز نہیں۔

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمَيِّتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۲۸

کس طرح کافر ہوتے ہو خدا تعالیٰ سے حالانکہ تم بے جان تھے پھر جلایا تم کو، پھر مارے گا تم کو، پھر جلانے کا تم کو، پھر

إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۲۸ **هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَى**

اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے واسطے جو کچھ زمین میں ہے سب، پھر قصد کیا

إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۲۹ **وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ**

آسمان کی طرف سوٹھیک کر دیا اُن کو سات آسمان، اور خدا تعالیٰ ہر چیز سے خبردار ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

تم اللہ کے ساتھ کفر کا طرز عمل آخر کیسے اختیار کر لیتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے، اُسی نے تمہیں زندگی بخشی، پھر وہی تمہیں موت دے گا، پھر وہی تم کو (دوبارہ) زندہ کرے گا، اور پھر تم اسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے (۲۸) وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے سب تمہارے لئے پیدا کیا، پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا، چنانچہ ان کو سات آسمانوں کی شکل میں ٹھیک ٹھیک بنادیا، اور وہ ہر چیز کا پورا علم رکھنے والا ہے (۲۹)

خلاصہ تفسیر

بھلا کیونکر ناشکری کرتے ہو اللہ کے ساتھ (کہ اس کے احسانات کو بھلا دیتے ہو، اور غیروں کا کلمہ پڑھتے ہو) حالانکہ (اس پر دلائل واضح قائم ہیں کہ صرف ایک اللہ ہی مستحق عبادت ہے مثلاً یہ کہ) تم بے جان (یعنی نطفہ میں جان پڑنے سے پہلے) سو تم کو جاندار کیا، پھر تم کو موت دیں گے، پھر زندہ کریں گے (یعنی قیامت کے دن) پھر انہی کے پاس لے جائے جاؤ گے (یعنی میدان قیامت میں حساب کتاب کے لئے حاضر کئے جاؤ گے) وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدہ کے لئے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا سب (یہ فائدہ عام ہے کھانے پینے کا ہو یا پہننے اور برتنے کا یا نکاح اور رُوح کو تازگی بخشنے کا، اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جس سے انسان کو فائدہ نہ پہنچتا ہو، اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر چیز کا ہر استعمال حلال ہو، جیسے سمیات قاتلہ بھی فائدہ انسان سے خالی نہیں، مگر اُن کا کھالینا عقلاء کے نزدیک ممنوع ہے) پھر توجہ فرمائی آسمان کی طرف (یعنی اس کی تخلیق و تکمیل کی طرف) تو دُرست کر کے بنادیئے ان کو سات آسمان اور وہ تو سب چیزوں کے جاننے والے ہیں۔

معارف مسائل

رابط آیات

چھلی آیتوں میں خدا تعالیٰ کے وجود، توحید اور رسالت کے دلائل واضح اور منکرین و مخالفین کے خیالات باطلہ کا رد مذکور تھا، مذکورہ دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے احسانات اور انعامات کا ذکر کر کے اس پر اظہار تعجب کیا گیا ہے کہ اتنے احسانات کے ہوتے ہوئے کیسے یہ ظالم کفر و انکار میں مبتلا ہیں، جس میں اس پر تنبیہ ہے کہ اگر دلائل میں غور کرنے کی زحمت

گوارا نہیں کرتے تو کم از کم محسن کا احسان ماننا، اس کی تعظیم و اطاعت کرنا تو ہر شریف انسان کا طبعی اور فطری تقاضا ہے، اسی راستہ سے تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر آ جاؤ۔

پہلی آیت میں اُن مخصوص نعمتوں کا ذکر ہے جو ہر انسان کی ذات اور نفس کے اندر موجود ہیں کہ پہلے وہ بے جان ذرات کی صورت میں تھا، پھر اس میں اللہ تعالیٰ نے زندگی پیدا فرمائی۔

دوسری آیت میں اُن عام نعمتوں کا ذکر ہے جن سے انسان اور تمام مخلوقات فائدہ اٹھاتی ہیں، اور وہ انسان کی زندگی اور بقا کے لئے ضروری ہیں، ان میں پہلے زمین اور اس کی پیداوار کا ذکر کیا گیا، جس سے انسان کا قریبی تعلق ہے، پھر آسمانوں کا ذکر کیا گیا جن کے ساتھ زمین کی حیات اور پیداوار وابستہ ہے۔

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ (کیسے اللہ کا انکار کرتے ہو) ان لوگوں نے اگرچہ بظاہر خدا کا انکار نہیں کیا، مگر رسول خدا کے انکار کو خدا ہی کا انکار قرار دے کر ایسا خطاب کیا گیا ہے۔

لَكُمْ اَمْوَالٌ فَاَحْيَاكُمْ، اموات، میت کی جمع ہے، مردہ اور بے جان چیز کو کہا جاتا ہے، مراد یہ ہے کہ انسان اپنی اصلی حقیقت پر غور کرے تو معلوم ہوگا کہ اس کے وجود کی ابتدا وہ بے جان ذرات ہیں جو کچھ منجمد چیزوں کی شکل میں، کچھ بہنے والی چیزوں میں، کچھ غذاؤں کی صورت میں تمام دُنیا میں پھیلے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے اُن بے جان ذرات کو کہاں کہاں سے جمع فرمایا، پھر اُن میں جان ڈالی، ان کو زندہ انسان بنا دیا، یہ اس کی ابتداء پیداؤں کا ذکر ہے۔

ثُمَّ يَمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ یعنی ”جس نے پہلی مرتبہ تمہارے بے جان ذرات کو جمع کر کے اُن میں جان پیدا کی، وہ اس عالم میں تمہاری عمر کا مقررہ وقت پورا ہونے کے بعد پھر تمہیں موت دے گا، اور پھر ایک عرصہ کے بعد قیامت میں اسی طرح تمہارے جسم کے بے جان اور منتشر ذرات کو جمع کر کے تمہیں زندہ کرے گا“، اس طرح ایک موت یعنی بے جان ہونا تمہاری ابتدا میں تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں زندہ کیا، دوسری موت دُنیا کی پوری عمر ہونے کے وقت اور دوسری زندگی قیامت کے روز ہوگی۔

پہلی موت اور زندگی کے درمیان چونکہ کوئی فاصلہ نہ تھا، اس لئے اس میں حرفِ فاء استعمال کیا گیا: **فَاَحْيَاكُمْ**، اور چونکہ دُنیا کی حیات اور موت کے درمیان اور اسی طرح اُس موت اور قیامت کی زندگی کے درمیان خاصا فاصلہ تھا، اس لئے وہاں لفظ **ثُمَّ** اختیار کیا گیا، **ثُمَّ يَمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ**، کیونکہ لفظ **ثُمَّ** بعدیت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۲۸) یعنی ”پھر تم اُسی ذاتِ پاک کی طرف پھر کر جاؤ گے“ اس سے مراد حشر و نشر اور قیامت کا وقت ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اُس انعام و احسان کا ذکر کیا ہے جو ہر انسان کی اپنی ذات سے متعلق ہے، اور جو سارے انعامات و احسانات کا مدار ہے، یعنی زندگی، دُنیا و آخرت اور زمین و آسمان کی جتنی نعمتیں انسان کو حاصل ہیں وہ سب اسی زندگی پر موقوف ہیں، زندگی نہ ہو تو کسی نعمت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا، زندگی کا نعمت ہونا تو ظاہر ہے، مگر اس آیت میں موت کو بھی نعمتوں کی فہرست میں شمار اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ دُنیا کی موت دروازہ ہے اُس دائمی زندگی کا جس کے بعد موت نہیں، اس لحاظ سے یہ موت بھی ایک نعمت ہے۔

مسئلہ:- آیت مذکورہ سے ثابت ہوا کہ:-

جو شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا منکر ہو، یا قرآن کے کلام الہی ہونے کا منکر ہو، وہ اگرچہ بظاہر خدا کے وجود و عظمت کا انکار نہ کرے مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ منکرینِ خدا ہی کی فہرست میں شمار ہے۔

حیاتِ برزخی

اس آیت میں دُنیا کی زندگی اور موت کے بعد صرف ایک حیات کا ذکر ہے، جو قیامت کے روز ہونے والی ہے، قبر کی زندگی جس کے ذریعہ قبر کا سوال و جواب اور قبر میں ثواب و عذاب ہونا قرآن کریم کی متعدد آیات اور حدیث کی متواتر روایات سے ثابت ہے، اس کا ذکر نہیں۔

وجہ یہ ہے کہ یہ برزخی زندگی اُس طرح کی زندگی نہیں ہے جو انسان کو دُنیا میں حاصل ہے، یا آخرت میں پھر ہوگی، بلکہ ایک درمیانی صورت مثل خواب کی زندگی کے ہے، اس کو دُنیا کی زندگی کا تکرار بھی کہا جاسکتا ہے، اور آخرت کی زندگی کا مقدمہ بھی، اس لئے کوئی مستقل زندگی نہیں جس کا جدا گانہ ذکر کیا جائے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا، ”اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے، سب کا سب“ یہ اُس نعمتِ عامہ کا ذکر ہے جس میں تمام انسان بلکہ حیوانات وغیرہ بھی شریک ہیں، اور ایک لفظ میں اُن تمام نعمتوں کا اجمال آگیا جو دُنیا میں کسی انسان کو حاصل ہوئیں یا ہو سکتی ہیں، کیونکہ انسان کی غذا، لباس، مکان اور دوا اور راحت کے کل سامان زمین ہی کی پیداوار ہیں۔

ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۲۹ استواء کے لفظی معنی سیدھا ہونے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ زمین کی پیدائش کے بعد اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کی تخلیق کا قصد راست فرمایا، جس میں کوئی حائل اور مانع نہ ہو سکے، یہاں تک کہ سات آسمانوں کی تخلیق مکمل فرمادی، اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے، اس لئے تخلیق کائنات اس کے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔

دُنیا کی ہر چیز نفع بخش ہے، کوئی شے بیکار نہیں

اس آیت میں زمین کی تمام چیزوں کو انسان کے لئے پیدا فرمانے کا بیان ہوا ہے۔

اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ دُنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جس سے انسان کو کسی نہ کسی حیثیت سے بلا واسطہ یا بالواسطہ فائدہ نہ پہنچتا ہو، خواہ یہ فائدہ دُنیا میں استعمال کرنے کا ہو، یا آخرت کے لئے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کا، بہت سی چیزوں کا فائدہ تو انسان محسوس کرتا ہے، اس کی غذا یا دوا یا استعمال میں براہِ راست آتی ہیں، اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ انسان کو ان سے فائدہ پہنچتا ہے، مگر اس کو خبر بھی نہیں ہوتی، یہاں تک کہ جو چیزیں انسان کے لئے مضر سمجھی جاتی ہیں جیسے زہریلی اشیاء، زہریلے جانور وغیرہ، غور کریں تو وہ کسی نہ کسی حیثیت سے انسان کے لئے نفع بخش بھی ہوتی ہیں، جو چیزیں انسان کے لئے ایک طرح سے حرام ہیں دوسری کسی طرح اور حیثیت سے ان کا نفع بھی انسان کو پہنچتا ہے۔

نہیں ہے چیز نئی کوئی زمانے میں

کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

عارف باللہ ابن عطاءؒ نے اس آیت کے تحت فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات کو تمہارے واسطے اس لئے پیدا فرمایا کہ ساری کائنات تمہاری ہو اور تم اللہ کے لئے ہو، اس لئے عقل مند کا کام یہ ہے کہ جو چیز اسی کے لئے پیدا ہوئی ہے وہ تو اس کو ملے گی، اس کی فکر میں لگ کر اُس ذات سے غافل نہ ہو جس کے لئے یہ پیدا ہوا ہے۔ (بحر محیط)

اشیائے عالم میں اصلِ اباحت ہے یا حرمت؟

اس آیت سے بعض علماء نے اس پر استدلال کیا ہے کہ دُنیا کی تمام چیزوں میں اصل یہ ہے کہ وہ انسان کے لئے حلال و مباح ہوں، کیونکہ وہ اسی کے لئے پیدا کی گئی ہیں، بجز ان چیزوں کے جن کو شریعت نے حرام قرار دے دیا، اس لئے جب تک کسی چیز کی حرمت قرآن و سنت سے ثابت نہ ہو اس کو حلال سمجھا جائے گا۔

اس کے بالمقابل بعض علماء نے یہ قرار دیا کہ انسان کے فائدے کے لئے کسی چیز کے پیدا ہونے سے اس کا حلال ہونا ثابت نہیں ہوتا، اس لئے اصل اشیاء میں حرمت ہے، جب تک قرآن و سنت کی کسی دلیل سے جواز ثابت نہ ہو ہر چیز حرام سمجھی جائے گی۔

بعض حضرات نے توقف فرمایا۔

تفسیر بحر محیط میں ابن حیانؒ نے فرمایا کہ صحیح یہ ہے کہ اس آیت میں اقوال مذکورہ میں سے کسی کے لئے حجت نہیں، کیونکہ **خَلَقَ لَكُمْ** میں حرف لام سمیت بتلانے کے لئے آیا ہے کہ تمہارے سبب سے یہ چیزیں پیدا کی گئی ہیں، اس سے نہ انسان کے لئے اُن چیزوں کے حلال ہونے پر کوئی دلیل قائم ہو سکتی ہے نہ حرام ہونے پر، بلکہ حلال و حرام کے احکام جدا گانہ قرآن و سنت میں بیان ہوئے ہیں، انہیں کا اتباع لازم ہے۔

اس آیت میں زمین کی پیدائش پہلے اور آسمانوں کی پیدائش بعد میں ہونا بلفظ **ثُمَّ** بیان کیا گیا ہے، اور یہی صحیح ہے، اور سورہ والنازعات میں جو یہ ارشاد ہے: **وَالْأَرْضُ بَعْدَ ذَلِكَ دَلْحَمًا** (النازعات) یعنی ”زمین کو آسمانوں کے پیدا کرنے کے بعد بچھایا“ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ زمین کی پیدائش آسمانوں کے بعد ہوئی ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین کی دُستی اور اس میں سے پیداوار نکالنے وغیرہ کے تفصیلی کام آسمانوں کی پیدائش کے بعد ہوئے، اگرچہ اصل زمین کی تخلیق آسمانوں سے پہلے ہو چکی تھی۔ (بحر محیط وغیرہ) ^[۱]

اس آیت سے آسمانوں کی تعداد سات ہونا ثابت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ علم ہیئت والوں کا آسمانوں کی تعداد نو بتلانا غلط، بے دلیل اور محض خیالات پر مبنی ہے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوا

اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو کہ: میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک نائب، کہا فرشتوں نے:

أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ

کیا قائم کرتا ہے تو زمین میں اس کو جو فساد کرے اور اس میں اور خون بہائے، اور ہم پڑھتے رہتے ہیں

بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝۳۰ وَعَلَّمَ

تیری خوبیاں اور یاد کرتے ہیں تیری پاک ذات کو، فرمایا: بے شک مجھ کو معلوم ہے جو تم نہیں جانتے۔ اور سکھلا دیئے اللہ نے

آدَمَ الْأَسْبَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَآءِ

آدم کو نام سب چیزوں کے پھر سامنے کیا اُن سب چیزوں کو فرشتوں کے، پھر فرمایا: بتاؤ مجھ کو نام

هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۱﴾ قَالُوا سُبْحَنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا

ان کے اگر تم سچے ہو۔ بولے: پاک ہے تو ہم کو معلوم نہیں مگر جتنا

عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يَٰأَدَمُ أَنْبِئْهُمْ

تو نے ہم کو سکھلایا، بے شک تو ہی ہے اصل جاننے والا حکمت والا۔ فرمایا: اے آدم! بتادے فرشتوں کو

بِأَسْمَائِهِمْ ۚ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ

ان چیزوں کے نام، پھر جب بتادیئے اس نے ان کے نام، فرمایا: کیا نہ کہا تھا میں نے تم کو کہ میں خوب جانتا ہوں

غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۚ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿۳۳﴾

چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی اور جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔

آسان ترجمہ قرآن

اور (اس وقت کا تذکرہ سنو) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، وہ کہنے لگے: ”کیا آپ زمین میں ایسی مخلوق پیدا کریں گے جو اس میں فساد مچائے، اور خون خرابہ کرے، حالانکہ ہم آپ کی تسبیح اور حمد و تقدیس میں لگے ہوئے ہیں؟“ اللہ نے کہا: ”میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے“ ﴿۳۱﴾ اور آدم کو (اللہ نے) سارے کے سارے نام سکھا دیے، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور (ان سے) کہا: اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتلاؤ ﴿۳۲﴾ وہ بول اٹھے: آپ ہی کی ذات پاک ہے، جو کچھ علم آپ نے ہمیں دیا ہے اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے۔ حقیقت میں علم و حکمت کے مالک تو صرف آپ ہیں ﴿۳۳﴾ اللہ نے کہا: ”آدم! تم ان کو ان چیزوں کے نام بتادو“ چنانچہ جب اس نے ان کے نام ان کو بتادیئے تو اللہ نے (فرشتوں سے) کہا: ”کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے بھید جانتا ہوں؟ اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ چھپاتے ہو مجھے اس سب کا علم ہے“ ﴿۳۴﴾

خلاصہ تفسیر

اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے (تاکہ وہ اپنی رائے ظاہر کریں جس میں حکمت و مصلحت تھی، مشورہ کی حاجت سے تو حق تعالیٰ بالا و برتر ہیں، غرض اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ) ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب (یعنی وہ میرا نائب ہوگا کہ اپنے احکام شرعیہ کے اجراء و نفاذ کی خدمت اس کے سپرد کروں گا) کہنے لگے: کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے اس میں اور خوں ریزیاں کریں گے، اور ہم برابر تسبیح کرتے رہتے ہیں بحمد اللہ اور آپ کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں (فرشتوں کی یہ گزارش نہ بطور اعتراض اور نہ اپنا استحقاق جتانے کے لئے، بلکہ فرشتوں کو کسی طرح یہ معلوم ہو گیا تھا کہ جو نئی مخلوق زمین سے بنائی جائے گی ان میں نیک و بد ہر طرح کے لوگ ہوں گے، بعض لوگ اس نیابت کے کام کو اور زیادہ خراب کریں گے، اس لئے نیاز مند انہ عرض کیا کہ ہم سب کے سب ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں، اور گروہ ملائکہ میں کوئی گناہ کرنے والا بھی نہیں، اس لئے کوئی نیا عملہ بڑھانے اور نئی مخلوق پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، خصوصاً جبکہ اس نئی مخلوق میں یہ بھی احتمال ہے کہ وہ آپ کی مرضی کے خلاف کام کریں گے جس سے آپ ناخوش ہوں، ہم ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں اور ہماری خدمت آپ کی مرضی کے مطابق ہی ہوگی) حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے (یعنی جو چیز تمہاری نظر میں تخلیق بنی آدم سے مانع ہے کہ ان میں بعض فساد بھی پھیلانیں گے، وہی چیز درحقیقت ان کی تخلیق کا اصلی سبب ہے، کیونکہ اجراء احکام و انتظام تو جہی وقوع میں آسکتا ہے جب کوئی اعتدال سے تجاوز کرنے والا بھی ہو، یہ مقصد تم فرمانبرداروں کے جمع ہونے سے پورا نہیں ہو سکتا، اور اعتدال سے تجاوز کر جانے والی ایک مخلوق جنات پہلے سے موجود تھی، اس سے یہ کام کیوں نہ لیا گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کام کے لئے موزوں وہ مخلوق ہو سکتی ہے جن میں شر و فساد کا عنصر موجود تو ہو مگر غالب نہ ہو، جنات میں یہ عنصر غالب تھا، اس لئے تخلیق آدم کی تجویز فرمائی، آگے اسی حکمت الہیہ کی مزید توضیح اس طرح کی گئی کہ نیابت خداوندی کے لئے ایک خاص علم کی ضرورت ہے، وہ علم ملائکہ کی استعداد سے خارج ہے، اس لئے فرمایا کہ) اور علم دے دیا اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو (ان کو پیدا کر کے) سب چیزوں کے اسماء کا (یعنی سب چیزوں کے نام اور ان کے خواص و آثار سب کا علم آدم کو دے دیا گیا) پھر وہ چیزیں فرشتوں کے روبرو کر دیں، پھر فرمایا کہ بتلاؤ مجھ کو اسماء ان چیزوں کے (یعنی مع ان کے آثار و خواص کے) اگر تم سچے ہو (یعنی اپنے اس قول میں سچے ہو کہ ہم خلافت ارضی کا کام اچھا انجام دے سکیں گے) فرشتوں نے عرض کیا کہ آپ تو پاک ہیں (اس الزام سے کہ آدم علیہ السلام پر اس علم کو ظاہر فرمادیا، ہم سے پوشیدہ رکھا، کیونکہ کسی آیت یا روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام کو علم اسماء کی تعلیم فرشتوں سے الگ کر کے دی

گئی، اس سے ظاہر یہ ہے کہ تعلیم تو سب کے سامنے یکساں دی گئی مگر آدم علیہ السلام کی فطرت میں اس علم کے حاصل کر لینے کی صلاحیت تھی انہوں نے حاصل کر لیا، فرشتوں کی طبیعت اس کی متحمل نہ تھی، ان کو یہ علم حاصل نہ ہوا) مگر ہم کو ہی علم نہیں مگر وہی جو کچھ آپ نے ہم کو علم دیا، بے شک آپ بڑے علم والے ہیں حکمت والے ہیں (کہ جس قدر جس کے لئے مصلحت جانا اسی قدر علم و فہم اس کو عطا فرمایا، اس سے فرشتوں کا یہ اعتراف تو ثابت ہو گیا کہ وہ اُس کام سے عاجز ہیں جو نائب کے سپرد کرنا ہے، آگے حق تعالیٰ کو یہ منظور ہوا کہ آدم علیہ السلام میں اس علم خاص کی مناسبت کو فرشتوں کے سامنے آشکارا فرمادیں، اس لئے) حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے آدم! تم بتلا دو ان کو ان چیزوں کے اسماء (یعنی مع حالات و خواص کے، جب آدم علیہ السلام نے یہ سب فرشتوں کے روبرو بتلا دیا تو فرشتے اتنا سمجھ گئے کہ آدم علیہ السلام اس علم کے ماہر ہو گئے ہیں) سو جب بتلا دیئے اُن کو آدم علیہ السلام نے اُن چیزوں کے اسماء تو حق تعالیٰ نے فرمایا (دیکھو) میں تم سے نہ کہتا تھا کہ بے شک میں جانتا ہوں تمام پوشیدہ چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی اور جانتا ہوں جس بات کو ظاہر کر دیتے ہو اور جس کو دل میں رکھتے ہو۔

معارف مسائل

ربط آیات

پچھلی آیات میں اللہ جل شانہ کی خاص و عام نعمتوں کا ذکر کر کے انسان کو ناشکری اور نافرمانی سے بچنے کی ہدایت کی گئی، اس آیت سے آخر رکوع تک دس آیتوں میں آدم علیہ السلام کا قصہ بھی اسی سلسلہ میں ذکر فرمایا ہے، کیونکہ نعمت دو قسم کی ہوتی ہے، ایک صوری یعنی محسوس، جیسے کھانا پینا، روپیہ پیسہ، مکان جائیداد، دوسری معنوی جیسے عزت و آبرو، مسرت، علم۔ پچھلی آیات میں صوری اور ظاہری نعمتوں کا ذکر تھا، اور ان گیارہ آیتوں میں معنوی نعمتوں کا ذکر ہے کہ ہم نے تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو دولتِ علم دی اور مسجود ملائکہ بنانے کی عزت دی، اور تم کو ان کی اولاد میں ہونے کا فخر عطا کیا۔

خلاصہ مضمون آیت کا یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے جب تخلیقِ آدم اور دُنیا میں اس کی خلافت قائم کرنے کا ارادہ کیا، تو فرشتوں سے بظاہر ان کا امتحان لینے کے لئے اس ارادے کا ذکر فرمایا، جس میں اشارہ یہ تھا کہ وہ اس معاملے میں اپنی رائے کا اظہار کریں، فرشتوں نے رائے یہ پیش کی کہ انسانوں میں تو ایسے لوگ بھی ہوں گے جو فساد اور خوں ریزی کریں گے، اُن کو زمین کی خلافت اور انتظام سپرد کرنا سمجھ میں نہیں آتا، اس کام کے لئے تو فرشتے زیادہ انسب معلوم ہوتے ہیں کہ نیکی ان کی فطرت ہے، برائی کا صدور ہی اُن سے ممکن نہیں، وہ مکمل اطاعت گزار ہیں، دُنیا کے انتظامات بھی وہ درست

کر سکیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کی رائے کے غلط ہونے کا اظہار اول ایک حاکمانہ طرز سے دیا کہ خلافت ارضی کی حقیقت اور اس کی ضروریات سے تم واقف نہیں، اس کو میں ہی مکمل طور پر جانتا ہوں۔

پھر دوسرا جواب حکیمانہ انداز سے آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر ترجیح، اور مقام علم میں آدم علیہ السلام کے تفوق کا ذکر کر کے دیا گیا، اور بتلایا گیا کہ خلافت ارض کے لئے زمینی مخلوقات کے نام اور ان کے خواص و آثار کا جاننا ضروری ہے اور فرشتوں کی استعداد اس کی متحمل نہیں۔

تخلیق آدم کی گفتگو فرشتوں سے کس مصلحت پر مبنی تھی؟

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ حضرت حق جل و علا شانہ کا فرشتوں کی مجلس میں اس واقعہ کا اظہار کس حیثیت سے تھا؟ کیا ان سے مشورہ لینا مقصود تھا؟ یا محض ان کو اطلاع دینا پیش نظر تھا؟ یا فرشتوں کی زبان سے ان کی رائے کا اظہار کرانا اس کا منشا تھا؟

سو یہ بات ظاہر ہے کہ مشورہ کی ضرورت تو وہاں پیش آتی ہے جہاں مسئلہ کے سب پہلو کسی پر روشن نہ ہوں، اور اپنے علم و بصیرت پر مکمل اطمینان نہ ہو، اس لئے دوسرے عقلاء و اہل دانش سے مشورہ کیا جاتا ہے، یا ایسی صورت میں جہاں حقوق دوسروں کے بھی مساوی ہوں، تو ان کی رائے لینے کے لئے مشورہ ہوتا ہے، جیسے دنیا کی عام کونسلوں میں رائج ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ یہاں دونوں صورتیں نہیں ہو سکتیں، اللہ سبحانہ و تعالیٰ خالق کائنات ہیں، ذرے ذرے کا علم رکھتے ہیں، اور ظاہر و باطن ہر چیز ان کے علم و بصر کے سامنے برابر ہے، ان کو کیا ضرورت کہ کسی سے مشورہ لیں؟

اسی طرح یہاں یہ بھی نہیں کہ کوئی پارلیمانی حکومت ہے، جس میں تمام ارکان کے مساوی حقوق ہیں، اور سب سے مشورہ لینا ضروری ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی سب کے خالق اور مالک ہیں، فرشتے ہوں یا جن و انس، سب ان کی مخلوق و مملوک ہیں، کسی کو حق نہیں کہ ان کے کسی فعل کے متعلق سوال بھی کر سکے کہ آپ نے یہ کیوں کیا اور فلاں کام کیوں نہیں کیا: لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ ﴿۲۱﴾ (الانبياء) ”اللہ تعالیٰ سے اس کے کسی فعل کے متعلق سوال نہیں کیا جاسکتا، اور سب سے ان کے اعمال کا سوال کیا جائے گا۔“

بات یہی ہے کہ درحقیقت یہاں مشورہ لینا مقصود نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے، مگر صورت مشورہ کی بنائی گئی، جس میں مخلوق کو سنت مشورہ کی تعلیم کا فائدہ ہو سکتا ہے، جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام سے مشورہ لینے کی ہدایت قرآن میں فرمائی گئی، حالانکہ آپ تو صاحب وحی ہیں، تمام معاملات اور ان کے تمام پہلو آپ کو بذریعہ وحی بتلائے جاسکتے تھے، مگر آپ کے ذریعہ مشورہ کی سنت جاری کرنے اور امت کو سکھانے کے لئے آپ کو بھی مشورے کی تاکید فرمائی گئی۔

غرض فرشتوں کی مجلس میں اس واقعہ کے اظہار سے ایک فائدہ تو تعلیم مشورہ کا حاصل ہوا (کافی روح البیان)۔
دوسرا فائدہ خود الفاظ قرآنی کے اشارہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے فرشتے یہ سمجھتے تھے کہ ہم سے زیادہ افضل و اعلم کوئی مخلوق اللہ تعالیٰ پیدا نہیں کریں گے۔

اور تفسیر ابن جریر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک روایت میں اس کی تصریح بھی ہے کہ خلقتِ آدم علیہ السلام سے پہلے فرشتے آپس میں کہتے تھے کہ: "لَنْ يَخْلُقَ اللَّهُ خَلْقًا أَكْرَمَ عَلَيْهِ مِنَّا وَلَا أَعْلَمَ" (یعنی اللہ تعالیٰ کوئی مخلوق ہم سے افضل اور اعلم پیدا نہ فرمائیں گے)۔ حضرت حق جل شانہ کے علم میں تھا کہ ایک ایسی مخلوق بھی پیدا کرنا ہے جو تمام مخلوقات سے زیادہ افضل و اعلم ہوگی، اور جس کو اپنی خلافت و نیابت کا خلعت عطا کیا جائے گا۔

اس لئے فرشتوں کی مجلس میں آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے اور زمین کے نائب بنانے کا ذکر کیا گیا کہ وہ اپنے خیال کا اظہار کریں۔

چنانچہ فرشتوں نے اپنے علم و بصیرت کے مطابق نیاز مندی کے ساتھ رائے کا اظہار کیا کہ جس مخلوق کو آپ خلیفہ زمین بنا رہے ہیں، اس میں تو شر و فساد کا مادہ بھی ہے، وہ دُوروں کی اصلاح اور زمین میں امن و امان کا انتظام کیسے کر سکتا ہے، جبکہ وہ خود خوں ریزی کا بھی مرتکب ہوگا، اس کے بجائے آپ کے فرشتوں میں شر و فساد کا کوئی مادہ نہیں، وہ خطاؤں سے معصوم ہیں، اور ہر وقت آپ کی تسبیح و تقدیس اور عبادت و اطاعت میں لگے ہوتے ہیں، وہ بظاہر اس خدمت کو اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں۔

غرض اس سے معاذ اللہ حضرت حق جل شانہ کے فعل پر اعتراض نہیں، کیونکہ فرشتے ایسے خیالات و حالات سے معصوم ہیں، بلکہ مقصد محض دریافت کرنا تھا کہ ایک ایسی معصوم جماعت کے موجود ہوتے ہوئے دُوسری غیر معصوم مخلوق پیدا کر کے یہ کام اُس کے حوالے کرنا اور اس کو ترجیح دینا کس حکمت پر مبنی ہے؟

چنانچہ اس کے جواب میں پہلے تو حق تعالیٰ نے اجمالی طور پر یہ فرمایا کہ: **إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ** ۲۰ یعنی تم خلافتِ الہیہ کی حقیقت اور اس کے لوازم سے واقف نہیں، اس لئے یہ سمجھ رہے ہو کہ ایک معصوم مخلوق ہی اس کو انجام دے سکتی ہے، اس کی پوری حقیقت کو ہم ہی جانتے ہیں۔

اس کے بعد فرشتوں کو اس کا کچھ تفصیلی علم کرانے کے لئے ایک خاص واقعہ کا اظہار کیا گیا کہ تمام کائناتِ عالم کے نام اور ان کے خواص و آثار جن کے علم کی صلاحیت صرف آدم علیہ السلام ہی میں ودیعت کی گئی تھی، فرشتوں کی فطرت

۱ تفسیر روح البیان تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۶۴

۲ تفسیر الطبری تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۳۶۵

و جبلت اس کے مناسب نہ تھی، وہ سب آدم علیہ السلام کو سکھائے اور بتلائے گئے تھے، مثلاً دُنیا کی نافع و مضر چیزیں اور ان کے خواص و آثار، ہر جان دار اور ہر قوم کے مزاج و طبائع اور ان کے آثار، اُن چیزوں کے معلوم کرنے کے لئے طبیعتِ ملکی متحمل نہیں، فرشتہ کیا جانے کہ بھوک کیا ہوتی ہے، پیاس کی تکلیف کیسی ہوتی ہے، نفسانی جذبات کا کیا اثر ہوتا ہے، کسی چیز سے نشہ کس طرح پیدا ہوتا ہے، سانپ اور بچھوکاز ہر کس بدن پر کیا اثر کرتا ہے۔

غرض زمینی مخلوقات کے نام اور خواص و آثار کی دریافت فرشتوں کے مزاج اور مخصوص طبیعت سے بالکل علیحدہ چیز تھی، یہ علم صرف آدم علیہ السلام ہی کو سکھایا جاسکتا تھا، انہی کو سکھایا گیا، پھر قرآن کی کسی تصریح یا اشارہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آدم علیہ السلام کو یہ تعلیم کسی تنہائی میں فرشتوں سے علیحدہ دی گئی، اس لئے ہو سکتا ہے کہ تعلیم سب کے لئے عام ہی ہو، مگر اس تعلیم سے فائدہ اٹھانا آدم علیہ السلام کی طبیعت میں تھا، وہ سیکھ گئے، فرشتوں کی طبیعت میں نہ تھا، وہ نہ سیکھ سکے، اسی لئے یہاں تعلیم کو آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا، اگرچہ یہ تعلیم فی نفسہ عام تھی، آدم علیہ السلام اور ملائکہ دونوں کو شامل تھی، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ظاہری تعلیم کی صورت ہی عمل میں نہ آئی ہو، بلکہ آدم علیہ السلام کی فطرت میں اُن چیزوں کا علم ابتدائے آفرینش سے ودیعت کر دیا گیا ہو، جیسے بچہ ابتدائے ولادت میں ماں کا دودھ پینا جانتا ہے، بطخ کا بچہ تیرنا جانتا ہے، اس میں کسی ظاہری تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اب رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو سب کچھ ہے، وہ فرشتوں کا مزاج اور طبیعت بدل کر اُن کو بھی یہ چیزیں سکھا سکتے تھے، تو اُن کو کیوں نہ سکھایا گیا؟ مگر اس کا حاصل تو یہ ہوا کہ فرشتوں کو ہی انسان کیوں نہ بنادیا، کیونکہ اگر فرشتوں کی جبلت و فطرت کو بدلا جاتا تو پھر وہ فرشتے نہ رہتے بلکہ انسان ہی ہو جاتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ زمینی مخلوقات کے اسماء اور اُن کے خواص و آثار کا آدم علیہ السلام کو علم دیا گیا، جو فرشتوں کے بس کا نہیں تھا، اور پھر اُن مخلوقات کو فرشتوں کے سامنے کر کے سوال کیا گیا کہ اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ ہم سے زیادہ کوئی مخلوق اعلم و افضل پیدا نہیں ہوگی، یا یہ کہ زمین کی خلافت و نیابت کے لئے فرشتے بہ نسبت انسان کے زیادہ موزوں ہیں تو اُن چیزوں کے نام اور خواص بتلاؤ جن پر خلیفہ زمین کو حکومت کرنا ہے۔

یہاں سے یہ فائدہ بھی حاصل ہو گیا کہ حاکم کے لئے ضروری ہے کہ اپنی محکوم رعایا کے مزاج و طبائع سے اور ان کے خواص و آثار سے پورا واقف ہو، اس کے بغیر وہ اُن پر عدل و انصاف کے ساتھ حکمرانی نہیں کر سکتا، جو شخص یہ نہیں جانتا کہ بھوک سے کیسی اور کتنی تکلیف ہوتی ہے، اگر اس کی عدالت میں کوئی دعویٰ کسی کو بھوکا رکھنے کے متعلق پیش ہو تو وہ اس کا فیصلہ کیا اور کس طرح کرے گا؟

غرض اسی واقعہ سے حق تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ بتلا دیا کہ زمین کی نیابت کے لئے معصوم ہونے کو دیکھنا نہیں بلکہ

اس کو دیکھنا ہے کہ وہ زمین کی چیزوں سے پورا واقف ہو، اُن کے استعمال کے طریقوں اور اُن کے ثمرات کو جانتا ہو، اگر تمہارا یہ خیال صحیح ہے کہ فرشتے اس خدمت کے لئے زیادہ موزوں ہیں تو ان چیزوں کے نام اور خواص بتلاؤ۔

فرشتوں کا اظہار رائے چونکہ کسی اعتراض یا فخر و غرور یا اپنا استحقاق جتلانے کے لئے نہیں بلکہ محض اپنے خیال کا اظہار ایک نیازمند خادم کی طرح اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے تھا، اس لئے فوراً بول اُٹھے: **سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ** (۳۳) (پاک ہیں آپ، ہم کو علم نہیں، مگر وہی جو آپ نے عطا فرمایا، بے شک آپ بڑے علم و حکمت والے ہیں) جس کا حاصل اپنے خیال سے رُجوع اور اس کا اقرار تھا کہ زیادہ اُعلم و افضل مخلوق بھی موجود ہے، اور یہ کہ زمین کی نیابت کے لئے وہی موزوں ہیں۔

دوسرا سوال اس جگہ یہ ہے کہ فرشتوں کو اس کی کیسے خبر ہوئی کہ انسان خوں ریزی کرے گا، کیا انہیں علم غیب تھا؟ یا محض اٹکل اور تخمینہ سے انہوں نے یہ سمجھا تھا؟

اس کا جواب جمہور محققین کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کو انسان کے حالات اور اس کے ہونے والے معاملات بتلا دیئے تھے، جیسا کہ بعض آثار میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے آدم علیہ السلام کو خلیفہ زمین بنانے کا ذکر فرمایا، تو فرشتوں نے اللہ تعالیٰ ہی سے اس خلیفہ کا حال دریافت کیا، اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی نے اُن کو بتلایا (روح المعانی)۔ اس سے فرشتوں کو تعجب ہوا کہ جب انسان کا یہ حال ہے کہ وہ فساد و خوں ریزی بھی کرے گا تو اس کو نیابت زمین کے لئے منتخب فرمانا کس حکمت پر مبنی ہے۔

اسی کا ایک جواب تو حضرت حق جل شانہ کی طرف سے آدم علیہ السلام کے علمی تفوق کا اظہار فرما کر دے دیا گیا، اور فساد و خوں ریزی سے جو شبہ اس کے استحقاق نیابت پر کیا گیا تھا، اس کا جواب **اِنَّيْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ** (۳۴) میں اجمالاً دے دیا گیا، جس میں اشارہ ہے کہ جس چیز کو تم نیابت و خلافت کے منافی سمجھ رہے ہو، درحقیقت وہ ہی اس کی اہلیت کا بڑا سبب ہے، کیونکہ نیابت زمین کی ضرورت ہی رفع فساد کے لئے ہے، جہاں فساد نہ ہو وہاں خلیفہ اور نائب بھیجنے کی ضرورت ہی نہیں، غرض یہ بتلادیا گیا کہ منشاء الہی یہ ہے کہ جس طرح اس نے ایک ایسی مقدس معصوم مخلوق فرشتے پیدا کر دیئے جس سے کسی گناہ خطا کا صدور ہو ہی نہیں سکتا، اور جس طرح اس نے شیاطین پیدا کر دیئے جن میں نیکی اور بھلائی کی صلاحیت نہیں، اسی طرح ایک ایسی مخلوق بھی پیدا کرنا منشاء خداوندی ہے، جس میں خیر و شر، نیکی اور بدی کا مخلوط مجموعہ ہو، اور جس میں خیر و شر کے دونوں جذبات ہوں، اور جو جذبات شر کو مغلوب کر کے خیر کے میدان میں آگے بڑھے، اور رضائے خداوندی کا خلعت حاصل کرے۔

واضح لغت خود حق تعالیٰ ہیں

اس قصہ آدم علیہ السلام اور تعلیم اسماء کے واقعہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ زبان اور لغت کے اصل واضح خود حق سبحانہ و تعالیٰ ہیں، پھر اس میں مخلوق کے استعمالات سے مختلف صورتیں اور مختلف زبانیں پیدا ہو گئیں، امام اشعریؒ نے اسی آیت سے استدلال کر کے اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی کو واضح لغت قرار دیا ہے۔^۱

آدم علیہ السلام کا تفوق فرشتوں پر

اس واقعہ میں قرآن حکیم کے یہ بلیغ الفاظ بھی قابلِ نظر ہیں کہ جب فرشتوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ ان چیزوں کے نام بتلاؤ لفظ **أَنْعَمُ** ارشاد فرمایا کہ مجھے بتلاؤ، اور جب آدم علیہ السلام کو اسی چیز کا خطاب ہوا تو لفظ **أَنْبِئْهُمْ** فرمایا گیا، یعنی آدم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ فرشتوں کو یہ اسماء بتلائیں۔

اس طرزِ بیان کے فرق سے واضح ہو گیا کہ آدم علیہ السلام کو معلم کا درجہ دیا گیا، اور فرشتوں کو طالبِ علم کا، جس میں آدم علیہ السلام کی فضیلت و تفوق کا ایک اہم صورت سے اظہار کیا گیا۔

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فرشتوں کے علوم میں بھی کمی اور زیادتی ہو سکتی ہے، کیونکہ جس چیز کا ان کو علم نہیں تھا، آدم علیہ السلام کے ذریعے ان کو بھی اُن چیزوں کا اجمالی طور پر کسی نہ کسی درجہ میں علم دے دیا گیا۔

خلافتِ ارض کا مسئلہ

زمین کا انتظام اور اس میں خدا کا قانون نافذ کرنے کے لئے اس کی طرف سے کسی نائب کا مقرر ہونا، جو ان آیات سے معلوم ہوا، اس سے دستورِ مملکت کا اہم باب نکل آیا، کہ اقتدارِ اعلیٰ تمام کائنات اور پوری زمین پر صرف اللہ تعالیٰ کا ہے، جیسا کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات اس پر شاہد ہیں: **إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ** (الانعام: ۵۷) اور **لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ** (البقرة: ۱۰۷) اور **أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ** (الاعراف: ۵۴) وغیرہ، زمین کے انتظام کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نائب آتے ہیں، جو باذنِ خداوندی زمین پر سیاست و حکومت اور بندگانِ خدا کے لئے تعالیٰ کی تعلیم و تربیت کا کام کرتے اور احکامِ الہیہ کو نافذ کرتے ہیں، اس خلیفہ و نائب کا تقرر بلا واسطہ خود حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس میں کسی کے کسبِ عمل کا کوئی دخل نہیں، اسی لئے پوری اُمت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ نبوت کسی چیز نہیں، جس کو کوئی اپنی سعی و عمل سے حاصل کر سکے، بلکہ حق تعالیٰ ہی خود اپنے علم و حکمت کے تقاضے سے خاص خاص افراد کو اس کام کے لئے چن لیتے ہیں، جن کو اپنا نبی و رسول یا خلیفہ و نائب قرار دیتے ہیں، قرآن حکیم نے جگہ جگہ اس کا اظہار فرمایا ہے، ارشاد ہے:-

اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ﴿۵۵﴾ (الحج)
 ”اللہ تعالیٰ انتخاب کر لیتا ہے فرشتوں میں سے اپنے رسول کو اور انسانوں میں سے بے شک اللہ تعالیٰ
 سننے والا دیکھنے والا ہے۔“
 نیز ارشاد ہے:-

اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ۚ (الانعام: ۱۲۴)

”اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ اپنی رسالت کس کو عطا فرما دیں۔“

یہ خلیفہ اللہ بلا واسطہ حق تعالیٰ سے اس کے احکام معلوم کرتے اور پھر ان کو دنیا میں نافذ کرتے ہیں، یہ سلسلہ
 خلافت و نیابت الہیہ آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی انداز میں چلتا رہا، یہاں
 تک کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اس زمین پر اللہ تعالیٰ کے آخری خلیفہ ہو کر بہت ہی اہم خصوصیات کے ساتھ
 تشریف لائے۔

ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپ سے قبل انبیاء خاص خاص قوموں یا ملکوں کی طرف مبعوث ہوتے تھے، ان کا حلقہ حکومت
 و اختیار انہی قوموں اور ملکوں میں محدود ہوتا تھا، ابراہیم علیہ السلام ایک قوم کی طرف، لوط علیہ السلام دوسری قوم کی طرف
 مبعوث ہوئے، حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام اور ان کے درمیان آنے والے انبیاء بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زمین میں اللہ کے آخری خلیفہ ہیں اور آپ کی خصوصیات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے عالم اور اس کی دونوں قوم جنات و انسان کی طرف بھیجا گیا، آپ کا اختیار
 و اقتدار پوری دنیا کی دونوں قوموں پر حاوی فرمایا گیا، قرآن کریم نے آپ کی بعثت و نبوت کے عام ہونے کا اعلان اس
 آیت میں فرمایا:-

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ (الاعراف: ۱۵۸)

”آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف، اللہ وہ ذات ہے جس کے قبضے
 میں ہیں ملک آسمانوں اور زمین کا۔“

اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تمام انبیاء علیہم السلام پر چھ چیزوں
 میں خاص فضیلت بخشی گئی ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کو تمام عالم کا نبی و رسول بنا کر بھیجا گیا۔

دوسری خصوصیت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ پچھلے انبیاء کی خلافت و نیابت جس طرح خاص ملکوں اور قوموں میں محدود ہوتی تھی، اسی طرح ایک خاص زمانے کے لئے مخصوص ہوتی تھی، اُس کے بعد دوسرا رسول آجاتا، تو پہلے رسول کی خلافت و نیابت ختم ہو کر آنے والے رسول کی خلافت قائم ہو جاتی تھی۔

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے خاتم الانبیاء بنا دیا کہ آپ کی خلافت و نیابت قیامت تک قائم رہے گی، اُس کا زمانہ بھی کوئی مخصوص زمانہ نہیں، بلکہ جب تک زمین و آسمان قائم اور زمانے کا وجود ہے وہ بھی قائم ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات و شریعت ایک زمانہ تک محفوظ رہتی اور چلتی تھی، رفتہ رفتہ اُس میں تحریفات ہوتے ہوئے وہ کالعدم ہو جاتی تھیں، اُس وقت کوئی دوسرا رسول اور دوسری شریعت بھیجی جاتی تھی۔

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ کا دین، آپ کی شریعت قیامت تک محفوظ رہے گی، قرآن مجید جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اس کے تو الفاظ اور معانی سب چیزوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لی، اور ارشاد فرمایا:-

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿۹﴾ (الحجر)

”ہم نے ہی قرآن نازل فرمایا اور ہم اس کے محافظ ہیں۔“

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ارشادات جن کو ”حدیث“ کہا جاتا ہے، اس کی حفاظت کا بھی اللہ تعالیٰ نے ایک خاص انتظام فرمادیا کہ قیامت تک آپ کی تعلیمات اور ارشادات کو جان سے زیادہ عزیز سمجھنے والی ایک جماعت باقی رہے گی، جو آپ کے علوم و معارف اور آپ کے شرعی احکام صحیح صحیح لوگوں کو پہنچاتی رہے گی، کوئی اس جماعت کو مٹانہ سکے گا، اللہ تعالیٰ کی تائید غیبی اُن کے ساتھ رہے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کی کتابیں اور صحیفے سب مسخ و محرف ہو جاتے، اور بالآخر دُنیا سے گم ہو جاتے، یا غلط سلط باقی رہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی کتاب قرآن اور آپ کی بتلائی ہوئی ہدایات حدیث سب کی سب اپنے اصلی خدو خال کے ساتھ قیامت تک موجود و محفوظ رہیں گی، اسی لئے اس زمین پر آپ کے بعد نہ کسی نئے نبی اور رسول کی ضرورت ہے، نہ کسی اور خلیفۃ اللہ کی گنجائش۔

چوتھی خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ پچھلے انبیاء کی خلافت و نیابت جو محدود زمانے کے لئے ہوتی تھی، ہر نبی و رسول کے بعد دوسرا رسول من جانب اللہ مقرر ہوتا اور نیابت کا کام سنبھالتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نظام خلافت

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ خلافت و نیابت تا قیامت ہے، اس لئے قیامت تک آپ ہی اس زمین میں خلیفہ اللہ ہیں، آپ کی وفات کے بعد نظام عالم کے لئے جو نائب ہوگا وہ خلیفۃ الرسول اور آپ کا نائب ہوگا، صحیح بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

كَانَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ تَسُوسُهُمُ الْأَنْبِيَاءُ كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ وَإِنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي وَسَيَكُونُ خُلَفَاءُ فَيَكْثُرُونَ۔

”بنی اسرائیل کی سیاست و حکومت اُن کے انبیاء کرتے تھے، ایک نبی فوت ہوتا تو دوسرا نبی آجاتا تھا، اور خبردار رہو کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں، ہاں میرے خلیفہ ہوں گے اور بہت ہوں گے۔“

پانچویں خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ آپ کے بعد آپ کی امت کے مجموعے کو اللہ تعالیٰ نے وہ مقام عطا فرمایا جو انبیاء علیہم السلام کا ہوتا ہے، یعنی امت کے مجموعے کو معصوم قرار دے دیا کہ آپ کی پوری امت کبھی بھی گمراہی اور غلطی پر جمع نہ ہوگی، یہ پوری امت جس مسئلہ پر اجماع و اتفاق کرے وہ حکم خداوندی کا مظہر سمجھا جائے گا، اسی لئے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے بعد اسلام میں تیسری حجت اجماع امت قرار دی گئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

لَنْ تَجْتَمِعَ أُمَّتِي عَلَى الضَّلَالَةِ۔^۱ ”میری امت کبھی گمراہی پر مجتمع نہ ہوگی۔“

اس کی مزید تفصیل اُس حدیث^۲ سے معلوم ہو جاتی ہے جس میں یہ ارشاد ہے کہ میری امت میں ہمیشہ ایک جماعت حق پر قائم رہے گی، دنیا کتنی ہی بدل جائے، حق کتنا ہی مضحل ہو جائے، مگر ایک جماعت حق کی حمایت ہمیشہ کرتی رہے گی، اور انجام کار وہی غالب رہے گی۔

اس سے بھی واضح ہو گیا کہ پوری امت کبھی گمراہی اور غلطی پر جمع نہ ہوگی، اور جبکہ امت کا مجموعہ معصوم قرار دیا گیا تو خلیفہ رسول کا انتخاب بھی اُسی کے سپرد کر دیا گیا، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نیابت زمین اور نظم حکومت کے

۱ صحیح البخاری، کتاب الانبیاء، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل ج: ۱ ص: ۴۹۱ و صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب وجوب الوفاء ببيعة الخلفاء الاول

فلاول ج: ۲ ص: ۱۲۶

۲ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب السواد الأعظم ج: ۲ ص: ۲۸۳

۳ مشکوٰۃ، باب ثواب هذه الأمة ج: ۲ ص: ۵۸۳

لئے انتخاب کا طریقہ مشروع ہو گیا، یہ اُمت جسے خلافت کے لئے منتخب کر دے، وہ خلیفہ رسول کی حیثیت سے نظامِ عالم کا واحد ذمہ دار ہوگا، اور خلیفہ سارے عالم کا ایک ہی ہو سکتا ہے۔

خلفائے راشدینؑ کے آخری عہد تک یہ سلسلہ خلافت صحیح اُصول پر چلتا رہا، اور اسی لئے اُن کے فیصلے صرف دینی اور ہنگامی فیصلوں کی حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ایک محکم دستاویز اور ایک درجے میں اُمت کے لئے حجت مانے جاتے ہیں، کیونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا:-

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ^۱
 ”میری سنت کو لازم پکڑو اور خلفائے راشدین کی سنت کو۔“

خلافتِ راشدہ کے بعد

خلافتِ راشدہ کے بعد کچھ طوائف الملوکی کا آغاز ہوا، مختلف خطوں میں مختلف امیر بنائے گئے، ان میں سے کوئی بھی خلیفہ کہلانے کا مستحق نہیں، ہاں کسی ملک یا قوم کا امیر خاص کہا جاسکتا ہے۔ اور جب پوری دنیا کے مسلمانوں کا اجتماع کسی ایک فرد پر متعذر ہو گیا، اور ہر ملک، ہر قوم کا علیحدہ علیحدہ امیر بنانے کی رسم چل گئی تو مسلمانوں نے اس کا تقرر اسی اسلامی نظریہ کے تحت جاری رکھا کہ ملک کے مسلمانوں کی اکثریت جس کو امیر منتخب کرے وہ ہی اس ملک کا امیر اور اولوالامر کہلائے، قرآن مجید کے ارشاد: وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ^۲ (الشوری: ۳۸) کے عموم سے اس پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔

مغربی جمہوریت اور اسلامی شورایت میں فرق

اسمبلیاں اسی طرزِ عمل کا ایک نمونہ ہیں، فرق اتنا ہے کہ عام جمہوری ملکوں کی اسمبلیاں اور ان کے ممبران بالکل آزاد و خود مختار ہیں، محض اپنی رائے سے جو چاہیں اچھایا برا قانون بنا سکتے ہیں، اسلامی اسمبلی اور اس کے ممبران اور منتخب کردہ امیر سب اس اُصول و قانون کے پابند ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اُن کو ملا ہے، اس اسمبلی یا مجلسِ شوریٰ کی ممبری کے لئے بھی کچھ شرائط ہیں، اور جس شخص کو یہ منتخب کریں اس کے لئے بھی کچھ حدود و قیود ہیں، پھر اُن کی قانون سازی بھی قرآن و سنت کے بیان کردہ اُصول کے دائرے میں ہو سکتی ہے، اس کے خلاف کوئی قانون بنانے کا ان کو اختیار نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو مخاطب کر کے جو ارشاد فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، اس سے دستورِ مملکت کی چند اہم دفعات پر روشنی پڑتی ہے۔

آیت مذکورہ سے دستورِ مملکت کی چند اہم دفعات کا ثبوت

اول یہ کہ آسمان اور زمین میں اقتدارِ اعلیٰ اللہ جل مجدہ کا ہے۔ دوسرے یہ کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی تنفیذ کے لئے اس کا نائب و خلیفہ اس کا رسول ہوتا ہے، اور ضمنی طور پر یہ بھی واضح ہو گیا کہ خلافتِ الہیہ کا سلسلہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا، تو اب خلافتِ رسول کا سلسلہ اُس کے قائم مقام ہوا، اور اس خلیفہ کا تقرر ملت کے انتخاب سے قرار پایا۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ ط

اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب سجدے میں گر پڑے، مگر شیطان، اس نے نہ مانا

وَاسْتَكْبَرَ ۖ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ۝۳۴

اور تکبر کیا، اور تھاوہ کافروں میں کا۔

آسان ترجمہ قرآن

اور (اس وقت کا تذکرہ سنو) جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ: آدم کو سجدہ کرو، چنانچہ سب نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے کہ اس نے انکار کیا، اور متکبرانہ رویہ اختیار کیا اور کافروں میں شامل ہو گیا ۝۳۴

خلاصہ تفسیر

اور جس وقت حکم دیا ہم نے سب فرشتوں کو (اور جنوں کو بھی جیسا کہ بعض روایات میں حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے، غرض ان سب کو یہ حکم دیا گیا کہ) سجدے میں گر جاؤ آدم کے سامنے، سو سب سجدے میں گر پڑے بجز ابلیس کے کہ اس نے کہنا نہ مانا اور غرور میں آگیا، اور ہو گیا کافروں میں سے۔

معارف مسائل

رابط آیات

پچھلے واقعہ میں جب آدم علیہ السلام کی فضیلت فرشتوں پر ظاہر ہو چکی، اور دلائل سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ صلاحیت خلافت کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے وہ آدم علیہ السلام میں سب مجتمع ہیں، اور ملائکہ کو ان میں سے بعض علوم حاصل ہیں، اور جنوں کو تو بہت ہی کم حصہ ان علوم کا حاصل ہے، جیسا کہ اوپر تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے، اور اس حیثیت خاص سے ملائکہ و جن ہر دو گروہ کے علوم کے یہ جامع ہیں، اُن کا شرف ہر دو گروہ پر ظاہر ہو گیا، اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس مقدمہ کو معاملہ سے بھی ظاہر فرمادیا جاوے، اور ملائکہ اور جنوں سے ان کی کوئی خاص تعظیم کرائی جاوے جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ اُن دونوں سے کامل اور مصداق ہے۔

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

کے ہیں، اور آدم علیہ السلام ان علوم خاصہ میں ملائکہ اور جن ہر دو گروہ سے کامل اور دونوں کے علوم و قوئی کو جامع ہیں، جیسا کہ مفصل طور پر مذکور ہوا، اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ان غیر کاملوں سے اُس کامل کی کوئی ایسی تعظیم کرائی جاوے کہ عملاً بھی یہ امر ظاہر ہو جاوے کہ یہ اُن دونوں سے کامل اور جامع ہیں، جب تو یہ دونوں ان کی تعظیم کر رہے ہیں، اور گویا بزبان حال کہہ رہے ہیں کہ جو اوصاف ہم میں الگ الگ ہیں وہ ان کے اندر یکجا ہیں، اس لئے جو عمل تعظیمی تجویز فرمایا گیا ہے اس کی حکایت ذکر فرماتے ہیں کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں، سب فرشتوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے سجدے سے انکار کیا اور غرور میں آ گیا۔

کیا سجدہ کا حکم جنات کو بھی تھا؟

اس آیت میں جو بات صراحتہً مذکور ہے وہ تو یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم فرشتوں کو دیا گیا، مگر آگے جب استثناء کر کے یہ بتلادیا گیا کہ سب فرشتوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے نہیں کیا تو اس سے ثابت ہوا کہ سجدہ آدم کا حکم اُس وقت کی تمام ذوی العقول مخلوقات کے لئے عام تھا، جن میں فرشتے اور جنات سب داخل ہیں، مگر حکم میں صرف فرشتوں کے ذکر پر اس لئے اکتفا کیا گیا کہ وہ سب سے افضل اور اشرف تھے، جب آدم علیہ السلام کی تعظیم کا حکم ان کو دیا گیا تو جنات کا بدرجہ اولیٰ اس حکم میں شامل ہونا معلوم ہو گیا۔

سجدہ تعظیمی پہلی اُمتوں میں جائز تھا، اسلام میں ممنوع ہے

اس آیت میں فرشتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں، اور سورہ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کے والدین اور بھائیوں کا مصر پہنچنے کے بعد یوسف علیہ السلام کو سجدہ کرنا مذکور ہے: وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا (یوسف: ۱۰۰) یہ تو ظاہر ہے کہ یہ سجدہ عبادت کے لئے نہیں ہو سکتا، کیونکہ غیر اللہ کی عبادت شرک و کفر ہے، جس میں یہ احتمال ہی نہیں کہ کسی وقت کسی شریعت میں جائز ہو سکے، اس کے سوا کوئی احتمال نہیں کہ قدیم انبیاء کے زمانے میں سجدے کا بھی وہی درجہ ہوگا جو ہمارے زمانے میں سلام، مصافحہ، معافقہ اور دست بوسی یا تعظیم کے لئے کھڑے ہو جانے کا ہے۔

امام بھٹاویؒ نے ”احکام القرآن“ میں یہی فرمایا ہے کہ انبیاء سابقین کی شریعت میں بڑوں کی تعظیم اور تحیہ کے لئے سجدہ مباح تھا، شریعت محمدیہ میں منسوخ ہو گیا، اور بڑوں کی تعظیم کے لئے صرف سلام، مصافحہ کی اجازت دی گئی، رُکوع، سجدہ اور بہ ہیئت نماز ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے کو ناجائز قرار دیا گیا۔^۱

توضیح اس کی یہ ہے کہ اصل کفر و شرک اور غیر اللہ کی عبادت تو اصول ایمان کے خلاف ہے، وہ کبھی کسی شریعت میں جائز نہیں ہو سکتے، لیکن کچھ افعال و اعمال ایسے ہیں جو اپنی ذات میں شرک و کفر نہیں، مگر لوگوں کی جہالت اور غفلت سے وہ افعال ذریعہ شرک و کفر کا بن سکتے ہیں، ایسے افعال کو انبیاء سابقین کی شریعتوں میں مطلقاً منع نہیں کیا گیا بلکہ ان کو ذریعہ شرک بنانے سے روکا گیا، جیسے جانداروں کی تصویر بنانا اور استعمال کرنا اپنی ذات میں کفر و شرک نہیں، اس لئے پچھلی شریعتوں میں جائز تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے میں مذکور ہے:-

يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَحَارِبٍ وَتَنَاقُلُ

”یعنی جنات اُن کے لئے بڑی محرابیں اور تصویریں بنایا کرتے تھے۔“

اسی طرح سجدہ تعظیمی پچھلی شریعتوں میں جائز تھا، لیکن آخر کار لوگوں کی جہالت سے یہی چیزیں شرک و بت پرستی کا ذریعہ بن گئیں، اور اسی راہ سے انبیاء علیہم السلام کے دین و شریعت میں تحریف ہو گئی، اور پھر دوسرے انبیاء اور دوسری شریعتوں نے آکر اس کو مٹایا، شریعت محمدیہ چونکہ دائمی اور ابدی شریعت ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت ختم اور آپ کی شریعت آخری شریعت ہے، اس لئے اس کو مسخ و تحریف سے بچانے کے لئے ہر ایسے سوراخ کو بند کر دیا گیا جہاں سے شرک و بت پرستی آ سکتی تھی، اسی سلسلہ میں وہ تمام چیزیں اس شریعت میں حرام قرار دے دی گئیں جو کسی زمانے میں شرک و بت پرستی کا ذریعہ بنی تھیں۔

تصویر سازی اور اس کے استعمال کو اس وجہ سے حرام کیا گیا، سجدہ تعظیمی اسی وجہ سے حرام ہوا، ایسے اوقات میں نماز پڑھنے کو حرام کر دیا گیا جن میں مشرکین اور کفار اپنے معبودوں کی عبادت کیا کرتے تھے، کہ یہ ظاہری مطابقت کسی وقت شرک کا ذریعہ نہ بن جائے۔

صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آقاؤں کو یہ حکم دیا کہ اپنے غلام کو عبد یعنی اپنا بندہ کہہ کر نہ پکاریں، اور غلاموں کو یہ حکم دیا کہ وہ آقاؤں کو اپنا رب نہ کہیں، حالانکہ لفظی معنی کے اعتبار سے بندہ کے معنی غلام کے اور رب کے معنی پالنے والے اور تربیت کرنے والے کے ہیں، ایسے الفاظ کا استعمال ممنوع نہ ہونا چاہئے تھا، مگر محض اس لئے کہ یہ الفاظ موہم شرک ہیں، کسی وقت جہالت سے یہی الفاظ آقاؤں کی پرستش کا دروازہ نہ کھول دیں، اس لئے ان الفاظ کے استعمال سے روک دیا گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو فرشتوں کا سجدہ اور یوسف علیہ السلام کو ان کے والدین اور بھائیوں کا سجدہ جو قرآن میں مذکور ہے، یہ سجدہ تعظیمی تھا، جو ان کی شریعت میں سلام، مصافحہ اور دست بوسی کا درجہ رکھتا تھا، اور جائز تھا، شریعت محمدیہ کو کفر و شرک کے شائبہ سے بھی پاک رکھنا تھا، اس لئے اس شریعت میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بقصد تعظیم بھی سجدہ یا رکوع کرنا جائز نہیں رکھا گیا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ نماز جو اصل عبادت ہے، اس میں چار طرح کے افعال ہیں، کھڑا ہونا، بیٹھنا، رکوع، سجدہ، ان میں سے پہلے دو یعنی کھڑا ہونا اور بیٹھنا تو ایسے کام ہیں جو عادت بھی انسان اپنی ضرورتوں کے لئے کرتا ہے اور عبادت بھی نماز میں کئے جاتے ہیں، مگر رکوع اور سجدہ ایسے فعل ہیں جو انسان عادت نہیں کرتا، وہ عبادت ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، اس لئے ان دونوں کو شریعت محمدیہ میں عبادت ہی کا حکم دے کر غیر اللہ کے لئے ممنوع کر دیا۔

اب یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ سجدہ تعظیمی کا جواز تو قرآن کی مذکورہ آیات سے ثابت ہے، شریعت محمدیہ میں اس کا منسوخ ہونا کس دلیل سے ثابت ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث متواترہ مشہورہ سے سجدہ تعظیمی کا حرام ہونا ثابت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں غیر اللہ کے لئے سجدہ تعظیمی کو جائز قرار دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ شوہر کو سجدہ کیا کرے،^۲ (مگر اس شریعت میں سجدہ تعظیم مطلقاً حرام ہے، اس لئے کسی کو کسی کے لئے جائز نہیں)۔

۱ صحیح مسلم، کتاب الألفاظ من الأدب وغیرھا، باب حکم إطلاق لفظة العبد... إلخ ج: ۲، ص: ۲۳۸

۲ مشکوٰۃ، کتاب النکاح، باب عشرة النساء... إلخ ج: ۲، ص: ۲۸۲

یہ حدیث بیس صحابہ کرامؓ کی روایت سے ثابت ہے، اُصول حدیث کی معروف کتاب ”تدریب الراوی“ میں ہے کہ جس روایت کو دس صحابہ کرامؓ نقل فرمادیں تو وہ حدیث متواتر ہو جاتی ہے، جو قرآن کی طرح قطعی ہے، یہاں تو بیس صحابہ کرامؓ سے منقول ہے، یہ بیس صحابہؓ کی روایتیں حاشیہ ”بیان القرآن“ میں حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جمع فرمادی ہیں، ضرورت ہو تو وہاں دیکھا جاسکتا ہے۔^[۲]

ابلیس کا کفر محض عملی نافرمانی کا نتیجہ نہیں

مسئلہ:- ابلیس کا کفر محض عملی نافرمانی کا نتیجہ نہیں، کیونکہ کسی فرض کو عملاً ترک کر دینا اُصول شریعت میں فسق و گناہ ہے، کفر نہیں۔ ابلیس کے کفر کا اصل سبب حکم ربانی سے معارضہ اور مقابلہ کرنا ہے کہ آپ نے جس کو سجدہ کرنے کا مجھے حکم دیا ہے وہ اس قابل نہیں کہ میں اس کو سجدہ کروں، یہ معارضہ بلاشبہ کفر ہے۔

ابلیس کو ”طاؤس الملائکۃ“ کہا جاتا تھا

مسئلہ:- یہ بات قابل غور ہے کہ ابلیس علم و معرفت میں یہ مقام رکھتا تھا کہ اس کو ”طاؤس الملائکۃ“ کہا جاتا تھا، پھر اس سے یہ حرکت کیسے صادر ہوئی؟ بعض علماء نے فرمایا کہ اس کے تکبر کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے اس سے اپنی دی ہوئی معرفت اور علم و فہم کی دولت سلب کر لی، اس لئے ایسی جہالت کا کام کر بیٹھا۔ بعض نے فرمایا کہ جب جاہ اور خود پسندی نے حقیقت شناسی کے باوجود اس بلا میں مبتلا کر دیا۔ تفسیر ”روح المعانی“ میں اس جگہ ایک شعر نقل کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض اوقات کسی گناہ کے وبال سے تائید حق انسان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے، تو اس کی ہر کوشش اور عمل اس کو گمراہی کی طرف دھکیل دیتا ہے، شعر یہ ہے۔

إِذَا لَمْ يَكُنْ عَوْنُ مِّنَ اللَّهِ لِلْفَتَىٰ

فَأَوَّلُ مَا يَجْنِي عَلَيْهِ اجْتِهَادُهُ^[۳]

”روح المعانی“ میں اس سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ انسان کا ایمان وہی معتبر ہے جو آخر عمر اور اوّل منازلِ آخرت تک ساتھ رہے، موجودہ ایمان و عمل اور علم و معرفت پر غرہ نہ ہونا چاہئے۔ (روح)^[۴]

۱ تدریب الراوی، النوع الثلاثون ... إلخ ج: ۲ ص: ۷۵

۲ تفصیل کے لئے دیکھئے: بیان القرآن تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۲۹، ۳۰

۳ ترجمہ:- انسان کی جب اللہ کی طرف سے مدد نہ ہو تو اس کی کوشش ہی اسے گمراہی کی طرف لے جاتی ہے۔

۴ روح المعانی ج: ۱ ص: ۲۳۱

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا^ص

اور ہم نے کہا: اے آدم! رہا کر تو اور تیری عورت جنت میں اور کھاؤ اس میں جو چاہو، جہاں کہیں سے چاہو،

وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۳۵﴾ فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا

اور پاس مت جانا اس درخت کے پھر تم ہو جاؤ گے ظالم۔ پھر ہلادیا ان کو شیطان نے اس جگہ سے

فَاخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ^ص وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ^ج

پھر نکالا ان کو اس عزت و راحت سے کہ جس میں تھے، اور ہم نے کہا: تم سب اُترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿۳۶﴾

اور تمہارے واسطے زمین میں ٹھکانا ہے اور نفع اٹھانا ایک وقت تک۔

آسان ترجمہ قرآن

اور ہم نے کہا: ”آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو، اور اس میں سے جہاں سے چاہو جی بھر کے کھاؤ، مگر اس درخت کے پاس بھی مت جانا، ورنہ تم ظالموں میں شمار ہو گے۔“ ﴿۳۵﴾ پھر ہوا یہ کہ شیطان نے ان دونوں کو وہاں سے ڈگمگادیا، اور جس (عیش) میں وہ تھے اس سے انہیں نکال کر رہا، اور ہم نے (آدم، ان کی بیوی اور ابلیس سے) کہا: ”اب تم سب یہاں سے اُتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے، اور تمہارے لئے ایک مدت تک زمین میں ٹھہرنا اور کسی قدر فائدہ اٹھانا (طے کر دیا گیا) ہے“ ﴿۳۶﴾

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم! رہا کر تو اور تمہاری بی بی (جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے آدم علیہ السلام کی پسلی سے کوئی مادہ لے کر بنادیا تھا) بہشت میں پھر کھاؤ دونوں اس میں سے با فراغت جس جگہ سے چاہو اور نزدیک نہ جائیو اس درخت کے ورنہ تم بھی انہی میں شمار ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھے ہیں (خدا جانے وہ کیا درخت تھا، مگر اس کے

یہ تھا کہ اس کا پھل نہ کھاؤ، مگر تاکید کے طور پر عنوان یہ اختیار کیا گیا کہ اس کے پاس بھی نہ جاؤ، اور مراد یہی ہے کہ کھانے کے لئے اس کے پاس نہ جاؤ۔ یہ درخت کونسا تھا، قرآن کریم نے متعین نہیں کیا، اور کسی مستند حدیث میں بھی اس کی تعیین مذکور نہیں، ائمہ تفسیر میں سے کسی نے گندم کا درخت قرار دیا، کسی نے انگور کا، کسی نے انجیر کا، مگر جس کو قرآن وحدیث نے مبہم چھوڑا ہے اس کو متعین کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ (قرطبی)

فَتَكُونُ نَامِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۳۵﴾ یعنی اگر آپ نے اس شجرِ ممنوعہ کو کھایا تو آپ ظالموں میں داخل ہو جائیں گے۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا، ”زَلَّه“ کے معنی عربی لغت میں لغزش کے ہیں، ”اِزْلَالُ“ کے معنی کسی کو لغزش دینا، معنی یہ ہیں کہ شیطان نے آدم و حوا کو لغزش دے دی، قرآن کے یہ الفاظ صاف اس کا اظہار کر رہے ہیں کہ حضرت آدم و حوا کی یہ خلاف ورزی اس طرح کی نہ تھی جو عام گناہگاروں کی طرف سے ہوا کرتی ہے، بلکہ شیطانی تلمیس سے کسی دھوکہ فریب میں مبتلا ہو کر ایسے اقدام کی نوبت آگئی کہ جس درخت کو ممنوع قرار دیا تھا اُس کا پھل وغیرہ کھا بیٹھے، عَنِهَا میں لفظ ”عَنْ“ بمعنی سبب ہے، یعنی اُس درخت کے سبب و ذریعے سے شیطان نے آدم و حوا کو لغزش میں مبتلا کر دیا۔

یہاں ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ جب شیطان کو سجدے سے انکار کی بنا پر پہلے ہی مردود کر کے جنت سے نکال دیا گیا تھا، تو یہ آدم و حوا کو بہکانے کے لئے جنت میں کیسے پہنچا؟ اس کا بے غبار جواب یہ ہے کہ شیطان کے بہکانے اور وہاں تک پہنچنے کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ بغیر ملاقات کے اُن کے دل میں وسوسہ ڈالا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ شیطان جنات میں سے ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جنات کو بہت سے ایسے تصرفات پر قدرت دی ہے جو عام طور پر انسان نہیں کر سکتے، ان کو مختلف شکلوں میں متشکل ہو جانے کی بھی قدرت دی ہے، ہو سکتا ہے کہ اپنی قوتِ جتنیہ کے ذریعے مسمریزم کی صورت سے آدم و حوا کے ذہن کو متاثر کیا ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی دوسری شکل میں مثلاً سانپ وغیرہ کی شکل میں متشکل ہو کر جنت میں داخل ہو گیا ہو، اور شاید یہی سبب ہوا کہ آدم علیہ السلام کو اس کی دشمنی کی طرف دھیان نہ رہا، قرآن مجید کی آیت: وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۳۱﴾ (الاعراف: ۲۱) سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے صرف وسوسہ اور ذہنی اثر ڈالنے سے کام نہیں لیا بلکہ آدم و حوا سے زبانی گفتگو کر کے اور قسمیں کھا کر متاثر کیا۔

فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ۚ یعنی شیطان نے اس دھوکہ اور لغزش کے ذریعے آدم و حوا علیہما السلام کو ان نعمتوں سے نکال دیا جن میں وہ آرام سے گزر رہے تھے، یہ نکالنا اگرچہ حکمِ خداوندی ہوا، مگر سبب اس کا شیطان تھا، اس لئے نکالنے کی نسبت اُس کی طرف کر دی گئی۔

وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ یعنی ”ہم نے حکم دیا کہ نیچے اتر جاؤ، اس طرح کہ تم میں بعضے بعضوں کے دشمن

رہیں گے، اس حکم کے مخاطب حضرت آدم و حوا ہیں، اور اگر شیطان کو اس وقت تک آسمانوں سے باہر نہیں کیا گیا تھا تو وہ بھی اسی خطاب میں شامل ہے، اس صورت میں باہم عداوت ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ شیطان کے ساتھ تمہاری عداوت کا سلسلہ دُنیا میں بھی جاری رہے گا، اور اگر بقول بعض اس واقعہ کے وقت سے پہلے ہی شیطان نکالا جا چکا تھا، تو پھر اس کلام کا رُخ آدم و حوا اور اُن کی اولاد کی طرف ہوگا، کہ ان کو بطورِ عتاب کے یہ بتلایا گیا کہ ایک سزا تو یہ ہے کہ جنت سے زمین پر اتارا گیا، دُوسری سزا اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ آپ کی اولاد کے درمیان باہم عداوتیں بھی ہوں گی، اور ظاہر ہے کہ اولاد کے باہم عداوت ہونے سے والدین کا لطفِ زندگی بھی رخصت ہو جاتا ہے، تو یہ بھی ایک قسم کی معنوی اور روحانی سزا ہوگی۔ (بیان القرآن) ^[۱]

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿۳۶﴾ یعنی آدم و حوا علیہما السلام کو یہ بھی ارشاد ہوا کہ تم کو زمین پر کچھ عرصہ ٹھہرنا ہے اور ایک معیادِ معین تک کام چلانا ہے، یعنی زمین پر جا کر بھی دوام نہ ملے گا، کچھ مدت کے بعد اس گھر کو بھی چھوڑنا پڑے گا۔

آیاتِ مذکورہ سے متعلقہ مسائل و احکام شرعیہ

اُسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ میں حضرت آدم و حوا علیہما السلام دونوں کے لئے جنت کو مسکن بنانے کا ارشاد ہے، جس کو مختصر لفظوں میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے: ”اُسْكُنَا الْجَنَّةَ“ یعنی آپ دونوں جنت میں میں رہیں، جیسا کہ اس کے بعد کَلَّا اور لَا تَقْرَبَا میں دونوں کو ایک ہی صیغے میں جمع کیا گیا ہے، مگر یہاں اس کے خلاف اَنْتَ وَزَوْجُكَ کے الفاظ کو اختیار کرنے میں مخاطب صرف حضرت آدم علیہ السلام کو قرار دیا اور انہی سے فرمایا کہ آپ کی زوجہ بھی جنت میں رہے، اس میں دو مسئلوں کی طرف اشارہ ہے:-

مسئلہ:- اول یہ کہ بیوی کے لئے رہائش کا انتظام شوہر کے ذمہ ہے، دُوسرے یہ کہ سکونت میں بیوی شوہر کے تابع ہے، جس مکان میں شوہر رہے اس میں اس کو رہنا چاہئے۔

مسئلہ:- لفظ اُسْكُنْ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس وقت ان دونوں حضرات کے لئے جنت کا قیام محض عارضی تھا، دائمی قیام جو شانِ ملکیت کی ہوتی ہے وہ نہ تھی، کیونکہ لفظ اُسْكُنْ کے معنی یہ ہیں کہ اس مکان میں رہا کرو، یہ نہیں فرمایا کہ یہ مکان تمہیں دے دیا گیا، یہ تمہارا مکان ہے، وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ آئندہ ایسے حالات پیش آئیں گے کہ آدم و حوا علیہما السلام کو جنت کا مکان چھوڑنا پڑے گا، نیز جنت کا استحقاقِ ملکیت ایمان اور عملِ صالح کر کے معاوضہ میں حاصل ہوتا ہے، جو قیامت کے بعد ہوگا، اسی سے حضراتِ فقہاء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو کہے

کہ ”میرے گھر میں رہا کرو“، یا یہ کہ ”میرا گھر تمہارا مسکن ہے“ اس سے مکان کی ملکیت اور دائمی استحقاق اس شخص کو حاصل نہیں ہوتا۔ (قرطبی) [۱]

غذا و خوراک میں بیوی شوہر کے تابع نہیں

وَكَلَامُهَا رَعْدًا یعنی ”کھاؤ تم دونوں جنت سے با فراغت“ اس میں بطرز مذکور سابق خطاب صرف آدم علیہ السلام کو نہیں کیا گیا بلکہ دونوں کو ایک ہی لفظ میں شریک کر کے وَكَلَامُهَا فرمایا، اس میں اشارہ اس کی طرف ہو سکتا ہے کہ غذا اور خوراک میں بیوی شوہر کے تابع نہیں، وہ اپنی ضرورت و خواہش کے وقت اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرے، اور یہ اپنی خواہش کے مطابق۔

ہر جگہ چلنے پھرنے کی آزادی انسان کا فطری حق ہے

رَعْدًا حَيْثُ شِئْتُمْ، لفظ رَعْدًا ماکولات میں وسعت و کثرت کی طرف اشارہ ہے کہ جو چیز جتنی چاہیں کھا سکتے ہیں، بجز ایک درخت کے اور کسی چیز میں رُکاوٹ اور ممانعت نہیں، اور لفظ شِئْتُمْ میں مقامات کی وسعت کا بیان ہے کہ پوری جنت میں جہاں چاہیں جس طرح چاہیں کھائیں، کوئی خطہ ممنوع نہیں، اس میں اشارہ ہے کہ چلنے پھرنے اور مختلف مقامات سے اپنی ضروریات حاصل کرنے کی آزادی انسان کا فطری حق ہے، ایک محدود و معین مقام یا مکان میں اگرچہ ضرورت و خواہش کی ساری چیزیں مہیا کر دی جائیں، مگر وہاں سے باہر جانا ممنوع ہو تو یہ بھی ایک قسم کی قید ہے اس لئے حضرت آدم علیہ السلام کو کھانے پینے کی تمام چیزیں بکثرت و فراغت عطا کر دینے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ حَيْثُ شِئْتُمْ فرما کر ان کو چلنے پھرنے اور ہر جگہ جانے کی آزادی بھی دی گئی۔

سدِّ ذرائع کا مسئلہ

وَلَا تَقْرَبُوا هَذِهِ الشَّجَرَةَ یعنی ”اس درخت کے قریب بھی نہ جاؤ۔“ ظاہر ہے کہ اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس درخت یا اس کے پھل کو نہ کھاؤ، مگر احتیاطی حکم یہ دیا گیا کہ اس کے قریب بھی نہ جاؤ، اس سے اُصول فقہ کا مسئلہ سدِّ ذرائع ثابت ہوا، یعنی بعض چیزیں اپنی ذات میں ناجائز یا ممنوع نہیں ہوتیں، لیکن جب یہ خطرہ ہو کہ ان چیزوں کے اختیار کرنے سے کسی حرام ناجائز کام میں مبتلا ہو جائے گا تو اس جائز چیز کو بھی روک دیا جاتا ہے، جیسے درخت کے قریب جانا ذریعہ بن سکتا تھا اس کے پھل پھول کھانے کا، اُس ذریعے کو بھی منع فرما دیا گیا، اسی کا نام اُصول فقہ کی اصطلاح میں ”سدِّ ذرائع“ ہے۔

مسئلہ عصمتِ انبیاء

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو کسی خاص درخت کے کھانے سے منع فرمایا گیا تھا، اور اس پر بھی متنبہ کر دیا گیا تھا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں گناہ میں مبتلا کر دے، اس کے باوجود آدم علیہ السلام نے اُس درخت سے کھا لیا جو بظاہر گناہ ہے، حالانکہ انبیاء علیہم السلام گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ تحقیق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت تمام گناہوں سے عقلاً اور نقلاً ثابت ہے، ائمہ اربعہ اور جمہور اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم و محفوظ ہوتے ہیں۔ اور بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ صغیرہ گناہ اُن سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں، جمہور اُمت کے نزدیک صحیح نہیں۔ (قرطبی) ۱

وجہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو لوگوں کا مقتدا بنا کر بھیجا جاتا ہے، اگر ان سے بھی کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف خواہ گناہ کبیرہ ہو یا صغیرہ صادر ہو سکے تو انبیاء کے اقوال و افعال سے امن اُٹھ جائے گا، اور وہ قابلِ اعتماد نہیں رہیں گے، جب انبیاء ہی پر اعتماد و اطمینان نہ رہے تو دین کا کہاں ٹھکانا ہے۔

البتہ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں متعدد انبیاء کے متعلق ایسے واقعات مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن پر عتاب بھی ہوا، حضرت آدم علیہ السلام کا یہ قصہ بھی اسی میں داخل ہے۔

ایسے واقعات کا حاصل باتفاق اُمت یہ ہے کہ کسی غلط فہمی یا خطا و نسیان کی وجہ سے اس کا صدور ہو جاتا ہے، کوئی پیغمبر جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف عمل نہیں کرتا، غلطی اجتہادی ہوتی ہے، یا خطا و نسیان کے سبب، قابلِ معافی ہوتی ہے، جس کو اصطلاح شرع میں گناہ نہیں کہا جاسکتا، اور یہ سہو و نسیان کی غلطی اُن سے ایسے کاموں میں نہیں ہو سکتی جن کا تعلق تبلیغ و تعلیم اور تشریع سے ہو، بلکہ اُن سے ذاتی افعال اور اعمال میں ایسا سہو و نسیان ہو سکتا ہے۔ (تفسیر بحر المحیط) ۲

مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا مقام نہایت بلند ہے، اور بڑوں سے چھوٹی سی غلطی بھی ہو جائے تو بہت بڑی غلطی سمجھی جاتی ہے، اس لئے قرآن حکیم میں ایسے واقعات کو معصیت اور گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس پر عتاب بھی کیا گیا ہے، اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے وہ گناہ ہی نہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کے اس واقعے کے متعلق علمائے تفسیر نے بہت سی توجیہات لکھی ہیں، ان میں چند یہ ہیں:-
اول یہ کہ جس وقت آدم علیہ السلام کو منع کیا گیا تھا، تو ایک خاص درخت کی طرف اشارہ کر کے منع کیا گیا کہ اس کے قریب نہ جاؤ، اور مراد خاص یہی درخت نہیں تھا، بلکہ اس کی جنس کے سارے درخت مراد تھے، جیسے حدیث میں ہے کہ

تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۳۰۷ تا ۳۰۹

تفسیر البحر المحیط باختصار تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۲۰۳، ۲۰۴

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ریشمی کپڑا اور ایک ٹکڑا سونے کا ہاتھ میں لے کر ارشاد فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں۔ ظاہر ہے کہ حرمت صرف اُس کپڑے اور سونے کے ساتھ مخصوص نہیں تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں تھے۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کو یہ خیال ہو گیا کہ جس درخت کی طرف اشارہ کر کے منع کیا گیا تھا ممانعت اسی کے ساتھ خاص ہے، شیطان نے یہی وسوسہ اُن کے دل میں مزین اور مستحکم کر دیا، اور قسمیں کھا کر یہ باور کرایا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، تمہیں کسی ایسے کام کا مشورہ نہیں دے رہا جو تمہارے لئے ممنوع یا مضر ہو، جس درخت کی ممانعت کی گئی ہے وہ دوسرا ہے، اس درخت کی ممانعت نہیں ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ شیطان نے یہ وسوسہ دل میں ڈالا ہو کہ اس درخت کی ممانعت صرف آپ کی ابتداء پیدا نش کے وقت کے ساتھ مخصوص تھی، جیسے چھوٹے بچوں کو اول عمر میں قوی غذا سے روکا جاتا ہے، ہلکی غذا دی جاتی ہے، اور قوت پیدا ہو جانے کے بعد ہر غذا کی اجازت ہو جاتی ہے، تو اب آپ قوی ہو چکے ہیں، اس لئے وہ ممانعت باقی نہیں رہی۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جس وقت شیطان نے اس درخت کے کھانے کے منافع بتلائے کہ اس کے کھانے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنت کی نعمتوں میں رہنے کا اطمینان ہو جائے گا، اُس وقت اُن کو وہ ممانعت یاد نہ رہی ہو جو ابتداء آفرینش کے وقت اس درخت کے متعلق کی گئی تھی، قرآن مجید کی آیت: فَتَنِّي وَلَمْ يَجِدْ لَهُ عِزًّا (طہ: ۱۱۵) یعنی ”آدم علیہ السلام بھول گئے اور ہم نے ان میں پختگی نہ پائی۔“ یہ اسی احتمال کی تائید کرتی ہے۔

بہر حال اس طرح کے متعدد احتمالات ہو سکتے ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ جان بوجھ کر نافرمانی کا صدور حضرت آدم علیہ السلام سے نہیں ہوا، بھول ہو گئی، یا اجتہادی لغزش جو درحقیقت گناہ نہیں۔ مگر آدم علیہ السلام کی شان نبوت اور قرب خداوندی کے مقام عالی کے اعتبار سے یہ لغزش بھی بڑی سمجھی گئی، اور قرآن میں اس کو معصیت کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا، اور آدم علیہ السلام کی توبہ واستغفار کے بعد معاف کرنے کا ذکر فرمایا گیا۔

اور یہ بحث فضول ہے کہ جب شیطان کو جنت سے مردود کر کے نکال دیا گیا تھا تو پھر وہ آدم علیہ السلام کو بہکانے کے لئے وہاں کس طرح پہنچا؟ کیونکہ شیطان کے بہکانے اور وسوسہ ڈالنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جنت میں داخل ہو کر ہی وسوسہ ڈالے، جنات و شیاطین کو حق تعالیٰ نے یہ قدرت دی ہے کہ وہ دُور سے بھی دل میں وسوسہ ڈال سکتے ہیں۔ اور اگر داخل ہو کر بالمشافہ گفتگو ہی کو تسلیم کیا جائے تو اس کے بھی مختلف احتمالات ہو سکتے ہیں جس کی تحقیق میں پڑنا بے فائدہ اور لایعنی بحث ہے۔

اسی طرح یہ سوال کہ آدم و حوا علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا: إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمُاعَدُوٌّ

مُتَبَيِّنٌ ۝۲۱ (الاعراف) کہ ”شیطان تمہارا دشمن ہے“ ایسا نہ ہو کہ یہ کوئی ایسا کام کرادے جس کی وجہ سے تمہیں جنت سے نکلنا پڑے، پھر حضرت آدم علیہ السلام اس کے دھوکے میں کس طرح آگئے؟ اس کا جواب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنات و شیاطین کو مختلف شکلوں میں ظاہر ہونے کی قدرت عطا فرمائی ہے، ممکن ہے کہ وہ کسی ایسی صورت میں سامنے آیا ہو جس کی وجہ سے آدم علیہ السلام یہ نہ پہچان سکے کہ یہ شیطان ہے۔

فَتَلَقَّى آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۖ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝۲۲

پھر سیکھ لیں آدم نے اپنے رب سے چند باتیں پھر متوجہ ہو گیا اللہ اس پر بے شک وہی ہے توبہ قبول کرنے والا مہربان۔

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ

ہم نے حکم دیا نیچے جاؤ یہاں سے تم سب، پھر اگر تم کو پہنچے میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو چلا میری ہدایت پر

فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝۲۸ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا

نہ خوف ہوگا اُن پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جو لوگ منکر ہوئے اور جھٹلایا ہماری نشانیوں کو

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝۳۹

وہ ہیں دوزخ میں جانے والے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

آسان ترجمہ قرآن

پھر آدم نے اپنے پروردگار سے (توبہ کے) کچھ الفاظ سیکھ لئے (جن کے ذریعے انہوں نے توبہ مانگی) چنانچہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ بیشک وہ بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے ۝۲۸ ہم نے کہا: ”اب تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر اگر میری طرف سے کوئی ہدایت تمہیں پہنچے، تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کو نہ کوئی خوف ہوگا، اور نہ وہ کسی غم میں مبتلا ہوں گے۔ ۝۲۸ اور جو لوگ کفر کا ارتکاب کریں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے وہ دوزخ والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔“ ۝۳۹

خلاصہ تفسیر

بعد ازاں حاصل کر لئے آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند الفاظ (یعنی معذرت کے کلمات کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی سے حاصل ہوئے تھے، حضرت آدم علیہ السلام کی ندامت پر اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوئی اور خود ہی معذرت کے الفاظ تلقین فرمادیئے) تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی اُن پر (یعنی توبہ قبول کر لی) بے شک وہی ہیں بڑے توبہ قبول کرنے والے بڑے مہربان (اور حضرت حوا کی توبہ کا بیان سورہ اعراف میں ہے: **قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا**، جس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی توبہ اور قبول توبہ میں آدم علیہ السلام کے ساتھ شریک رہیں، مگر معاف فرمانے کے بعد بھی زمین پر جانے کے حکم کو منسوخ نہیں فرمایا کیونکہ اس میں ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں مضمر تھیں، البتہ اس کا طرز بدل دیا کہ پہلا حکم زمین پر اُترنے کا حاکمانہ طور پر بطرز سزا تھا، اب یہ حکم حکیمانہ انداز سے اس طرح ارشاد ہوا: **قُلْنَا اهْبِطْ مِنْهَا جَمِيعًا** (یعنی) ہم نے حکم فرمایا کہ نیچے جاؤ اس بہشت سے سب کے سب، پھر اگر آؤ تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت (یعنی احکام شرعیہ بذریعہ وحی) سو جو شخص پیروی کرے گا میری اس ہدایت کی تو نہ کچھ اندیشہ ہوگا ان پر اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے (یعنی اُن پر کوئی خوفناک واقعہ نہ پڑے گا، اور قیامت کے ہولناک واقعات سے اُن کا بھی خوف زدہ ہونا اس کے منافی نہیں، جیسا کہ احادیث صحیحہ میں سب پر ہول اور خوف کا عام ہونا معلوم ہوتا ہے، ”حزن“ وہ کیفیت ہے جو کسی مضرت و مصیبت کے واقع ہو جانے کے بعد قلب میں پیدا ہوتی ہے، اور خوف ہمیشہ قبل وقوع ہوا کرتا ہے، یہاں حق تعالیٰ نے حزن و غم دونوں کی نفی فرمادی، کیونکہ اُن پر کوئی آفت و کلفت واقع نہ ہوگی جس سے حزن یا خوف ہو، آگے ان لوگوں کا حال بیان کیا ہے جو اس ہدایت کی پیروی نہ کریں، فرمایا: اور جو لوگ کفر کریں گے اور تکذیب کریں گے ہمارے احکام کی، یہ لوگ ہوں گے دوزخ والے، وہ اس میں ہمیشہ کور ہیں گے۔

معارف مسائل

ربط آیات

پچھلی آیات میں شیطانی دسوسہ اور حضرت آدم کی لغزش اور اس کے نتیجہ میں جنت سے نکلنے اور زمین پر اُترنے کا حکم مذکور تھا، حضرت آدم علیہ السلام نے ایسے خطاب و عتاب کہاں سنے تھے، نہ ایسے سنگدل تھے کہ اس کی سہار کر جاتے، بے چین ہو گئے، اور فوراً ہی معافی کی التجا کرنے لگے، مگر پیغمبرانہ معرفت اور اس کی وجہ سے انتہائی ہیبت سے کوئی بات زبان سے نہ نکلتی تھی، یا اس خوف سے کہ معافی کی التجا کہیں خلاف شان ہو کر مزید عتاب کا سبب نہ بن جائے، زبان

خاموش تھی، اللہ رب العزت دلوں کی بات سے واقف اور رحیم و کریم ہیں، یہ حالت دیکھ کر خود ہی معافی کے لئے کچھ کلمات ان کو سکھا دیئے، اس کا بیان ان آیات میں ہے کہ: ”آدم علیہ السلام نے حاصل کر لئے اپنے رب سے چند الفاظ، تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی (یعنی اُن کی توبہ قبول کر لی) بے شک وہی ہیں بڑے توبہ قبول کرنے والے مہربان۔“ مگر چونکہ رُوئے زمین پر آنے میں اور بھی ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں مضمر تھیں، مثلاً ان کی نسل سے فرشتوں اور جنات کے درمیان ایک نئی نوع انسان کا وجود میں آنا، اور ان کو ایک طرح کا اختیار دے کر احکام شرعیہ کا مکلف بنانا، پھر ان میں خلافتِ الہیہ قائم کرنا، حدود اور احکام شرعیہ نافذ کرنا، تاکہ یہ نئی مخلوق ترقی کر کے اس مقام پر پہنچ سکے جو بہت سے فرشتوں کو بھی نصیب نہیں، اور ان مقاصد کا ذکر تخلیقِ آدم علیہ السلام سے پہلے یہ کر دیا گیا: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی السَّمٰوٰتِ وَ اِلَیْہِ رُجُوعٌ (البقرة: ۳۰)

اس لئے خطا معاف کرنے کے بعد بھی زمین پر اترنے کا حکم منسوخ نہیں فرمایا، البتہ اس کا طرز بدل دیا کہ پہلا حکم حاکمانہ اور زمین پر اترنا بطور سزا کے تھا، اب یہ ارشاد حکیمانہ اور زمین پر آنا خلافتِ الہیہ کے اعزاز کے ساتھ ہوا، اس لئے بعد کی آیات میں اُن فرائض منصبی کا بیان ہے جو ایک خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے اُن پر عائد کئے گئے تھے، اسی لئے زمین پر اترنے کے حکم کو پھر مکرر بیان کر کے فرمایا کہ: ”ہم نے حکم فرمایا کہ نیچے جاؤ اس جنت سے سب کے سب پھر اگر آوے تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت، (یعنی احکام شرعیہ بذریعہ وحی کے) تو جو شخص پیروی کرے گا میری اس ہدایت کی، تو نہ کچھ اندیشہ ہوگا ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“ یعنی نہ کسی گزشتہ چیز کے فوت ہونے کا غم ہوگا، نہ آئندہ کسی تکلیف کا خطرہ۔

تَلَقَّیْ، تلقی کے معنی ہیں شوق اور رغبت کے ساتھ کسی کا استقبال کرنا، اور اس کو قبول کرنا (روح، کشف)، مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب اُن کو توبہ کے کلمات کی تلقین کی گئی تو آدم علیہ السلام نے اہتمام کے ساتھ اُن کو قبول کیا۔ **کَلِمَتٍ**، وہ کلمات جو حضرت آدم علیہ السلام کو بغرضِ توبہ بتلائے گئے کیا تھے، اس میں مفسرین صحابہؓ سے کئی روایات منقول ہیں، مشہور قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے کہ وہ کلمات وہی ہیں جو قرآن مجید میں دوسری جگہ منقول ہیں یعنی: رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝۲۳ (الاعراف)

تَابَ، توبہ کے اصل معنی رُجوع کرنے کے ہیں، اور جب توبہ کی نسبت بندے کی طرف کی جاتی ہے تو اس کے معنی تین چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے، اول اپنے کئے ہوئے گناہ کو گناہ سمجھنا اور اس پر نادم و شرمندہ ہونا، دوسرے اس گناہ کو بالکل چھوڑ دینا، تیسرے آئندہ کے لئے دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عزم و ارادہ کرنا۔ اگر ان تین چیزوں میں سے ایک کی بھی کمی ہوئی

تو وہ توبہ نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ محض زبان سے ”اللہ توبہ“ کے الفاظ بول دینا نجات کے لئے کافی نہیں، جب تک یہ تینوں چیزیں جمع نہ ہوں، یعنی گزشتہ پر ندامت اور حال میں اُس کا ترک، اور مستقبل میں اس کے نہ کرنے کا عزم و ارادہ۔ **تَابَ عَلَيْهِ** یہاں توبہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اس کے معنی توبہ قبول کرنا۔ بعض سلف سے پوچھا گیا کہ جس شخص سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے وہ کیا کرے؟ تو فرمایا: وہی کام کرے جو اس کے پہلے والدین آدم و حوا علیہما السلام نے کیا کہ اپنے کئے پر ندامت، اور آئندہ نہ کرنے کے عزم کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی کے لئے عرض کیا: رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا (یعنی ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کر لیا ہے، اگر آپ معاف نہ کریں اور ہم پر رحم نہ کریں تو ہم سخت خسارے والوں میں داخل ہو جائیں گے)۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي (القصص: ۱۶) یعنی ”اے میرے پالنے والے! میں نے اپنی جان پر ظلم کر لیا ہے، تو آپ ہی میری مغفرت فرمائیے۔“ اور حضرت یونس علیہ السلام سے جب لغزش ہو گئی تو عرض کیا: لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۸۵﴾ (الانبیاء) یعنی ”اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، آپ ہر برائی سے پاک ہیں، میں ظلم کرنے والوں میں داخل ہو گیا ہوں“ مطلب یہ ہے کہ مجھ پر رحم فرمائیے۔ (قرطبی) ^[۱]

فائدہ:- حضرت آدم و حوا سے جو اجتہادی لغزش یا بھول صادر ہوئی ہے، اولاً تو قرآن کریم نے دونوں ہی کی طرف اس کی نسبت کی ہے: فَأَذَلَّهَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا، اور زمین پر اترنے کے حکم میں بھی حضرت حوا کو شریک کر کے لفظ: **أُخْرِجُوا** فرمایا ہے، مگر بعد میں توبہ اور قبول توبہ میں بہ لفظ مفرد صرف آدم علیہ السلام کا ذکر ہے، حضرت حوا کا نہیں، اس مقام کے علاوہ بھی اس لغزش کا ذکر صرف آدم علیہ السلام کی طرف کر کے کیا گیا ہے: عَصَى آدَمُ (طہ: ۱۲۱) وغیرہ۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ رعایت ہو کہ عورت کو اللہ تعالیٰ نے مستور رکھا ہے، اس لئے بطور پردہ پوشی کے گناہ اور عتاب کے ذکر میں اس کا ذکر صراحتہً نہیں فرمایا، اور ایک جگہ: رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا (الاعراف: ۲۳) میں دونوں کی توبہ کا ذکر کر بھی دیا گیا، تاکہ کسی کو یہ شبہ نہ رہے کہ حضرت حوا کا قصور معاف نہیں ہوا، اس کے علاوہ عورت چونکہ اکثر احوال میں مرد کے تابع ہے، اس لئے اس کے مستقل ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ (قرطبی) ^[۲]

تَوَابٌ اور تَائِبٌ میں فرق

امام قرطبی نے فرمایا کہ لفظ **تَوَابٌ** بندہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے جیسے: إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ (البقرة: ۲۲۲) اور اللہ تعالیٰ کے لئے بھی جیسے اس آیت میں: **هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ** ﴿۳۵﴾۔ جب بندے کے لئے استعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے

۱۔ تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۳۲۴

۲۔ تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۳۲۵

ہیں گناہ سے اطاعت کی طرف رجوع کرنے والا، اور جب اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوتا ہے تو معنی ہوتے ہیں توبہ قبول کرنے والا، یہ صرف لفظ ”تَوَابٌ“ کا حکم ہے، اسی معنی کا دوسرا لفظ ”تَائِبٌ“ ہے، اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لئے جائز نہیں، اگرچہ لغوی معنی کے اعتبار سے وہ بھی غلط نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی شان میں صرف وہی صفات اور القاب استعمال کرنا جائز ہے جن کا ذکر قرآن و سنت میں وارد ہے، باقی دوسرے الفاظ اگرچہ معنی کے اعتبار سے صحیح ہوں، مگر اللہ تعالیٰ کے لئے اس کا استعمال درست نہیں۔

گناہ سے توبہ قبول کرنے کا اختیار خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ توبہ قبول کرنے اور گناہ معاف کرنے کا اختیار سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو نہیں، یہود و نصاریٰ اس قاعدہ سے غفلت کی بنا پر سخت فتنے میں مبتلا ہو گئے، کہ پادریوں اور پیروں کے پاس جاتے، اور ان کو کچھ ہدیہ دے کر اپنے گناہ معاف کرا لیتے، اور سمجھتے تھے کہ انہوں نے معاف کر دیا تو اللہ کے نزدیک بھی معاف ہو گیا۔ آج بھی بہت سے ناواقف مسلمان اس طرح کے غلط اور خام عقیدے رکھتے ہیں، جو سراسر غلط ہیں، کوئی عالم یا مرشد کسی کے گناہ کو معاف نہیں کر سکتا، زیادہ سے زیادہ دعا کر سکتا ہے۔

آدم علیہ السلام کا زمین پر اترنا سزا کے طور پر نہیں بلکہ ایک مقصد کی تکمیل کے لئے تھا

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا، جنت سے زمین پر اترنے کا حکم اس سے پہلی آیت میں آچکا ہے، اس جگہ پھر اس کو مکرر لانے میں غالباً حکمت یہ ہے کہ پہلی آیت میں زمین پر اترنے کا ذکر بطور عتاب اور سزا کے آیا تھا، اسی لئے اس کے ساتھ انسانوں کی باہمی عداوت کا بھی ذکر کیا گیا، اور یہاں زمین پر اترنے کا ذکر ایک خاص مقصد خلافتِ الہیہ کی تکمیل کے لئے اعزاز کے ساتھ ہے، اسی لئے اس کے ساتھ ہدایت بھیجنے کا ذکر ہے جو خلافتِ الہیہ کے فرائض منصبی میں سے ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگرچہ زمین پر اترنے کا ابتدائی حکم بطور عتاب اور سزا کے تھا، مگر بعد میں جب خطا معاف کر دی گئی تو دوسرے مصالح اور حکمتوں کے پیش نظر زمین پر بھیجنے کے حکم کو اس کی حیثیت بدل کر برقرار رکھا گیا، اور اب ان کا نزول زمین کے حاکم اور خلیفہ کی حیثیت سے ہوا، اور یہ وہی حکمت ہے جس کا ذکر تخلیقِ آدم کے وقت ہی فرشتوں سے کیا جا چکا تھا کہ زمین کے لئے اُن کو خلیفہ بنانا ہے۔

رنج و غم سے نجات صرف اُن لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو اللہ کے فرمانبردار ہیں

فَمَنْ تَبِعَ هَذَا لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۳۸﴾ اس آیت میں آسمانی ہدایات کی پیروی کرنے والوں کے

لئے دو انعام مذکور ہیں، ایک یہ کہ اُن پر کوئی خوف نہ ہوگا، دوسرے وہ غمگین نہ ہوں گے۔

خوف: آئندہ پیش آنے والی کسی تکلیف و مصیبت کے اندیشے کا نام ہے، اور حُزُن: کسی مقصد و مراد کے فوت ہو جانے سے پیدا ہونے والے غم کو کہا جاتا ہے، غور کیا جائے تو عیش و راحت کی تمام انواع و اقسام کا ان دو لفظوں میں ایسا احاطہ کر دیا گیا ہے کہ آرام و آسائش کا کوئی فرد اور کوئی قسم اس سے باہر نہیں، پھر ان دونوں لفظوں کی تعبیر میں ایک خاص فرق کیا گیا ہے کہ ”خوف“ کی نفی تو عام انداز میں کر دی گئی، مگر ”حزن“ کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ ”لَا حُزْنَ عَلَيْهِمْ“ بلکہ بصیغہ فعل لایا گیا، اور اُس کی ضمیر فاعل کو مقدم کر کے **وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ** فرمایا گیا، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ کسی چیز یا مراد کے فوت ہونے کے غم سے آزاد ہونا صرف انہی اولیاء اللہ کا مقام ہے جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایات کی مکمل پیروی کرنے والے ہیں، ان کے سوا کوئی انسان اس غم سے نہیں بچ سکتا، خواہ وہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہو یا دنیا کا بڑے سے بڑا مال دار، کیونکہ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہوتا جس کو اپنی طبیعت اور خواہش کے خلاف کوئی بات پیش نہ آئے اور اس کا غم نہ ہو، جیسا کہ کہا گیا ہے ۔

دریں دُنیا کسے بے غم نباشد

وگر باشد بنی آدم نباشد

بخلاف اولیاء اللہ کے کہ وہ اپنی مرضی اور ارادے کو اللہ رب العزت کی مرضی اور ارادے میں فنا کر دیتے ہیں، اس لئے ان کو کسی چیز کے فوت ہونے کا غم نہیں ہوتا، قرآن مجید میں دوسری جگہ بھی اس کو ظاہر کیا گیا ہے کہ خاص اہل جنت ہی کا یہ حال ہوگا کہ وہ جنت میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کا اس پر شکر کریں گے کہ ان سے غم دور کر دیا گیا: **الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ** * (فاطر: ۳۴) اس سے معلوم ہوا کہ اس دُنیا میں کچھ نہ کچھ غم ہونا ہر انسان کے لئے ناگزیر ہے، بجز اس شخص کے جس نے اپنا تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ مکمل اور مضبوط کر لیا ہو، خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ نے خوب فرمایا ہے ۔

جو بچنا ہو غموں سے آپ کا دیوانہ ہو جائے

اس آیت میں اللہ والوں سے خوف و غم کی نفی کرنے سے مراد یہ ہے کہ دُنیا کی کسی تکلیف یا کسی خواہش و مراد پر اُن کو خوف و غم نہ ہوگا، آخرت کی فکر و غم اور اللہ جل شانہ کی ہیبت و جلال تو اُن پر اور سب سے زیادہ ہوتی ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں یہ آیا ہے کہ آپ اکثر غمگین اور متفکر رہتے تھے، وجہ یہ ہے کہ آپ کا یہ فکر و غم کسی

ترجمہ:- اس دُنیا میں کوئی بھی بے غم نہیں ہے، اگر کوئی بے غم ہے تو وہ آدم کی اولاد میں سے نہیں ہے۔

دُنیوی نعمت کے فوت ہونے یا کسی مصیبت کے خطرہ سے نہیں، بلکہ اللہ جل شانہ کی ہیبت و جلال سے اور اُمت کے حالات کی وجہ سے تھا۔

نیز اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ دُنیا میں جو چیزیں خوفناک سمجھی جاتی ہیں ان سے انبیاء و اولیاء کو بشری طور پر طبعی خوف نہ ہو، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب لاٹھی کا سانپ بن گیا تو ان کا ڈر جانا قرآن مجید میں مذکور ہے: **فَاَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُّوسٰی** (طہ) کیونکہ یہ فطری اور طبعی خوف ابتدائے حال میں تھا، جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **لَا تَخَفْ** تو یہ ڈر بالکل نکل گیا۔

اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ خوف عام انسانوں کی طرح اس بنیاد پر نہ تھا کہ یہ سانپ ان کو کوئی تکلیف پہنچائے گا، بلکہ اس لئے تھا کہ بنی اسرائیل اس سے کہیں گمراہی میں نہ پڑ جائیں، تو یہ خوف ایک قسم کا اخروی خوف تھا۔

آخری آیت **وَالَّذِينَ كَفَرُوا** سے یہ بتلادیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت کی پیروی نہیں کریں گے اُن کا ٹھکانا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم ہوگا، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس ہدایت کو ہدایت سمجھنے اور اس کی پیروی کرنے سے انکار کر دیں، یعنی کفار، اور مومنین جو ہدایت کو ہدایت ماننے کا اقرار کرتے ہیں، وہ عملاً کیسے بھی گناہگار ہوں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد بالآخر جہنم سے نکال لئے جائیں گے، واللہ اعلم۔

يٰۤاِبْنِۤىۤ اِسْرَآءِیۡلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیۡ الَّتِیۡۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَوْفُوا بِعَهْدِیۡ

اے بنی اسرائیل! یاد کرو میرے وہ احسان جو میں نے تم پر کئے اور تم پورا کرو میرا اقرار

اَوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَاٰیٰی فَاٰرِھُبُوْنَ (۲۴) **وَامْنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلْتُ مُّصَدِّقًا**

تو میں پورا کروں تمہارا اقرار، اور مجھ ہی سے ڈرو۔ اور مان لو اس کتاب کو جو میں نے اُتاری ہے سچ بتلانے والی ہے

لِّسَامِعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ کٰفِرٍ بِہٖ (۲۵) **وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیۡ شِقَاقِیۡلًا**

اُس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے، اور مت ہو سب میں اوّل منکر اس کے، اور نہ لو میری آیتوں پر مول تھوڑا

وَاٰیٰی فَاتَّقُوْنَ ۝۳۱ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ

اور مجھ ہی سے بچتے رہو۔ اور مت ملاؤ صحیح میں غلط اور مت چھپاؤ سچ کو

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۳۲

جان بوجھ کر۔

آسان ترجمہ قرآن

اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تم کو عطا کی تھی، اور تم مجھ سے کیا ہوا عہد پورا کرو، تاکہ میں بھی تم سے کیا ہوا عہد پورا کروں، اور تم (کسی اور سے نہیں، بلکہ) صرف مجھی سے ڈرو ۝۳۱ اور جو کلام میں نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ، جبکہ وہ اُس کتاب (یعنی تورات) کی تصدیق بھی کر رہا ہے جو تمہارے پاس ہے، اور تم ہی سب سے پہلے اس کے منکر نہ بن جاؤ۔ اور میری آیتوں کو معمولی سی قیمت لے کر نہ بیچو، اور (کسی اور کے بجائے) صرف میرا خوف دل میں رکھو ۝۳۲ اور حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ نہ کرو، اور نہ حق بات کو چھپاؤ جبکہ (اصل حقیقت) تم اچھی طرح جانتے ہو ۝۳۲

خلاصہ تفسیر

اے بنی اسرائیل! (یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد) یاد کرو تم لوگ میرے اُن احسانوں کو جو کئے ہیں میں نے تم پر (تاکہ حق نعمت سمجھ کر ایمان لانا تمہارے لئے آسان ہو جائے، آگے اس یاد کرنے کی مراد بتلاتے ہیں) اور پورا کرو تم میرے عہد کو (یعنی تم نے جو تورات میں مجھ سے عہد کیا تھا جس کا بیان قرآن کی اس آیت میں ہے: وَلَقَدْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَآءَیْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِیْبًا (الآیہ) (المائدہ: ۱۲)) پورا کروں گا میں تمہارے عہد کو (یعنی میں نے جو عہد تم سے کیا تھا ایمان لانے پر جیسا کہ آیت مذکورہ میں ہے: لَا كُفْرَانَ عَنْكُمْ سِیِّئَاتِكُمْ) اور صرف مجھ ہی سے ڈرو (اپنے عوام معتقدین سے نہ ڈرو کہ ان کا اعتقاد نہ رہے گا اور ان سے آمدنی بند ہو جاوے گی) اور ایمان لے آؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے (یعنی قرآن پر) ایسی حالت میں کہ وہ سچ بتلانے والی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے، (یعنی توراۃ کے کتاب الہی ہونے کی تصدیق کرتی ہے، اور جو اس میں تحریفات کی گئی ہیں وہ خود توراۃ و انجیل ہونے ہی سے خارج ہیں، ان کی تصدیق اس سے لازم نہیں آتی) اور مت بنو تم پہلے انکار کرنے والے اس قرآن کے (یعنی تمہیں دیکھ

کر جو دوسرے لوگ انکار کریں گے اُن سب میں اوّل بانی انکار و کفر کے تم ہو گے اس لئے قیامت تک اُن کے کفر و انکار کا وبال تمہارے نامہ اعمال میں ہی درج ہوتا رہے گا) اور مت لو بمقابلہ میرے احکام کے معاوضہ حقیر اور خاص مجھ ہی سے پورے طور پر ڈرو (یعنی میرے احکام چھوڑ کر یا اُن کو بدل کر یا چھپا کر عوام الناس سے دُنیاۓ ذلیل و قلیل کو وصول مت کرو، جیسا کہ اُن کی عادت تھی جس کی تصریح آگے آتی ہے: **وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ**) اور مخلوط مت کرو حق کو ناحق کے ساتھ اور پوشیدہ بھی مت کرو حق کو جس حالت میں کہ تم جانتے بھی ہو (کہ حق کو چھپانا بری بات ہے)۔

معارف مسائل

رابط آیات

سورہ بقرہ قرآن کے ذکر سے شروع کی گئی، اور یہ بتلایا گیا کہ قرآن کی ہدایت اگرچہ ساری مخلوق کے لئے عام ہے مگر اس سے نفع صرف مؤمنین اٹھائیں گے، اس کے بعد اُن لوگوں کے عذابِ شدید کا ذکر فرمایا جو اس پر ایمان نہیں لائے، ان میں ایک طبقہ کھلے کافروں اور منکروں کا تھا، دوسرا منافقین کا، دونوں کا مع ان کے کچھ حالات اور غلط کاریوں کے ذکر کیا گیا، اس کے بعد مؤمنین، مشرکین، منافقین کے تینوں طبقوں کو خطاب کر کے سب کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تاکید کی گئی، اور قرآن مجید کے اعجاز کا ذکر کر کے سب کو دعوتِ ایمان دی گئی، پھر تخلیقِ آدم علیہ السلام کا ذکر کر کے ان پر ان کی اصلیت اور حقیقت اور اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ واضح کی گئی تاکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کی ترغیب اور نافرمانی سے بچنے کی فکر۔

پھر کفار کی دو جماعتیں جن کا ذکر اوپر آیا ہے کھلے کافر اور منافق، ان دونوں میں دو طرح کے لوگ تھے، ایک توبت پرست مشرکین جو محض باپ دادوں کی رسوم کی پیروی کرتے تھے، کوئی علم قدیم یا جدید ان کے پاس نہ تھا، عام طور پر ان پڑھ امی تھے، جیسے عام اہل مکہ، اسی لئے قرآن میں ان لوگوں کو اُمّیین کہا گیا ہے۔

دوسرے وہ لوگ تھے جو پچھلے انبیاء پر ایمان لائے، اور پہلی آسمانی کتابوں تورات و انجیل وغیرہ کا علم اُن کے پاس تھا، لکھے پڑھے لوگ کہلاتے تھے، ان میں بعض حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، عیسیٰ علیہ السلام پر نہیں، ان کو ”یہود“ کہا جاتا تھا، اور بعض عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بحیثیت نبی معصوم نہیں مانتے تھے، یہ ”نصاری“ کہلاتے تھے، ان دونوں کو قرآن میں اس بنا پر اہل کتاب کہا گیا ہے کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی آسمانی کتاب تورات یا انجیل پر ایمان رکھتے تھے، یہ لوگ لکھے پڑھے اہل علم ہونے کی وجہ سے لوگوں کی نظر میں معزز اور قابلِ اعتماد مانے

جاتے تھے، ان کی بات اُن پر اثر انداز ہوتی تھی، یہ راستے پر آجائیں تو دوسروں کے مسلمان ہونے کی توقع بڑی تھی، مدینہ طیبہ اور اس کے قرب و جوار میں ان لوگوں کی کثرت تھی۔

سورۃ بقرہ چونکہ مدنی سورت ہے، اس لئے اس میں مشرکین و منافقین کے بیان کے بعد اہل کتاب کو خصوصیت اور اہتمام کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، چالیسویں آیت سے شروع ہو کر ایک سو تیس آیات آخر پارہ الہ تک انہی لوگوں سے خطاب ہے، جس میں ان کو مانوس کرنے کے لئے اول ان کی خاندانی شرافت اور اس سے دُنیا میں حاصل ہونے والے اعزاز کا، پھر اللہ تعالیٰ کی مسلسل نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے، پھر اُن کی بے راہی اور غلط کاری پر متنبہ کیا گیا، اور صحیح راستہ کی طرف دعوت دی گئی، ان میں سے پہلی سات آیتوں میں اجمالی خطاب ہے، جن میں سے تین میں دعوتِ ایمان اور چار میں اعمالِ صالحہ کی تلقین ہے، اس کے بعد بڑی تفصیل سے ان کو خطاب کیا گیا، تفصیلی خطاب کے شروع میں اور بالکل ختم پر، پھر اہتمام کے لئے **يٰۤاَيُّهَا اِسْرَآءِیْلُ** فرما کر انہیں الفاظ کا اعادہ کیا گیا ہے جن سے شروع کیا گیا تھا، جیسا کہ کلام کو موثر اور وقع بنانے کے لئے ایسا کرنے کا دستور ہے۔

يٰۤاَيُّهَا اِسْرَآءِیْلُ، ”اسرائیل“ عبرانی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی ”عبداللہ“ ہیں، یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا دوسرا نام ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور نبی کے نام متعدد نہیں ہیں، صرف حضرت یعقوب علیہ السلام کے دو نام ہیں، یعقوب اور اسرائیل۔ قرآن میں اس جگہ ان کو ”بنی یعقوب“ کہہ کر خطاب نہیں کیا، بلکہ دوسرے نام ”اسرائیل“ کا استعمال کیا، اس میں حکمت یہ ہے کہ خود اپنے لقب اور نام ہی سے ان کو معلوم ہو جائے کہ ہم عبداللہ یعنی اللہ کے عبادت گزار بندے کی اولاد ہیں، ہمیں بھی ان کے نقش قدم پر چلنا چاہئے، اس آیت میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ:-

”اور پورا کرو تم میرے عہد کو“ یعنی تم نے مجھ سے عہد کیا تھا تو ریت میں جس کا بیان بقول قنادہ و مجاہد اس آیت میں ہے: **وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَآءِیْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِیْبًا (الِی) قَدْ ضَآحَسْنَا (المائدہ: ۱۲)** اس میں سب سے اہم معاہدہ تمام رسولوں پر ایمان لانے کا شامل ہے، جن میں ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خصوصیت سے داخل ہیں، نیز نماز، زکوٰۃ اور صدقات بھی اس عہد میں شامل ہیں، جس کا خلاصہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور آپ کا مکمل اتباع ہے، اسی لئے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس عہد سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے۔ (ابن جریر بسند صحیح)

”پورا کروں گا میں تمہارے عہد کو“ یعنی اسی آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ جو لوگ اس عہد کو پورا کریں گے تو ان کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے، اور جنت میں داخل کیا جائے گا، تو حسب وعدہ ان لوگوں کو جنت کی

نعمتوں سے سرفراز کیا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اے بنی اسرائیل! تم میرا عہد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا پورا کرو، تو میں اپنا عہد تمہاری مغفرت اور جنت کا پورا کر دوں گا، اور صرف مجھ ہی سے ڈرو، اور عوام الناس معتقدین سے نہ ڈرو کہ ان کی منشا کے خلاف کلمہ حق کہیں گے تو وہ معتقد نہ رہیں گے، آمدنی بند ہو جائے گی۔

۱۔ اُمتِ محمدیہ کی ایک خاص فضیلت

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اللہ جل شانہ نے بنی اسرائیل کو اپنی نعمتیں اور احسانات یاد دلا کر اپنی یاد اور اطاعت کی طرف دعوت دی ہے، اور اُمتِ محمدیہ کو جب اسی کام کے لئے دعوت دی تو احسانات و انعامات کے ذکر کے بغیر فرمایا: **فَاذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ** (البقرة: ۱۵۲) یعنی ”تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا“ اس میں اُمتِ محمدیہ کی خاص فضیلت کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا تعلق محسن و منعم سے بلا واسطہ ہے، یہ محسن کو پہچان کر احسان کو پہچانتے ہیں، بخلاف دوسری اُمتوں کے کہ وہ احسانات کے ذریعے محسن کو پہچانتے ہیں۔^[۱]

۲۔ ایفاءِ عہد واجب اور عہد شکنی حرام ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ عہد و معاہدہ کو پورا کرنا ضروری ہے، اور عہد شکنی حرام ہے، سورہ مائدہ کی پہلی آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ مضمون آیا ہے: **اَوْفُوا بِالْعُقُودِ** (المائدة: ۱) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عہد شکنی کرنے والوں کو جو سزا آخرت میں ملے گی اس سے پہلے ہی ایک سزا یہ دی جائے گی کہ محشر کے میدان میں جہاں تمام اولین و آخرین کا اجتماع ہوگا عہد شکنی کرنے والے پر ایک جھنڈا بطور علامت کے لگا دیا جائے گا، اور جیسی بڑی عہد شکنی کی ہے اتنا ہی یہ جھنڈا بلند ہوگا، اس طرح ان کو میدانِ محشر میں رُسوا اور شرمندہ کیا جائے گا۔ (صحیح مسلم عن ابی سعید)^[۲]

۳۔ جو شخص کسی گناہ یا ثواب کا سبب بنتا ہے، اس پر بھی کرنے والوں کا گناہ یا ثواب لکھا جاتا ہے

اَوَّلُ كَافِرٍ يَهُودِيٍّ، کافر ہونا خواہ سب سے پہلے ہو یا بعد میں بہر حال انتہائی ظلم اور جرم ہے، مگر اس آیت میں یہ فرمایا کہ پہلے کافر نہ بنو، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ جو شخص اول کفر اختیار کرے گا تو بعد میں اس کو دیکھ کر جو بھی کفر میں مبتلا

۱ تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۳۳۲

۲ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسير، باب تحریم الغدر ج: ۲ ص: ۸۳

ہوگا اس کا وبال جو اس شخص پر پڑے گا، اس پہلے کافر پر بھی اس کا وبال آئے گا، اس طرح یہ پہلا کافر اپنے کفر کے علاوہ بعد کے لوگوں کے کفر کا سبب بن کر ان سب کے وبال کفر کا بھی ذمہ دار ٹھہرے گا، اور اس کا عذاب چند در چند ہو جائے گا۔

فائدہ:- اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص دُنیا میں دُوسروں کے لئے کسی گناہ میں مبتلا ہونے کا سبب بنتا ہے تو جتنے آدمی اس کے سبب سے مبتلائے گناہ ہوں گے ان سب کا گناہ ان لوگوں کو بھی ہوگا اور اس شخص کو بھی۔ اسی طرح جو شخص دُوسروں کے لئے کسی نیکی کا سبب بن جائے تو جتنے آدمی اس کے سبب سے نیک عمل کریں گے، اس کا ثواب جیسا ان لوگوں کو ملے گا ایسا ہی اس شخص کے نامہ اعمال میں بھی لکھا جائے گا، قرآن مجید کی متعدد آیات اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث میں یہ مضمون بار بار آیا ہے۔

۴۔ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَتِي ثَمَنًا قَلِيلًا ذ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی آیات کے بدلے میں قیمت لینے کی ممانعت کا مطلب وہ ہی ہے جو آیت کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے، کہ لوگوں کی مرضی اور ان کی اغراض کی خاطر اللہ تعالیٰ کی آیات کا مطلب غلط بتلا کر یا چھپا کر لوگوں سے پیسے لئے جائیں، یہ فعل باجماع اُمت حرام ہے۔

۵۔ تعلیم قرآن پر اجرت لینا جائز ہے

رہا یہ معاملہ کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کی آیات صحیح صحیح بتلا کر یا پڑھا کر اس کی اجرت لینا کیسا ہے؟ اس کا تعلق آیت مذکورہ سے نہیں، خود یہ مسئلہ اپنی جگہ قابل غور و بحث ہے کہ تعلیم قرآن پر اجرت و معاوضہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ فقہائے اُمت کا اس میں اختلاف ہے، امام مالک، شافعی، احمد بن حنبلؒ جائز قرار دیتے ہیں، اور امام اعظم ابوحنیفہؒ اور بعض دُوسرے ائمہ منع فرماتے ہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو ذریعہ کسب معاش کا بنانے سے منع فرمایا ہے۔

لیکن متاخرین حنفیہ نے بھی جب ان حالات کا مشاہدہ کیا کہ قرآن مجید کے معلمین کو اسلامی بیت المال سے گزارہ ملا کرتا تھا، اب ہر جگہ اسلامی نظام میں فتور کے سبب ان معلمین کو عموماً کچھ نہیں ملتا، یہ اگر اپنے معاش کے لئے کسی محنت مزدوری یا تجارت وغیرہ میں لگ جائیں تو بچوں کو تعلیم قرآن کا سلسلہ یکسر بند ہو جائے گا، کیونکہ وہ دن بھر کا مشغلہ چاہتا ہے، اس لئے تعلیم قرآن پر تنخواہ لینے کو بضرورت جائز قرار دیا، جیسا کہ صاحب ہدایہ نے فرمایا ہے کہ آج کل اسی پر فتویٰ دینا چاہئے کہ تعلیم قرآن پر اجرت و تنخواہ لینا جائز ہے، صاحب ہدایہ کے بعد آنے والے دُوسرے فقہاء نے بعض ایسے ہی دُوسرے وظائف جن پر تعلیم قرآن کی طرح دین کی بقا موقوف ہے، مثلاً امامت و اذان اور تعلیم حدیث و فقہ وغیرہ کو تعلیم قرآن کے ساتھ ملحق کر کے ان کی بھی اجازت دی۔ (درمختار، شامی)

۶۔ ایصالِ ثواب کے لئے ختم قرآن پر اجرت لینا باتفاق جائز نہیں

علامہ شامیؒ نے ”در مختار“ کی شرح میں اور اپنے رسالہ ”شفاء العلیل“ میں بڑی تفصیل اور قوی دلائل کے ساتھ یہ بات واضح کر دی ہے کہ تعلیم قرآن وغیرہ پر اجرت لینے کو جن متاخرین فقہاء نے جائز قرار دیا ہے اس کی علت ایک ایسی دینی ضرورت ہے جس میں خلل آنے سے دین کا پورا نظام مختل ہو جاتا ہے، اس لئے اس کو ایسی ہی ضرورت کے مواقع میں محدود رکھنا ضروری ہے، اس لئے مُردوں کو ایصالِ ثواب کے لئے ختم قرآن کرانا یا کوئی دوسرا وظیفہ پڑھوانا اجرت کے ساتھ حرام ہے، کیونکہ اُس پر کسی عام دینی ضرورت کا مدار نہیں، اور اجرت لے کر پڑھنا حرام ہوا تو اس طرح پڑھنے والا اور پڑھوانے والا دونوں گناہگار ہوئے، اور جب پڑھنے والے ہی کو کوئی ثواب نہ ملا تو میت کو وہ کیا پہنچائے گا۔ علامہ شامیؒ نے اس بات پر فقہاء کی بہت سی تصریحات تاج الشریعة، عینی شرح ہدایہ، حاشیہ خیر الدین بر بحر الرائق وغیرہ سے نقل کی ہے، اور خیر الدین رملی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ایصالِ ثواب کے لئے قبر پر قرآن پڑھوانا یا اجرت دے کر ختم قرآن کرانا صحابہؓ و تابعینؓ اور اُسلافِ اُمتؓ سے کہیں منقول نہیں، اس لئے بدعت ہے۔

۷۔ حق بات کو چھپانا یا اس میں خلط ملط کرنا حرام ہے

آیت: وَلَا تَلْسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ الخ سے ثابت ہوا کہ حق بات کو غلط باتوں کے ساتھ گڈمڈ کر کے اس طرح پیش کرنا جس سے مخاطب مغالطہ میں پڑ جائے جائز نہیں، اسی طرح کسی خوف یا طمع کی وجہ سے حق بات کا چھپانا بھی حرام ہے، مسئلہ واضح ہے، اس میں کسی تفصیل کی ضرورت نہیں، امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں حق کو چھپانے سے پرہیز کرنے کا ایک واقعہ اور مفصل مکالمہ حضرت ابو حازمؒ تابعی اور خلیفہ سلیمان بن عبد الملکؒ کا نقل کیا ہے، جو بہت سے فوائد کی وجہ سے قابل ذکر ہے۔

حضرت ابو حازمؒ تابعی، سلیمان بن عبد الملکؒ کے دربار میں

مسندِ دارمیؒ میں سند کے ساتھ مذکور ہے کہ ایک مرتبہ سلیمان بن عبد الملکؒ مدینہ طیبہ پہنچے، اور چند روز قیام کیا تو لوگوں سے دریافت کیا کہ مدینہ طیبہ میں اب کوئی ایسا آدمی موجود ہے جس نے کسی صحابی کی صحبت پائی ہو؟ لوگوں نے بتلایا: ہاں ابو حازم ایسے شخص ہیں۔ سلیمان نے اپنا آدمی بھیج کر اُن کو بلوایا، جب وہ تشریف لائے تو سلیمانؒ نے کہا کہ اے ابو حازم! یہ کیا بے مروتی اور بیوفائی ہے؟ ابو حازمؒ نے کہا: آپ نے میری کیا بے مروتی اور بے وفائی دیکھی ہے؟ سلیمانؒ

نے کہا کہ مدینہ کے سب مشہور لوگ مجھ سے ملنے آئے، آپ نہیں آئے۔ ابو حازمؒ نے کہا: امیر المؤمنین! میں آپ کو اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں اس سے کہ آپ کوئی ایسی بات کہیں جو واقعہ کے خلاف ہے، آج سے پہلے نہ آپ مجھ سے واقف تھے اور نہ میں نے کبھی آپ کو دیکھا تھا، ایسے حالات میں خود ملاقات کے لئے آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بیوفائی کیسی؟

سلیمانؑ نے جواب سن کر ابن شہاب زہریؒ اور حاضرین مجلس کی طرف التفات کیا، تو امام زہریؒ نے فرمایا کہ ابو حازم نے صحیح فرمایا، آپ نے غلطی کی۔

اس کے بعد سلیمانؑ نے رُوئے سخن بدل کر کچھ سوالات شروع کئے اور کہا: اے ابو حازم! یہ کیا بات ہے کہ ہم موت سے گھبراتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی آخرت کو دیران اور دُنیا کو آباد کیا ہے، اس لئے آبادی سے ویرانے میں جانا پسند نہیں۔

سلیمانؑ نے تسلیم کیا، اور پوچھا کہ کل اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کیسے ہوگی؟ فرمایا کہ نیک عمل کرنے والا تو اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح جائے گا جیسا کوئی مسافر سفر سے واپس اپنے گھر والوں کے پاس جاتا ہے، اور برے عمل کرنے والا اس طرح پیش ہوگا جیسا کوئی بھاگا ہوا غلام پکڑ کر آقا کے پاس حاضر کیا جائے۔

سلیمانؑ یہ سن کر رو پڑے، اور کہنے لگے: کاش! ہمیں معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے کیا صورت تجویز کر رکھی ہے؟ ابو حازمؒ نے فرمایا کہ اپنے اعمال کو اللہ کی کتاب پر پیش کرو تو پتہ لگ جائے گا۔

سلیمانؑ نے دریافت کیا کہ قرآن کی کس آیت سے یہ پتہ لگے گا؟ فرمایا: اس آیت سے: **إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ۝ (الانفطار) ۱۲** یعنی ”بلاشبہ نیک عمل کرنے والے جنت کی نعمتوں میں ہیں، اور نافرمان، گناہ شعار دوزخ میں۔“

سلیمانؑ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو بڑی ہے، وہ بدکاروں پر بھی حاوی ہے۔ فرمایا: **إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ۝ (الاعراف) ۵۶** یعنی ”اللہ تعالیٰ کی رحمت نیک عمل کرنے والوں سے قریب ہے۔“

سلیمانؑ نے پوچھا: اے ابو حازم! اللہ کے بندوں میں سب سے زیادہ کون عزت والا ہے؟ فرمایا: وہ لوگ جو مروت اور عقل سلیم رکھنے والے ہیں۔

پھر پوچھا کہ کونسا عمل افضل ہے؟ تو فرمایا کہ فرائض و واجبات کی ادائیگی، حرام چیزوں سے بچنے کے ساتھ۔

پھر دریافت کیا کہ کونسی دُعا زیادہ قابل قبول ہے؟ تو فرمایا کہ جس شخص پر احسان کیا گیا ہو اس کی دُعا اپنے محسن کے لئے اقرب الی القبول ہے۔

پھر دریافت کیا کہ صدقہ کونسا افضل ہے؟ تو فرمایا کہ مصیبت زدہ سائل کے لئے باوجود اپنے افلاس کے جو کچھ

ہو سکے، اس طرح خرچ کرنا کہ نہ اس سے پہلے احسان جتائے اور نہ ٹال مٹول کر کے ایذا پہنچائے۔

پھر دریافت کیا کہ کلام کونسا افضل ہے؟ تو فرمایا کہ جس شخص سے تم کو خوف ہو یا جس سے تمہاری کوئی حاجت ہو اور اُمید وابستہ ہو اس کے سامنے بغیر کسی رورعایت کے حق بات کہہ دینا۔

پھر دریافت کیا کہ کونسا مسلمان سب سے زیادہ ہوشیار ہے؟ فرمایا: وہ شخص جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تحت کام کیا ہو، اور دُوسروں کو بھی اس کی دعوت دی ہو۔

پھر پوچھا کہ مسلمانوں میں کون شخص احمق ہے؟ فرمایا: وہ آدمی جو اپنے کسی بھائی کی اس کے ظلم میں امداد کرے، جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اس نے دُوسرے کی دُنیا دُرست کرنے کے لئے اپنا دین بیچ دیا۔ سلیمانؑ نے کہا کہ صحیح فرمایا۔

اس کے بعد سلیمانؑ نے اور واضح الفاظ میں دریافت کیا کہ ہمارے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ ابو حازمؒ نے فرمایا کہ مجھے اس سوال سے معاف رکھیں تو بہتر ہے۔ سلیمانؑ نے کہا کہ نہیں، آپ ضرور کوئی نصیحت کا کلمہ کہیں۔

ابو حازمؒ نے فرمایا: اے امیر المؤمنین! تمہارے آباء و اجداد نے بزورِ شمشیر لوگوں پر تسلط کیا، اور زبردستی ان کی مرضی کے خلاف ان پر حکومت قائم کی، اور بہت سے لوگوں کو قتل کیا، اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ اس دُنیا سے رخصت ہو گئے، کاش! آپ کو معلوم ہوتا کہ اب وہ مرنے کے بعد کیا کہتے ہیں، اور ان کو کیا کہا جاتا ہے۔

حاشیہ نشینوں میں سے ایک شخص نے بادشاہ کے مزاج کے خلاف ابو حازمؒ کی اس صاف گوئی کو سن کر کہا کہ ابو حازم! تو نے یہ بہت بری بات کہی ہے، ابو حازمؒ نے فرمایا کہ تم غلط کہتے ہو، بری بات نہیں کہی، بلکہ وہ بات کہی جس کا ہم کو حکم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے علماء سے اس کا عہد لیا ہے کہ حق بات لوگوں کو بتلائیں گے چھپائیں گے نہیں: لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ (آل عمران: ۱۸۷)

یہی وہ بات ہے جس کے لئے یہ طویل حکایت امام قرطبیؒ نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں درج فرمائی ہے۔ سلیمانؑ نے پھر سوال کیا کہ اچھا اب ہمارے دُرست ہونے کا کیا طریقہ ہے؟ فرمایا کہ تکبر چھوڑو، مروت اختیار کرو، اور حقوق والوں کو ان کے حقوق انصاف کے ساتھ تقسیم کرو۔

سلیمانؑ نے کہا کہ ابو حازم! کیا ہو سکتا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ رہیں؟ فرمایا: خدا کی پناہ! سلیمانؑ نے پوچھا: یہ کیوں؟ فرمایا کہ اس لئے کہ مجھے خطرہ یہ ہے کہ میں تمہارے مال و دولت اور عزت و جاہ کی طرف کچھ مائل ہو جاؤں جس کے نتیجہ میں مجھے عذاب بھگتنا پڑے۔

پھر سلیمانؑ نے کہا کہ اچھا آپ کی کوئی حاجت ہو تو بتلائیے کہ ہم اس کو پورا کریں؟ فرمایا: ہاں ایک حاجت ہے کہ جہنم سے نجات دلا دو اور جنت میں داخل کر دو۔ سلیمانؑ نے کہا کہ یہ تو میرے اختیار میں نہیں! فرمایا کہ پھر مجھے آپ سے

اور کوئی حاجت مطلوب نہیں۔

آخر میں سلیمانؑ نے کہا کہ اچھا میرے لئے دُعا کیجئے! تو ابو حازمؒ نے یہ دُعا کی: یا اللہ! اگر سلیمان آپ کا پسندیدہ ہے تو اس کے لئے دُنیا و آخرت کی بہتری کو آسان بنا دے، اور اگر وہ آپ کا دشمن ہے تو اس کے بال پکڑ کر اپنی مرضی اور محبوب کاموں کی طرف لے آ۔

سلیمانؑ نے کہا کہ مجھے کچھ وصیت فرمادیں۔ ارشاد فرمایا کہ مختصر یہ ہے کہ اپنے رب کی عظمت و جلال اس درجہ میں رکھو کہ وہ تمہیں اس مقام پر نہ دیکھے جس سے منع کیا ہے، اور اس مقام سے غیر حاضر نہ پائے جس کی طرف آنے کا اس نے حکم دیا ہے۔

سلیمانؑ نے اس مجلس سے فارغ ہونے کے بعد سوغتیاں بطور ہدیہ کے ابو حازمؒ کے پاس بھیجیں، ابو حازمؒ نے ایک خط کے ساتھ اُن کو واپس کر دیا، خط میں لکھا تھا کہ اگر یہ سودینا میرے کلمات کا معاوضہ ہیں تو میرے نزدیک خون اور خنزیر کا گوشت اس سے بہتر ہے، اور اگر اس لئے بھیجا ہے کہ بیت المال میں میرا حق ہے، تو مجھ جیسے ہزاروں علماء اور دین کی خدمت کرنے والے ہیں، اگر سب کو آپ نے اتنا ہی دیا ہے تو میں بھی لے سکتا ہوں، ورنہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

ابو حازمؒ کے اس ارشاد سے کہ اپنے کلمات نصیحت کا معاوضہ لینے کو خون اور خنزیر کی طرح قرار دیا ہے، اس مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ کسی طاعت و عبادت کا معاوضہ لینا اُن کے نزدیک جائز نہیں۔

وَاقِیْبُوا الصَّلٰوةَ وَاتُوا الزَّكٰوةَ وَاِیَّكُمْ مَّعَ الرَّکِیْعِیْنَ ۝۳۳ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ

اور قائم رکھو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور جھکو نماز میں جھکنے والوں کے ساتھ۔ کیا حکم کرتے ہو لوگوں کو

بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ ۝۳۴ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۳۵

نیک کام کا اور بھولتے ہو اپنے آپ کو اور تم تو پڑھتے ہو کتاب، پھر کیوں نہیں سوچتے ہو۔

وَاسْتَعِیْزُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۝۳۶ وَاِنَّهَا لَکَبِیْرَةٌ ۝۳۷ اِلَّا عَلٰی الْخٰشِعِیْنَ ۝۳۸

اور مدد چاہو صبر سے اور نماز سے اور البتہ وہ بھاری ہے مگر انہی عاجزوں پر

الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا سَرَبَهُمْ وَإِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝

جن کو خیال ہے کہ وہ رُو برو ہونے والے ہیں اپنے رَب کے اور یہ کہ اُن کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے

آسان ترجمہ قرآن

اور نماز قائم کرو، اور زکوٰۃ ادا کرو، اور رُکوع کرنے والوں کے ساتھ رُکوع کرو ۳۳ کیا تم (دوسرے) لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو، اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہو! کیا تمہیں اتنی بھی سمجھ نہیں؟ ۳۴ اور صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔ نماز بھاری ضرور معلوم ہوتی ہے، مگر اُن لوگوں کو نہیں جو خشوع (یعنی دھیان اور عاجزی) سے پڑھتے ہیں ۳۵ جو اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں، اور ان کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ۳۶

خلاصہ تفسیر

اور قائم کرو تم لوگ نماز کو (یعنی مسلمان ہو کر) اور دوزکوٰۃ کو اور عاجزی کرو عاجزی کرنے والوں کے ساتھ۔ (علمائے بنی اسرائیل کے بعض اقارب مسلمان ہو گئے تھے، جب ان سے گفتگو ہوتی تو خفیہ طور پر یہ علماء اُن سے کہتے تھے کہ بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسولِ برحق ہیں، ہم لوگ تو کسی مصلحت سے مسلمان نہیں ہوتے، مگر تم اس مذہبِ اسلام کو نہ چھوڑنا، اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا) کیا غضب ہے کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور آپ کی اطاعت کرنے کو) اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی (یعنی توریت کی جس میں جا بجا ایسے عالم بے عمل کی مذمتیں مذکور ہیں) تو پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ اور مددلو (یعنی اگر تم کو حب مال و حب جاہ کی وجہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہوتا ہو تو مددلو) صبر اور نماز سے (یعنی ایمان لا کر صبر اور نماز کا التزام کرو تو یہ حب مال و جاہ دل سے نکل جائے گی، اور اگر کوئی کہے کہ خود نماز اور صبر کا التزام بہت دشوار ہے تو سن لے کہ) اور بے شک وہ نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو اُن پر کچھ بھی دشوار نہیں، وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بے شک ملنے والے ہیں اپنے رَب سے اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رَب کی طرف واپس جانے والے ہیں (تو اس وقت اس کا حساب کتاب بھی دینا ہوگا، ان دونوں خیالوں سے رغبت بھی پیدا ہوگی، خوف بھی اور یہی دو چیزیں ہر عمل کی رُوح ہیں)۔

معارف مسائل

رابط آیات

بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں اور احسانات یاد دلا کر ایمان اور عمل صالح کی طرف دعوت دی ہے، پچھلی تین آیتوں میں ایمان و عقائد سے متعلق ہدایات تھیں، اور ان چار آیتوں میں اعمال صالحہ کی تلقین ہے، اور ان میں جو اعمال سب سے زیادہ اہم ہیں ان کا ذکر ہے، اور حاصل مطلب آیات کا یہ ہے کہ اور اگر تم کو حب مال و جاہ کے غلبہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہوتا ہے تو اس کا علاج یہ ہے کہ ”صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو“ صبر سے حب مال گھٹ جائے گی، کیونکہ مال اسی وجہ سے مطلوب و محبوب ہے کہ وہ ذریعہ ہے لذات و شہوات کے پورا کرنے کا، جب ان لذات و شہوات کی مطلق العنانی چھوڑنے پر ہمت باندھ لو گے، تو پھر مال کی فراوانی کی نہ ضرورت رہے گی نہ اُس کی محبت ایسی غالب آئے گی کہ اپنے نفع نقصان سے اندھا کر دے، اور نماز سے حب جاہ کم ہو جائے گی، کیونکہ نماز میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کی پستی اور عاجزی ہی ہے، جب نماز کو صحیح صحیح ادا کرنے کی عادت ہو جائے گی تو حب جاہ و منصب اور تکبر و غرور گھٹے گا، اصل مادہ فساد جس کے سبب ایمان لانا دشوار تھا یہی مال و جاہ کی محبت تھی، جب یہ مادہ فساد گھٹ گیا تو ایمان لانا آسان ہو جائے گا۔

اب سمجھئے کہ صبر میں تو صرف غیر ضروری خواہشات اور شہوات کا ترک کرنا ہے، اور نماز میں بہت سے افعال کا واقع کرنا بھی ہے، اور بہت سی جائز خواہشات کو بھی وقتی طور پر ترک کرنا ہے مثلاً کھانا، پینا، کلام کرنا، چلنا پھرنا، اور دوسری انسانی ضروریات جو شرعاً جائز و مباح ہیں ان کو بھی نماز کے وقت ترک کرنا ہے، اور وہ بھی اوقات کی پابندی کے ساتھ دن رات میں پانچ مرتبہ، اس لئے نماز نام ہے کچھ افعال معینہ کا، اور معین اوقات میں تمام ناجائز و جائز چیزوں سے صبر کرنے کا۔ غیر ضروری خواہشات کے ترک کرنے پر انسان ہمت باندھ لے تو چند روز کے بعد طبعی تقاضا بھی ختم ہو جاتا ہے، کوئی دشواری نہیں رہتی، لیکن نماز کے اوقات کی پابندی اور اس کے تمام شرائط کی پابندی اور ضروری خواہشات سے بھی ان اوقات میں پرہیز کرنا یہ انسانی طبیعت پر بہت بھاری اور دشوار ہے، اس لئے یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ایمان کو آسان بنانے کا جو نسخہ تجویز کیا گیا کہ ”صبر اور نماز سے کام لو“ اس نسخہ کا استعمال خود ایک دشوار چیز ہے، خصوصاً نماز کی پابندیوں کا، تو اس دشواری کا کیا علاج ہوگا؟ اس کے لئے ارشاد فرمایا: ”بے شک وہ نماز دشوار ضرور ہے، مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو ان پر کچھ بھی دشوار نہیں“ اس میں نماز کے آسان کرنے کی ترکیب بتلا دی گئی۔

حاصل یہ ہے کہ نماز میں دشواری کی وجہ اور سبب پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ انسان کا قلب خوگر ہے میدان خیال

میں آزاد پھرنے کا، اور سب اعضاءِ انسانی قلب کے تابع ہیں، اس لئے قلب کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ اس کے سب اعضاء بھی آزاد رہیں، اور نماز سراسر اس آزادی کے خلاف ہے کہ نہ ہنسوں، نہ بولوں، نہ کھاؤں، نہ پیوں، نہ چلوں، وغیرہ وغیرہ، اس لئے قلب ان تقیدات سے تنگ ہوتا ہے، اور اس کے تابع اعضاءِ انسانی بھی اس سے تکلیف محسوس کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ سبب اس دُشواری اور گرانی کا قلب کی حرکتِ فکریہ ہے، تو اس کا علاج سکون سے ہونا چاہئے، اس لئے خشوع کو نماز کے آسان ہونے کا ذریعہ بتایا گیا، کیونکہ خشوع کے معنی ہی سکونِ قلب کے ہیں، اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سکونِ قلب یعنی خشوع کس طرح حاصل ہو؟ تو یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے قلب سے مختلف افکار و خیالات کو براہِ راست نکالنا چاہے تو اس میں کامیابی قریب بحال ہے، بلکہ اس کی تدبیر یہ ہے کہ نفسِ انسانی چونکہ ایک وقت میں دو طرف متوجہ نہیں ہو سکتا، اس لئے اگر اس کو کسی ایک خیال میں محو و مستغرق کر دیا جائے تو دوسرے خیالات اور افکار خود بخود دل سے نکل جائیں گے، اس لئے تلقینِ خشوع کے بعد وہ خیال بتلاتے ہیں جس میں مستغرق ہو جانے سے دوسرے خیالات دفع ہوں، اور اُن کے دفع ہونے سے حرکتِ فکریہ قلب کی منقطع ہو کر سکون حاصل ہو، اور سکون سے نماز میں آسانی ہو کر اس پر مداومت اور پابندی نصیب ہو، اور اس پابندی سے کبر و غرور اور حبِ جاہ کم ہو، تا کہ ایمان کے راستہ میں جو حائل ہے وہ دور ہو کر ایمان کامل ہو جائے، سبحان اللہ کیا مرتب علاج اور مطب ہے۔

اب اس خیالِ مذکور کی تلقین و تعیین اس طرح فرمائی: ”وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بے شک ملنے والے ہیں اپنے رب سے“ تو اس وقت اس خدمت کا خوب انعام ملے گا، اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ ”وہ اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں“ تو اس وقت اس کا حساب و کتاب بھی دینا ہوگا، ان دونوں خیالات سے رغبت و رہبت یعنی اُمید اور خوف پیدا ہوں گے، اول تو ہر خیالِ محمود میں مستغرق ہو جانا قلب کو نیک کام پر جمادیتا ہے، خصوصاً اُمید و بیم کا خیال، اس کو تو خاص طور پر دخل ہے نیک کام میں مستعد کر دینے کے لئے۔

وَأَقِمْ الصَّلَاةَ، صَلَاةَ کے لفظی معنی دُعا کے ہیں، اصطلاحِ شرع میں وہ خاص عبادت ہے جس کو ”نماز“ کہا جاتا ہے، قرآنِ کریم میں عموماً نماز کی جتنی مرتبہ تاکید کی گئی ہے لفظ ”اقامت“ کے ساتھ آئی ہے، مطلق نماز پڑھنے کا ذکر صرف ایک دو جگہ آیا ہے، اس لئے اقامتِ صلوٰۃ کی حقیقت کو سمجھنا چاہئے۔ ”اقامت“ کے لفظی معنی سیدھا کرنے اور ثابت رکھنے کے ہیں، اور عادت جو عمودِ یادِ یواریا درخت وغیرہ سیدھا کھڑا ہوتا ہے وہ قائم رہتا ہے، گر جانے کا خطرہ کم ہوتا ہے، اس لئے اقامت کے معنی دائم اور قائم کرنے کے بھی آتے ہیں۔

قرآن و سنت کی اصطلاح میں اقامتِ صلوٰۃ کے معنی نماز کو اس کے وقت میں پابندی کے ساتھ اس کے پورے آداب و شرائط کی رعایت کر کے ادا کرنا ہیں، مطلق نماز پڑھ لینے کا نام اقامتِ صلوٰۃ نہیں ہے، نماز کے جتنے فضائل اور آثار

وبرکات قرآن وحدیث میں آئے ہیں وہ سب اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ مقید ہیں، مثلاً قرآن کریم میں ہے:-

إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ۖ (العنکبوت: ۴۵)

”یعنی نماز انسان کو ہر بے حیائی اور ہر برے کام سے روک دیتی ہے۔“

نماز کا یہ اثر اسی وقت ظاہر ہوگا جبکہ نماز کی اقامت اس معنی سے کرے جو ابھی ذکر کئے گئے ہیں، اس لئے بہت سے نمازیوں کو برائیوں اور بے حیائیوں میں مبتلا دیکھ کر اس آیت پر کوئی شبہ نہ کرنا چاہئے، کیونکہ ان لوگوں نے نماز پڑھی تو ہے مگر اس کو قائم نہیں کیا۔

وَأَتُوا الزَّكَاةَ، لفظ ”زکوٰۃ“ کے معنی لغت میں دو آتے ہیں، پاک کرنا اور بڑھنا، اصطلاح شریعت میں مال کے اس حصے کو ”زکوٰۃ“ کہا جاتا ہے جو شریعت کے احکام کے مطابق کسی مال میں سے نکالا جائے اور اس کے مطابق صرف کیا جائے۔ اگرچہ یہاں خطاب موجودہ بنی اسرائیل کو ہے جس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نماز اور زکوٰۃ اسلام سے پہلے بنی اسرائیل پر فرض تھی، مگر سورہ مائدہ میں: وَلَقَدْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَآءِيلَ ۖ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا وَقَالَ اللَّهُ إِنِّي مَعَكُمْ ۚ لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلَاةَ الْخ (المائدہ: ۱۲) سے ثابت ہے کہ نماز اور زکوٰۃ بنی اسرائیل پر فرض تھی، اگرچہ اس کی کیفیت اور ہیئت وغیرہ میں فرق ہو۔

وَأَمَّا كَوْنُ أَمَامَ الرَّكْعَيْنِ (۳۳) کے لغوی معنی جھکنے کے ہیں، اور اس معنی کے اعتبار سے یہ لفظ ”سجدہ“ پر بھی بولا جاسکتا ہے، کیونکہ وہ بھی جھکنے کا انتہائی درجہ ہے، مگر اصطلاح شرع میں اس خاص جھکنے کو ”رکوع“ کہتے ہیں جو نماز میں معروف و مشہور ہے۔

آیت کے معنی یہ ہیں کہ ”رکوع کرو، رکوع کرنے والوں کے ساتھ“ یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ نماز کے تمام ارکان میں سے اس جگہ رکوع کی تخصیص کیوں کی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں نماز کا ایک جزء بول کر کل نماز مراد لی گئی ہے، جیسے قرآن مجید میں ایک جگہ قُرْآنَ الْفَجْرِ (الاسراء: ۷۸) فرما کر پوری نماز فجر مراد ہے، اور بعض روایات حدیث میں ”سجدہ“ کا لفظ بول کر پوری رکعت یا نماز مراد لی گئی ہے، اس لئے مراد آیت کی یہ ہوگئی کہ نماز پڑھو نماز پڑھنے والوں کے ساتھ، لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ نماز کے بہت سے ارکان میں سے رکوع کی تخصیص میں کیا حکمت ہے؟

جواب یہ ہے کہ یہودی نماز میں سجدہ وغیرہ تو تھا، مگر رکوع نہیں تھا، رکوع اسلامی نماز کی خصوصیات میں سے ہے، اس لئے ”رَاكِعِينَ“ کے لفظ سے اُمت محمدیہ کے نمازی مراد ہوں گے، جن کی نماز میں رکوع بھی ہے، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم بھی اُمت محمدیہ کے نمازیوں کے ساتھ نماز ادا کرو، یعنی اول ایمان قبول کرو پھر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرو۔

باجماعت نماز کے احکام

نماز کا حکم اور اس کا فرض ہونا تو لفظ **اقْبِلُوا الصَّلَاةَ** سے معلوم ہو چکا تھا، اس جگہ **مَعَ الرَّكْعَيْنِ** کے لفظ سے نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

یہ حکم کس درجہ کا ہے؟ اس میں علماء فقہاء کا اختلاف ہے، ایک جماعت صحابہؓ و تابعینؓ اور فقہائے اُمت کی، جماعت کو واجب قرار دیتی ہے، اور اس کے چھوڑنے کو سخت گناہ، اور بعض صحابہ کرامؓ تو اس نماز ہی کو جائز قرار نہیں دیتے جو بلا عذر شرعی کے بدون جماعت پڑھی جائے، یہ آیت ظاہری الفاظ کے اعتبار سے ان حضرات کی حجت ہے جو وجوب جماعت کے قائل ہیں۔

اس کے علاوہ چند روایات حدیث سے بھی جماعت کا واجب ہونا سمجھا جاتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ:-

لَا صَلَاةَ لِحَارِ الْمَسْجِدِ إِلَّا فِي الْمَسْجِدِ - (رواہ ابوداؤد)

”یعنی مسجد کے قریب رہنے والے کی نماز صرف مسجد ہی میں جائز ہے۔“

اور مسجد کی نماز سے ظاہر ہے کہ جماعت کی نماز مراد ہے، تو الفاظ حدیث سے یہ مطلب نکلا کہ مسجد کے قریب رہنے والے کی نماز بغیر جماعت کے جائز نہیں۔

مسجد کے سوا کسی اور جگہ جماعت

اور صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ منقول ہے کہ ایک نابینا صحابیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے ساتھ کوئی ایسا آدمی نہیں جو مجھے مسجد تک پہنچا دیا اور لے جایا کرے، اس لئے اگر آپ اجازت دیں تو میں نماز گھر میں پڑھ لیا کروں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اول تو ان کو اجازت دے دی، مگر جب وہ جانے لگے تو سوال کیا کہ کیا اذان کی آواز تمہارے گھر تک پہنچتی ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ اذان کی آواز تو میں سنتا ہوں، آپ نے فرمایا: پھر تو آپ کو مسجد میں آنا چاہئے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ پھر میں آپ کے لئے کوئی گنجائش اور رخصت نہیں پاتا۔ (اخر جہ ابوداؤد)

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

مَنْ سَمِعَ النَّدَاءَ فَلَمْ يُجِبْ فَلَا صَلَاةَ لَهُ إِلَّا مِنْ عُذْرٍ - (صحیحہ القرطبی)

۱ کنز العمال ج: ۷ ص: ۶۵۰ رقم الحدیث: ۲۰۷۳۷

۲ سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب التشدید فی ترک الجماعة ج: ۱ ص: ۸۱، وصحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب فضل صلاۃ المكتوبة... إلخ ج: ۱ ص: ۲۳۲

۳ تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۳۳۹

”یعنی جو شخص اذان کی آواز سنتا ہے اور جماعت مسجد میں نہیں آتا تو اس کی نماز نہیں ہوتی، مگر یہ کہ اس کو کوئی عذر شرعی ہو۔“

ان احادیث کی بنا پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ وغیرہ حضرات صحابہ نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ جو شخص مسجد سے اتنا قریب رہتا ہے کہ اذان کی آواز وہاں تک پہنچتی ہے تو اگر وہ بلا عذر کے جماعت میں حاضر نہ ہو تو اس کی نماز ہی نہیں ہوتی، (آواز سننے سے مراد یہ ہے کہ متوسط آواز والے آدمی کی آواز وہاں پہنچ سکے، آلہ مکبر الصوت یا غیر معمولی بلند آواز کا اس میں اعتبار نہیں)۔ یہ سب روایات ان حضرات کی دلیل ہیں جو جماعت کو واجب قرار دیتے ہیں، مگر جمہور اُمت علماء و فقہائے صحابہ و تابعین کے نزدیک جماعت سنت مؤکدہ ہے، مگر سنن مؤکدہ میں سنت فجر کی طرح سب سے زیادہ مؤکدہ اور قریب بوجوب ہے، ان سب حضرات نے قرآن کریم کے امر: **وَأْمُرُوا أُمَّةَ الرَّاكِعِينَ** (۳۳) کو دوسری آیات اور روایات کی بنا پر تاکید کے لئے قرار دیا ہے۔

اور جن احادیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے قریب رہنے والے کی نماز بغیر جماعت کے ہوتی ہی نہیں، اس کا یہ مطلب قرار دیتے ہیں کہ یہ نماز کامل اور مقبول نہیں، اس معاملے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان بہت واضح اور کافی ہے جس کو امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے:-

فقیہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ کل (محشر میں) اللہ تعالیٰ سے مسلمان ہونے کی حالت میں ملے تو اس کو چاہئے کہ ان (پانچ) نمازوں کے ادا کرنے کی پابندی اس جگہ کرے جہاں اذان دی جاتی ہے (یعنی مسجد)، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کچھ ہدایت کے طریقے بتلائے ہیں، اور ان پانچ نمازوں کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا انہی سنن ہدیٰ میں ہے، اور اگر تم نے یہ نمازیں اپنے گھر میں پڑھ لیں، جیسے یہ جماعت سے الگ رہنے والا اپنے گھر میں پڑھ لیتا ہے (کسی خاص شخص کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) تو تم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑ بیٹھو گے، اور اگر تم نے اپنے نبی کی سنت کو چھوڑ دیا تو تم گمراہ ہو جاؤ گے۔ (اور جو شخص وضو کرے اور اچھی طرح پاکی حاصل کرے) پھر کسی مسجد کا رخ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم پر نیکی اس کے نامہ اعمال میں درج فرماتے ہیں، اور اس کا ایک درجہ بڑھا دیتے ہیں، اور ایک گناہ معاف کر دیتے ہیں، اور ہم نے اپنے مجمع کو ایسا پایا ہے کہ منافق بین اتفاق کے سوا کوئی آدمی جماعت سے الگ نماز نہ پڑھتا تھا، یہاں تک کہ بعض حضرات کو عذر اور بیماری میں بھی دو آدمیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر مسجد میں لایا جاتا اور صف میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔^۱

اس بیان میں جس طرح باجماعت نماز کی پوری تاکید اور اہمیت و ضرورت کا ذکر ہے اسی کے ساتھ اس کا یہ درجہ

بھی بیان فرمادیا کہ وہ سننِ ہدیٰ میں سے ہے، جس کو فقہاء سنتِ مؤکدہ کہتے ہیں، چنانچہ اگر کوئی شخص عذرِ شرعی مثلاً مرض وغیرہ کے بغیر تنہا نماز پڑھ لے اور جماعت میں شریک نہ ہو تو اس کی نماز تو ہو جائے گی، مگر سنتِ مؤکدہ کے ترک کی وجہ سے مستحقِ عتاب ہوگا، اور اگر ترکِ جماعت کی عادت بنا لے تو سخت گناہگار ہے، خصوصاً اگر ایسی صورت ہو جائے کہ مسجد ویران رہے اور لوگ گھروں میں نماز پڑھیں تو یہ سب شرعاً مستحقِ سزا ہیں، اور قاضی عیاضؒ نے فرمایا کہ ایسے لوگ اگر سمجھانے سے باز نہ آئیں تو ان سے قتال کیا جائے۔ (قرطبی ج: ۱ ص: ۲۹۸)

بے عمل واعظ کی مذمت

اَتَا مُرُوْنَ النَّاسَ بِالْإِيْمَةِ وَتَنَسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ، اس آیت میں خطاب اگرچہ علمائے یہود سے ہے، ان کو ملامت کی جارہی ہے کہ وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو یہ تلقین کرتے تھے کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کرتے رہو، اور دینِ اسلام پر قائم رہو (جو علامت ہے اس بات کی کہ علمائے یہود دینِ اسلام کو یقینی طور پر حق سمجھتے تھے) مگر خود نفسانی خواہشات سے اتنے مغلوب تھے کہ اسلام قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے، لیکن معنی کے اعتبار سے یہ ہر اُس شخص کی مذمت ہے جو دُوسروں کو تو نیکی اور بھلائی کی ترغیب دے، مگر خود عمل نہ کرے، دُوسروں کو خدا سے ڈرائے، مگر خود نہ ڈرے، ایسے شخص کے بارے میں احادیث میں بڑی ہولناک وعیدیں آئی ہیں، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شبِ معراج میں میرا گزر کچھ لوگوں پر ہوا جن کے ہونٹ اور زبانیں آگ کی قینچیوں سے کترے جارہے تھے، میں نے جبریل سے پوچھا: یہ کون ہیں؟ جبریل نے بتایا کہ یہ آپ کی اُمت کے دُنیا دار واعظ ہیں جو لوگوں کو تو نیکی کا حکم کرتے تھے، مگر اپنی خبر نہ لیتے تھے۔ (ابن کثیر)

ابنِ عساکرؒ نے ذکر کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بعض جنتی بعض دوزخیوں کو آگ میں دیکھ کر پوچھیں گے کہ تم آگ میں کیونکر پہنچ گئے؟ حالانکہ ہم تو بخدا انہی نیک اعمال کی بدولت جنت میں داخل ہوئے ہیں جو ہم نے تم سے سیکھے تھے، اہل دوزخ کہیں گے: ”ہم زبان سے کہتے ضرور تھے، لیکن خود عمل نہیں کرتے تھے“۔ (ابن کثیر)

کیا فاسق وعظ و نصیحت نہیں کر سکتا؟

لیکن مذکورہ بیان سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ بے عمل یا فاسق کے لئے دُوسروں کو وعظ و نصیحت کرنا جائز نہیں، اور جو شخص کسی گناہ میں مبتلا ہو وہ دُوسروں کو اس گناہ سے باز رہنے کی تلقین نہ کرے، کیونکہ کوئی اچھا عمل الگ نیکی ہے اور اس

۱ تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۲۳۸ ومسند احمد رقم الحديث: ۱۱۷۶۶

۲ تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۲۳۹ والمعجم الكبير للطبرانی رقم الحديث: ۱۷۸۶۰

اچھے عمل کی تبلیغ دوسری مستقل نیکی ہے، اور ظاہر ہے کہ ایک نیکی کو چھوڑنے سے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دوسری نیکی بھی چھوڑ دی جائے۔ جیسے ایک شخص اگر نماز نہیں پڑھتا تو اس کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ روزہ بھی ترک کر دے، بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا تو اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ دوسروں کو نماز پڑھنے کے لئے بھی نہ کہے، اسی طرح کسی ناجائز فعل کا ارتکاب الگ گناہ ہے، اور اپنے زیر اثر لوگوں کو اس ناجائز فعل سے نہ روکنا دوسرا گناہ ہے، اور ایک گناہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرا گناہ بھی ضرور کیا جائے۔ (روح المعانی) [۱]

چنانچہ امام مالکؒ نے حضرت سعید بن جبیرؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر ہر ایک شخص یہ سوچ کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دے کہ میں خود گنہگار ہوں، جب گناہوں سے خود پاک ہو جاؤں گا تو لوگوں کو تبلیغ کروں گا، تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ تبلیغ کرنے والا کوئی بھی باقی نہ رہے گا، کیونکہ ایسا کون ہے جو گناہوں سے بالکل پاک ہو؟ حضرت حسنؒ کا ارشاد ہے کہ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ لوگ اسی غلط خیال میں پڑ کر تبلیغ کا فریضہ چھوڑ بیٹھیں (قرطبی)۔ [۲] بلکہ حضرت سیدی حکیم الامت تھانویؒ تو فرمایا کرتے تھے کہ جب مجھے اپنی کسی بری عادت کا علم ہوتا ہے تو میں اس عادت کی مذمت اپنے مواعظ میں خاص طور سے بیان کرتا ہوں، تاکہ وعظ کی برکت سے یہ عادت جاتی رہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت **اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ** کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بے عمل آدمی کو وعظ کہنا جائز نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ وعظ کو بے عمل نہیں ہونا چاہئے، اور دونوں میں فرق واضح ہے۔ مگر یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ بے عمل ہونا نہ تو وعظ کے لئے جائز ہے نہ غیر وعظ کے لئے، پھر وعظ کی تخصیص کیوں؟ جواب یہ ہے کہ ناجائز تو دونوں کے لئے ہے، مگر وعظ کا جرم غیر وعظ کے جرم کے مقابلے میں زیادہ سنگین اور زیادہ قابل ملامت ہے، کیونکہ وعظ جرم کو جرم سمجھتے ہوئے جان بوجھ کر کرتا ہے، اس کے پاس یہ عذر نہیں ہوتا کہ مجھے اس کا جرم ہونا معلوم نہ تھا، برخلاف غیر وعظ کے اور ان پڑھ جاہل کے کہ اس کو خواہ علم حاصل نہ کرنے کا الگ گناہ ہو، لیکن ارتکاب گناہ میں اس کے پاس کسی درجہ میں عذر موجود ہوتا ہے کہ مجھے معلوم نہ تھا۔ اس کے علاوہ عالم اور وعظ اگر کوئی جرم کرتا ہے تو یہ دین کے ساتھ ایک قسم کا استہزاء ہے، چنانچہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جتنا ان پڑھ لوگوں کو معاف کرے گا اتنا علماء کو معاف نہیں کرے گا۔ [۳]

[۱] روح المعانی تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۲۹۸

[۲] تفسیر ابن کثیر ج: ۱ ص: ۴۲۸

[۳] کنز العمال رقم الحديث: ۲۸۹۸۳

دو نفسیاتی بیماریاں اور اُن کا علاج

حب مال اور حب جاہ، یہ دونوں قلب کی ایسی بیماریاں ہیں جن کے باعث انسان کی دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ اور غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی تاریخ میں اب تک جتنی انسانیت سوز لڑائیاں لڑی گئیں اور جو فساد برپا ہوئے، ان میں سے اکثر و بیشتر کو انہی دو بیماریوں نے جنم دیا تھا۔

حب مال کے نتائج یہ نکلتے ہیں:-

- ۱- کنجوسی اور بخل پیدا ہوتا ہے، جس کا ایک قومی نقصان تو یہ ہوتا ہے کہ اس کی دولت قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی، دوسرا نقصان خود اس کی ذات کو پہنچتا ہے کہ معاشرہ میں کوئی ایسے شخص کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔
 - ۲- خود غرضی پیدا ہوتی ہے جو مال کی ہوس کو پورا کرنے کے لئے اُسے اشیاء میں ملاوٹ، ناپ تول میں کمی، رشوت ستانی، مکر و فریب اور دغا بازی کے نت نئے حیلے بھاتی ہے، وہ اپنی تجوری پہلے سے زیادہ بھرنے کے لئے دوسروں کا خون نچوڑ لینا چاہتا ہے، بالآخر سرمایہ دار اور مزدور کے جھگڑے جنم لیتے ہیں۔
 - ۳- ایسے شخص کو کتنا ہی مال مل جائے لیکن مزید کمانے کی دھن ایسی سوار ہوتی ہے کہ تفریح اور آرام کے وقت بھی یہی بے چینی اُسے کھائے جاتی ہے کہ کسی طرح اپنے سرمایہ میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کروں، بالآخر جو مال اس کے آرام و راحت کا ذریعہ بنتا وہ اس کے لئے وبال جان بن جاتا ہے۔
 - ۴- حق بات خواہ کتنی ہی روشن ہو کر سامنے آجائے، مگر وہ ایسی کسی بات کو ماننے کی ہمت نہیں کرتا، جو اس کی ہوس مال سے متصادم ہو، یہ تمام چیزیں بالآخر پورے معاشرہ کا امن و چین برباد کر ڈالتی ہیں۔
- غور کیا جائے تو قریب قریب یہی حال حب جاہ کا نظر آئے گا کہ اس کے نتیجہ میں تکبر، خود غرضی، حقوق کی پامالی، ہوس اقتدار اور اس کے لئے خوں ریز لڑائیاں، اور اسی طرح کی بے شمار انسانیت سوز خرابیاں جنم لیتی ہیں، جو بالآخر دنیا کو دوزخ بنا کر چھوڑتی ہیں، ان دونوں بیماریوں کا علاج قرآن کریم نے یہ تجویز فرمایا: **وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ** (اور مددلو صبر اور نماز سے) یعنی صبر اختیار کرو، یعنی اپنی لذات و شہوات پر قابو حاصل کرلو، اس سے حب مال گھٹ جائے گی، کیونکہ مال کی محبت اسی لئے پیدا ہوتی ہے کہ مال لذات و شہوات کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے، جب ان لذات و خواہشات کی اندھا دھند پیروی چھوڑنے پر ہمت باندھ لو گے تو شروع میں اگرچہ شاق گزرے گا، لیکن رفتہ رفتہ یہ خواہشات اعتدال پر آجائیں گی، اور اعتدال تمہاری عادت بن جائے گا، تو پھر مال کی فراوانی کی ضرورت نہ رہے گی، نہ اُس کی محبت ایسی غالب آئے گی کہ اپنے نفع نقصان سے اندھا کر دے۔

اور نماز سے حبِ جاہ کم ہو جائے گی، کیونکہ نماز میں ظاہری اور باطنی ہر طرح کی عاجزی اور پستی ہے، جب نماز کو صحیح صحیح ادا کرنے کی عادت ہو جائے گی تو ہر وقت اللہ کے سامنے اپنی عاجزی اور پستی کا تصور رہنے لگے گا، جس سے تکبر و غرور اور حبِ جاہ گھٹ جائے گی۔

خشوع کی حقیقت

﴿إِلَّا عَلَى الْخُشُعِينَ﴾ قرآن و سنت میں جہاں خشوع کی ترغیب مذکور ہے اس سے مراد وہ قلبی سکون و انکساری ہے جو اللہ کی عظمت اور اس کے سامنے اپنی حقارت کے علم سے پیدا ہوتی ہے، اس کے نتیجہ میں طاعت آسان ہو جاتی ہے، کبھی اس کے آثار بدن پر بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں کہ وہ باادب، متواضع اور شکستہ قلب نظر آتا ہے، اگر دل میں خوفِ خدا اور تواضع نہ ہو تو خواہ وہ ظاہر میں کتنا ہی باادب اور متواضع نظر آئے وہ خشوع کا حامل نہیں۔

بلکہ آثارِ خشوع کا قصداً اظہار کرنا بھی پسندیدہ نہیں، حضرت عمرؓ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ سر جھکائے بیٹھا ہے، فرمایا: سر اٹھا، خشوع دل میں ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم خلیؑ کا ارشاد ہے کہ ”موٹا پہننے، موٹا کھانے اور سر جھکانے کا نام خشوع نہیں، خشوع تو یہ ہے کہ تم حق کے معاملہ میں شریف و رذیل کے ساتھ یکساں سلوک کرو، اور اللہ نے جو تم پر فرض کیا ہے اُسے ادا کرنے میں اللہ کے لئے قلب کو فارغ کر لو۔“

حضرت حسنؓ کا ارشاد ہے کہ حضرت عمرؓ جب بات کرتے تو سنا کرتے تھے، جب چلتے تو تیز چلتے، اور جب مارتے تو زور سے مارتے تھے، حالانکہ بلاشبہ وہ خشوع رکھنے والے تھے۔

خلاصہ یہ کہ اپنے قصد و اختیار سے خاشعین کی سی صورت بنانا شیطان اور نفس کا دھوکہ ہے اور مذموم ہے، ہاں اگر بے اختیار یہ کیفیت ظاہر ہو جائے تو معذور ہے۔ (قرطبی)

فائدہ:- ”خشوع“ کے ساتھ ایک دوسرا لفظ ”خضوع“ بھی استعمال ہوتا ہے، قرآن کریم میں بھی بار بار آیا ہے، یہ دونوں لفظ تقریباً ہم معنی ہیں، لیکن ”خشوع“ کا لفظ اصل کے اعتبار سے آواز اور نگاہ کی پستی اور تذلل کے لئے بولا جاتا ہے، جبکہ وہ مصنوعی نہ ہو بلکہ قلبی خوف اور تواضع کا نتیجہ ہو، قرآن کریم میں ہے: وَخَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ (طہ: ۱۰۸) (آوازیں پست ہو گئیں) اور ”خضوع“ کا لفظ بدن کی تواضع اور انکساری کے لئے استعمال ہوتا ہے، قرآن حکیم میں ہے:-
فَقَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خُضُعِينَ ﴿۲﴾ (الشعراء) ”پس اُن کی گردنیں اس کے سامنے جھک گئیں۔“

نماز میں خشوع کی فقہی حیثیت

نماز میں خشوع کی تاکید قرآن و سنت میں بار بار آئی ہے، قرآن حکیم کا ارشاد ہے:-

وَاقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي ﴿۱۴﴾ (طہ: ۱۴) ”اور نماز قائم کر مجھے یاد کرنے کے لئے۔“

اور ظاہر ہے کہ غفلت یاد کرنے کی ضد ہے، جو نماز میں اللہ جل شانہ سے غافل ہے وہ اللہ کو یاد کرنے کا فریضہ ادا

نہیں کر رہا۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے:-

وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِينَ ﴿۱۵﴾ (الاعراف) ”اور تو غافلوں میں سے نہ ہو۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”نماز تو صرف تمسکین اور تواضع ہی ہے۔“ جس کا ظاہری مطلب یہ ہے

کہ جب تمسکین اور تواضع دل میں نہ ہو تو وہ نماز نہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ ”جس کی نماز اسے بے حیائی اور برائیوں سے نہ روک سکے، وہ اللہ سے دور ہی ہوتا

جاتا ہے۔“ اور غافل کی نماز بے حیائی سے اور برائیوں سے نہیں روکتی، معلوم ہوا کہ غفلت کے ساتھ نماز پڑھنے والا اللہ سے

دور ہی ہوتا جاتا ہے۔

امام غزالیؒ نے مذکورہ آیات و روایات اور دوسرے دلائل پیش کر کے فرمایا ہے کہ ان کا یہ تقاضا ہے کہ خشوع نماز

کے لئے شرط ہو، اور نماز کی صحت اُس پر موقوف ہو، پھر فرمایا کہ سفیان ثوریؒ، حسن بصریؒ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا

مذہب یہی تھا کہ خشوع کے بغیر نماز ادا نہیں ہوتی، بلکہ فاسد ہے۔

لیکن ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء نے خشوع کو شرطِ صلوٰۃ قرار نہیں دیا، بلکہ اُسے نماز کی روح قرار دینے کے باوجود

صرف اتنا شرط کیا ہے کہ تکبیر تحریمہ کے وقت قلب کو حاضر کر کے اللہ کے لئے نماز کی نیت کرے، باقی نماز میں اگر خشوع

حاصل نہ ہو تو اگرچہ اتنی نماز کا ثواب اُسے نہیں ملے گا جتنے حصے میں خشوع نہیں رہا، لیکن فقہ کی رو سے وہ تارکِ صلوٰۃ نہیں

کہلائے گا اور نہ اُس پر تعزیر وغیرہ کے وہ احکام مرتب ہوں گے جو تارکِ صلوٰۃ پر لگتے ہیں۔

امام غزالیؒ نے اس کی یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ فقہاء باطنی احوال اور قلبی کیفیات پر حکم نہیں لگاتے، بلکہ وہ تو صرف

اعضائے ظاہرہ کے اعمال پر ظاہری احکام بیان کرتے ہیں، یہ بات کہ فلاں عمل کا ثواب آخرت میں ملے گا یا نہیں، یہ فقہ کی

حدود سے خارج ہے، تو چونکہ باطنی کیفیات پر حکم لگانا ان کی بحث سے خارج ہے، اور خشوع ایک باطنی کیفیت ہے، اس لئے

انہوں نے خشوع کو پوری نماز میں شرط قرار نہیں دیا، بلکہ خشوع کے ادنیٰ مرتبہ کو شرط کہا، اور وہ یہ کہ کم از کم تکبیر تحریمہ کے وقت محض اللہ کی عبادت و تعظیم کی نیت کر لے۔

خشوع کو پوری نماز میں شرط قرار نہ دینے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کی دوسری آیات میں تشریع احکام کا یہ واضح اصول بتا دیا گیا ہے کہ انسانوں پر کوئی ایسی چیز فرض نہیں کی جاتی جو ان کی طاقت و امکان سے باہر ہو، اور پوری نماز میں خشوع برقرار رکھنے سے ماسوا چند خاص افراد کے اکثر لوگ عاجز ہوتے ہیں، اس لئے تکلیف مالا یطاق سے بچنے کے لئے پوری نماز کی بجائے صرف ابتدائے صلوٰۃ میں خشوع کو شرط قرار دے دیا گیا۔

نماز خشوع کے بغیر بھی بالکل بے فائدہ نہیں

امام غزالی آخر میں ارشاد فرماتے ہیں کہ خشوع کی اس غیر معمولی اہمیت کے باوجود ہمیں اللہ سے یہی اُمید ہے کہ غفلت کے ساتھ نماز پڑھنے والا بھی بالکل تارک صلوٰۃ کے درجہ میں نہیں، کیونکہ بہر حال اُس نے ادائے فرض کا اقدام تو کیا ہے، اور تھوڑی سی دیر کے لئے قلب کو اللہ کے لئے فارغ بھی کیا کہ کم از کم نیت کے وقت تو صرف اللہ ہی کا دھیان تھا، ایسی نماز کا کم سے کم فائدہ یہ ضرور ہے کہ اس کا نام نافرمانوں اور بے نمازوں کی فہرست سے نکل گیا۔

مگر دوسری حیثیت سے یہ خوف بھی ہے کہ کہیں غافل کی حالت تارک سے بھی زیادہ بری نہ ہو، کیونکہ جو غلام آقا کی خدمت میں حاضر ہو کر آقا سے بے توجہی برتا اور تحقیر آمیز لہجے میں کلام کرتا ہے اس کی حالت اُس غلام سے زیادہ شدید ہے جو خدمت میں حاضر ہی نہیں ہوتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ معاملہ بیم و رجاء کا ہے، عذاب کا خوف بھی ہے اور بخشش کی اُمید بھی، اس لئے غفلت و تساہل کو چھوڑنے کے لئے اپنی مقدور بھر کوشش کرتے رہنا چاہئے، وَمَا تَوْفِيقُنَا إِلَّا بِاللّٰهِ۔

يٰۤاِبْنِ اِسْرَآءِیْل اذْكُرْ وَاِنْعَمْتِیْ اِلَیْكَ وَاِنِّیْ فَضَّلْتُكَ

اے بنی اسرائیل! یاد کرو میرے احسان جو میں نے تم پر کئے اور اس کو کہ میں نے تم کو بڑائی دی

عَلِی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۷﴾ وَاتَّقُوا یَوْمًا لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا

تمام عالم پر۔ اور ڈرو اُس دن سے کہ کام نہ آئے کوئی شخص کسی کے کچھ بھی

وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ﴿۳۸﴾

اور قبول نہ ہو اس کی طرف سے سفارش اور نہ لیا جائے اس کی طرف سے بدلہ اور نہ اُن کو مدد پہنچے۔

آسان ترجمہ قرآن

اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تم کو عطا کی تھی، اور یہ بات (یاد کرو) کہ میں نے تم کو سارے جہانوں پر فضیلت دی تھی ﴿۳۸﴾ اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص بھی کسی کے کچھ کام نہیں آئے گا، نہ کسی سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی، نہ کسی سے کسی قسم کا فدیہ لیا جائے گا، اور نہ ان کو کوئی مدد پہنچے گی ﴿۳۸﴾

خلاصہ تفسیر

اے اولاد یعقوب (علیہ السلام) کی! تم لوگ میری اس نعمت کو یاد کرو (تاکہ شکر اور اطاعت کی تحریک ہو) جو میں نے تم کو انعام میں دی تھی، اور اس (بات) کو (یاد کرو) کہ میں نے تم کو (خاص خاص برتاؤ میں) تمام دنیا جہان والوں پر فوقیت دی تھی، (اور ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”میں نے تم کو ایک بڑے حصہ مخلوق پر فوقیت دی تھی“ مثلاً اس زمانے کے لوگوں پر)۔

فائدہ:- اس آیت میں خطاب چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودیوں کو ہے اور عموماً ایسا ہوتا ہے کہ باپ دادا پر جو احسان و اکرام کیا جائے اس سے اس کی اولاد بھی فائدہ حاصل کرتی ہے، جس کا عام طور پر مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، اس لئے ان کو بھی اس آیت میں مخاطب سمجھا جاسکتا ہے۔

اور ڈرو تم ایسے دن سے کہ (جس میں) نہ تو کوئی شخص کسی شخص کی طرف سے کچھ مطالبہ ادا کر سکتا ہے، اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہو سکتی ہے (جبکہ خود اس شخص میں ایمان نہ ہو جس کی سفارش کرتا ہے) اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی معاوضہ لیا جاسکتا ہے، اور نہ اُن لوگوں کی طرف داری چل سکے گی۔

فائدہ:- آیت میں جس یوم کا ذکر ہے اس سے قیامت کا دن مراد ہے، مطالبہ ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کسی کے ذمہ نماز روزے کا مطالبہ ہو، اور دوسرا کہے کہ میرا نماز روزہ لے کر اس کا حساب بے باق کر دیا جائے، اور معاوضہ یہ کہ کچھ مال وغیرہ داخل کر کے بچالادے، سود و نوں باتیں نہ ہوں گی، اور بدون ایمان کے سفارش قبول نہ ہونے کو جو فرمایا ہے تو اور آیتوں سے معلوم ہوا کہ اس کی صورت یہ ہوگی کہ ایسوں کی خود سفارش ہی نہ ہوگی، جو قبول کی گنجائش ہو، اور

طرف داری کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کوئی زوردار حمایت کر کے زبردستی نکال لاوے۔
غرض دنیا میں مدد کرنے کے جتنے طریقے ہوتے ہیں بدون ایمان کے کوئی طریقہ بھی نہ ہوگا۔

وَإِذْ نَجَّيْنَاكَ مِنَ الْفُتُونِ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْعَذَابِ الَّذِي يَدَّبُّوْنَ

اور یاد کرو اس وقت کو جبکہ رہائی دی ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے جو کرتے تھے تم کو بڑا عذاب، ذبح کرتے تھے

أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ ۚ وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿۴۹﴾

تمہارے بیٹوں کو اور زندہ چھوڑتے تھے تمہاری عورتوں اور اس میں آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے بڑی۔

آسان ترجمہ قرآن

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے نجات دی جو تمہیں بڑا عذاب دیتے تھے، تمہارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے۔ اور اس ساری صورت حال میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارا بڑا امتحان تھا ﴿۴۹﴾

خلاصہ تفسیر

اوپر جن خاص برتاؤوں کا حوالہ دیا ہے اب یہاں سے اُن کی تفصیل بیان کرنی شروع کی، پہلا معاملہ تو یہ ہے کہ: اور (وہ زمانہ یاد کرو) جبکہ رہائی دی ہم نے تم (لوگوں کے آباء و اجداد) کو متعلقین فرعون سے جو فکر میں لگے رہتے تھے تمہاری دل آزاری کے، گلے کاٹتے تھے تمہاری اولاد (ذکور) کے اور زندہ چھوڑ دیتے تھے تمہاری عورتوں کو (لڑکیوں کو کہ زندہ رہ کر بڑی عورتیں ہو جائیں) اور اس (واقعہ) میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارا ایک بڑا بھاری امتحان تھا۔
فائدہ:- کسی نے فرعون سے پیشین گوئی کر دی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا ایسا پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں تیری سلطنت جاتی رہے گی، اس لئے اس نے نوزائیدہ لڑکوں کو قتل کرنا شروع کر دیا، اور چونکہ لڑکیوں سے کوئی اندیشہ نہ تھا اس لئے اُن سے کوئی تعرض نہیں کیا، دوسرے اس میں اس کا اپنا ایک مطلب بھی تھا کہ اُن عورتوں سے ماماگری اور خدمت گاری کا کام لیتا تھا، سو یہ عنایت بھی اپنے مطلب کے لئے تھی۔

اور اس واقعہ سے یا تو یہ ذبح و قتل مذکور مراد ہے، اور مصیبت میں صبر کا امتحان ہوتا ہے، اور یا رہائی دینا مراد ہے جو

کہ ایک نعمت ہے، اور نعمت میں شکر کا امتحان ہوتا ہے، اور اس نجات دینے کی تفصیل آگے بیان فرمائی۔

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ

اور جب پھاڑ دیا ہم نے تمہاری وجہ سے دریا کو پھر بچا دیا ہم نے تم کو اور ڈبو دیا فرعون کے لوگوں کو اور تم

تَنْظُرُونَ ﴿۵۰﴾ وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعَجَلَ

دیکھ رہے تھے۔ اور جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے چالیس رات کا پھر تم نے بنالیا پھڑا

مِنْ بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ﴿۵۱﴾

موسیٰ کے بعد اور تم ظالم تھے۔

آسان ترجمہ قرآن

اور (یاد کرو) جب ہم نے تمہاری خاطر سمندر کو پھاڑ ڈالا تھا، چنانچہ تم سب کو بچا لیا تھا اور فرعون کے لوگوں کو (سمندر میں) غرق کر ڈالا تھا، اور تم یہ سارا نظارہ دیکھ رہے تھے ﴿۵۰﴾ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ ٹھہرایا تھا، پھر تم نے ان کے پیچھے (اپنی جانوں پر) ظلم کر کے پھڑے کو معبود بنالیا ﴿۵۱﴾

خلاصہ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جبکہ شق کر دیا ہم نے تمہارے (رستہ دینے کی) وجہ سے دریائے شور کو پھر ہم نے (ڈوبنے سے) بچا لیا تم کو اور غرق کر دیا متعلقین فرعون کو (مع فرعون کے) اور تم (اس کا) معائنہ کر رہے تھے۔

فائدہ:- یہ قصہ اس وقت ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام پیدا ہو کر پیغمبر ہو گئے، اور مدتوں فرعون کو سمجھاتے رہے، جب وہ کسی طرح نہ مانا تو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو خفیہ طور پر لے کر یہاں سے چلے جاؤ، راستہ میں دریا حائل ہوا، اور اسی وقت پیچھے سے فرعون بھی مع لشکر آ پہنچا، حق تعالیٰ کے حکم سے دریا شق ہو گیا اور بنی اسرائیل کو گزرنے کا راستہ مل گیا، یہ تو پار ہو گئے، فرعون کے پہنچنے تک دریا اسی طرح رہا، وہ بھی تعاقب کی غرض سے اس میں گھس گیا، اس وقت سب طرف سے دریا سمٹ کر اپنی سابق حالت پر ہو گیا، اور فرعون اور اس کے ساتھی سب وہاں ہی غرق ہو کر ختم ہو گئے۔

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جبکہ وعدہ کیا تھا ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے (توریت دینے کا ایک مدت گزرنے پر جس میں دس رات کا اضافہ ہو کر) چالیس رات کا (زمانہ ہو گیا تھا) پھر تم لوگوں نے (پرستش کے لئے) تجویز کر لیا گو سالہ کو موسیٰ (علیہ السلام) کے (جانے کے) بعد اور تم نے (اس تجویز میں صریح) ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی (کہ ایسی بے جا بات کے قائل ہو گئے تھے)۔

فائدہ:- یہ قصہ اس وقت ہوا جب فرعون کے غرق ہونے کے بعد بنی اسرائیل بقول بعض، مصر میں واپس آ کر رہنے لگے، یا بقول بعض کسی اور مقام پر ٹھہر گئے تو موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل نے عرض کیا کہ اب ہم بالکل مطمئن ہو گئے، اگر کوئی شریعت ہمارے لئے مقرر ہو تو اس کو اپنا دستور العمل بنائیں، موسیٰ علیہ السلام کی عرض پر حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ تم کوہ طور پر آ کر ایک مہینہ ہماری عبادت میں مشغول رہو، ایک کتاب تم کو دیں گے، آپ نے ایسا ہی کیا، اور تورات آپ کو مل گئی، مگر دس روز مزید عبادت میں مشغول رہنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک ماہ روزہ رکھنے کے بعد افطار فرمایا تھا، اللہ تعالیٰ کو روزہ دار کے منہ کا راتحہ (جو خلوئے معدہ کی تیخیر سے پیدا ہو جاتا ہے) پسند ہے، اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ دس روزے اور رکھیں تاکہ وہ راتحہ پھر پیدا ہو جائے، اس طرح یہ چالیس روزے پورے ہو گئے، موسیٰ علیہ السلام تو یہاں رہے اور وہاں ایک شخص ”سامری“ نامی تھا، اس نے چاندی یا سونے کا ایک پچھڑے کا قالب بنا کر اس کے اندر وہ مٹی جو اس نے جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کے قدم کے نیچے سے اٹھا کر اپنے پاس محفوظ رکھی ہوئی تھی ڈال دی، اُس پچھڑے میں جان پڑ گئی، اور جہلائے بنی اسرائیل نے اس کی پرستش شروع کر دی۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۵۲﴾

پھر معاف کیا ہم نے تم کو اس پر بھی تاکہ تم احسان مانو۔

آسان ترجمہ قرآن

پھر اس سب کے بعد بھی ہم نے تم کو معاف کر دیا تاکہ تم شکر ادا کرو ﴿۵۲﴾

خلاصہ تفسیر

پھر بھی ہم نے (تمہاری توبہ کرنے پر) درگزر کیا، تم سے اتنی بڑی بات ہوئے پیچھے اس توقع پر کہ تم احسان

مانو گے۔

فائدہ:- اس توبہ کا بیان آگے تیسری آیت میں مذکور ہے، اللہ تعالیٰ کے اس توقع رکھنے کا مطلب نعوذ باللہ یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کو شک تھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ درگزر کرنا ایسی چیز ہے کہ دیکھنے والوں کو شکر گزاری کی توقع کا گمان ہو سکتا ہے۔

وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۵۴﴾

اور جب دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق کو ناحق سے جدا کرنے والے احکام تاکہ تم سیدھی راہ پاؤ

آسان ترجمہ قرآن

اور (یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، اور حق و باطل میں تمیز کا معیار (بخشا) تاکہ تم راہ راست پر آؤ ﴿۵۴﴾

خلاصہ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب (توریت) دی، اور فیصلہ کی چیز، اس توقع پر کہ تم راہ چلتے رہو۔

فائدہ:- فیصلہ کی چیز یا تو ان احکام شرعیہ کو کہا جو توریت میں لکھے ہیں، (کیونکہ) شرع سے تمام تر اعتقاد دی اور عملی اختلافات کا فیصلہ ہو جاتا ہے، یا معجزوں کو کہا کہ ان سے سچے، جھوٹے دعوے کا فیصلہ ہوتا ہے، یا خود توریت ہی کو کہہ دیا کہ اس میں کتاب ہونے کی صفت بھی ہے اور فیصل ہونے کی صفت بھی۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يُقَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے: اے قوم! تم نے نقصان کیا اپنا یہ بچھڑا بنا کر

فَتَوَبُّوا إِلَى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ ۖ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ۖ

سو اب توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اور مار ڈالو اپنی اپنی جان یہ بہتر ہے تمہارے لئے تمہارے خالق کے نزدیک،

فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۖ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۵۴﴾

پھر متوجہ ہوا تم پر، بے شک وہی ہے معاف کرنے والا نہایت مہربان۔

آسان ترجمہ قرآن

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ: ”اے میری قوم! حقیقت میں تم نے پچھڑے کو معبود بنا کر خود اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، لہذا اب اپنے خالق سے توبہ کرو، اور اپنے آپ کو قتل کرو۔ تمہارے خالق کے نزدیک یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔“ اس طرح اللہ نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔ بیشک وہی ہے جو اتنا معاف کرنے والا، اتنا رحم کرنے والا ہے ﴿۵۴﴾

خلاصہ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم! بے شک تم نے اپنا بڑا نقصان کیا اس گوسالہ (پرستی) کی تجویز سے، سو تم اب اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو، پھر بعض آدمی (جنہوں نے گوسالہ پرستی نہیں کی) بعض آدمیوں کو (جنہوں نے گوسالہ پرستی کی) قتل کرو، یہ (عمل درآمد) تمہارے لئے بہتر ہوگا تمہارے خالق کے نزدیک، پھر (اُس عمل درآمد کرنے سے) حق تعالیٰ تمہارے حال پر (اپنی عنایت سے) متوجہ ہوئے، بے شک وہ تو ایسے ہی ہیں کہ توبہ قبول کر لیتے ہیں اور عنایت فرماتے ہیں۔

فائدہ:- یہ اُس طریق کا بیان ہے جو اُن کی توبہ کے لئے تجویز ہوا، یعنی مجرم لوگ قتل کئے جائیں، جیسا ہماری شریعت میں بھی بعض گناہوں کی سزا باوجود توبہ کے بھی قتل و جان ستانی مقرر ہے، مثلاً قتل عمد کے عوض قتل اور ثبوت زنا بالشہادۃ پر رجم، کہ توبہ سے یہ سزا ساقط نہیں ہوتی، چنانچہ ان لوگوں نے اس پر عمل کیا، جس کی وجہ سے آخرت میں موردِ رحمت و عنایت ہو گئے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرٰى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاخَذَتْكُمْ

اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم ہرگز یقین نہ کریں گے تیرا جب تک کہ نہ دیکھ لیں اللہ کو سامنے، پھر آلیا تم کو

الصَّعِقَةُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿۵۵﴾

بجلی نے اور تم دیکھ رہے تھے۔

آسان ترجمہ قرآن

اور جب تم نے کہا تھا: ”اے موسیٰ! ہم اُس وقت تک ہرگز تمہارا یقین نہیں کریں گے جب تک اللہ کو ہم خود کھلی آنکھوں نہ دیکھ لیں“ نتیجہ یہ ہوا کہ کڑکے نے تمہیں اس طرح آپکڑا کہ تم دیکھتے رہ گئے ﴿۵۵﴾

خلاصہ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ اے موسیٰ! ہم تمہارے کہنے سے ہرگز نہ مانیں گے (کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے) یہاں تک کہ ہم (خود) اللہ تعالیٰ کو علانیہ طور پر دیکھ لیں، سو (اس گستاخی پر) تم پر کڑک بجلی کی آپڑی، اور تم (اس بجلی کا آنا) آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

فائدہ:- اس کا قصہ اس طرح ہوا تھا کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور سے توریت لا کر پیش کی، کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، تو بعض گستاخ لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ خود ہم سے کہہ دے کہ یہ ہماری کتاب ہے تو بے شک ہم کو یقین آجائے گا، موسیٰ علیہ السلام نے باذن الہی فرمایا کہ کوہ طور پر چلو، یہ بات بھی ہو جائے گی، بنی اسرائیل نے اس کام کے لئے ستر آدمی منتخب کر کے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر روانہ کئے، وہاں پہنچنے پر اللہ تعالیٰ کا کلام اُن لوگوں نے خود سنا، تو اُس وقت اور رنگ لائے کہ ہم کو تو کلام سننے سے قناعت نہیں ہوتی، خدا جانے کون بول رہا ہوگا، اگر خدا کو دیکھ لیں تو بے شک مان لیں۔ چونکہ دنیا میں کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی قوت نہیں رکھتا، اس لئے اس گستاخی پر اُن پر بجلی آپڑی، اور سب ہلاک ہو گئے (ہلاکت کے متعلق اگلی آیت میں بیان ہے)۔

ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۵۶﴾

پھر اُٹھا کھڑا کیا ہم نے تم کو مر گئے پیچھے تاکہ تم احسان مانو۔

آسان ترجمہ قرآن

پھر ہم نے تمہیں تمہارے مرنے کے بعد دوسری زندگی دی تاکہ تم شکر گزار بنو۔ (۵۱)

خلاصہ تفسیر

پھر ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے) تم کو زندہ کراٹھایا تمہارے مرجانے کے بعد اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے۔

فائدہ:- ”موت“ کے لفظ سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس بجلی سے مر گئے تھے، اُن کے دوبارہ زندہ کئے جانے کا قصہ یہ ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ بنی اسرائیل یوں ہی بدگمان رہتے ہیں، اب وہ یہ دیکھیں گے کہ میں نے اُن کو کہیں لے جا کر کسی تدبیر سے ان کا کام تمام کرا دیا ہوگا، مجھ کو اس تہمت سے محفوظ رکھئے، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اُن کو پھر زندہ کر دیا۔

وَضَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّاءَ وَالسَّلْوَىٰ ط كُلُوا

اور سایہ کیا ہم نے تم پر ابر کا اور اتارا تم پر من اور سلوی، کھاؤ

مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ط وَمَا ظَلَمُونَا وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۵۲﴾

پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دیں، اور انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہ کیا بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔

آسان ترجمہ قرآن

اور ہم نے تم کو بادل کا سایہ عطا کیا، اور تم پر من و سلوی نازل کیا (اور کہا کہ:) ”جو پاکیزہ رزق ہم نے تمہیں بخشا ہے (شوق سے) کھاؤ۔“ اور (یہ نافرمانیاں کر کے) انہوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا، بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ہی ظلم کرتے رہے (۵۲)

خلاصہ تفسیر

اور سایہ فگن کیا ہم نے تم پر ابرکو (میدانِ تہ میں) اور (خزانہ غیب سے) پہنچایا ہم نے تمہارے پاس ترنجبین اور بیڑیں (اور تم کو اجازت دی کہ) کھاؤ نفیس چیزوں سے جو کہ ہم نے تم کو دی ہیں (مگر وہ لوگ اس میں بھی خلاف بات کر بیٹھے) اور (اس سے) انہوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا، لیکن اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

فائدہ:- دونوں قصے وادیِ تہ میں واقع ہوئے، وادیِ تہ کی حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا اصلی وطن ملکِ شام ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے وقت میں مصر آئے تھے، اور یہاں ہی رہ پڑے، اور ملکِ شام میں عمالقہ نامی قوم کا تسلط ہو گیا، فرعون جب غرق ہو گیا اور یہ لوگ مطمئن ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ کا ان کو حکم ہوا کہ عمالقہ سے جہاد کرو، اور اپنی اصلی جگہ کو اُن کے قبضے سے چھڑالو۔ بنی اسرائیل اس ارادہ پر مصر سے چلے، اور اُن کی حدود میں پہنچ کر جب عمالقہ کے زور و قوت کا حال معلوم ہوا تو ہمت ہار بیٹھے اور جہاد سے صاف انکار کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس انکار کی یہ سزا دی کہ چالیس برس تک ایک میدان میں سرگرداں و پریشاں پھرتے رہے گھر پہنچنا بھی نصیب نہ ہوا۔

یہ میدان کچھ بہت بڑا رقبہ نہ تھا، بلکہ مصر اور شام کے درمیان پانچ چھ کوس یعنی تقریباً دس میل کا رقبہ تھا، روایت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے وطن مصر جانے کے لئے دن بھر سفر کرتے، اور رات کو کسی منزل پر اُترتے، صبح کو دیکھتے کہ جہاں سے چلے تھے وہیں ہیں، اسی طرح چالیس سال سرگرداں و پریشاں اس میدان میں پھرتے رہے، اسی لئے اس میدان کو ”وادیِ تہ“ کہا جاتا ہے، ”تہ“ کے معنی ہیں سرگردانی اور پریشانی کے۔

یہ وادیِ تہ ایک کھلا میدان تھا، نہ اس میں کوئی عمارت تھی نہ درخت، جس کے نیچے دُھوپ اور سرگردی گرمی سے بچا جاسکے، اور نہ یہاں کوئی کھانے پینے کا سامان تھا، نہ پہننے کے لئے لباس، مگر اللہ تعالیٰ نے معجزہ کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے اسی میدان میں اُن کی تمام ضروریات کا انتظام فرمادیا، بنی اسرائیل نے دُھوپ کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے سفید رقیق ابر کا سایہ کر دیا، اور بھوک کا تقاضا ہوا تو من و سلویٰ نازل فرمادیا، یعنی درختوں پر ترنجبین جو ایک شیریں چیز ہے بکثرت پیدا کر دی، یہ لوگ اس کو جمع کر لیتے، اسی کو ”من“ کہا گیا ہے، اور بیڑیں اُن کے پاس جمع ہو جاتیں، اُن سے بھاگتی نہ تھیں، یہ اُن کو پکڑ لیتے اور ذبح کر کے کھاتے، اسی کو ”سلویٰ“ کہا گیا ہے، یہ لوگ دونوں لطیف چیزوں سے پیٹ بھر لیتے، چونکہ ترنجبین کی کثرت معمول سے زائد تھی، اور بیڑیوں کا وحشت نہ کرنا یہ بھی معمول کے خلاف ہے، لہذا اس حیثیت سے دونوں چیزیں خزانہ غیب سے قرار دی گئیں، اُن کو پانی کی ضرورت پیش آئی تو موسیٰ علیہ السلام کو ایک پتھر پر لاٹھی مارنے کا حکم دیا گیا، اس پتھر سے چشمے پھوٹ پڑے، جیسا کہ دوسری آیات قرآنی میں مذکور ہے، ان

لوگوں نے رات کی اندھیری کا شکوہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے غیب سے ایک روشنی عمودی شکل میں ان کے محلہ کے درمیان قائم فرمادی، کپڑے میلے ہوئے اور پھٹنے لگے اور لباس کی ضرورت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے بطور اعجاز یہ صورت کردی کہ ان کے کپڑے نہ میلے ہوں نہ پھٹیں، اور بچوں کے بدن پر جو کپڑے ہیں وہ ان کے بدن کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اسی مقدار سے بڑھتے رہیں۔ (تفسیر قرطبی) ۱

اور ان لوگوں کو یہ بھی حکم ہوا تھا کہ بقدر خرچ لے لیا کریں، آئندہ کے لئے جمع کر کے نہ رکھیں، مگر ان لوگوں نے حرص کے مارے اس میں بھی خلاف کیا، تو رکھا ہوا گوشت سڑنا شروع ہو گیا، اسی کو فرمایا ہے کہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا

اور جب ہم نے کہا داخل ہو اس شہر میں اور کھاتے پھرو اس میں جہاں چاہو فراغت سے اور داخل ہو

الْبَابِ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَتَكُمْ ۖ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ۝۵۸

دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے اور کہتے جاؤ: بخش دے، تو معاف کر دیں گے، ہم تمہارے قصور اور زیادہ بھی دیں گے نیکی والوں کو۔

آسان ترجمہ قرآن

اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے کہا تھا کہ: ”اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور اس میں جہاں سے چاہو جی بھر کر کھاؤ، اور (بستی کے) دروازے میں جھکے سروں کے ساتھ داخل ہونا، اور یہ کہتے جانا کہ (یا اللہ!) ہم آپ کی بخشش کے طلب گار ہیں، (اس طرح) ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے، اور نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ (ثواب) بھی دیں گے۔“ ۵۸

خلاصہ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے حکم کیا کہ تم لوگ اس آبادی کے اندر داخل ہو پھر کھاؤ اس (کی چیزوں میں) سے جس جگہ تم رغبت کرو بے تکلفی سے، اور (یہ بھی حکم دیا کہ جب اندر جانے لگو تو) دروازے میں داخل ہونا (عاجزی سے) جھکے جھکے اور (زبان سے یہ) کہتے جانا کہ توبہ ہے (توبہ ہے) ہم معاف کر دیں گے تمہاری (پچھلی) خطائیں (تو سب کی)

اور مزید برآں اور دیں گے دل سے نیک کام کرنے والوں کو۔

فائدہ:- بقول شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ قصہ بھی زمانہ وادی تیبہ کا ہے، کہ جب من وسلوی کھاتے کھاتے اُکتا گئے اور اپنے معمولی کھانے کی درخواست کی (جیسا کہ آگے کی چوتھی آیت میں آرہا ہے) تو ان کو ایک شہر میں جانے کا حکم ہوا تھا کہ وہاں کھانے پینے کی اور معمولی چیزیں ملیں گی، سو یہ حکم اس شہر کے اندر جانے کے متعلق ہے، اس میں قولی اور فعلی ادب داخل ہونے کے متعلق بیان کیا گیا، اور اندر جا کر کھانے پینے میں توسیع کی گئی، اس قول پر بہت سے بہت یہ کہا جاسکے گا کہ قصہ کے بیان میں تقدم و تاخر ہو گیا، کہ بعد کا قصہ پہلے بیان ہوا اور پہلے کا بعد میں، تو یہ اشکال اُس وقت ہوتا جب قرآن مجید میں خود قصوں کا بیان کرنا مقصود اصلی ہوتا، اور جب نظر نتائج پر ہے تو اگر ایک قصہ کے اجزاء میں ہر جز کا نتیجہ جدا ہو، اور اُن نتائج کے کسی اثر کا لحاظ کر کے جز و مقدم کو مؤخر، اور جز و مؤخر کو مقدم کر دیا جائے تو اس میں نہ کوئی مضائقہ ہے اور نہ کوئی اشکال۔

دیگر مفسرین حضرات نے اس حکم کو اس شہر سے متعلق سمجھا ہے جس پر جہاد کرنے کا حکم ہوا تھا، اور بعد مدت تیبہ کے پھر اس پر جہاد ہوا، اور وہ فتح ہوا، اس وقت یوشع علیہ السلام نبی تھے، یہ حکم ان کی معرفت اس شہر کے بارے میں ہوا تھا۔ قول اول کی بنا پر کچھلی خطاؤں میں وہ درخواست بھی داخل کر لینا مناسب ہے جو من وسلوی چھوڑ کر معمولی کھانوں کے متعلق کی گئی تھی، مطلب یہ ہوگا کہ یہ درخواست تھی تو گستاخی، لیکن خیر، اب اگر اس ادب اور حکم کو بجا لائیں تو اس کو معاف کر دیں گے، اور ہر قول پر یہ معافی تو سب کہنے والوں کے لئے عام ہوگی، اور جو اخلاص سے اعمالِ صالحہ کریں گے اُن کا انعام اس کے علاوہ ہے۔

فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنْزَلْنَا عَلَى

پھر بدل ڈالا ظالموں نے بات کو خلاف اس کے کہ جو کہہ دی گئی تھی ان سے پھر اُتارا ہم نے

الَّذِينَ ظَلَمُوا بِرُجْزٍ مِنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿٥٩﴾

ظالموں پر عذاب آسمان سے اُن کی عدول حکمی پر۔

آسان ترجمہ قرآن

مگر ہوا یہ کہ جو بات اُن سے کہی گئی تھی، ظالموں نے اُسے بدل کر ایک اور بات بنالی۔ نتیجہ یہ کہ جو نافرمانیاں وہ

کرتے آرہے تھے ہم نے اُن کی سزا میں ان ظالموں پر آسمان سے عذاب نازل کیا ﴿۵۹﴾

خلاصہ تفسیر

سو بدل ڈالا اُن ظالموں نے ایک اور کلمہ جو خلاف تھا اس کلمے کے جس (کے کہنے) کی اُن سے فرمائش کی گئی تھی، اس پر ہم نے نازل کی ان ظالموں پر ایک سماوی آفت اس وجہ سے کہ وہ عدول حکمی کرتے تھے۔

فائدہ:- یہ آیت آیت سابقہ کا تتمہ ہے، وہ کلمہ خلاف یہ تھا کہ **حِطَّةٌ** بمعنی توبہ کی جگہ اُزراہِ تمسخر ”حَبَّةُ فِسی شَعِیرَةٍ“ (یعنی غلہ درمیان جو کے) کہنا شروع کیا۔ وہ آفت سماوی طاعون تھا، جو حدیث کی رو سے بے حکموں کے لئے عذاب اور حکم برداروں کے لئے رحمت ہے، اس شرارت کی اُن کو یہ سزا ملی کہ ان میں طاعون پھوٹ پڑا اور بہت سے آدمی فنا ہو گئے (بعضوں نے ہلاک شدگان کی تعداد ستر ہزار تک بتائی ہے)۔ (قرطبی)

معارف مسائل

کلام میں لفظی تغیر و تبدل کا حکم شرعی

اس آیت سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس شہر میں **حِطَّةٌ** یعنی ”توبہ توبہ“ کہتے ہوئے داخل ہوں، انہوں نے شرارت سے ان الفاظ کو بدل کر ”حِطَّةٌ“ کہنا اختیار کیا، اس کی وجہ سے اُن پر آسمانی عذاب نازل ہوا، یہ الفاظ کی تبدیلی ایسی تھی کہ جس میں صرف الفاظ ہی نہیں بدلے، بلکہ معنی بھی بالکل اُلٹ گئے۔ **حِطَّةٌ** کے معنی توبہ یعنی گناہوں کو نظر انداز کرنے کے تھے، اور ”حِطَّةٌ“ کے معنی گندم کے ہیں، جس کا کلمہ مأمور بہا سے کوئی تعلق نہیں، الفاظ کی ایسی تبدیلی خواہ قرآن میں ہو یا حدیث میں، یا اور کسی امرِ الہی میں بلاشبہ اور بالاتفاق حرام ہے، کیونکہ یہ ایک قسم کا استہزاء یا تحریف ہے، اسی پر یہ عذاب نازل ہوا۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ معنی اور مقصود کو محفوظ رکھتے ہوئے صرف الفاظ کی تبدیلی کا کیا حکم ہے؟ امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس کے متعلق فرمایا ہے کہ بعض کلمات اور اقوال میں معنی کی طرح الفاظ بھی مقصود اور اداء عبارت کے لئے ضرورت ہوتے ہیں، ایسے اقوال میں لفظی تبدیلی بھی جائز نہیں، جیسے اذان کے الفاظ مقررہ کے بجائے اسی معنی کے دوسرے الفاظ پڑھنا جائز نہیں، اسی طرح نماز میں جو دعائیں مثلاً سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ، التَّحِيَّاتُ، دُعَاءُ قُنُوتٍ یا تَسْبِيحَاتِ رُکُوعِ و سجود، جن الفاظ سے منقول ہیں انہی الفاظ میں ادا کرنا ضروری ہے، دوسرے الفاظ میں اگرچہ معنی وہی محفوظ بھی رہیں مگر تبدیلی جائز

نہیں۔ اسی طرح تمام قرآن کریم کے الفاظ کا یہی حکم ہے، کہ تلاوت قرآن سے جو احکام متعلق ہیں وہ صرف انہی الفاظ کے ساتھ ہیں جو قرآن کریم کے نازل ہوئے ہیں، اگر کوئی ان الفاظ کا ترجمہ دوسرے لفظوں میں کر کے پڑھے جس میں معنی بالکل محفوظ رہیں اس کو اصطلاح شریعت میں تلاوت قرآن نہ کہا جائے گا، اور نہ اُس پر وہ ثواب حاصل ہوگا جو قرآن پڑھنے پر مقرر ہے کہ ایک حرف پر دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، کیونکہ قرآن صرف معنی کا نام نہیں بلکہ معنی اور الفاظ نازل شدہ کے مجموعے کو قرآن کہا جاتا ہے۔

آیت مذکورہ میں **فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا اقْوَالَهُمْ** کے الفاظ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو توبہ کے لئے جو الفاظ **حَطَّةٌ** کے بتلائے گئے تھے، یہ الفاظ بھی مامور بہ تھے، ان کا بدلنا خود بھی گناہ تھا، پھر تبدیلی ایسی کر دی کہ معنی ہی الٹ گئے، اس لئے عذاب آسمانی کے مستحق ہو گئے۔

لیکن جن اقوال اور کلمات میں اصل مقصود معنی ہی ہیں، الفاظ مقصود نہیں، ان میں اگر لفظی تبدیلی ایسی کی جائے کہ معنی پر کوئی اثر نہ پڑے، وہ پوری طرح محفوظ رہیں تو جمہور محدثین اور فقہاء کے نزدیک یہ تبدیلی جائز ہے، بعض حضرات محدثین حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسی لفظی تبدیلی کو بھی جائز نہیں کہتے۔ قرطبیؒ نے امام مالکؒ، شافعیؒ، امام اعظم ابو حنیفہؒ سے نقل کیا ہے کہ حدیث میں روایت بالمعنی بھی جائز ہے، مگر شرط یہ ہے کہ روایت کرنے والا عربی زبان کا ماہر اور مواقع خطاب اور جس ماحول میں حدیث وارد ہوئی ہے اس سے پوری طرح واقف ہوتا کہ اس کی غلطی سے معنی میں فرق نہ آجائے۔

اور ائمہ حدیث کی ایک جماعت جس طرح الفاظ حدیث سے ہیں اُسی طرح نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں، کوئی لفظی تغیر و تبدل جائز نہیں رکھتے، محمد بن سیرینؒ، قاسم بن محمدؒ وغیرہ حضرات کا بھی یہی مسلک ہے، یہاں تک کہ ان میں سے بعض حضرات کا تعامل یہ ہے کہ اگر راوی حدیث نے کوئی لفظ نقل کرنے میں کوئی لغوی غلطی بھی کی ہے تو اس سے سننے والے کو اسی غلطی کے ساتھ روایت کرنا چاہئے، اپنی طرف سے تغیر نہ کرے، اس کے ساتھ یہ ظاہر کر دے کہ میرے خیال میں صحیح لفظ اس طرح ہے مگر مجھے روایت اس طرح پہنچی ہے۔ ان حضرات کا استدلال اس حدیث سے ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ تلقین فرمائی تھی کہ جب سونے کے لئے بستر پر جائے تو یہ دُعا پڑھے: **”اٰمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِي اَنْزَلْتَ وَبِنَبِيِّكَ الَّذِي اَرْسَلْتَ“** اس شخص نے **”نَبِيِّكَ“** کی جگہ **”رَسُولُكَ“** پڑھ دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی ہدایت فرمائی کہ لفظ **”نَبِيِّكَ“** پڑھا کرے، جس سے معلوم ہوا کہ لفظی تبدیلی بھی جائز نہیں۔

اسی طرح ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

نَضَرَ اللَّهُ أَمْرًا سَمِعَ مَقَالَتِي فَبَلَّغَهَا كَمَا سَمِعَهَا۔^[۱]

”یعنی اللہ تعالیٰ اُس شخص کو سرسبز و شاداب رکھے جس نے میرا کوئی کلام سنا اور پھر اُمت کو اسی طرح پہنچا دیا جس طرح سنا تھا۔“

اس سے بھی ظاہر ہے کہ جن الفاظ سے سنا تھا انہی لفظوں سے پہنچانا مراد ہے۔

مگر جمہور محدثین اور فقہاء کے نزدیک اگرچہ اولیٰ اور افضل تو یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے حدیث کی روایت میں ٹھیک وہی الفاظ نقل کرے جو سنے ہیں، اپنے قصد سے اُن میں تبدیلی نہ کرے، لیکن اگر وہ الفاظ پوری طرح یاد نہیں رہے تو ان کا مفہوم اپنے الفاظ میں نقل کر دینا بھی جائز ہے، اور حدیث ”بَلَّغَهَا كَمَا سَمِعَهَا“ کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جو مضمون سنا وہی بعینہ نقل کر دے، اس کے مفہوم میں کوئی فرق نہ آوے، الفاظ کی تبدیلی اس کے منافی نہیں، امام قرطبیؒ نے اس کی تائید میں فرمایا کہ خود یہی حدیث اس کی دلیل ہے کہ الفاظ کی تبدیلی بضرورت جائز ہے، کیونکہ خود اس حدیث کی روایت ہی ہم تک مختلف الفاظ سے پہنچی ہے۔

اور پہلی حدیث میں جو لفظ ”رسولک“ کے بجائے ”نَبِیِّک“ ہی پڑھنے کا امر فرمایا، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لفظ ”نبی“ میں صفت مدح بہ نسبت ”رسول“ کے زیادہ ہے، کیونکہ ”رسول“ کا لفظ تو قاصد کے معنی میں دُوروں کے لئے بھی بولا جاتا ہے، بخلاف لفظ ”نبی“ کے کہ وہ خاص اسی منصب کے لئے استعمال ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے مخصوص بندوں کو بذریعہ وحی خطاب کرنے کا عطا کیا جاتا ہے۔

اور دُوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دُعاؤں میں الفاظ منقولہ کا اتباع خواص و آثار کے اعتبار سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، دُوسرے الفاظ میں وہ خاصیت نہیں رہتی (قرطبیؒ)۔ اسی لئے عامل حضرات جو تعویذ گنڈے کرتے ہیں وہ اس کی بڑی رعایت کرتے ہیں کہ جو الفاظ منقول ہیں ان میں تغیر و تبدل نہ کیا جائے، اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ادعیہ ماثورہ بھی اسی قسم اول میں داخل ہیں، جن میں معنی کے ساتھ الفاظ مخصوصہ کی حفاظت بھی مقصود ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

وَإِذَا سَأَلَكَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانفَجَرَتْ

اور جب پانی مانگا موسیٰ نے اپنی قوم کے واسطے تو ہم نے کہا: مار اپنے عصا کو پتھر پر، سو بہہ نکلے

[۱] مشکوٰۃ، کتاب العلم ج: ۱ ص: ۳۵

[۲] تفسیر القرطبی، تحت هذه الآيات ج: ۱ ص: ۴۱۰ تا ۴۱۳

مِنْهُ اثْنَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوا وَاشْرَبُوا

اس سے بارہ چشمے، پہچان لیا ہر قوم نے اپنا گھاٹ، کھاؤ اور پیو

مِنْ رِزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۖ

اللہ کی روزی اور نہ پھر ملک میں فساد مچاتے۔

آسان ترجمہ قرآن

اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تو ہم نے کہا: ”اپنی لاٹھی پتھر پر مارو“ چنانچہ اس (پتھر) سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر ایک قبیلے نے اپنے پانی لینے کی جگہ معلوم کر لی۔ (ہم نے کہا:) اللہ کا دیا ہوا رزق کھاؤ پیو، اور زمین میں فساد مچاتے مت پھرنا ۖ

خلاصہ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے پانی کی دُعا مانگی، اپنی قوم کے واسطے، اس پر ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کو) حکم دیا کہ اپنے اس عصا کو فلاں پتھر پر مارو (اس سے پانی نکل آوے گا)، بس (عصا پتھر پر مارنے کی دیر تھی) فوراً اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، (اور بنی اسرائیل کے بھی بارہ ہی خاندان تھے، چنانچہ) ہر شخص نے اپنے پانی پینے کا موقع معلوم کر لیا (اور ہم نے یہ نصیحت کی کہ کھانے کو) کھاؤ اور (پینے کو) پیو، اللہ تعالیٰ کے رزق سے اور حد (اعتدال) سے مت نکلو، فساد (و فتنہ) کرتے ہوئے سر زمین میں۔

فائدہ:- یہ قصہ بھی وادی تہ میں ہوا، وہاں پیاس لگی تو پانی مانگا، موسیٰ علیہ السلام نے دُعا کی تو ایک خاص پتھر کو صرف عصا مارنے سے قدرتِ خداوندی سے بارہ چشمے نکل پڑے۔ اور ان کے بارہ خاندان اس طرح تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے، ہر ایک کی اولاد کا ایک ایک خاندان تھا، ان کو انتظامی معاملات میں الگ الگ ہی رکھا جاتا تھا، سب کے افسر بھی جدا جدا تھے، اس لئے چشمے بھی بارہ ہی نکلے۔

کھانے سے مراد من و سلویٰ اور پینے سے مراد یہی پانی تھا، اور نافرمانی اور ترکِ احکام کو فتنہ و فساد سے تعبیر فرمایا۔ قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسے خوارق (اور معجزات) کا انکار بہت بڑی غلطی ہے، جب بعض

پتھروں میں اللہ تعالیٰ نے بعید از قیاس اور خلاف عقل یہ تاثیر رکھی ہے کہ لوہے کو جذب کرتا ہے تو اس پتھر میں اگر یہ تاثیر پیدا کر دی ہو کہ اجزاء زمین سے پانی کو جذب کر لے اور اس سے پانی نکلنے لگے تو کیا محال ہے۔
ہمارے زمانے کے عقلاء کو اس بیان سے سبق حاصل کرنا اور فائدہ اٹھانا چاہئے، اور پھر یہ نظیر بھی محض سطحی نظر والوں کے لئے ہے، ورنہ خود اگر اس پتھر کے اجزاء ہی میں پانی پیدا ہو جائے تو بھی کونسا محال لازم آتا ہے، جو حضرات ایسے امور کو محال کہتے ہیں تو واللہ وہ اب تک محال کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھے۔

معارف مسائل

آیت مذکورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے استسقاء کی دُعا فرمائی، اللہ تعالیٰ نے پانی کا سامان کر دیا کہ پتھر پر لاٹھی مارنے سے چشمے اُبل پڑے، اس سے معلوم ہوا کہ استسقاء کی اصل دُعا ہی ہے، شریعت موسویہ میں بھی صرف دُعا پر اکتفا کیا گیا، جیسا کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا ارشاد ہے کہ استسقاء کی اصل پانی کے لئے دُعا کرنا ہے، یہ دُعا کبھی خاص نماز استسقاء کی صورت میں کی گئی ہے، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز استسقاء کے لئے عید گاہ کے میدان میں تشریف لے جانا اور نماز اور خطبہ اور دُعا کرنا منقول ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ بغیر کسی خاص نماز کے صرف دُعا پر اکتفا کیا گیا، جیسا کہ صحیحین میں حضرت انسؓ کی روایت سے منقول ہے کہ خطبہ جمعہ ہی میں آپ نے دُعا فرمائی، اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمادی۔

اور یہ بات سب کے نزدیک مُسلم ہے کہ استسقاء خواہ بصورت نماز کیا جائے یا صرف دُعا کی صورت میں، اس کے موثر ہونے کے لئے گناہوں سے توبہ، اپنے فقر و مسکنت اور عبودیت کا اظہار ضروری ہے، گناہوں پر اصرار اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں پر قائم رہتے ہوئے تاثیر دُعا کے انتظار کا کسی کو حق نہیں، اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے یوں بھی قبول فرمائیں، ان کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ

اور جب کہا تم نے: اے موسیٰ! ہم ہرگز صبر نہ کریں گے ایک ہی طرح کے کھانے پر، سو دُعا مانگ ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے کہ

۱ تفسیر البیضاوی تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۹۷

۲ صحیح البخاری، ابواب الاستسقاء، باب من اکتفی بصلوة الجمعة... إلخ ج: ۱ ص: ۱۲۸، وصحیح مسلم، کتاب صلوة الاستسقاء، فصل فی الکفایة

بالدعاء... إلخ ج: ۱ ص: ۲۹۳

يُخْرِجُ لَنَا مِمَّا تُثْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّاءِهَا فُومَهَا وَعَدْسَهَا

نکال دے ہمارے واسطے جو اُگتا ہے زمین سے ترکاری اور ککڑی اور گیہوں اور مسور

وَبَصِلَهَا^ط قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَى بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ^ط اهْبِطُوا

اور پیاز، کہا موسیٰ نے: کیا لینا چاہتے ہو وہ چیز جو ادنیٰ ہے اس کے بدلہ میں جو بہتر ہے، اترو

مِصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مَّا سَأَلْتُمْ^ط وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ^ق وَبَاءُوا

کسی شہر میں تو تم کو ملے جو مانگتے ہو، اور ذالی گئی اُن پر ذلت اور محتاجی اور پھرے

بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ^ط ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ

اللہ کا غصہ لے کر، یہ اس لئے ہوا کہ نہیں مانتے تھے احکام خداوندی کو اور خون کرتے تھے

النَّبِيِّنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ^ط ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ^ع

پیغمبروں کا ناحق، یہ اس لئے کہ نافرمان تھے اور حد پر نہ رہتے تھے۔

آسان ترجمہ قرآن

اور (وہ وقت بھی) جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہم ایک ہی کھانے پر صبر نہیں کر سکتے، لہذا ہماری خاطر اپنے پروردگار سے مانگئے کہ وہ ہمارے لئے کچھ وہ چیزیں پیدا کرے جو زمین اُگایا کرتی ہے، یعنی زمین کی ترکاریاں، اس کی ککڑیاں، اس کا گندم، اس کی دالیں اور اس کی پیاز۔ موسیٰ نے کہا: ”جو (غذا) بہتر تھی کیا تم اُس کو ایسی چیزوں سے بدلنا چاہتے ہو جو گھٹیا درجے کی ہیں؟ (خیر!) ایک شہر میں جا اترو، تو وہاں تمہیں وہ چیزیں مل جائیں گی جو تم نے مانگی ہیں۔“ اور ان (یہودیوں) پر ذلت اور بے کسی کا ٹھپہ لگا دیا گیا، اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کر دیتے تھے۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی، اور وہ بیحد زیادتیاں کرتے تھے ۶۱

خلاصہ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ اے موسیٰ (روز کے روز) ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر کبھی نہ رہیں گے (یعنی من و سلویٰ پر) آپ ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے دُعا کریں کہ وہ ہمارے لئے ایسی چیزیں پیدا کریں جو زمین میں اُگا کرتی ہیں، ساگ (ہوا)، کلڑی (ہوئی)، گیہوں (ہوا)، مسور (ہوئی)، پیاز (ہوئی) آپ نے فرمایا: کیا تم عوض میں لینا چاہتے ہو اُدنیٰ درجہ کی چیزوں کو ایسی چیز کے مقابلہ میں جو اُعلیٰ درجہ کی ہے (اچھا اگر نہیں مانتے تو) کسی شہر میں (جا کر) اُترو (وہاں) البتہ تم کو وہ چیزیں ملیں گی جن کی تم درخواست کرتے ہو اور (ایسی ایسی گستاخیوں سے ایک زمانے میں جا کر نقش کی طرح) جم گئی اُن پر ذلت (کہ دُوسروں کی نگاہ میں قدر نہ رہی) اور پستی (کہ خود اُن کی طبائع میں اُولوالعزمی نہ رہی) اور مستحق ہو گئے غضبِ الہی کے (اور) یہ (ذلت و غضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے تھے احکامِ الہیہ کے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کا (کہ وہ قتل خود ان کے نزدیک بھی) ناحق (ہوتا تھا) اور (نیز) یہ (ذلت و غضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ ان لوگوں نے اطاعت نہ کی، اور دائرۃ (اطاعت) سے بھی نکل جاتے تھے۔

فائدہ:- یہ قصہ بھی وادیِ تہ کا ہے، من و سلویٰ سے اُکتا کر ان ترکاریوں اور غلوں کی درخواست کی، اس میدان کے داخلِ حدود کوئی شہر آباد تھا، وہاں جا کر رہنے کا حکم ہوا کہ بوؤ، جو تو، کھاؤ، کماؤ۔

اور من جملہ ذلت و مسکنت کے یہ بھی ہے کہ یہودیوں سے سلطنتِ قربِ قیامت تک کے لئے چھین لی گئی، البتہ بالکل قیامت کے قریب محض لٹیروں کا سا بے ضابطہ تھوڑا زور شور دجالِ یہودی کا کل چالیس دن کے لئے ہو جائے گا، اور اس کو کوئی عاقل سلطنت نہیں کہہ سکتا، اور ان کو یہ بات موسیٰ علیہ السلام کی معرفت جتلا دی گئی تھی کہ اگر بے حکمی کرو گے تو ہمیشہ دُوسری قوموں کے محکوم رہو گے، جیسا کہ سورہ اعراف کی آیت: **وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ يَسُوءُهُمْ سَاءَ الْعَذَابِ** ^(۱۶۷) (الاعراف: ۱۶۷) میں مذکور ہے، (موجودہ اسرائیلی حکومت کی حیثیت بھی امریکا اور برطانیہ کے غلام سے زیادہ کچھ نہیں)۔

اور بہت سے پیغمبر مختلف اوقات میں یہودیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، جس کو وہ لوگ بھی دل میں سمجھتے تھے کہ ہمارا یہ فعل ناحق ہے، لیکن عناد اور ضد نے اندھا بنا رکھا تھا۔

معارف و مسائل

یہودیوں پر ابدی ذلت کا مطلب اور اسرائیل کی موجودہ حکومت سے شبہ اور اس کا جواب

آیات مذکورہ میں یہودی سزا دُنیا میں دائمی ذلت و مسکنت اور دُنیا و آخرت میں غضبِ الہی کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کی دائمی ذلت و مسکنت کا مفہوم جو ائمہ تفسیر صحابہ و تابعین سے منقول ہے، اس کا خلاصہ ابن کثیرؒ کے الفاظ میں یہ ہے کہ: "لَا يَزَالُونَ مُسْتَذِلِّينَ، مَنْ وَجَدَهُمْ اسْتَذَلَّهُمْ وَضَرَبَ عَلَيْهِمُ الصَّغَارَ"، یعنی وہ کتنے ہی مال دار بھی ہو جائیں ہمیشہ تمام اقوام میں ذلیل و حقیر ہی سمجھے جائیں گے، جس کے ہاتھ لگیں گے ان کو ذلیل کرے گا، اور ان پر غلامی کی علامتیں لگا دے گا۔

امام تفسیر ضحاک ابن مزاحمؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ان کی ذلت و مسکنت کا یہ مفہوم نقل کیا ہے کہ: "هُمْ أَهْلُ الْقَبَالَاتِ يَعْنِي الْجِزْيَةَ" مطلب یہ ہے کہ یہودی ہمیشہ دُوسروں کی غلامی میں رہیں گے، ان کو ٹیکس وغیرہ ادا کرتے رہیں گے، خود ان کو کوئی قوت و اقتدار حاصل نہ ہوگا۔

اس مضمون کی ایک آیت سورہ آل عمران میں ایک زیادتی کے ساتھ اس طرح آئی ہے:-

صُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذَّلَّةُ أَيْنَ مَا ثَقَفُوا إِلَّا يَجْلُي مِنَ اللَّهِ وَحُبْلٍ مِنَ النَّاسِ (آل عمران: ۱۱۲)

”جمادی گئی اُن پر بے قدری جہاں کہیں جائیں گے، مگر ہاں ایک تو ایسے ذریعہ سے جو اللہ کی طرف سے ہو اور ایک ایسے ذریعہ سے جو آدمیوں کی طرف سے ہو۔“

اللہ تعالیٰ کے ذریعہ کا مطلب تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے قانون میں امن دے دیا ہو، جیسے نابالغ بچے، عورتیں یا ایسے عبادت گزار جو مسلمانوں سے لڑتے نہیں پھرتے، وہ محفوظ و مأمون رہیں گے۔ اور آدمیوں کے ذریعہ سے مراد معاہدہ صلح ہے، جس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ مسلمانوں سے معاہدہ صلح کا یا جزیہ دے کر ان کے ملک میں رہنے کا ہو جائے، مگر الفاظ قرآنی میں ”مِنَ النَّاسِ“ فرمایا ہے، ”مِنَ الْمُسْلِمِينَ“ نہیں، اس لئے یہ صورت بھی محتمل ہے کہ دُوسرے غیر مسلموں سے معاہدہ صلح کا کر کے اُن کی پشت پناہی میں آجائیں تو مأمون رہ سکتے ہیں، پھر یہ استثناء ”حَبْلٌ مِّنَ اللَّهِ“ اور ”حَبْلٌ مِّنَ النَّاسِ“ کا اگر بقول کشاف^[۱] استثناء متصل قرار دیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ یہود ہمیشہ ہر جگہ ذلیل

[۱] مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: کشاف تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۳۱۲

و خوار رہیں گے، بجز اُن دو صورتوں کے کہ یا تو اللہ کے عہد کے ذریعہ ان کے بچے، عورتیں وغیرہ اس ذلت و خواری سے نکل جائیں، یا معاہدہ صلح کے ذریعہ یہ اپنے آپ کو ذلت و خواری سے بچالیں، اور جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے معاہدہ صلح کے ذریعہ ذلت و خواری سے نکلنے کی صورت مسلمانوں سے معاہدہ صلح کر کے بھی ہو سکتی ہے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ دوسری قوموں سے معاہدہ صلح کا کر کے اُن کے سہارے ذلت و خواری سے محفوظ رہیں۔

یہ سب تقریر استثناء متصل کی تقدیر پر ہے، اور بہت سے حضرات مفسرین نے اس کو استثناء منقطع قرار دیا ہے، تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ اپنی ذلت اور اپنی قومی حیثیت سے تو ذلیل و خوار ہی رہیں گے، گو قانونِ الہی کی وسعت میں آکر ان کے بعض افراد اس سے محفوظ ہو جائیں گے، یا دوسرے لوگوں کا سہارا لے کر ذلت و خواری پر پردہ ڈال دیں۔

اس طرح سورہ بقرہ کی آیت کی وضاحت سورہ آل عمران کی آیت سے پوری ہوگئی، اور اسی سے وہ تمام شبہات بھی دور ہو گئے جو آج کل فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم ہونے کی بنا پر بہت سے مسلمانوں کو پیش آتے ہیں کہ قرآن کے قطعی ارشادات سے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہودیوں کی حکومت کبھی قائم نہ ہوگی، اور واقعہ یہ پایا جاتا ہے کہ فلسطین میں اُن کی حکومت قائم ہوگئی۔ جواب واضح ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کی موجودہ حکومت کی حقیقت سے جو لوگ باخبر ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ حکومت درحقیقت اسرائیل کی نہیں بلکہ امریکا اور برطانیہ کی ایک چھاؤنی سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں، یہ اپنی ذاتی طاقت سے ایک مہینہ بھی زندہ نہیں رہ سکتے، یورپین طاقتوں نے اسلامی ہلاک کو کمزور کرنے کے لئے اُن کے بیچ میں اسرائیل کا نام دے کر ایک چھاؤنی بنائی ہوئی ہے، اور اسرائیلی اُن کی نظروں میں بھی اُن کے فرمانبردار غلام سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے، صرف قرآن کریم کے ارشاد: وَحَبْلِ مِّنَ الْثَلاَثِ کے سہارے ان کا اپنا وجود قائم ہے، وہ بھی ذلت کے ساتھ، اس لئے موجودہ اسرائیلی حکومت سے قرآن کریم کے کسی ارشاد پر ادنیٰ شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں میں سب سے پہلے یہود ہیں، ان کی شریعت، اُن کی تہذیب سب سے پہلی ہے، اگر پوری دنیا میں فلسطین کے ایک چھوٹے سے قصبہ پر اُن کا تسلط کسی طرح ہو بھی گیا، تو پوری دنیا کے نقشہ میں یہ حصہ ایک نقطہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے، اس کے بالمقابل نصاریٰ کی سلطنتیں اور مسلمانوں کے دورِ تنزل کے باوجود ان کی سلطنتیں، بت پرستوں کی سلطنتیں، لاندہبوں کی حکومتیں جو جگہ جگہ مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ہیں اُن کے مقابلہ میں فلسطین اور وہ بھی آدھا، اور اس پر بھی امریکا، برطانیہ کے زیرِ سایہ کوئی تسلط یہودیوں کا ہو جائے تو کیا اس سے پوری قوم یہود پر خدا تعالیٰ کی طرف سے لگائی ہوئی دائمی ذلت کا کوئی جواب بن سکتا ہے؟

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّبِيَّانَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ

بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابین جو ایمان لایا (ان میں سے) اللہ پر

وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ

اور روزِ قیامت پر اور کام کئے نیک تو ان کے لئے ہے ان کا ثواب ان کے رب کے پاس، اور نہیں ان پر کچھ خوف

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۶۲﴾

اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

آسان ترجمہ قرآن

حق تو یہ ہے کہ جو لوگ بھی، خواہ وہ مسلمان ہوں یا یہودی یا نصرانی یا صابی، اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لے آئیں گے اور نیک عمل کریں گے، وہ اپنے پروردگار کے پاس اپنے اجر کے مستحق ہوں گے، اور ان کو نہ کوئی خوف ہوگا، نہ وہ کسی غم میں مبتلا ہوں گے۔ ﴿۶۲﴾

خلاصہ تفسیر

(اس مقام پر یہودیوں کی شرارت کا حال معلوم کر کے سامعین کو یا خود یہود کو یہ خیال گزر سکتا ہے کہ ان حالات میں اگر عذر پیش کر کے ایمان لانا بھی چاہیں تو غالباً وہ اللہ کے نزدیک قبول نہ ہو، اس خیال کو دفع کرنے کے لئے اس آیت میں ایک قانون اور ضابطے کا ذکر فرمایا کہ) یہ تحقیقی بات ہے کہ مسلمان، یہودی اور نصاریٰ اور فرقہ صابین (ان میں سب میں) جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ (کی ذات و صفات) پر اور قیامت پر اور کارگزاری اچھی کرے (موافق قانون شریعت کے) ایسوں کے لئے ان کا حق الخدمت بھی ہے ان کے پروردگار کے پاس (پہنچ کر) اور (وہاں جا کر) کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں ان پر، اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

فائدہ:- قانون کا حاصل ظاہر ہے کہ ہمارے دربار میں کسی کی تخصیص نہیں، جو شخص پوری اطاعت اعتقاد اور

اعمال میں اختیار کرے گا خواہ وہ پہلے سے کیسا ہی ہو، ہمارے ہاں مقبول اور اس کی خدمت مشکور ہے، اور ظاہر ہے کہ نزولِ قرآن کے بعد پوری اطاعت، اطاعتِ محمدی یعنی مسلمان ہونے میں منحصر ہے، مطلب یہ ہوا کہ جو مسلمان ہو جائے گا مستحقِ نجاتِ اخروی ہوگا، اس میں اس خیال کا جواب ہو گیا، یعنی ان شرارتوں کے بعد بھی اگر مسلمان ہو جائیں تو ہم سب معاف کر دیں گے۔

اور صابئین ایک فرقہ تھا جس کے معتقدات اور طرزِ عمل کے بارے میں چونکہ کسی کو پورا پتہ نہ چلا اس لئے مختلف اقوال ہیں، واللہ اعلم۔

اور اس قانون میں بظاہر تو مسلمانوں کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ وہ تو مسلمان ہیں ہی، لیکن اس سے کلامِ پاک میں ایک خاص بلاغت اور مضمون میں ایک خاص وقعت پیدا ہو گئی، اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی حاکم یا بادشاہ کسی ایسے ہی موقع پر یوں کہے کہ ہمارا قانون عام ہے کوئی موافق ہو یا مخالف، جو شخص بھی اطاعت کرے گا موردِ عنایت ہوگا، اب ظاہر ہے کہ موافق تو اطاعت کر ہی رہا ہے، سنا تو اصل میں مخالف کو ہے، لیکن اس میں نکتہ یہ ہوتا ہے کہ ہم کو جو موافقین پر عنایت ہے سو اس کی علت اُن سے کوئی ذاتی خصوصیت نہیں، بلکہ ان کی صفتِ موافقت پر مدار ہے ہماری عنایت کا، سو اگر مخالف بھی اختیار کرے تو وہ بھی اس موافق کے برابر ہو جائے گا، اس لئے مخالف کے ساتھ موافق کو بھی ذکر کر دیا گیا۔

وَإِذَا خَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ ط خذُوا مَا آتَيْنَكُم بِقُوَّةٍ

اور جب لیا ہم نے تم سے اقرار اور بلند کیا تمہارے اوپر کوہِ طور کو کہ پکڑو جو کتاب ہم نے تم کو دی زور سے

وَإِذْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ التَّقْوَى ۖ تَقْوَىٰ

اور یاد رکھو جو کچھ اس میں ہے تاکہ تم ڈرو۔

آسان ترجمہ قرآن

اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم سے (توراة پر عمل کرنے کا) عہد لیا تھا، اور کوہِ طور کو تمہارے اوپر اٹھا کھڑا کیا تھا (کہ) جو (کتاب) ہم نے تمہیں دی ہے اس کو مضبوطی سے تھامو، اور اس میں جو کچھ (لکھا) ہے اُس کو یاد رکھو، تاکہ تمہیں

تقویٰ حاصل ہو ﴿۶۳﴾

خلاصہ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تم سے قول و قرار لیا (کہ توراۃ پر عمل کریں گے) اور (اس قول و قرار لینے کے لئے) ہم نے طور پہاڑ کو اٹھا کر تمہارے اُوپر (محاذات میں) معلق کر دیا (اور اس وقت کہا) کہ (جلدی) قبول کرو جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے (یعنی توراۃ) مضبوطی کے ساتھ، اور یاد رکھو جو احکام اس (کتاب) میں ہیں جس سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔

فائدہ:- جب موسیٰ علیہ السلام کو طور پر تورات عطا ہوئی اور آپ نے واپس تشریف لا کر قوم کو وہ دکھائی اور سنائی تو اس میں احکام ذرا سخت تھے، مگر ان لوگوں کی حالت کے مطابق ایسے ہی احکام مناسب تھے، تو اوّل تو انہوں نے یہی کہا تھا کہ جب ہم سے اللہ تعالیٰ خود کہہ دیں گے کہ یہ میری کتاب ہے، تب مانیں گے (جس کا قصہ اُوپر گزر چکا ہے)۔ غرض وہ ستر آدمی جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر گئے تھے واپس آ کر انہوں نے گواہی دی، مگر اس شہادت میں (اپنی طرف سے) اتنی آمیزش بھی کر دی کہ ”اللہ تعالیٰ نے آخر میں یہ فرمادیا تھا کہ تم سے جس قدر عمل ہو سکے کرنا، جو نہ ہو سکے معاف ہے۔“ تو کچھ تو جبلی شرارت، کچھ احکام کی مشقت اور کچھ اس آمیزش کا حیلہ ملا، غرض صاف کہہ دیا کہ ہم سے تو اس کتاب پر عمل نہیں ہو سکتا، حق تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ کوہ طور کا ایک بڑا ٹکڑا اُٹھا کر اُن کے سروں پر معلق کر دو، کہ یا تو مانو ورنہ ابھی گرا، آخر چار ناچار ماننا پڑا۔

ایک شبہ کا ازالہ

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ دین میں تو اکراہ نہیں ہے، یہاں کیوں اکراہ کیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ اکراہ ایمان لانے پر نہیں، بلکہ اوّل اپنی خوشی سے ایمان و اسلام قبول کر لینے اور اس کے خلاف بغاوت کرنے کی وجہ سے ہے، باغیوں کی سزا تمام حکومتوں میں بھی عام مخالف اور دشمن قوموں سے الگ ہوتی ہے، اُن کے لئے ہر حکومت میں دو ہی راستے ہوتے ہیں، یا اطاعت قبول کریں، یا قتل کئے جائیں، اسی وجہ سے اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے، کفر کی سزا قتل نہیں۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ ۖ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ

پھر تم پھر گئے اس کے بعد سو اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی مہربانی

لَكُنْتُمْ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۶﴾

تو ضرور تم تباہ ہوتے۔

آسان ترجمہ قرآن

اس سب کے باوجود تم دوبارہ (راہِ راست سے) پھر گئے۔ چنانچہ اگر اللہ کا فضل اور رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم ضرور سخت نقصان اٹھانے والوں میں شامل ہو جاتے ﴿۶۶﴾

خلاصہ تفسیر

پھر تم اس قول و قرار کے بعد بھی (اس سے) پھر گئے، سو اگر تم لوگوں پر خدا تعالیٰ کا فضل اور رحم نہ ہوتا (تو اس عہد شکنی کا مقتضی تو یہ تھا کہ) ضرور تم (فوراً) تباہ (اور ہلاک) ہو جاتے، (مگر ہماری عنایت و رحمتِ عامہ ہے کہ حیاتِ مستعار کے ختم ہونے تک مہلت دے رکھی ہے، لیکن کب تک؟ آخر بعد از مرگ وبالِ اعمال میں مبتلا ہو گئے)۔

فائدہ:- حق تعالیٰ کی رحمتِ عامہ دُنیا میں مومن کافر سب پر ہے، جس کا اثر عافیت اور دُنیوی راحت ہے، رحمتِ خاصہ کا ظہور آخرت میں ہوگا، جس کا اثر نجات اور قربِ خداوندی ہے۔

بظاہر اس آیت کے جزو آخر کے مخاطب وہ یہودی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے، چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانا بھی عہد شکنی میں داخل ہے، اس لئے ان کو بھی عہد شکنوں میں شامل کر کے بطور مثال فرمایا گیا کہ اس پر بھی ہم نے تم پر دُنیا میں کوئی عذاب ایسا نازل نہیں کیا جیسا پہلے بے ایمانوں اور عہد شکنوں پر ہوتا رہا، یہ محض خدا کی رحمت ہے۔

اور چونکہ اب اُزروئے احادیث ایسے عذابوں کا نہ آنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت ہے، اس لئے بعض مفسرین نے فضل و رحمت کی تفسیر بعثتِ محمدیہ سے کی ہے۔

اس مضمون کی تائید کے لئے گزشتہ بے ایمانوں کا ایک واقعہ اگلی آیت میں بیان ہو رہا ہے:-

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اَعْتَدُوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُفُوْا

اور تم خوب جان چکے ہو جنہوں نے کہ تم میں سے زیادتی کی تھی ہفتہ کے دن میں تو ہم نے کہا ان سے کہ ہو جاؤ

قِرْدَةٌ خَسِيْنٌ ۚ فَجَعَلْنَهَا نَكَالًا لِّبَايِنٍ يَدِيْهَا وَمَا خَلْفَهَا

بندر ذلیل، پھر کیا ہم نے اس واقعے کو عبرت اُن لوگوں کے لئے جو وہاں تھے اور جو پیچھے آنے والے تھے

وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۖ

اور نصیحت ڈرنے والوں کے واسطے۔

آسان ترجمہ قرآن

اور تم اپنے ان لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہو جو سنیچر (سبت) کے معاملے میں حد سے گزر گئے تھے، چنانچہ ہم نے اُن سے کہا تھا کہ تم دُھتکارے ہوئے بندر بن جاؤ ۖ پھر ہم نے اس واقعے کو اُس زمانے کے اور اُس کے بعد کے لوگوں کے لئے عبرت، اور ڈرنے والوں کے لئے نصیحت کا سامان بنادیا ۖ

خلاصہ تفسیر

اور تم جانتے ہی ہو اُن لوگوں کا حال جنہوں نے تم میں سے (حدِ شرع سے) تجاوز کیا تھا دربارہ (اس حکم کے جو) ہفتہ کے دن کے (متعلق تھا کہ اس روز مچھلی کا شکار نہ کریں) سو ہم نے اُن کو (اپنے حکمِ قہری تکوینی سے مسخ کرنے کے لئے) کہہ دیا کہ تم بندر ذلیل بن جاؤ (چنانچہ وہ بندروں کے قالب میں مسخ ہو گئے) پھر ہم نے اس کو ایک (واقعہ) عبرت (انگیز) بنادیا، اُن لوگوں کے لئے بھی جو اس قوم کے معاصر تھے، اور اُن لوگوں کے لئے بھی جو مابعد کے زمانے میں آتے رہے، اور (نیز اس واقعے کو) موجب نصیحت (بنایا، خدا سے) ڈرنے والوں کے لئے۔

فائدہ:- یہ واقعہ بھی بنی اسرائیل کا حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں ہوا، بنی اسرائیل کے لئے ہفتہ کا دن معظم اور عبادت کے لئے مقرر تھا، اور مچھلی کا شکار بھی اس روز ممنوع تھا، یہ لوگ سمندر کے کنارے آباد تھے، اور مچھلی کے شوقین تھے، اُس حکم کو نہ مانا، اور شکار کیا، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسخ صورت کا عذاب نازل ہوا، تین دن کے بعد وہ سب مر گئے۔

اس واقعہ کو دیکھنے اور سننے والے دو قسم کے لوگ تھے، فرمانبردار و نافرمان، تو نافرمانوں کے لئے تو یہ واقعہ

نافرمانی سے توبہ کرانے والا تھا، اس لئے اس کو ”نَکَال“ فرمایا، اور فرمانبرداروں کو یہ واقعہ فرمانبرداری پر قائم رکھنے والا تھا اس کو ”مَوْعِظَةٌ“ فرمایا۔

معارف مسائل

دینی معاملات میں کوئی ایسا حیلہ جس سے اصل حکم شرعی باطل ہو جائے حرام ہے

اس آیت میں یہودیوں کے جس اعتداء یعنی حدود سے تجاوز کا ذکر کر کے اس کو سبب عذاب بتلایا گیا ہے، روایات سے ثابت ہے کہ وہ صاف طور پر حکم شرعی کی خلاف ورزی نہ تھی، بلکہ ایسے حیلے تھے جن سے حکم شرعی کا ابطال لازم آتا تھا، مثلاً ہفتہ کے دن مچھلی کی دُم میں ایک ڈور کا پھندا لگا کر دریا میں چھوڑ دیا، اور یہ ڈور زمین پر کسی چیز سے باندھ دی، پھر اتوار کے روز اس کو پکڑ کر کھالیا، تو یہ ایک ایسا حیلہ ہے جس میں حکم شرعی کا ابطال بلکہ ایک قسم کا استہزاء ہے، اس لئے ایسا حیلہ کرنے والوں کو بڑا سرکش، نافرمان قرار دے کر اُن پر عذاب آیا۔

مگر اس سے اُن فقہی حیلوں کی حرمت ثابت نہیں ہوتی جن میں سے بعض خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائے ہیں، مثلاً ایک سیر عمدہ کھجور کے بدلے میں دو سیر خراب کھجور خریدنا سود میں داخل ہے، مگر اس سے بچنے کا ایک حیلہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتلایا کہ جنس کا تبادلہ جنس سے نہ کرو، قیمت کے ذریعہ خرید و فروخت کر لو، مثلاً دو سیر خراب کھجوریں دو درہم میں فروخت کر دیں، پھر ان دو درہموں میں سے ایک سیر عمدہ کھجور خرید لی، تو یہاں حکم شرعی کی تعمیل مقصود ہے ابطال نہ مقصود ہے نہ واقع ہے۔ اسی طرح بعض دوسرے مسائل میں بھی فقہاء نے حرام سے بچنے کی بعض ایسی ہی تدبیریں بتلائی ہیں، اُن کو یہودیوں کے حیلوں کی طرح کہنا اور سمجھنا غلط ہے۔

واقعہ مسخ صورتِ یہود

تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہود نے اوّل اوّل تو اس طرح کے حیلے کر کے مچھلیاں پکڑیں، پھر ہوتے ہوتے عام طور پر شکار کھیلنے لگے، تو ان میں دو جماعتیں ہو گئیں، ایک جماعت علماء و صلحاء کی تھی، جنہوں نے ان کو ایسا کرنے سے روکا، یہ باز نہ آئے تو اُن سے برادرانہ تعلقات قطع کر کے بالکل الگ ہو گئے، اور بستی کے دو حصے کر لئے، ایک میں یہ نافرمان لوگ رہ گئے، دوسرے میں علماء و صلحاء رہے، ایک روز اُن کو یہ محسوس ہوا کہ جس حصہ میں یہ نافرمان لوگ رہتے تھے اُدھر بالکل سناٹا ہے، تو وہاں جا کر دیکھا تو سب کے سب بندروں کی صورت میں مسخ ہو گئے تھے، اور حضرت قتادہؓ نے فرمایا کہ اُن کے جو ان

بندر بنادیئے گئے تھے اور بوڑھے خنزیر کی شکل میں منتقل کر دیئے گئے تھے، اور مسخ شدہ بندر اپنے رشتہ دار اور تعلق والے انسانوں کو پہچانتے تھے، اُن کے قریب آ کر روتے تھے۔

ممسوخ قوم کی نسل نہیں چلتی

اس معاملہ میں صحیح بات وہ ہے جو خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بروایت عبداللہ بن مسعود صحیح مسلم میں منقول ہے کہ بعض لوگوں نے اپنے زمانے کے بندروں اور خنزیروں کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا یہ وہی مسخ شدہ یہودی ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم میں مسخ صورت کا عذاب نازل کرتے ہیں تو اُن کی نسل نہیں چلتی (بلکہ چند روز میں ہلاک ہو کر ختم ہو جاتے ہیں)، اور پھر فرمایا کہ بندر اور خنزیر دُنیا میں پہلے سے بھی موجود تھے، (اور آج بھی موجود ہیں، مگر مسخ شدہ بندروں اور خنزیروں سے اُن کا کوئی جوڑ نہیں)۔

اس موقع پر بعض مفسرین نے صحیح بخاری کے حوالہ سے بندروں میں زنا کی سزا میں سنگساری کرنے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، مگر یہ واقعہ نہ بخاری کے صحیح نسخوں میں موجود ہے، نہ روایت صحیح ہے، قرطبی نے اس جگہ اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً ۖ قَالُوا

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے: اللہ فرماتا ہے تم کو، ذبح کرو ایک گائے، وہ بولے:

أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۖ قَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝۶۷

کیا تو ہم سے ہنسی کرتا ہے؟ کہا: پناہ خدا کی کہ ہوں میں جاہلوں میں۔

آسان ترجمہ قرآن

اور (وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔ وہ کہنے لگے کہ کیا آپ ہمارا مذاق بناتے ہیں؟ موسیٰ نے کہا: میں اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں (ایسے) نادانوں میں شامل ہوں (جو مذاق میں جھوٹ بولیں) ۝۶۷

۱ تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۳۳۰

۲ صحیح مسلم، کتاب القدر، باب بیان ان الآجال والأزاق... إلخ ج: ۲ ص: ۳۳۸

خلاصہ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ حق تعالیٰ تم کو حکم دیتے ہیں کہ (اگر اس لاش کے قاتل کا پتہ لگانا چاہتے ہو تو) تم ایک بیل ذبح کرو، وہ کہنے لگے کہ آیا آپ ہم کو مسخرہ بناتے ہیں (کہاں قاتل کی تحقیق، کہاں جانور کا ذبح کرنا) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا: نعوذ باللہ، جو میں ایسی جہالت والوں کا سا کام کروں (کہ احکام خداوندی میں تمسخر کرنے لگوں)۔

فائدہ:- یہ قصہ اس طرح ہوا کہ بنی اسرائیل میں ایک خون ہو گیا تھا، جس کی وجہ ”مرقاۃ شرح مشکوٰۃ“ میں یہ لکھی ہے کہ کسی شخص نے مقتول کی کسی لڑکی سے شادی کی درخواست کی تھی، مگر اس نے انکار کر دیا، اور اس شخص نے اس کو قتل کر دیا، قاتل لاپتہ تھا، اس کا پتہ نہ لگتا تھا۔

اور معاملہ نے کلبی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس وقت تک توریت میں اس کے متعلق کوئی شرعی قانون بھی نازل نہیں ہوا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ نزولِ توریت سے قبل کا ہے۔

غرض بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہم چاہتے ہیں کہ قاتل کا پتہ چلے، آپ نے بحکم خداوندی ایک بیل ذبح کرنے کا حکم فرمایا، انہوں نے حسبِ عادت اور اپنی جبلت کے مطابق اس میں جھتیں نکالنا شروع کیں۔ آیاتِ آئندہ میں اسی کی تفصیل ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ ۖ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ

بولے کہ دعا کر ہمارے واسطے اپنے رب سے کہ بتادے ہم کو کہ وہ گائے کیسی ہو؟ کہا: وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے

لَا فَارِضٌ وَلَا بَكْرٌ ۖ عَوَانٌ بَيْنَ ذَلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿۲۸﴾ قَالُوا

نہ بوڑھی اور نہ بن بیاہی درمیان میں ہے بڑھاپے اور جوانی کے، اب کر ڈالو جو تم کو حکم ملا ہے۔ بولے کہ

ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْثُهَا ۖ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ

دعا کر ہمارے واسطے اپنے رب سے کہ بتادے ہم کو کہ کیسا ہے اس کا رنگ؟ کہا: وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے زرد

فَاقِعٌ لَّوْنَهَا تَسْرُ النَّظِيرِينَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا

خوب گہری ہے اس کی زردی، خوش آتی ہے دیکھنے والوں کو۔ بولے کہ دُعا کر ہمارے واسطے اپنے رب سے کہ بتادے ہم کو

مَا هِيَ ۚ إِنَّ الْبَقَرَ تَشْبَهُ عَلَيْنَا ۖ وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾ قَالَ

کس قسم میں ہے وہ کیونکہ اس گائے میں شبہ پڑا ہے ہم کو اور ہم اگر اللہ نے چاہا تو ضرور راہ پالیں گے۔ کہا:

إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ ۖ لَا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ

وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے محنت کرنے والی نہیں کہ جوتی ہو زمین کو یا پانی دیتی ہو کھیتی کو،

مُسَلَّةٌ لَا شَيْءَ فِيهَا ۚ قَالُوا النَّجِيُّ بِالْحَقِّ ۖ فَذَبَحُوهَا

بے عیب ہے کوئی داغ اس میں نہیں، بولے: اب لایا تو ٹھیک بات، پھر اس کو ذبح کیا،

وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾

وہ لگتے نہ تھے کہ ایسا کر لیں گے۔

آسان ترجمہ قرآن

انہوں نے کہا کہ آپ ہماری خاطر اپنے رب سے درخواست کیجئے کہ ہمیں صاف صاف بتائے کہ وہ گائے کیسی ہو؟ اس نے کہا: ”اللہ فرماتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہو کہ نہ بہت بوڑھی ہو نہ بالکل بچی، (بلکہ) ان دونوں کے بیچ بیچ میں ہو۔ بس اب جو حکم تمہیں دیا گیا ہے اس پر عمل کرلو“ ﴿٦٩﴾ کہنے لگے: آپ ہماری خاطر اپنے رب سے درخواست کیجئے کہ ہمیں صاف صاف بتائے کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ موسیٰ نے کہا: ”اللہ فرماتا ہے کہ وہ ایسے تیز زرد رنگ کی گائے ہو جو دیکھنے والوں کا دل خوش کر دے“ ﴿٧٠﴾ انہوں نے (پھر) کہا کہ آپ ہماری خاطر اپنے رب سے درخواست کیجئے کہ ہمیں صاف صاف بتائے کہ وہ گائے کیسی ہو؟ اس گائے نے تو ہمیں شبہ میں ڈال دیا ہے۔ اور اللہ نے چاہا تو ہم ضرور اس کا پتہ لگالیں گے ﴿٧١﴾ موسیٰ نے کہا: اللہ فرماتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہو جو کام میں جت کر زمین میں ہل نہ چلاتی ہو، اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہو، پوری

طرح صحیح سالم ہو جس میں کوئی داغ نہ ہو۔ انہوں نے کہا: ہاں! اب آپ ٹھیک ٹھیک پتہ لے کر آئے۔ اس کے بعد انہوں نے اُسے ذبح کیا، جبکہ لگتا نہیں تھا کہ وہ کرپائیں گے ④

خلاصہ تفسیر

وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ درخواست کیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے ہم سے بیان کر دیں کہ اس (بیل) کے کیا اوصاف ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ وہ (میری درخواست کے جواب میں) یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسا بیل ہو کہ نہ بوڑھا ہو نہ بہت بچہ ہو (بلکہ) پٹھا ہو، دونوں عمروں کے اوسط میں، سو اب (زیادہ حجت مت کی جیو، بلکہ) کرڈالو جو کچھ تم کو حکم ملا ہے۔ کہنے لگے کہ (اچھا یہ بھی) درخواست کر دیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے ہم سے یہ (بھی) بیان کر دیں کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ آپ نے فرمایا کہ (اس کے متعلق) حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زرد رنگ کا بیل ہو جس کا رنگ تیز زرد ہو کہ ناظرین کو فرخت بخش ہو۔ کہنے لگے کہ (اب کی بار اور) ہماری خاطر اپنے رب سے دریافت کر دیجئے کہ (اول بار کے سوال کا جواب ذرا اور واضح) ہم سے بیان کر دیں کہ اس کے اوصاف کیا کیا ہوں؟ کیونکہ ہم کو اس بیل میں (قدرے) اشتباہ (یہ باقی) ہے (کہ وہ معمولی بیل ہو گا یا کوئی اور عجیب و غریب جس میں تحقیق قاتل کا خاص اثر ہو) اور ہم ضرور ان شاء اللہ تعالیٰ (اب کی بار) ٹھیک سمجھ جاویں گے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ وہ (کوئی عجیب و غریب جانور نہیں ہے، یہی معمولی بیل ہے، البتہ عمدہ ہونا چاہئے کہ اوصاف مذکورہ کے ساتھ) نہ تو ہل میں چلا ہوا ہو، جس سے زمین جوتی جاوے، اور نہ (کنویں میں جوڑا گیا ہو کہ) اُس سے زراعت کی آبپاشی کی جاوے، (غرض ہر قسم کے عیب سے) سالم ہو اور اس میں (کسی طرح کا) کوئی داغ نہ ہو، (یہ سن کر) کہنے لگے کہ (ہاں) اب آپ نے پوری (اور صاف) بات فرمائی، (القصد جانور تلاش کر کے خریدا) پھر اس کو ذبح کر دیا، حالانکہ بظاہر کرتے ہوئے معلوم نہ ہوتے تھے۔

فائدہ:- حدیث شریف میں ہے کہ اگر وہ یہ جتیں نہ کرتے تو اتنی قیدیں اُن کے ذمہ نہ ہوتیں، جو بھی بقرہ ذبح کر دیا جاتا کافی ہو جاتا۔

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّارَأْتُمْ فِيهَا وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ⑤

اور جب مار ڈالا تھا تم نے ایک شخص کو پھر لگے ایک دوسرے پر دھرنے اور اللہ کو ظاہر کرنا تھا جو تم چھپاتے تھے۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بَعْضَهَا كَذَلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ

پھر ہم نے کہا: مارو اس مردے پر اس گائے کا ایک ٹکڑا، اسی طرح زندہ کرے گا اللہ مردوں کو اور دکھاتا ہے تم کو اپنی قدرت کے نمونے

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۷۳﴾

تاکہ تم غور کرو۔

آسان ترجمہ قرآن

اور (یاد کرو) جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا، اور اُس کے بعد اُس کا الزام ایک دوسرے پر ڈال رہے تھے، اور اللہ کو وہ راز نکال باہر کرنا تھا جو تم چھپائے ہوئے تھے ﴿۷۳﴾ چنانچہ ہم نے کہا کہ اس (مقتول) کو اس (گائے) کے ایک حصے سے مارو۔ اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے، اور تمہیں (اپنی قدرت کی) نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھ سکو ﴿۷۳﴾

خلاصہ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں (میں سے کسی) نے ایک آدمی کا خون کر دیا، پھر (اپنی براءت کے لئے) ایک دوسرے پر ڈالنے لگے، اور اللہ تعالیٰ کو اس امر کا ظاہر کرنا منظور تھا جس کو تم (میں کے مجرم و مشتبہ لوگ) مخفی رکھنا چاہتے تھے، اس لئے (ذبح بقرہ کے بعد) ہم نے حکم دیا کہ اس (مقتول کی لاش) کو اس (بقرہ) کے کوئی سے ٹکڑے سے چھو دو (چنانچہ چھوانے سے وہ زندہ ہو گیا، آگے اللہ تعالیٰ بمقابلہ منکرین قیامت کے اس قصے سے استدلال اور نظیر کے طور پر فرماتے ہیں کہ) اسی طرح حق تعالیٰ (قیامت میں) مردوں کو زندہ کر دیں گے، اور اللہ تعالیٰ اپنے نظائر (قدرت) تم کو دکھلاتے ہیں اس توقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو (اور ایک نظیر سے دوسری نظیر کے انکار سے باز آؤ)۔

فائدہ:- جب اس مردہ کے ساتھ یہ معاملہ کیا گیا تو وہ زندہ ہو گیا، اس نے قاتل کا نام بتایا اور پھر فوراً ہی مر گیا۔

اس جگہ صرف مقتول کا بیان اس لئے کافی سمجھا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ مقتول سچ بولے گا، ورنہ صرف مقتول کے بیان سے بغیر شرعی شہادت کے کسی پر قتل کا ثبوت کافی نہیں ہوتا۔

یہاں یہ شبہ کرنا بھی درست نہیں کہ حق تعالیٰ کو تو مردہ زندہ کرنے کی ویسی ہی قدرت تھی، یا مقتول کو زندہ کئے بغیر قاتل کا نام بتایا جاسکتا تھا، پھر اس سامان کی کیا ضرورت تھی، تو بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا کوئی فعل ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے تو ہوتا نہیں، بلکہ مصلحت اور حکمت کے لئے ہوتا ہے، اور ہر واقعہ کی حکمت اللہ تعالیٰ ہی کے احاطہ علمی میں آسکتی ہے، نہ ہم اس کے مکلف ہیں کہ ہر واقعہ کی مصلحت معلوم کریں اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر واقعہ کی حکمت ہماری سمجھ میں آجائے، اس لئے اس کے پیچھے پڑ کر اپنی عمر عزیز ضائع کرنے کے بجائے بہتر طریقہ تسلیم و سکوت کا ہے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ط

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس سب کے بعد سو وہ ہو گئے جیسے پتھر یا ان سے بھی سخت،

وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ ط وَإِنَّ مِنْهَا لَمَاءٌ يَشَّقُّ

اور پتھروں میں تو ایسے بھی ہیں جن سے جاری ہوتی ہیں نہریں، اور ان میں ایسے بھی ہیں جو پھٹ جاتے ہیں

فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ ط وَإِنَّ مِنْهَا لَمَاءٌ يَمْهِيطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ ط

اور نکلتا ہے ان سے پانی، اور ان میں ایسے بھی ہیں جو گر پڑتے ہیں اللہ کے ڈر سے،

وَمَا لِلَّهِ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۷۴﴾

اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے۔

آسان ترجمہ قرآن

اس سب کے بعد تمہارے دل پھر سخت ہو گئے، یہاں تک کہ وہ ایسے ہو گئے جیسے پتھر! بلکہ سختی میں کچھ ان سے بھی زیادہ۔ (کیونکہ) پتھروں میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے نہریں پھوٹ بہتی ہیں، اور انہی میں سے کچھ وہ ہوتے ہیں جو خود پھٹ پڑتے ہیں اور ان سے پانی نکل آتا ہے، اور انہی میں وہ (پتھر) بھی ہیں جو اللہ کے خوف سے لڑھک جاتے ہیں۔ اور (اس کے برخلاف) جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے ﴿۷۴﴾

خلاصہ تفسیر

(گزشتہ واقعات سے متاثر نہ ہونے پر شکایت کے طور پر ارشاد ہوتا ہے) ایسے ایسے واقعات کے بعد (چاہئے تھا کہ تم لوگوں کے دل بالکل نرم اور حق تعالیٰ کی عظمت سے پُر ہو جاتے، لیکن) تمہارے دل پھر بھی سخت ہی رہے تو (یوں کہنا چاہئے کہ) ان کی مثال پتھر کی سی ہے، یا (یوں کہئے کہ وہ) سختی میں اُن سے (بھی) زیادہ (ہیں)، اور (زیادہ سخت اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ) بعض پتھر تو ایسے ہیں جن سے (بڑی بڑی) نہریں پھوٹ کر چلتی ہیں، اور انہی پتھروں میں بعض ایسے ہیں کہ جوشق ہو جاتے ہیں، پھر اُن سے (اگر زیادہ نہیں تو تھوڑا ہی) پانی نکل آتا ہے، اور انہی پتھروں میں بعض ایسے ہیں جو خدا تعالیٰ کے خوف سے اُوپر سے نیچے لڑھک آتے ہیں، (اور تمہارے قلوب میں کسی قسم کا اثر ہی نہیں ہوتا) اور (اس قسوت سے جو اعمال صادر ہوتے ہیں) حق تعالیٰ تمہارے (ان) اعمال سے بے خبر نہیں ہیں (بہت جلد تم کو سزا تک پہنچا دیں گے)۔

فائدہ:- اس جگہ پتھر کے تین اثرات بیان کئے گئے ہیں، اول ان سے زیادہ پانی نکلتا، دوم کم پانی نکلتا، ان دو میں تو کسی کو شبہ نہیں پڑتا، تیسری صورت یعنی خدا کے خوف سے پتھر کا نیچے آگرنے، اس میں ممکن ہے کسی کو شبہ ہو، کیونکہ پتھر کو تو عقل اور حس نہیں ہے، سو یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ خوف کے لئے عقل کی تو ضرورت نہیں، کیونکہ حیوانات لایعقل میں خوف کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، البتہ حس کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن جمادات میں اتنی حس بھی نہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں، کیونکہ حس حیات پر موقوف ہے، اور بہت ممکن ہے کہ ان میں ایسی لطیف حیات ہو جس کا ہم کو ادراک نہ ہوتا ہو، جیسا جو ہر دماغ کے احساس کا بہت سے عقلاء کو ادراک نہیں ہوتا، وہ محض دلائل سے اس کے قائل ہوتے ہیں، تو دلائل طبعیہ سے ظاہر نص قرآن کی دلالت اور قوت کسی طرح بھی کم نہیں۔

پھر ہمارا یہ دعویٰ بھی نہیں کہ ہمیشہ پتھر گرنے کی علت خوف ہی ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ بعض پتھر اس وجہ سے گر جاتے ہیں، سو بہت ممکن ہے کہ گرنے کے اسباب مختلف ہوں، ان میں سے بعض طبعی ہوں اور ایک سبب خوف خدا بھی ہو۔

اس مقام پر تین قسم کے پتھروں کے ذکر میں ترتیب نہایت لطیف اور افادہ مقصود نہایت بلیغ انداز میں کیا گیا ہے، یعنی بعض پتھروں میں تاثر اتنا قوی ہے جس سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں، جن سے مخلوق خدا فائدہ اٹھاتی ہے، اور ان (یہودیوں) کے دل ایسے بھی نہیں (کہ مخلوق خدا کی تکلیف و مصیبت میں پگھل جائیں) اور بعض پتھروں میں ان سے کم تاثر ہوتا ہے جس سے کم نفع پہنچتا ہے، تو یہ پتھر بہ نسبت اول کے کم نرم ہوئے، اور ان کے قلوب ان دو (درجہ دوم کے)

پتھروں سے بھی سخت ہیں۔

اور بعض پتھروں میں گواس درجے کا اثر نہیں، مگر پھر بھی ایک اثر تو ہے (کہ خوفِ خدا سے نیچے گراتے ہیں) گو درجے میں پہلی قسموں سے یہ ضعیف تر ہیں، مگر ان کے قلوب میں تو کم درجہ اور ضعیف ترین درجہ انفعال بھی نہیں۔

اَفَتَطْعَمُونَ اَنْ يُّؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلِمَ اللّٰهِ

اب کیا تم اے مسلمانو! توقع رکھتے ہو کہ وہ مانیں تمہاری بات اور ان میں ایک فرقہ تھا کہ سنتا تھا اللہ کا کلام

ثُمَّ يَحْرِفُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

پھر بدل ڈالتے تھے اس کو جان بوجھ کر اور وہ جانتے تھے۔

آسان ترجمہ قرآن

(مسلمانو!) کیا اب بھی تمہیں یہ لالچ ہے کہ یہ لوگ تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے؟ حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کے لوگ اللہ کا کلام سنتے تھے، پھر اس کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد بھی جانتے بوجھتے اس میں تحریف کر ڈالتے تھے ﴿۷۵﴾

خلاصہ تفسیر

(مسلمان، یہودیوں کو مومن بنانے کی جو کوشش کر رہے تھے اور اس میں کلفت اٹھاتے تھے تو یہود کے حالات و واقعات بتا اور سنا کر مسلمانوں کی اُمید کا انقطاع کر کے اُن کی کلفت اس آیت کے ذریعے دفع فرماتے ہیں)

(اے مسلمانو!) کیا (یہ سارے قصے سن کر) اب بھی تم توقع رکھتے ہو کہ یہ (یہودی) تمہارے کہنے سے ایمان لے آویں گے، حالانکہ (ان سب مذکورہ قصوں سے بڑھ کر ایک اور بات بھی اُن سے ہو چکی ہے کہ) ان میں کچھ لوگ ایسے گزرے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے اور پھر اس کو کچھ کا کچھ کر ڈالتے تھے (اور) اس کو سمجھنے کے بعد (ایسا کرتے) اور (لطف یہ کہ یہ بھی) جانتے تھے (کہ ہم برا کر رہے ہیں، محض اغراضِ نفسانیہ اس کارروائی کا باعث ہوتیں)۔

فائدہ:- مطلب یہ کہ جو لوگ ایسے بیباک اور اغراضِ نفسانی کے اسیر ہوں وہ کسی کے کہنے سننے سے کب باز آنے والے اور کسی کی کب سننے والے ہیں۔

اور ”کلام اللہ“ سے مراد یا تو توریت ہے، اور ”سمع“ سے مراد بواسطہ انبیاء علیہم السلام کے ہے، اور ”تحریف“

سے مراد اس کے بعض کلمات یا تفاسیر یا دونوں بدل ڈالنا ہیں، اور یا ”کلام“ سے مراد وہ کلام ہے جو اُن ستر آدمیوں نے بطور تصدیق موسیٰ علیہ السلام کو ہر طور پر سنا تھا، اور ”سماع“ سے مراد بلا واسطہ، اور ”تحریف“ سے مراد قوم سے یہ نقل کر دینا کہ ”آخر میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمادیا تھا کہ جو حکم تم سے ادا نہ ہو سکے وہ معاف ہے۔“

اُمور مذکورہ بالا میں سے کسی امر کا صدور گواہان یہودیوں سے نہ ہوا ہو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے، لیکن چونکہ یہ لوگ بھی اپنے اسلاف کے اُن اعمال پر انکار و نفرت نہ رکھتے تھے، اس لئے حکمائے بھی ویسے ہی ہوئے۔

وَإِذْ يَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بِعَضُومِهِمْ إِلَىٰ بَعْضٍ

اور جب ملتے ہیں مسلمانوں سے کہتے ہیں: ہم مسلمان ہوئے، اور جب تنہا ہوتے ہیں ایک دوسرے کے پاس

قَالُوا اتَّحَدَّثُوا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا آمَنَّا بِاللَّهِ عَلَىٰ كَمَا جُوعُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ ط

تو کہتے ہیں: تم کیوں کہہ دیتے ہو اُن سے جو ظاہر کیا اللہ نے تم پر تاکہ جھٹلائیں تم کو اس سے تمہارے رب کے آگے،

أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٤٦﴾

کیا تم نہیں سمجھتے؟

آسان ترجمہ قرآن

اور جب یہ لوگ ان (مسلمانوں) سے ملتے ہیں جو پہلے ایمان لا چکے ہیں تو (زبان سے) کہہ دیتے ہیں کہ ہم (بھی) ایمان لے آئے ہیں، اور جب یہ ایک دوسرے کے ساتھ تنہائی میں جاتے ہیں تو (آپس میں ایک دوسرے سے) کہتے ہیں کہ: ”کیا تم ان (مسلمانوں) کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر کھولی ہیں تاکہ یہ (مسلمان) تمہارے پروردگار کے پاس جا کر انہیں تمہارے خلاف دلیل کے طور پر پیش کریں؟ کیا تمہیں اتنی بھی عقل نہیں؟“ ﴿٤٦﴾

خلاصہ تفسیر

اور جب ملتے ہیں (منافقین یہود) مسلمانوں سے تو (ان سے تو) کہتے ہیں کہ ہم (بھی) بھی ایمان لے آئے

ہیں اور جب تنہائی میں جاتے ہیں یہ بعضے (منافق یہودی) دوسرے بعضے (علانیہ یہودیوں کے پاس) تو ان سے اُن کی معیت وہم مشربی کے مدعی ہوتے ہیں، اس وقت وہ (دوسرے یہودی) اُن سے کہتے ہیں کہ تم (یہ) کیا (غضب کرتے ہو کہ) مسلمانوں کو (خوشامد میں) وہ باتیں بتلا دیتے ہو جو (اُن کے مفید مذہب) اللہ تعالیٰ نے (توریت میں) تم پر منکشف کر دی ہیں (مگر ہم بہ مصلحت پوشیدہ رکھتے ہیں) نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ تم کو حجت میں مغلوب کر دیں گے کہ (دیکھو) یہ مضمون اللہ کے پاس (سے تمہاری کتاب میں آیا) ہے، کیا تم (اتنی موٹی سی بات) نہیں سمجھتے۔

فائدہ:- منافقین کبھی ایک آدھ بات خوشامد میں اپنے ایمان کی سچائی جتانے کے لئے مسلمانوں سے کہہ دیتے تھے کہ توریت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارت آئی ہے، یا قرآن مجید کے متعلق خبر آئی ہے، وغیرہ وغیرہ، اس پر دوسرے لوگ اُن کو ملامت کرتے تھے۔

أَوْ لَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿۷۹﴾ وَمِنْهُمْ أُمِّيُونَ

کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ اور بعض ان میں بے پڑھے ہیں

لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيٍّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿۸۰﴾ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ

کہ خبر نہیں رکھتے کتاب کی سوائے جھوٹی آرزوؤں کے اور اُن کے پاس کچھ نہیں مگر خیالات۔ سو خرابی ہے اُن کو جو

يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ۖ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ

لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھ سے، پھر کہہ دیتے ہیں: یہ خدا کی طرف سے ہے

لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ

تاکہ لیویں اس پر تھوڑا سا مال، سو خرابی ہے اُن کو اپنے ہاتھوں کے لکھے سے اور خرابی ہے

لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ ﴿۸۱﴾

اُن کو اپنی اس کمائی سے۔

آسان ترجمہ قرآن

کیا یہ لوگ (جو ایسی باتیں کرتے ہیں) یہ نہیں جانتے کہ اللہ کو اُن ساری باتوں کا خوب علم ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں؟ ۷۹ اور ان میں سے کچھ لوگ اُن پڑھ ہیں جو کتاب (توراة) کا علم تو رکھتے نہیں، البتہ کچھ آرزوئیں پکائے بیٹھے ہیں، اور اُن کا کام بس یہ ہے کہ وہم و گمان باندھتے رہتے ہیں ۸۰ لہذا بتایا ہی ہے اُن لوگوں کی جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر (لوگوں سے) کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، تاکہ اس کے ذریعے تھوڑی سی آمدنی کمالیں۔ پس بتایا ہی ہے ان لوگوں پر اُس تحریر کی وجہ سے بھی جو ان کے ہاتھوں نے لکھی، اور بتایا ہی ہے اُن پر اُس آمدنی کی وجہ سے بھی جو وہ کماتے ہیں ۸۱

خلاصہ تفسیر

کیا ان کو علم نہیں ہے کہ حق تعالیٰ کو سب خبر ہے اُن چیزوں کی بھی جن کو وہ مخفی رکھتے ہیں اور ان کی بھی جن کا وہ اظہار کرتے ہیں (تو اگر منافقین نے مؤمنین سے اپنا کفر چھپایا تو کیا، اور ان ملامت گروں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت وغیرہ کے مضامین چھپائے تو کیا، اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں مضامین سے مسلمانوں کو جا بجا مطلع فرمادیا ہے)۔

اس آیت میں تو یہودیوں کے خواندہ لوگوں کا ذکر تھا، آگے اُن کے ناخواندہ لوگوں کا ذکر اس طرح فرماتے ہیں کہ:- اور ان (یہودیوں) میں بہت سے ناخواندہ (بھی) ہیں جو کتابی علم نہیں رکھتے، لیکن (بلا سند) دل خوش کن باتیں (بہت یاد ہیں) اور وہ لوگ کچھ اور نہیں (ویسے ہی بے بنیاد) خیالات پکالیتے ہیں (اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ تو ان کے علماء کی تعلیم ناقص اور مخلوط ہے، اور پھر اوپر سے اُن میں فہم کی کمی ہے، ایسی صورت میں بجز بے بنیاد خیالات کے حقائق واقعیہ کی تحقیق کہاں نصیب ہو سکتی ہے، بقول شخصے ”کر یلا اور نیم چڑھا“ اس میں مٹھاس کہاں۔

اور چونکہ ان کی اس توہم پرستی میں ان کے علماء کی خیانت بڑا سبب ہے، اس لئے جرم میں بھی وہ اپنے عوام سے زیادہ ہوئے، اسی کا بیان اب یہاں کرتے ہیں:-

(جب عوام مذکورین قابلِ زجر و توبیخ ہیں اور ان کے جہل کا اصلی سبب اُن کے علماء ہی ہیں) تو بڑی خرابی اُن کی ہوگی جو لکھتے ہیں (بدلِ سدل کر) کتاب (توریت) کو اپنے ہاتھوں سے (اور) پھر (عوام سے) کہہ دیتے ہیں کہ یہ (حکم) خدا کی طرف سے (یوں ہی آیا) ہے، (اور) غرض (صرف) یہ ہوتی ہے کہ اس ذریعے سے کچھ نقدِ قدرے قلیل وصول

کر لیں، سو بڑی خرابی (پیش) آوے گی ان کی اس (تحریف کتاب) کی بدولت (بھی) جس کو ان کے ہاتھوں نے لکھا تھا اور بڑی خرابی ہوگی ان کو اس (نقد) کی بدولت (بھی) جس کو وہ وصول کر لیا کرتے تھے۔

فائدہ:- عوام کی رضا جوئی کے لئے غلط سلط مسئلے بتلا دینے سے ان کو کچھ نقد وغیرہ بھی وصول ہو جاتا تھا، اور ان کی نظر میں وقعت اور وقار بھی رہتا تھا، اسی غرض سے توریت میں لفظی اور معنوی پھیر پھار بھی کرتے رہتے تھے، اس آیت میں اسی پر وعید سنائی گئی۔

وَقَالُوا لَنْ تَسْنَأَ النَّاسُ إِلَّا آيَامًا مَّعْدُودَةً ۖ قُلْ أَتَّخِذُكُمْ عِنْدَ اللَّهِ

اور کہتے ہیں: ہم کو ہرگز آگ نہ لگے گی مگر چند روز گنے چنے، کہہ دو: کیا تم لے چکے ہو اللہ کے یہاں سے

عَهْدًا أَفَلَنْ يُخْلَفَ اللَّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۸۰﴾

قرار کہ اب ہرگز خلاف نہ کرے گا اللہ اپنے قرار کے یا جوڑتے ہو اللہ پر جو تم نہیں جانتے۔

آسان ترجمہ قرآن

اور یہودیوں نے کہا ہے کہ ہمیں گنتی کے چند دنوں کے علاوہ آگ ہرگز نہیں چھوئے گی۔ آپ ان سے کہئے کہ کیا تم نے اللہ کی طرف سے کوئی عہد لے رکھا ہے جس کی بنا پر وہ اپنے عہد کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا، یا تم اللہ کے ذمے وہ بات لگا رہے ہو جس کا تمہیں کچھ پتہ نہیں؟ ﴿۸۰﴾

خلاصہ تفسیر

اور یہودیوں نے (یہ بھی) کہا کہ ہرگز ہم کو آتش (دوزخ) چھوئے گی (بھی تو) نہیں، (ہاں) مگر (بہت) تھوڑے روز جو (انگلیوں پر) شمار کر لئے جاسکیں (اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (ان سے) یوں فرما دیجئے: کیا تم لوگوں نے حق تعالیٰ سے (اس کے متعلق) کوئی معاہدہ لے لیا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ اپنے معاہدہ کے خلاف نہ کریں گے، یا (معاہدہ نہیں لیا، بلکہ ویسے ہی) اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لگا رہے ہو جس کی کوئی علمی سند اپنے پاس نہیں رکھتے۔

فائدہ:- یہود کے اس قول کی مفسرین نے مختلف تقریریں کی ہیں، من جملہ اس کے یہ ہے کہ یہ امر محقق ہے کہ مؤمن اگر عاصی ہو تو گو بقدر گناہ دوزخ کے عذاب میں داخل ہو، لیکن ایمان کی وجہ سے دائمی عذاب جہنم نہ ہوگا، بعد چندے نجات ہو جائے گی۔

پس یہود کے دعوے کا حاصل یہ تھا کہ چونکہ ان کے بزعم دین موسوی منسوخ نہیں ہے، لہذا وہ مؤمن ہیں، انکار نبوت حضرت عیسیٰ علیہ السلام و جناب حضور مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کافر نہیں ہوئے، پس اگر کسی عصیان کے سبب دوزخ میں چلے بھی گئے، پھر نکال لئے جائیں گے، اور چونکہ یہ دعویٰ بناء الفاسد علی الفاسد ہے، کیونکہ دین موسوی کی ابدیت کا دعویٰ خود غلط ہے، لہذا انکار نبوت مسیحیہ و محمدیہ کے سبب وہ لوگ کافر ہوں گے، اور کفار کے لئے بعد چندے دوزخ سے نجات پا جانا کسی بھی آسمانی کتاب میں نہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے ”عہد“ سے تعبیر فرمایا، پس ثابت ہوا کہ دعویٰ بلادلیل بلکہ خلاف دلیل ہے۔

بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ

کیوں نہیں جس نے کمایا گناہ اور گھیر لیا اس کو اس کے گناہ نے سو وہی ہیں دوزخ کے رہنے والے،

هُم فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ

وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جو ایمان لائے اور عمل کئے نیک وہی ہیں

أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۸۲﴾

جنت کے رہنے والے، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

آسان ترجمہ قرآن

(آگ تمہیں) کیوں نہیں (چھوئے گی)؟ جو لوگ بھی بدی کما تے ہیں اور ان کی بدی انہیں گھیر لیتی ہے تو ایسے

لوگ ہی دوزخ کے باسی ہیں۔ وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے ﴿۸۱﴾ اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، تو وہ

جنت کے باسی ہیں۔ وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے ﴿۸۲﴾

خلاصہ تفسیر

خلود فی النار کا ضابطہ

(بجز چند روز کے تم کو آتشِ دوزخ) کیوں نہیں (لگے گی، بلکہ ابد الابد تک اس میں رہنا ضروری ہے، کیونکہ ہمارا ضابطہ یہ ہے کہ) جو شخص قصدِ اُبری باتیں کرتا رہے اور اس کو اس کی خطا (و قصور اس طرح) احاطہ کر لے (کہ کہیں نیکی کا اثر تک نہ رہے) سو ایسے لوگ اہلِ دوزخ ہوتے ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے، اور جو لوگ (اللہ و رسول پر) ایمان لاویں اور نیک کام کریں، ایسے لوگ اہلِ بہشت ہوتے ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے۔

فائدہ:- خطاؤں کے احاطہ کے جو معنی اوپر ذکر کئے گئے ہیں، اس قسم کا احاطہ اس معنی کے ساتھ کفار کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ کفر کی وجہ سے کوئی بھی عملِ صالح مقبول نہیں ہوتا، بلکہ کفر کے قبل اگر کچھ نیک اعمال کئے بھی ہوں تو وہ بھی ضائع اور ضبط ہو جاتے ہیں، اسی وجہ سے کفار میں سرتاپا بدی ہی بدی ہوگی، جس کی جزا ابدی جہنم ہوگی، بخلاف اہلِ ایمان کے کہ اوّل تو ان کا ایمان خود بہت بڑا عملِ صالح ہے، دوسرے اعمالِ فرعیہ بھی ان کے نامہ اعمال میں درج ہوتے ہیں، اس لئے وہ نیکی کے اثر سے خالی نہیں، پس احاطہ مذکور ان کی حالت پر صادق نہیں آتا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جب اس ضابطہ کی رو سے کافر کا ابدی جہنمی ہونا ثابت ہو گیا، تو چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خاتم الانبیاء نہیں ہیں، آپ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نبی ہیں، تو یہودان کا انکار کر کے کافروں میں شامل ہو گئے، اس لئے اس ضابطہ کی رو سے وہ بھی خالد فی النار ہوں گے، تو ان کا دعویٰ مذکور دلیلِ قطعی سے باطل ٹھہرا۔

وَإِذَا خَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَآءِ يَلَّا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ ۖ وَبِالْوَالِدَيْنِ

اور جب ہم نے لیا قرار بنی اسرائیل سے کہ عبادت نہ کرنا مگر اللہ کی اور ماں باپ سے

إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا ۚ وَقِيمُوا

سلوک نیک کرنا اور کنبہ والوں سے اور یتیموں اور محتاجوں سے اور کہو سب لوگوں سے نیک بات اور قائم رکھو

الصَّلَاةُ وَالزَّكَاةُ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمَا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿۸۳﴾

نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ، پھر تم پھر گئے مگر تھوڑے سے تم میں، اور تم ہی ہو پھرنے والے۔

آسان ترجمہ قرآن

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے بنی اسرائیل سے پکا عہد لیا تھا کہ: ”تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرو گے، اور والدین سے اچھا سلوک کرو گے، اور رشتہ داروں سے بھی اور یتیموں اور مسکینوں سے بھی۔ اور لوگوں سے بھلی بات کہنا، اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا۔“ (مگر) پھر تم میں سے تھوڑے سے لوگوں کے سوا باقی سب (اس عہد سے) منہ موڑ کر پھر گئے ﴿۸۳﴾

خلاصہ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب لیا ہم نے (توریت میں) قول و قرار بنی اسرائیل سے کہ عبادت مت کرنا (کسی کی) بجز اللہ کے، اور ماں باپ کی اچھی طرح خدمت گزاری کرنا، اور اہل قرابت کی بھی، اور بے باپ کے بچوں کی بھی، اور غریب محتاجوں کی بھی، اور عام لوگوں سے (جب کوئی) بات (کہنا ہو تو) اچھی طرح (خوش خلقی سے) کہنا اور پابندی رکھنا نماز کی اور ادا کرتے رہنا زکوٰۃ، پھر تم (قول و قرار کر کے) اس سے پھر گئے بجز معدودے چند کے، اور تمہاری تو معمولی عادت ہے اقرار کر کے ہٹ جانا۔

فائدہ:- یہ معدودے چند وہ لوگ ہیں جو توریت کے پورے پابند رہے، توریت کے منسوخ ہونے سے قبل شریعت موسویہ کے پابند رہے، جب توریت منسوخ ہو گئی تو شریعت محمدیہ کے متبع ہو گئے۔

مسئلہ:- اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ احکام اسلام اور سابقہ شریعتوں میں مشترک ہیں، جن میں توحید، والدین اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کی خدمت، اور تمام انسانوں کے ساتھ گفتگو میں نرمی و خوش خلقی کرنا اور نماز اور زکوٰۃ سب داخل ہیں۔

تعلیم و تبلیغ میں سخت کلامی کافر سے بھی درست نہیں

وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا سے مراد ”قَوْلًا ذَا حَسَنٍ“ ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ جب لوگوں سے خطاب کرے تو

بات نرم کرے، خوش رُوئی اور کشادہ دلی سے کرے، چاہے مخاطب نیک ہو یا بد، سنی ہو یا بدعتی، ہاں دین کے معاملہ میں مدہانت اور اس کی خاطر سے حق پوشی نہ کرے، وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جب موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف بھیجا تو یہ ہدایت نامہ دیا کہ: **فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا** (طہ: ۴۴) تو آج جو کلام کرنے والا ہے وہ حضرت موسیٰ سے افضل نہیں، اور مخاطب کتنا ہی برا ہو فرعون سے زیادہ برا خبیث نہیں۔

طلحہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے امام تفسیر و حدیث عطاءؒ سے کہا کہ آپ کے پاس فاسد عقیدے والے لوگ بھی جمع رہتے ہیں، مگر میرے مزاج میں تیزی ہے، میرے پاس ایسے لوگ آتے ہیں تو میں ان کو سخت باتیں کہہ دیتا ہوں۔ حضرت عطاءؒ نے فرمایا کہ ایسا نہ کیا کرو، کیونکہ حق تعالیٰ کا حکم ہے کہ: **قُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا**، اس میں تو یہودی و نصرانی بھی داخل ہیں، مسلمان خواہ کیسا ہی ہو وہ کیوں نہ داخل ہوگا۔ (قرطبی) ^[۱]

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنْفُسَكُمْ

اور جب لیا ہم نے وعدہ تمہارا کہ نہ کرو گے خون آپس میں اور نہ نکال دو گے اپنوں کو

مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنْتُمْ تَسْهَدُونَ ^(۸۴)

اپنے وطن سے پھر تم نے اقرار کر لیا اور تم مانتے ہو۔

آسان ترجمہ قرآن

اور (یاد کرو) جب ہم نے تم سے پکا عہد لیا تھا کہ: ”تم ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے، اور اپنے آدمیوں کو اپنے گھروں سے نہیں نکالو گے“ پھر تم نے اقرار کیا تھا، اور تم خود اس کے گواہ ہو ^(۸۴)

خلاصہ تفسیر

اوپر جو عہدِ میثاق لیا گیا تھا اس آیت میں اس کا تتمہ بیان کیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:-
اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تم سے یہ قول و قرار (بھی) لیا کہ (خانہ جنگی کر کے) باہم خونریزی مت کرنا اور ایک دوسرے کو ترکِ وطن مت کرانا، پھر (ہمارے اس اقرار لینے پر) تم نے اقرار بھی کر لیا اور اقرار بھی (ضمناً نہیں،

بلکہ) ایسا جیسے تم (اس پر) شہادت (بھی) دیتے ہو۔

فائدہ:- بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کی تقریر سے کسی امر کا اقرار مترشح ہوتا ہے گو صاف اقرار نہیں ہوتا، مگر عرفاً اور عقلاً اس کو اقرار ہی سمجھا جاتا ہے، لیکن یہاں تو **ثُمَّ أَقْرَأْتُمْ** سے اس شبہ کو بھی رفع کر دیا، اور بتا دیا کہ یہ اقرار اتنا صریح اور واضح تھا جیسے شہادت صاف اور واضح ہوا کرتی ہے۔

ترک وطن کرانے کی ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو آزار پہنچا کر اتنا تنگ مت کرنا کہ بیچارہ ترک وطن پر مجبور ہو جائے۔

ثُمَّ أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِنْكُمْ

پھر تم وہ لوگ ہو کہ ویسے ہی خون کرتے ہو آپس میں اور نکال دیتے ہو اپنے ایک فرقہ کو

مِنْ دِيَارِهِمْ تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِم بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَإِنْ يَأْتُوكُمْ

ان کے وطن سے چڑھائی کرتے ہوئے اُن پر گناہ اور ظلم سے اور اگر وہ آویں تمہارے پاس

أُسْرَى تُفْدُوهُمْ وَهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ

کسی کے قیدی ہو کر تو ان کا بدلہ دے کر چھڑاتے ہو، حالانکہ حرام ہے تم پر ان کا نکال دینا بھی، تو کیا مانتے ہو بعض

الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضِ فَبِأَجْزَاءٍ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ

کتاب کو اور نہیں مانتے بعض کو، سو کوئی سزا نہیں اس کی جو تم میں یہ کام کرتا ہے مگر رسوائی

فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَمَةِ يُرَدُّونَ إِلَى أَشَدِّ الْعَذَابِ ط

دنیا کی زندگی میں اور قیامت کے دن پہنچائے جاویں سخت سے سخت عذاب میں،

وَمَا لِلَّهِ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝۸۵

اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے۔

آسان ترجمہ قرآن

اس کے بعد (آج) تم ہی وہ لوگ ہو کہ اپنے ہی آدمیوں کو قتل کرتے ہو، اور اپنے ہی میں سے کچھ لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرتے ہو، اور ان کے خلاف گناہ اور زیادتی کا ارتکاب کر کے (ان کے دشمنوں کی) مدد کرتے ہو، اور اگر وہ (دشمنوں کے) قیدی بن کر تمہارے پاس آجاتے ہیں تو تم ان کو فدیہ دے کر چھڑا لیتے ہو، حالانکہ ان کو (گھر سے) نکالنا ہی تمہارے لئے حرام تھا۔ تو کیا تم کتاب (توراة) کے کچھ حصے پر تو ایمان رکھتے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو؟ اب بتاؤ کہ جو شخص ایسا کرے اُس کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ دُنیوی زندگی میں اُس کی رسوائی ہو؟ اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو سخت ترین عذاب کی طرف بھیج دیا جائے گا۔ اور جو کچھ تم عمل کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے ۸۵

خلاصہ تفسیر

تمہ میثاق میں جو حکم ان کو دیا گیا ہے اس کے متعلق عہد شکنی کا بیان اس آیت میں فرمایا ہے۔ پھر (اس اقرارِ صریح کے بعد) تم (جیسے ہو) یہ (آنکھوں کے سامنے) موجود (ہی) ہو کہ باہم قتل و قتل بھی کرتے ہو، اور ایک دوسرے کو ترکِ وطن بھی کراتے ہو، (اس طور پر کہ) ان اپنوں کے مقابلہ میں (ان کی مخالف قوموں کی) امداد کرتے ہو، گناہ اور ظلم کے ساتھ (سوان دونوں حکموں کو تو یوں غارت کیا) اور (ایک تیسرا حکم جو سہل سا سمجھا اس پر عمل کرنے کو خوب تیار رہتے ہو کہ) اگر ان لوگوں میں سے کوئی گرفتار ہو کر تم تک پہنچ جاتا ہے تو ایسوں کو کچھ خرچ کرا کر رہا کر دیتے ہو، حالانکہ یہ بات (بھی معلوم) ہے کہ تم کو ان کا ترکِ وطن کرا دینا (اور قتل تو اور بھی بدرجہ اولیٰ) نیز ممنوع ہے۔

معارف مسائل

فائدہ:- اس باب میں ان پر تین حکم لازم تھے، اول قتل نہ کرنا، دوم اخراج یعنی ترکِ وطن نہ کرنا، سوم اپنی قوم میں سے کسی کو قید و بند میں گرفتار دیکھیں تو روپیہ خرچ کر کے چھڑا دینا، تو ان لوگوں نے اول کے دو حکم کو تو چھوڑ دیا اور تیسرے حکم کا اہتمام کرنے لگے، اور صورت اس کی یہ ہوئی تھی کہ اہلِ مدینہ میں دو قومیں تھیں، اوس و خزرج، اور ان میں باہم عداوت رہتی تھی، اور کبھی کبھی قتال کی نوبت بھی آجاتی تھی، اور مدینہ کے گرد و نواح میں یہودیوں کی دو قومیں بنی قریظہ اور بنی نضیر آباد تھیں، اوس و بنی قریظہ کی باہم دوستی تھی، اور خزرج و بنی نضیر میں باہم یار نہ تھا، جب اوس و خزرج میں باہم لڑائی ہوتی تو دوستی کی بنا پر بنو قریظہ تو اوس کے مددگار ہوتے، اور بنو نضیر خزرج کی طرف داری کرتے، تو جہاں اوس و خزرج مارے

جاتے اور خانماں آوارہ ہوتے تو ان کے دوستوں اور حامیوں کو بھی یہ مصیبت پیش آتی، اور ظاہر ہے کہ بنو قریظہ کے قتل و اخراج میں بنو نضیر کا بھی ہاتھ ہوتا، اور ایسا ہی بالعکس، البتہ یہودی دونوں جماعتوں میں سے اگر کوئی جنگ میں قید ہو جاتا تو ہر جماعت اپنے دوستوں کو مال پر راضی کر کے اس قیدی کو رہائی دلا دیتے، اور کوئی پوچھتا کہ ایسا کیوں کرتے ہو، تو اس کو جواب دیتے کہ اسیر کو رہا کر دینا ہم پر واجب ہے، اور اگر کوئی قتل و قتال میں معین و مددگار بننے پر اعتراض کرتا تو کہتے کہ کیا کریں، دوستوں کا ساتھ نہ دینے سے عار آتی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کی شکایت فرمائی ہے، اور ان کی حیلہ سازیوں کا پردہ چاک فرمایا ہے۔

اس آیت میں جن مخالف قوموں کی امداد کا ذکر ہے اس سے اس و خزرج مراد ہیں، کہ اس، بنی قریظہ کی موافقت میں بنی نضیر کے مخالف تھے، اور خزرج، بنی نضیر کی موافقت میں بنی قریظہ کے مخالف تھے۔

”اِثْمٌ“ و ”عَدْوَانٌ“ (ظلم اور گناہ) دو لفظ لانے اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ اس میں دو حق ضائع ہوتے ہیں، حکم الہی کی تعمیل نہ کر کے حق اللہ ضائع کیا، اور دوسرے کو آزار پہنچا کر حق العباد بھی ضائع کر دیا۔

آگے اس عہد شکنی پر ملامت و شکایت کے ساتھ ساتھ سزا کو بھی بالتصریح بیان فرمایا ہے، ارشاد ہے:-

کیا تو (بس یوں کہو کہ) کتاب (توریت) کے بعض (احکام) پر تم ایمان رکھتے ہو اور بعض (احکام) پر ایمان نہیں رکھتے تو اور کیا سزا ہو (ناچاہئے) ایسے شخص کی جو تم لوگوں میں سے ایسی حرکت کرے بجز رسوائی کے دنیوی زندگی میں اور روز قیامت کو بڑے سخت عذاب میں ڈال دیئے جاویں گے، اور اللہ تعالیٰ (کچھ) بے خبر نہیں ہیں تمہارے اعمال (زشت) سے۔

فائدہ:- ہر چند کہ وہ یہودی جن کا قصہ میں ذکر ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنے کی بنا پر کافی ہی تھے، مگر یہاں ان کا کفر مذکور نہیں، بلکہ بعض احکام پر عمل نہ کرنے کو کفر سے تعبیر فرمایا ہے، حالانکہ جب تک حرام کو حرام سمجھے آدمی کافر نہیں ہوتا، سو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جو گناہ بہت شدید ہوتا ہے اس پر محاورات شرعیہ میں اس کی شدت کے پیش نظر کفر کا اطلاق کر دیا جاتا ہے۔ ہم اپنے محاورات عرفیہ میں اس کی مثالیں دن رات دیکھتے ہیں، جیسے کسی ذلیل حرکت کرنے والے کو کہہ دیتے ہیں کہ تو بالکل چمار ہے، حالانکہ مخاطب چمار یقیناً نہیں ہے، اس سے مقصود شدت نفرت اور اس کام کی قباحت ظاہر کرنا ہوتا ہے، اور یہی معنی ہیں اس حدیث: ”مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ“^[۱] وغیرہ کے۔

اس مقام پر جن دوسراؤں کا ذکر ہے ان میں سے پہلی سزا یعنی دنیا میں ذلت و رسوائی تو اس کا وقوع اس طرح ہوا

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانے میں مسلمانوں کے ساتھ معاہدے کی خلاف ورزی کرنے کے سبب بنی قریظہ قتل و قید کئے گئے اور بنی نضیر ملک شام کی طرف بہر ارضیت و خواری نکال دیئے گئے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۚ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ

یہ وہی ہیں جنہوں نے مولیٰ دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے، سونہ ہلکا ہوگا اُن پر

الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۚ

عذاب اور نہ اُن کو مدد پہنچے گی۔

آسان ترجمہ قرآن

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دُنیوی زندگی کو آخرت کے بدلے خرید لیا ہے، لہذا نہ اُن کے عذاب میں کوئی تخفیف ہوگی اور نہ اُن کی مدد کی جائے گی ۛ

خلاصہ تفسیر

(اور وجہ سزا اُن کے لئے یہ ہے کہ) یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے (احکام کی مخالفت کر کے) دُنیوی زندگی (کے مزوں) کو لے لیا ہے، بعوض (نجات) آخرت کے (جس کا ذریعہ اطاعت ہے) سونہ تو (سزا دینے والے کی طرف سے) ان کی سزا میں (کچھ) تخفیف دی جاوے گی اور نہ کوئی (فکیل، مختار یا دوست، رشتہ دار) اُن کی طرف داری (پیروی) کرنے پاوے گا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ ۚ وَآتَيْنَا عِيسَى

اور بے شک دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور پے درپے بھیجے اس کے پیچھے رسول اور دیئے ہم نے عیسیٰ

ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيْتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۖ أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ

مریم کے بیٹے کو معجزے صریح اور قوت دی اس کو رُوح پاک سے، پھر بھلا کیا جب تمہارے پاس لایا کوئی رسول

بِأَلَاتِهِمْ أَنْفُسُكُمْ اسْتَكْبَرْتُمْ ۖ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ ۖ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ﴿۸۷﴾

وہ حکم جو نہ بھایا تمہارے جی کو تو تم تکبر کرنے لگے، پھر ایک جماعت کو جھٹلایا اور ایک جماعت کو تم نے قتل کر دیا۔

آسان ترجمہ قرآن

اور بیشک ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے۔ اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں، اور روح القدس سے ان کی تائید کی۔ پھر یہ آخر کیا معاملہ ہے کہ جب کبھی کوئی رسول تمہارے پاس کوئی ایسی بات لے کر آیا جو تمہاری نفسانی خواہشات کو پسند نہیں تھی تو تم اکڑ گئے؟ چنانچہ بعض (انبیاء) کو تم نے جھٹلایا، اور بعض کو قتل کرتے رہے ﴿۸۷﴾

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے (اے بنی اسرائیل! تمہاری ہدایت کے لئے ہمیشہ سے بڑے بڑے سامان کئے، سب سے اوّل) موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (توراة) دی اور (پھر) ان کے بعد (درمیان میں) یکے بعد دیگرے (برابر مختلف) پیغمبروں کو بھیجتے رہے، اور (پھر اس خاندان کے سلسلے کے اخیر میں) ہم نے (حضرت) عیسیٰ بن مریم کو (نبوت کے) واضح دلائل (انجیل اور معجزات) عطا فرمائے، اور ہم نے ان کو روح القدس (جبریل علیہ السلام) سے (جو) تائید دی (سوا لگ، جو بجائے خود ایک دلیل واضح تھی تو) کیا (تعجب کی بات نہیں کہ اس پر بھی تم سرکشی کرتے رہے اور) جب کبھی (بھی) کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسے احکام لائے جن کو تمہارا دل نہ چاہتا تھا (جب ہی) تم نے (ان پیغمبروں کی اطاعت سے) تکبر کرنا شروع کر دیا، سو (ان پیغمبروں میں سے) بعضوں کو تو (نعوذ باللہ) تم نے جھوٹا بتلایا اور بعضوں کو (بے دھڑک) قتل ہی کر ڈالتے تھے۔

فائدہ:- قرآن وحدیث میں جا بجا حضرت جبریل علیہ السلام کو روح القدس کہا گیا ہے، جیسے قرآن کی اس آیت میں، نیز: قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ (النحل: ۱۰۲) میں، اور حدیث میں حضرت حسان بن ثابتؓ کا یہ شعر ے

وَجِبْرِيلُ رَسُولُ اللَّهِ فِينَا

وَرُوحُ الْقُدُسِ لَيْسَ لَهُ كِفَاءٌ ﴿۱﴾

اور جبریل علیہ السلام کے واسطے سے عیسیٰ علیہ السلام کی کئی طریقوں سے تائید ہوئی، اول تو ولادت کے وقت مس شیطان سے حفاظت کی گئی، پھر ان کے دم کرنے سے حمل عیسوی قرار پایا، پھر یہود چونکہ کثرت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخالف تھے، اس لئے جبریل علیہ السلام حفاظت کے لئے ساتھ رہتے تھے، حتیٰ کہ آخر میں اُن کے ذریعہ سے آسمان پر اُٹھوائے گئے، یہود نے بہت سے پیغمبروں کی تکذیب کی حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بھی تکذیب کی، اور حضرت زکریا و حضرت یحییٰ علیہما السلام کو قتل بھی کیا۔

وَقَالُوا اقْلُوبْنَا غُلْفٌ ط بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ﴿۸۸﴾

اور کہتے ہیں: ہمارے دلوں پر غلاف ہے، بلکہ لعنت کی ہے اللہ نے اُن کے کفر کے سبب سو بہت کم ایمان لاتے ہیں

آسان ترجمہ قرآن

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ: ”ہمارے دل غلاف میں ہیں۔“ نہیں! بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان پر پھٹکار ڈال رکھی ہے، اس لئے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں ﴿۸۸﴾

خلاصہ تفسیر

اور وہ (یہود طنزیہ طور پر) کہتے ہیں کہ ہمارے قلوب (ایسے) محفوظ ہیں (کہ اس میں مخالف مذہب کا جو اسلام ہے، اثر ہی نہیں ہوتا، تو مذہب پر ہم خوب پختہ ہیں، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ محفوظی اور پختگی نہیں ہے) بلکہ اُن کے کفر کے سبب اُن پر خدا کی مار ہے (کہ اسلام جو مذہب حق ہے اس سے نفور اور منسوخ مذہب پر مصر ہیں) سو بہت ہی تھوڑا سا ایمان رکھتے ہیں (اور تھوڑا ایمان مقبول نہیں، پس وہ کافر ہی ٹھہرے)۔

فائدہ:- یہ تھوڑا سا ایمان ان امور کی بابت ہے جو اُن کے مذہب اور اسلام میں مشترک ہیں، مثلاً خدا کا قائل ہونا، قیامت کا قائل ہونا کہ ان امور کے وہ بھی قائل تھے، لیکن خود نبوتِ محمدیہ اور قرآن کے کلامِ الہی ہونے کے منکر تھے، اس لئے پورا ایمان نہ تھا۔

اور اس تھوڑے ایمان کو باعتبار لغت ایمان کہا، جس کے معنی مطلق یقین کے ہیں، گو وہ بعض اشیاء کے ساتھ ہی متعلق ہو، شرعاً اس کو ایمان نہیں کہتے، شرعاً وہ ایمان معتبر ہے جو کل امورِ وارد فی الشرع کے یقین کے ساتھ ہو۔

وَلَبَّاجَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ^{۱۸۹} وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ

اور جب پہنچی اُن کے پاس کتاب اللہ کی طرف سے جو سچا بتاتی ہے اس کتاب کو جو ان کے پاس ہے اور پہلے سے

يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا^{۱۹۰} فَلَبَّاجَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ^{۱۹۱}

فتح مانگتے تھے کافروں پر، پھر جب پہنچا ان کو جس کو پہچان رکھا تھا تو اس سے منکر ہو گئے،

فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ^{۱۹۲}

سولعت ہے اللہ کی منکروں پر۔

آسان ترجمہ قرآن

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب آئی (یعنی قرآن) جو اُس (توراة) کی تصدیق بھی کرتی ہے جو پہلے سے ان کے پاس ہے، (تو ان کا طرزِ عمل دیکھو!) باوجودیکہ یہ خود شروع میں کافروں (یعنی بت پرستوں) کے خلاف (اس کتاب کے حوالے سے) اللہ سے فتح کی دُعائیں مانگا کرتے تھے، مگر جب وہ چیز ان کے پاس آگئی جسے انہوں نے پہچان بھی لیا، تو اس کا انکار کر بیٹھے۔ پس پھٹکار ہے اللہ کی ایسے کافروں پر! ^{۱۹۲}

خلاصہ تفسیر

اور جب اُن کو (ایک) ایسی کتاب پہنچی (یعنی قرآن مجید) جو منجانب اللہ ہے، (اور) اس (کتاب) کی (بھی) تصدیق کرنے والی ہے جو (پہلے سے) اُن کے پاس ہے، (یعنی توراة) حالانکہ اس کے قبل (خود) بیان کرتے تھے (اور) کفار سے (یعنی مشرکینِ عرب سے کہ ایک نبی آنے والے ہیں، اور ایک کتاب لانے والے ہیں، مگر) پھر جب وہ چیز آ پہنچی جس کو وہ (خوب جانتے) پہچانتے ہیں تو اس کا (صاف) انکار کر بیٹھے، سو (بس) خدا کی مار ہو ایسے منکروں پر (کہ جان بوجھ کر محض تعصب کے سبب انکار کریں)۔

فائدہ:- قرآن کو جو مصدقِ توراة فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ توراة میں بعثتِ محمدیہ اور نزولِ قرآن کی جو پیشین گوئیاں تھیں اسے ان کا صدق ظاہر ہو گیا، سو توراة کا ماننے والا تو قرآن اور صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب

کر ہی نہیں سکتا ورنہ تورات کی تکذیب لازم آئے گی۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب وہ حق کو حق جانتے تھے تو پھر ان کو ”مؤمن“ کہنا چاہئے، کافر کیسے کہا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایمان صرف جاننے کا نام نہیں، بلکہ ماننے کا نام ہے، ورنہ یوں تو شیطان سب سے زیادہ حق کو حق جانتا ہے، مگر جاننے کے باوجود انکار کرنے کی وجہ سے اور بھی کفر میں شدت بڑھ گئی، اسی لئے اگلی آیت میں اُن کے کفر کا عناد بتلایا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

يُسْأَلُنَّ عَنْ نَفْسِهِمْ اَنْ يَكْفُرُوا اِذَا نَزَلَ اللَّهُ بُعِيًّا اَنْ يَنْزِلَ

بري چیز ہے وہ جس کے بدلے بیچا انہوں نے اپنے آپ کو کہ منکر ہوئے اس چیز کے جو اتاری اللہ نے اس ضد پر کہ اتارے

اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ فَبَاءُ وَبِغَضَبٍ عَلَى غَضَبٍ ط

اللہ اپنے فضل سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے، سو کما لائے غصے پر غصہ

وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُهِينٌ ⑨

اور کافروں کے واسطے عذاب ہے ذلت کا۔

آسان ترجمہ قرآن

بری ہے وہ قیمت جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا ہے، کہ یہ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کا صرف اس جلن کی بنا پر انکار کر رہے ہیں کہ اللہ اپنے فضل کا کوئی حصہ (یعنی وحی) اپنے بندوں میں سے جس پر چاہ رہا ہے (کیوں) اتار رہا ہے؟ چنانچہ یہ (اپنی اس جلن کی وجہ سے) غضب بالائے غضب لے کر لوٹے ہیں۔ اور کافر لوگ ذلت آمیز سزا کے مستحق ہیں۔ ⑨

خلاصہ تفسیر

وہ حالت (بہت ہی) بری ہے جس کو اختیار کر کے (وہ بزعم خود) اپنی جانوں کو (عقوبتِ آخرت سے) چھڑانا

چاہتے ہیں، (اور وہ حالت) یہ (ہے) کہ کفر (انکار) کرتے ہیں ایسی چیز کا جو حق تعالیٰ نے (ایک سچے پیغمبر پر) نازل فرمائی (یعنی قرآن، اور وہ انکار بھی) محض (اس) ضد پر کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جس بندہ پر اس کو منظور ہو، (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر، کیوں) نازل فرماوے سو (اس حسد بالائے کفر سے) وہ لوگ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے، اور (آخرت میں) ان کفر کرنے والوں کو ایسی سزا ہوگی جس میں (تکلیف کے علاوہ) ذلت (بھی) ہے۔

فائدہ:- ایک غضب کفر پر، دوسرا حسد پر، یوں غضب بالائے غضب فرمایا۔ عذاب کے ساتھ ”مہین“ کی قید سے بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ عذاب کفار کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ گناہگار مومن کو عذاب اس کو پاک کرنے کے لئے ہوگا، ذلت کے لئے نہیں۔

آگے کی آیت میں جو ان کا قول نقل کیا ہے اس سے ان کا کفر ثابت ہوتا ہے، اور حسد بھی مترشح ہوتا ہے:-

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ امْنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُوْمِنُ بِمَا أَنْزَلَ عَلَيْنَا

اور جب کہا جاتا ہے ان سے: مانو اس کو جو اللہ نے بھیجا ہے، تو کہتے ہیں: ہم مانتے ہیں جو اُترا ہے ہم پر،

وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ^ق وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ^ط قُلْ

اور نہیں مانتے اس کو جو سو اس کے ہے، حالانکہ وہ کتاب سچی ہے جو تصدیق کرتی ہے اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے، کہہ دو:

فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنْبِيَاءَ اللَّهِ مِنْ قَبْلُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ^{۹۱}

پھر کیوں قتل کرتے رہے ہو اللہ کے پیغمبروں کو پہلے سے اگر تم ایمان رکھتے تھے۔

آسان ترجمہ قرآن

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کلام اُتارا ہے اس پر ایمان لے آؤ، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو (صرف) اُسی کلام پر ایمان رکھیں گے جو ہم پر نازل کیا گیا، (یعنی توراۃ) اور وہ اس کے سوا (دوسری آسمانی کتابوں) کا انکار کرتے ہیں، حالانکہ وہ بھی حق ہیں، (اور) جو کتاب ان کے پاس ہے وہ اُس کی تصدیق بھی کرتی ہیں۔ (اے پیغمبر!) تم ان سے کہو کہ اگر تم واقعی (توراۃ پر) ایمان رکھتے تھے تو اللہ کے نبیوں کو پہلے زمانے میں کیوں قتل کرتے رہے؟^{۹۱}

خلاصہ تفسیر

اور جب ان (یہودیوں) سے کہا جاتا ہے کہ تم ایمان لاؤ ان تمام کتابوں پر جو اللہ تعالیٰ نے (متعدد پیغمبروں پر) نازل فرمائی ہیں (اور ان تمام کتابوں میں قرآن بھی ہے) تو (جواب میں) کہتے ہیں کہ ہم (تو صرف) اس (ہی) کتاب پر ایمان لاویں گے جو ہم (لوگوں) پر (بواسطہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے) نازل کی گئی ہے (یعنی توراۃ) اور (باقی) جتنی (کتابیں) اس کے علاوہ ہیں (جیسے انجیل اور قرآن) ان (سب) کا وہ انکار کرتے ہیں، حالانکہ وہ (توراۃ کے ماسوا کتابیں) بھی (فی نفسہ) حق (اور واقعی) ہیں، اور (فی نفسہ حق ہونے کے علاوہ) تصدیق کرنے والی بھی ہیں اس (کتاب) کی جو ان کے پاس ہے (یعنی توراۃ کی) آپ (یہ بھی) کہئے کہ (اچھا تو) پھر کیوں قتل کیا کرتے تھے اللہ کے پیغمبروں کو اس کے پہلے زمانہ میں اگر تم (توراۃ پر) ایمان رکھنے والے تھے۔

فائدہ:- یہود نے جو یہ کہا کہ ”ہم صرف توراۃ پر ایمان لاویں گے، دوسری کتب پر ایمان نہ لاویں گے“ تو ان کا یہ قول صریحی کفر ہے، اور اس کے ساتھ جو یہ کہا کہ (توراۃ) ”جو ہم پر نازل کی گئی ہے“ اس سے حسد مترشح ہوتا ہے، اس کا مفہوم صاف یہ ہے کہ اور کتابیں چونکہ ہم پر نازل نہیں کی گئیں، اس لئے ان پر ایمان نہیں لائیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کو تین طرح رد فرمایا ہے:-

اول یہ کہ جب اور کتابوں کی حقیقت اور واقعیت بھی دلیل قطعی سے ثابت ہے تو پھر اس انکار کی کیا وجہ ہے؟ ہاں اگر اس دلیل میں کوئی کلام تھا تو اس کو پیش کر کے تشفی کر لیتے، انکار محض کی آخر کیا وجہ؟

دوسرے اور کتابیں مثلاً قرآن مجید جو توراۃ کا مصدق ہے تو اس کے انکار سے تو خود توراۃ کی تکذیب و انکار لازم آتا ہے۔

تیسرے یہ کہ انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا تمام آسمانی کتابوں کی رو سے کفر ہے، پھر تمہارے گروہ کے لوگوں نے جو کئی نبیوں کو قتل کیا، جن کی تعلیم بھی توراۃ ہی کے احکام کے ساتھ خاص تھی، اور تم ان قاتلین کو اپنا پیشوا اور مقتدا سمجھتے ہو، تو براہ راست توراۃ کے ساتھ کفر کرتے ہو، اس سے تو تمہارا توراۃ پر ایمان کا دعویٰ بھی غلط ٹھہرتا ہے، غرض کسی بھی پہلو سے تمہارا قول و فعل صحیح اور درست نہیں۔

آگے بعض اور وجوہ و دلائل سے ان یہودیوں کا رد فرمایا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَى بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ

اور آپکا تمہارے پاس موسیٰ صریح معجزے لے کر پھر بنالیا تم نے پھڑا اس کے گئے پیچھے،

وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ﴿۹۲﴾

اور تم ظالم ہو۔

آسان ترجمہ قرآن

اور خود موسیٰ تمہارے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے، پھر تم نے ان کے پیٹھ پیچھے یہ ستم ڈھایا کہ گائے کے پھڑے کو معبود بنالیا ﴿۹۲﴾

خلاصہ تفسیر

اور (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) تم لوگوں کے پاس صاف صاف دلیلیں (توحید و رسالت کی) لائے (مگر) اس پر بھی تم لوگوں نے گوسالہ کو (معبود) بنالیا، موسیٰ (علیہ السلام) کے (طور پر جانے کے) بعد اور تم (اس تجویز میں) ستم ڈھا رہے تھے۔

فائدہ:- ”بیِّنَات“ سے وہ دلائل مراد ہیں جو اس قصے سے پہلے جبکہ توراۃ نہ ملی تھی، موسیٰ علیہ السلام کے نبی برحق ہونے پر قائم ہو چکی تھیں، مثلاً عصا اور ید بیضا، دریا کا پھٹنا وغیرہ۔

رَدّ کی تقریر کا حاصل ظاہر ہے کہ تم دعویٰ تو ایمان کا کرتے ہو اور صریح شرک میں مبتلا ہو، جس سے موسیٰ علیہ السلام بلکہ خدا تعالیٰ کی صریح تکذیب بھی لازم آتی ہے، گوسالہ کو معبود بنانے کا معاملہ اگرچہ ان یہودیوں کے ساتھ پیش نہیں آیا تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نزولِ قرآن کے وقت موجود تھے، مگر چونکہ یہ لوگ اپنے اجداد کے حامی اور طرف دار رہتے تھے، اس لئے فی الجملہ یہ بھی رَدّ میں شامل ہیں۔

اور اسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جن کے اسلاف نے موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کر کے کفر کیا، وہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار کے مرتکب ہوں تو چنداں عجیب نہیں۔

وَإِذَا خَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ ط خَذُوا مَا آتَيْنَكُم بِقُوَّةٍ

اور جب ہم نے لیا قرار تمہارا اور بلند کیا تمہارے اوپر کوہ طور کو، پکڑو جو ہم نے تم کو دیا زور سے

وَأَسْمِعُوا ط قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ

اور سنو، بولے: سنا ہم نے اور نہ مانا، اور پلائی گئی ان کے دلوں میں محبت اسی بچھڑے کی

بِكُفْرِهِمْ ط قُلْ بِسَيِّئَاتِكُمْ بِهِ إِيَّانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۙ ۙ

بسبب اُن کے کفر کے، کہہ دے کہ بری باتیں سکھاتا ہے تم کو ایمان تمہارا اگر تم ایمان والے ہو۔

آسان ترجمہ قرآن

اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تمہارے اوپر طور کو بلند کر دیا (اور یہ کہا کہ) ”جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اس کو مضبوطی سے تھامو اور (جو کچھ کہا جائے اسے ہوش سے) سنو۔“ کہنے لگے: ”ہم نے (پہلے بھی) سن لیا تھا، مگر عمل نہیں کیا تھا (اب بھی ایسا ہی کریں گے)“ اور (در اصل) اُن کے کفر کی نحوست سے اُن کے دلوں میں بچھڑا بسا ہوا تھا۔ آپ (اُن سے) کہئے کہ اگر تم مؤمن ہو تو کتنی بُری ہیں وہ باتیں جو تمہارا ایمان تمہیں تلقین کر رہا ہے! ۙ ۙ

خلاصہ تفسیر

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تمہارا قول و قرار لیا تھا، اور (اس قول و قرار لینے کے لئے) طور کو تمہارے (سروں کے) اوپر لاکھڑا کیا تھا (اور اس وقت حکم دیا تھا کہ) لو جو کچھ (احکام) ہم تم کو دیتے ہیں ہمت (اور پختگی) کے ساتھ لے لو اور (ان احکام کو دل سے) سنو، (اس وقت) انہوں نے (ڈر کے مارے زبان سے تو) کہہ دیا کہ ہم نے (قبول کر لیا اور) سن لیا، اور (چونکہ واقع میں یہ بات دل سے نہ تھی، اس لئے گویا بزبانِ حال یوں بھی کہہ رہے تھے کہ) ہم سے عمل نہ ہوگا، اور (وجہ اُن کی اس بددلی کی یہ تھی کہ) ان کے قلوب (کے ریشے ریشے) میں وہی گوسالہ پیوست ہو گیا تھا، ان کے کفر (سابق) کی وجہ سے (جبکہ دریائے شور سے اتر کر انہوں نے ایک بت پرست قوم کو دیکھ کر درخواست کی تھی کہ

ہمارے لئے کوئی ایسا ہی مجسم معبود تجویز کر دیا جائے، آپ فرمادیجئے کہ (دیکھ لیا تم نے اپنے ایمان مزعوم کے افعال کو، سو) یہ افعال تو بہت برے ہیں، جن کی تعلیم تمہارا ایمان تم کو کر رہا ہے، اگر تم (بزعم خود آب بھی) اہل ایمان ہو (یعنی یہ ایمان نہیں ہے)۔

فائدہ:- اس آیت میں جو اسباب اور مسببات مذکور ہیں، اُن کی ترتیب کا حاصل یہ ہے کہ دریائے شور سے پار ہو کر ان سے ایک کلمہ کفر کا صدور ہوا، ہر چند موسیٰ علیہ السلام کی ڈانٹ ڈپٹ سے توبہ کر لی، لیکن توبہ کے مراتب بھی مختلف ہوتے ہیں، اعلیٰ درجہ کی توبہ نہ ہونے کے سبب اس کی ظلمت قلب میں کچھ باقی رہ گئی تھی، وہ ترقی پا کر گوسالہ پرستی کا سبب بن گئی، پھر اس کی توبہ میں بعضوں کو قتل ہونا پڑا، اور بعض کو غالباً بلاقفل معافی ہو گئی ہو، جیسا کہ بعض مفسرین نے ذکر بھی کیا ہے، اُن کی توبہ بھی کچھ ضعیف ہوئی ہوگی، اور جو گوسالہ پرستی سے محفوظ رہے تھے ان کو بھی گوسالہ پرستوں سے جس قدر نفرت واجب تھی اس میں کوتاہی ہونے سے ایک گونہ اثر اس معصیتِ شرکیہ کا ان کے قلب میں باقی تھا، بہر حال ضعیف توبہ یا کفر سے نفرت نہ ہونے کے آثار باقی رہنے نے دلوں میں دین سے سستی پیدا کر دی، جس سے اخذِ ميثاق میں کوہ طور کو ان پر معلق کرنے کی نوبت آئی۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ لَكُمْ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّنْ دُونِ النَّاسِ

کہہ دے کہ اگر ہے تمہارے واسطے آخرت کا گھر اللہ کے ہاں تنہا سوا اور لوگوں کے،

فَتَسَوُا الْبُوتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۙ وَلَنْ يَتَمَوَّهَ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ

تو تم مرنے کی آرزو کرو اگر تم سچ کہتے ہو۔ اور ہرگز آرزو نہ کریں گے موت کی کبھی بسبب اُن گناہوں کے کہ بھیج چکے ہیں

أَيُّدِيهِمْ ۖ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۙ

ان کے ہاتھ اور اللہ خوب جانتا ہے گنہگاروں کو۔

آسان ترجمہ قرآن

آپ (اُن سے) کہئے کہ: ”اگر اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لئے

مخصوص ہے (جیسا کہ تمہارا کہنا ہے) تو موت کی تمنا تو کر کے دکھاؤ، اگر واقعی سچے ہو، ﴿۹۶﴾ اور (ہم بتائے دیتے ہیں کہ) انہوں نے اپنے جو کرتوت آگے بھیج رکھے ہیں، ان کی وجہ سے یہ کبھی ایسی تمنا نہیں کریں گے۔ اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے ﴿۹۷﴾

خلاصہ تفسیر

(بعض یہودی یہ دعویٰ کرتے تھے کہ آخرت کی نعمتیں خالص ہمارا ہی حق ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس دعوے کو باطل کرنے کے لئے فرمایا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (ان لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ اگر (بقول تمہارے) عالم آخرت محض تمہارے ہی لئے نافع ہے بلا شرکت غیرے تو تم (اس کی تصدیق کے لئے ذرا) موت کی تمنا کر کے دکھلا دو اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو، اور (ہم ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ) یہ لوگ ہرگز کبھی اس (موت) کی تمنا نہ کریں گے، بوجہ (خوفِ سزا) ان اعمال (کفریہ) کے جو اپنے ہاتھوں سمیٹتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو خوب اطلاع ہے ان ظالموں (کے حال) کی (جب مقدمہ کی تاریخ آئے گی فرد قرار داد جرم سنا کر سزا کا حکم کر دیا جائے گا)۔

فائدہ: قرآن کی بعض اور آیات سے بھی اُن کے اس دعویٰ کا مفہوم نکلتا ہے جیسا کہ: وَقَالُوا لَنْ تَسْمَنَّا تَأْتُرْنَا إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً (البقرة: ۸۰)، وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارًا (البقرة: ۱۱۱)، وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ (المائدة: ۱۸) وغیرہا۔

ان سب دعووں کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم دین حق پر ہیں، لہذا آخرت میں ہم کو تو ضرور نجات ملے گی، ہم میں سے جو تائب یا مرحوم ہیں اُن کو تو ابتدا ہی سے جنت میں داخلہ مل جائے گا، اور جو گنہگار ہیں وہ چند روزہ عذاب بھگت کر نجات پا جائیں گے، اور جو مطیع ہیں وہ بمثل ابناء و احباء محبوب و مقرب ہیں۔

بعض عنوانات کے قبح سے قطع نظر، یہ دعوے دین حق پر قائم ہونے کی صورت میں فی نفسہ تو درست و صادق ہیں، لیکن چونکہ وہ لوگ اپنے دین کے منسوخ ہو جانے کی بنا پر حق پر نہ رہے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے جا بجا مختلف عنوانات اور طریقوں سے ان کی تکذیب فرمائی، یہاں ایک خاص طریقہ ذکر کیا گیا کہ اگر عام عادت کے مطابق بحث اور دلائل سے فیصلہ نہیں کرتے تو آ و مافوق العادة طریقہ یعنی معجزے کے ذریعے اس میں نہ زیادہ علم و فہم کی ضرورت ہے نہ غائر نظر درکار،

۱ ترجمہ: اور یہودیوں نے کہا ہے کہ ہمیں کتنی کے چند دنوں کے علاوہ آگ ہرگز نہیں چھوئے گی۔

۲ ترجمہ: اور یہ (یعنی یہودی اور عیسائی) کہتے ہیں کہ: ”جنت میں سوائے یہودیوں یا عیسائیوں کے کوئی بھی ہرگز داخل نہیں ہوگا۔“

۳ ترجمہ: یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ”ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔“

صرف زبان ہلانے کی ضرورت ہے، مگر ہم پیشین گوئی کرتے ہیں کہ تم زبان سے یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ ”ہم موت کی تمنا کرتے ہیں۔“

اس پیشین گوئی کے بعد ہم کہتے ہیں کہ اگر تم اپنے دعووں میں سچے ہو تو یہ کلمہ کہہ دو، نہ کہا تو پھر تمہارا جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے گا۔

چونکہ اُن کو اپنا باطل اور کفر پر ہونا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین کا حق پر ہونا اُن پر خوب واضح و روشن تھا، اس لئے یا تو ایسی ہیبت چھائی کہ زبان ہی نہ اُٹھی، یا وہ ڈر گئے کہ تم نے یہ کلمہ منہ سے نکالا اور موت نے آدب چا، اور پھر سیدھے جہنم رسید ہوئے، ورنہ اُن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو عداوت و دشمنی تھی اس کے پیش نظر تو ان کو یہ سن کر جوش میں آجانا چاہئے تھا، اور یہ کلمات ضرور کہہ دینے چاہئے تھے۔

در حقیقت اسلام کی حقانیت کے ثبوت کے لئے یہ واقعہ بہت کافی ہے۔

یہاں دو باتیں اور قابل ذکر ہیں :-

اول تو یہ کہ یہ استدلال ان یہودیوں کے ساتھ تھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے، اور جنہوں نے آپ کو نبی پہچاننے کے بعد عناد و عداوت کی بنا پر آپ کا انکار کیا، ہر زمانے کے یہود سے یہ خطاب نہیں۔

دوسرے یہ شبہ بھی نہیں ہونا چاہئے کہ تمنا کرنا دل اور زبان دونوں سے ہوتا ہے، ممکن ہے انہوں نے دل سے تمنا کی ہو۔ اول تو یہ اس لئے صحیح نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان **وَلَنْ يَسْمُوكَ** اس کی صاف تردید کر رہا ہے، دوسرے اگر وہ دل سے تمنا کرتے تو زبان سے ضرور اس کا اظہار کرتے، کیونکہ اس میں تو اُن کی جیت تھی، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانے کا اچھا موقع تھا۔

اور یہ شبہ بھی نہ کرنا چاہئے کہ انہوں نے تمنا کی ہو، مگر اس کی شہرت نہ ہوئی ہو۔ یہ اس لئے صحیح نہیں کہ اسلام کے ہمدرد و معاونین کی تعداد کے مقابلہ میں معاندین و مخالفین کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی، اگر ایسی بات ہوئی ہوتی تو وہ خود اس کو خوب خوب اچھا لیتے کہ دیکھ لو تم نے جو معیار حق و صداقت مقرر کیا تھا اس پر بھی ہم پورے اترے۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيٰوَةٍ ۖ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ۚ

اور تو دیکھے گا اُن کو سب لوگوں سے زیادہ حریص زندگی پر، اور زیادہ حریص مشرکوں سے بھی،

يَوْمَ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِزَحْزِحٍ مِنَ الْعَذَابِ

چاہتا ہے ہر ایک ایک ان میں کا کہ عمر پاوے ہزار برس، اور نہیں اس کو بچانے والا عذاب سے

أَنْ يُعَمَّرَ ۖ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿۹۶﴾

اس قدر جینا، اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

آسان ترجمہ قرآن

(بلکہ) یقیناً تم ان لوگوں کو پاؤ گے کہ انہیں زندہ رہنے کی حرص دوسرے تمام انسانوں سے زیادہ ہے، یہاں تک کہ مشرکین سے بھی زیادہ۔ ان میں کا ایک ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ ایک ہزار سال عمر پائے، حالانکہ کسی کا بڑی عمر پالینا اسے عذاب سے دُور نہیں کر سکتا۔ اور یہ جو عمل بھی کرتے ہیں اللہ اسے اچھی طرح دیکھ رہا ہے ﴿۹۶﴾

خلاصہ تفسیر

اور (وہ لوگ موت کی تمنا کیا خاک کرتے) آپ (تو) ان کو حیات (دُنیویہ) کا حریص (اور عام) آدمیوں سے (بھی) بڑھ کر پائیں گے، اور (اوروں کا تو کیا ذکر، حیرت تو یہ ہے کہ بعض) مشرکین سے بھی (بڑھ کر آپ ان کو حیات کا حریص دیکھیں گے، اور ان کی یہ کیفیت ہے کہ) ان میں کا ایک ایک (شخص) اس ہوس میں ہے کہ اس کی عمر ہزار برس کی ہو جائے اور (بھلا بالفرض اگر اتنی عمر ہو بھی گئی تو کیا) یہ امر عذاب سے تو بچا نہیں سکتا، کہ (کسی کی) بڑی عمر ہو جائے اور حق تعالیٰ کے سب پیش نظر ہیں ان کے اعمال (بد جس پر ان کو عذاب ہونے والا ہے)۔

فائدہ:- اس میں حیرت و استبعاد کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین عرب تو آخرت کے منکر تھے، ان کی بہار اور عیش تو جو کچھ ہے دُنیا ہی ہے، اس لئے وہ اگر طولِ عمر کی تمنا کریں تو چنداں عجب نہیں، مگر یہود تو آخرت کے قائل اور بزعم خود آخرت کی نعمتوں کا اپنے آپ ہی کو مستحق کہتے تھے، پھر بھی وہ دُنیا میں رہنے کی تمنا کریں، یہ ہے حیرت و تعجب کی بات۔ پس باوجود اعتقادِ آخرت کے طولِ عمر کی تمنا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نعمتِ اُخروی کا اپنے آپ کو مستحق سمجھنے کا دعویٰ صرف دعویٰ ہی ہے، حقیقت جو ہے اس کو یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ وہاں پہنچ کر جہنم ہی ٹھکانا بنے گا، اس لئے جب تک بچے رہیں تب تک ہی سہی۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا

تو کہہ دے: جو کوئی ہووے دشمن جبریل کا، سو اس نے تو اتارا ہے یہ کلام تیرے دل پر اللہ کے حکم سے کہ سچا بتانے والا ہے

لِبَّابَيْنِ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ

اس کلام کو جو اس کے پہلے ہے اور راہ دکھاتا ہے اور خوش خبری سناتا ہے ایمان والوں کو، جو کوئی ہووے دشمن اللہ

وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَلَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ ﴿۹۸﴾

کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے پیغمبروں کا اور جبریل اور میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے ان کافروں کا۔

آسان ترجمہ قرآن

(اے پیغمبر!) کہہ دو کہ اگر کوئی شخص جبریل کا دشمن ہے تو (ہوا کرے) انہوں نے تو یہ کلام اللہ کی اجازت سے تمہارے دل پر اتارا ہے جو اپنے سے پہلے کی کتابوں کی تصدیق کر رہا ہے، اور ایمان والوں کے لئے مجسم ہدایت اور خوشخبری ہے ﴿۹۷﴾ اگر کوئی شخص اللہ کا، اس کے فرشتوں اور رسولوں کا، اور جبریل اور میکائیل کا دشمن ہے تو (وہ سن رکھے کہ) اللہ کافروں کا دشمن ہے ﴿۹۸﴾

خلاصہ تفسیر

(بعض یہود نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سن کر کہ جبریل علیہ السلام وحی لاتے ہیں کہا کہ ان سے تو ہماری عداوت ہے، ہماری قوم پر واقعات ہائیکہ اور احکامات شاقہ انہی کے ذریعے آتے رہے ہیں، میکائیل خوب ہیں کہ بارش اور رحمت ان کے متعلق ہے، اگر وہ وحی لایا کرتے تو ہم مان لیتے، اس پر حق تعالیٰ رد فرماتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (ان سے) یہ کہئے کہ جو شخص جبریل سے عداوت رکھے (وہ جانے، لیکن اس امر کو قرآن کے نہ ماننے میں کیا دخل؟ کیونکہ اس میں تو وہ سفیر محض ہیں) سو (سفارت کے طور پر) انہوں نے یہ قرآن پاک آپ کے قلب تک پہنچا دیا ہے خداوندی حکم سے (تو لانے والے کی خصوصیت کیوں دیکھی جاتی ہے؟ البتہ خود قرآن کو دیکھو کہ کیسا ہے، سو) اس کی (خود) یہ حالت ہے کہ تصدیق کر رہا ہے اپنے سے قبل والی (آسمانی) کتابوں کی اور رہنمائی کر رہا ہے (مصالح ضروریہ کی) اور

خوشخبری سنارہا ہے ایمان والوں کو (اور کتبِ سماویہ کی یہی شان ہوتی ہے، پس قرآن ہر حال میں کتابِ سماوی اور قابلِ اتباع ٹھہرا، پھر جبریل علیہ السلام کی عداوت سے اس کو نہ ماننا نری حماقت ہے، اب رہا خود مسئلہ عداوتِ جبریل کا، سو اس کا فیصلہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے نزدیک خود اللہ تعالیٰ سے عداوت رکھنا یا اس کے دوسرے ملائکہ سے یا اس کے رسولوں سے، یا خود میکائیل سے، جن کی دوستی کا دم بھرتے ہیں، ان سب سے عداوت رکھنا اور جبریل سے عداوت رکھنا، یہ سب ہم پہلے شمار کئے جاتے ہیں، اور ان سب عداوتوں کا قانون یہ ہے کہ) جو (کوئی) شخص خدا تعالیٰ کا دشمن ہو (تو) اور فرشتوں کا ہو (تو) اور پیغمبروں کا ہو (تو) اور جبریل کا (ہو تو) اور میکائیل کا (ہو) تو (ان سب کا وبال یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ دشمن ہے ایسے کافروں کا۔

وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ ﴿٩٩﴾

اور ہم نے اُتاریں تیری طرف آیتیں روشن اور انکار نہ کریں گے اُن کا مگر وہی جو نافرمان ہیں۔

آسان ترجمہ قرآن

اور بیشک ہم نے آپ پر ایسی آیتیں اُتاری ہیں جو حق کو آشکار کرنے والی ہیں، اور اُن کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں

جو نافرمان ہیں ﴿۹۹﴾

خلاصہ تفسیر

اور (بعض یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ آپ پر کوئی ایسی دلیل واضح نازل نہ ہوئی جس کو ہم بھی جانتے پہچانتے، اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ وہ تو ایک ہی واضح دلیل کو لئے پھرتے ہیں) ہم نے تو آپ کے پاس بہت سے دلائل واضح نازل کئے ہیں، (جن کو وہ بھی خوب جانتے پہچانتے ہیں، سو ان کا انکار نہ جاننے کی بنا پر نہیں، بلکہ یہ انکار عدول حکمی کی عادت کی وجہ سے ہے) اور (قاعدہ کلیہ ہے کہ) کوئی انکار نہیں کیا کرتا (ایسے دلائل کا) مگر صرف وہی لوگ جو عدول حکمی کے عادی ہیں۔

أَوْ كَلَّمَا عَهْدٌ وَأَعْهَدَ ابْنُ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ ۖ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۱۰۰﴾

کیا جب کبھی باندھیں گے کوئی قرار تو پھینک دے گی اس کو ایک جماعت اُن میں سے بلکہ ان میں اکثر یقین نہیں کرتے۔

آسان ترجمہ قرآن

یہ آخر کیا معاملہ ہے کہ ان لوگوں نے جب کوئی عہد کیا، ان کے ایک گروہ نے اسے ہمیشہ توڑ پھینکا؟ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ ایمان لاتے ہی نہیں ۱۰۱

خلاصہ تفسیر

(بعض یہود کو جو وہ عہد یاد دلایا گیا جو ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے باب میں توراہ میں لیا گیا تھا، تو انہوں نے خود عہد لینے ہی سے صاف انکار کر دیا، اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ) کیا (اس عہد لینے سے ان کو انکار ہے) اور (ان کی تو یہ حالت ہے کہ انہوں نے اپنے مسلم عہدوں کو بھی کبھی پورا نہیں کیا، بلکہ) جب کبھی بھی ان لوگوں نے (دین کے متعلق) کوئی عہد کیا ہوگا (ضرور) اس کو ان میں سے کسی نہ کسی فریق نے نظر انداز کر دیا ہوگا، بلکہ ان (تعمیل عہد نہ کرنے والوں) میں زیادہ تو ایسے ہی نکلیں گے جو (سرے سے اس عہد کا) یقین ہی نہیں رکھتے (سو تعمیل نہ کرنا تو فسق تھا ہی، یہ یقین نہ کرنا اس سے بڑھ کر کفر ہے)۔

فائدہ:- اور ایک جماعت کی تخصیص اس لئے کی گئی کہ بعضے ان میں سے ان عہد کو پورا بھی کرتے تھے، حتیٰ کہ آخر میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لے آئے۔

وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ

اور جب پہنچا ان کے پاس رسول، اللہ کی طرف سے تصدیق کرنے والا اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے تو پھینک دیا

فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ ۚ كَتَبَ اللَّهُ وَرَأَوْا ظُهُورَهُمْ لَكَاظِمًا

ایک جماعت نے اہل کتاب سے کتاب اللہ کو اپنی پیٹھ کے پیچھے گویا کہ وہ

لَا يَعْلَمُونَ ۝۱۰۱

جانتے ہی نہیں۔

آسان ترجمہ قرآن

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول آئے جو اُس (توراة) کی تصدیق کر رہے تھے جو ان کے پاس ہے، تو اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب (توراة و انجیل) کو اس طرح پس پشت ڈال دیا گویا وہ کچھ جانتے ہی نہ تھے (کہ اس میں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا ہدایات دی گئی تھیں) ⑩

خلاصہ تفسیر

(اس آیت میں ایک خاص عہد شکنی کا ذکر فرماتے ہیں، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے میں کلام تھا، ارشاد ہوتا ہے) اور جب ان کے پاس ایک (عظیم الشان) پیغمبر آئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو (رسول ہونے کے ساتھ) تصدیق بھی کر رہے ہیں اُس کتاب کی جو ان لوگوں کے پاس ہے (یعنی توراة کی، کیونکہ اس میں آپ کی نبوت کی خبر ہے، تو اس حالت میں آپ پر ایمان لانا عین توراة پر عمل تھا، جس کو وہ بھی کتاب اللہ جانتے ہیں، مگر باوجود اس کے بھی) ان اہل کتاب میں سے ایک فریق نے خود اس کتاب اللہ ہی کو اس طرح پس پشت ڈال دیا جیسے ان کو (اس کے مضمون کا یا کتاب اللہ ہونے کا) گویا اصلاً علم ہی نہیں۔

وَاتَّبِعُوا مَا تَتْلُو الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكٍ سُلَيْمٍ ۖ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٌ وَلٰكِنَّ

اور پیچھے ہوئے اُس علم کے جو پڑھتے تھے شیطان سلیمان کی بادشاہت کے وقت اور کفر نہیں کیا سلیمان نے لیکن

الشَّيَاطِينُ كَفَرُوا يَعْلَمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ ۖ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ

شیطانوں نے کفر کیا کہ سکھلاتے تھے لوگوں کو جادو، اور اس علم کے پیچھے ہوئے جو اترے دو فرشتوں پر شہر بابل میں

هَارُوتَ وَمَارُوتَ ۚ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ

جن کا نام ہاروت اور ماروت ہے، اور نہیں سکھاتے تھے وہ دونوں فرشتے کسی کو جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو

فِتْنَةً فَلَا تَكْفُرُ ۖ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ

آزمائش کے لئے ہیں سو تو کافر مت ہو، پھر ان سے سیکھتے وہ جادو جس سے جدائی ڈالتے ہیں مرد میں

وَزَوْجِهِ ۖ وَمَا هُمْ بِضَآرِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَيَتَعَلَّمُونَ ۖ

اور اس کی عورت میں، اور وہ اس سے نقصان نہیں کر سکتے کسی کا بغیر حکم اللہ کے، اور سیکھتے ہیں

مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۖ وَلَقَدْ عَلِمُوا لِنِ اشْتَرَاهُ مَالَهُ فِي الْآخِرَةِ

وہ چیز جو نقصان کرے ان کا اور فائدہ نہ کرے، اور خوب جان چکے ہیں کہ جس نے اختیار کیا جادو کو نہیں اس کے لئے آخرت میں

مِنْ خَلْقٍ ۖ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ ۖ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝۱۰۲ وَلَوْ

کچھ حصہ، اور بہت ہی بری چیز ہے جس کے بدلے بیچا انہوں نے اپنے آپ کو اگر ان کو سمجھ ہوتی۔ اور اگر

أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَشَوْا بَشُوبَةً مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ خَيْرٌ ۖ لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝۱۰۳

وہ ایمان لاتے اور تقویٰ کرتے تو بدلہ پاتے اللہ کے ہاں سے بہتر، اگر ان کو سمجھ ہوتی۔

آسان ترجمہ قرآن

اور یہ (بنی اسرائیل) اُن (منتروں) کے پیچھے لگ گئے جو سلیمان (علیہ السلام) کی سلطنت کے زمانے میں شیاطین پڑھا کرتے تھے۔ اور سلیمان (علیہ السلام) نے کوئی کفر نہیں کیا تھا، البتہ شیاطین لوگوں کو جادو کی تعلیم دے کر کفر کا ارتکاب کرتے تھے۔ نیز (یہ بنی اسرائیل) اُس چیز کے پیچھے لگ گئے جو شہرِ بابل میں ہاروت اور ماروت نامی دو فرشتوں پر نازل کی گئی تھی۔ یہ دو فرشتے کسی کو اس وقت تک کوئی تعلیم نہیں دیتے تھے جب تک اس سے یہ نہ کہہ دیں کہ: ”ہم محض آزمائش کے لئے (بھیجے گئے) ہیں، لہذا تم (جادو کے پیچھے لگ کر) کفر اختیار نہ کرنا۔“ پھر بھی یہ لوگ اُن سے وہ چیزیں سیکھتے تھے جس کے ذریعے مرد اور اس کی بیوی میں جدائی پیدا کر دیں۔ (ویسے یہ واضح رہے کہ) وہ اس کے ذریعے کسی کو اللہ کی مشیت کے بغیر کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ (مگر) وہ ایسی باتیں سیکھتے تھے جو اُن کے لئے نقصان دہ تھیں، اور

فائدہ مند نہ تھیں۔ اور وہ یہ بھی خوب جانتے تھے کہ جو شخص ان چیزوں کا خریدار بنے گا، آخرت میں اُس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ چیز بہت بُری تھی جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانیں بیچ ڈالیں۔ کاش کہ ان کو (اس بات کا حقیقی) علم ہوتا۔ ۱۰۲ اور (اس کے برعکس) اگر وہ ایمان اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کے پاس سے ملنے والا ثواب یقیناً کہیں زیادہ بہتر ہوتا۔ کاش کہ اُن کو (اس بات کا بھی حقیقی) علم ہوتا۔ ۱۰۳

خلاصہ تفسیر

اور (یہودی ایسے بے عقل ہیں کہ) انہوں نے (کتاب اللہ کا تو اتباع نہ کیا اور) ایسی چیز کا (یعنی سحر و جادو کا) اتباع (اختیار) کیا جس کا چرچا کیا کرتے تھے شیاطین، (یعنی خبیث جن) حضرت سلیمان علیہ السلام کے (عہد) سلطنت میں اور (بعضے بیوقوف جو حضرت سلیمان علیہ السلام پر گمانِ سحر رکھتے ہیں بالکل ہی لغوبات ہے، کیونکہ سحر تو اعتقادِ اُیماً عملاً کفر ہے اور) حضرت سلیمان علیہ السلام نے (نعوذ باللہ کبھی) کفر نہیں کیا، مگر (ہاں) شیاطین (یعنی خبیث جن بے شک) کفر (کی باتیں اور کام یعنی سحر) کیا کرتے تھے، اور حالت یہ تھی کہ (خود تو کرتے ہی اور) آدمیوں کو بھی (اس) سحر کی تعلیم کیا کرتے تھے (سو وہی سحر متواتر چلا آ رہا ہے اس کا اتباع یہ یہودی کرتے ہیں) اور (اسی طرح) اس (سحر) کا بھی (یہ لوگ اتباع کرتے ہیں) جو کہ اُن دونوں فرشتوں پر (ایک خاص حکمت کے واسطے) نازل کیا گیا تھا (جو شہر) بابل میں (رہتے تھے) جن کا نام ہاروت و ماروت تھا، اور وہ دونوں (وہ سحر) کسی کو نہ بتلاتے جب تک (احتیاطاً پہلے) یہ (نہ) کہہ دیتے کہ ہمارا وجود بھی (لوگوں کے لئے) ایک امتحان (خداوندی) ہے (کہ ہماری زبان سے سحر پر مطلع ہو کر کون پھنستا ہے اور کون بچتا ہے) سو تو (اس پر مطلع ہو کر) کہیں کا فرمت بن جائیو (کہ اس میں پھنس جاؤ) سو (بعضے) لوگ ان دونوں (فرشتوں) سے اس قسم کا سحر سیکھ لیتے تھے جس کے ذریعے سے (عمل کر کے) کسی مرد اور اس کی بیوی میں تفریق پیدا کر دیتے تھے اور (اس سے کوئی وہم اور خوف میں نہ پھنس جاوے کہ جادوگر جو چاہے کر سکتا ہے کیونکہ یہ یقینی بات ہے کہ) یہ (ساحر) لوگ اس (سحر) کے ذریعے سے کسی کو (ذّرہ برابر) بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے مگر خدا ہی کے (تقدیری) حکم سے اور (ایسا سحر حاصل کر کے بس) ایسی چیزیں سیکھ لیتے ہیں جو (خود) ان کو (بوجہ گناہ کے) ضرر رساں ہیں اور (کسی معتد بہ درجہ میں) اُن کو نافع نہیں ہیں (تو یہودی بھی اتباعِ سحر سے بڑے ضرر میں ہوں گے) اور (یہ بات کچھ ہمارے ہی کہنے کی نہیں بلکہ) ضرور یہ (یہودی) بھی اتنا جانتے ہیں کہ جو شخص اس (سحر) کو (کتاب اللہ کے عوض) اختیار کرے ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ (باقی) نہیں، اور بے شک بُری ہے وہ چیز (یعنی جادو و کفر) جس میں وہ لوگ اپنی جان دے رہے ہیں، کاش! ان کو (اتنی) عقل ہوتی، اور اگر وہ لوگ (بجائے اس کفر و بد عملی کے) ایمان اور تقویٰ (اختیار) کرتے تو خدا تعالیٰ کے یہاں کا

معاوضہ (اس کفر و بد عملی سے ہزار درجے) بہتر تھا، کاش! (اتنی) عقل ہوتی۔

معارف مسائل

آیات مذکورہ کی تفسیر اور شان نزول میں نقل کی ہوئی اسرائیلی روایات سے بہت سے لوگوں کو مختلف قسم کے شبہات پیش آتے ہیں، ان شبہات کا حل سیدی حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ نے نہایت واضح اور سہل انداز میں فرمایا ہے، اس جگہ اس کو بعینہ نقل کر دینا کافی ہے، وہ یہ ہے:-

۱- یہ بیوقوف لوگ جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف جادو کی نسبت کرتے تھے، یہودی تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے درمیان آیت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی براءت بھی ظاہر فرمادی۔

۲- ان آیتوں سے یہودیوں کی برائی کرنا مقصود ہے، کیونکہ ان میں جادو کا چرچا تھا، ان آیتوں کے متعلق زہرہ کا ایک لمبا چوڑا قصہ بھی مشہور ہے، جو کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں، جن علماء نے اس قصہ کو قواعد شرعیہ کے خلاف سمجھا ہے، رد کر دیا ہے، اور جنہوں نے اس میں تاویل کو خلاف شرع نہیں سمجھا ہے، رد نہیں کیا، ہمیں یہاں فی الوقت اس کے صحیح یا غلط ہونے سے بحث نہیں، البتہ اتنا ضرور ہے کہ ان آیات کی تفسیر اس قصہ پر موقوف نہیں، جیسے کہ ناظرین کو معارف و مسائل کے اس زیر عنوان مضمون سے اندازہ ہو جائے گا۔

۳- اور یہودی سب باتوں کے جاننے کے باوجود چونکہ عمل علم کے خلاف کرتے تھے، اور تدبر سے کام نہ لیتے تھے، اس لئے اول تو ان کے جاننے کی خبر دی، اور پھر آخر میں یہ کہہ کر اس کی نفی بھی کر دی کہ ”کاش! ان کو علم و عقل ہوتی“ کیونکہ جس علم پر عمل اور تدبر نہ ہو وہ جہل کی مانند ہے۔

۴- ایک زمانے میں جس کی پوری تعیین میں کوئی محققانہ رائے اس وقت سامنے نہیں، دُنیا میں اور خصوصاً ”بابل“ میں جادو کا بہت چرچا تھا، اور اس کے عجیب اثرات کو دیکھ کر جاہلوں کو اس کی حقیقت اور انبیائے کرام کے معجزات کی حقیقت میں اختلاط و اشتباہ ہونے لگا، اور بعض لوگ جادو گروں کو مقدس اور قابلِ اتباع سمجھنے لگے، اور بعض لوگ جادو کو نیک کام سمجھ کر اس کو سیکھنے اور اس پر عمل کرنے لگے، جیسا موجودہ دور میں مسمریزم کے ساتھ لوگوں کا معاملہ ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اشتباہ اور غلطی کے رفع کرنے کے لئے بابل میں دو فرشتے ہاروت و ماروت نامی اس کام کے لئے بھیجے کہ لوگوں کو سحر کی حقیقت اور اس کے شعبوں سے مطلع کر دیں تاکہ اشتباہ جاتا رہے، اور جادو پر عمل کرنے، نیز جادو گروں کے اتباع کرنے سے اجتناب کر سکیں، اور جس طرح انبیاء علیہم السلام کی نبوت کو معجزات و دلائل سے ثابت کر دیا جاتا ہے، اسی طرح ہاروت و ماروت کے فرشتہ ہونے پر دلائل قائم کر دیئے گئے، تاکہ ان احکامات و ارشادات کی تعمیل و اطاعت ممکن ہو۔

اور یہ کام انبیائے کرام سے اس لئے نہیں لیا گیا کہ اول تو انبیاء اور جادوگروں میں امتیاز و فصل کرنا مقصود تھا، ایک حیثیت سے گویا انبیائے کرام ایک فریق کا درجہ رکھتے تھے، اس لئے حکم فریقین کے علاوہ کوئی اور ثالث ہونا مناسب تھا۔

دوسرے اس کام کی تکمیل بغیر جادو کے الفاظ کی نقل و حکایت کے عادی ہونہ سکتی تھی، اگرچہ نقل کفر کفر نباشد کے عقلی و نقلی مسئلہ قاعدہ کے مطابق ایسا ہو سکتا تھا، مگر چونکہ حضرات انبیائے کرام مظہر ہدایت ہوتے تھے، اس لئے ان سے یہ کام لینا مناسب نہ سمجھا گیا، لہذا فرشتوں کو اس کام کے لئے تجویز کیا گیا، کیونکہ کارخانہ تکوین میں جو خیر و شر سب پر مشتمل ہوتا ہے، ان فرشتوں سے ایسے کام بھی لئے جاتے ہیں جو مجموعہ عالم کے اعتبار سے توجہ مصالح عامہ خیر ہوں، لیکن لزوم مفسدہ کے سبب فی ذاتہ شر ہوں، جیسے کسی ظالم و جابر یا موذی جانور وغیرہ کی نشوونما اور غور و پرداخت کہ تکوینی اعتبار سے درست و محمود ہے، اور تشریحی لحاظ سے نادرست و مذموم، بخلاف انبیائے کرام علیہم السلام کے کہ ان سے خاص تشریعیات کا کام ہی لیا جاتا ہے جو خصوصاً و عموماً خیر ہی خیر ہوتا ہے، اور گو کہ یہ نقل و حکایت مذکورہ غرض کے لحاظ سے ایک تشریحی کام ہی تھا، لیکن پھر بھی بوجہ احتمال قریب اس امر کے کہ کہیں یہ نقل و حکایت بھی جادو پر عمل کا سبب نہ بن جائے، جیسا کہ واقع میں ہوا، تو حضرات انبیاء کو اس کا سبب بواسطہ نقل بنانا بھی پسند نہیں کیا گیا۔

البتہ کلیات شرعیہ سے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ بھی اس مقصود کی تکمیل کر دی گئی، ان کلیات کے جزئیات کی تفصیلات بوجہ احتمال فتنہ انبیائے کرام کے ذریعہ بیان نہیں کی گئیں، اس کی مثال ایسی ہے کہ مثلاً انبیائے کرام نے یہ بتایا ہے کہ رشوت لینا حرام ہے، اور اس کی حقیقت بھی بتلا دی، لیکن یہ جزئیات نہیں بتلائے کہ ایک طریقہ رشوت کا یہ ہے کہ صاحب معاملہ سے یوں چال کر کے فلاں بات کہے، وغیرہ وغیرہ، کیونکہ اس طرح کی تفصیلات بیان کرنے سے تو لوگ اور ترکیبیں سیکھ سکتے ہیں، یا مثلاً اقسام سحر ہی میں مثال فرض کیجئے کہ قواعد کلیہ سے یہ بتلادیا گیا ہے کہ دست غیب کا عمل جس میں تیکے کے نیچے یا جیب میں رکھے ہوئے روپے مل جائیں ناجائز ہے، لیکن یہ نہیں بتلایا کہ فلاں عمل پڑھنے سے اس طرح روپیہ ملنے لگتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ فرشتوں نے بابل میں آکر اپنا کام شروع کر دیا، کہ سحر کے اصول و فروع ظاہر کر کے لوگوں کو اس کے عمل بد سے بچنے کی اور ساحرین سے نفرت و دوری رکھنے کی تنبیہ اور تائید کی، جیسے کوئی عالم دیکھے کہ جاہل لوگ اکثر نادانی سے کفریہ کلمات بک جاتے ہیں، اس لئے وہ تقریر یا تحریراً ان کلمات کو جو اس وقت شائع ہیں جمع کر کے عوام کو مطلع کر دے کہ دیکھو یہ کلمات بچنے کے لائق ہیں، ان سے احتیاط رکھنا۔

جب فرشتوں نے کام شروع کیا تو وقتاً فوقتاً مختلف لوگوں کی آمد و رفت ان کے پاس شروع ہوئی، اور وہ

درخواست کرنے لگے کہ ہم کو بھی ان اصول و فروع سے مطلع کر دیجئے، تاکہ ناواقفی سے کسی اعتقادی یا عملی فساد میں مبتلا نہ ہو جائیں، اس وقت فرشتوں نے بطور احتیاط و تبلیغ اور بنظر اصلاح یہ التزام کیا کہ اصول و فروع بتانے سے قبل یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ دیکھو ہمارے یہ بتانے کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کی آزمائش بھی مقصود ہے کہ دیکھیں ان چیزوں پر مطلع ہو کر کون شخص اپنے دین کی حفاظت و اصلاح کرتا ہے، کہ شر سے آگاہ ہو کر اس سے بچے، اور کون اپنا دین خراب کرتا ہے کہ اس شر پر مطلع ہو کر وہی شر خود اختیار کر لے، جس کا انجام کفر ہے، خواہ کفر عملی ہو یا اعتقادی، دیکھو ہم تم کو نصیحت کئے دیتے ہیں کہ اچھی نیت سے اطلاع حاصل کرنا اور پھر اسی نیت پر ثابت قدم رہنا، ایسا نہ ہو کہ ہم سے تو یہ کہہ کر سیکھ لو کہ میں بچنے کے لئے پوچھ رہا ہوں، اور پھر اس کی خرابی میں خود ہی مبتلا ہو جاؤ، اور ایمان برباد کر لو۔

اب ظاہر ہے کہ وہ اس سے زیادہ خیر خواہی اور کیا کر سکتے تھے، غرض جو کوئی ان سے اس طرح عہد و پیمان کر لیتا وہ اس کے روبرو جادو کے سب اصول و فروع بیان کر دیتے تھے، کیونکہ ان کا کام ہی یہ تھا، اب اگر کوئی عہد شکنی کر کے اپنے ارادہ و اختیار سے کافر و فاجر بنے وہ جانے۔ چنانچہ بعضے اس عہد پر قائم نہ رہے، اور اس جادو کو مخلوق کی ایذا رسانی کا ذریعہ بنالیا، جو فسق تو یقیناً ہے، اور بعضے طریقے اس کے استعمال کے کفر بھی ہیں، اس طرح سے فاجر کافر بن گئے۔

اس ارشاد اصلاحی اور پھر مخاطب کے خلاف کرنے کی مثال اس طرح ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص کسی جامع معقول و منقول، عالم باعمل کے پاس جائے کہ مجھ کو قدیم یا جدید فلسفہ پڑھا دیجئے، تاکہ خود بھی ان شبہات سے محفوظ رہوں جو فلسفہ میں اسلام کے خلاف بیان کئے جاتے ہیں، اور مخالفین کو بھی جواب دے سکوں، اور اس عالم کو یہ احتمال ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ کو دھوکہ دے کر پڑھ لے، اور پھر خود ہی خلاف شرع عقائد باطلہ کو تقویت دینے میں اس کو استعمال کرنے لگے، اس احتمال کی وجہ سے اس کو نصیحت کرے کہ ایسا مت کرنا اور وہ وعدہ کر لے، اور اس لئے اس کو پڑھا دیا جاوے، لیکن وہ شخص فلسفہ کے خلاف اسلام نظریات و عقائد ہی کو صحیح سمجھنے لگے تو ظاہر ہے کہ اس کی اس حرکت سے اس معلم پر کوئی ملامت یا برائی عائد نہیں ہو سکتی، اسی طرح اس اطلاع سحر سے ان فرشتوں پر بھی نہ کسی شبہ کی گنجائش ہے نہ وسوسے کی۔

اور اس فرض کی تکمیل کے بعد غالباً وہ فرشتے آسمان پر بلا لئے گئے ہوں گے، واللہ اعلم بحقیقۃ

الحال۔ (بیان القرآن)

سحر کی حقیقت

”سحر“ بالکسر لغت میں ہر ایسے اثر کو کہتے ہیں جس کا سبب ظاہر نہ ہو (قاموس)، خواہ وہ سبب معنوی ہو جیسے خاص

خاص کلمات کا اثر، یا غیر محسوس چیزوں کا ہو، جیسے جنات و شیاطین کا اثر، یا مسمریزم میں قوتِ خیالیہ کا اثر، یا محسوسات کا ہو مگر وہ محسوسات مخفی ہوں، جیسے مقناطیس کی کشش لوہے کے لئے جبکہ مقناطیس نظروں سے پوشیدہ ہو، یا دواؤں کا اثر جبکہ وہ دوائیں مخفی ہوں، یا نجوم و سیارات کا اثر۔

اسی لئے جادو کی اقسام بہت ہیں، مگر عرفِ عام میں عموماً جادو ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جن میں جنات و شیاطین کے عمل کا دخل ہو، یا قوتِ خیالیہ مسمریزم کا، یا کچھ الفاظ و کلمات کا، کیونکہ یہ بات عقلاً بھی ثابت ہے اور تجربہ و مشاہدہ سے بھی، اور قدیم و جدید فلاسفہ بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ حروف و کلمات میں بھی بالخاصہ کچھ تاثرات ہوتی ہیں، کسی خاص حرف یا کلمہ کو کسی خاص تعداد میں پڑھنے یا لکھنے وغیرہ سے خاص خاص تاثرات کا مشاہدہ ہوتا ہے، یا ایسی تاثرات جو کسی انسانی بالوں یا ناخنوں وغیرہ اعضاء یا اس کے استعمالی کپڑوں کے ساتھ کچھ دوسری چیزیں شامل کر کے پیدا کی جاتی ہیں جن کو عرفِ عام میں ٹونا ٹوٹکا کہا جاتا ہے، اور جادو میں شامل سمجھا جاتا ہے۔

اور اصطلاحِ قرآن و سنت میں ”سحر“ ہر ایسے امرِ عجیب کو کہا جاتا ہے جس میں شیاطین کو خوش کر کے ان کی مدد حاصل کی گئی ہو، پھر شیاطین کو راضی کرنے کی مختلف صورتیں ہیں، کبھی ایسے منتر اختیار کئے جاتے ہیں جن میں کفر و شرک کے کلمات ہوں اور شیاطین کی مدح کی گئی ہو، یا کواکب و نجوم کی عبادت اختیار کی گئی ہو، جس سے شیطان خوش ہوتا ہے۔ کبھی ایسے اعمال اختیار کئے جاتے ہیں جو شیطان کو پسند ہیں، مثلاً کسی کو ناحق قتل کر کے اس کا خون استعمال کرنا، یا جنابت و نجاست کی حالت میں رہنا، طہارت سے اجتناب کرنا وغیرہ۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کے پاک فرشتوں کی مدد، ان اقوال و افعال سے حاصل کی جاتی ہے جن کو فرشتے پسند کرتے ہیں، مثلاً تقویٰ، طہارت اور پاکیزگی، بدبو اور نجاست سے اجتناب، ذکر اللہ اور اعمالِ خیر۔

اسی طرح شیاطین کی امداد ایسے اقوال و افعال سے حاصل ہوتی ہے جو شیطان کو پسند ہیں، اسی لئے سحر صرف ایسے ہی لوگوں کا کامیاب ہوتا ہے جو گندے اور نجس رہیں، پاکی اور اللہ کے نام سے دُور رہیں، خبیث کاموں کے عادی ہوں، عورتیں بھی ایامِ حیض میں یہ کام کرتی ہیں تو موثر ہوتا ہے، باقی شعبدے اور ٹوٹکے یا ہاتھ چالاک کے کام یا مسمریزم وغیرہ ان کو مجازاً سحر کہہ دیا جاتا ہے۔ (روح المعانی)

سحر کے اقسام

امام راغب اصفہانی ”مفردات القرآن“ میں لکھتے ہیں کہ سحر کی مختلف قسمیں ہیں۔

ایک قسم تو محض نظر بندی اور تخیل ہوتی ہے، جس کی کوئی حقیقتِ واقعہ نہیں، جیسے بعض شعبہ باز اپنی ہاتھ چالاکی سے ایسے کام کر لیتے ہیں کہ عام لوگوں کی نظریں اس کو دیکھنے سے قاصر رہتی ہیں، یا قوتِ خیالیہ مسمریزم وغیرہ کے ذریعہ کسی کے دماغ پر ایسا اثر ڈالا جائے کہ وہ ایک چیز کو آنکھوں سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے مگر اس کی کوئی حقیقتِ واقعہ نہیں ہوتی، کبھی یہ کام شیاطین کے اثر سے بھی ہو سکتا ہے کہ مسحور کی آنکھوں اور دماغ پر ایسا اثر ڈالا جائے جس سے وہ ایک غیر واقعی چیز کو حقیقت سمجھنے لگے، قرآن مجید میں فرعونی ساحروں کے جس سحر کا ذکر ہے وہ پہلی قسم کا سحر تھا، جیسا کہ ارشاد ہے:-

سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ (الاعراف: ۱۱۶) ”انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا۔“

اور ارشاد ہے:-

يُخَيِّلُ الْيَهُودُ مِنْ سِحْرِ هِمَّ أَنْهَاسُوعِي (طہ)

”اُن کے سحر سے موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں یہ آنے لگا کہ یہ رسیوں کے سانپ دوڑ رہے ہیں۔“

اس میں یُخَيِّلُ کے لفظ سے یہ بتلادیا گیا کہ یہ رسیاں اور لاٹھیاں جو ساحروں نے ڈالی تھیں نہ درحقیقت سانپ بنیں، اور نہ انہوں نے کوئی حرکت کی، بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوتِ متخیلہ متاثر ہو کر ان کو دوڑنے والے سانپ سمجھنے لگی۔ دوسری قسم اس طرح کی تخیل اور نظر بندی ہے جو بعض اوقات شیاطین کے اثر سے ہوتی ہے، جو قرآن کریم کے اس ارشاد سے معلوم ہوئی:-

هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَن تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ (۳۷) تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ (الشعراء)

”میں تمہیں بتلاتا ہوں کہ کن لوگوں پر شیطان اترتے ہیں، ہر بہتان باندھنے والے گناہگار پر اترتے ہیں۔“

نیز دوسری جگہ ارشاد ہے:-

وَلَكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ (البقرة: ۱۰۲)

”یعنی شیاطین نے کفر اختیار کیا، لوگوں کو جادو سکھانے لگے۔“

تیسری قسم یہ ہے کہ سحر کے ذریعے ایک شے کی حقیقت ہی بدل جائے، جیسے کسی انسان یا جاندار کو پتھریا کوئی جانور بنادیں۔ امام راغب اصفہانی، ابوبکر جصاص وغیرہ حضرات نے اس سے انکار کیا ہے کہ سحر کے ذریعے کسی چیز کی حقیقت بدل جائے، بلکہ سحر کا اثر صرف تخیل اور نظر بندی ہی تک ہو سکتا ہے، معتزلہ کا بھی یہی قول ہے، مگر جمہور علماء کی تحقیق یہ ہے کہ انقلابِ اعیان میں نہ کوئی عقلی امتناع نہ شرعی، مثلاً کوئی جسم پتھر بن جائے، یا ایک نوع سے دوسری نوع کی طرف منقلب ہو جائے۔

اور فلاسفہ کا جو یہ قول مشہور ہے کہ انقلاب حقائق ممکن نہیں، اُن کی مراد حقائق سے محال، ممکن، واجب کی حقیقتیں ہیں کہ ان میں انقلاب عقلاً ممکن نہیں، کہ کوئی محال ممکن بن جائے، یا کوئی ممکن محال بن جائے۔

اور قرآن عزیز میں فرعونی ساحروں کے سحر کو جو تخیل قرار دیا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر سحر تخیل ہی ہو، اس سے زائد کچھ نہ ہو، اور بعض حضرات نے سحر کے ذریعہ انقلاب حقیقت کے جواز پر حضرت کعب احبارؓ کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جو مؤطا امام مالکؒ میں بروایت قعقاع بن حکیم منقول ہے:-

لَوْلَا كَلِمَاتُ أَقْوَلُهُنَّ لَجَعَلْتَنِي الْيَهُودَ حِمَارًا۔

”اگر یہ چند کلمات نہ ہوتے جن کو میں پابندی سے پڑھتا ہوں تو یہودی مجھے گدھا بنا دیتے۔“

”گدھا بنا دینے“ کا لفظ مجازی طور پر بیوقوف بنانے کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے، مگر بلا ضرورت حقیقت کو چھوڑ کر مجاز مراد لینا صحیح نہیں، اس لئے حقیقی اور ظاہری مفہوم اس کا یہی ہے کہ اگر میں یہ کلمات روزانہ پابندی سے نہ پڑھتا تو یہودی جادوگر مجھے گدھا بنا دیتے۔

اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں، اول یہ کہ سحر کے ذریعے انسان کو گدھا بنا دینے کا امکان ہے، دوسرے یہ کہ جو کلمات وہ پڑھا کرتے تھے ان کی تاثیر یہ ہے کہ کوئی جادو اثر نہیں کرتا، حضرت کعب احبارؓ سے جب لوگوں نے پوچھا کہ وہ کلمات کیا تھے تو آپ نے یہ کلمات بتلائے:-

أَعُوذُ بِوَجْهِ اللَّهِ الْعَظِيمِ الَّذِي لَيْسَ شَيْءٌ أَعْظَمَ مِنْهُ وَبِكَلِمَاتِ اللَّهِ التَّامَّاتِ الَّتِي لَا يُجَاوِزُهَا بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ وَبِأَسْمَاءِ اللَّهِ الْحُسْنَى كُلِّهَا مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَمَا لَمْ أَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَبِرَّاءٍ وَذَرَاءٍ۔ (اخرجه فی المؤطا باب التَّعَوُّذِ عِنْدَ النَّوْمِ)

”میں اللہ عظیم کی پناہ پکڑتا ہوں جس سے بڑا کوئی نہیں، اور پناہ پکڑتا ہوں اللہ کے کلمات تامات کی جن سے کوئی نیک و بد انسان آگے نہیں نکل سکتا، اور پناہ پکڑتا ہوں اللہ کے تمام اسمائے حسنیٰ کی جن کو میں جانتا ہوں، اور جن کو نہیں جانتا، ہر اس چیز کے شر سے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا، اور وجود دیا اور پھیلا یا ہے۔“

خلاصہ یہ ہے کہ سحر کی یہ تینوں قسمیں ممکن الوقوع ہیں۔

سحر اور معجزے میں فرق

جس طرح انبیاء علیہم السلام کے معجزات یا اولیاء کی کبریات سے ایسے واقعات مشاہدے میں آتے ہیں جو عادی نہیں ہو سکتے، اسی لئے ان کو ”خرقِ عادت“ کہا جاتا ہے، بظاہر سحر اور جادو سے بھی ایسے ہی آثار مشاہدے میں آتے ہیں، اس لئے بعض جاہلوں کو ان دونوں میں التباس بھی ہو جاتا ہے، اور اس کی وجہ سے وہ جادو گروں کی تعظیم و تکریم کرنے لگتے ہیں، اس لئے دونوں کا فرق بیان کرنا ضروری ہے۔^۱

سو یہ فرق ایک تو اصل حقیقت کے اعتبار سے ہے اور ایک ظاہری آثار کے اعتبار سے، حقیقت کا فرق تو یہ ہے کہ سحر اور جادو سے جو چیزیں مشاہدے میں آتی ہیں، یہ دائرۂ اسباب سے الگ کوئی چیز نہیں، فرق صرف اسباب کے ظہور و خفاء کا ہے، جہاں اسباب ظاہر ہوتے ہیں وہ آثار ان اسباب کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں اور کوئی تعجب کی چیز نہیں سمجھی جاتی، لیکن جہاں اسباب مخفی ہوں تو وہ تعجب کی چیز ہوتی ہے، اور عوام اسباب کے نہ جاننے کی وجہ سے اس کو خرقِ عادت سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ وہ درحقیقت تمام عادی امور کی طرح کسی جن شیطان کے اثر سے ہوتی ہے۔ ایک خط مشرق بعید سے آج کا لکھا ہوا اچانک سامنے آ کر گر گیا، تو دیکھنے والے اس کو خرقِ عادت کہیں گے، حالانکہ جنات و شیاطین کو ایسے اعمال و افعال کی قوت دی گئی ہے، ان کا ذریعہ معلوم ہو تو پھر کوئی خرقِ عادت نہیں رہتا، خلاصہ یہ ہے کہ سحر سے ظاہر ہونے والے تمام آثار اسبابِ طبعیہ کے ماتحت ہوتے ہیں، مگر اسباب کے مخفی ہونے کے سبب لوگوں کو مغالطہ خرقِ عادت کا ہو جاتا ہے۔

بخلاف معجزہ کے کہ وہ بلا واسطہ فعلِ حق تعالیٰ کا ہوتا ہے، اس میں اسبابِ طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے نمرود کی آگ کو حق تعالیٰ نے فرما دیا کہ ابراہیم علیہ السلام کے لئے ٹھنڈی ہو جائے، مگر ٹھنڈک بھی اتنی نہ ہو جس سے تکلیف پہنچے، بلکہ جس سے سلامتی حاصل ہو، اس حکمِ الہی سے آگ ٹھنڈی ہو گئی۔

آج بھی بعض لوگ بدن پر کچھ دوائیں استعمال کر کے آگ کے اندر چلے جاتے ہیں، وہ معجزہ نہیں، بلکہ دواؤں کا اثر ہے، دوائیں مخفی ہونے سے لوگوں کو دھوکا خرقِ عادت کا ہو جاتا ہے۔

یہ بات کہ معجزہ براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، خود قرآن عزیز کی تصریح سے ثابت ہے، ارشاد فرمایا:-

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (الأنفال: ۱۷)

”کنکریوں کی مٹھی جو آپ نے پھینکی، درحقیقت آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی ہے۔“

مراد یہ ہے کہ ایک مٹھی خاک اور کنکری سارے مجمع کی آنکھوں تک پہنچ جانا اس میں آپ کے عمل کو کوئی دخل نہیں، یہ خالص حق تعالیٰ کا فعل ہے، یہ معجزہ غزوہ بدر میں پیش آیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مٹھی خاک اور سنگریزوں کی

کفار کے لشکر پر پھینکی (جو سب کی آنکھوں میں پڑ گئی)۔

معجزہ اور سحر کی حقیقتوں کا یہ فرق کہ معجزہ بلا واسطہ اسبابِ طبعیہ کے براہِ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، اور جادو اسبابِ طبعیہ مخفیہ کا اثر ہوتا ہے، حقیقت سمجھنے کے لئے تو کافی وافی ہے، مگر یہاں ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ عوام الناس اس فرق کو کیسے پہچانیں، کیونکہ ظاہری صورت دونوں کی ایک سی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ عوام کے پہچاننے کے لئے بھی حق تعالیٰ نے کئی فرق ظاہر کر دیئے ہیں:-

اول یہ کہ معجزہ یا کرامت ایسے حضرات سے ظاہر ہوتی ہے جن کا تقویٰ، طہارت و پاکیزگی اخلاق و اعمال کا سبب مشاہدہ کرتے ہیں، اس کے برعکس جادو کا اثر صرف ایسے لوگوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے جو گندے، ناپاک، اللہ کے نام سے اور اس کی عبادت سے دُور رہتے ہیں، یہ چیز ہر انسان آنکھوں سے دیکھ کر معجزہ اور سحر میں فرق پہچان سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ عادتہ اللہ یہ بھی جاری ہے کہ جو شخص معجزے اور نبوت کا دعویٰ کر کے کوئی جادو کرنا چاہے اس کا جادو نہیں چلتا، ہاں نبوت کے دعوے کے بغیر کرے تو چل جاتا ہے۔

کیا انبیاء پر بھی جادو کا اثر ہو سکتا ہے؟

جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے، وجہ وہی ہے جو اوپر بتلائی گئی کہ سحر در حقیقت اسبابِ طبعیہ ہی کا اثر ہوتا ہے، اور انبیاء علیہم السلام اسبابِ طبعیہ کے اثرات سے متاثر ہوتے ہیں، یہ تاثر شانِ نبوت کے خلاف نہیں، جیسے ان کا بھوک پیاس سے متاثر ہونا، بیماری میں مبتلا ہونا اور شفا پانا ظاہری اسباب سے سبب جانتے ہیں، اسی طرح جادو کے باطنی اسباب سے بھی انبیاء علیہم السلام متاثر ہو سکتے ہیں، اور یہ تاثر شانِ نبوت کے منافی نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہودیوں کا سحر کرنا اور اس کی وجہ سے آپ پر بعض آثار کا ظاہر ہونا اور بذریعہ وحی اس جادو کا پتہ لگنا اور اس کا ازالہ کرنا احادیثِ صحیحہ میں ثابت ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سحر سے متاثر ہونا خود قرآن میں مذکور ہے، آیات: يُخَيِّلُ الْيَوْمَ مِنْ سِحْرِهِمْ أَتَّهَاتَسْعَى ۝۲۱ اور فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُوسَى ۝۲۲ (طہ) موسیٰ علیہ السلام پر خوف طاری ہونا اسی جادو ہی کا تو اثر تھا۔

سحر کے احکام شرعیہ

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، قرآن و حدیث کی اصطلاح میں ”سحر“ صرف ایسے عمل کو کہا گیا ہے جس میں کفر و شرک اور فسق و فجور اختیار کر کے جنات و شیاطین کو راضی کیا گیا ہو، اور ان سے مدد لی گئی ہو، ان کی امداد سے کچھ عجیب

واقعات ظاہر ہو گئے ہوں، سحرِ بابل جس کا قرآن میں ذکر ہے وہ یہی تھا (بصّاص) ^[۱]، اور اسی سحر کو قرآن میں کفر قرار دیا ہے۔ ابو منصورؒ نے فرمایا کہ صحیح یہی ہے کہ مطلقاً سحر کی سب اقسام کفر نہیں، بلکہ صرف وہ سحر کفر ہے جس میں ایمان کے خلاف اقوال و اعمال اختیار کئے گئے ہوں۔ (روح المعانی) ^[۲]

اور یہ ظاہر ہے کہ شیاطین پر لعنت کرنے اور ان سے عداوت و مخالفت کرنے کے احکام قرآن و حدیث میں بار بار آئے ہیں، اس کے خلاف ان سے دوستی اور ان کو راضی کرنے کی فکر خود ہی ایک گناہ ہے، پھر وہ راضی جب ہی ہوتے ہیں جب انسان کفر و شرک میں مبتلا ہو جس سے ایمان ہی سلب ہو جائے، یا کم از کم فسق و فجور میں مبتلا ہو، اور اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی مرضیات کے خلاف گندہ اور نجس رہے، یہ مزید گناہ ہے، اور اگر جادو کے ذریعے کسی کو ناحق نقصان پہنچایا تو یہ اور گناہ ہے۔

غرض اصطلاح قرآن و سنت میں جس کو ”سحر“ کہا گیا ہے وہ کفرِ اعتقادی یا کم از کم کفرِ عملی سے خالی نہیں ہوتا، اگر شیاطین کو راضی کرنے کے لئے کچھ اقوال یا اعمال کفر و شرک کے اختیار کئے تو کفرِ حقیقی اعتقادی ہوگا، اور اگر کفر و شرک کے اقوال و افعال سے بچ بھی گیا مگر دوسرے گناہوں کا ارتکاب کیا تو کفرِ عملی سے خالی نہ رہا، قرآن عزیز کی آیات مذکورہ میں جو سحر کو کفر کہا گیا ہے وہ اسی اعتبار سے ہے کہ یہ سحر حقیقی اعتقادی یا کفرِ عملی سے خالی نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس سحر میں کوئی عمل کفر اختیار کیا گیا ہو جیسے شیاطین سے استغاثہ و استمداد یا کواکب کی تاثیر کو مستقل ماننا، یا سحر کو معجزہ قرار دے کر اپنی نبوت کا دعویٰ کرنا وغیرہ تو یہ سحر باجماع کفر ہے، اور جس میں یہ افعال کفر نہ ہوں مگر معاصی کا ارتکاب ہو وہ گناہ کبیرہ ہے۔

مسئلہ:- جب یہ معلوم ہو گیا کہ یہ سحر کفرِ اعتقادی یا عملی سے خالی نہیں تو اس کا سیکھنا اور سکھانا بھی حرام ہوا، اس پر عمل کرنا بھی حرام ہوا، البتہ اگر مسلمانوں سے دفع ضرر کے لئے بقدر ضرورت سیکھا جائے تو بعض فقہاء نے اجازت دی ہے۔ (شامی، عالمگیری) ^[۳]

مسئلہ:- تعویذ گندے وغیرہ جو عامل کرتے ہیں ان میں بھی اگر جنات و شیاطین سے استمداد ہو تو بحکم سحر ہیں، اور حرام ہیں، اور اگر الفاظ مشتبہ ہوں معنی معلوم نہ ہوں، اور شیاطین اور بتوں سے استمداد کا احتمال ہو تو بھی حرام ہے۔

مسئلہ:- قرآن و سنت کے اصطلاحی سحرِ بابل کے علاوہ باقی قسمیں سحر کی ان میں بھی اگر کفر و شرک کا ارتکاب کیا

[۱] احکام القرآن للجصاص، باب الاختلاف فی حکم السحر ج: ۱ ص: ۱۲۳

[۲] روح المعانی تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۳۲۷

[۳] شامی، مطلب السحر انواع ج: ۱ ص: ۴۵، عالمگیری، کتاب الکراهیة، الباب الثلاثون فی المتفرقات ج: ۵ ص: ۳۷۸

جائے تو وہ بھی حرام ہیں۔

مسئلہ:- اور خالی مباح اور جائز امور سے کام لیا جاتا ہو تو اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ اس کو کسی ناجائز مقصد کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔

مسئلہ:- اگر قرآن و حدیث کے کلمات ہی سے کام لیا جائے مگر ناجائز مقصد کے لئے استعمال کریں تو وہ بھی جائز نہیں، مثلاً کسی کو ناحق ضرر پہنچانے کے لئے کوئی تعویذ کیا جائے یا وظیفہ پڑھا جائے، اگرچہ وظیفہ اسمائے الہیہ یا آیات قرآنیہ ہی کا ہو، وہ بھی حرام ہے۔ (فتاویٰ قاضی خان و شامی)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوا^ط

اے ایمان والو! تم نہ کہو راعیناً اور کہو انظرنا اور سنتے رہو،

وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۰۴﴾

اور کافروں کو عذاب ہے دردناک۔

آسان ترجمہ قرآن

ایمان والو! (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر) ”راعیناً“ نہ کہا کرو، اور ”انظرنا“ کہہ دیا کرو۔ اور سنا کرو۔ اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے ﴿۱۰۴﴾

خلاصہ تفسیر

(بعض یہودیوں نے ایک شرارت ایجاد کی کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں آکر لفظ راعیناً سے آپ کو خطاب کرتے، جس کے معنی ان کی عبرانی زبان میں ایک بددعا کے ہیں، اور وہ اسی نیت سے کہتے تھے، مگر عربی زبان میں اس کے معنی ”ہماری مصلحت کی رعایت فرمائیے“ کے ہیں، اس لئے عربی داں اس شرارت کو نہ سمجھ سکتے تھے، اور اس اچھے معنی کے قصد سے بعض مسلمان بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کلمہ سے خطاب کرنے لگے، اس سے ان شریروں کو اور گنجائش ملی، آپس میں بیٹھ کر ہنستے تھے کہ اب تک تو ہم ان کو خفیہ ہی برا کہتے تھے، اب علانیہ کہنے کی تدبیر ایسی ہاتھ آگئی کہ مسلمان بھی اس میں شریک ہو گئے، حق تعالیٰ نے اس گنجائش کے قطع کرنے کو مسلمانوں کو حکم دیا کہ) اے ایمان والو! تم

(لفظ) رَاعِنًا مت کہا کرو اور (اس کی جگہ لفظ) اُنْظُرْنَا کہہ دیا کرو (کیونکہ اس لفظ کے معنی اور رَاعِنًا کے معنی عربی زبان میں ایک ہی ہیں، رَاعِنًا کہنے میں یہودیوں کی شرارت چلتی ہے، اس لئے اس کو ترک کر کے دوسرا لفظ استعمال کرو) اور (اس حکم کو اچھی طرح) سن لی جیو (اور یاد رکھو) اور (ان) کافروں کو (تو) سزائے دردناک ہو (ہی) گی (جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایسی گستاخی اور وہ بھی چالاکی کے ساتھ کرتے ہیں)۔

مسئلہ:- اس آیت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر اپنے کسی جائز فعل سے دوسروں کو ناجائز کاموں کی گنجائش ملتی معلوم ہو تو یہ جائز فعل بھی اس کے لئے جائز نہیں رہتا، جیسے اگر کسی عالم کے جائز فعل سے جاہلوں کو مغالطہ میں پڑنے اور ناجائز کاموں میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو تو اس عالم کے لئے یہ جائز فعل بھی ممنوع ہو جائے گا، بشرطیکہ یہ فعل شرعاً ضروری اور مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہو، اس کی مثالیں قرآن و سنت میں بہت ہیں، اسی کی ایک دلیل وہ حدیث ہے جس میں ارشاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”بیت اللہ کی تعمیر جو قریش نے زمانہ جاہلیت میں کی تھی، اس میں کئی چیزیں بناء ابراہیمی کے خلاف کردی ہیں، میرا دل چاہتا ہے کہ اس کو منہدم کر کے از سر نو بناء ابراہیمی کے مطابق بنادوں، لیکن اس سے ناواقف عوام کے فتنے میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہے اس لئے بالفعل ایسا نہیں کرتا۔“^[۱۰۵] ایسے احکام کو اصول فقہ کی اصطلاح میں ”سد ذرائع“ سے تعبیر کیا جاتا ہے، جو سبھی فقہاء کے نزدیک معتبر ہے، خصوصاً حضرات حنابلہ اس کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔ (قرطبی)

مَا يَوْذُلُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ

دل نہیں چاہتا اُن لوگوں کا جو کافر ہیں اہل کتاب میں اور نہ مشرکوں میں اس بات کو کہ اُترے

عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِّنْ رَبِّكُمْ ۖ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَن يَّشَاءُ ۖ

تم پر کوئی نیک بات تمہارے رب کی طرف سے اور اللہ خاص کر لیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہے

وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ①

اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

کافر لوگ، روار اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے، یہ پسند نہیں کرتے کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے کوئی بھلائی تم پر نازل ہو، حالانکہ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے مخصوص فرمالیتا ہے۔ اور اللہ فضل عظیم کا مالک ہے۔ ⑤

خلاصہ تفسیر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہود کا جو برتاؤ تھا، وہ اوپر کی آیت میں بیان کیا گیا، اب اس آیت میں یہود کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے کہ (بعض یہودی بعض مسلمانوں سے کہنے لگے کہ بخدا ہم دل سے تمہارے خیر روار ہیں، اور ہزار جان سے پسند کرتے ہیں کہ تم کو دینی احکام ہمارے دینی احکام سے بہتر عنایت ہوں تو ہم بھی ان کو قبول کریں گے، مگر کیا کیا جائے کہ تمہارا دین ہمارے دین سے اچھا ثابت نہیں ہو، حق تعالیٰ اس دعویٰ خیر روار ہی کی تکذیب فرماتے ہیں کہ) ذرا بھی پسند نہیں کرتے کافر لوگ (روار) ان اہل کتاب میں سے (ہوں) اور (روار) مشرکین میں سے، اس امر کو کہ تم کو تمہارے پروردگار کی طرف سے کسی طرح کی بہتری (بھی) نصیب ہو (اور ان کے حسد سے کچھ بھی نہیں ہوتا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ اپنی رحمت (وعنایت) کے ساتھ جس کو منظور ہوتا ہے مخصوص فرمالیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل (کرنے) والے ہیں۔

فائدہ:- ان یہودیوں کے دو دعوے تھے، اول یہودیت کا بہتر ہونا اسلام سے، دوسرے ان کا خیر روار ہونا، تو اول دعوے کو تو یہ ثابت نہیں کر سکے، نرے دعوے سے کیا ہوتا ہے، اور پھر یہ دعویٰ ہے بھی فضول سی بات، کیونکہ جب نسخ آتا ہے تو منسوخ ترک کر دیا جاتا ہے، افضل غیر افضل کے فرق پر موقوف نہیں، لہذا بوجہ ظاہر اور کھلی ہوئی بات ہونے کے اس کا جواب یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔

صرف دوسرے دعویٰ خیر روار ہی پر کلام کیا گیا ہے، اور اہل کتاب کے ساتھ مشرکین کا ذکر مضمون کو قوی اور مؤکد کرنے کے لئے کیا گیا کہ جس طرح مشرکین یقیناً تمہارے خیر روار نہیں، اسی طرح ان کو بھی سمجھو۔

مَا نُنْسخُ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِها نَاتٍ بِخَيْرٍ مِنْها أَوْ مِثْلِها ۖ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ

جو منسوخ کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلا دیتے ہیں تو بھیج دیتے ہیں اس سے بہتر یا اس کے برابر، کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ

عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۰۶﴾ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط

ہر چیز پر قادر ہے، کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمان اور زمین کی

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿۱۰۷﴾

اور نہیں تمہارے واسطے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ مددگار۔

آسان ترجمہ قرآن

ہم جب بھی کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں یا اسے بھلا دیتے ہیں تو اُس سے بہتر یا اُسی جیسی (آیت) لے آتے ہیں۔ کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے؟ ﴿۱۰۶﴾ کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ اللہ وہ ذات ہے کہ آسمانوں اور زمین کی سلطنت تنہا اُسی کی ہے، اور اللہ کے سوا نہ کوئی تمہارا رکھوالا ہے نہ مددگار؟ ﴿۱۰۷﴾

خلاصہ تفسیر

(تبدیلِ قبلہ کا واقعہ جب ہوا تو یہود نے اس پر طعن کیا، اور مشرکین بھی بعض احکام کی منسوخی پر زبانِ طعن دراز کرتے تھے، حق تعالیٰ اُن کے طعن اور اعتراض کا جواب دیتے ہیں کہ) ہم کسی آیت کو جو حکم موقوف کر دیتے ہیں (گو آیت قرآن میں یا ذہنوں میں باقی رہے) یا اس آیت (ہی) کو (ذہنوں سے) فراموش کر دیتے ہیں تو (یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں، کیونکہ اس میں بھی مصلحت ہوتی ہے، چنانچہ) ہم اس آیت سے بہتر یا اس آیت ہی کے مثل (بجائے اس کے دوسری چیز) لے آتے ہیں، (اے معترض!) کیا تجھ کو یہ معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ ہر شے پر قدرت رکھتے ہیں (پس ایسے قادر کو مصالِح کی رعایت کیا مشکل ہے اور) کیا تجھ کو یہ معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ ایسے ہیں کہ خاص انہی کی سلطنت آسمانوں اور زمین پر ہے (جب ان کی اس قدرت و سلطنت میں کوئی شریک و سہیم نہیں ہے تو ان مصلحتوں کی رعایت کر کے دوسرا حکم دے دینے میں کون مزاحمت کر سکتا ہے، غرض حکمِ ثانی کی تجویز سے بھی کوئی مانع نہیں، اور اس حکم کے جاری کر دینے میں بھی کوئی مانع نہیں) اور (یہ بھی سمجھ رکھو کہ) تمہارا حق تعالیٰ کے سوا کوئی یار و مددگار بھی نہیں (پس جب وہ یار ہیں تو احکام میں مصلحت کی ضرور رعایت کریں گے، اور جب مددگار ہیں تو ان احکام پر عمل کرنے کے وقت تمہارے مخالفین کی مزاحمت سے بھی ضرور محفوظ رکھیں گے، البتہ اگر اس ضرر سے بڑھ کر کوئی نفع اخروی ملنے والا ہو تو ظاہراً مخالف کا مسلط ہو جانا اور بات ہے)۔

معارف مسائل

مَا نُنَسِّخُ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا، اس آیت میں کسی آیت قرآن کے منسوخ ہونے کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں سب کو جمع کر دیا ہے۔ ”نسخ“ کے معنی لغت میں زائل کرنے اور لکھنے کے آتے ہیں، اس پر تمام مفسرین اُمت کا اتفاق ہے کہ اس آیت میں ”نسخ“ سے مراد کسی حکم کا زائل کرنا یعنی منسوخ کرنا ہے، اور اسی لئے اصطلاح کتاب و سنت میں ”نسخ“ ایک حکم کے بجائے کوئی دوسرا حکم جاری کرنے کو کہا جاتا ہے، خواہ وہ دوسرا حکم یہی ہو کہ سابق حکم بالکل ختم کر دیا جائے، یا یہ ہو کہ اس کی جگہ دوسرا عمل بتلایا جائے۔

احکام الہیہ میں نسخ کی حقیقت

دُنیا کی حکومتوں اور اداروں میں کسی حکم کو منسوخ کر کے دوسرا حکم جاری کر دینا مشہور و معروف ہے، لیکن انسانوں کے احکام میں نسخ کبھی اس لئے ہوتا ہے کہ پہلے کسی غلط فہمی سے ایک حکم جاری کر دیا، بعد میں حقیقت معلوم ہوئی تو حکم بدل دیا، کبھی اس لئے ہوتا ہے کہ جس وقت یہ حکم جاری کیا گیا اس وقت کے حالات کے مناسب تھا، اور آگے آنے والے واقعات و حالات کا اندازہ نہ تھا، جب حالات بدلے تو حکم بھی بدلنا پڑا، یہ دونوں صورتیں احکام خداوندی میں نہیں ہو سکتیں۔

ایک تیسری صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ حکم دینے والے کو اوّل ہی سے یہ بھی معلوم تھا کہ حالات بدلیں گے اور اُس وقت یہ حکم مناسب نہیں ہوگا، دوسرا حکم دینا ہوگا، یہ جانتے ہوئے آج ایک حکم دے دیا، اور جب اپنے علم کے مطابق حالات بدلے تو اپنی قرارداد سابق کے مطابق حکم بھی بدل دیا، اس کی مثال ایسی ہے کہ مریض کے موجودہ حالات کو دیکھ کر حکیم یا ڈاکٹر ایک دوا تجویز کرتا ہے، اور وہ جانتا ہے کہ دوروز اس دوا کے استعمال کرنے کے بعد مریض کا حال بدلے گا، اس وقت مجھے دوسری دوا تجویز کرنا ہوگی، یہ سب کچھ جانتے ہوئے وہ پہلے دن ایک دوا تجویز کرتا ہے جو اُس دن کے مناسب ہے، دو دن کے بعد حالات بدلنے پر دوسری دوا تجویز کرتا ہے۔

ماہر حکیم ڈاکٹر یہ بھی کر سکتا ہے کہ پہلے ہی دن پورے علاج کا نظام لکھ کر دیدے کہ دوروز تک یہ دوا استعمال کرو، پھر تین روز فلاں دوا، پھر ایک ہفتہ فلاں دوا، لیکن یہ مریض کی طبیعت پر بے وجہ کا ایک بار بھی ڈالنا ہے، اس میں غلط فہمی کی وجہ سے عملی خلل کا بھی خطرہ ہے، اس لئے وہ پہلے ہی سے سب تفصیلات نہیں بتلاتا۔

اللہ جل شانہ کے احکام میں اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں میں صرف یہی آخرت صورت نسخ کی ہو سکتی ہے، اور ہوتی رہی ہے، ہر آنے والی نبوت اور ہر نازل ہونے والی کتاب نے پچھلی نبوت اور کتاب کے بہت سے احکام کو منسوخ

کر کے نئے احکام جاری کئے، اور اسی طرح ایک ہی نبوت و شریعت میں ایسا ہوتا رہا کہ کچھ عرصہ تک ایک حکم جاری رہا، پھر بتقاضائے حکمت خداوندی اس کو بدل کر دوسرا حکم نافذ کر دیا گیا، صحیح مسلم کی حدیث میں ہے:-

لَمْ تَكُنْ نَبْوَةٌ قَطُّ إِلَّا تَنَاسَخَتْ - (مسلم)

”یعنی کبھی کوئی نبوت نہیں آئی جس نے احکام میں نسخ اور رد و بدل نہ کیا ہو“ (قرطبی)

جاہلانہ شبہات

البتہ کچھ جاہل یہودیوں نے اپنی جہالت سے احکامِ الہیہ کے نسخ کو دنیوی احکام کے نسخ کی پہلی دونوں صورتوں پر قیاس کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر زبانِ طعن دراز کی، اسی کے جواب میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ (ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ) مسلمانوں میں سے فرقہ برعزلہ کے بعض لوگوں نے شاید ان مخالفین کے طعن سے بچنے کی یہ راہ نکالی کہ احکامِ الہیہ میں نسخ ہونے کا امکان تو ہے، کوئی امر اس امکان کے لئے مانع نہیں، لیکن پورے قرآن میں نسخ کا وقوع کہیں نہیں ہوا، نہ کوئی آیت نسخ ہے، نہ منسوخ۔ یہ قول ابو مسلم اصفہانی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جس پر علمائے امت نے ہمیشہ رد و نکیر فرمایا ہے، تفسیر روح المعانی میں ہے:-

وَاتَّفَقَتْ أَهْلُ الشَّرَائِعِ عَلَى جَوَازِ النَّسْخِ وَوُقُوعِهِ وَخَالَفَتِ الْيَهُودُ غَيْرَ الْعِيسَوِيَّةِ فِي جَوَازِهِ وَقَالُوا يَمْتَنِعُ عَقْلًا وَأَبُو مُسْلِمٍ الْأَصْفَهَانِيُّ فِي وَقُوعِهِ فَقَالَ إِنَّهُ وَإِنْ جَازَ عَقْلًا لَكِنَّهُ لَمْ يَقَعْ-

(روح المعانی ج: ۱ ص: ۳۵۲)

”تمام اہل شرائع کا نسخ کے جواز اور وقوع دونوں پر اتفاق ہے، صرف یہودیوں نے بجز عیسویہ کے امکانِ نسخ کا انکار کیا ہے، اور ابو مسلم اصفہانی نے وقوع کا انکار کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ نسخ احکامِ الہیہ میں ممکن تو ہے مگر کہیں واقع ہوا نہیں۔“

اور امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا:-

مَعْرِفَةُ هَذَا الْبَابِ أَكِيدَةٌ وَفَائِدَتُهُ عَظِيمَةٌ لَا تَسْتَغْنِي عَنْ مَعْرِفَتِهِ الْعُلَمَاءُ وَلَا يُنْكَرُهُ إِلَّا الْجَهْلَةُ الْأَغْبِيَاءُ - (قرطبی ج: ۱ ص: ۵۵)

”بابِ نسخ کی معرفت بہت ضروری ہے، اور فائدہ اس کا بہت بڑا ہے، اس کی معرفت سے علماء مستغنی نہیں ہو سکتے، اور جاہلوں بیوقوفوں کے سوا اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔“

قرطبیؒ نے اس جگہ ایک واقعہ حضرت علیؓ کرّم اللہ وجہہ کا بھی نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ وہ مسجد میں تشریف لائے تو کوئی آدمی وعظ کہہ رہا تھا، آپؐ نے لوگوں سے پوچھا یہ کیا کرتا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ وعظ و نصیحت کر رہا ہے، آپؐ نے فرمایا: نہیں، یہ کوئی وعظ و نصیحت نہیں کرتا، بلکہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں فلاں بن فلاں ہوں، سو بیچاؤ۔ پھر اس شخص کو بلوا کر پوچھا کہ کیا تم قرآن وحدیث کے نسخ و منسوخ احکام کو جانتے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں میں نہیں جانتا، حضرت علیؓ کرّم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ ہماری مسجد سے نکل جاؤ، آئندہ کبھی یہاں وعظ نہ کہو۔

قرآن وسنت میں نسخ کے وجود و وقوع کے متعلق صحابہؓ و تابعینؓ کے اتنے آثار و اقوال موجود ہیں جن کو نقل کرنا مشکل ہے، تفسیر ابن جریر، ابن کثیر، درمنثور وغیرہ میں اسانید قویہ صحیحہ کے ساتھ بھی بہت سی روایات مذکور ہیں، اور روایات ضعیفہ کا تو شمار نہیں۔^۱

اسی لئے اُمت میں یہ مسئلہ ہمیشہ اجماعی رہا ہے، صرف ابو مسلم اصفہانی اور چند معتزلہ نے وقوع نسخ کا انکار کیا ہے، جن پر امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں شرح وسط کے ساتھ رد کیا ہے۔

نسخ کے مفہوم میں متقدمین و متاخرین کی اصطلاحوں میں فرق

چونکہ نسخ کے اصطلاحی معنی تبدیل حکم کے ہیں، اور یہ تبدیلی جس طرح ایک حکم کو بالکلیہ منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم لانے میں ہے، جیسے بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کو قبلہ بنادینا، اسی طرح کسی مطلق یا عام حکم میں کسی قید و شرط کو بڑھادینا بھی ایک قسم کی تبدیلی ہے، اسلاف اُمت نے نسخ کو اسی عام معنی میں استعمال فرمایا ہے، جس میں کسی حکم کی پوری تبدیلی بھی داخل ہے، اور جزوی تبدیلی قید و شرط یا استثناء وغیرہ کی بھی اس میں شامل ہے، اسی لئے متقدمین حضرات کے نزدیک قرآن میں آیات منسوخہ پانچ سو تک شمار کی گئی ہیں۔

حضرات متاخرین نے صرف اُس تبدیلی کا نام ”نسخ“ رکھا ہے جس کی پہلے حکم کے ساتھ کسی طرح تطبیق نہ ہو سکے، ظاہر ہے کہ اس اصطلاح کے مطابق آیات منسوخہ کی تعداد بہت گھٹ جائے گی، اسی کا لازمی اثر یہ تھا کہ متقدمین نے تقریباً پانچ سو آیات قرآنی میں نسخ ثابت کیا تھا، جس میں معمولی سی تبدیلی قید و شرط یا استثناء وغیرہ کو بھی شامل کیا تھا، اور حضرات متاخرین میں علامہ سیوطیؒ نے صرف بیس آیتوں کو منسوخ قرار دیا، ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان میں بھی تطبیق کی صورت پیدا کر کے صرف پانچ آیتوں کو منسوخ فرمایا ہے، جن میں کوئی تطبیق بغیر تاویل بعید کے نہیں ہو سکتی، یہ امر اس لحاظ سے مستحسن ہے کہ احکام میں اصل بقاء حکم ہے، نسخ خلاف اصل ہے، اس لئے جہاں آیت کے معمول بہا ہونے

کی کوئی توجیہ ہو سکتی ہے، اس میں بلا ضرورت نسخ ماننا درست نہیں۔

لیکن اس تقلیل کا یہ منشا ہرگز نہیں ہو سکتا ہے کہ مسئلہ نسخ اسلام یا قرآن پر کوئی عیب تھا، جس کے ازالے کی کوشش چودہ سو برس تک چلتی رہی، آخری انکشاف حضرت شاہ ولی اللہ کا ہوا، جس میں گھٹتے گھٹتے پانچ رہ گئی، اور اب اس کا انتظار ہے کہ کوئی جدید محقق ان پانچ کا بھی خاتمہ کر کے بالکل صفر تک پہنچا دے۔

مسئلہ نسخ کی تحقیق میں ایسا رخ اختیار کرنا نہ اسلام اور قرآن کی کوئی صحیح خدمت ہے، اور نہ ایسا کرنے سے صحابہؓ و تابعینؓ اور پھر چودہ سو برس کے علمائے متقدمین و متاخرین کے مقالات و تحقیقات کو دھویا جاسکتا ہے، اور نہ مخالفین کی زبانِ طعن اس سے بند ہو سکتی ہے، بلکہ اس زمانے کے ملحدین کے ہاتھ میں یہ ہتھیار دینا ہے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چودہ سو برس تک تمام علمائے اُمت کچھ کہتے رہے ہوں اور آخر میں اس کا غلط ہونا ثابت ہو جائے، معاذ اللہ! اگر یہ دروازہ کھلے گا تو قرآن اور شریعت سے امن اٹھ جائے گا، اس کی کیا ضمانت ہے کہ آج جو کسی نے تحقیق کی وہ کل کو غلط ثابت نہیں ہو جائے گی۔ عصر حاضر میں بعض علماء کی ایسی تحریریں نظر سے گزری ہیں، جنہوں نے آیت مذکورہ: **مَا نُنَسِّخْ** کو متضمن معنی شرط پر ہونے کی وجہ سے ایک قضیہ فرضیہ مثل **لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ** (الانبیاء: ۲۲) اور **لَوْ كَانَ لِلرَّحْمَنِ وَلَدٌ** قرار دے کر صرف امکانِ نسخ کی دلیل بنایا اور وقوع سے انکار کیا، حالانکہ متضمن معنی شرط اور قضیہ شرطیہ بحرف ”لو“ میں بڑا فرق ہے، اور یہ وہی استدلال ہے جو ابوسلم اصفہانی اور معتزلہ پیش کرتے ہیں۔

لیکن صحابہؓ و تابعینؓ کی تفسیریں اور پوری اُمت کے تراجم دیکھنے کے بعد اس کو مدلولِ قرآنی کہنا کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہو سکتا، صحابہ کرامؓ نے اسی آیت سے وقوعِ نسخ پر استدلال کیا ہے، اور متعدد واقعات شمار کرائے ہیں۔ (ابن کثیر، ابن جریر وغیرہ)

یہی وجہ ہے کہ اُمت کے متقدمین و متاخرین میں کسی نے بھی وقوعِ نسخ کا مطلقاً انکار نہیں کیا، خود حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تطبیق کر کے تعداد تو کم بتلائی مگر مطلقاً وقوعِ نسخ کا انکار نہیں فرمایا، ان کے بعد بھی اکابر علمائے دیوبند بلا استثناء سبھی وقوعِ نسخ کے قائل چلے آئے ہیں، جن میں سے متعدد حضرات کی مستقل یا جزوی تفسیریں بھی موجود ہیں، کسی نے بھی نسخ کے وقوع کا مطلقاً انکار نہیں کیا، واللہ سبحانہ و تعالیٰ أعلم۔

أَوْ نُنَسِّهَا، یہ مشہور قراءت کے مطابق ”انساء“ اور ”نسیان“ سے مأخوذ ہے، معنی یہ ہیں کہ کبھی نسخِ آیت کی یہ صورت بھی ہوتی ہے کہ وہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہؓ کے ذہنوں سے بالکل بھلا دی جائے، جیسا کہ اس

کی تفسیر میں کئی واقعات اس طرح کے حضرات مفسرین نے ذکر کئے ہیں، اس بھلا دینے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ آئندہ اس پر عمل کرنا مقصود نہیں۔

نسخ کے متعلق بقیہ احکام کی تفصیلات کی یہاں گنجائش نہیں، اس کا اصل محل اصول فقہ کی کتابیں ہیں۔

أَمْ تَرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سَأَلَ مُوسَى مِنْ قَبْلُ ۖ وَمَنْ

کیا تم مسلمان بھی چاہتے ہو کہ سوال کرو اپنے رسول سے جیسے سوال ہو چکے ہیں موسیٰ سے اس سے پہلے، اور جو کوئی

يَتَّبِدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ۝۱۰۸

کفر لیوے بدلے ایمان کے تو وہ بہک سیدھی راہ سے۔

آسان ترجمہ قرآن

کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے اسی قسم کے سوال کرو جیسے پہلے موسیٰ سے کئے جا چکے ہیں؟ اور جو شخص ایمان کے بدلے کفر اختیار کرے وہ یقیناً سیدھے راستے سے بھٹک گیا ۝۱۰۸

خلاصہ تفسیر

(بعض یہود نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عناداً عرض کیا کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام پر ایک ہی دفعہ توراۃ نازل ہوئی، اسی طرح آپ قرآن مجموعی طور پر لائیے، اس پر ارشاد ہوتا ہے کہ) ہاں کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول (وقت) سے (بے جا، بے جا) درخواستیں کرو جیسا کہ اس کے قبل (تمہارے بزرگوں کی طرف سے حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) سے بھی (ایسی ایسی) درخواستیں کی جا چکی ہیں (مثلاً خدا تعالیٰ کو علانیہ دیکھنے کی درخواست کی تھی، اور ایسی درخواستیں جن سے صرف رسول پر اعتراض کرنا اور مصالح الہیہ میں مزاحمت کرنا ہی مقصود ہو، اور ایمان لانے کا پھر بھی ارادہ نہ ہونری کفر کی باتیں ہیں، اور) جو شخص ایمان لانے کی بجائے کفر (کی باتیں) کرے، بلا شک وہ شخص راہ راست سے دور جا پڑا۔

فائدہ:- اس درخواست کو بے جا اس لئے فرمایا کہ ہر فعل میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں اور مصلحتیں جدا جدا ہوتی ہیں، بندے کو اس میں تعین طریق کا کیا حق ہے کہ وہ کہے کہ یہ بات اس طرح ہو، یہ اس طرح ہو، اس کام تو بس یہ ہونا چاہئے:

زباں تازہ کردن با قرارِ تو

نیلِ سخن علت از کارِ تو

ترجمہ شیخ الہند میں یہ خطاب مسلمانوں سے قرار دیا ہے، اس کا حاصل مسلمانوں کو اس پر تنبیہ کرنا ہوگا کہ رسول سے بے جا سوال نہ کیا کریں۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُّوْكُمْ مِّنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا ۖ

دل چاہتا ہے بہت سے اہل کتاب کا کہ کسی طرح تم کو پھر کر مسلمان ہوئے پیچھے کافر بنادیں

حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا

بسبب اپنے دلی حسد کے بعد اس کے کہ ظاہر ہو چکا اُن پر حق، سو تم درگزر کرو اور خیال میں نہ لاؤ

حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝۱۰۹ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ

جب تک بھیجے اللہ اپنا حکم، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور قائم رکھو نماز

وَاتُوا الزَّكَاةَ ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ ۚ إِنَّ

اور دیتے رہو زکوٰۃ اور جو کچھ آگے بھیج دو گے اپنے واسطے بھلائی پاؤ گے اس کو اللہ کے پاس، بے شک

اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝۱۱۰

اللہ جو کچھ تم کرتے ہو سب دیکھتا ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

(مسلمانو!) بہت سے اہل کتاب اپنے دلوں کے حسد کی بنا پر یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لانے کے بعد تمہیں پلٹا کر پھر کافر بنادیں، باوجودیکہ حق اُن پر واضح ہو چکا ہے۔ چنانچہ تم معاف کرو اور درگزر سے کام لو یہاں تک کہ

ترجمہ:- آپ کے اقرار کے ساتھ زبان کو تازہ کرنا ہے نہ کہ آپ کے کام میں کوئی علت نکالنا۔

اللہ خود اپنا فیصلہ بھیج دے۔ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ① اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو، اور (یاد رکھو کہ) جو بھلائی کا عمل بھی تم خود اپنے فائدے کے لئے آگے بھیج دو گے اُس کو اللہ کے پاس پاؤ گے۔ بیشک جو عمل بھی تم کرتے ہو اللہ اُسے دیکھ رہا ہے ②

خلاصہ تفسیر

(بعض یہود شب و روز مختلف تدبیروں سے دوستی اور خیر خواہی کے پیرایہ میں مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے کی کوشش کیا کرتے تھے، اور باوجود ناکامی کے اپنی دُھن سے باز نہ آتے تھے، حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس پر متنبہ فرمادیا کہ) ان اہل کتاب (یعنی یہود) میں سے بہترے دل سے یہ چاہتے ہیں کہ تم کو تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر کافر کر ڈالیں، (اور یہ چاہنا کچھ خیر خواہی سے نہیں، جیسا کہ وہ اظہار کرتے ہیں، بلکہ) محض حسد کی وجہ سے جو کہ (تمہاری جانب سے کسی امر کے سبب پیدا نہیں ہوا، بلکہ) خود ان کے دلوں ہی سے (جوش مارتا) ہے، (اور یہ بھی نہیں کہ ان کو حق واضح نہ ہوا ہو، بلکہ) حق واضح ہوئے پیچھے (یہ حالت ہے، اب اس پر مسلمانوں کو ان پر غصہ آنے کا محل تھا، اس لئے ارشاد ہوتا ہے کہ) خیر (اب تو) معاف کرو اور درگزر کرو جب تک حق تعالیٰ (اس معاملے کے متعلق) اپنا حکم (قانونِ جدید) بھیجیں، (اشارہ بتلادیا کہ ان کی شرارتوں کا علاج قانونِ انتظامِ امن عام یعنی قتال و جزیہ سے ہم جلد کرنے والے ہیں، اس پر مسلمانوں کو اپنا ضعف اور ان کی قوت دیکھ کر اس قانون کے اجراء کے متعلق تعجب ہو سکتا تھا، اس لئے ارشاد ہوتا ہے کہ تم تعجب کیوں کرتے ہو) اللہ تعالیٰ ہر چیز پر (خواہ وہ معمولی ہو خواہ عجیب ہو) قادر ہیں، اور (سردست صرف) نمازیں پابندی سے پڑھے جاؤ اور (جن پر زکوٰۃ فرض ہے) زکوٰۃ دیئے جاؤ (اور جب وہ قانون آجائے گا ان اعمالِ صالحہ کے ساتھ اس کا بھی اضافہ کر لینا) اور (یہ نہ سمجھو کہ جب تک جہاد کا حکم نہ آوے صرف نماز روزہ سے کچھ ثواب میں کمی رہے گی، نہیں، بلکہ) جو نیک کام بھی اپنی بھلائی کے واسطے جمع کرتے رہو گے، حق تعالیٰ کے پاس (پہنچ کر) اس کو (پورا پورا مع صلہ کے) پالو گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کئے ہوئے کاموں کی دیکھ بھال کر رہے ہیں (ان میں کا ایک ذرہ بھی ضائع نہ ہونے پائے گا)۔

فائدہ:- اُس وقت کی حالت کا یہی مقتضی تھا، پھر حق تعالیٰ نے اس وعدے کو پورا فرمایا اور جہاد کی آیات نازل ہوئیں، جس کے بعد یہود کے ساتھ بھی وہ قانون برتا گیا، اور ناشائستہ لوگوں کے ساتھ حسبِ حیثیت ان کے فساد کے بدلے قتل یا جلا وطنی یا جزیہ پر عمل درآمد کیا گیا۔

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصْرًا ۚ تِلْكَ آمَانِيهِمْ ط

اور کہتے ہیں کہ ہرگز نہ جاویں گے جنت میں مگر جو ہوں گے یہودی یا نصرانی، یہ آرزوئیں باندھ لی ہیں انہوں نے،

قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۱۳﴾ بَلَىٰ ۚ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ

کہہ دے: لے آؤ سند اپنی اگر تم سچے ہو۔ کیوں نہیں جس نے تابع کر دیا منہ اپنا اللہ کے

وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ ۖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

اور وہ نیک کام کرنے والا ہے تو اسی کے لئے ہے ثواب اس کا اپنے رب کے پاس اور نہ ڈر ہے اُن پر اور نہ وہ

يَحْزَنُونَ ﴿۱۱۴﴾ وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصْرَاءُ عَلَىٰ شَيْءٍ ۖ وَقَالَتِ النَّصْرَاءُ

غمگین ہوں گے۔ اور یہود تو کہتے ہیں کہ نصاریٰ نہیں کسی راہ پر، اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ

لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ ۖ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ ط كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ

یہودی نہیں کسی راہ پر، باوجودیکہ سب پڑھتے ہیں کتاب، اسی طرح کہا اُن لوگوں نے

لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ

جو جاہل ہیں انہی کی سی بات، اب اللہ حکم کرے گا ان میں قیامت کے دن

فَيَمَّا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۱۵﴾

جس بات میں جھگڑتے تھے۔

آسان ترجمہ قرآن

اور یہ (یعنی یہودی اور عیسائی) کہتے ہیں کہ: ”جنت میں سوائے یہودیوں یا عیسائیوں کے کوئی بھی ہرگز داخل نہیں

ہوگا۔“ یہ محض ان کی آرزوئیں ہیں۔ آپ ان سے کہئے کہ اگر تم (اپنے اس دعوے میں) سچے ہو تو اپنی کوئی دلیل لے کر آؤ ① کیوں نہیں؟ (قاعدہ یہ ہے کہ) جو شخص بھی اپنا رخ اللہ کے آگے جھکا دے، اور وہ نیک عمل کرنے والا ہو، اُسے اپنا اجر اپنے پروردگار کے پاس ملے گا۔ اور ایسے لوگوں کو نہ کوئی خوف ہوگا، اور نہ وہ غمگین ہوں گے ② اور یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں (کے مذہب) کی کوئی بنیاد نہیں، اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودیوں (کے مذہب) کی کوئی بنیاد نہیں، حالانکہ یہ سب (آسمانی) کتاب پڑھتے ہیں۔ اسی طرح وہ (مشرکین) جن کے پاس کوئی (آسمانی) علم ہی سرے سے نہیں ہے، انہوں نے بھی ان (اہل کتاب) کی جیسی باتیں کہنی شروع کر دی ہیں۔ چنانچہ اللہ ہی قیامت کے دن ان کے درمیان اُن باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں یہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔ ③

خلاصہ تفسیر

اور یہود و نصاریٰ (یوں) کہتے ہیں کہ بہشت میں ہرگز کوئی نہ جانے پاوے گا بجز اُن لوگوں کے جو یہودی ہوں (یہ تو یہود کا قول ہے) یا اُن لوگوں کے جو نصرانی ہوں (یہ نصاریٰ کا قول ہے، حق تعالیٰ اُن کی تردید فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ) یہ (خالی) دل بہلانے کی باتیں ہیں (اور حقیقت کچھ بھی نہیں) آپ (ان سے یہ تو) کہئے کہ (اچھا) اپنی دلیل لاؤ اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو، (سو وہ تو کیا دلیل لاویں گے، کیونکہ کوئی دلیل ہے ہی نہیں، اب ہم اس کے خلاف پہلے تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ) ضرور دوسرے لوگ (بھی جنت میں) جاویں گے (پھر اس پر دلیل لاتے ہیں کہ ہمارا قانون جو با اتفاقِ سماوی ملتوں کے ماننے والوں کے پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے یہ ہے کہ) جو کوئی شخص بھی اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے (یعنی اعمال و عقائد میں فرمانبرداری اختیار کرے) اور (اس کے ساتھ) وہ مخلص بھی ہو (کہ فرمانبرداری دلی طور پر اختیار کی ہو، محض مصلحت سے ظاہر داری نہ ہو) تو ایسے شخص کو اس (کی فرمانبرداری) کا عوض ملتا ہے پروردگار کے پاس پہنچ کر، اور ایسے لوگوں پر (قیامت میں) نہ کوئی اندیشہ (ناک واقعہ پڑنے والا) ہے، اور نہ ایسے لوگ (اس روز) مغموم ہونے والے ہیں (کیونکہ فرشتے ان کو بشارتیں سنا کر بے فکر کر دیں گے)۔

(حاصل استدلال کا یہ ہوا کہ جب یہ قانونِ مسلم ہے تو اب صرف یہ دیکھ لو کہ یہ بات کس پر صادق آتی ہے؟ سو ظاہر ہے کہ کسی حکم سابق کے منسوخ ہو جانے کے بعد اس پر عمل کرنے والا کسی بھی طور پر فرمانبردار نہیں کہلا سکتا، لہذا یہود و نصاریٰ فرمانبردار نہ ہوئے، بلکہ حکمِ ثانی پر عمل کرنا فرمانبرداری سمجھی جائے گی، اور یہ شانِ مسلمانوں کی ہے، کہ نبوت و شریعتِ محمدیہ کو قبول کر لیا، چنانچہ یہی جنت میں داخل ہونے والے شمار ہوئے۔

اور مخلصین کی قید سے منافقین نکل گئے) (کیونکہ وہ بھی شرعاً کفار ہی میں داخل اور مستحقِ جہنم ہیں) اور (ایک بار

کچھ یہودی اور کچھ نصرانی جمع ہو کر مذہبی مباحثہ کرنے لگے، تو یہود تو اپنے عقیدہ کے موافق نصاریٰ کے دین کو باطل بتاتے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور انجیل کے کتاب اللہ ہونے کا انکار کرتے تھے، مگر نصاریٰ بھی ضد و تعصب میں آ کر دین یہود کو بے اصل و باطل کہنے لگے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت اور توریت کے کتاب اللہ ہونے کا انکار کرنے لگے، اللہ تعالیٰ اس قصہ کو نقل فرما کر بطور تردید فرماتے ہیں کہ (یہود کہنے لگے کہ نصاریٰ (کا مذہب) کسی بنیاد پر (قائم) نہیں، (یعنی سرے سے غلط ہے) اور اسی طرح نصاریٰ کہنے لگے کہ یہود (کا مذہب) کسی بنیاد پر قائم نہیں، (یعنی سرے سے غلط ہے) حالانکہ یہ سب (فریقین کے لوگ آسمانی) کتابیں (بھی) پڑھتے (پڑھاتے) ہیں (یعنی یہودی توریت کو اور عیسائی انجیل کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں اور دونوں کتابوں میں دونوں رسولوں اور دونوں کتابوں کی تصدیق موجود ہے، جو کہ دونوں مذہبوں کی اصل بنیاد ہے، گو منسوخ ہو جانے کی بنا پر قابل عمل نہ ہو، یہ اور بات ہے)۔

(اور اہل کتاب تو ایسے دعوے کرتے ہی تھے، ان کی دیکھا دیکھی مشرکین کو بھی جوش آیا اور) اسی طرح سے یہ لوگ (بھی) جو کہ (محض) بے علم ہیں، ان (ہی اہل کتاب) کا سا قول دہرانے لگے، (کہ ان یہود و نصاریٰ سب کا دین بے بنیاد ہے، حق پر بس ہم ہی ہیں) سو (یہاں سب اپنی اپنی ہانک لیں) اللہ تعالیٰ ان سب کے درمیان (عملی) فیصلہ کر دیں گے، قیامت کے دن ان تمام مقدمات میں جن میں وہ باہم اختلاف کر رہے تھے، (اور وہ عملی فیصلہ یہ ہوگا کہ اہل حق کو جنت میں اور اہل باطل کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا، عملی فیصلہ کی قید اس لئے لگائی کہ قوی اور برہانی فیصلہ تو عقلی اور نقلی دلائل کے ذریعہ دنیا میں بھی ہو چکا ہے)۔

معارف و مسائل

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے باہمی اختلافات اور ایک دوسرے پر رد کا ذکر فرما کر ان کی نادانی اور اس اختلاف کے مضر اثرات کا بیان، پھر اصل حقیقت کا اظہار فرمایا ہے، ان تمام واقعات میں مسلمانوں کے لئے بڑی اہم ہدایات ہیں جن کا بیان آگے آتا ہے۔

یہود و نصاریٰ دونوں نے دین کی اصل حقیقت کو فراموش کر کے مذہب کے نام پر ایک قومیت بنالی تھی، اور ان میں سے ہر ایک اپنی ہی قوم کے جنتی اور مقبول ہونے، اور اپنے سوا تمام اقوام عالم کے دوزخی اور گمراہ ہونے کا معتقد تھا۔ اس نامعقول اختلاف کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرکین کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ عیسائیت بھی بے بنیاد اور یہودیت بھی بے اصل، حق و صحیح بس ہماری بت پرستی ہے۔

حق تعالیٰ نے ان دونوں قوموں کی جہالت و گمراہی کے متعلق فرمایا کہ یہ دونوں قومیں جنت میں جانے کے اصل

سبب سے غافل ہیں، محض مذہب کے نام کی قومیت کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ مذہب یہودی ہو یا نصرانی یا اسلام ان سب کی اصل رُوح دو چیزیں ہیں:-

ایک یہ کہ بندہ دل و جان سے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دے، اس کی اطاعت و فرمانبرداری کو اپنا عقیدہ و مذہب سمجھے، چاہے یہ کسی مذہب میں حاصل ہو، حقیقت دین و مذہب کو فراموش کر کے یا پس پشت ڈال کر یہودی یا نصرانی قومیت کو اپنا مقصد بنا لینا دین و مذہب سے ناواقفیت اور گمراہی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جنت میں جانے کے لئے صرف یہ بھی کافی نہیں کہ کوئی آدمی اپنے دل سے خدا کی فرمانبرداری کا قصد تو درست کر لے، مگر اطاعت، فرمانبرداری اور عبادت کے طریقے اپنے ذہن و خیال کے مطابق خود گھڑ لے، بلکہ یہ ضروری ہے کہ عبادت و اطاعت اور امتثالِ امر کے طریقے بھی وہی اختیار کرے جو خدا تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعے بتائے اور متعین کئے ہوں۔

پہلی بات **بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ** اللہ کے ذریعے اور دوسری **وَهُوَ مُحْسِنٌ** اللہ کے ذریعے واضح کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ نجاتِ اخروی اور دخولِ جنت کے لئے صرف قصدِ اطاعت کافی نہیں، بلکہ حسنِ عمل بھی ضروری ہے، اور حسنِ عمل کا مصداق وہی تعلیم و طریقہ ہے جو قرآن اور سنت رسول خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہو۔

نسلی مسلمان ہو یا یہودی و نصرانی، اللہ کے یہاں اس کی کوئی قیمت نہیں، اصل چیز ایمان اور عملِ صالح ہے

جو شخص ان بنیادی اصولوں میں سے کسی بھی اصول کو چھوڑ دے، خواہ وہ یہودی ہو یا نصرانی یا مسلمان اور پھر محض نام کی قومیت کے زعم میں اپنے آپ کو جنت کا ٹھیکہ دار سمجھ لے تو یہ صرف اس کی خود فریبی ہے، جس کا حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی بھی ان ناموں کا سہارا لے کر قریب نہیں ہو سکتا، نہ مقبول بن سکتا ہے، جب تک اس میں ایمان و عملِ صالح کی رُوح موجود نہ ہو۔

پھر اصولِ ایمان تو ہر رسول اور ہر شریعت کے زمانے میں مشترک و یکساں رہے ہیں، البتہ عملِ صالح و مقبول کی شکلیں کچھ ادتی بدلتی رہی ہیں، توراۃ کے زمانے میں عملِ صالح وہ سمجھا گیا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توریت کی تعلیم کے مطابق تھا، انجیل کے دور میں عملِ صالح یقیناً وہی عمل تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کی تعلیم سے مطابقت رکھتا تھا، اور اب قرآن کے زمانے میں وہی عملِ صالح کہے جانے کا مستحق ہوگا جو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اور ان کی لائی ہوئی اللہ کی کتاب ”قرآن مجید“ کی ہدایت کے مطابق ہوگا۔

خلاصہ کلام یہ کہ یہود و نصاریٰ کے اس اختلاف کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ دونوں قومیں جہالت کی باتیں کر رہی ہیں، دونوں میں سے کوئی بھی جنت کا ٹھیکہ دار نہیں، اور نہ ہی دونوں کے مذہب بے بنیاد اور بے اصل ہیں، بلکہ دونوں مذہبوں کی صحیح بنیاد موجود ہے، غلط فہمی کا سبب اصلی یہ ہے کہ انہوں نے مذہب و ملت کی اصل رُوح یعنی عقائد و اعمال اور نظریات کو چھوڑ کر نسلی یا وطنی بنیاد پر کسی قوم کو یہود ٹھہرا لیا اور کسی کو نصرانی سمجھ لیا۔

جو یہود کی نسل سے ہو، یا یہود کے شہر میں بستا ہو، یا مردم شماری میں اپنے آپ کو یہودی بتاتا ہو، اس کو یہود سمجھ لیا گیا، اسی طرح نصرانیوں کی تشخیص و تعیین کی گئی، حالانکہ اُصولِ ایمان کو توڑ کر اور اعمالِ صالحہ سے منہ موڑ کر نہ کوئی یہودی، یہودی رہتا ہے، نہ نصرانی، نصرانی۔

قرآن کریم میں اس اختلاف اور اس فیصلہ کا ذکر مسلمانوں کو سنانے اور متنبہ کرنے کے لئے ہے کہ کہیں وہ بھی اس قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں، کہ ہم تو پشتی مسلمان ہیں، ہر دفتر و رجسٹر میں ہمارا نام مسلمان کے خانے میں درج ہے، اور ہم زبان سے بھی اپنے کو مسلمان ہی کہتے ہیں، اس لئے جنت کے نیزان تمام انعامی وعدوں کے ہم ہی مستحق ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے مسلمانوں سے کئے گئے۔

اس فیصلہ سے اُن پر واضح ہو جانا چاہئے کہ کوئی شخص نہ محض دعوے سے حقیقی مسلمان بنتا ہے، نہ کہیں مسلمان نام درج کرانے یا مسلمان کی صلب سے، یا ان کے شہر میں پیدائش ہونے کی وجہ سے، بلکہ مسلمان ہونے کے لئے اول اسلام ضروری ہے، اور اسلام کے معنی ہی اپنے آپ کو سپرد کرنے اور سوئچ دینے کے ہیں، دوسرے احسانِ عمل یعنی سنت کے مطابق عمل کو درست کرنا۔

لیکن قرآن کریم کی اس تنبیہ کے باوجود بہت سے مسلمان، اسی یہودی اور نصرانی غلطی کا شکار ہو گئے، کہ خدا و رسول اور آخرت و قیامت سے بالکل غافل رہ کر اپنا نسلی مسلمان ہونا مسلمان ہونے کے لئے کافی سمجھنے لگے، اور قرآن و حدیث میں جو وعدے فلاحِ دنیا و آخرت کے مسلمانوں سے کئے گئے ہیں اپنے آپ کو ان کا مستحق سمجھ کر ان کے پورے ہونے کا انتظار کرنے لگے، اور جب وہ پورے ہوتے نظر نہیں آتے تو قرآن و حدیث کے وعدوں میں شک کرنے لگے، اس کو نہیں دیکھتے کہ قرآن نے محض نسلی مسلمانوں سے کوئی وعدہ نہیں کیا، جب تک وہ اپنے تمام ارادوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع نہ کر دیں، اور ان کے بتلائے ہوئے طریقوں پر عملِ صالح کے پابند نہ ہوں، یہی خلاصہ ہے آیت مذکورہ: **بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرٌ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ** (۱۱۳) کا۔

آج کل پوری دنیا کے مسلمان طرح طرح کے مصائب و آفات کا شکار ہیں، اس کو دیکھ کر بہت سے ناواقف لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید ان تمام آفات و مصائب کا سبب ہمارا اسلام ہی ہے، لیکن مذکورہ تحریر سے واضح ہو گیا کہ

اس کا اصلی سبب ہمارا اسلام نہیں بلکہ ترک اسلام ہے، کہ ہم نے اسلام کا صرف نام باقی رکھا ہے، نہ اس کے عقائد ہمارے اندر ہیں، نہ اخلاق، نہ اعمال، گویا۔

وضع میں ہم ہیں نصاریٰ تو تمدن میں ہنود

پھر ہمیں کیا حق ہے کہ اسلام اور مسلم کے لئے کئے ہوئے وعدوں اور انعاموں کا ہم انتظار کریں۔

البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ہم کچھ بھی سہی نام تو اسلام کا لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیا تو ہیں، اور جو کفار کھلے طور پر اللہ و رسول کی مخالفت کرتے ہیں، اسلام کا نام لینا بھی پسند نہیں کرتے، وہ تو آج دنیا میں ہر طرح کی ترقی کر رہے ہیں، بڑی بڑی حکومتوں کے مالک بنے ہوئے ہیں، دنیا کی صنعتوں اور تجارتوں کے ٹھیکہ دار بنے ہوئے ہیں، اگر ہماری بد عملی کی ہمیں یہ سزا مل رہی ہے کہ ہم ہر جگہ پامال و پریشان ہیں تو کفار و فجار کو اس سے زیادہ سزا ملنی چاہئے لیکن اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو یہ شبہ خود بخود رفع ہو جائے گا۔

اول تو اس لئے کہ دوست اور دشمن کے ساتھ معاملہ یکساں نہیں ہوا کرتا، دوست کو قدم قدم اور بات بات پر ٹوکا جاتا ہے، اولاد اور شاگرد کو ذرا ذرا سی بات پر سزا دی جاتی ہے، لیکن دشمن کے ساتھ یہ سلوک نہیں ہوتا، اس کو ڈھیل دی جاتی ہے، اور وقت آنے پر دفعۃً پکڑ لیا جاتا ہے۔

مسلمان جب تک ایمان و اسلام کا نام لیتا ہے، اور اللہ کی عظمت و محبت کا دم بھرتا ہے، وہ دوستوں کی فہرست میں داخل ہے، اُس کے برے اعمال کی سزا عموماً دنیا ہی میں دے دی جاتی ہے، تاکہ آخرت کا بار ہلکا ہو جائے، بخلاف کافر کے کہ اس پر باغیوں اور دشمنوں کا قانون جاری ہے، دنیا کی ہلکی ہلکی سزاؤں سے ان کا بار عذاب ہلکا نہیں کیا جاتا، اُن کو یک لخت عذاب میں پکڑا جائے گا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا یہی مطلب ہے کہ ”دُنیا مومن کے لئے قید خانہ اور کافر کے لئے جنت ہے“۔

دوسری اہم بات مسلمانوں کے تنزل اور پریشانی اور کفار کی ترقی و آرام کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر عمل کا جدا گانہ خاصہ رکھا ہے، ایک عمل کرنے سے دوسرے عمل کے خواص حاصل نہیں ہو سکتے، مثلاً تجارت کا خاصہ ہے مال میں زیادتی، دواء کا خاصہ ہے بدن کی صحت، اب اگر کوئی شخص تجارت میں تو دن رات لگا رہے بیماری اور اس کے علاج کی طرف توجہ نہ دے تو محض تجارت کے سبب وہ بیماری سے نجات نہیں پاسکتا، اسی طرح دوا دار کو استعمال کر کے تجارت کا خاصہ یعنی مال کی زیادتی حاصل نہیں کر سکتا، کفار کی دنیوی ترقی اور مال و دولت کی فراوانی ان کے کفر کا نتیجہ نہیں، جیسے مسلمان کا افلاس

و پریشانی اسلام کا نتیجہ نہیں، بلکہ کفار نے جب آخرت کی فکر چھوڑ دی اور پوری طرح دُنیا کے مال و دولت اور عیش و آرام کی فکر میں لگ گئے، تجارت، صنعت، زراعت اور حکومت و سیاست کے مفید راستوں کو اختیار کیا، مضر طریقوں سے بچے، تو دُنیا میں ترقی حاصل کر لی، اگر وہ بھی ہماری طرح صرف اپنے اپنے مذہب کا نام لے کر بیٹھ جاتے اور دُنوی ترقی کے لئے اس کے اُصول کے مطابق جدوجہد نہ کرتے تو ان کا کفر اُن کو مال و دولت یا حکومت کا مالک نہ بنا دیتا، پھر ہم یہ کیسے سمجھ لیں کہ ہمارا اسلام اور وہ بھی صرف نام کا، ہماری ساری فتوحات کے دروازے کھول دے گا؟ اسلام و ایمان اگر بالکل صحیح اُصول پر بھی ہو تو اس کا اصلی خاصہ اور نتیجہ نجاتِ آخرت اور جنت کی دائمی راحت ہے، دُنیا میں مال و دولت کی فراوانی یا عیش و آرام کی وسعت اس کے نتیجے میں حاصل کرنا ضروری نہیں جب تک اس کے لئے مناسب جدوجہد نہ کی جائے۔

اور یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ جہاں کہیں اور جب کوئی مسلمان تجارت و صنعت، حکومت و سیاست کے اُصول صحیحہ کو سیکھ کر ان پر عمل پیرا ہو جاتا ہے تو وہ بھی ان دُنوی ثمرات و نتائج سے محروم نہیں رہتا جو کسی کافر کو حاصل ہو رہے ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ دُنیا میں ہمارا افلاس و احتیاج اور مصائب و آفات ہمارے اسلام کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک طرف اسلامی اخلاق و اعمال چھوڑنے کا اور دُوسری طرف ان تمام کاموں سے منہ موڑنے کا نتیجہ ہے، جن کے عمل میں لانے سے مال و دولت میں زیادتی ہوا کرتی ہے۔

افسوس ہے کہ ہمیں جب یورپ والوں کے ساتھ اختلاط کا اتفاق پیش آیا تو ہم نے ان سے صرف ان کا کفر اور آخرت سے غفلت اور بے حیائی و بداخلاقی تو سب سیکھ لی، لیکن ان کے وہ اعمال نہ سیکھے جن کی وجہ سے وہ دُنیا میں کامیاب نظر آتے ہیں، جس مقصد کے لئے کھڑے ہوں اس کے پیچھے اُن تھک کوشش، معاملہ کی سچائی، بات کی سچائی اور دُنیا میں اثر و رسوخ حاصل کرنے کے نئے نئے طریقے جو درحقیقت اسلام ہی کی اصلی تعلیمات ہیں ہم نے ان کو دیکھ کر بھی اس کی نقل اُتارنے کی کوشش نہ کی تو یہ قصور ہمارے اسلام کا ہے یا ہمارا اپنا قصور ہے۔

الغرض قرآن کی ان آیات نے واضح کر دیا کہ محض نسلی طور پر اسلام کا نام رکھ لینا کسی نتیجہ پر نہیں پہنچا سکتا، جب تک ایمان اور عمل صالح کو مکمل طور پر اختیار نہ کیا جائے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ

اور اس سے بڑا ظالم کون جس نے منع کیا اللہ کی مسجدوں میں کہ لیا جاوے وہاں نام اس کا اور کوشش کی

فِي خَرَابِهَآ ۖ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا اِلَّا خَافِيْنَ ۝۱۱۵ لَهُمْ

ان کے اُجاڑنے میں، ایسوں کو لائق نہیں کہ داخل ہوں اُن میں مگر ڈرتے ہوئے، ان کے لئے

فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۚ وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۱۱۴ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ

دُنیا میں ذلت ہے اور اُن کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔ اور اللہ ہی کا ہے مشرق

وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاٰتِبَاتُوْا فَاِنَّكُمْ وَجْهَ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ وَاَسِعُ عَلِيْمٌ ۝۱۱۵

اور مغرب سو جس طرف تم منہ کرو وہاں ہی متوجہ ہے اللہ، بے شک اللہ بے انتہا بخشش کرنے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

اور اُس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں پر اس بات کی بندش لگا دے کہ ان میں اللہ کا نام لیا جائے، اور ان کو ویران کرنے کی کوشش کرے۔ ایسے لوگوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان (مسجدوں) میں داخل ہوں مگر ڈرتے ہوئے۔ ایسے لوگوں کے لئے دُنیا میں رُسوائی ہے، اور انہی کو آخرت میں زبردست عذاب ہوگا۔ ۝۱۱۴ اور مشرق و مغرب سب اللہ ہی کی ہیں۔ لہذا جس طرف بھی تم رُخ کرو گے، وہیں اللہ کا رُخ ہے۔ بیشک اللہ بہت وسعت والا، بڑا علم رکھنے والا ہے ۝۱۱۵

خلاصہ تفسیر

(یہود تو قبلہ کا حکم بدلنے کے وقت طرح طرح کے اعتراض کر کے کم سمجھ لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا کرتے تھے، اگر وہ شبہات عام طور پر قلوب میں اثر کرتے تو اُن کا لازمی نتیجہ انکار رسالت اور ترک نماز نکلتا، اور ترک نماز سے مسجد کی ویرانی لازم ہے، تو گویا یہ یہودی اس طور سے ترک نماز اور ویرانی مساجد خصوصاً مسجد نبوی میں بھی کوشاں تھے، اور روم کے بعض سلاطین جو نصاریٰ کے اسلاف تھے، اور نصاریٰ ان کے افعال کا انکار بھی نہ کرتے تھے، گو وہ نصرانی نہ ہوں، کسی زمانے میں یہودِ شام پر چڑھ آئے تھے، قتل و قتال بھی ہوا، اور اس وقت بعض جہلاء کے ہاتھ سے مسجد بیت المقدس کی

بے حرمتی بھی ہوئی، اور بد امنی کی وجہ سے اس میں نماز وغیرہ کا اہتمام بھی نہ ہوا، اس طور پر نصاریٰ کے اسلاف ترک نماز اور ویرانی مسجد کے بانی ہوئے، اور نصاریٰ پر بوجہ عدم انکار اس کا الزام دیا گیا، اس بادشاہ کا نام ”طیطس“ تھا، اور نصاریٰ کو یہ قصہ اس لئے ناگوار نہ تھا کہ اس میں یہودیوں کی تذلیل ہوئی تھی، اور یہ یہود سے عداوت رکھتے تھے، اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ سے پہلے جب مکہ معظمہ میں داخل ہو کر مسجد الحرام کا طواف اور نماز ادا فرمائی چاہی تو مشرکین مکہ نے آپ کو نہ جانے دیا، یہاں تک کہ آپ اس سال واپس تشریف لے آئے، تو اس طرح یہ مشرکین بھی مسجد حرام کی ویرانی میں کوشاں ہوئے، اس لئے حق تعالیٰ نے صیغہ عموم سے اس کی قباحت اور برائی ظاہر فرمائی، یعنی) اور اس شخص سے زیادہ اور کون ظالم ہوگا جو خدا تعالیٰ کی مسجدوں میں (جس میں مکہ کی مسجد حرام، مدینہ کی مسجد، بیت المقدس کی مسجد اور سب مسجدیں آگئیں) ان کا ذکر (اور عبادت) کئے جانے سے بندش کرے، اور ان (مساجد) کے ویران (اور معطل) ہونے (کے بارے) میں کوشش کرے، ان لوگوں کو تو کبھی بے ہیبت (اور بے باک) ہو کر ان (مساجد) میں قدم بھی نہ رکھنا چاہئے تھا، (بلکہ جب جاتے تو نہایت عظمت و حرمت و ادب سے جاتے، جب بے باک ہو کر اندر جانے تک کا استحقاق نہیں تو اس کی ہتک حرمت کا حق کب حاصل ہے، اسی کو ظلم فرمایا گیا) ان لوگوں کو دنیا میں بھی رسوائی (نصیب) ہوگی، اور ان کو آخرت میں بھی سزائے عظیم ہوگی۔

(یہود نے تبدیل قبلہ کے حکم پر اعتراض کیا تھا کہ مسلمان اس جہت سے دوسری جہت کی طرف کیوں پھر گئے، اس کا جواب حق تعالیٰ دیتے ہوئے فرماتے ہیں، یعنی) اور اللہ ہی کی مملوک ہیں (سب جہتیں) مشرق بھی اور مغرب بھی (اور وہ اس کا مکان نہیں)۔

(پس جب وہ مالک ہیں جس جہت کو چاہیں قبلہ مقرر کر دیں، کیونکہ حکمت تعین قبلہ میں مثلاً عابدین کا اتفاق ہیئت اور اجتماع خاطر ہے، اور یہ حکمت ہر جہت سے حاصل ہو سکتی ہے، جس کا حکم دے دیں وہی متعین ہو جائے گی، ہاں البتہ اگر معبود کی ذات نعوذ باللہ کسی جہت خاص کے ساتھ مقید ہوتی تو ضرورت کی وجہ سے اسی جہت میں قبلہ عبادت بننے کا انحصار زیبا تھا، لیکن وہ ذات پاک کسی جہت کے ساتھ مقید و محدود نہیں جب یہ بات ہے) تو تم لوگ جس طرف بھی منہ کرو ادھر (ہی) اللہ تعالیٰ (کی ذات پاک) کا رخ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ (خود تمام جہات اور اشیاء کو) محیط ہیں (جس طرح کا احاطہ ان کی شان کے لائق ہے، لیکن باوجود محیط و غیر محدود ہونے کے پھر بھی جہت عبادت کو متعین اس لئے فرمایا کہ وہ) کامل العلم ہیں (کہ ہر شے کے مصالح کو خوب جانتے ہیں، چونکہ ان کے علم میں یہ تعین بعض مصالح سے تھی، اس لئے اس کا حکم دے دیا)۔

فوائد از ”بیان القرآن“

۱- ویرانی مساجد میں کوشاں گروہ کی دنیا میں تو یہ رسوائی ہوئی کہ یہ ساری قومیں اسلامی سلطنت کی رعایا اور باج گزار ہوئیں، اور عذابِ آخرت تو کافر ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے ہی، اور ویرانی مساجد میں کوشش کے سبب یہ عذاب اور بھی سخت و شدید ہو جائے گا، اور اوپر کی آیت میں جو ان تینوں فرقوں کے حق پر ہونے کا دعویٰ مذکور ہوا تھا اس قصہ سے اس کی تردید کا ایک گونہ مفہوم بھی نکل آیا کہ ایسے ایسے افعال کر کے صاحبِ حق ہونے کا دعویٰ بڑے شرم کی بات ہے۔

۲- تعیین قبلہ کی جو ایک حکمت بطور مثال اُوپر بیان کی گئی، اس سے بعض مخالفین اسلام کا یہ اعتراض کہ ”مسلمان کعبہ پرست ہیں“ بالکل اٹھ گیا۔

جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ عبادت و پرستش تو خدا تعالیٰ کی ہے، لیکن عبادت کے وقت یکسوئی قلب کی ضرورت ہے، نیز عابدین کی ہیئتِ اجتماعیہ کو بھی اس یکسوئی میں دخل ہے، چنانچہ یہ دونوں باتیں تجربہ و مشاہدہ سے ثابت ہیں، اس لئے یکسوئی اور اجتماعی ہیئت حاصل کرنے کے لئے تعیینِ جہت مشروع ہوئی، لہذا اس اعتراض و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

اور اگر اس پر کوئی اپنی براءت کے لئے یہ دعویٰ کرے کہ ہم بھی بتوں کو سامنے اسی قصد و غرض سے رکھتے ہیں، تو اوّل تو اپنی براءت کے دعوے سے مسلمانوں پر مذکورہ اعتراض نہیں لوٹا، وہ بدستور مرتفع رہا، جو اس مقام پر مقصودِ اصلی ہے۔ ثانیاً، عام مسلمانوں اور عام کافروں کی حالت تفتیش کرنے سے عدمِ پرستش کے دعوے میں مسلمانوں کا راستہ گواہ ہونا اور دُوسروں کا دروغ گو ہونا ہر وقت، ہر شخص کو معلوم ہو سکتا ہے۔

تیسرے، علی السبیل التّنزل کہا جاتا ہے کہ اگر اس دعوے کی سچائی مان بھی لی جائے پھر بھی اس تعیین اور تفتید کے لئے کسی غیر منسوخ شریعت کا حکم پیش کرنا لازم ہے، اور یہ بجز اہل اسلام کے دُوسروں کے پاس مفقود ہے۔

اور ترجمہ و تفسیر کے ضمن میں بیانِ حکمت کے لئے جو لفظ مثلاً اضافہ کیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ احکامِ خداوندی کی حکمتیں اور مصلحتیں انحصار اور استیعاب کے ساتھ کسی کے ادراک میں نہیں آ سکتیں، سو اس حکم میں بھی ہزاروں حکمتیں ہوں گی، ایک دو کے سمجھ جانے سے ان میں انحصار اور دُوسروں کی نفی نہیں ہو سکتی۔

۳- اور یہ جو فرمایا ہے کہ ”اُدھر ہی اللہ کا رخ ہے“ اور اسی طرح یہ جو فرمایا ہے کہ ”وہ محیط ہے“ اور ایسے ہی جو مضامین ہوں ان سب میں زیادہ کھود کرید نہ کرنی چاہئے، کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کا پورا ادراک کسی بندہ سے ممکن نہیں، اسی طرح اس کی صفات کی حقیقت بھی فہم سے خارج ہے، اجمالاً سب پر ایمان لے آوے، اس سے زیادہ کا انسان مکلف نہیں۔

عنقا شکار کس نشود دام باز چین

کایجا ہمیشہ باد بدست است دام را

معارف و مسائل

ان دو آیتوں میں دو اہم مسئلوں کا بیان ہے، پہلی آیت ایک خاص واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ زمانہ اسلام سے پہلے جب یہودیوں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو قتل کر ڈالا تو روم کے نصاریٰ نے ان سے انتقام لینے کی خاطر عراق کے ایک مجوسی بادشاہ کے ساتھ مل کر اپنے بادشاہ طیطوس کی سرکردگی میں شام کے بنی اسرائیل پر حملہ کر کے ان کو قتل و غارت کیا اور توراۃ کے نسخے جلا ڈالے، بیت المقدس میں نجاسات اور خنزیر ڈال دیئے، اس کی عمارت کو خراب و ویران کر دیا، بنی اسرائیل کی قوت و شوکت کو بالکل پامال اور ختم کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک بیت المقدس اسی طرح ویران و منہدم پڑا تھا۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب شام و عراق فتح ہوئے تو آپ کے حکم سے بیت المقدس کی دوبارہ تعمیر کرائی گئی، زمانہ دراز تک پورا ملک شام و بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ میں رہا، پھر ایک عرصے کے بعد بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گیا، اور تقریباً سو سال یورپ کے عیسائیوں کا اس پر قبضہ رہا، تا آنکہ چھٹی صدی ہجری میں سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے پھر اس کو فتح کیا۔

رُومی نصاریٰ کی اس گستاخانہ حرکت پر کہ توراۃ کو جلایا اور بیت المقدس کو خراب و ویران کر کے اس کی بے حرمتی کی، یہ آیت نازل ہوئی۔

یہ قول مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ہے، اور حضرت ابن زیدؒ وغیرہ دوسرے مفسرین نے آیت کا شان نزول یہ بتلایا ہے کہ جب مشرکین مکہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعہ حدیبیہ کے وقت مسجد حرام میں داخل ہونے اور طواف کرنے سے روک دیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن جریرؒ نے پہلی روایت کو اور ابن کثیرؒ نے دوسری کو ترجیح دی ہے۔

۱ ترجمہ:- عنقا پرندہ کسی کے شکار میں نہیں آسکتا، اپنا جال اٹھاو، یہاں جال میں ہمیشہ ہوا ہی آیا کرتی ہے۔

۲ بعض مفسرین نے اس مجوسی بادشاہ کا نام ”بخت نصر“ بتلایا، اس سے معروف بخت نصر تو اس لئے مراد نہیں ہو سکتا کہ اس کا زمانہ حضرت یحییٰ علیہ السلام سے بہت پہلے ہے، یہ ممکن ہے کہ بعد میں کسی دوسرے بادشاہ کو ”بخت نصر ثانی“ کہنے لگے ہوں۔ ۱۲ (محمد شفیع)

۳ تفسیر الطبری تحت هذه الآية ج: ۲ ص: ۵۲۰ و تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۳۸۸

بہر حال آیت کا شان نزول تو مفسرین کے نزدیک ان دونوں واقعوں میں سے کوئی خاص واقعہ ہے، مگر اس کا بیان عام لفظوں میں ایک مستقل ضابطہ اور قانون کے الفاظ میں فرمایا گیا ہے، تاکہ یہ حکم انہی نصاریٰ یا مشرکین وغیرہ کے لئے مخصوص نہ سمجھا جائے بلکہ تمام اقوام عالم کے لئے عام رہے، یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں خاص بیت المقدس کا نام لینے کے بجائے **مَسْجِدَ اللہ** فرما کر تمام مساجد پر اس حکم کو عام کر دیا گیا، اور آیت کا مضمون یہ ہو گیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی کسی مسجد میں لوگوں کو اللہ کا ذکر کرنے سے روکے، یا کوئی ایسا کام کرے جس سے مسجد ویران ہو جائے تو وہ بہت بڑا ظالم ہے۔ مساجد اللہ کی عظمت کا مقتضی یہ ہے کہ ان میں جو شخص داخل ہو، ہیبت و عظمت اور خشوع و خضوع کے ساتھ داخل ہو، جیسے کسی شاہی دربار میں داخل ہوتے ہیں۔

اس آیت سے جو چند ضروری مسائل و احکام نکلے ان کی تفصیل یہ ہے:-

اول یہ کہ دنیا کی تمام مساجد آداب مسجد کے لحاظ سے مساوی ہیں، جیسے بیت المقدس، مسجد حرام یا مسجد نبوی کی بے حرمتی ظلم عظیم ہے، اسی طرح دوسری تمام مساجد کے متعلق بھی یہی حکم ہے، اگرچہ ان تینوں مساجد کی خاص بزرگی و عظمت اپنی جگہ مسلم ہے کہ مسجد حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر، اور مسجد نبوی و نیز بیت المقدس میں پچاس ہزار نمازوں کے برابر ملتا ہے، ان تینوں مساجد میں نماز پڑھنے کی خاطر دُور دراز ملکوں سے سفر کر کے پہنچنا موجب ثواب عظیم اور باعث برکات ہے، بخلاف دوسری مساجد کے کہ ان تینوں کے علاوہ کسی دوسری مسجد میں نماز پڑھنے کو افضل جان کر اس کے لئے دُور سے سفر کر کے آنے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ مسجد میں ذکر و نماز سے روکنے کی جتنی بھی صورتیں ہیں وہ سب ناجائز و حرام ہیں، ان میں سے ایک صورت تو یہ کھلی ہوئی ہے ہی کہ کسی کو مسجد میں جانے سے یا وہاں نماز و تلاوت سے صراحتاً روکا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ مسجد میں شور و شغب کر کے یا اس کے قرب و جوار میں باجے گاجے بجا کر لوگوں کی نماز و ذکر وغیرہ میں خلل ڈالے، یہ بھی ذکر اللہ سے روکنے میں داخل ہے۔

اسی طرح اوقات نماز میں جبکہ لوگ اپنی نوافل یا تسبیح و تلاوت وغیرہ میں مشغول ہوں، مسجد میں کوئی بلند آواز سے تلاوت یا ذکر بالجہر کرنے لگے، تو یہ بھی نمازیوں کی نماز و تسبیح میں خلل ڈالنے اور ایک حیثیت سے ذکر اللہ کو روکنے کی صورت ہے، اسی لئے حضرات فقہاء نے اس کو بھی ناجائز قرار دیا ہے، ہاں جب مسجد عام نمازیوں سے خالی ہو، اس وقت ذکر یا تلاوت جہر کا مضا لفقہ نہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس وقت لوگ نماز و تسبیح وغیرہ میں مشغول ہوں مسجد میں اپنے لئے سوال کرنا یا کسی

دینی کام کے لئے چندہ کرنا بھی ایسے وقت ممنوع ہے۔

تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ مسجد کی ویرانی کی جتنی بھی صورتیں ہیں سب حرام ہیں، اس میں جس طرح کھلے طور پر مسجد کو منہدم اور ویران کرنا داخل ہے، اسی طرح ایسے اسباب پیدا کرنا بھی اس میں داخل ہے جن کی وجہ سے مسجد ویران ہو جائے، اور مسجد کی ویرانی یہ ہے کہ وہاں نماز کے لئے لوگ نہ آئیں، یا کم ہو جائیں، کیونکہ مسجد کی تعمیر و آبادی دراصل درود یواریاں کے نقش و نگار سے نہیں، بلکہ ان میں اللہ کا ذکر کرنے والوں سے ہے، اسی لئے قرآن شریف میں ایک جگہ ارشاد ہے:-

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسْجِدًا لِلّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاَتٰى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ (التوبہ: ۱۸)

”یعنی اصل میں مسجد کی آبادی ان لوگوں سے ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائیں اور روز قیامت پر، اور نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔“

اسی لئے حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرب قیامت میں مسلمانوں کی مسجدیں بظاہر آباد اور مزین و خوب صورت ہوں گی، مگر حقیقتہً ویران ہوں گی کہ ان میں حاضر ہونے والے نمازی کم ہو جائیں گے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ شرافت و انسانیت کے چھ کام ہیں، تین حضرات کے اور تین سفر کے، حضر کے تین یہ ہیں: تلاوت قرآن کرنا، مسجدوں کو آباد کرنا، ایسے دوستوں کی جمعیت بنانا جو اللہ تعالیٰ اور دین کے کاموں میں امداد کریں، اور سفر کے تین کام یہ ہیں: اپنے توشے سے غریب ساتھیوں پر خرچ کرنا، حسن خلق سے پیش آنا، اور رفقائے سفر کے ساتھ ہنسی خوشی، تفریح و خوش طبعی کا طرز عمل رکھنا، بشرطیکہ یہ خوش طبعی گناہ کی حد میں داخل نہ ہو جائے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد میں مسجدوں کے آباد کرنے کا مطلب یہی ہے کہ وہاں خشوع خضوع کے ساتھ حاضر بھی ہوں، اور وہاں حاضر ہو کر ذکر و تلاوت میں مشغول رہیں، اب اس کے مقابلہ میں مسجد کی ویرانی یہ ہوگی کہ وہاں نمازی نہ رہیں یا کم ہو جائیں، یا ایسے اسباب جمع ہوں جن سے خشوع و خضوع میں خلل آئے۔

اور اگر آیت کا شان نزول واقعہ حدیبیہ اور مشرکین مکہ کا مسلمانوں کو مسجد حرام سے روکنا ہے تو اسی آیت سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ مساجد کی ویرانی صرف یہی نہیں کہ انہیں منہدم کر دیا جائے، بلکہ مساجد جس مقصد کے لئے بنائی گئی ہیں یعنی نماز اور ذکر اللہ، جب وہ نہ رہے یا کم ہو جائے تو مساجد ویران کہلائیں گی۔

تحویل قبلہ کی بحث

دوسری آیت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تسلی دی گئی ہے کہ مشرکین مکہ نے اگرچہ

آپ کو مکہ اور بیت اللہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا، اور مدینہ پہنچ کر ابتدائی زمانے میں سولہ سترہ مہینے تک آپ کو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا، لیکن اس میں آپ کا کوئی نقصان نہیں، نہ آپ کے لئے غمگین ہونے کی کوئی وجہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کسی خاص سمت میں نہیں، وہ ہر جگہ ہے، اس کے لئے مشرق و مغرب یکساں ہیں، کعبہ کو قبلہ نماز بنائیں، یا بیت المقدس کو، دونوں میں کوئی ذاتی خصوصیت نہیں، بلکہ امر الہی کی تعمیل ہی دونوں جگہ سبب فضیلت ہے۔

داوٰی حق را قابلیت شرط نیست

بلکہ شرط قابلیت داد ہست

اس لئے جب کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم تھا اُس میں فضیلت تھی، اور جب بیت المقدس کا استقبال کرنے کا حکم ہو گیا تو اس میں فضیلت ہے، آپ دلگیر نہ ہوں، اللہ تعالیٰ کی توجہ دونوں حالتوں میں یکساں ہے، جبکہ بندہ اس کے حکم کی تعمیل کر رہا ہو۔

چند مہینوں کے لئے بیت المقدس کو قبلہ قرار دینے کا حکم دے کر عملاً اور آپ نے قولاً اس بات کو واضح کر دیا کہ کسی خاص مکان یا سمت کو قبلہ قرار دینا اس وجہ سے نہیں کہ معاذ اللہ خدا تعالیٰ اس مکان یا اس سمت میں ہے، دوسری جگہ میں نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ، ہر سمت میں یکساں توجہ کے ساتھ موجود ہے، کسی خاص سمت کو قبلہ عالم قرار دینا دوسری حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کی توجہ کسی خاص سمت یا جگہ کے ساتھ مقید نہیں تو اَب عمل کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ ہر شخص کو اختیار دے دیا جائے کہ جس طرف چاہے رخ کر کے نماز پڑھے، دوسرے یہ کہ سب کے لئے کوئی خاص سمت و جہت معین کر دی جائے، ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں ایک تشتت و افتراق کا منظر سامنے آئے گا، کہ دس آدمی نماز پڑھ رہے ہیں، اور ہر ایک کا رخ الگ الگ اور ہر ایک کا قبلہ جدا جدا ہے، اور دوسری صورت میں تنظیم و اتحاد کا عملی سبق ملتا ہے، ان حکمتوں کی بنا پر سارے عالم کا قبلہ ایک ہی چیز کو بنانا زیادہ مناسب ہے، اب وہ بیت المقدس ہو یا کعبہ، دونوں مقدس اور متبرک مقامات ہیں، ہر قوم اور ہر زمانے کے مناسب اللہ تعالیٰ کی طرف سے احکام آتے ہیں، ایک زمانے تک بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی دلی خواہش کے مطابق اس حکم کو منسوخ کر کے کعبہ کو قبلہ عالم بنا دیا گیا، ارشاد ہوا:-

قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا ۚ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ

مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهُكُمْ شَطْرًا ۚ (البقرة: ۱۴۴)

ترجمہ:- اللہ تعالیٰ کی عنایت کے لئے قابلیت شرط نہیں ہے بلکہ قابلیت کے لئے اللہ تعالیٰ کی عنایت شرط ہے۔

” (یعنی کعبہ کو قبلہ بنادینے کی دلی رغبت کی وجہ سے) بار بار آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دیکھتے ہیں (کہ شاید فرشتہ حکم لے آئے) ہم یہ سب دیکھ رہے ہیں، اس لئے اب ہم آپ کو اسی قبلے کی طرف متوجہ کر دیں گے جس کو آپ چاہتے ہیں، اس لئے اب سے آپ اپنا چہرہ نماز میں مسجد حرام کی طرف کیا کریں، اور (یہ حکم کچھ آپ ہی کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ تمام امت کے لئے یہی حکم دے دیا گیا کہ) تم جہاں کہیں بھی موجود ہو (یہاں تک کہ خود بیت المقدس کے اندر بھی ہو) تو نماز میں اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کیا کرو۔“

الغرض آیت مذکورہ **وَاللَّهُ الشَّرِيقُ وَالْمُعَرَّبُ** نے استقبال قبلہ کی پوری حقیقت کو واضح کر دیا کہ اس کا منشا بیت اللہ یا بیت المقدس کی معاذ اللہ پرستش نہیں، اور نہ ان دونوں مکانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک مخصوص ہے، بلکہ اس کی ذات سارے عالم پر محیط اور ہر سمت میں اس کی توجہ یکساں ہے، پھر جو کسی خاص مکان یا سمت کو مخصوص کیا جاتا ہے اس میں دوسری حکمتیں ہیں۔

آیت مذکورہ کے اس مضمون کو واضح اور دل نشین کرنے ہی کے لئے شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کو ہجرت کے اوائل میں سولہ سترہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم دے کر عملی طور پر بتلادیا گیا کہ ہماری توجہ ہر طرف ہے، اور نوافل میں اس حکم کو ہمیشہ کے لئے جاری رکھا کہ سفر میں کوئی شخص کسی سواری مثلاً اونٹ، گھوڑے وغیرہ پر سوار ہو تو اس کو اجازت ہے کہ سواری پر بیٹھے ہوئے اشارہ سے نفلی نماز پڑھ لے، اور اس کے لئے قبلہ کی طرف رخ کرنا بھی ضروری نہیں، جس طرف اس کی سواری چل رہی ہے اسی طرف رخ کر لینا کافی ہے۔

بعض مفسرین نے آیت **فَإِيَّانَا تُنْفِلُوا فَتَمُّ وَجْهِ اللَّهِ** کو اسی نفلی نماز کا حکم قرار دیا ہے، مگر یاد رہے کہ یہ حکم صرف ان سوار یوں کا ہے جن پر سوار ہو کر چلتے ہوئے قبلہ کی طرف رخ کرنا دشوار ہے، اور جن سوار یوں میں سوار کو قبلہ کی طرف رخ کر لینا دشوار نہیں، جیسے ریل، پانی کا جہاز، ہوائی جہاز، ان کا وہی حکم ہے جو حالت حضر میں رخ قبلہ کا ہے، کہ اگر نفل نماز بھی ان میں پڑھی جائے تو قبلہ رخ ہو کر پڑھی جائے، (البتہ نماز کی حالت میں ریل کا یا جہاز کا رخ مڑ جائے اور نماز کے لئے گنجائش نہ ہو کہ وہ بھی قبلہ رخ پھر جائے، تو اسی حالت میں نماز پوری کر لے)۔

اسی طرح جہاں نماز کو سمت قبلہ معلوم نہ ہو، اور رات کی اندھیری وغیرہ کی وجہ سے سمتیں متعین کرنا بھی دشوار ہو، اور کوئی بتلانے والا بھی نہ ہو تو وہاں بھی یہی حکم ہے کہ وہ اپنا اندازہ اور تخمینہ لگا کر جس طرف کو بھی متعین کر لے گا وہی سمت اس کا قبلہ قرار دی جائے گی، نماز ادا کرنے کے بعد اگر یہ بھی ثابت ہو جائے کہ اس نے غلط سمت میں نماز ادا کی ہے، تب بھی نماز صحیح ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں۔

آیت کے اس بیان اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل اور جزئیات مذکورہ سے استقبالِ قبلہ کے حکم شرعی کی پوری حقیقت واضح ہو گئی۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا ۚ سُبْحَنَهُ ۚ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط

اور کہتے ہیں کہ اللہ رکھتا ہے اولاد، وہ تو سب باتوں سے پاک ہے، بلکہ اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں،

كُلُّ لَّهٗ قِنْدَرٌ ۝۱۱۷ بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَإِذَا قَضٰی اَمْرًا

سب اسی کے تابعدار ہیں۔ نیا پیدا کرنے والا ہے آسمان اور زمین کا اور جب حکم کرتا ہے کسی کام کو

فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۱۱۸

تو یہی فرماتا ہے اس کو کہ ہو جا، پس وہ ہو جاتا ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے کوئی بیٹا بنایا ہوا ہے، (حالانکہ) اس کی ذات (اس قسم کی چیزوں سے) پاک ہے، بلکہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اُسی کا ہے۔ سب کے سب اس کے فرماں بردار ہیں ۝۱۱۷ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے، اور جب وہ کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے بارے میں بس اتنا کہتا ہے کہ: ”ہو جا“ چنانچہ وہ ہو جاتی ہے۔ ۝۱۱۸

خلاصہ تفسیر

(بعض یہودی حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو، اور مشرکین عرب ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں، جیسا مختلف آیات میں ان اقوال کی خبر دی گئی ہے، حق تعالیٰ اس قول کی قباحت اور بطلان کا بیان فرماتے ہیں، یعنی) اور یہ لوگ (مختلف عنوان سے) کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اولاد رکھتا ہے، سبحان اللہ (کیا مہمل بات ہے) بلکہ (ان کے تو اولاد ہونا عقلاً ممکن نہیں، کیونکہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو اولاد غیر جنس ہوگی اور یا ہم جنس ہوگی، اگر غیر جنس ہو تب تو ناجنس اولاد ہونا عیب ہے، اور حق تعالیٰ عیب سے پاک ہے، عقلاً بھی جیسا مُسَلَّم ہے، اور نقلاً بھی جیسا سبحانہ مذکور کا بھی مدلول ہے، اور اگر ہم جنس ہو تو اس لئے باطل ہے کہ حق تعالیٰ کا کوئی ہم جنس نہیں، کیونکہ جو صفات کمال لوازم

ذات واجبہ سے ہیں وہ اللہ کے ساتھ مخصوص اور غیر اللہ میں معدوم ہیں، اور لازم کی نفی ملزوم کی نفی کی دلیل ہے، اس لئے غیر اللہ ذات واجب نہ ہوگا، اور وجوب خود عین حقیقت یا لازم حقیقت ہے، پس کوئی غیر اللہ، اللہ کے ساتھ حقیقت میں شریک نہ ہوا، لہذا ہم جنس ہونا بھی باطل ہو گیا، اب صفات کمال صرف حق تعالیٰ ہی کے ساتھ مختص ہونے کی دلیلیں مذکور ہوتی ہیں، اول یہ کہ (خاص اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں (موجودات) ہیں (اور دوسرے یہ کہ مملوک ہونے کے ساتھ) سب ان کے محکوم (بھی) ہیں (بایں معنی کہ ان کے تصرفات قدرت جیسے مارنا، جلانا وغیرہ کو کوئی نہیں ہٹا سکتا، گواہ احکام شرعیہ کو کوئی ٹال دے اور تیسرے یہ کہ حق تعالیٰ) موجد (بھی) ہیں آسمانوں اور زمین کے اور (چوتھے یہ کہ ایجاد کی بھی قدرت ایسی عظیم و عجیب ہے کہ) جب کسی کام کا (مثلاً پیدا ہی کرنا ہے) پورا کرنا چاہتے ہیں تو بس (اتنی بات ہے کہ) اس کو (اتنا) فرمادیتے ہیں کہ ہو جا، بس وہ (اسی طرح) ہو جاتا ہے، (ان کو آلات و اسباب اور صناعات اور معینوں کی ضرورت نہیں پڑتی، اور یہ چاروں امر بجز حق تعالیٰ کے کسی میں نہیں پائے جاتے، اور یہ مدعیان اولاد کے بھی مسلمات سے تھا، پس دلیل سے مقدمہ اختصاص بھی ثابت ہو کر حجت تمام ہو گئی)۔

فوائد

- ۱- خاص خاص کاموں پر خاص خاص ملائکہ کو مقرر کرنا، مثلاً بارش، رزق وغیرہ، اور اسی طرح اسباب اور مواد اور قوی سے کام لینا، یہ سب کسی حکمت خداوندی پر مبنی ہوتا ہے، اس لئے نہیں کہ لوگ انہیں اسباب و قوت کو حاجت روا مان کر استعانت و مدد کے طلب گار ہوں۔
- ۲- بیضاویؒ نے کہا ہے کہ پہلی شرائع میں اللہ تعالیٰ کو سبب اول ہونے کی وجہ سے باپ کہا کرتے تھے، جاہلوں نے ولادت کے معنی سمجھ لئے، اس لئے یہ عقیدہ رکھنا یا ایسا کہنا کفر قرار دیا گیا، دفع فساد کی مصلحت سے اب ایسے لفظ کے استعمال کی بالکل اجازت نہیں۔

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ

اور کہتے ہیں وہ لوگ جو کچھ نہیں جانتے: کیوں نہیں بات کرتا ہے ہم سے اللہ یا کیوں نہیں آتی ہمارے پاس کوئی آیت،

كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ^ط تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ^ط

اسی طرح کہہ چکے ہیں وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے انہی کی سی بات، ایک سے ہیں دل ان کے،

قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿۱۱۸﴾

بے شک ہم نے بیان کر دیں نشانیاں اُن لوگوں کے واسطے جو یقین لاتے ہیں۔

آسان ترجمہ قرآن

اور جو لوگ علم نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ: اللہ ہم سے (براہِ راست) کیوں بات نہیں کرتا؟ یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں وہ بھی اسی طرح کی باتیں کہتے تھے جیسی یہ کہتے ہیں۔ ان سب کے دل ایک جیسے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ یقین کرنا چاہیں اُن کے لئے ہم نشانیاں پہلے ہی واضح کر چکے ہیں۔ ﴿۱۱۸﴾

خلاصہ تفسیر

اور (بعض) جاہل (یہود و نصاریٰ اور مشرکین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں) یوں کہتے ہیں کہ (خود) اللہ تعالیٰ ہم سے کلام کیوں نہیں فرماتے (خواہ فرشتوں کے بغیر، جیسے خود فرشتوں سے کلام فرماتے ہیں، یا فرشتوں کے واسطے سے، جیسے پیغمبروں سے بطور وحی بات کرتے ہیں، اور اس کلام میں یا تو خود ہم کو احکام بتادیں کہ دوسرے رسول کی ہم کو ضرورت ہی نہ رہے، یا کم از کم اتنا ہی کہہ دیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے رسول ہیں، تو ہم ان کی ہی رسالت کے قائل ہو کر ان کی اطاعت کرنے لگیں) یا (کلام نہیں کرتے تو) ہمارے پاس کوئی اور ہی دلیل (ثبوتِ رسالت کی) آجائے (حق تعالیٰ اولاً اس بات کا جاہلانہ رسم ہونا بتلاتے ہیں کہ) اس طرح وہ (جاہل) لوگ بھی کہتے چلے آئے ہیں جو اُن سے پہلے ہو گزرے ہیں، ان ہی کا سا (جاہلانہ) قول (سو معلوم ہوا کہ یہ قول کوئی با وقعت اور باریک بینی پر مبنی نہیں، یوں ہی ہانک دیا جاتا ہے، پھر ثانیاً اس قول کا منشا اور سبب بیان فرماتے ہیں کہ) ان سب (اگلے پچھلے جاہلوں) کے قلوب (کج فہمی میں) با ہم ایک دوسرے کے مشابہ ہیں (اس لئے سب سے بات بھی ایک ہی سی پیدا ہوئی، پھر ثالثاً اس قول کا جواب دیتے ہیں، اور چونکہ اس قول کا جزو اول حماقت محض تھا، کہ اپنے کو اس لیاقت پر ہم پلہ ملائکہ اور انبیاء کا بنانا چاہتے تھے، جو بالکل ہی بدیہی البطلان ہے، اس لئے اس احمقانہ بات کو نظر انداز کر کے صرف دوسرے جز کا جواب ارشاد ہوتا ہے کہ تم تو ایک دلیل کو لئے پھرتے ہو) ہم نے تو بہت سی دلیلیں (رسالتِ محمدیہ کے ثبوت میں) صاف صاف بیان کر دی ہیں (مگر وہ) ان لوگوں کے لئے (نافع و کافی ہو سکتی ہیں) جو یقین (اور اطمینان حاصل کرنا) چاہتے ہیں (اور چونکہ معترضین کو محض ضد اور کد ہی مقصود ہے اس لئے حق طلبی کی نظر سے اُن کو تحقیق ہی منظور نہیں، سو ایسوں کی تسلی و تشریف کا کون ذمہ دار بنے)۔

فائدہ:- یہود و نصاریٰ تو اہل کتاب تھے، ان میں اہل علم بھی تھے، اس کے باوجود جو ان کو اللہ تعالیٰ نے جاہل فرمایا تو اس لئے کہ باوجودیکہ قطعی اور قوی دلائل کثرت سے قائم کر دیئے گئے تھے پھر بھی جو انکار کئے جا رہے تھے تو جہالت نہیں تو اور کیا تھا، اور یہ جاہلوں ہی کی سی بات کہلائے گی، لہذا اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو جاہل فرمایا۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۖ وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ ۝۱۱۹

بے شک ہم نے تجھ کو بھیجا ہے سچا دین دے کر خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا، اور تجھ سے پوچھ نہیں دوزخ میں رہنے والوں کی۔

آسان ترجمہ قرآن

(اے پیغمبر!) بے شک ہم نے تمہیں کو حق دے کر اس طرح بھیجا ہے کہ تم (جنت کی) خوشخبری دو اور (جہنم سے) ڈراؤ۔ اور جو لوگ (اپنی مرضی سے) جہنم (کا راستہ) اختیار کر چکے ہیں ان کے بارے میں آپ سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ ۱۱۹

خلاصہ تفسیر

(چونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ رحمۃ للعالمین کا تقاضا یہ ہو سکتا تھا کہ آپ کو اس جہالت اور عناد کی بدولت دل تنگی پیش آتی، اور ان کے ایمان نہ لانے کی کوئی صورت سمجھ میں نہ آنے کے سبب آپ ملول و آزرده خاطر ہو جاتے، اس لئے اللہ تعالیٰ آپ کی تسلی کے لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ اے رسول) ہم نے آپ کو ایک سچا دین دے کر (خلق کی طرف) بھیجا ہے کہ (ماننے والوں کو) خوش خبری سناتے رہئے اور (نہ ماننے والوں کو سزا سے) ڈراتے رہئے، اور آپ سے دوزخ میں جانے والوں کی باز پرس نہ ہوگی (کہ ان لوگوں نے کیوں نہیں قبول کیا اور کیوں دوزخ میں گئے، آپ اپنا کام کرتے رہئے، آپ کو کسی کے ماننے یا نہ ماننے کی کوئی فکر نہیں کرنی چاہئے)۔

وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۖ قُلْ

اور ہرگز راضی نہ ہوں گے تجھ سے یہود اور نہ نصاریٰ جب تک تو تابع نہ ہو ان کے دین کا، تو کہہ دے

إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ ۖ وَلَئِنَّ آتِیْتَهُمْ بِعَدَ

جو راہ اللہ بتا دے وہی راہ سیدھی ہے، اور اگر بالفرض تو تابعداری کرے ان کی خواہشوں کی بعد

الَّذِی جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۚ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن وَلِیٍّ وَلَا نَصِیْرٍ ۝۱۲۰

اس علم کے جو تجھ کو پہنچا، تو تیرا کوئی نہیں اللہ کے ہاتھ سے حمایت کرنے والا اور نہ مددگار۔

آسان ترجمہ قرآن

اور یہود و نصاریٰ تم سے اس وقت تک ہرگز راضی نہیں ہوں گے جب تک تم ان کے مذہب کی پیروی نہیں کرو گے۔ کہہ دو کہ حقیقی ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے۔ اور تمہارے پاس (وحی کے ذریعے) جو علم آ گیا ہے، اگر کہیں تم نے اس کے بعد بھی ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی کر لی تو تمہیں اللہ سے بچانے کے لئے نہ کوئی حمایتی ملے گا نہ کوئی مددگار۔ ۱۲۰

خلاصہ تفسیر

اور کبھی خوش نہ ہوں گے آپ سے یہ یہود اور نہ یہ نصاریٰ، جب تک کہ آپ (خدا نخواستہ) ان کے مذہب کے (بالکل) پیرو نہ ہو جائیں (اور یہ محال ہے، پس ان کا راضی ہونا محال ہے، اور اگر کبھی اس قسم کی بات ان کی زبان یا حال سے مترشح ہو تو) آپ (صاف) کہہ دیجئے کہ (بھائی) حقیقت میں ہدایت کا تو وہی راستہ ہے جس کو خدا نے (ہدایت کا راستہ) بتلایا ہے، (اور دلائل سے ایسا راستہ صرف اسلام ہونا ثابت ہو چکا ہے، پس راہ ہدایت وہی رہا) اور (یہ امر کہ آپ نعوذ باللہ ان کے مذہب کے پیرو ہو جائیں محال اس لئے ہے کہ اس سے ایک محال لازم آتا ہے، کیونکہ) اگر آپ ان کے غلط خیالات کا اتباع کرنے لگیں (جس کو وہ اپنا مذہب سمجھتے ہیں مگر کچھ تحریف سے اور کچھ منسوخ ہو جانے سے اب وہ محض چند غلط خیالات کا مجموعہ رہ گیا ہے، اور پھر اتباع بھی کیسی حالت میں کہ) علم (قطعی ثابت بالوحی) آپکنے کے بعد تو (ایسی حالت میں تو) آپ کا کوئی خدا سے بچانے والا نہ یار نکلے نہ مددگار (بلکہ تو بہ تو بہ پیچہ قہر میں گرفتار ہو جانا لازم آوے، اور یہ لازم محال ہے، کیونکہ دلائل قطعیہ سے دوام رضائے حق تعالیٰ آپ سے ثابت ہے، پس غضب محال ہے، اور اتباع مذکور سے یہ لازم آیا تھا، اس لئے اتباع مذکور بھی محال، اور بدون اتباع کے ان کا راضی ہونا غیر ممکن، تو ایسے امر کی امید کرنے کی کوئی گنجائش نہیں، اس لئے اس سے دل کو خالی کر لینا چاہئے)۔

الَّذِينَ اتَّيَهُمُ الْكِتَابُ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ ۖ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۖ

وہ لوگ جن کو دی ہم نے کتاب وہ اس کو پڑھتے ہیں جو حق ہے اس کے پڑھنے کا، وہی اس پر یقین لاتے ہیں،

وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ۚ

اور جو کوئی منکر ہوگا اس سے تو وہی لوگ نقصان پانے والے ہیں۔

آسان ترجمہ قرآن

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی، جبکہ وہ اس کی تلاوت اس طرح کرتے ہوں جیسا اس کی تلاوت کا حق ہے، تو وہ

لوگ ہی (درحقیقت) اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور جو اس کا انکار کرتے ہوں، تو ایسے لوگ ہی نقصان اٹھانے والے ہیں (۱۲۱)

خلاصہ تفسیر

(اس آیت سے پہلے کی آیت میں معاندین اہل کتاب کا ذکر اور مخالفین کے ایمان سے کلی مایوسی کا بیان تھا، اس

کے بعد حسب عادت قرآن انصاف پسند اہل کتاب کا بیان ہے، جنہوں نے حق واضح ہو جانے کے بعد جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی، اور آپ کا اتباع اختیار کر لیا، پس ارشاد ہے) جن لوگوں کو ہم نے کتاب (توراة و انجیل) دی بشرطیکہ وہ اس کی تلاوت (اس طرح) کرتے رہے جس طرح تلاوت کا حق ہے (کہ قوت علمیہ کو فہم مضامین میں صرف کیا، اور قوت ارادیہ کو عزم اتباع میں استعمال کیا) ایسے لوگ (البتہ آپ کے) اس (دین حق اور علم وحی) پر ایمان لے آتے ہیں، اور جو شخص نہ مانے گا (کس کا نقصان کرے گا) خود ہی ایسے لوگ خسارہ میں رہیں گے (کہ ایمان پر جو ثمرات عطا ہوتے ہیں ان سے محروم رہیں گے)۔

يٰۤاَيُّهَا اِسْرَآءِیْلُ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَنْتُمْ نَسِیْتُمْ ۚ

اے بنی اسرائیل! یاد کرو احسان ہمارے جو ہم نے تم پر کئے اور اس کو کہ ہم نے تم کو بڑائی دی

عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿١٢٢﴾ وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا

اہل عالم پر، اور ڈرو اس دن سے کہ نہ کام آوے کوئی شخص کسی کی طرف سے ذرا بھی

وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿١٢٣﴾

اور نہ قبول کیا جاوے گا اس کی طرف سے بدلہ اور نہ کام آوے اس کو سفارش اور نہ ان کی مدد پہنچے۔

آسان ترجمہ قرآن

اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تم کو عطا کی تھی، اور یہ بات (یاد کرو) کہ میں نے تم کو سارے جہانوں پر فضیلت دی تھی ﴿۱۲۲﴾ اور اُس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص بھی کسی کے کچھ کام نہیں آئے گا، نہ کسی سے کسی قسم کا فدیہ قبول کیا جائے گا، نہ اُس کو کوئی سفارش فائدہ دے گی، اور نہ ان کو کوئی مدد پہنچے گی۔ ﴿۱۲۳﴾

خلاصہ تفسیر

(اوپر کی آیت تک بنی اسرائیل کے متعلق جن خاص مضامین کا بیان کرنا مقصود تھا وہ تو ختم ہوئے، اب ان مضامین کی ابتدائی تمہید جس کے اجمال کے یہ سارے مضامین تفصیل تھے، اس کو دوبارہ پھر بیان کرتے ہیں، جس کا مقصد یہ ہے کہ تمہید کا مضمون خاص یعنی ترغیب کے لئے انعام عام و خاص کا یاد دلانا، اور ترہیب کے لئے قیامت کو پیش نظر کر دینا بوجہ تکرار خوب ذہن نشین ہو جائے، کیونکہ مقصود اعظم کلیات ہوتے ہیں جن کا خود استحضار ان کے اختصار کی وجہ سے سہل اور آسان ہوتا ہے، اور بوجہ جامعیت اور انطباق کے ان کے ذریعے سے ان کے جزئیات کا محفوظ رکھنا آسان ہوتا ہے، اور محاورات میں یہ طرزِ بلیغ بھی اعلیٰ درجے کا سمجھا جاتا ہے، کہ مفصل اور مطوّل بات کرنے سے پہلے ایک مجمل عنوان سے اس کی تقریر کر دی جائے، جس کا قدرِ مشترک تمام تفصیل کے سمجھنے میں معین و مددگار ہو، اور آخر میں بطورِ خلاصہ اور نتیجہ تفصیل اسی مجمل عنوان کا پھر اعادہ کر دیا جائے، مثلاً یہ کہا جائے کہ ”تکبر بڑی مضر خصلت ہے، اس میں ایک ضرریہ، دوسرا یہ، تیسرا یہ“ دس بیس مضر تین گنوا کر پھر آخر میں کہہ دیا جائے کہ ”غرض تکبر بڑی مضر خصلت ہے“ اسی طور پر اس آیت یٰبَنِیْ اِسْرَآءِیْل کا اعادہ فرمایا گیا ہے۔)

اے اولاد یعقوب (علیہ السلام) میری ان نعمتوں کو یاد کرو جن کا میں نے تم پر (وقتاً فوقتاً) انعام کیا، اور اس کو (بھی یاد کرو) کہ میں نے تم کو بہت لوگوں پر (بہت سی باتوں میں) فوقیت دی، اور تم ڈرو ایسے دن سے (یعنی روزِ قیامت سے) جس میں کوئی شخص کسی کی طرف سے نہ کوئی مطالبہ (اور حق واجب) ادا کر پاوے گا، اور نہ کسی کی طرف سے کوئی معاوضہ (بجائے حق واجب کے) قبول کیا جاوے گا اور نہ کسی کی کوئی سفارش (جبکہ ایمان نہ ہو) مفید ہوگی اور نہ ان لوگوں کو کوئی (بزور) بچا سکے گا۔

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَتْهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ

اور جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے کئی باتوں میں، پھر اس نے وہ پوری کیں، تب فرمایا: میں تجھ کو کروں گا سب لوگوں کا

إِمَامًا ۖ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ﴿۱۲۴﴾

پیشوا، بولا: اور میری اولاد میں سے بھی، فرمایا: نہیں پہنچے گا میرا قراظالموں کو۔

آسان ترجمہ قرآن

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیم کو ان کے پروردگار نے کئی باتوں سے آزمایا، اور انہوں نے وہ ساری باتیں پوری کیں۔ اللہ نے (اُن سے) کہا: ”میں تمہیں تمام انسانوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔“ ابراہیم نے پوچھا: ”اور میری اولاد میں سے؟“ اللہ نے فرمایا: ”میرا (یہ) عہد ظالموں کو شامل نہیں ہے۔“ ﴿۱۲۴﴾

خلاصہ تفسیر

اور جس وقت امتحان کیا حضرت ابراہیم کا اُن کے پروردگار نے چند باتوں میں (اپنے احکام میں سے) اور وہ ان کو پورے طور سے بجالائے، (اس وقت) حق تعالیٰ نے (ان سے) فرمایا کہ میں تم کو (اس کے صلہ میں نبوت دے کر یا اُمت بڑھا کر) لوگوں کا مقتدا بناؤں گا، انہوں نے عرض کیا: اور میری اولاد میں سے بھی کسی کو (نبوت دیجئے)، ارشاد ہوا کہ (آپ کی درخواست منظور ہے، مگر اس کا ضابطہ سن لیجئے کہ) میرا (یہ) عہدہ (نبوت) خلاف ورزی (قانون) کرنے والوں کو نہ ملے گا، (سوائے لوگوں کو تو صاف جواب ہے، البتہ اطاعت کرنے والوں میں سے بعض کو نبوت دی جائے گی)۔

معارف مسائل

اس آیت میں حق تعالیٰ کے خاص پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مختلف امتحانات اور ان میں ان کی کامیابی، پھر اس کے انعام وصلہ کا بیان ہے، اور پھر جب حضرت خلیل اللہ نے ازراہ شفقت اپنی اولاد کے لئے بھی اسی انعام کی درخواست کی، تو انعام پانے کا ایک ضابطہ ارشاد فرما دیا گیا، جس میں حضرت خلیل اللہ کی درخواست کی منظوری مشروط صورت میں دی گئی، کہ یہ انعام آپ کی ذریت کو بھی ملے گا، مگر جو لوگ ذریت میں سے نافرمان اور ظالم ہوں گے وہ یہ انعام نہ پاسکیں گے۔

حضرت خلیل اللہ کے عظیم امتحانات اور مضامین امتحان

یہاں چند باتیں غور طلب ہیں:-

اول یہ کہ امتحان کسی شخص کی قابلیت معلوم کرنے کے لئے لیا جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ علیم وخبیر ہیں، کسی بھی شخص کا کوئی حال یا کمال اُن پر مخفی نہیں، پھر اس امتحان کا مقصد کیا تھا؟
دوسرے یہ کہ امتحان کس کس عنوان سے لیا گیا؟
تیسرے یہ کہ کامیابی کس صورت اور کس نوعیت کی رہی؟
چوتھے یہ کہ انعام کیا دیا گیا اور اس کی حیثیت کیا ہے؟
پانچویں یہ کہ اس انعام کے لئے جو ضابطہ مقرر کیا گیا ہے اس کی کچھ توضیح و تفصیل۔
ان پانچوں سوالات کے جوابات بالتفصیل ملاحظہ فرمائیے:-

پہلی بات کہ امتحان کا مقصد کیا تھا؟ قرآن کے ایک لفظ **رَبُّہُ** نے اس کو حل کر دیا ہے، جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اس امتحان کے ممتحن خود اللہ جل شانہ ہیں، اور ان کے اسمائے حسنیٰ میں سے اس جگہ لفظ **رَبُّ** لا کر شانِ ربوبیت کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز کو آہستہ آہستہ درجہ کمال تک پہنچانا۔

مطلب یہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ ابتلا و امتحان کسی جرم کی پاداش میں یا نامعلوم قابلیت کا علم حاصل کرنے کے لئے نہیں، بلکہ شانِ تربیت و ربوبیت اس کا منشا ہے، ان آزمائشوں کے ذریعے اپنے خلیل کی تربیت کر کے ان کے درجات و مقامات تک پہنچانا مقصود ہے، پھر اس جملے میں مفعول کو مقدم اور فاعل کو مؤخر کر کے یوں ارشاد ہوا: **وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّہُ** اس میں ابراہیم علیہ السلام کی جلالتِ شان کو اور نمایاں فرمایا گیا۔

دوسرا سوال کہ امتحان کس عنوان سے لیا گیا؟ اس کے متعلق قرآن شریف میں تو صرف ”کلمات“ کا لفظ آیا ہے، اور اس لفظ کی تفسیر و تشریح میں حضراتِ صحابہؓ و تابعینؓ کے مختلف اقوال ہیں، کسی نے احکامِ الہیہ میں سے دس چیزیں شمار کیں، کسی نے تیس بتلائی ہیں، اور کسی نے اور کچھ کم و بیش دوسری چیزیں بتائیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں کچھ اختلاف نہیں، وہ چیزیں سب کی سب ہی حضرت خلیل اللہ کے مضامین امتحان تھے، ائمہ تفسیر ابن جریرؒ اور ابن کثیرؒ کی یہی رائے ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک علمی موشگافیوں سے زیادہ قابلِ قدر اخلاق و کردار کی عملی ثابت قدمی ہے

یہی مضامین امتحان جن کی تفصیل آگے بیان ہوگی، مدارس کے امتحانات کی طرح فنی مسائل اور ان کی تحقیقات نہیں، بلکہ اخلاقی قدروں اور عملی ثابت قدمی کی جانچ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ بارگاہِ عز و جلال میں جس چیز کی قیمت ہے وہ علمی موشگافیاں نہیں، بلکہ عملی اور اخلاقی برتری ہے۔

اب ان مضامین امتحان میں سے چند اہم چیزیں سنئے:-

حق تعالیٰ کو منظور تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی خلت کا خلعتِ خاص عطا فرمایا جائے، اس لئے ان کو سخت امتحانات سے گزار گیا، پوری قوم کی قوم حتیٰ کہ اپنا خاندان سب کے سب بت پرستی میں مبتلا تھے، سب کے عقائد و رسوم سے مختلف ایک دینِ حنیف ان کو عطا کیا گیا، اور اس کی تبلیغ اور قوم کو اس کی طرف دعوت دینے کا بار گراں آپ پر ڈالا گیا، آپ نے پیغمبرانہ جرات و ہمت کے ساتھ بے خوف و خطر قوم کو خدائے وحدہ لا شریک لہ کی طرف بلایا، بت پرستی کی شرمناک رسم کی خرابیاں مختلف عنوانات سے بیان کیں، عملی طور پر بتوں کے خلاف جہاد کیا، پوری قوم کی قوم آمادہ جنگ و جدال ہو گئی، بادشاہ وقت نمرود اور اس کی قوم نے آپ کو آگ میں ڈال کر زندہ جلادینے کا فیصلہ کر لیا، اللہ کے خلیل نے اپنے مولا کی رضا مندی کے لئے ان سب بلاؤں پر راضی ہو کر اپنے آپ کو آگ میں ڈال دینے کے لئے پیش کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل کو امتحان میں کامیاب پایا تو آگ کو حکم دیا:-

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ﴿۶۹﴾ (الانبياء)

”ہم نے حکم دے دیا کہ آگ! تو ابراہیم پر ٹھنڈی اور ذریعہ سلامتی بن جا۔“

جس وقت یہ حکم خداوندی آتش نمرود کے متعلق آیا تو حکم کے الفاظ عام تھے، کسی خاص آگ کی تعیین کر کے حکم نہیں دیا گیا تھا، اس لئے پوری دنیا میں جہاں کہیں آگ موجود تھی اس حکم خداوندی کے آتے ہی اپنی اپنی جگہ ہر آگ ٹھنڈی ہو گئی، اور نارِ نمرود بھی اس زمرہ کافر دین کر ٹھنڈی پڑ گئی۔

قرآن میں لفظ بَدَا کے ساتھ سَلْبًا کا اضافہ اس لئے فرمایا گیا کہ کسی چیز کی ٹھنڈک حدِ اعتدال سے بڑھ جائے تو وہ بھی برف کی طرح تکلیف دہ بلکہ مہلک ہو جاتی ہے، اگر لفظ سَلْبًا ارشاد نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ آگ برف کی طرح ایسی ٹھنڈی ہو جاتی جو بجائے خود ایک عذاب بن جاتی جیسے جہنم میں ایک عذاب زمہریر کا بھی ہے۔

اس امتحان سے فارغ ہو کر دوسرا امتحان یہ لیا گیا کہ اپنے اصلی وطن کو چھوڑ کر شام کی طرف ہجرت کر جائیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رضائے خداوندی کی تڑپ میں قوم و وطن کو بھی خیر باد کہہ دیا، اور مع اہل و عیال ہجرت کر کے شام میں چلے آئے!

آنکس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند

فرزند و عیال و خانماں را چہ کند

اب قوم و وطن کو چھوڑ کر ملکِ شام میں قیام کیا ہی تھا کہ یہ حکم ملا کہ بی بی ہاجرہ رضی اللہ عنہا اور اُن کے شیرخوار بچے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ساتھ لے کر یہاں سے بھی کوچ کریں۔ (ابن کثیر)

جبریل امین آئے اور دونوں کو ساتھ لے کر چلے، راستہ میں جہاں کوئی سرسبز جگہ آتی تو حضرت خلیل فرماتے کہ یہاں ٹھہرا دیا جائے، جبریل فرماتے کہ یہاں کا حکم نہیں، منزل آگے ہے۔ جب وہ خشک پہاڑ اور گرم ریگستان آ جاتا ہے جہاں آگے کسی وقت بیت اللہ کی تعمیر اور شہرِ مکہ کی بستی بسانا مقدر تھا، اس ریگستان میں آپ کو اتار دیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے خلیل اپنے پروردگار کی محبت میں مسرور و مگن اسی چٹیل میدان اور بے آب و گیاہ جنگل میں بی بی کو لے کر ٹھہر جاتے ہیں، لیکن یہ امتحان اسی پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ملتا ہے کہ بی بی اور بچے کو یہیں چھوڑ دیں، اور خود ملکِ شام کو واپس ہو جائیں، اللہ کا خلیل حکم پاتے ہی اس کی تعمیل میں اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور شام کی طرف روانہ ہو جاتا ہے، تعمیلِ حکم میں اتنی تاخیر بھی گوارا نہیں کہ بیوی کو یہ اطلاع ہی دیدے کہ مجھے چونکہ خدا کا یہ حکم ملا ہے اس لئے میں جا رہا ہوں، حضرت ہاجرہ علیہا السلام جب آپ کو جاتے ہوئے دیکھتی ہیں تو پکارتی ہیں، مگر آپ جواب نہیں دیتے، پھر پکارتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اس لِق و دِق میدان میں ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟ اس کا بھی جواب نہیں دیتے، مگر وہ بی بی بھی خلیل اللہ کی بی بی تھیں سمجھ گئیں کہ ماجرا کیا ہے، اور کہنے لگیں کہ کیا آپ کو اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم ملا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں، حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو بھی جب حکم خداوندی کا علم ہو گیا، تو نہایت اطمینان کے ساتھ فرمایا کہ جاییے، جس مالک نے آپ کو چلے جانے کا حکم فرمایا ہے وہ ہمیں بھی ضائع نہیں کرے گا۔

اب حضرت ہاجرہ اپنے شیرخوار بچے کے ساتھ اس لِق و دِق جنگل میں وقت گزارنے لگتی ہیں، پیاس کی شدت پانی

کی تلاش پر مجبور کرتی ہے، بچے کو کھلے میدان میں چھوڑ کر، صفا و مروہ کی پہاڑیوں پر بار بار چڑھتی اُترتی ہیں کہ کہیں پانی کے آثار نظر آئیں، یا کوئی انسان نظر آجائے جس سے کچھ معلومات حاصل کریں، سات مرتبہ کی دوڑ دھوپ کے بعد مایوس ہو کر بچے کے پاس لوٹ آتی ہیں۔ صفا و مروہ کے درمیان سات مرتبہ دوڑنا اسی کی یادگار کے طور پر قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے احکام حج میں ضروری قرار دیا گیا ہے۔ حضرت ہاجرہ علیہا السلام اپنی دوڑ دھوپ ختم کرنے اور مایوس ہونے کے بعد جب بچے کے پاس آتی ہیں تو رحمت خداوندی نازل ہوتی ہے، جبریل امین آتے ہیں اور اس خشک ریگستان کی زمین سے پانی کا ایک چشمہ نکال دیتے ہیں، جس کا نام آج ”زمزم“ ہے، پانی کو دیکھ کر اوّل جانور آجاتے ہیں، پھر جانوروں کو دیکھ کر انسان پہنچتے ہیں، اور مکہ کی آبادی کا سامان ہو جاتا ہے، ضروریات زندگی کی کچھ آسانیاں مہیا ہو جاتی ہیں۔

نو مولود بچہ جن کو آج حضرت اسماعیل علیہ السلام کہا جاتا ہے، نشوونما پاتے ہیں اور کام کاج کے قابل ہو جاتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام باشارات ربانی گاہ گاہ تشریف لاتے ہیں، اور بی بی ونچے کو دیکھ جاتے ہیں، اس وقت پھر اللہ تعالیٰ اپنے خلیل کا تیسرا امتحان لیتے ہیں، یہ بچہ اس بے کسی اور بے سروسامانی میں پروان چڑھا، اور بظاہر اسباب باپ کی تربیت اور شفقت سے بھی محروم رہا، اب والد ماجد کو بظاہر یہ حکم ملتا ہے اس بچے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر دو، ارشاد قرآنی ہے:-

فَلَمَّا بَدَعْمَعَهُ السَّعْيُ قَالَ يُبَيِّئُ لِي أَنِّي أَمْرِي فِي السَّامِ أَرَأَيْتَ أَذْبَحُكَ فَأَنْظُرُ مَاذَا تَأْتِي ۖ قَالَ يَا بَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ﴿۱۰۲﴾ (الصَّفّت)

”جب بچہ اس قابل ہو گیا کہ باپ کے ساتھ کام کاج میں کچھ مدد دے سکے تو ابراہیم علیہ السلام نے اس سے کہا کہ اے بیٹے! میں خواب میں یہ دیکھتا ہوں کہ تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، تو بتلا کہ تیرا کیا خیال ہے؟ فرزند سعید نے عرض کیا کہ ابا جان! آپ کو جو حکم ملا ہے اس کی تعمیل کیجئے، آپ مجھے بھی اس کی تعمیل میں ان شاء اللہ ثابت قدم پائیں گے۔“

اس کے بعد کا واقعہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ حضرت خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام صاحبزادے کو ذبح کرنے کے لئے منیٰ کے جنگل میں لے گئے، اور اپنی طرف سے حکم حق جل و علا شانہ کی پوری تعمیل کر دی، مگر وہاں مقصود بچے کو ذبح کرانا نہیں بلکہ شفیق باپ کا امتحان کرنا تھا، واقعہ خواب کے الفاظ میں غور کیا جائے کہ اس میں یہ نہیں دیکھا تھا کہ ذبح کر دیا، بلکہ ذبح کا عمل کرتے دیکھا، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کر دکھایا، اور اس عمل کو بذریعہ وحی منام دکھلانے میں بھی شاید یہی مصلحت ہو کہ بذریعہ کلام حکم ذبح دینا منظور نہ تھا، اسی وجہ سے ارشاد یہ ہوا کہ صَدَقْتَ الرَّءْيَا (الصَّفّت: ۱۰۵) کہ خواب میں جو کچھ دیکھا تھا آپ نے اس کو پورا کر دیا، جب اس میں وہ پورے اُترے، تو اللہ تعالیٰ نے جنت سے اس کا فدیہ نازل فرما کر

حفاظت کرنے والے ہیں، لیکن اپنی بیویوں سے یا اپنی لونڈیوں سے کیونکہ ان پر کوئی الزام نہیں، ہاں جو اس کے علاوہ طلب گار ہوں ایسے لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں، اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا خیال رکھنے والے ہیں، اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں، ایسے ہی لوگ وارث ہونے والے ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

اور سورہ احزاب میں مذکورہ دس صفات یہ ہیں :-

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَنَاتِينَ وَالْقَنَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّالِحِينَ وَالصَّالِحَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ﴿٣٥﴾ (الاحزاب)

”بے شک اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں، اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں، اور فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں، اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں، اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں، اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں، اور اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرنے والی عورتیں اور بکثرت اللہ کو یاد کرنے والے مرد اور بکثرت اللہ کو یاد کرنے والی عورتیں، ان سب کے لئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔“

مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ مسلمان کے لئے جتنی علمی، عملی، اخلاقی صفات مطلوب ہیں وہ ان تینوں سورتوں کی چند آیات میں جمع کر دی گئی ہیں، اور یہی وہ صفات وہ کلمات ہیں جن میں حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کا امتحان لیا گیا، اور آیت **وَإِذْ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ** میں انہی صفات کی طرف اشارہ ہے۔ ان آیات کے متعلق قابل غور سوالات میں سے دو سوالوں کا جواب یہاں تک ہو گیا۔

تیسرا سوال یہ تھا کہ اس امتحان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کامیابی کا درجہ اور مقام کیا رہا؟ تو خود قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں ان کو سند کامیابی عطا فرمائی، ارشاد ہوا:-

وَابْرُهِيمَ الَّذِي وَفَّى ۖ (النجم) (وہ ابراہیم جس نے پورا کر دکھایا)

اس کا حاصل یہ ہے کہ ہر امتحان کی مکمل اور سو فیصد کامیابی کا اعلان فرما دیا۔

چوتھا سوال کہ اس امتحان پر انعام کیا ملا؟ اس کا ذکر خود اسی آیت میں آچکا ہے، یعنی:-

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (البقرة: ۱۲۳)

”(امتحان کے بعد) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں آپ کو لوگوں کا امام اور پیشوا بنانے والا ہوں۔“

اس سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوا کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو اس کامیابی کے صلہ میں امامت خلق اور پیشوائی کا انعام دیا گیا، دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوا کہ خلق خدا کے امام و مقتدا اور پیشوا بننے کے لئے جو امتحان درکار ہے وہ دنیا کے مدارس اور یونیورسٹیوں جیسا امتحان نہیں جس میں چند مسائل کی فنی تحقیق اور علمی موشگافی کو کامیابی کا اعلیٰ درجہ سمجھا جاتا ہے، اس عہدے کے حاصل کرنے کے لئے ان تیس اخلاقی اور عملی صفات میں کامل اور مکمل ہونا شرط ہے، جن کا ذکر ابھی بحوالہ آیات آچکا ہے، قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ بھی یہی مضمون اس طرح بیان فرمایا ہے:-

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اٰیَةً يُّهْدُوْنَ بِاَمْرِ نَا لِمَا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰیٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ (السجدة)

”یعنی ہم نے اُن میں سے امام اور پیشوا بنائے کہ وہ ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کریں جب انہوں نے اپنے نفس کو خلاف شرع سے روکا اور ہماری آیتوں پر یقین کیا۔“

اس آیت میں امامت و پیشوائی کے لئے ان تیس صفات کا خلاصہ دو لفظوں میں کر دیا گیا ہے، یعنی صبر و یقین، یقین علمی اور اعتقادی کمال اور صبر عملی اور اخلاقی کمال ہے، اور وہ تیس صفات جن کا ذکر ابھی اوپر گزر چکا ہے سب کی سب انہی دو صفوں میں سموئی ہوئی ہیں۔

پانچواں سوال یہ تھا کہ آئندہ آنے والی نسلوں کو منصب امامت و پیشوائی دینے کے لئے جو یہ ضابطہ ارشاد ہوا ہے کہ فاسق اور ظالم لوگوں کو یہ منصب نہ ملے گا، اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کی توضیح یہ ہے کہ امامت و پیشوائی ایک حیثیت سے اللہ جل شانہ کی خلافت ہے، یہ کسی ایسے شخص کو نہیں دی جاسکتی جو اس کا باغی اور نافرمان ہو، اسی لئے مسلمانوں پر لازم ہے کہ اپنے اختیار سے اپنا نمائندہ یا امیر کسی ایسے شخص کو مقرر نہ کریں جو اللہ تعالیٰ کا باغی یا نافرمان ہو۔

وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاٰمَنًا وَاَتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ

اور جب مقرر کیا ہم نے خانہ کعبہ کو اجتماع کی جگہ لوگوں کے واسطے اور جگہ امن کی، اور بناؤ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو

مُصَلًّی وَاَعٰهَدْنَا اِلٰی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِیْ لِلطَّٰٓءِفِیْنَ

نماز کی جگہ اور حکم کیا ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو کہ پاک رکھو میرے گھر کو واسطے طواف کرنے والوں کے

وَالْعَافِينَ وَالرُّكَّعَ السُّجُودَ ①۲۵

اور اعتکاف کرنے والوں کے اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے۔

آسان ترجمہ قرآن

اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لئے ایسی جگہ بنایا جس کی طرف وہ لوٹ لوٹ کر جائیں اور جو سراپا امن ہو۔ اور تم مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالو۔ اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو یہ تاکید کی کہ: ”تم دونوں میرے گھر کو ان لوگوں کے لئے پاک کرو جو (یہاں) طواف کریں اور اعتکاف میں بیٹھیں اور رکوع اور سجدہ بجالائیں۔“ ①۲۵

حل لغات

مَثَابَةً یہ لفظ ”ثَابَ يَثُوبُ ثَوْبًا وَمَثَابًا“ سے مأخوذ ہے، جس کے معنی لوٹنے کے ہیں، اس لئے مشابہ کے معنی مرجع کے ہو گئے جہاں آدمی بار بار لوٹ کر جائے۔

خلاصہ تفسیر

(اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے کہ) جس وقت ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کا معبد اور (مقام) امن (ہمیشہ سے) مقرر کر رکھا اور (آخر میں امت محمدیہ کو حکم دیا کہ برکت حاصل کرنے کے لئے) مقام ابراہیم کو (کبھی کبھی) نماز پڑھنے کی جگہ بنالیا کرو، اور ہم نے (بنائے کعبہ کے وقت حضرت) ابراہیم و (حضرت) اسماعیل (علیہما السلام) کی طرف حکم بھیجا کہ میرے (اس) گھر کو خوب پاک (صاف) رکھا کرو، بیرونی اور مقامی لوگوں (کی عبادت) کے واسطے اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے واسطے۔

معارف مسائل

حضرت خلیل اللہ کی ہجرت مکہ اور بناء بیت اللہ کا تفصیلی واقعہ

اس آیت میں بیت اللہ کعبہ کی تاریخ کی طرف اشارہ ہے اور حضرت خلیل اللہ اور اسماعیل علیہما السلام کے ہاتھوں اس کی تعمیر جدید، نیز بیت اللہ اور مکہ مکرمہ کی چند خصوصیات کا ذکر اور بیت اللہ کے احترام سے متعلق احکام مذکور ہیں، یہ

مضمون قرآن کی بہت سی آیات میں مختلف سورتوں میں پھیلا ہوا ہے، اس جگہ مختصر طور پر اس کو بیان کیا جاتا ہے، جس سے مذکورہ آیات کا پورا مضمون واضح ہو جائے گا، یہ مضمون سورہ حج کی آیت نمبر ۲۶ میں اس طرح مذکور ہے:-

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكْ بِشَيْءٍ ظَهَرُ بَيْتِي لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ
السُّجُودِ ۝ (۲۶) وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ۝

”یعنی وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے کہ جبکہ ہم نے ابراہیم کو خانہ کعبہ کی جگہ بتلا دی کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرنا، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے واسطے پاک رکھنا، اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو، لوگ تمہارے پاس چلے آئیں گے، پیادہ بھی اور دُلی اُونٹنیوں پر بھی جو دُور دراز کے راستوں سے پہنچی ہوں گی۔“

تفسیر ابن کثیر میں ائمہ تفسیر حضرت مجاہد وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ملکِ شام میں مقیم تھے، اور حضرت اسماعیل علیہ السلام شیرخوار بچے تھے، جس وقت حق تعالیٰ کا ان کو یہ حکم ملا کہ ہم خانہ کعبہ کی جگہ آپ کو بتلاتے ہیں، آپ اس کو پاک صاف کر کے طواف و نماز سے آباد رکھیں، اس حکم کی تعمیل کے لئے جبریل امین براق لے کر حاضر ہوئے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اور اسماعیل علیہ السلام کو مع ان کی والدہ حضرت ہاجرہ کے ساتھ لے کر سفر کیا، راستے میں جب کسی بستی پر نظر پڑتی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام جبریل امین سے دریافت کرتے کہ کیا ہمیں یہاں اُترنے کا حکم ملا ہے، تو حضرت جبریل علیہ السلام فرماتے کہ نہیں آپ کی منزل آگے ہے، یہاں تک کہ مکہ مکرمہ کی جگہ سامنے آئی، جس میں کانٹے دار جھاڑیاں اور بیول کے درختوں کے سوا کچھ نہ تھا، اس خطہ زمین کے آس پاس کچھ لوگ بستے تھے جن کو ”عمالین“ کہا جاتا تھا، بیت اللہ اس وقت ایک ٹیلے کی شکل میں تھا، حضرت خلیل اللہ علیہ السلام نے اس جگہ پہنچ کر جبریل امین سے دریافت کیا کہ کیا ہماری منزل یہ ہے؟ تو فرمایا کہ ہاں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام مع اپنے صاحبزادے اور حضرت ہاجرہ کے یہاں اُتر گئے، اور بیت اللہ کے پاس ایک معمولی چھپر ڈال کر حضرت اسماعیل اور ہاجرہ علیہما السلام کو یہاں ٹھہرا دیا، ان کے پاس ایک توشہ دان میں کچھ کھجوریں اور ایک مشکیزہ میں پانی رکھ دیا، اور ابراہیم علیہ السلام کو اس وقت یہاں ٹھہرنے کا حکم نہ تھا، وہ اس شیرخوار بچے اور ان کی والدہ کو حوالہ بخدا کر کے واپس ہونے لگے، جانے کی تیاری دیکھ کر حضرت ہاجرہ نے عرض کیا کہ ہمیں اس لقمہ دوق میدان میں چھوڑ کر آپ کہاں جاتے ہیں، جس میں نہ کوئی مونس و مددگار ہے، نہ زندگی کی ضروریات۔

حضرت خلیل اللہ صلوٰۃ اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہ دیا، اور چلنے لگے، حضرت ہاجرہ ساتھ اٹھیں، پھر بار بار یہی سوال دہرایا، حضرت خلیل اللہ کی طرف سے کوئی جواب نہ تھا، یہاں تک کہ خود ان کے دل میں بات پڑی، اور

عرض کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہاں چھوڑ کر چلے جانے کا حکم دیا ہے؟ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ملا ہے۔

اس کو سن کر حضرت ہاجرہ نے فرمایا کہ پھر آپ شوق سے جائیں، جس نے آپ کو یہ حکم دیا ہے وہ ہمیں بھی ضائع نہ کرے گا۔ ابراہیم علیہ السلام حکم خداوندی کی تعمیل میں یہاں سے چل کھڑے ہوئے، مگر شیر خوار بچہ اور اس کی والدہ کا خیال لگا ہوا تھا، جب راستے کے موڑ پر پہنچے جہاں سے حضرت ہاجرہ نہ دیکھ سکیں تو ٹھہر گئے اور اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا فرمائی جو سورہ ابراہیم کی آیت نمبر ۵۳ و ۵۴ میں اس طرح مذکور ہے:-

رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ إِلَّا ضَمَامَ ۖ (ابراہیم)

”اے میرے پروردگار! اس شہر کو امن والا بنا دیجئے اور مجھ کو اور میرے خاص فرزندوں کو بتوں کی عبادت سے بچائے رکھئے۔“
پھر دُعا میں عرض کیا:-

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زُرْعَةٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ۖ (ابراہیم)

”یعنی اے ہمارے رب! میں اپنی اولاد کو آپ کے محترم گھر کے قریب ایک میدان میں جو زراعت کے قابل نہیں آباد کرتا ہوں، اے ہمارے رب! تاکہ وہ نماز کا اہتمام رکھیں، تو آپ کچھ لوگوں کے قلوب ان کی طرف مائل کر دیجئے، اور ان کو پھل کھانے کو دیجئے تاکہ یہ لوگ شکر کریں۔“

سابقہ حکم جس کی بنا پر شام سے ہجرت کرنا حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کو یہاں لایا گیا تھا اس میں یہ ارشاد ہوا تھا کہ میرے گھر کو پاک رکھنا، حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام جانتے تھے کہ پاک رکھنے سے مراد یہ ہے کہ اس کو ظاہری نجاسات اور گندگی سے بھی پاک رکھا جائے، اور باطنی نجاست کفر و شرک سے پاک بھی فرمانِ الہی میں مقصود ہے، اس لئے یہاں ٹھہر کر جو دُعائیں فرمائیں ان میں اول تو اس بستی کے محفوظ و مامون رہنے اور جائے امن ہونے کی دُعا فرمائی، پھر یہ دُعا کی کہ مجھے اور میری اولاد کو شرک و بت پرستی سے بچائیے، کیونکہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو معرفتِ حق تعالیٰ کا وہ مقام حاصل تھا جس میں انسان کو اپنا وجود ہی نابود نظر آتا ہے، اپنے تمام افعال و اعمال اور ارادوں کو

[۱] آگے سورہ بقرہ آیت: ۲۲۸ کے تحت نیز سورہ ابراہیم کی آیت: ۵۳ و ۵۴ کے تحت حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے خود اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ اس موقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہ دُعا فرمائی تھی جو سورہ بقرہ کی آیت: ۱۲۶ میں مذکور ہے، اور سورہ ابراہیم والی دُعا بعد میں کی گئی تھی، لہذا بظاہر یہاں سورہ ابراہیم کی آیات کا اندراج مرجوح قول پر مبنی ہے، واللہ اعلم۔ محمد تقی عثمانی ۲۰/۱/۱۴۳۰ھ

یہ محسوس کرتا ہے کہ سب کچھ حق تعالیٰ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں، اسی کی مشیت و ارادے سے سب کام ہوتے ہیں، اس لئے کفر و شرک سے بیت اللہ کو پاک رکھنے کا جو حکم ملا تھا، اس میں حق تعالیٰ ہی سے امداد طلب کی، اس دُعا کے اندر کفر و شرک سے محفوظ رہنے کی التجا میں ایک خاص راز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب بیت اللہ کی تعظیم و تکریم کا حکم ہوا تو یہ احتمال بھی تھا کہ آئندہ چل کر کوئی ناواقف اس بیت اللہ ہی کو معبود نہ بنا لے، اور اس طرح شرک میں مبتلا ہو جائے، اس لئے یہ دُعا فرمائی کہ مجھ کو اور میری اولاد کو شرک سے محفوظ رکھا جائے۔

اس کے بعد شیر خوار بچہ اور اس کی والدہ پر شفقت کے پیش نظر یہ دُعا فرمائی کہ میں نے ان کو آپ کے حکم کے مطابق آپ کے محترم گھر کے پاس ٹھہرا تو دیا ہے، لیکن یہ جگہ زراعت کے قابل بھی نہیں، جہاں کوئی اپنی محنت سے ضروریات زندگی حاصل کر سکے، اس لئے آپ ہی اپنے فضل سے ان کو پھلوں کا رزق عطا فرمادیں۔

یہ دُعا کر کے حضرت خلیل اللہ علیہ السلام تو اپنے وطن شام کی طرف روانہ ہو گئے، ادھر حضرت ہاجرہ کا کچھ وقت تو اس توشہ کھجور اور پانی کے ساتھ کٹ گیا، جو حضرت خلیل اللہ چھوڑ گئے تھے، پانی ختم ہونے کے بعد خود بھی پیاس سے بے چین اور شیر خوار بچہ بھی، اس وقت پانی کی تلاش میں ان کا ٹکنا اور کبھی کوہ صفا پر، کبھی کوہ مروہ پر چڑھنا اور ان دونوں کے درمیان دوڑ دوڑ کر راستہ طے کرنا، تاکہ حضرت اسماعیل آنکھوں کے سامنے آجائیں، عام مسلمانوں میں معروف ہے اور حج میں صفا مروہ کے درمیان سعی کرنا آج تک اسی کی یادگار ہے۔

اس قصہ کے آخر میں حضرت جبریل امین کا بحکم خداوندی وہاں پہنچنا اور چشمہ زمزم کا جاری کرنا اور پھر قبیلہ جرہم کے کچھ لوگوں کا یہاں آکر مقیم ہو جانا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے جوان ہونے کے بعد قبیلہ جرہم کی ایک بی بی سے شادی ہو جانا، یہ سب صحیح بخاری کی روایت میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ روایت حدیث کے مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء سورہ حج کی آیت میں جو بیت اللہ کو آباد کرنے اور پاک صاف رکھنے کا حکم حضرت خلیل اللہ کو ملا تھا اس وقت اتنا ہی عمل مقصود تھا کہ اس جگہ کو حضرت اسماعیل اور ہاجرہ علیہا السلام کے ذریعہ آباد کر دیا جائے، اس کے مخاطب صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے، کیونکہ اسماعیل علیہ السلام ابھی شیر خواری کے عالم میں تھے، اس وقت بیت اللہ کی تعمیر جدید کا حکم نہ ملا تھا، سورہ بقرہ کی یہ آیت جو اس وقت زیر نظر ہے **وَعَهْدُنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنْ طَهَّرَا بَيْتِي** اس میں حضرت ابراہیم کے ساتھ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بھی شریک کر لیا گیا ہے، یہ حکم اس وقت کا ہے جبکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام جوان اور متاہل ہو چکے تھے، اُس وقت دونوں کو بناء بیت اللہ کا حکم دیا گیا۔

صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ ایک روز حضرت ابراہیم علیہ السلام حسب عادت حضرت ہاجرہ اور اسماعیل کی ملاقات کے لئے مکہ مکرمہ پہنچے، تو دیکھا کہ اسماعیل علیہ السلام ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تیر بنا رہے ہیں، والد ماجد کو

دیکھ کر کھڑے ہو گئے، ملاقات کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک کام کا حکم دیا ہے، کیا تم اس میں میری مدد کرو گے؟ لائق فرزند نے عرض کیا کہ سر و چشم کروں گا، اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُس ٹیلہ کی طرف اشارہ کیا جہاں بیت اللہ تھا کہ مجھے اس کی تعمیر کا حکم ہوا ہے، بیت اللہ کے حدود اربعہ حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو بتلادیئے تھے، دونوں بزرگوار اس کام میں لگے تو بیت اللہ کی قدیم بنیادیں نکل آئیں، انہی پر دونوں نے تعمیر شروع کر دی، اگلی آیت میں اسی کا بیان ہے **وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ** جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ بانی بیت اللہ اصل میں حضرت خلیل علیہ السلام ہیں اور اسماعیل علیہ السلام مددگار کی حیثیت سے شریک ہیں۔

ان تمام آیات پر غور کرنے سے وہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے جو بعض روایات حدیث اور تاریخ میں مذکور ہے کہ بیت اللہ پہلے سے دُنیا میں موجود تھا، کیونکہ تمام آیات میں کہیں بیت اللہ کی جگہ بتلادیئے کا ذکر ہے، کہیں اس کو پاک صاف رکھنے کا ذکر ہے، یہ کہیں مذکور نہیں کہ آج کوئی نیا گھر تعمیر کرانا ہے اس کی تعمیر کریں، اس سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ کا وجود اس واقعہ سے پہلے موجود تھا، پھر طوفانِ نوح کے وقت منہدم ہو گیا یا اٹھالیا گیا تھا، صرف بنیادیں موجود تھیں، حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کعبہ کے پہلے بانی نہیں، بلکہ بناء سابق کی بنیادوں پر جدید تعمیر ان کے ہاتھوں ہوئی ہے۔

اب رہا یہ معاملہ کہ پہلی تعمیر کس نے کی اور کس وقت کی؟ اس میں کوئی صحیح اور قوی روایت حدیث کی منقول نہیں، اہل کتاب کی روایات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اس کی تعمیر آدم علیہ السلام کے اس دُنیا میں آنے سے پہلے ہی فرشتوں نے کی تھی، پھر آدم علیہ السلام نے اس کی تجدید فرمائی، یہ تعمیر طوفانِ نوح تک باقی رہی، طوفانِ نوح میں منہدم ہو جانے کے بعد سے ابراہیم علیہ السلام کے زمانے تک یہ ایک ٹیلہ کی صورت میں باقی رہی، حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے از سر نو تعمیر فرمائی، اس کے بعد اس تعمیر میں شکست و ریخت تو ہمیشہ ہوتی رہی مگر منہدم نہیں ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل قریش مکہ نے اس کو منہدم کر کے از سر نو تعمیر کیا، جس کی تعمیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی خاص شرکت فرمائی۔

احکام و مسائل متعلقہ حرم محترم

- ۱۔ لفظ **مَثَابَهُ** سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو یہ خاص فضیلت بخشی ہے کہ وہ ہمیشہ مرجعِ خلائق بنا رہے گا، اور لوگ بار بار اس کی طرف جانے اور لوٹنے کے آرزو مند رہیں گے۔ امام تفسیر حضرت مجاہدؒ نے فرمایا: **”لَا يَقْضِي أَحَدٌ**

مِنْهَا وَطَرًا“ (قرطبی)۔ یعنی کوئی آدمی اس کی زیارت سے کبھی سیر نہیں ہوتا، بلکہ ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ زیارت و طواف کا شوق لے کر لوٹتا ہے۔ اور بعض علماء نے فرمایا کہ قبول حج کی علامات میں سے ہے کہ وہاں سے لوٹنے کے بعد پھر وہاں جانے کا شوق دل میں پائے، چنانچہ عام طور پر اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ پہلی مرتبہ جتنا شوق زیارت بیت اللہ کا ہوتا ہے، دوسری مرتبہ کے لئے اس شوق میں اضافہ ہو جاتا ہے، اور جوں جوں بار بار زیارت کرتا رہتا ہے یہ شوق اور بڑھتا جاتا ہے۔ یہ معجزہ بیت اللہ ہی کی خصوصیت ہو سکتی ہے، ورنہ دنیا کے بہتر سے بہتر مناظر کو انسان ایک دو مرتبہ دیکھ لینے کے بعد سیر ہو جاتا ہے، اور پانچ سات مرتبہ دیکھنے کے بعد تو دیکھنے کا دھیان بھی نہیں آتا، اور یہاں تو نہ کوئی خوش منظر سینری، نہ وہاں پہنچنا کچھ آسان ہے، نہ وہاں دنیا کے کاروبار ہی کی کوئی اہمیت ہے، اس کے باوجود لوگوں کے دل میں اس کی تڑپ ہمیشہ موجزن رہتی ہے، ہزاروں روپیہ خرچ کر کے سینکڑوں مشقتیں جھیل کر وہاں پہنچنے کے مشتاق رہتے ہیں۔

۲- لفظ ”أَمْنًا“ اس جگہ ”مَأْمَن“ یعنی جائے امن کے معنی میں ہے، اور لفظ ”بَيْت“ سے مراد صرف بیت اللہ یعنی خانہ کعبہ نہیں بلکہ پورا حرم مراد ہے، قرآن کریم میں بیت اللہ اور کعبہ کا لفظ بول کر پورا حرم مراد لینے کے اور بھی شواہد موجود ہیں جیسے ارشاد ہے: هَذِهِ بِلْدَةُ الْكُعْبَةِ (المائدة: ۹۵) اس میں لفظ ”کعبہ“ بول کر پورا حرم مراد لیا گیا ہے، کیونکہ اس میں ذکر قربانی کا ہے اور بیت کعبہ کے اندر تو قربانی نہیں ہوتی، اور نہ وہاں قربانی کرنا جائز ہے، اس لئے معنی آیت کے یہ ہوئے کہ ہم نے حرم مکہ کو جائے امن بنا دیا ہے، اور جائے امن بنادینے سے مراد لوگوں کو یہ حکم دینا ہے کہ حرم محترم کو عام قتل و قتل اور انتقام سے بالاتر رکھیں۔ (ابن عربی) [۲]

چنانچہ زمانہ جاہلیت میں بھی عربوں کے ہاتھ میں ملت ابراہیمی کے جو کچھ آثار باقی رہ گئے تھے، ان میں یہ بھی تھا کہ حرم میں اپنے باپ اور بھائی کا قاتل بھی کسی کو ملتا تو انتقام نہیں لیتے تھے، اور عام جنگ و قتال کو بھی حرم میں حرام سمجھتے تھے، شریعت اسلام میں بھی یہ حکم اسی طرح باقی رکھا گیا، فتح مکہ کے وقت صرف چند گھنٹوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے ارض حرم میں قتال کو جائز کیا گیا تھا، مگر اسی وقت پھر ہمیشہ کے لئے حرام کر دیا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے خطبے میں اس کا اعلان فرما دیا۔ (صحیح بخاری) [۳]

اب رہا یہ مسئلہ کہ کوئی شخص حرم کے اندر ہی کوئی ایسا جرم کرے جس پر حد و قصاص اسلامی شریعت کی رو سے عائد ہوتا ہے تو حرم اس کو امن نہیں دے گا، بلکہ اس پر باجماع امت حد و قصاص جاری کئے جائیں گے (احکام القرآن بخصاص

[۱] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۲ ص: ۱۱۰

[۲] احکام القرآن لابن العربی تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۲۸

[۳] صحیح البخاری، کتاب المناسک، باب لا یحل القتال بمكة... إلخ ج: ۱ ص: ۲۴۷

قرطبی) کیونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

فَإِنْ تَلَّوْهُمُ فَأَتُتُّوْهُمُ^۱ (البقرة: ۱۹۱)

”یعنی اگر تم سے لوگ حرم میں قتال کرنے لگیں تو تم بھی وہیں اُن کو قتل کر دو۔“

البتہ یہاں ایک مسئلہ ائمہ مجتہدین میں مختلف فیہ ہے، وہ یہ کہ کوئی شخص باہر سے جرم کر کے حرم میں پناہ لے لے تو اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا؟ اس میں بعض ائمہ اس پر بھی حرم میں حدود و قصاص کی سزائیں جاری کرنے کا حکم دیتے ہیں، اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کو سزا سے چھوڑنا تو نہیں، کیونکہ اگر ایسا کیا گیا تو جرائم کر کے سزا سے بچنے کا راستہ کھل جائے گا اور عالم میں فساد برپا ہو جائے گا، اور حرم مجرموں کا ٹھکانا بن جائے گا، لیکن احترام حرم کے سبب حرم کے اندر سزا نہ دی جائے گی، بلکہ اس کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ حرم سے باہر نکلے، وہاں سے نکلنے کے بعد سزا جاری کی جائے گی۔

۳- **وَإِذَا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى**^۲ اس میں مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قدم مبارک کا بطور معجزہ نشان پڑ گیا تھا، اور جس کو تعمیر بیت اللہ کے وقت آپ نے استعمال کیا تھا۔ (صحیح بخاری) حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے اس پتھر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم مبارک کا نقشہ دیکھا ہے، مگر لوگوں کے بکثرت چھونے اور ہاتھ لگانے سے اب وہ نشان ہلکا پڑ گیا ہے (قرطبی)۔ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مقام ابراہیم کی تفسیر میں یہ بھی منقول ہے کہ پورا حرم مقام ابراہیم ہے، ممکن ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ طواف کے بعد کی دو رکعتیں جن کو مقام ابراہیم پر پڑھنے کا حکم اس آیت میں ہے، اس حکم کی تعمیل پورے حرم میں کسی جگہ بھی یہ رکعتیں پڑھنے سے ہو جائے گی، اس پر اکثر فقہائے اُمت متفق ہیں۔

۴- آیت مذکورہ میں مقام ابراہیم کو مصلیٰ بنانے کا حکم ہے، اس کی وضاحت خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں اپنے قول و عمل سے اس طرح فرمادی کہ آپ طواف کے بعد مقام ابراہیم کے پاس پہنچے جو بیت اللہ کے سامنے تھوڑے فاصلے سے رکھا ہوا ہے، وہاں پہنچ کر یہ آیت تلاوت فرمائی **وَإِذَا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى**^۳ اور پھر مقام ابراہیم کے پیچھے اس طرح دو رکعت نماز پڑھی کہ مقام ابراہیم کو درمیان میں رکھتے ہوئے بیت اللہ کا استقبال ہو جائے (صحیح مسلم)۔ اسی لئے فقہائے اُمت نے فرمایا ہے کہ جس شخص کو مقام ابراہیم کے پیچھے متصلاً جگہ نہ ملے، وہ کتنے ہی فاصلے پر بھی جب اس طرح کھڑا ہو کہ مقام ابراہیم بھی اس کے سامنے رہے اور بیت اللہ بھی تو اس حکم کی پوری تعمیل ہو جائے گی۔

۵- اس آیت سے ثابت ہوا کہ طواف کے بعد کی دو رکعتیں واجب ہیں۔ (حصّاص و مناسک مثلاً علی قاری)^۴

[۱] صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ج: ۱ ص: ۳۹۵

[۲] مناسک مثلاً علی القاری ص: ۱۵۵ واحکام القرآن للخصّاص ج: ۱ ص: ۷۴

البتہ ان دو رکعتوں کا خاص مقام ابراہیم کے پیچھے ادا کرنا سنت ہے، اور حرم میں کسی دوسری جگہ بھی ادا کرے تو کافی ہوگا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان رکعتوں کا بیت اللہ کے دروازے سے متصل پڑھنا بھی ثابت ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی اس جگہ پڑھنا منقول ہے (بہاص)۔ اور ملا علی قاریؒ نے مناسک میں فرمایا ہے کہ یہ دو رکعت طواف تو واجب ہیں، اور سنت یہ ہے کہ مقام ابراہیم کے پیچھے ادا کی جائیں، لیکن اگر کسی وجہ سے وہاں ادا نہ کر سکا تو پھر حرم میں یا حرم سے باہر جہاں کہیں ممکن ہو ادا کرنے سے واجب ادا ہو جائے گا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حجۃ الوداع میں حضرت ام سلمہؓ کو ایسا ہی اتفاق ہوا کہ ان کو واجب طواف نماز پڑھنے کا وہاں موقع نہ ملا تو مسجد حرام بلکہ مکہ مکرمہ سے نکلنے کے بعد ادا کی، اور بضرورت حرم سے باہر ادا کرنے پر جمہور علماء کے نزدیک کوئی دم بھی واجب نہیں ہوتا، صرف امام مالکؒ وجوب دم کے قائل ہیں۔ (مناسک ملا علی قاریؒ) [۲]

۶- **طَهْرًا بَيْنِي** اس میں بیت اللہ کو پاک کرنے کا حکم ہے، جس میں ظاہری نجاسات اور گندگی سے طہارت بھی داخل ہے، اور باطنی نجاسات کفر و شرک اور اخلاقِ رذیلیہ بغض و حسد، حرص و ہوا، تکبر و غرور، ریا و نام و نمود سے پاکی بھی شامل ہے، اور اس حکم طہارت کے لئے لفظ **بَيْنِي** میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ حکم تمام مساجد کے لئے عام ہے، کیونکہ ساری مساجد بیوٹ اللہ ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے: **فِي بُيُوتٍ اِذْنُ اللّٰهِ اَنْ تُرْفَعَ**۔ (النور: ۳۶)

حضرت فاروق اعظمؓ نے مسجد میں ایک شخص کی آواز سنی، تو فرمایا: تمہیں خبر نہیں کہ تم کہاں کھڑے ہو (قرطبی)۔ [۳] یعنی مسجد کا ادب و احترام چاہئے، اس میں غیر مشروع آواز بلند نہیں کرنا چاہئے۔ حاصل یہ ہے کہ اس آیت سے جس طرح بیت اللہ کا تمام ظاہری اور باطنی نجاسات سے پاک رکھنا ضروری ہے، اسی طرح تمام مساجد کو بھی پاک رکھنا واجب ہے، یعنی مساجد میں داخل ہونے والوں پر لازم ہے کہ اپنے بدن اور کپڑوں کو بھی تمام نجاسات اور بدبو کی چیزوں سے پاک صاف رکھیں، اور اپنے دلوں کو شرک و نفاق اور تمام اخلاقِ رذیلیہ، تکبر، حسد، بغض، حرص و ریا وغیرہ کی نجاسات سے پاک کر کے داخل ہوں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ کوئی شخص پیاز، لہسن وغیرہ بدبودار چیزیں کھا کر مسجد میں نہ جائے، [۴] اور چھوٹے بچوں اور دیوانوں کو مسجدوں میں داخل ہونے سے منع فرمایا ہے، [۵] کیونکہ ان سے نجاست کا خطرہ رہتا ہے۔

[۱] احکام القرآن ج: ۱ ص: ۷۳، ۷۵

[۲] ص: ۱۵۷

[۳] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۲ ص: ۱۱۳، ۱۱۵

[۴] صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب نہی من اکل ثوماً... إلخ ج: ۱ ص: ۲۰۹

[۵] سنن ابن ماجہ، ابواب المساجد، باب ما یکرہ فی المساجد ج: ۱ ص: ۵۳

۷- لِلظَّالِمِينَ وَالْعَافِينَ وَالرُّكَّعَ السُّجُودِ ﴿۱۲۵﴾ آیت کے ان کلمات سے چند احکام و فوائد حاصل ہوئے، اول یہ کہ بناء بیت اللہ کا مقصد طواف، اعتکاف اور نماز ہے، دوسرے یہ کہ طواف نماز سے مقدم ہے (کماروی عن ابن عباس)، تیسرے یہ کہ اطرافِ عالم سے جانے والے حجاج کے لئے طواف بہ نسبت نماز کے افضل ہے، چوتھے یہ کہ بیت اللہ کے اندر نماز علی الاطلاق جائز ہے فرض ہو یا نفل۔ (بہصاص)

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ

اور جب کہا ابراہیم نے: اے میرے رب! بنا اس کو شہرِ امن کا اور روزی دے اس کے رہنے والوں کو میوے

مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا

جو کوئی ان میں سے ایمان لاوے اللہ پر اور قیامت کے دن پر، فرمایا: اور جو کفر کرے اس کو بھی نفع پہنچاؤں گا تھوڑے دنوں

ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿۱۲۶﴾ وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ

پھر اس کو جبراً بلاؤں گا دوزخ کے عذاب میں اور وہ بری جگہ ہے رہنے کی۔ اور یاد کرو جب اٹھاتے تھے ابراہیم

الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ ۖ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ

بنیادیں خانہ کعبہ کی اور اسماعیل، دعا کرتے تھے: اے پروردگار ہمارے! قبول کر ہم سے بے شک تو ہی ہے سننے والا

الْعَلِيمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً

جاننے والا۔ اے پروردگار ہمارے! اور کر ہم کو حکم بردار اپنا، اور ہماری اولاد میں بھی کر ایک جماعت فرمانبردار

لَكَ ۖ وَآرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۱۲۸﴾

اپنی، اور بتلا ہم کو قاعدے حج کرنے کے اور ہم کو معاف کر، بے شک تو ہی ہے توبہ قبول کرنے والا مہربان۔

آسان ترجمہ قرآن

اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ابراہیم نے کہا تھا کہ: ”اے میرے پروردگار! اس کو ایک پُر امن شہر بنا دیجئے، اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لائیں انہیں قسم قسم کے پھلوں سے رزق عطا فرمائیے۔“ اللہ نے کہا: ”اور جو کفر اختیار کرے گا اس کو بھی میں کچھ عرصے کے لئے لطف اٹھانے کا موقع دوں گا، (مگر) پھر اُسے دوزخ کے عذاب کی طرف بھیج لے جاؤں گا۔ اور وہ بدترین ٹھکانا ہے۔“ (۱۲۸) اور اُس وقت کا تصور کرو جب ابراہیم بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے، اور اسماعیل بھی (ان کے ساتھ شریک تھے، اور دونوں یہ کہتے جاتے تھے کہ: ”اے ہمارے پروردگار! ہم سے (یہ خدمت) قبول فرمالے۔ بیشک تو، اور صرف تو ہی، ہر ایک کی سننے والا، ہر ایک کو جاننے والا ہے (۱۲۹) اے ہمارے پروردگار! ہم دونوں کو اپنا مکمل فرماں بردار بنالے، اور ہماری نسل سے بھی ایسی اُمت پیدا کر جو تیری پوری تابع دار ہو۔ اور ہم کو ہماری عبادتوں کے طریقے سکھا دے، اور ہماری توبہ قبول فرمالے۔ بیشک تو، اور صرف تو ہی، معاف کر دینے کا خوگر (اور) بڑی رحمت کا مالک ہے (۱۳۰)

خلاصہ تفسیر

اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جس وقت ابراہیم (علیہ السلام) نے (دُعائیں) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! اس (موقع) کو ایک (آباد) شہر بنا دیجئے (اور شہر بھی کیسا) امن (وامان) والا اور اس کے بسنے والوں کو پھلوں (کی قسم) سے بھی عنایت کیجئے (اور میں سب بسنے والوں کو نہیں کہتا بلکہ خاص) اُن کو (کہتا ہوں) جو اُن میں اللہ تعالیٰ پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہوں (باقیوں کو آپ جانیں) حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا (کہ چونکہ رزق ہمارا خاص نہیں ہے، اس لئے ثمرات سب کو دُلوں کا مومن کو بھی) اور اس شخص کو بھی جو کافر ہے (البتہ نجاتِ آخرت چونکہ اہل ایمان کے ساتھ خاص ہے) سو (اس واسطے) ایسے شخص کو (جو کہ کافر ہے) تھوڑے روز (یعنی دُنیا میں) تو خوب آرام برتاؤں گا (لیکن) پھر (بعد مرگ) اس کو کشاں کشاں عذابِ دوزخ میں پہنچاؤں گا اور ایسی پہنچنے کی جگہ تو بہت بری ہے (اللہ بچا دے۔ اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ اٹھا رہے تھے ابراہیم علیہ السلام دیواریں خانہ کعبہ کی اور (ان کے ساتھ) اسماعیل علیہ السلام بھی (اور یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ) اے ہمارے پروردگار! (یہ خدمت) ہم سے قبول فرمائیے، بلاشبہ آپ خوب سننے والے، جاننے والے ہیں (ہماری دُعا کو سنتے ہیں، ہماری نیتوں کو جانتے ہیں)۔ اے ہمارے پروردگار! اور (ہم دونوں یہ بھی دُعا کرتے ہیں کہ) ہم کو اپنا اور زیادہ مطیع بنا لیجئے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک ایسی

جماعت پیدا کیجئے جو آپ کی مطیع ہو، اور (نیز) ہم کو ہمارے حج (وغیرہ) کے احکام بھی بتلا دیجئے اور ہمارے حال پر (مہربانی کے ساتھ) توجہ رکھئے اور فی الحقیقت آپ ہی ہیں توجہ فرمانے والے، مہربانی کرنے والے۔

معارف مسائل

حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ کی راہ میں قربانیاں دیں، مال و منال، اہل و عیال اور خود اپنے نفس کی خواہشات کو نظر انداز کر کے تعمیل احکام ربانی میں مسارعت کے جو کارنامے پیش کئے وہ عجائب روزگار میں سے ہیں۔ اس کے ساتھ اہل و عیال پر شفقت و محبت ایک طبعی اور فطری امر ہونے کے ساتھ حکم ربانی بھی ہے، مذکور الصدر آیات اس کا مظہر ہیں، انہوں نے اپنے اہل و عیال کے لئے دین و دنیا کی آسائش و راحت کے لئے دعائیں مانگی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں

دُعا کو شروع لفظ رَبِّ سے کیا ہے، جس کے معنی ہیں ”اے میرے پالنے والے!“ ان الفاظ میں دُعا مانگنے کا سلیقہ سکھایا ہے، کہ خود یہ الفاظ حق تعالیٰ کی رحمت اور لطف و کرم کو متوجہ کرنے پر مؤثر دواعی ہیں، پھر سب سے پہلی دُعا یہ فرمائی کہ اس چٹیل میدان کو جس میں آپ کے حکم کے مطابق میں نے اپنے اہل و عیال کو لاڈالا ہے آپ ایک شہر بنا دیں، تاکہ یہاں کی سکونت میں اُن کو وحشت نہ ہو، اور ضروریات زندگی باسانی میسر آجائیں، یہی دُعا سورہ ابراہیم میں: هَذَا الْبَلَدُ اَمِنًا (ابراہیم: ۳۵) کے الفاظ سے آئی ہے، جس میں ”الْبَلَدُ“ کو الف لام کے ساتھ ذکر کیا ہے، جو عربی زبان کی اصطلاح میں ”معرّفہ“ کہلاتا ہے، فرق کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پہلی دُعا جو آیت سورہ بقرہ میں ”بَلَدًا“ کے لفظ سے آئی ہے یہ اس وقت کی گئی ہے جب یہ جگہ جنگل تھی، شہر بنا نہیں تھا، اس وقت ”بلد“ کو بغیر الف لام کے نکرہ استعمال کیا، اور دوسری دُعا بظاہر اس وقت کی ہے جب مکہ کی بستی بس گئی اور وہ شہر معروف بن گیا، اس کا قرینہ یہ ہے کہ سورہ ابراہیم کی آخری آیات میں ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلٰى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ (ابراہیم: ۳۹) جس سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یہ دُعا حضرت اسحاق کی پیدائش کے بعد کی ہے، اور حضرت اسحاق حضرت اسماعیل سے تیرہ سال بعد میں پیدا ہوئے۔ (ابن کثیر)

دوسری دُعا اس میں یہ ہے کہ اس شہر کو امن والا شہر بنا دیجئے، یعنی جو قتل و غارت گری سے، کفار کے تسلط سے اور آفات سے مأمون و محفوظ رہے۔

حضرت خلیل اللہ کی یہ دُعا قبول ہوئی، اور مکہ مکرمہ ایک ایسا آباد شہر ہو گیا کہ اس کی اپنی آبادی کے علاوہ ساری دنیا

کا مرجع بن گیا، اطرافِ عالم سے مسلمان وہاں پہنچنے کو اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتے ہیں، اور مامون و محفوظ بھی ہو گیا، کہ بیت اللہ کے مخالف کسی قوم اور کسی بادشاہ کا اس پر تسلط نہیں ہو سکا، اصحابِ فیل کا واقعہ خود قرآن میں مذکور ہے، کہ انہوں نے بیت اللہ پر حملے کا قصد کیا تو پورے لشکر کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔

یہ شہر قتل و غارت گری سے بھی برابر محفوظ چلا آ رہا ہے، اسلام سے پہلے بھی زمانہ جاہلیت والے کتنی ہی خرابیوں اور کفر و شرک کی رسموں میں مبتلا ہونے کے باوجود بیت اللہ اور اس کے ماحولِ حرم کی تعظیم و تکریم کو ایسا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے کہ کیسا ہی دشمن وہاں کسی کو مل جائے حرم میں اس سے قصاص یا انتقام نہ لیتے تھے، بلکہ سکانِ حرم کی تعظیم و تکریم بھی پورے عرب میں عام تھی، اسی لئے مکہ والے ملکِ شام اور یمن سے تجارتی درآمد و برآمد کا سلسلہ رکھتے تھے اور کوئی ان کی راہ میں حائل نہ ہوتا تھا۔

حدودِ حرم میں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو بھی امن دیا ہے، اس میں شکار جائز نہیں، ایسا ہی جانوروں میں بھی یہ قدرتی احساس پیدا فرما دیا ہے کہ حدودِ حرم میں آکر جانور اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے، کسی شکاری آدمی سے نہیں گھبراتا۔ حرمِ محترم کے مامون ہونے کے یہ احکام جو دعائے ابراہیمی کا نتیجہ ہیں زمانہ جاہلیت سے قائم چلے آتے تھے، اسلام اور قرآن نے ان کو اور زیادہ نکھارا، اور تقویت پہنچائی۔ حجاج ابن یوسف اور پھر قرامطہ کے ظلم و ستم اور بدکاریوں سے جو قتل و قتال حرم میں ہوا، اول تو وہ خود اسلام کا نام لینے والوں کے ہاتھوں ہوا، کوئی کافر قوم حملہ آور نہ تھی، اور کوئی شخص خود اپنے گھر کو آگ لگائے تو وہ امن کے منافی نہیں، اس کے علاوہ یہ واقعات شاذہ ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر آج تک ہزاروں سال کی مدت میں گنے چنے ہیں، اور قتل و قتال کے بعد ایسا کرنے والوں کا انجام بد بھی سب کے سامنے آ گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دعائے ابراہیمی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو ایک مامون شہر اور تمام دنیا کے لئے امن کی جگہ قدرتی طور پر بھی بنا دی ہے، یہاں تک کہ دجال کو بھی حرم میں داخل ہونے کی قدرت نہ ہوگی، اور شرعی طور پر بھی یہ احکام جاری فرما دیئے کہ حرم میں باہمی قتل و قتال تو کیا جانوروں کا شکار بھی حرام کر دیا گیا۔

تیسری دُعا یہ فرمائی کہ اس شہر کے باشندوں کو پھلوں کا رزق عطا فرمائیے، مکہ مکرمہ اور اس کے آس پاس کی زمین نہ کسی باغ و چمن کی متحمل تھی، نہ وہاں دُور دُور تک پانی کا نام و نشان تھا، مگر حق تعالیٰ نے دُعا ابراہیمی کو قبول فرمایا، اور مکہ کے قریب ہی طائف کا ایک ایسا خطہ بنا دیا جس میں ہر طرح کے بہترین پھل بکثرت پیدا ہوتے اور مکہ مکرمہ آکر فروخت ہوتے ہیں، بعض اسرائیلی روایات میں ہے کہ طائف دراصل ملکِ شام کا خطہ تھا، جس کو بحکم خداوندی جبریل امین نے یہاں منتقل کر دیا۔

حکمتِ ابراہیمی

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دُعا میں یہ نہیں فرمایا کہ مکہ اور اس کے ماحول کو گلزار اور پھلوں کی زمین یا قابلِ کاشت بنا دیجئے، بلکہ دُعا یہ فرمائی کہ یہ چیزیں پیدا کبی اور ہوں مگر مکہ میں پہنچا کریں، اس میں شاید یہ راز ہو کہ حضرت خلیل یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی اولاد کاشتکاری یا باغبانی کے کاموں میں مشغول ہو جائے، کیونکہ ان کو اس جگہ آباد کرنے کا منشا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود یہ فرمادیا: رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ (ابراہیم: ۳۷) جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت خلیل علیہ السلام اپنی اولاد کا اصل مشغلہ بیت اللہ کی حفاظت اور نماز کو رکھنا چاہتے تھے، ورنہ کیا مشکل تھا کہ خود مکہ مکرمہ کو ایسا گلزار بنا دیا جاتا کہ دمشق و بیروت اس پر رشک کرتے۔

رزق ثمرات تمام ضروریاتِ زندگی کو شامل ہے

لفظ ”ثمرات“ جو ثمرہ کی جمع ہے، اس کے معنی پھل کے ہیں، اور بظاہر اس سے مراد درختوں کے پھل ہیں، لیکن سورہ قصص آیت نمبر: ۵۷ میں اس دُعا کی قبولیت کا اظہار ان الفاظ میں فرمادیا ہے: يُجْعَلِي لِي فِيهِ ثَمَرَاتٌ كُلِّ شَيْءٍ ۖ اِنَّ الْفَاظِ میں ایک تو اس کی تصریح ہے کہ خود مکہ میں یہ پھل پیدا کرنے کا وعدہ نہیں، بلکہ دُوسرے مقامات سے یہاں لائے جایا کریں گے، کیونکہ لفظ يُجْعَلِي کا یہی مفہوم ہے، دُوسرے ”ثمرات کُل شجر“ نہیں فرمایا، بلکہ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ فرمایا، اس تغیر لفظی سے ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہاں ثمرات کو عام کرنا مقصود ہے، کیونکہ ”ثمرہ“ عرف میں ہر چیز سے حاصل ہونے والی پیداوار کو کہا جاتا ہے، درختوں سے پیدا ہونے والے پھل جس طرح اس میں داخل ہیں اسی طرح مشینوں سے حاصل ہونے والا کُل سامان بھی مشینوں کے ثمرات ہیں، اسی طرح مختلف دستکاریوں سے بننے والا سامان اُن دستکاریوں کے ثمرات ہیں، اس طرح ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ میں تمام ضروریاتِ زندگی داخل ہو جاتی ہیں، اور حالات و واقعات کا مشاہدہ بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اگرچہ ارضِ حرم کو نہ کاشت کی زمین بنایا ہے نہ صنعت کاری کی، لیکن دُنیا بھر میں پیدا ہونے والی اور بننے والی چیزیں یہاں عام طور پر مل جاتی ہیں، اور یہ بات شاید آج بھی کسی بڑے سے بڑے تجارتی یا صنعتی شہر کو حاصل نہ ہو کہ دُنیا بھر کی مصنوعات بکثرت و بآسانی وہاں مل جاتی ہیں۔

حضرت خلیل اللہ کی احتیاط

اس آیت میں جبکہ اہل مکہ کے لئے امن اور فراخی عیش کی دُعا کی گئی، تو ان میں مومن و کافر سب داخل تھے، اور اس سے پہلے حضرت خلیل اللہ نے جب ایک دُعا میں اپنی پوری ذریت کو بغیر امتیازِ مومن و کافر جمع کیا تھا، تو حق تعالیٰ کی

طرف سے یہ ارشاد آیا تھا کہ یہ دُعا مومنوں کے حق میں قبول ہے، ظالم مشرکوں کے حق میں قابل قبول نہیں، وہ دُعا تھی امامت و اقتدار کی، حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو، جو مقام خلعت پر فائز اور خشیت اللہ سے لبریز تھے، اس جگہ بھی وہ بات یاد آئی تو اپنی دُعا میں یہ قید لگا دی کہ یہ معاشی خوش حالی اور امن و امان کی دُعا صرف مومنین کے لئے کرتا ہوں، حق تعالیٰ کی طرف سے اس خشیت و احتیاط کی قدر کی گئی اور فرمایا: **وَمَنْ كَفَرَ** یعنی یہ دُنیوی خوش حالی اور اقتصادی فراخی ہم سبھی اہل مکہ کو عطا کریں گے، اگرچہ وہ ظالم مشرک و کافر ہی ہوں، البتہ مومنین کو یہ خوش حالی جس طرح دُنیا میں دی جائے گی اسی طرح آخرت میں بھی عطا ہوگی، اور کافروں کو آخرت میں عذاب کے سوا کچھ نہیں۔

اپنے نیک عمل پر بھروسہ اور قناعت نہ کرنے کی تعلیم

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حکم ربانی کی تعمیل میں ملکِ شام کے ہر بھرے خوش منظر خطہ کو چھوڑ کر مکہ مکرمہ کے خشک پہاڑوں کے درمیان اپنے اہل و عیال کو لا ڈالا، اور بیت اللہ کی تعمیر میں اپنی پوری توانائی خرچ کی، یہ موقع ایسا تھا کہ ایسے مجاہدے کرنے والے کے دل میں عجب پیدا ہوتا تو وہ اپنے عمل کو بہت کچھ قابل قدر سمجھتا، لیکن یہاں حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں، رب العزت کی بارگاہ عزت و جلال کو پہچاننے والے ہیں کہ کسی انسان سے اللہ تعالیٰ کے شایان شان عبادت و اطاعت ممکن نہیں، ہر شخص اپنی قوت و ہمت کی مقدار سے کام کرتا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ کوئی بھی بڑے سے بڑا عمل کرے تو اس پر ناز نہ کرے، بلکہ الحاح و زاری کے ساتھ دُعا کرے کہ میرا یہ عمل قبول ہو جائے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بناء بیت اللہ کے عمل کے متعلق یہ دُعا فرمائی کہ ”اے ہمارے پروردگار! آپ ہمارے اس عمل کو قبول فرمائیں، کیونکہ آپ تو سننے والے اور جاننے والے ہیں، ہماری دُعا کو سنتے ہیں اور ہماری نیتوں کو جانتے ہیں۔“

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ یہ دُعا بھی اسی معرفت و خشیت کا نتیجہ ہے، جو حضرت خلیل کو حاصل تھی، کہ اطاعت و فرمانبرداری کے بے مثال کارنامے بجالانے کے بعد بھی یہ دُعا کرتے ہیں کہ ”ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنا لیجئے“ وجہ یہ ہے کہ جتنی کسی کو حق تعالیٰ کی معرفت بڑھتی جاتی ہے، اتنا ہی اس کا یہ احساس بڑھتا جاتا ہے کہ ہم حق و فاداری اور حق فرمانبرداری پورا ادا نہیں کر رہے۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اس دُعا میں بھی اپنی اولاد کو شریک فرمایا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ والے جو اللہ کی راہ میں اپنی جان اور اولاد کی قربانی پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے، ان کو اپنی اولاد سے کس قدر محبت ہوتی ہے، مگر اس محبت کے صحیح تقاضوں کو پورا کرتے ہیں جہاں تک عوام کی رسائی نہیں، عوام تو اولاد کی صرف جسمانی صحت و راحت کو جانتے ہیں، اُن

کی ساری شفقت و راحت اُسی کے گرد گھومتی ہے، مگر اللہ کے مقبول بندے جسمانی سے زیادہ رُوحانی اور دُنیوی سے زیادہ اُخروی راحت کی فکر کرتے ہیں، اس لئے دُعا فرمائی کہ میری اولاد میں سے ایک جماعت کو پورا فرمانبردار بنادیتجئے۔ اپنی ذُریت کے لئے دُعا میں ایک حکمت اور بھی ہے کہ تجربہ شاہد ہے کہ جو لوگ قوم میں بڑے مانے جاتے ہیں ان کی اولاد اگر ان کے راستہ پر قائم رہے تو عوام میں اُن کی مقبولیت فطری ہوتی ہے، ان کی صلاحیت صلاح عوام کا ذریعہ بنتی ہے۔ (بحر محیط) ۱

حضرت خلیل اللہ کی یہ دُعا بھی قبول ہوئی کہ آپ کی ذُریت میں ہمیشہ ایسے لوگ موجود رہے ہیں جو دین حق پر قائم اور اللہ کے فرمانبردار بندے تھے، جاہلیتِ عرب میں جبکہ پوری دُنیا کو خصوصاً عرب کو شرک و بت پرستی نے گھیر لیا تھا، اس وقت اولادِ ابراہیم میں ہمیشہ کچھ لوگ عقیدہ توحید و آخرت کے سچے معتقد اور اطاعت شعار رہے ہیں، جیسے اہل جاہلیت میں زید بن عمرو بن نفیل اور قس بن ساعدہ تھے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِ امجد عبدالمطلب بن ہاشم کے متعلق بھی یہی روایت ہے کہ وہ شرک و بت پرستی سے بیزار تھے۔ (بحر محیط) ۲

وَأَيُّهَا مَنْ سَكَنَّا، مناسک منسک کی جمع ہے، اعمالِ حج کو بھی مناسک کہا جاتا ہے، اور مقاماتِ حج، عرفات، منیٰ، مزدلفہ کو بھی، یہاں دونوں مراد ہو سکتے ہیں، اور دُعا کا حاصل یہ ہے کہ ہمیں اعمالِ حج اور مقاماتِ حج پوری طرح سمجھا دیتجئے، اسی لئے لفظ آریٰ استعمال فرمایا، جس کے معنی ہیں ”ہمیں دکھلا دیتجئے“ وہ دیکھنا آنکھوں سے بھی ہو سکتا ہے اور قلب سے بھی، چنانچہ مقاماتِ حج کو بذریعہ جبریل امین دکھلا کر متعین کر دیا گیا اور احکامِ حج کی واضح تلقین و تعلیم فرمادی گئی۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ

اے پروردگار ہمارے! اور بھیج ان میں ایک رسول انہی میں کا کہ پڑھے اُن پر تیری آیتیں اور سکھلائے ان کو کتاب

وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۙ ۱۲۹

اور تہ کی باتیں اور پاک کرے ان کو، بے شک تو ہی ہے بہت زبردست بڑی حکمت والا۔

آسان ترجمہ قرآن

اور ہمارے پروردگار! ان میں ایک ایسا رسول بھی بھیجنا جو انہی میں سے ہو، جو ان کے سامنے تیری آیتوں کی

تلاوت کرے، انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے، اور ان کو پاکیزہ بنائے۔ بیشک تیری، اور صرف تیری، ذات وہ ہے جس کا اقتدار بھی کامل ہے، جس کی حکمت بھی کامل۔“ (۱۲۹)

خلاصہ تفسیر

اے ہمارے پروردگار! اور (یہ بھی دعا ہے کہ) اس جماعت کے اندر (جس کے پیدا ہونے کی دعا اپنی اولاد میں سے کر رہے ہیں) انہی میں کا ایک ایسا پیغمبر بھی مقرر کیجئے جو ان لوگوں کو آپ کی آیات پڑھ کر سنایا کریں اور ان کو (آسمانی) کتاب (کے مضامین) کی اور (اس میں) خوش فہمی (کا سلیقہ حاصل کرنے) کی تعلیم دیا کریں اور ان کو (اس تعلیم و تلاوت کے ذریعہ جہالت کے خیالات اور اعمال سے) پاک کریں، بلاشبہ آپ ہی ہیں غالب القدرت کامل الانتظام۔

تشریح لغات

يَتْلُو عَلَيْهِمُ الْبَيِّنَاتِ، مصدر تلاوة سے مشتق ہے، تلاوت کے اصلی معنی اتباع اور پیروی کے ہیں، اصطلاح قرآن وحدیث میں یہ لفظ قرآن کریم اور دوسری آسمانی کتابوں اور کلامِ الہی کے پڑھنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ اس کلام کے پڑھنے والے کو اس کا پورا اتباع کرنا لازم ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ٹھیک اسی طرح پڑھنا ضروری ہے، اپنی طرف سے کسی لفظ یا اس کی حرکات میں کمی بیشی یا تبدیلی کی اجازت نہیں۔ امام راغب اصفہانی نے ”مفردات القرآن“ میں فرمایا ہے کہ کلامِ الہی کے سوا کسی دوسری کتاب یا کلام کے پڑھنے کو عرفاً تلاوت نہیں کہا جاسکتا۔

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ، اس میں ”کتاب“ سے مراد کتاب اللہ ہے، اور ”الحِکْمَةُ“ کا لفظ عربی لغت میں کئی معنی کے لئے آتا ہے، حق بات پر پہنچنا، عدل و انصاف، علم و حلم وغیرہ (قاموس)۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لئے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی تمام اشیاء کی پوری معرفت اور مستحکم ایجاد کے ہوتے ہیں، اور جب غیر اللہ کے لئے بولا جائے تو موجودات کی صحیح معرفت اور نیک اعمال کے، لئے جاتے ہیں، ترجمہ شیخ الہند میں اس کا ترجمہ ”تہہ کی باتیں“ اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے، اور لفظ ”حکمت“ عربی زبان میں کئی معنی کے لئے بولا جاتا ہے، علم صحیح، نیک عمل، عدل و انصاف، قول صادق وغیرہ۔ (قاموس و راغب) [۱]

اس لئے دیکھنا ہے کہ اس آیت میں لفظ ”حکمت“ سے کیا مراد ہے، مفسرین صحابہ و تابعین جو معانی قرآن کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھ کر کرتے ہیں، اس جگہ لفظ حکمت کے معنی بیان کرنے میں اگرچہ ان کے الفاظ

مختلف ہیں، لیکن خلاصہ سب کا ایک ہی ہے، یعنی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، امام تفسیر ابن کثیر و ابن جریر نے حضرت قتادہ سے یہی تفسیر نقل کی ہے، کسی نے تفسیر قرآن اور کسی نے تفقہ فی الدین فرمایا ہے، اور کسی نے علم احکام شرعیہ کہا، اور کسی نے کہا کہ ایسے احکام الہیہ کا علم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی بیان سے معلوم ہو سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان سب کا حاصل وہی حدیث و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

لفظ **يُزَكِّيهِمْ** زکوٰۃ سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں طہارت اور پاکی، اور یہ لفظ ظاہری اور باطنی ہر طرح کی پاکی کے لئے بولا جاتا ہے۔

معارف مسائل

تشریح مذکور سے آیت کا مفہوم واضح ہو گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آئندہ نسل کی فلاح دنیا و آخرت کے واسطے حق تعالیٰ سے یہ دُعا کی کہ میری اولاد میں ایک رسول بھیج دیجئے جو ان کو آپ کی آیات تلاوت کر کے سنائے اور قرآن و سنت کی تعلیم دے، اور ان کو ظاہری و باطنی گندگیوں سے پاک کرے۔ اس میں حضرت خلیل اللہ نے اس رسول کے لئے اپنی اولاد میں ہونے کی اس لئے دُعا فرمائی کہ اول تو یہ اپنی اولاد کے لئے سعادت و شرف ہے، دوسرے ان لوگوں کے لئے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ رسول جب انہی کی قوم اور برادری کے اندر ہوگا، تو اس کے چال، چلن سیرت و حالات سے یہ لوگ بخوبی واقف ہوں گے، کسی دھوکا فریب میں مبتلا نہ ہوں گے، حدیث میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس دُعا کا جواب حق تعالیٰ کی طرف سے یہ ملا کہ آپ کی دُعا قبول کر لی گئی، اور یہ رسول آخری زمانہ میں بھیجے جائیں گے۔ (ابن جریر و ابن کثیر) ^[۲]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خصوصیات

مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اللہ کے نزدیک خاتم النبیین اس وقت تھا جبکہ آدم علیہ السلام پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، بلکہ ان کا خمیر ہی تیار ہو رہا تھا، اور میں آپ لوگوں کو اپنے معاملہ کی ابتدا بتلاتا ہوں کہ میں اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت اور اپنی والدہ ماجدہ کے

۱۔ تفسیر الطبری تحت هذه الآية ج: ۳ ص: ۸۶، ۸۷ و تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۴۴۳، ۴۴۵

۲۔ تفسیر ابن کثیر ج: ۱ ص: ۴۴۳

۳۔ مسند احمد رقم الحدیث: ۷۷۳

خواب کا مظہر ہوں، عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت سے مراد ان کا یہ قول ہے: وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ (الصف: ۶)، اور والدہ ماجدہ نے حالتِ حمل میں یہ خواب دیکھا تھا کہ میرے بطن سے ایک نور نکلا جس سے ملکِ شام کے محلات جگمگا اٹھے، پھر قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا تذکرہ کرتے ہوئے دو جگہ سورہ آل عمران آیت نمبر ۱۶۳ اور سورہ جمعہ آیت نمبر ۲ میں انہی الفاظ کا اعادہ کیا گیا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں یہاں مذکور ہیں، جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس رسول کے بھیجنے کی دعا فرمائی تھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، آیت کے الفاظ کی تشریح اور اس کا مفہوم واضح ہو جانے کے بعد اس پر غور کیجئے۔

بعثتِ رسول کے تین مقاصد

سورہ بقرہ کی اس آیت میں اور سورہ آل عمران اور سورہ جمعہ کی آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایک ہی مضمون ایک ہی طرح کے الفاظ میں آیا ہے، جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا میں تشریف لانے کے مقاصد یا آپ کے عہدہ نبوت و رسالت کے فرائض منصبی تین بیان کئے گئے ہیں، ایک تلاوتِ آیات، دوسرے تعلیم کتاب و حکمت، تیسرے لوگوں کا تزکیہ اخلاق وغیرہ۔

پہلا مقصد تلاوتِ آیات

یہاں پہلی بات قابلِ غور ہے کہ تلاوت کا تعلق الفاظ سے ہے، اور تعلیم کا معانی سے، یہاں تلاوت و تعلیم کو الگ الگ بیان کرنے سے یہ حاصل ہوا کہ قرآن کریم میں جس طرح معانی مقصود ہیں، اس کے الفاظ بھی مستقل مقصود ہیں، ان کی تلاوت و حفاظت فرض اور اہم عبادت ہے، یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بلا واسطہ شاگرد اور مخاطب خاص وہ حضرات تھے جو عربی زبان کے نہ صرف جاننے والے بلکہ اس کے فصیح و بلیغ خطیب اور شاعر بھی تھے، ان کے سامنے قرآن عربی کا پڑھ دینا بھی بظاہر ان کی تعلیم کے لئے کافی تھا، ان کو الگ سے ترجمہ و تفسیر کی ضرورت نہ تھی، تو پھر تلاوتِ آیات کو ایک علیحدہ مقصد اور تعلیم کتاب کو جدا گانہ دوسرا مقصد رسالت قرار دینے کی کیا ضرورت تھی، جبکہ عمل کے اعتبار سے یہ دونوں مقصد ایک ہی ہو جاتے ہیں، اس میں غور کیا جائے تو دو اہم نتیجے آپ کے سامنے آئیں گے، اول یہ کہ قرآن کریم دوسری کتابوں کی طرح ایک کتاب نہیں جس میں صرف معانی مقصود ہوتے ہیں، الفاظ ایک ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں اگر معمولی تغیر و تبدل بھی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا، ان کے الفاظ بغیر معنی سمجھے ہوئے پڑھتے رہنا بالکل لغو و فضول ہے، بلکہ قرآن کریم کے جس طرح معانی مقصود ہیں اسی طرح الفاظ بھی مقصود ہیں، اور الفاظ

قرآن کے ساتھ خاص خاص احکام شرعیہ بھی متعلق ہیں، یہی وجہ ہے کہ اصول فقہ میں قرآن کریم کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ ”هُوَ النَّظْمُ وَالْمَعْنَى جَمِيعًا“ یعنی قرآن نام ہے الفاظ اور معنی دونوں کا، جس سے معلوم ہوا کہ اگر معانی قرآن کو الفاظ قرآن کے علاوہ دوسرے الفاظ یا دوسری زبان میں لکھا جائے تو وہ قرآن کہلانے کا مستحق نہیں، اگرچہ مضامین بالکل صحیح درست ہی ہوں، ان مضامین قرآنیہ کو بدلے ہوئے الفاظ میں اگر کوئی شخص نماز میں پڑھ لے، تو نماز ادا نہ ہوگی، اسی طرح وہ تمام احکام جو قرآن سے متعلق ہیں اس پر عائد نہیں ہوں گے، قرآن کریم کی تلاوت کا جو ثواب احادیث صحیحہ میں وارد ہے وہ بدلی ہوئی زبان یا بدلے ہوئے الفاظ پر مرتب نہیں ہوگا، اور اسی لئے فقہائے اُمت نے قرآن کریم کا صرف ترجمہ بلا متن قرآن کے لکھنے اور چھاپنے کو ممنوع فرمایا ہے، جس کو عرف میں اُردو کا قرآن یا انگریزی کا قرآن کہہ دیا جاتا ہے، کیونکہ درحقیقت جو قرآن اُردو یا انگریزی میں نقل کیا گیا وہ قرآن کہلانے کا مستحق نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں تعلیم کتاب سے علیحدہ تلاوت آیات کو جداگانہ فرض قرار دے کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ قرآن کریم میں جس طرح اس کے معانی مقصود ہیں، اسی طرح اس کے الفاظ بھی مقصود ہیں، کیونکہ تلاوت الفاظ کی ہوتی ہے، معانی کی نہیں، اسی لئے جس طرح رسول کے فرائض میں معانی کی تعلیم داخل ہے، اسی طرح الفاظ کی تلاوت اور حفاظت بھی ایک مستقل فرض ہے، اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم کے نزول کا اصل مقصد اس کے بتائے ہوئے نظام زندگی پر عمل کرنا اور اس کی تعلیمات کو سمجھنا اور سمجھانا ہے، محض اس کے الفاظ رٹ لینے پر قناعت کر کے بیٹھ جانا قرآن کریم کی حقیقت سے بے خبری اور اس کی بے قدری ہے۔

قرآن کریم کے الفاظ اگر بے سمجھے بھی پڑھے جائیں تو بیکار نہیں، بلکہ موجب ثواب عظیم ہیں

لیکن اس کے ساتھ یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں کہ ”جب تک قرآن کریم کے الفاظ کے معانی نہ سمجھے، طوطے کی طرح اس کے الفاظ پڑھنا فضول ہے۔“ یہ میں اس لئے واضح کر رہا ہوں کہ آج کل بہت سے حضرات قرآن کریم کو دوسری کتابوں پر قیاس کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک کسی کتاب کے معنی نہ سمجھیں تو اس کے الفاظ کا پڑھنا پڑھانا وقت ضائع کرنا ہے، مگر قرآن کریم میں ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے، کیونکہ قرآن الفاظ اور معنی دونوں کا نام ہے، جس طرح ان کے معانی کا سمجھنا اور اس کے دیئے ہوئے احکام پر عمل کرنا فرض اور اعلیٰ عبادت ہے، اسی طرح اس کے الفاظ کی تلاوت بھی ایک مستقل عبادت اور ثواب عظیم ہے۔

دوسرا مقصد تعلیم کتاب

یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ جو معانی قرآن کو سب سے زیادہ جاننے والے اور سمجھنے والے تھے، انہوں نے محض معنی سمجھ لینے اور عمل کر لینے کو کافی نہ سمجھا، سمجھنے اور عمل کرنے کے لئے تو ایک مرتبہ پڑھ لینا کافی ہوتا، انہوں نے ساری عمر تلاوت قرآن کو حرزِ جان بنائے رکھا، بعض صحابہؓ روزانہ ایک قرآن مجید ختم کرتے تھے، بعض دو دن میں اور اکثر حضرات تین دن میں ختم قرآن کے عادی تھے، اور ہر ہفتے میں قرآن ختم کرنے کا تو پوری اُمت کا معمول رہا ہے، قرآن کریم کی سات منزلیں اسی ہفتہ واری معمول کی علامت ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا یہ عمل بتلا رہا ہے کہ جس طرح قرآن کے معانی کا سمجھنا اور عمل کرنا اصلی عبادت ہے، اسی طرح اس کے الفاظ کی تلاوت بھی بجائے خود ایک اعلیٰ عبادت اور موجب انوار و برکات اور سرمایہ سعادت و نجات ہے، اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں تلاوت آیات کو ایک مستقل حیثیت دی گئی، مقصد یہ ہے کہ جو مسلمان فی الحال معانی قرآن کو نہیں سمجھتے وہ اس بد نصیبی میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ الفاظ کو فضول سمجھ کر اس سے بھی محروم ہو جائیں، کوشش کرتے رہنا ضروری ہے کہ وہ قرآن کے معانی کو سمجھیں تاکہ قرآن کریم کے حقیقی انوار و برکات کا مشاہدہ کریں، اور نزول قرآن کا اصلی مقصد پورا ہو، قرآن کو معاذ اللہ جنتِ منتر کی طرح صرف جھاڑ پھونک میں استعمال کی چیز نہ بنائیں، اور بقول اقبال مرحوم سورہ یس کو صرف اس کام کے لئے نہ سمجھیں کہ اس کے پڑھنے سے مرنے والے کی جان سہولت سے نکل جاتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آیت میں فرائض رسول بیان کرتے ہوئے تلاوت آیات کو مستقل فرض کی حیثیت دے کر اس پر تنبیہ کر دی گئی ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کی تلاوت اور ان کی حفاظت اور ان کو ٹھیک اس لب و لہجے میں پڑھنا جس پر وہ نازل ہوئے ہیں، ایک مستقل فرض ہے۔ اسی طرح تلاوت آیات کے فرض کے ساتھ تعلیم کتاب کو جداگانہ فرض قرار دینے سے ایک دوسرا اہم نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن فہمی کے لئے صرف عربی زبان کا جان لینا کافی نہیں، بلکہ تعلیم رسول کی ضرورت ہے جیسے کہ تمام علوم فنون میں یہ بات معلوم و مشاہدہ ہے کہ کسی فن کی کتاب کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے محض اس کتاب کی زبان جاننا بلکہ زبان کا ماہر ہونا بھی کافی نہیں، جب تک کہ اس فن کو کسی ماہر اُستاد سے حاصل نہ کیا جائے، مثلاً آج کل ڈاکٹری، ہومیو پیتھک اور ایلو پیتھک کی کتابیں عموماً انگریزی زبان میں ہیں، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ محض انگریزی زبان میں مہارت پیدا کر لینے اور ڈاکٹری کی کتابوں کا مطالعہ کر لینے سے کوئی شخص ڈاکٹر نہیں بن سکتا، انجینئرنگ کی کتابیں پڑھنے سے کوئی انجینئر نہیں بن سکتا، بڑے فنون تو اپنی جگہ پر ہیں، معمولی روزمرہ کے کام محض کتاب کے مطالعہ سے بغیر اُستاد سے سیکھے ہوئے حاصل نہیں ہو سکتے، آج تو ہر صنعت و حرفت پر سینکڑوں کتابیں لکھی ہوئی ہیں، فوٹو دے کر کام سکھانے کے

طریقے بتائے ہیں، لیکن ان کتابوں کو دیکھ کر نہ کوئی درزی بنتا ہے نہ باورچی یا لوہار، اگر محض زبان جان لینا کسی فن کے حاصل کرنے اور اس کی کتاب سمجھنے کے لئے کافی ہوتا تو دنیا کے سب فنون اس شخص کو حاصل ہو جاتے جو ان کتابوں کی زبان جانتا ہے، اب ہر شخص غور کر سکتا ہے کہ معمولی فنون اور ان کے سمجھنے کے لئے جب محض زبان دانی کافی نہیں، تعلیم اُستاد کی ضرورت ہے تو مضامین قرآن جو علومِ الہیہ سے لے کر طبعیات و فلسفہ تک تمام گہرے دقیق علوم پر مشتمل ہے وہ محض عربی زبان جان لینے سے کیسے حاصل ہو سکتے ہیں، اور اگر یہی ہوتا تو جو شخص عربی زبان سیکھ لے وہ معارف قرآن کا ماہر سمجھا جائے تو آج بھی ہزاروں یہودی اور نصرانی عرب ممالک میں عربی زبان کے بڑے ماہر اُدیب ہیں، وہ سب سے بڑے مفسر قرآن مانے جاتے، اور عہدِ رسالت میں ابو جہل، ابولہب قرآن کے ماہر سمجھے جاتے۔

غرض یہ ہے کہ قرآن کریم نے ایک طرف تو رسول کے فرائض میں تلاوت آیات کو ایک مستقل فرض قرار دیا، دوسری طرف تعلیم کتاب کو جداگانہ فرض قرار دے کر بتلادیا کہ محض تلاوت آیات کا سن لینا فہم قرآن کے لئے عربی زبان جاننے والوں کے واسطے بھی کافی نہیں، بلکہ تعلیم رسول ہی کے ذریعے قرآنی تعلیم کا صحیح علم حاصل ہو سکتا ہے، قرآن کو تعلیمات رسول سے جدا کر کے خود سمجھنے کی فکر خود فریبی کے سوا کچھ نہیں، اگر مضامین قرآنی کو بتلانے سکھانے کی ضرورت نہ ہوتی تو رسول کو بھیجے ہی کی کوئی حاجت نہ تھی، اللہ کی کتاب کسی دوسری طرح بھی انسانوں تک پہنچائی جاسکتی تھی، مگر اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہیں، وہ جانتے ہیں کہ مضامین قرآنی کی تعلیم و تفہیم کے لئے دنیا کے دوسرے علوم و فنون سے زیادہ تعلیم اُستاد کی ضرورت ہے، اور یہاں پر عام اُستاد بھی کافی نہیں، بلکہ ان مضامین کا اُستاد صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جس کو حق تعالیٰ سے بذریعہ وحی شرف ہم کلامی حاصل ہو، جس کو اسلام کی اصطلاح میں ”نبی و رسول“ کہا جاتا ہے، اس لئے قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بھیجے کا مقصد یہ قرار دیا کہ وہ قرآن کریم کے معانی و احکام کی شرح کر کے بیان فرمائیں، ارشاد ہے: لَتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (النحل: ۴۴) یعنی ”ہم نے آپ کو اس لئے بھیجا ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے اللہ کی نازل کردہ آیات کے مطالب بیان فرمائیں۔“ تعلیم کتاب کے ساتھ آپ کے فرائض میں دوسری چیز تعلیم حکمت بھی رکھی گئی ہے، اور میں نے اوپر بتلایا ہے کہ ”حکمت“ کے عربی زبان کے اعتبار سے اگرچہ کئی معنی ہو سکتے ہیں، لیکن اس آیت میں اور اس کے ہم معنی دوسری آیات میں صحابہ و تابعین نے حکمت کی تفسیر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی ہے، جس سے واضح ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمے جس طرح معانی قرآن کا سمجھانا و بتلانا فرض ہے، اسی طرح پیغمبرانہ تربیت کے اُصول و آداب جن کا نام ”سنت“ ہے، ان کی تعلیم بھی آپ کے فرائض منصبی میں داخل ہے، اور اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ”إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا“ ”میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔“^[۱] اور یہ ظاہر

ہے کہ جب آپ کا مقصد وجود معلم ہونا ہے، تو آپ کی اُمت کا مقصد وجود متعلم اور طالب علم ہونا لازم ہو گیا، اس لئے ہر مسلمان مرد و عورت بحیثیت مسلمان ہونے کے ایک طالب علم ہونا چاہئے جس کو تعلیماتِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لگن ہو، اگر علوم قرآن و سنت کی مکمل تحصیل اور اس میں مہارت کے لئے ہمت و فرصت نہیں ہے، تو کم از کم بقدر ضرورت علم حاصل کرنے کی فکر چاہئے۔

تیسرا مقصد تزکیہ

تیسرا فرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں تزکیہ ہے، جس کے معنی ہیں ظاہری و باطنی نجاسات سے پاک کرنا۔ ظاہری نجاسات سے تو عام مسلمان واقف ہیں، باطنی نجاسات کفر اور شرک، غیر اللہ پر اعتماد کلی اور اعتقادِ فاسد، نیز تکبر و حسد، بغض، حب دُنیا وغیرہ ہیں، اگرچہ علمی طور پر قرآن و سنت کی تعلیم میں ان سب چیزوں کا بیان آ گیا ہے، لیکن تزکیہ کو آپ کا جداگانہ فرض قرار دے کر اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ جس طرح محض الفاظ کے سمجھنے سے کوئی فن حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح نظری و علمی طور پر فن حاصل ہو جانے سے اس کا استعمال اور کمال حاصل نہیں ہوتا جب تک کسی مربی کے زیر نظر اس کی مشق کر کے عادت نہ ڈالے، سلوک و تصوف میں کسی شیخِ کامل کی تربیت کا یہی مقام ہے کہ قرآن و سنت میں جن احکام کو عملی طور پر بتلایا گیا ہے اُن کی عملی طور پر عادت ڈالی جائے۔

ہدایت و اصلاح کے دو سلسلے، کتاب اللہ اور رجال اللہ

اب اس سلسلے کی دو باتیں اور قابلِ نظر ہیں:-

اول یہ کہ اللہ جل شانہ نے ابتدائے آفرینش سے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے ہمیشہ ہر زمانے میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک دو سلسلے جاری رکھے ہیں، ایک آسمانی کتابوں کا، دوسرے اس کی تعلیم دینے والے رسولوں کا۔ جس طرح محض کتاب نازل فرما دینے کو کافی نہیں سمجھا، اسی طرح محض رسولوں کے بھیجنے پر بھی اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ دونوں سلسلے برابر جاری رکھے، اللہ جل شانہ کی اس عادت اور قرآن کریم کی شہادت نے قوموں کی صلاح و فلاح کے لئے ان دونوں سلسلوں کو یکساں طور پر جاری فرما کر ایک بڑے علم کا دروازہ کھول دیا کہ انسان کی صحیح تعلیم و تربیت کے لئے نہ صرف کتاب کافی ہے، نہ کوئی مربی انسان، بلکہ ایک طرف آسمانی ہدایات اور الہی قانون کی ضرورت ہے جس کا نام کتاب یا قرآن ہے، دوسری طرف ایک معلم اور مربی انسان کی ضرورت ہے جو اپنی تعلیم و تربیت سے عام انسان کو آسمانی ہدایات سے روشناس کر کے ان کا خوگر بنائے، کیونکہ انسان کا اصلی معلم انسان ہی ہو سکتا ہے، کتاب معلم یا مربی نہیں ہو سکتی، ہاں

تعلیم و تربیت میں معین و مددگار ضرور ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جس طرح اسلام کی ابتدا ایک کتاب اور ایک رسول سے ہوئی، اور ان دونوں کے امتزاج نے ایک صحیح اور اعلیٰ مثالی معاشرہ دنیا میں پیدا کر دیا، اسی طرح آگے آنے والی نسلوں کے لئے بھی ایک طرف شریعتِ مطہرہ اور دوسری طرف رجالِ اللہ کا سلسلہ رہا، قرآن کریم نے جگہ جگہ اس کی ہدایتیں دی ہیں، ایک جگہ ارشاد ہوا:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴿۱۹﴾ (التوبہ)

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ رہو۔“

دوسری جگہ ”صادقین“ کی تعریف اور اوصاف بیان کر کے فرمایا:-

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿۲۰﴾ (البقرة)

”اور یہی لوگ سچے ہیں، اور یہی ہیں پرہیزگار۔“

پورے قرآن کا خلاصہ سورہ فاتحہ ہے، اور سورہ فاتحہ کا خلاصہ صراطِ مستقیم کی ہدایت ہے، یہاں بھی صراطِ مستقیم کا پتہ دینے کے لئے بجائے اس کے کہ صراطِ القرآن یا صراطِ الرسول یا صراطِ السنۃ فرمایا جاتا، کچھ اللہ والے لوگوں کا پتہ دیا گیا کہ اُن سے صراطِ مستقیم حاصل کی جائے، ارشاد ہوا:-

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۚ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ﴿۳۰﴾

”یعنی صراطِ مستقیم اُن لوگوں کا راستہ ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا ہے نہ کہ اُن لوگوں کا جو

گمراہ ہو گئے۔“

دوسری جگہ ان کی مزید تعین اور توضیح قرآن میں وارد ہوئی جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے: فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصَّادِقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ (النساء: ۶۹)۔ اسی طرح رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد کے لئے کچھ حضرات کے نام متعین کر کے دینی معاملات میں آپ کا اتباع کرنے کی ہدایت فرمائی، ترمذی کی صحیح حدیث میں ہے:-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ مَا إِنِ اخَذْتُمْ بِهِ لَنْ تَضِلُّوا كِتَابَ اللَّهِ وَعِثْرَتِي

أَهْلَ بَيْتِي - (ترمذی)

”اے لوگو! میں تمہارے لئے اپنے بعد میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں، ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے

۱ ترجمہ:- تو وہ اُن کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔

۲ ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب اہل البیت ج: ۲ ص: ۲۱۹

رہنا، تو تم گمراہ نہ ہو گے، ایک کتاب اللہ دوسری میری اولاد اور اہل بیت۔“
اور جامع الترمذی کی حدیث میں ہے:-

اِقْتَدُوا بِالَّذِينَ مِنْ بَعْدِي أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرُ -
”یعنی میرے بعد ابو بکر اور عمر کا اتباع کرو۔“

اور ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:-

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ -
”میرے طریقے کو اختیار کرو، اور خلفائے راشدین کے طریقے کو۔“

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن کریم کی ان ہدایات اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ قوموں کی اصلاح و تربیت کے لئے ہر قرن، ہر زمانے میں دو چیزیں ضروری ہیں، قرآنی ہدایات اور ان کے سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کا سلیقہ حاصل کرنے کے لئے ماہرین شریعت اور اللہ والوں کی تعلیم و تربیت، اور اگر مختلف علوم و فنون اور ان کے سیکھنے سکھانے کے طریقوں پر ناقدانہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اصول تعلیم و تربیت کچھ دین اور دینیات ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام علوم و فنون کی صحیح تحصیل اسی پر دائر ہے کہ ایک طرف ہر فن کی بہترین کتابیں ہوں تو دوسری طرف ماہرین کی تعلیم و تربیت، ہر علم و فن کی ترقی و تکمیل کے یہی دو بازو ہیں، لیکن دین اور دینیات میں ان دونوں بازوؤں سے فائدہ اٹھانے میں بہت سے لوگ افراط و تفریط کی غلط روش میں پڑ جاتے ہیں، جس کا نتیجہ بجائے فائدہ اٹھانے کے نقصان، اور بجائے اصلاح کے فساد ہوتا ہے۔

بعض لوگ کتاب اللہ کو نظر انداز کر کے صرف علماء و مشائخ ہی کو قبلہ مقصود بنا لیتے ہیں، اور ان کے متبع شریعت ہونے کی تحقیق نہیں کرتے، اور یہ اصلی مرض یہود و نصاریٰ کا ہے کہ اِتَّخَذُوا أَحْبَابَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ (التوبہ: ۳۱) یعنی ”ان لوگوں نے اپنے علماء و مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا معبود اور قبلہ مقصود بنا لیا“ ظاہر ہے کہ یہ راستہ شرک و کفر کا ہے، اور لاکھوں انسان اس راستے میں برباد ہوئے، اور ہو رہے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں بعض وہ لوگ بھی ہیں جو علوم قرآن و حدیث کے حاصل کرنے میں کسی معلم و مربی کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف اللہ کی کتاب کافی ہے، نہ ماہر علماء کی ضرورت، نہ تربیت یافتہ مشائخ کی حاجت، یہ دوسری گمراہی ہے، جس کا نتیجہ دین و ملت سے نکل کر نفسانی اغراض کا شکار ہونا ہے، کیونکہ ماہرین کی امداد و اعانت کے بغیر کسی فن کا صحیح حاصل ہو جانا انسانی فطرت

۱ مشکوٰۃ، باب مناقب ابی بکر و عمر رضی اللہ عنہما ج: ۲ ص: ۵۶۰

۲ مشکوٰۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسنة ج: ۱ ص: ۳۰۰

کے خلاف ہے، ایسا کرنے والا یقیناً غلط فہمیوں کا شکار ہوتا ہے، اور یہ غلط فہمی بعض اوقات اس کو دین و ملت سے بالکل نکال دیتی ہے۔

اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ ان دو چیزوں کو اپنے مقامات اور حدود میں رکھ کر ان سے فائدہ اٹھایا جائے، یہ سمجھا جائے کہ حکم اصلی صرف ایک وحدہ لا شریک لہ کا ہے، اور اطاعت اصل میں اسی کی ہے، رسول بھی اس پر عمل کرنے اور کرانے کا ایک ذریعہ ہے، رسول کی اطاعت بھی محض اسی نظر سے کی جاتی ہے کہ وہ بعینہ اللہ جل شانہ کی اطاعت ہے، ہاں اس کے ساتھ قرآن وحدیث کے سمجھنے میں اور ان کے احکام پر عمل کرنے میں جو علمی یا عملی مشکلات سامنے آئیں اس کے لئے ماہرین کے قول و فعل سے امداد لینے کو سرمایہ سعادت و نجات سمجھنا ضروری ہے۔ آیت مذکورہ میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں تعلیم کتاب کو داخل فرمانے سے ایک دوسرا فائدہ یہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ جب قرآن فہمی کے لئے تعلیم رسول ضروری ہے اور اس کے بغیر قرآن پر صحیح عمل ناممکن ہے تو جس طرح قرآن قیامت تک محفوظ ہے اس کا ایک ایک زیر و بر محفوظ ہے، ضروری ہے کہ تعلیمات رسول بھی مجموعی حیثیت سے قیامت تک باقی اور محفوظ رہیں، ورنہ محض الفاظ قرآن کے محفوظ رہنے سے نزول قرآن کا اصلی مقصد پورا نہ ہوگا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ تعلیمات رسول صلی اللہ علیہ وسلم وہی ہیں جن کو سنت یا حدیث رسول کہا جاتا ہے، اس کی حفاظت کا وعدہ اللہ جل شانہ کی طرف سے اگرچہ اس درجہ میں نہیں ہے جس درجہ کی حفاظت قرآن کے لئے موعود ہے:-

إِنَّا خَشْنُ نَزْلِنَا الَّذِي كَرِهْنَا لَكَ لِحَفْظُونَ ① (الحجر)

”ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔“

جس کا یہ نتیجہ ہے کہ اس کے الفاظ اور زیر و بر تک بالکل محفوظ چلے آئے ہیں، اور قیامت تک اسی طرح محفوظ رہیں گے، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ اگرچہ اس طرح محفوظ نہیں لیکن مجموعی حیثیت سے آپ کی تعلیمات کا محفوظ رہنا آیت مذکورہ کی رو سے لازمی ہے، اور بحمد اللہ آج تک وہ محفوظ چلی آتی ہیں، جب کسی طرف سے اس میں رخنہ اندازی یا غلط روایات کی آمیزش کی گئی، ماہرین سنت نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ نکھار کر رکھ دیا، اور قیامت تک یہ سلسلہ بھی اسی طرح رہے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں قیامت تک ایسی جماعت اہل حق اور اہل علم قائم رہے گی جو قرآن وحدیث کو صحیح طور پر محفوظ رکھے گی، اور ان میں ڈالے گئے ہر رخنے کی اصلاح کرتی رہے گی۔^۱

خلاصہ یہ ہے کہ جب قرآن پر عمل کرنے کے لئے تعلیم رسول ضروری ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن پر عمل قیامت تک فرض ہے، تو لازم ہے کہ قیامت تک تعلیمات رسول بھی باقی اور محفوظ رہیں، اس لئے آیت میں تعلیمات

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قیامت تک باقی اور محفوظ رہنے کی بھی پیشین گوئی موجود ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ سے لے کر آج تک علم حدیث کے ماہر علماء اور مستند کتابوں کے ذریعے محفوظ رکھا ہے۔ اس سے اس دجل والحاد کی حقیقت کھل جاتی ہے جو آج کل بعض لوگوں نے احکام اسلام سے جان بچانے کے لئے یہ بہانہ تراشا ہے کہ موجودہ ذخیرہ حدیث محفوظ اور قابل اطمینان نہیں ہے، ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ ذخیرہ حدیث سے اعتماد اٹھ جائے تو قرآن پر بھی اعتماد کا کوئی راستہ نہیں رہتا۔

آیت مذکورہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تیسرا فرض منصبی تزکیہ قرار دیا ہے، تزکیہ کے معنی باطنی نجاسات اور گندگیوں سے پاک کرنا ہے، یعنی شرک و کفر اور عقائد فاسدہ سے، نیز برے اخلاق، تکبر، حرص و طمع، بغض و حسد، حب مال و جاہ وغیرہ سے پاک کرنا۔

اصلاح انسان کے لئے صرف تعلیم صحیح بھی کافی نہیں، اخلاقی تربیت بھی ضروری ہے

تزکیہ کو تعلیم سے جدا کر کے مستقل مقصد رسالت اور رسول کا فرض منصبی قرار دینے میں اس طرف اشارہ ہے کہ تعلیم کتنی ہی صحیح ہو محض تعلیم سے عادتاً اصلاح اخلاق نہیں ہوتی جب تک کسی تربیت یافتہ مربی کے زیر نظر عملی تربیت حاصل نہ کرے، کیونکہ تعلیم کا کام درحقیقت سیدھا اور صحیح راستہ دکھلادینا ہے، مگر ظاہر ہے کہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے محض راستہ جان لینا تو کافی ہیں، جب تک ہمت کر کے قدم نہ اٹھائے اور راستہ نہ چلے، اور ہمت کا نسخہ بجز اہل ہمت کی صحبت اور اطاعت کے اور کچھ نہیں، ورنہ سب کچھ جاننے سمجھنے کے بعد بھی حالت یہ ہوتی ہے کہ

جاننا ہوں ثواب طاعت و زہد

پر طبیعت ادھر نہیں آتی

عمل کی ہمت و توفیق کسی کتاب کے پڑھنے یا سمجھنے سے پیدا نہیں ہوتی، اس کی صرف ایک ہی تدبیر ہے کہ اللہ والوں کی صحبت اور ان سے ہمت کی تربیت حاصل کرنا، اسی کا نام تزکیہ ہے، قرآن کریم نے تزکیہ کو مقاصد رسالت میں ایک مستقل مقصد قرار دے کر تعلیمات اسلام کی نمایاں خصوصیت کو بتلایا ہے، کیونکہ محض تعلیم اور ظاہری تہذیب تو ہر قوم اور ہر ملت میں کسی نہ کسی صورت سے کامل یا ناقص طریق پر ضروری سمجھی جاتی ہے، ہر مذہب و ملت اور ہر سوسائٹی میں اس کو انسانی ضروریات میں داخل سمجھا جاتا ہے، اس میں اسلام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے صحیح اور مکمل تعلیم پیش کی جو انسان کی انفرادی زندگی سے لے کر عائلی، پھر قبائلی زندگی اور اس سے آگے بڑھ کر سیاسی و ملکی زندگی پر حاوی اور بہترین نظام کی حامل ہے، جس کی نظیر دوسری اقوام و ملل میں نہیں پائی جاتی، اس کے ساتھ تزکیہ اخلاق اور باطنی طہارت ایک ایسا

کام ہے جس کو عام اقوام اور سوسائٹیوں نے سرے سے نظر انداز کر رکھا ہے، انسانی لیاقت و استعداد کا معیار اس کی تعلیمی ڈگریاں سمجھی جاتی ہیں، انہی ڈگریوں کے وزن کے ساتھ انسانوں کا وزن گھٹتا بڑھتا ہے، اسلام نے تعلیم کے ساتھ تزکیہ کا ضمیمہ لگا کر تعلیم کے اصل مقصد کو پورا کر دکھایا۔

جو خوش نصیب حضرات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے زیرِ تعلیم رہے، تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کا باطنی تزکیہ بھی ہوتا گیا، اور جو جماعت صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین آپ کی زیرِ تربیت تیار ہوئی، ایک طرف ان کی عقل و دانش اور علم و حکمت کی گہرائی کا یہ عالم تھا کہ ساری دُنیا کے فلسفے اس کے سامنے گرد ہو گئے، تو دوسری طرف ان کے تزکیہ باطنی اور تعلق مع اللہ اور اعتماد علی اللہ کا یہ درجہ تھا جو خود قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:-

وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا

(فتح: ۲۹)

”اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں رحم دل ہیں، تم انہیں رُکوع سجدہ کرتے ہوئے دیکھو گے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا مندی تلاش کرتے ہیں۔“

یہی وجہ تھی کہ وہ جس طرف چلتے تھے فتح و نصرت ان کے قدم لیتی تھی، تا سید ربانی ان کے ساتھ ہوتی تھی، ان کے محیر العقول کارنامے جو آج بھی ہر قوم و ملت کے ذہنوں کو مرعوب کئے ہوئے ہیں، وہ اسی تعلیم و تزکیہ کے اعلیٰ نتائج ہیں۔ آج دُنیا میں تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے نصابوں کی تبدیل و ترمیم پر تو سب لوگ غور کرتے ہیں، لیکن تعلیم کی رُوح کو درست کرنے کی طرف عام طور پر توجہ نہیں دی جاتی کہ مدرس اور معلم کی اخلاقی حالت اور مصلحانہ تربیت کو دیکھا جائے، اس پر زور دیا جائے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہزار کوششوں کے بعد بھی ایسے مکمل انسان پیدا نہیں ہوتے جن کے عمدہ اخلاق دوسروں پر اثر انداز ہوں، اور دوسروں کی تربیت کر سکیں۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اساتذہ جس علم و عمل اور اخلاق و کردار کے مالک ہوں گے ان سے پڑھنے والے طلبہ زیادہ سے زیادہ انہی جیسے پیدا ہو سکیں گے، اس لئے تعلیم کو مفید اور بہتر بنانے کے لئے نصابوں کی تدوین و ترمیم سے زیادہ اس نصاب کے پڑھانے والوں کی علمی و عملی و اخلاقی حالات پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

یہاں تک رسالت و نبوت کے تین مقاصد کا بیان تھا، آخر میں مختصر طور پر یہ بھی سن لیجئے کہ سردارِ دو عالم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تین فرائض منصبی سپرد کئے گئے تھے، ان کو آپ نے کس حد تک پورا فرمایا، آپ کو ان کے پورا کرنے میں کہاں تک کامیابی ہوئی، اس کے لئے اتنا جان لینا کافی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دُنیا سے تشریف لے جانے سے پہلے پہلے تلاوتِ آیات کا یہ درجہ ہو گیا تھا کہ تقریباً پورے جزیرۃ العرب میں قرآن پڑھا جا رہا تھا،

ہزاروں اس کے حافظ تھے، سینکڑوں ایسے حضرات تھے جو روزانہ یا تیسرے روز پورا قرآن ختم کرتے تھے، تعلیم کتاب و حکمت کا یہ مقام تھا۔

یتیم کہ ناکردہ قرآن درست

کتب خانہ چند ملت ہشت

دنیا کے سارے فلسفے قرآن کے سامنے ماند ہو چکے تھے، توراۃ و انجیل کے تحریف شدہ صحائف افسانہ بن چکے تھے، قرآنی اصول کو عزت و شرف کا معیار مانا جاتا تھا، تزکیہ کا یہ عالم تھا کہ ساری بد اخلاقیوں کے مرتکب افراد تہذیب اخلاق کے معلم بن گئے، بد اخلاقیوں کے مریض نہ صرف صحت یاب بلکہ کامیاب معالج اور مسیحا بن گئے، جو رہزن تھے رہبر بن گئے، غرض بت پرست لوگ ایثار و ہمدردی کے مجسمے بن گئے، تند خوئی اور جنگ جوئی کی جگہ نرمی اور صلح جوئی نظر آنے لگی، چور اور ڈاکو، لوگوں کے اموال کے محافظ بن گئے۔

الغرض حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جن مقاصد کے لئے دُعا فرمائی، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا تھا، وہ تینوں مقصد آپ کے عہد مبارک ہی میں نمایاں طور پر کامیاب ہوئے، پھر آپ کے بعد آپ کے صحابہ کرامؓ نے تو ان کو مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک ساری دنیا میں عام کر دیا، فَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلَىٰ آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا بَعْدَ مَنْ صَلَّى وَصَامَ وَقَعَدَ وَقَامَ۔

وَمَنْ يَرْغَبْ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ

اور کون ہے جو پھرے ابراہیم کے مذہب سے مگر وہی جس نے احمق بنایا اپنے آپ کو اور بے شک ہم نے ان کو منتخب کیا

فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ۝۱۳۰ اِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمُ ۝۱۳۱

دنیا میں اور وہ آخرت میں نیکوں میں ہیں۔ یاد کرو جب اس کو کہا اس کے رب نے کہ حکم برداری کر!

قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝۱۳۲ وَوَصَّىٰ بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ ۝۱۳۳

تو بولا کہ میں حکم بردار ہوں تمام عالم کے پروردگار کا۔ اور یہی وصیت کر گیا ابراہیم اپنے بیٹوں کو اور یعقوب بھی

يَبْنِيَنَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَى لَكُمْ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿۱۳۲﴾

کہ اے بیٹو! بے شک اللہ نے چن کر دیا ہے تم کو دین، سو تم ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان۔

آسان ترجمہ قرآن

اور کون ہے جو ابراہیم کے طریقے سے انحراف کرے؟ سوائے اُس شخص کے جو خود اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کر چکا ہو! حقیقت تو یہ ہے کہ ہم نے دُنیا میں اُنہیں (اپنے لئے) چن لیا تھا، اور آخرت میں اُن کا شمار صالحین میں ہوگا ﴿۱۳۲﴾ جب ان کے پروردگار نے ان سے کہا کہ: ”سر تسلیم خم کر دو!“ تو وہ (فوراً) بولے: ”میں نے رَبِّ العالمین کے (ہر حکم کے) آگے سر جھکا دیا۔“ ﴿۱۳۳﴾ اور اسی بات کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی، اور یعقوب نے بھی (اپنے بیٹوں کو) کہ: ”اے میرے بیٹو! اللہ نے یہ دین تمہارے لئے منتخب فرمایا ہے، لہذا تمہیں موت بھی آئے تو اس حالت میں آئے کہ تم مسلم ہو۔“ ﴿۱۳۴﴾

حل لغات

سَفَهَ نَفْسَهُ ۖ سَفَهَ بِمَعْنَى جَهْلٍ، وَانْتِصَابَ نَفْسِهِ عَلَى أَنَّهُ تَمْيِيزُ عَلَى قَوْلِ الْفَرَّاءِ أَوْ شَبَّهَ بِالْمَفْعُولِ عَلَى قَوْلِ بَعْضِ الْكُوفِيِّينَ أَوْ مَفْعُولٍ بِهِ إِمَّا لِكَوْنِ سَفَهٍ مُتَعَدِّياً بِنَفْسِهِ كَسَفَهَ الْمَضْعَفُ أَوْ لِكَوْنِهِ ضَمْنِ مَعْنَى مَا يَتَعَدَّى إِلَى جَهْلٍ وَهُوَ قَوْلُ الزَّجَّاجِ - ترجمہ شیخ الہند اسی پر مبنی ہے، اس لئے سَفَهَ نَفْسَهُ ۖ کے معنی پہلی توجیہ کے اعتبار سے وہ ہیں جو خلاصہ تفسیر میں لئے گئے کہ اپنی ذات ہی سے احمق ہو، اور دوسری توجیہ پر معنی یہ ہوں گے کہ ملتِ ابراہیمی سے رُوگردانی وہی کرے گا جو اپنے نفس سے بھی جاہل ہو، یعنی اس کو خود اپنی ذات کی بھی خبر نہ ہو کہ میں کیا ہوں۔

خلاصہ تفسیر

اور ملتِ ابراہیمی سے تو وہی رُوگردانی کرے گا جو اپنی ذات ہی سے احمق ہو، اور (ایسی ملت کے تارک کو کیونکر احمق نہ کہا جائے جس کی یہ شان ہو کہ اسی کی بدولت) ہم نے ان (ابراہیم علیہ السلام) کو (عہدہ رسالت کے لئے) دُنیا میں منتخب کیا اور (اسی کی بدولت) وہ آخرت میں بڑے لائق لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں (جن کے لئے سب ہی کچھ ہے، اور یہ انتخاب عہدہ رسالت کے لئے اس وقت ہوا تھا) جبکہ ان سے ان کے پروردگار نے (بطور الہام کے) فرمایا کہ تم

(حق تعالیٰ کی) اطاعت اختیار کرو، انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اطاعت اختیار کی رَبِّ الْعَالَمِينَ کی (پس اسی اطاعت کے اختیار کرنے پر ہم نے اُن کو شرفِ نبوت دے دیا، خواہ اسی وقت ہو یا بعد چندے) اور اسی (ملتِ موصوفہ پر قائم رہنے) کا حکم کر گئے ہیں ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹوں کو اور (اسی طرح) یعقوب علیہ السلام بھی (اپنے بیٹوں کو، جس کا مضمون یہ تھا کہ) میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے اس دین (اسلام و اطاعت حق) کو تمہارے لئے منتخب فرمایا ہے، سو تم (دمِ مرگ تک اسی کو مت چھوڑنا اور) بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں ملتِ ابراہیمی کے بنیادی اصول اور ان کے اتباع کی تاکید اور ان سے انحراف کی خرابی کا بیان ہے، جس میں یہود و نصاریٰ کے اتباعِ ملتِ ابراہیمی کے متعلق دعووں کی تردید اور صرف ملتِ اسلام کا ملتِ ابراہیمی ہونا اور دینِ اسلام کی حقیقت اور یہ کہ وہ تمام انبیاء کا مشترک دین ہے، ذکر کیا گیا ہے۔

مذکورہ آیات میں انبیاء علیہم السلام کا اپنی اولاد کی دینی اور روحانی تربیت کی طرف خاص توجہ اور اہتمام کرنا مذکور ہے، پہلی آیت میں ملتِ ابراہیمی کی فضیلت اور اسی کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دنیا و آخرت میں شرف اور بزرگی بتلا کر ان کی ملت سے انحراف کرنے کو احمقانہ کام بتلایا گیا ہے، ارشاد ہے: **وَمَنْ يَتَّخِذْ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا مَلَكًا أَوْ ابْنًا أَوْ زَوْجًا فَقُلُوبُهُمْ أَلَا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ** یعنی ”ملتِ ابراہیمی سے رُوگردانی صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس میں ذرا عقل نہ ہو“ کیونکہ یہ ملت عین دینِ فطرت ہے، کوئی سلیم الفطرت انسان اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ آگے اس کی وجہ سے بیان فرمائی کہ اس ملت کا شرف اور فضیلت اس سے ظاہر ہے کہ اللہ جل شانہ نے اسی ملت کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں عزت و بزرگی عطا فرمائی اور آخرت میں بھی، دنیا کی عزت و بزرگی کا مشاہدہ تو ساری دنیا نے کر لیا کہ نمرود جیسا صاحبِ اقتدار بادشاہ اور اس کی قوم اس اکیلے بزرگ کے خلاف کھڑی ہوئی، اور اپنے اقتدار کے سارے عوامل ان کے خلاف استعمال کر لئے، آخر میں آگ کے ایک بڑے انبار میں اُن کو ڈال دیا گیا، مگر دنیا کے سارے عناصر اور ان کی طاقتیں جس قدرت والے کے تابع فرمان ہیں، اس نے سارے نمرودی منصوبوں کو خاک میں ملا دیا، آگ ہی کو اپنے خلیل کے لئے گلزار بنا دیا، اور دنیا کی ساری قومیں ان کا لوہا ماننے پر مجبور ہو گئیں۔ دنیا کے سارے مومن اور کافر یہاں تک کہ بت پرست بھی اس بت شکن کی عزت کرتے چلے آئے، مشرکین عرب بہر حال اولادِ ابراہیم تھے، بت پرستی کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عزت و عظمت پر جان دیتے تھے، اور انہی کی ملت کے اتباع کا دعویٰ کرتے تھے، اور ملتِ ابراہیمی کے مٹے مٹے کچھ آثار ان کے عمل میں بھی موجود تھے، حج و عمرہ و قربانی، مہمان نوازی انہی کے باقیاتِ صالحات تھے، اگرچہ جہالت نے اُن کو بھی مسخ کر دیا تھا، اور یہ نتیجہ اس

خداوندی انعام کا ہے جس کی رو سے خلیل اللہ کو امام الناس کا خطاب دیا گیا تھا: اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (البقرة: ۱۳۲)۔
 ابراہیم اور ملتِ ابراہیم علیہ السلام کے اس قہری غلبہ کے علاوہ اس کی مقبولیت اور فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہونا بھی دُنیا کے سامنے آچکا تھا، اور جس میں کچھ بھی عقل و فہم تھی وہ اس ملت کے سامنے جھک گیا تھا۔
 یہ تو ابراہیم علیہ السلام کے دُنیاوی شرف و بزرگی کا ذکر تھا، آخرت کا معاملہ جو ابھی سامنے نہیں، اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام قرآن کی اس آیت نے واضح کر دیا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو دُنیا میں عزت و فضیلت عطا فرمائی اسی طرح آخرت میں بھی ان کے درجاتِ عالیہ مقرر ہیں۔

ملتِ ابراہیمی کا بنیادی اصولِ اسلام، یعنی اطاعتِ حق ہے وہ صرف اسلام میں منحصر ہے

اس کے بعد دوسری آیت میں ملتِ ابراہیمی کے بنیادی اصول بتلائے گئے، ارشاد ہوا: اِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ اَسْلِمْ^۱ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ^۲ یعنی ”جب فرمایا ابراہیم سے اُن کے رب نے کہ اطاعت اختیار کرو، تو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اطاعت اختیار کی ربِّ العالمین کی۔“ اس طرزِ بیان میں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ اللہ جل شانہ کے خطاب اَسْلِمْ کا جواب بظاہر خطاب ہی کے انداز میں یہ ہونا چاہئے کہ ”اَسْلَمْتُ لَکَ“ یعنی میں نے آپ کی اطاعت اختیار کر لی، مگر حضرت خلیل علیہ السلام نے اس طرزِ خطاب کو چھوڑ کر یوں عرض کیا کہ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ^۳ یعنی میں نے پروردگارِ عالم کی اطاعت اختیار کر لی، ایک تو اس میں رعایتِ ادب کے ساتھ اور حق جل و علا شانہ کی حمد و ثنا شامل ہو گئی جس کا مقام تھا، دوسرے اس کا اظہار ہو گیا کہ میں نے جو طاعت اختیار کی وہ کسی پر احسان نہیں کیا، بلکہ میرے لئے اس کا کرنا ہی ناگزیر تھا، کیونکہ وہ ربِّ العالمین یعنی سارے جہان کا پروردگار ہے، سارے جہان اور جہان والوں کو اس کی اطاعت کے سوا کوئی چارہ کار نہیں، جس نے اطاعت اختیار کی اس نے اپنا فرض ادا کر کے اپنا نفع حاصل کیا، اس میں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ملتِ ابراہیمی کا بنیادی اصول اور پوری حقیقت ایک لفظ ”اسلام“ میں مضمر ہے، جس کے معنی ہیں اطاعتِ حق، اور یہی خلاصہ ہے ابراہیم علیہ السلام کے مذہب و مسلک کا، اور یہی حاصل ہے ان امتحانات کا جن سے گزر کر اللہ تعالیٰ کا یہ خلیل اپنے مقامِ عالی تک پہنچا ہے، اور اسلام یعنی اطاعتِ حق ہی وہ چیز ہے جس کے لئے یہ سارا جہان بنایا گیا، اور جس کے لئے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے، آسمانی کتابیں نازل کی گئیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسلام ہی تمام انبیاء علیہم السلام کا مشترک دین اور نقطہ وحدت ہے، حضرت آدم

سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر آنے والے رسول اور نبی نے اسی کی طرف دعوت دی، اسی پر اپنی اپنی اُمت کو چلایا، قرآن کریم نے واضح الفاظ میں فرمایا:-

۱- إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۚ (آل عمران: ۱۹)

”دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے“

۲- وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ ۚ (آل عمران: ۸۵)

”اور جو شخص اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین و مذہب اختیار کرے وہ مقبول نہیں۔“

اور ظاہر ہے کہ جتنے دین و مذہب مختلف انبیاء علیہم السلام لائے ہیں وہ سب اپنے اپنے وقت میں اللہ کے نزدیک مقبول تھے، اس لئے ضروری ہے کہ وہ سب دین دین اسلام ہی ہوں، اگرچہ نام ان کا کچھ بھی رکھ دیا جائے، دین موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کہا جائے یا یہودیت و نصرانیت وغیرہ، مگر حقیقت سب کی اسلام ہے، جس کا حاصل اطاعت حق ہے، البتہ اس میں ایک خصوصیت ملتِ ابراہیمی کو حاصل ہے، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ملت کا نام بھی اسلام تجویز کیا، اور اپنی اُمت کو بھی اُمتِ مسلمہ کا نام دیا، دُعا میں عرض کیا:-

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ ۚ (البقرة: ۱۲۸)

”اے ہمارے پروردگار! بنا دیجئے ہم دونوں (ابراہیم و اسماعیل) کو مسلم (یعنی اپنا فرمانبردار) اور

ہماری اولاد میں سے بھی ایک جماعت کو اپنا فرمانبردار بنا۔“

اولاد کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:-

فَلَا تَتَوَثَّنَا إِلَّا أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۚ (البقرة: ۱۳۳)

”تم بجز مسلم ہونے کے کسی مذہب پر جان نہ دینا“

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد یہ خصوصی امتیاز حضرت ابراہیم ہی کی تجویز کے مطابق اُمتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کو حاصل ہوا، کہ اس کا نام اُمتِ مسلمہ رکھا گیا، اور اس کی ملت بھی ملتِ اسلامیہ کے نام سے معروف ہوئی، قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

وَلِلَّهِ آيَاتُ الْكِتَابِ ۚ هُوَ سَخَّرَ لَكُمُ الْإِسْلَامَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا (الحج: ۷۸)

”تم اپنے باپ ابراہیم کے دین پر قائم رہو، اس نے تمہارا لقب مسلمان رکھا ہے، پہلے بھی اور اس میں

بھی (یعنی قرآن میں)۔“

کہنے کو تو یہود بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم ملتِ ابراہیم پر ہیں، نصاریٰ بھی اور مشرکین عرب بھی لیکن یہ سب غلط فہمی یا

جھوٹے دعوے تھے، حقیقت میں ملتِ محمدیہ ہی آخری دور میں ملتِ ابراہیمی اور دینِ فطرت کے مطابق تھی۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے جتنے انبیاء علیہم السلام تشریف لائے اور جتنی کتابیں اور شرائع نازل ہوئے ان سب کی روح اسلام یعنی اطاعت حق ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ نفسانی خواہشات کے مقابلہ میں فرمان حق کی اطاعت اور اتباع ہوئی کو چھوڑ کر اتباع ہدیٰ کی پابندی۔

افسوس ہے کہ آج اسلام کا نام لینے والے لاکھوں مسلمان بھی اس حقیقت سے بیگانہ ہو گئے اور دین و مذہب کے نام پر بھی اپنی خواہشات کا اتباع کرنا چاہتے ہیں، انہیں قرآن و حدیث کی صرف وہ تفسیر و تعبیر بھلی معلوم ہوتی ہے جو ان کی خواہش کے مطابق ہو، ورنہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ جامہ شریعت کو کھینچ تان کر بلکہ چیر پھاڑ کر اپنی اغراض اور اہواء نفسانی کے بتوں کا لباس بنا دیں کہ دیکھنے میں دین و مذہب کا اتباع نظر آئے، اگرچہ وہ حقیقت میں خالص اتباع ہوئی اور خواہشات کی پیروی ہے۔

سودہ شد از سجدہ راہ بتاں پیشانیم

چند بر خود تہمت دین مسلمانی نهم [۱]

غافل انسان یہ نہیں جانتا کہ یہ حیلے اور تاویلیں مخلوق کے سامنے تو چل سکتی ہیں، مگر خالق کے سامنے جس کا علم ذرے ذرے کو محیط ہے، جو دلوں کے چھپے ہوئے ارادوں، بھیدوں کو دیکھتا اور جانتا ہے، اس کے آگے بجز خالص اطاعت کے کوئی چیز کارگر نہیں۔

کارہا با خلق آری جملہ راست

با خدا تزویر و حیلہ کے رواست [۲]

حقیقی اسلام یہ ہے کہ اپنی اغراض اور خواہشات سے بالکل خالی الذہن ہو کر انسان کو اس کی تلاش ہو کہ حضرت حق جل شانہ کی رضا کس کام میں ہے، اور اس کا فرمان میرے لئے کیا ہے، وہ ایک فرمانبردار غلام کی طرح گوش بر آواز رہے کہ کس طرف جانے کا اور کس کام کا حکم ہوتا ہے، اور اس کام کو کس انداز سے کیا جائے، جس سے وہ مقبول ہو اور میرا مالک راضی ہو، اسی کا نام عبادت و بندگی ہے۔

در راہ عشق و سوسہ اہرمن بسے ست

ہمشدار و گوش را بہ پیام سرورش دار [۳]

اسی جذبہ اطاعت و محبت کا کمال انسان کی ترقی کا آخری مقام ہے، جس کو مقام عبدیت کہا جاتا ہے، یہی وہ مقام

۱ ترجمہ:- بتوں کے سامنے سجدہ کر کے میری پیشانی پر نشان پڑ گئے ہیں، آخر کب تک میں دین اسلام کی تہمت اپنے اوپر لگائے رکھوں گا۔

۲ ترجمہ:- مخلوق کے ساتھ تو جو کچھ بھی کیا جائے چل جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ دھوکا دینا کہاں چل سکتا ہے۔

۳ ترجمہ:- عشق کے راستے میں باطل کے دوسے بہت ہیں، خبردار ادھی کے پیغام کی طرف کان لگائے رکھو۔

ہے جہاں پہنچ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ کا خطاب پاتے ہیں، اور سید الرسل خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو عبادنا کا خطاب ملتا ہے، اسی عبدیت اور اطاعت کے ذیلی درجات پر اُمت کے اولیاء، اقطاب و ابدال کے درجات دائر ہوتے ہیں، اور یہی حقیقی توحید ہے جس کے حاصل ہونے پر انسان کے خوف و امید صرف ایک اللہ جل شانہ کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں۔

امید و ہراس نباشد ز کس

ہمیں ست بنیادِ توحید و بس ^[۱]

غرض اسلام کے معنی اور حقیقتِ اطاعتِ حق ہے، اور اس کا راستہ صرف اتباعِ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں منحصر ہے، جس کو قرآن کریم نے واضح الفاظ میں اس طرح ارشاد فرمایا:-

فَلَا تَمْلِكُ لَكُمْ شَيْئًا وَلَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ⑤ (النساء)

”تیرے رب کی قسم! وہ کبھی مؤمن نہ ہوں گے جب تک وہ آپ کو اپنے تمام اختلافی معاملات میں حاکم تسلیم نہ کر لیں، اور پھر آپ کے فیصلے سے کوئی دل تنگی محسوس نہ کریں، اور فیصلے کو ٹھنڈے دل سے تسلیم نہ کریں۔“

مسئلہ:- آیت مذکورہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو وصیت فرمائی، اور ان سے عہد لیا، وہ یہ تھا کہ اسلام کے سوا اور کسی حالت اور کسی ملت پر نہ مرنا، مراد اس کی یہ ہے کہ اپنی زندگی میں اسلام اور اسلامی تعلیمات پر پختگی سے عمل کرتے رہو تا کہ اللہ تعالیٰ تمہارا خاتمہ بھی اسلام ہی پر فرمادے، جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ تم اپنی زندگی میں جس حالت کے پابند رہو گے، اُسی حالت پر تمہاری موت بھی ہوگی، اور اسی حالت میں محشر میں قائم ہو گے، اللہ جل شانہ کی عادت یہی ہے کہ جو بندہ نیکی کا قصد کرتا ہے اور اس کے لئے اپنے مقدور کے مطابق کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو نیکی کی توفیق دے دیتے ہیں، اور یہ کام اس کے لئے آسان کر دیتے ہیں۔

اس معاملہ میں اُس حدیث سے شبہ نہ کیا جائے جس میں یہ ارشاد ہے کہ بعض آدمی جنت کے کام اور اہل جنت کے عمل ہمیشہ کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس شخص اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، مگر پھر اس کی تقدیر غالب آ جاتی ہے، اور اہل دوزخ کے سے کام کرنے لگتا ہے، اور انجامِ کار دوزخ میں جاتا ہے، اسی طرح بعض آدمی

دوزخ کے کام میں مشغول رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر تقدیر غالب آتی ہے اور آخر عمر میں اہل جنت کے کام کرنے لگتا ہے اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔^[۱]

وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کے بعض الفاظ میں یہ قید بھی لگی ہوئی ہے کہ ”فِيْمَا يَبْدُو لِلنَّاسِ“^[۲] یعنی جس نے عمر بھر جنت کے کام کئے اور آخر میں دوزخ کے کام میں لگا، درحقیقت اس کے پہلے کام بھی دوزخ ہی کے عمل تھے، مگر لوگوں کے ظاہر میں اور دیکھنے میں وہ اہل جنت کے عمل معلوم ہوتے تھے، اسی طرح جو دوزخ کے اعمال میں مشغول رہا آخر میں جنت کے کام کرنے لگا، درحقیقت وہ اول ہی سے جنت کے کام میں تھا، مگر ظاہر نظر میں لوگ اس کو گناہگار سمجھتے تھے۔ (ابن کثیر)^[۳]

خلاصہ یہ ہے کہ جو آدمی نیک کام میں مشغول رہے اس کو اللہ تعالیٰ کے وعدے اور عادت کی بنا پر یہی اُمید رکھنا چاہئے کہ اس کا خاتمہ بھی نیکی پر ہوگا۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْبُوتُ ۚ اِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُوْنَ

کیا تم موجود تھے جس وقت قریب آئی یعقوب کے موت جب کہا اپنے بیٹوں کو: تم کس کی عبادت کرو گے

مِنْ بَعْدِي ۖ قَالُوا نَعْبُدُ الْهَلَكَ وَالْهَآبَ اَبَاكَ اِبْرٰهٖمَ ۚ وَاسْمٰعِيْلَ

میرے بعد؟ بولے: ہم بندگی کریں گے تیرے رب کی اور تیرے باپ دادوں کے رب کی جو کہ ابراہیم اور اسماعیل

وَاسْحٰقَ الْهَآوَاۤ اِحْدًا ۚ وَنَحْنُ لَهُۥ مُسْلِمُوْنَ ۝ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا

اور اسحاق ہیں، وہی ایک معبود ہے اور ہم سب اسی کے فرمانبردار ہیں۔ وہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی اُن کے واسطے ہے

مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْأَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

جو انہوں نے کیا، اور تمہارے واسطے ہے جو تم نے کیا، اور تم سے پوچھ نہیں اُن کے کاموں کی۔

۱ صحیح البخاری، کتاب القدر ج: ۲ ص: ۹۴۵، ۹۴۶، صحیح مسلم، کتاب القدر، باب کیفیۃ الخلق الادمی... إلخ ج: ۲ ص: ۳۲۲

۲ صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوة خیبر ج: ۲ ص: ۶۰۴

۳ تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۴۴۶، ۴۴۷

آسان ترجمہ قرآن

کیا اُس وقت تم خود موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا تھا، جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ اُن سب نے کہا تھا کہ ہم اُسی ایک خدا کی عبادت کریں گے جو آپ کا معبود ہے اور آپ کے باپ دادوں ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کا معبود ہے۔ اور ہم صرف اُسی کے فرماں بردار ہیں ﴿۳۲﴾ وہ ایک اُمت تھی جو گذر گئی۔ جو کچھ اُنہوں نے کمایا وہ اُن کا ہے، اور جو کچھ تم نے کمایا وہ تمہارا ہے، اور تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا عمل کرتے تھے ﴿۳۳﴾

خلاصہ تفسیر

کیا (تم لوگ کسی معتبر صحیح نقل سے دعویٰ مذکورہ کرتے ہو) یا تم خود (اس وقت) موجود تھے جس وقت یعقوب علیہ السلام کا آخری وقت آیا (اور) جس وقت انہوں نے اپنے بیٹوں سے (تجدید معاہدہ کے لئے) پوچھا کہ تم لوگ میرے (مرنے کے) بعد کس چیز کی پرستش کرو گے؟ انہوں نے (بالاتفاق) جواب دیا کہ ہم اس (ذات پاک) کی پرستش کریں گے جس کی آپ اور آپ کے بزرگ (حضرات) ابراہیم و اسماعیل و اسحاق (علیہم السلام) پرستش کرتے آئے ہیں، یعنی وہی معبود جو وحدہ لا شریک ہے، اور ہم (احکام میں) اسی کی اطاعت پر (قائم) رہیں گے، یہ (ان بزرگوں کی) ایک جماعت تھی جو (اپنے زمانے میں) گزر چکی، ان کے کام ان کا کیا ہوا آئے گا، اور تمہارے کام تمہارا کیا ہوا آئے گا، اور تم سے ان کے کئے ہوئے کی پوچھ بھی تو نہ ہوگی (اور خالی تذکرہ بھی تو نہ ہوگا، اس سے تم کو نفع پہنچنا یہ تو بڑی دُور ہے)۔

معارف مسائل

سابقہ آیات میں ملتِ ابراہیم اور اسلام کی حقیقت کا بیان تھا، اب آیات مذکورہ میں ایک اور اصولی بات قابلِ نظر ہے کہ ملتِ ابراہیم کہنے یا اسلام، یہ پوری قوم بلکہ ساری دُنیا کے لئے ہدایت نامہ ہے، پھر اس میں اولادِ ابراہیم و یعقوب علیہم السلام کی کیا خصوصیت ہے کہ آیات مذکورہ میں ان کو خاص خطاب فرمایا گیا، اور اللہ تعالیٰ کے ان دونوں برگزیدہ پیغمبروں نے اپنی اولاد کو بطور وصیت خاص اس کی ہدایت فرمائی۔

اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ اولاد کی محبت اور ان کی بھلائی کی فکر مقامِ رسالت و نبوت بلکہ مقامِ خلعت کے بھی منافی نہیں، اللہ تعالیٰ کا وہ خلیل جو ایک وقت اپنے رب کا اشارہ پا کر اپنے چہیتے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے کمر بستہ نظر آتا

ہے، وہی دوسرے وقت اپنی اولاد کی دینی اور دنیوی آسائش اور بھلائی کے لئے اپنے رب سے دُعائیں بھی کرتا ہے، دُنیا سے رخصت ہونے کے وقت اپنی اولاد کو وہ چیز دے کر جانا چاہتا ہے جو اس کی نظر میں سب سے بڑی نعمت ہے، یعنی اسلام۔

آیت مذکورہ: **وَوَضَعِي بِهَا إِبْرَاهِيمَ بَيْنِيهِ وَيَعْقُوبُ** ^۱ (البقرة: ۱۳۲) کا یہی مطلب ہے، اور آیت: **إِذْ حَصَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ** ^۲ **إِذْ قَالَ لِبَنِيِّهِ مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِي** ^۳ (البقرة: ۱۳۳) کا یہی حاصل ہے، فرق اتنا ہے کہ عام انسانوں کی نظروں میں نعمت و دولت دُنیا کی فانی اور ذلیل چیزیں ہیں، ان کی نظر اور حوصلہ بلند ہے، ان کے نزدیک اصلی دولت ایمان اور عملِ صالح یا اسلام ہے۔

جس طرح عام انسان اپنی موت کے وقت یہ چاہتے ہیں کہ جو بڑی سے بڑی دولت ان کے پاس ہے وہ اولاد کو دے جائیں، ایک سرمایہ دار تاجر کی آج کل یہ خواہش ہوتی ہے کہ میری اولاد ملوں اور فیکٹریوں کی مالک ہو، ان کو ایمپورٹ اور ایکسپورٹ کے بڑے بڑے لائسنس ملیں، لاکھوں اور کروڑوں کا بینک بیلنس ہو، یا ایک سروس والا انسان یہ چاہتا ہے کہ میری اولاد کو اُونچے عہدے اور بڑی تنخواہیں ملیں، یا ایک صنعت پیشہ آدمی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد اس کی صنعت میں کمال حاصل کرے، اس کو اس کے اپنی عمر بھر کے گرتلا دے۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین اولیاء کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ جس چیز کو وہ اصلی اور دائمی لازوال دولت سمجھتے ہیں وہ ان کی اولاد کو پوری پوری مل جائے، اس کے لئے دُعائیں کرتے ہیں، اور کوششیں بھی، آخر وقت میں وصیت اسی کی کرتے ہیں جیسا کہ آیات مذکورہ سے واضح ہے۔

اولاد کے لئے کوئی دولت دین و اخلاق سکھانے کے برابر نہیں

انبیاء علیہم السلام کے اس طرزِ خاص میں عام انسانوں کے لئے بھی یہ ہدایت ہے کہ وہ جس طرح ان کی دنیوی پرورش اور ان کے دنیوی آرام و راحت کا انتظام کرتے ہیں، اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ ان پر لازم ہے کہ اولاد کی نظری، عملی اور اخلاقی تربیت کریں، برے راستوں اور برے اعمال و اخلاق سے ان کو بچانے میں سعیِ بلیغ کریں، کہ اولاد کی سچی محبت اور اصلی خیر خواہی یہی ہے۔ یہ کوئی عقل کی بات نہیں کہ ایک انسان اپنے بچے کو دُھوپ کی گرمی سے بچانے کے لئے تو ساری توانائی خرچ کرے اور دائمی آگ سے اور عذاب سے بچانے کے لئے کوئی دھیان نہ دے، اس کے بدن سے پھانس نکالنے میں تو سارے ذرائع اور وسائل استعمال کرے، اور بندوق کی گولی کا نشانہ بننے سے اس کو نہ بچائے۔

انبیاء علیہم السلام کے اس طرزِ عمل سے ایک اصولی بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ والدین کا فرض اور اولاد کا حق ہے کہ سب سے پہلے ان کی صلاح و فلاح کی فکر کی جائے، ان کے بعد دُوسروں کی طرف توجہ کی جائے، جس میں دو حکمتیں ہیں:-
اول یہ کہ طبعی اور جسمی تعلق کی بنا پر وہ نصیحت کا اثر زیادہ جلد اور آسانی سے قبول کر سکیں گے، اور پھر وہ ان کی تحریک

اور اصلاحی کوشش میں اُن کے دست و بازو بن کر اشاعتِ حق میں اُن کے معین ہوں گے۔

دوسرے اشاعتِ حق کا اس سے زیادہ سہل اور مفید راستہ کوئی نہیں کہ ہر گھر کا ذمہ دار آدمی اپنے اہل و عیال کو حق بات سکھانے اور اس پر عمل کرانے کی سعی میں دل و جان سے لگ جائے کہ اس طرح تبلیغ و تعلیم اور اصلاح و تربیت کا دائرہ عمل سمٹ کر صرف گھروں کے ذمہ داروں تک آ جاتا ہے، ان کو سکھانا پوری قوم کو سکھانے کے ہم معنی ہو جاتا ہے، قرآن کریم نے اسی تنظیمی اصول کے پیش نظر ارشاد فرمایا ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا (التحریم: ۶)

”اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو بڑی آگ سے۔“

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ساری دُنیا کے رسول ہیں، اور جن کی ہدایت قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے عام ہے آپ کو بھی سب سے پہلے اس کا حکم دیا گیا کہ:-

وَأَنْذَرُ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ﴿۱۳۴﴾ (الشعراء)

”اپنے قریبی رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیے۔“

اور ارشاد ہوا:-

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (طہ: ۱۳۲)

”یعنی اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم کیجئے اور خود بھی اس کے پابند رہئے۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اس کی تعمیل فرمائی۔

ایک تیسری حکمت یہ بھی ہے کہ جب تک کسی شخص کے اہل و عیال اور قریبی خاندان اس کے نظریات اور عملی پروگرام میں اس کا ساتھی اور ہم رنگ نہیں ہوتا تو اس کی تعلیم و تبلیغ دُوسروں پر اتنی مؤثر نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کے جواب میں ابتدائے اسلام کے وقت عام لوگوں کا یہ جواب ہوتا تھا کہ پہلے اپنے خاندان قریش کو تو آپ دُرست کر لیں، پھر ہماری خبر لیں، اور جب خاندان میں اسلام پھیل گیا اور فتح مکہ کے وقت اس کی تکمیل ہوئی تو اس کا نتیجہ قرآن کے الفاظ میں یہ ظاہر ہوا کہ:-

يَذْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ﴿۱﴾ (النصر)

”یعنی لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج ہو کر داخل ہوں گے۔“

آج کل مسلمانوں میں بے علمی اور بے دینی پھیلنے کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ والدین اگر خود دین سے واقف اور دین دار بھی ہیں تو اس کی فکر نہیں کرتے کہ ہماری اولاد بھی دین دار ہو کر دائمی راحت کی مستحق ہو، عام طور پر ہماری نظریں

صرف اولاد کی دنیوی اور چند روزہ راحت پر رہتی ہیں اسی کے انتظامات کرتے رہتے ہیں، دولتِ لازوال کی طرف توجہ نہیں دیتے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرما دیں کہ آخرت کی فکر میں لگ جائیں، اور اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے سب سے بڑا سرمایہ ایمان اور عملِ صالح کو سمجھ کر اس کی کوشش کریں۔

بعض مسائل متعلقہ مسئلہ توریث الحد

اس آیت میں حضرت یعقوب کی اولاد کی طرف سے جو جواب نقل کیا گیا ہے اس میں: **إِلَهُ أَبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ** فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ دادا بھی باپ ہی کہلاتا ہے، اور باپ ہی کے حکم میں ہے، اس لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس آیت سے استدلال کر کے فرمایا کہ میراث میں دادا کا بھی وہی حکم ہے جو باپ کا ہے۔

آباء و اجداد کے اعمال کی جزا و سزا اولاد پر نہیں ہوگی

لَهَا مَا كَسَبَتْ الآیہ، اس آیت سے معلوم ہوا کہ باپ دادا کے نیک اعمال اولاد کے لئے کافی نہیں ہوں گے، جب تک وہ خود اپنے اعمال کو درست نہ کریں، اسی طرح باپ دادا کے برے اعمال کا عذاب بھی اولاد پر نہ پڑے گا جبکہ یہ اعمال صالحہ کے پابند ہوں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مشرکین کی اولاد جو بلوغ سے پہلے مرجائے اُن کو اپنے ماں باپ کے کفر و شرک کی وجہ سے عذاب نہیں ہوگا، اور اس سے یہود کے اس عقیدے کی بھی تردید ہوگئی کہ ہم جو چاہیں عمل کرتے رہیں ہماری مغفرت تو ہمارے آباء و اجداد کے اعمال سے ہو جائے گی۔ اسی طرح آج کل کے بعض سید خاندان کے لوگ اس خیال میں رہتے ہیں کہ ہم اولادِ رسول ہیں، ہم جو چاہیں گناہ کرتے رہے ہیں، ہماری مغفرت ہی ہوگی۔

قرآن کریم نے اس مضمون کو بار بار مختلف عنوانات سے بیان فرمایا ہے: **وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا** اور **وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ** (الانعام: ۱۶۴) وغیرہ، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

”اے بنی ہاشم! ایسا نہ ہو کہ قیامت کے روز اور لوگ تو اپنے اپنے اعمالِ صالحہ لے کر آئیں اور تم اعمالِ صالحہ سے غفلت برتو اور صرف میرے نسب کا بھروسہ لے کر آؤ اور میں اس روز تم سے یہ کہوں کہ میں تمہیں اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا۔“
اور دوسری حدیث میں ارشاد ہے:-

ترجمہ:- ہر ایک نفس جو عمل کرتا ہے اس کی ذمہ داری اسی پر ہے۔ ۱۲ منہ

ترجمہ:- کسی کا بوجھ قیامت کے روز کوئی دوسرا نہیں اٹھا سکے گا۔ ۱۲ منہ

مَنْ بَطَأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ۔

”یعنی جس شخص کو اس کے عمل نے پیچھے ڈالا، اس کو اس کا نسب آگے نہیں بڑھا سکتا۔“

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى تَهْتَدُوا ۖ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ

اور کہتے ہیں کہ ہو جاؤ یہودی یا نصرانی تو تم پالو گے راہِ راست، کہہ دے کہ ہرگز نہیں، بلکہ ہم نے اختیار کی راہِ ابراہیم کی

حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُسْرِكِينَ ﴿۱۳۵﴾ قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا

جو ایک ہی طرف کا تھا اور نہ تھا شرک کرنے والوں میں۔ تم کہہ دو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو اُترا ہم پر

وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا مِنْ رَبِّهِمْ وَأَسْمِعِلْ وَأَسْحَقْ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ

اور جو اُترا ابراہیم پر اور اسماعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور اس کی اولاد پر

وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ

اور جو ملا موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور جو ملا دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے، ہم فرق نہیں کرتے

بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿۱۳۶﴾

ان سب میں سے ایک میں بھی اور ہم اسی پروردگار کے فرمانبردار ہیں۔

آسان ترجمہ قرآن

اور یہ (یہودی اور عیسائی مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ: ”تم یہودی یا عیسائی ہو جاؤ، راہِ راست پر آ جاؤ گے۔“ کہہ دو کہ: ”نہیں، بلکہ (ہم تو) ابراہیم کے دین کی پیروی کریں گے جو ٹھیک ٹھیک سیدھی راہ پر تھے، اور وہ اُن لوگوں میں سے نہ تھے جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتے ہیں۔“ ﴿۱۳۵﴾ (مسلمانو!) کہہ دو کہ: ”ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں، اور اُس

کلام پر بھی جو ہم پر اتارا گیا اور اُس پر بھی جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد پر اتارا گیا، اور اُس پر بھی جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور اُس پر بھی جو دوسرے پیغمبروں کو اُن کے پروردگار کی طرف سے عطا ہوا۔ ہم ان پیغمبروں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے، اور ہم اُسی (ایک خدا) کے تابع فرمان ہیں۔“ (۳۶)

خلاصہ تفسیر

اور یہ (یہودی و نصرانی) لوگ (مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ تم لوگ یہودی ہو جاؤ (یہ تو یہود نے کہا تھا)، یا نصرانی ہو جاؤ (یہ نصاریٰ نے کہا تھا) تم بھی راہ (حق) پر پڑ جاؤ گے، (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (جواب میں) کہہ دیجئے کہ ہم تو (یہودی یا نصرانی کبھی نہ ہوں گے، بلکہ) ملتِ ابراہیم (یعنی اسلام) پر رہیں گے، جس میں کجی کا نام نہیں، (بخلاف یہودیت و نصرانیت کے، جس میں علاوہ محرف ہونے کے اس کے منسوخ ہو چکے کے سبب اب اس میں کجی آگئی) اور ابراہیم علیہ السلام مشرک بھی نہ تھے، (مسلمانو! یہود و نصاریٰ کے جواب میں جو تم نے اجمالاً کہا ہے کہ ہم ملتِ ابراہیمی پر رہیں گے، اس ملت کی تفصیل بیان کرنے کے لئے) کہہ دو کہ (اس ملت پر رہنے کا حاصل یہ ہے کہ) ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس (حکم) پر بھی جو ہمارے پاس (بواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) بھیجا گیا اور اس (حکم) پر بھی جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب (علیہم السلام) اور اولادِ یعقوب (میں جو نبی گزرے ہیں ان) کی طرف (بواسطہ وحی کے) بھیجا گیا، اور اس (حکم اور معجزہ) پر بھی جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو دیا گیا، اور اس پر بھی جو کچھ اور انبیاء (علیہم السلام) کو دیا گیا، ان کے پروردگار کی طرف سے (سو ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں، اور ایمان بھی) اس کیفیت سے کہ ہم ان (حضرات) میں سے کسی ایک میں بھی (دوسرے سے ایمان لانے میں) تفریق نہیں کرتے (کہ کسی پر ایمان رکھیں، کسی پر نہ رکھیں) اور ہم تو اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں (انہوں نے ہم کو یہ دین بتلایا ہم نے اختیار کر لیا پس یہ حاصل ہے اس ملت کا جس پر ہم قائم ہیں، جس میں کسی کو اصلاً انکار و سرتابی کی گنجائش نہیں)۔

معارفِ مسائل

اولادِ یعقوب علیہ السلام کو قرآن کریم نے لفظ ”اَسْبَاط“ سے تعبیر فرمایا ہے، یہ جمع ہے ”سبط“ کی جس کے معنی قبیلہ اور جماعت کے ہیں۔ ان کو سبط کہنے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ یعقوب علیہ السلام کے صلبی لڑکے بارہ تھے، پھر ہر لڑکے کی اولاد ایک مستقل قبیلہ بن گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی نسل میں یہ برکت دی کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس

مصر گئے تو بارہ بھائی تھے، اور جب فرعون کے مقابلے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کی اولاد بنی اسرائیل نکلے تو ہر بھائی کی اولاد ہزاروں افراد پر مشتمل قبیلے تھے، اور دوسری برکت اولاد یعقوب علیہ السلام میں اللہ تعالیٰ نے یہ عطا فرمائی کہ دس انبیاء کے علاوہ باقی سب انبیاء و رسل ان کی اولاد میں پیدا ہوئے، بنی اسرائیل کے علاوہ باقی انبیاء حضرت آدم علیہ السلام کے بعد نوح، شیت، ہود، صالح، لوط، ابراہیم، اسحاق، یعقوب، اسماعیل اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ

سوا گروہ بھی ایمان لاویں جس طرح پر تم ایمان لائے تو ہدایت پائی انہوں نے بھی اور اگر پھر جاویں تو پھر وہی ہیں

فِي شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝۱۳۸ صِبْغَةَ اللَّهِ ۚ

ضد پر، سوا ب کافی ہے تیری طرف سے ان کو اللہ اور وہی ہے سننے والا جاننے والا۔ ہم نے قبول کر لیا رنگ اللہ کا،

وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ۚ وَنَحْنُ لَهُ عِبْدُونَ ۝۱۳۹

اور کس کا رنگ بہتر ہے اللہ کے رنگ سے، اور ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں۔

آسان ترجمہ قرآن

اس کے بعد اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جیسے تم ایمان لائے ہو تو یہ راہِ راست پر آجائیں گے۔ اور اگر یہ منہ موڑ لیں تو درحقیقت وہ دشمنی میں پڑ گئے ہیں۔ اب اللہ تمہاری حمایت میں عنقریب ان سے نمٹ لے گا، اور وہ ہر بات سننے والا، ہر بات جاننے والا ہے ۝۱۳۸ (اے مسلمانو! کہہ دو کہ: ”ہم پر تو اللہ نے اپنا رنگ چڑھا دیا ہے، اور کون ہے جو اللہ سے بہتر رنگ چڑھائے؟ اور ہم صرف اُسی کی عبادت کرتے ہیں۔“ ۝۱۳۹)

اللغات والبلاغة

”الشِّقَاقُ“ قال البيضاوی هو المناواة والمخالفة فإنَّ كلَّ واحد من المتخالفين في شق غير شق

الآخر۔ ”الصَّبْغَةُ“ بالكسر فعلة من صبغ وهي الحالة التي يقع عليها الصبغ۔

خلاصہ تفسیر

(یعنی جب اُوپر طریقِ اسلام میں دینِ حق کا منحصر ہونا ثابت ہو چکا) سو اگر وہ (یہود و نصاریٰ) بھی اسی طریق سے ایمان لے آویں جس طریق سے تم (اہلِ اسلام) ایمان لائے ہو تب تو وہ بھی راہِ (حق) پر لگ جاویں گے، اور اگر وہ (اس سے) رُوگردانی کریں تو (تم ان کی رُوگردانی سے کچھ تعجب نہ کرو کیونکہ) وہ لوگ تو (ہمیشہ سے) برسرِ مخالفت ہیں ہی (اور اگر ان کی مخالفت سے کچھ اندیشہ ہو) تو (سمجھ لیجئے کہ) آپ کی طرف سے عنقریب ہی نمٹ لیں گے ان سے اللہ تعالیٰ، اور اللہ تعالیٰ (تمہاری اور ان کی باتیں) سنتے ہیں (اور تمہارے اور ان کے برتاوے) جانتے ہیں، (تمہارے فکر و غم کی ضرورت نہیں)۔

(اے مسلمانو! کہہ دو کہ ہم نے جو اُوپر تم لوگوں کے جواب میں کہا ہے کہ ہم ملتِ ابراہیم پر رہیں گے، اس کلام کی حقیقت یہ ہے کہ) ہم (دین کی) اس حالت پر رہیں گے جس میں (ہم کو) اللہ تعالیٰ نے رنگ دیا ہے (اور رنگ کی طرح ہمارے رگ و ریشے میں بھر دیا ہے) اور (دوسرا) کون ہے جس کے رنگ دینے کی حالت اللہ تعالیٰ (کے رنگ دینے کی حالت) سے خوب تر ہو (جب اور کوئی دوسرا ایسا نہیں تو ہم نے اور کسی کا دین بھی اختیار نہیں کیا) اور (اس لئے) ہم اس کی غلامی اختیار کئے ہوئے ہیں۔

معارفِ مآل

ایمان کی مختصر اور جامع تفسیر

فَإِنْ آمَنُوا بِحِثِّ مَا آمَنْتُمْ بِهِ، شروع سورہ بقرہ سے یہاں تک ایمان کی حقیقت کہیں مجمل، کہیں مفصل بیان کی گئی ہے، اس آیت میں ایک ایسا اجمال ہے جو تمام تفصیلات اور تشریحات پر حاوی ہے، کیونکہ آمَنْتُمْ کے مخاطب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ ہیں، اس آیت میں ان کے ایمان کو ایک مثالی نمونہ قرار دے کر حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول و معتبر صرف اس طرح کا ایمان ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے اختیار فرمایا، جو اعتقاد اس سے سرِ مختلف ہو، اللہ کے نزدیک مقبول نہیں۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ جتنی چیزوں پر یہ حضرات ایمان لائے ان میں کوئی کمی زیادتی نہ ہو، اور جس طرح اخلاص کے ساتھ ایمان لائے اس میں کوئی فرق نہ آئے کہ وہ نفاق میں داخل ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، فرشتے اور انبیاء

ورسل، آسمانی کتابیں اور ان کی تعلیمات کے مطابق جو ایمان و اعتقاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا وہی اللہ کے نزدیک مقبول ہے، اس کے خلاف اس میں کوئی تاویل کرنا یا کوئی دوسرے معنی مراد لینا اللہ کے نزدیک مردود ہے، فرشتوں اور انبیاء و رسل کے لئے جو مقام آپ کے قول و عمل سے واضح ہوا، اس سے ان کو گھٹانا یا بڑھانا ایمان کے منافی ہے۔

اس توضیح سے ان تمام باطل فرقوں کے ایمان کا خلل واضح ہو گیا جو ایمان کے دعوے دار ہیں مگر حقیقت ایمان سے بے بہرہ ہیں، کیونکہ زبانی دعویٰ ایمان کا تو بت پرست مشرکین بھی کرتے تھے، اور یہود و نصاریٰ بھی اور ہر زمانے میں زندیق و ملحد بھی، مگر چونکہ ان کا ایمان اللہ پر اور رسولوں پر اور فرشتوں پر اور یوم قیامت وغیرہ پر اس طرح کا نہیں تھا، جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، اس لئے وہ اللہ کے نزدیک مردود و نامقبول ہوا۔

فرشتہ اور رسول کی عظمت و محبت میں اعتدال مطلوب ہے، غلو گمراہی ہے

مشرکین میں سے بعض نے تو فرشتوں کے وجود ہی کا انکار کیا، بعض نے ان کو خدا کی بیٹیاں بنا دیا، دونوں کی تردید **بیشل مَا آمَنْتُمْ بِهِ** سے ہو گئی۔ یہود و نصاریٰ کے بعض گروہوں نے اپنے پیغمبروں کی مخالفت اور نافرمانی کی، یہاں تک کہ بعض کو قتل بھی کر دیا، اور بعض گروہوں نے ان کی عزت و عظمت کو اتنا بڑھایا کہ خدا، یا خدا کا بیٹا، یا خدا کا مثل بنا دیا، یہ دونوں قسم کی افراط و تفریط ضلالت و گمراہی قرار دی گئی۔

شریعت اسلام میں ”رسول“ کی عظمت و محبت فرض ہے، اس کے بغیر ایمان ہی نہیں ہوتا، مگر رسول کو کسی صفت علم یا قدرت وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کے برابر کر دینا گمراہی اور شرک ہے، قرآن کریم نے شرک کی حقیقت یہی بیان فرمائی ہے، کہ غیر اللہ کو کسی صفت میں اللہ کے برابر کریں: **إِذْ تُسَوِّیْکُمْ بِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ** (اشعراء) کا یہی مفہوم ہے۔ آج بھی جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب اور خدا تعالیٰ کی طرح ہر جگہ موجود و حاضر و ناظر کہتے ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت کا حق ادا کر رہے ہیں، حالانکہ وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی اور عمر بھر کی کوششوں کی صریح مخالفت کر رہے ہیں۔ اس آیت میں اُن کے لئے بھی سبق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت اللہ کے نزدیک ایسی ہی مطلوب ہے جیسی صحابہ کرامؓ کے دل میں آپ کی تھی، اس سے کمی بھی جرم ہے اور اس میں زیادتی بھی غلو اور گمراہی ہے۔

نبی و رسول کی اختراعی قسمیں، ظلی، بروزی، لغوی سب گمراہی ہے

اسی طرح جن فرقوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم نبوت کا انکار کر کے نئے نبی کے لئے دروازہ کھولنا چاہا،

اور قرآن کریم کی واضح تصریح خَاتَمُ النَّبِيِّینَ (الاحزاب: ۴۰) کو اپنے مقصد میں حائل پایا تو انہوں نے رسول و نبی کی بہت سی قسمیں اپنی طرف سے اختراع کر لیں، جن کا نام نبی ظلی، نبی بروزی وغیرہ رکھ دیا، اور ان کے لئے گنجائش نکالنے کی کوشش کی۔ مذکور الصدر آیت نے ان کے دجل و گمراہی کو بھی واضح کر دیا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے ایمان بالرسول میں کسی ظلی و بروزی کا کہیں نام و نشان نہیں، یہ کھلا ہوا زندقہ اور الحاد ہے۔

ایمان بالآخرۃ کی تاویلاتِ باطلہ مردود ہیں

اسی طرح وہ لوگ جن کے قلب و دماغ صرف مادّے اور مادّیات میں کھوئے ہوئے ہیں، عالم غیب اور عالم آخرت کی چیزیں جب انہیں مستبعد نظر آتی ہیں تو طرح طرح کی تاویلوں میں پڑ جاتے ہیں، اور اپنے نزدیک اس کو دین کی خدمت سمجھتے ہیں کہ ہم نے اس کو اقرب الی الفہم کر دیا، مگر چونکہ وہ تاویلیں بِشَلِّ مَا اَمْنْتُمْ بِهِ کے خلاف ہیں، اس لئے سب مردود و باطل ہیں، آخرت کے تمام حالات و واقعات جس طرح قرآن و سنت میں وارد ہوئے ہیں اُن پر بغیر کسی جھجک اور تاویل کے ایمان لانا ہی درحقیقت ایمان ہے، حشرِ اجساد کے بجائے حشرِ رُوحانی اور عذاب و ثواب جسمانی و رُوحانی، اسی طرح وزنِ اعمال میں تاویلیں کرنا سب اللہ کے نزدیک مردود، باطل اور گمراہی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے لے لی

فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ میں واضح فرمادیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مخالفوں کی زیادہ فکر نہ فرماویں، ہم خود ان سے نمٹ لیں گے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسا دوسری ایک آیت: وَاللّٰهُ يُعِصُّكَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ: ۶۷) میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ فرمادیا کہ آپ مخالفین کی فکر نہ کریں، اللہ تعالیٰ ان سے آپ کی حفاظت خود کریں گے۔

دین و ایمان ایک گہرا رنگ ہے جو انسان کے چہرہ بشرہ سے نظر آنا چاہئے

صِبْغَةَ اللّٰهِ اس سے پہلی آیت میں دین اسلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا تھا، وَاٰتٰهُمْ حَنِیْفًا (البقرہ: ۱۳۵) اس جگہ اس کو براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے بتلادیا کہ دین درحقیقت اللہ تعالیٰ کا ہے، کسی پیغمبر کی طرف اس کی نسبت مجازی کر دی جاتی ہے۔ اور اس جگہ ملت کو "صِبْغَتُ" کے لفظ سے تعبیر کر کے دو باتوں کی طرف اشارہ ہو گیا، اول تو نصاریٰ کی ایک رسم کی تردید ہو گئی، ان کی یہ عادت تھی کہ جو بچہ پیدا ہو، اس کو ساتویں روز ایک رنگین پانی میں نہلاتے تھے، اور بجائے ختنہ کے اسی نہلانے کو بچے کی طہارت اور دین نصرانیت کا پختہ رنگ سمجھتے

تھے۔ اس آیت نے بتلایا کہ یہ پانی کا رنگ تو دھل کر ختم ہو جاتا ہے، اس کا بعد میں کوئی اثر نہیں رہتا، نیز ختنہ نہ کرنے کی وجہ سے جو گندگی اور ناپاکی جسم میں رہتی ہے اس سے بھی یہ رنگ نجات نہیں دیتا، اصل رنگ دین و ایمان کا رنگ ہے جو ظاہری اور باطنی پاکی کی ضمانت بھی ہے اور باقی رہنے والا بھی۔

دوسرے دین و ایمان کو رنگ فرما کر اس کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ جس طرح رنگ آنکھوں سے محسوس ہوتا ہے مؤمن کے ایمان کی علامات اس کے چہرہ بشرہ اور تمام حرکات و سکنات، معاملات و عادات میں ظاہر ہونا چاہئیں، واللہ اعلم۔

قُلْ أَتَحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَا أَعْمَالُنَا

کہہ دے: کیا تم جھگڑا کرتے ہو ہم سے اللہ کی نسبت حالانکہ وہی ہے رب ہمارا اور رب تمہارا اور ہمارے لئے ہیں عمل ہمارے

وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ ۝۱۳۹ ۚ أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ

اور تمہارے لئے ہیں عمل تمہارے، اور ہم تو خالص اُسی کے ہیں۔ کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم

وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۚ قُلْ

اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد تو یہودی تھے یا نصرانی، کہہ دے کہ

ءَأَنْتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللَّهُ ۚ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَ اللَّهِ ۚ وَمَنْ

تم کو زیادہ خبر ہے یا اللہ کو، اور اس سے بڑا ظالم کون جس نے چھپائی وہ گواہی جو ثابت ہو چکی اس کو اللہ کی طرف سے،

وَمَا لِلَّهِ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝۱۴۰ ۚ تِلْكَ أُمَمٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ

اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے۔ وہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی، ان کے واسطے ہے جو انہوں نے کیا

وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تَسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝۱۴۱ ۚ

اور تمہارے واسطے ہے جو تم نے کیا، اور تم سے کچھ پوچھ نہیں اُن کے کاموں کی۔

آسان ترجمہ قرآن

کہہ دو کہ: ”کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں حجت کرتے ہو؟ حالانکہ وہ ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار۔ (یہ) اور (بات ہے کہ) ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں، اور تمہارے عمل تمہارے لئے۔ اور ہم نے تو اپنی بندگی اُسی کے لئے خالص کر لی ہے“ ﴿۱۳۹﴾ بھلا کیا تم یہ کہتے ہو کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولادیں یہودی یا نصرانی تھیں؟ (اے پیغمبر! ان سے) کہو: کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ اور اُس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو ایسی شہادت کو چھپائے جو اُس کے پاس اللہ کی طرف سے پہنچی ہو؟ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے بے خبر نہیں ہے ﴿۱۴۰﴾ (بہر حال!) وہ ایک اُمت تھی جو گذر گئی۔ جو کچھ انہوں نے کمایا وہ اُن کا ہے، اور جو کچھ تم نے کمایا وہ تمہارا ہے، اور تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا عمل کرتے تھے؟ ﴿۱۴۱﴾

خلاصہ تفسیر

آپ (ان یہود و نصاریٰ سے) فرمادیجئے کہ کیا تم لوگ (اب بھی) ہم سے حجت کئے جاتے ہو حق تعالیٰ کے معاملہ میں (کہ وہ ہم کو قیامت میں نہ بخشیں گے) حالانکہ وہ ہمارا اور تمہارا (سب کا) رَب (اور مالک) ہے، (سورہ بوبیت میں تو تمہارے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں، جیسا تمہارے بعض دعووں سے اختصاص مفہوم ہوتا ہے، مثل لَحْنُ اَبْنَوْا اللہ (المائدہ: ۱۸)) اور ہم کو ہمارا کیا ہوا ملے گا اور تم کو تمہارا کیا ہوا ملے گا (یہاں تک تو تمہارے نزدیک بھی مُسَلَّم ہے) اور (اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ) ہم نے صرف حق تعالیٰ (کی خوشنودی) کے لئے اپنے (دین) کو (شرک وغیرہ سے) خالص کر رکھا ہے (بخلاف تمہارے طریقہ موجودہ کے کہ علاوہ منسوخ ہونے کے خود شرک سے بھی مخلوط ہے، جیسا ان کے اقوال ”عَزَّوَاللہ“ اور ”الْمَسِيحُ ابْنُ اللہ“ (التوبہ: ۳۰) سے ظاہر ہے، اور اس میں ہم کو اللہ تعالیٰ نے ترجیح دی ہے پھر ہم کو نجات نہ ہونے کے کیا معنی) یا (اب بھی اپنے حق پر ہونے کے ثابت کرنے کو یہی) کہے جاتے ہو کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولاد یعقوب (میں جو انبیاء گزرے ہیں، یہ سب حضرات) یہود یا نصاریٰ تھے (اور اس سے بواسطہ موافقت طریق اپنا حق پر ہونا ثابت کرتے ہو، سو اس کے جواب میں) اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم (ایک اتنی مختصری بات ان سے) کہہ دیجئے کہ (اچھا یہ بتلاؤ کہ) تم زیادہ واقف ہو یا حق تعالیٰ (اور ظاہر ہے کہ خدا ہی زیادہ واقف ہے، اور وہ ان انبیاء کا ملتِ اسلام پر ہونا ثابت کر چکے ہیں، جیسا ابھی اُوپر گزر چکا ہے) اور (جانتے ہیں یہ کافر بھی مگر چھپاتے ہیں، سو) ایسے شخص سے زیادہ ظالم کونا ہوگا جو ایسی شہادت کا اخفا کرے جو اس کے پاس من جانب اللہ پہنچی ہو اور (اے اہل

کتاب) اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے سے بے خبر نہیں ہیں (پس جب یہ حضرات یہود و نصاریٰ نہ تھے، سو تم طریقِ دین میں ان کے موافق کب ہوئے، پھر تمہارا حق پر ہونا ثابت نہ ہوا) یہ (ان بزرگوں کی) ایک جماعت تھی جو (اپنے زمانے میں) گزر گئی، ان کے کام ان کا کیا ہوا آوے گا اور تمہارے کام تمہارا کیا ہوا آوے گا، اور تم سے ان کے کئے ہوئے کی پوچھ بھی تو نہ ہوگی (اور جب خالی تذکرہ بھی نہ ہوگا تو اس سے تم کو کچھ نفع پہنچنا تو درکنار)۔

معارفِ مسائل

اخلاص کی حقیقت

وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ ﴿۱۳۹﴾ اس میں اُمتِ مسلمہ کی ایک خصوصیت یہ بتلائی ہے کہ وہ اللہ کے لئے مخلص ہے، اخلاص کے معنی حضرت سعید بن جبیرؓ نے یہ بتلائے ہیں کہ انسان اپنے دین میں مخلص ہو کہ اللہ کے سوا کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، اور اپنے عمل کو خالص اللہ کے لئے کرے، لوگوں کے دکھلانے یا ان کی مدح و شکر کی طرف نظر نہ ہو۔ بعض بزرگوں نے فرمایا کہ اخلاص ایک ایسا عمل ہے جس کو نہ تو فرشتے پہچان سکتے ہیں اور نہ شیطان، وہ صرف بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک راز ہے۔

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبَلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ط

اب کہیں گے بیوقوف لوگ کہ کس چیز نے پھیر دیا مسلمانوں کو ان کے قبلہ سے جس پر وہ تھے،

قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ط يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۱۴۰﴾

تو کہہ اللہ ہی کا ہے مشرق اور مغرب، چلائے جس کو چاہے سیدھی راہ۔

آسان ترجمہ قرآن

اب یہ بے وقوف لوگ کہیں گے کہ آخر وہ کیا چیز ہے جس نے ان (مسلمانوں) کو اپنے اُس قبلے سے رخ پھیرنے پر آمادہ کر دیا جس کی طرف وہ منہ کرتے چلے آ رہے تھے؟ آپ کہہ دیجئے کہ مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کی ہیں۔ وہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ کی ہدایت کر دیتا ہے ﴿۱۴۰﴾

خلاصہ تفسیر

(جب کعبہ قبلہ نماز مقرر ہو کر یہود کا قبلہ متروک ہو گیا تو بوجہ ناگواری کے) اب تو (یہ) بیوقوف لوگ ضرور ہی کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے (سابق سمت) قبلہ سے (کہ بیت المقدس تھا) جس طرف پہلے متوجہ ہوا کرتے تھے کس بات نے (دوسری سمت کی طرف) بدل دیا آپ (جواب میں) فرمادیتے کہ سب (سمتیں خواہ) مشرق (ہو) اور (خواہ) مغرب (ہو) اللہ ہی کے ملک ہیں (خدا تعالیٰ کو مالکانہ اختیار ہے جس سمت کو چاہیں مقرر فرمادیں، کسی کو منصب علت دریافت کرنے کا نہیں ہے، اور سیدھا طریق احکام شرعیہ کے باب میں یہی اعتقاد ہے، لیکن بعضوں کو اس راہ کے اختیار کرنے کی توفیق نہیں ہوتی خواہ مخواہ عتیں ڈھونڈتے پھرا کرتے ہیں، البتہ) جس کو خدا ہی (اپنے فضل سے) چاہیں (یہ) سیدھا طریق بتلا دیتے ہیں۔

معارف مسائل

اس آیت میں مخالفین کا اعتراض دربارہ تحویل قبلہ نقل کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے، اس اعتراض اور جواب سے پہلے قبلہ کی حقیقت اور اس کی مختصر تاریخ سن لیجئے، جس سے سوال و جواب کا سمجھنا آسان ہو جائے۔

”قبلہ“ کے لفظی معنی ہیں سمت توجہ، یعنی جس طرف رخ کیا جائے، یہ ظاہر ہے کہ مؤمن کا رخ ہر عبادت میں صرف ایک اللہ وحدہ لا شریک لہ کی طرف ہوتا ہے، اور اس کی ذات پاک مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی قیدوں اور سمتوں سے بالاتر ہے، وہ کسی خاص سمت میں نہیں، اس کا اثر طبعی خاص طور پر یہ ہونا تھا کہ کوئی عبادت کرنے والا کسی خاص رخ کا پابند نہ ہوتا، جس کا جس طرف جی چاہتا نماز میں اپنا رخ اس طرف کر لیتا، اور ایک ہی آدمی کسی وقت ایک طرف اور کسی وقت کئی طرف رخ کرتا تو وہ بھی بے جا نہ ہوتا۔

لیکن ایک دوسری حکمت الہیہ اس کی مقتضی ہوئی کہ تمام عبادت گزاروں کا رخ ایک ہی طرف ہونا چاہئے، اور وہ یہ ہے کہ عبادت کی مختلف قسمیں ہیں، بعض انفرادی ہیں، بعض اجتماعی، ذکر اللہ اور روزہ وغیرہ انفرادی عبادات ہیں، جن کو خلوت میں اور اخفا کے ساتھ ادا کیا جاسکتا ہے، اور نماز اور حج اجتماعی عبادات ہیں، جن کو جماعت و اجتماع و اعلان کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے، ان میں عبادت کے ساتھ مسلمانوں کو اجتماعی زندگی کے آداب کا بتلانا اور سکھانا بھی پیش نظر ہے، اور یہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ اجتماعی نظام کا سب سے بڑا بنیادی اصول افراد کثیرہ کی وحدت اور یک جہتی ہے، یہ وحدت جتنی زیادہ قوی سے قوی ہوگی اتنا ہی اجتماعی نظام مستحکم اور مضبوط ہوگا، انفرادیت اور تشتت اجتماعی نظام کے لئے سم قاتل

ہے، پھر نقطہ وحدت متعین کرنے میں ہر قرن، ہر زمانے کے لوگوں کی مختلف راہیں رہی ہیں، کسی قوم نے نسل اور نسب کو نقطہ وحدت قرار دیا، کسی نے وطن اور جغرافیائی خصوصیات کو، کسی نے رنگ اور زبان کو۔

لیکن دین الہی اور شرائع انبیاء علیہم السلام نے ان غیر اختیاری چیزوں کو نقطہ وحدت بنانے کے قابل نہیں سمجھا، اور نہ درحقیقت یہ چیزیں ایسی ہیں جو پورے افراد انسانی کو کسی ایک مرکز پر جمع کر سکیں، بلکہ جتنا غور کیا جائے یہ وحدتیں درحقیقت افراد انسانی کو بہت سی کثرتوں میں تقسیم کر ڈالنے اور آپس میں ٹکراؤ اور اختلافات کے اسباب ہیں۔

دین اسلام نے جو درحقیقت تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ہے وحدت کا اصلی نقطہ فکر و خیال اور عقیدے کی وحدت کو قرار دیا، اور کروڑوں خداؤں کی پرستش میں بٹی ہوئی دنیا کو ایک ذات حق وحدہ لا شریک لہ کی عبادت اور اطاعت کی دعوت دی جس پر مشرق و مغرب اور ماضی و مستقبل کے تمام افراد انسانی جمع ہو سکتے ہیں، پھر اس حقیقی فکری اور نظری وحدت کو عملی صورت اور قوت دینے کے لئے کچھ ظاہری وحدتیں بھی ساتھ لگائی گئیں، مگر ان ظاہری وحدتوں میں بھی اصول یہ رکھا گیا کہ وہ عملی اور اختیاری ہوں، تاکہ تمام افراد انسانی ان کو اختیار کر کے ایک رشتہ اخوت میں منسلک ہو سکیں، نسب، وطن، زبان، رنگ وغیرہ اختیار چیزیں نہیں ہیں، جو شخص ایک خاندان کے اندر پیدا ہو چکا ہے وہ کسی طرح دوسرے خاندان میں پیدا نہیں ہو سکتا، جو پاکستان میں پیدا ہو چکا وہ انگلستان یا افریقہ میں پیدا نہیں ہو سکتا، جو کالا ہے وہ اپنے اختیار سے گورا، اور جو گورا ہے وہ اپنے اختیار سے کالا نہیں ہو سکتا۔

اب اگر ان چیزوں کو مرکز وحدت بنایا جائے تو انسانیت کا سیکڑوں بلکہ ہزاروں ٹکروں اور گروہوں میں تقسیم ہو جانا ناگزیر ہوگا، اس لئے دین اسلام نے ان چیزوں سے جن سے تمدنی مفاد وابستہ ہیں ان کا پورا احترام رکھتے ہوئے ان کو وحدت انسانی کا مرکز نہیں بننے دیا، کہ یہ وحدتیں افراد انسانی کو مختلف کثرتوں میں بانٹنے والی ہیں، ہاں اختیاری امور میں اس کی پوری رعایت رکھی کہ فکری وحدت کے ساتھ عملی اور صوری وحدت بھی قائم ہو جائے، مگر اس میں بھی اس کا پورا لحاظ رکھا گیا کہ مرکز وحدت ایسی چیزیں بنائی جائیں جن کا اختیار کرنا ہر مرد و عورت، لکھے پڑھے اور ان پڑھے، شہری اور دیہاتی، امیر و غریب کو یکساں طور پر آسان ہو، یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلام نے تمام دنیا کے لوگوں کو لباس اور مسکن، کھانے اور پینے کے کسی ایک طریقے کا پابند نہیں کیا، کہ ہر جگہ کے موسم اور طبائع مختلف اور ان کی ضروریات مختلف ہیں، سب کو ایک ہی طرح کے لباس یا شعار (یونیفارم) کا پابند کر دیا جائے تو بہت سی مشکلات پیش آئیں گی، پھر اگر یہ یونیفارم کم سے کم تجویز کر دیا جائے تو یہ اعتدال انسانی پر ظلم ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے عمدہ لباس اور عمدہ کپڑوں کی بے حرمتی ہوگی، اور اگر اس سے زائد کسی لباس کا پابند کیا جائے تو غریب مفلس لوگوں کو مشکلات پیش آئیں گی۔

اس لئے شریعت اسلام نے مسلمانوں کا کوئی ایک شعار (یونیفارم) مقرر نہیں کیا، بلکہ مختلف قوموں میں جو طریقہ

اور اوضاع لباس کی رائج تھیں ان سب پر نظر کر کے ان میں سے جو صورتیں اسراف بے جا، یا فخر وغیرہ، یا کسی غیر مسلم قوم کی نقالی پر مبنی تھیں، صرف ان کو ممنوع قرار دے کر باقی چیزوں میں ہر فرد اور ہر قوم کو آزاد اور خود مختار رکھا، مرکز وحدت ایسی چیزوں کو بنایا گیا جو اختیاری بھی ہوں اور آسان اور سستی بھی، ان چیزوں میں جیسے جماعت نماز کی صف بندی، ایک امام کی نقل و حرکت کی مکمل پابندی، حج میں لباس اور مسکن کا اشتراک وغیرہ ہیں۔

اسی طرح ایک اہم چیز سمت قبلہ کی وحدت بھی ہے، کہ اگرچہ اللہ جل شانہ کی ذات پاک ہر سمت وجہت سے بالاتر ہے، اس کے لئے شش جہت یکساں ہیں، لیکن نماز میں اجتماعی صورت اور وحدت پیدا کرنے کے لئے تمام دنیا کے انسانوں کا رخ کسی ایک ہی جہت و سمت کی طرف ہونا ایک بہترین اور آسان اور بے قیمت وحدت کا ذریعہ ہے، جس پر سارے مشرق و مغرب اور جنوب و شمال کے انسان آسانی سے جمع ہو سکتے ہیں، اب وہ ایک سمت وجہت کو نسی ہو جس کی طرف ساری دنیا کا رخ پھیرا جائے، اس کا فیصلہ اگر انسانوں پر چھوڑا جائے تو یہی ایک سب سے بڑی بناء اختلاف و نزاع بن جاتی ہے، اس لئے ضرور تھا کہ اس کا تعین خود حضرت حق جل و علا شانہ کی طرف سے ہوتا، حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں اتارا گیا تو فرشتوں کے ذریعے بیت اللہ کعبہ کی بنیاد پہلے ہی رکھ دی گئی تھی، حضرت آدم اور اولاد آدم علیہ السلام کا سب سے پہلا قبلہ یہی بیت اللہ اور خانہ کعبہ بنایا گیا:-

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ ﴿۹۱﴾ (آل عمران)

”سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ گھر ہے جو مکہ میں ہے برکت والا، ہدایت والا جہان والوں کے لئے۔“

نوح علیہ السلام تک سب کا قبلہ یہی بیت اللہ تھا، طوفان نوح کے وقت پوری دنیا غرق ہو کر تباہ ہو گئی، بیت اللہ کی عمارت بھی منہدم ہو گئی، اور ان کے بعد حضرت خلیل اللہ اور اسماعیل علیہ السلام نے دوبارہ بحکم خداوندی بیت اللہ کی تعمیر کی، اور یہی ان کا اور ان کی امت کا قبلہ رہا، اس کے بعد انبیائے بنی اسرائیل کے لئے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا گیا اور بقول ابوالعالیہ انبیائے سابقین جو بیت المقدس میں نماز پڑھتے تھے وہ بھی عمل ایسا کرتے تھے کہ صحرا بیت المقدس بھی سامنے رہے اور بیت اللہ بھی۔ (ذکرہ القرطبی)

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر جب نماز فرضی کی گئی تو بقول بعض علماء ابتداء آپ کا قبلہ آپ کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ یعنی خانہ کعبہ ہی قرار دیا گیا، مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے اور مدینہ طیبہ میں قیام کرنے کے بعد، اور بعض روایات کے اعتبار سے ہجرت مدینہ سے کچھ پہلے آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ آپ بیت المقدس

کو اپنا قبلہ بنائیے، صحیح بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سولہ سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف نماز ادا فرمائی، مسجد نبوی میں آج تک اس کی علامات موجود ہیں، جہاں کھڑے ہو کر آپ نے بیت المقدس کی طرف نمازیں ادا فرمائی تھیں۔ (قرطبی)

حکم خداوندی کی تعمیل کے لئے تو سید الرسل سر تاپا اطاعت تھے، اور حکم خداوندی کے مطابق نمازیں بیت المقدس کی طرف ادا فرما رہے تھے، لیکن آپ کی طبعی رغبت اور دلی خواہش یہ تھی کہ آپ کا قبلہ پھر وہی آدم علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ قرار دے دیا جائے، اور چونکہ عادتہ اللہ یہی ہے کہ وہ اپنے مقبول بندوں کی مراد اور خواہش و رغبت کو پورا فرماتے ہیں۔

تو چنان خواہی خدا خواہد چنیں

می دہد یزداں مراد متقین

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ اُمید تھی کہ آپ کی تمنا پوری کی جائے گی، اور اس لئے انتظارِ وحی میں آپ بار بار آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھتے تھے، اسی کا بیان قرآن کی اس آیت میں ہے:-

قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا ۚ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ

(البقرة: ۱۴۴)

”ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ کا بارہا آسمان کی طرف نظر اٹھانا، سو ہم آپ کا قبلہ وہی بدل دیں گے جو آپ کو پسند ہے، اس لئے آئندہ آپ نماز میں اپنا رخ مسجدِ حرام کی طرف کیا کریں۔“
اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کا اظہار فرما کر اس کو پورا کرنے کا حکم دے دیا گیا ہے کہ آئندہ آپ مسجدِ حرام کی طرف رخ کیا کریں۔

نماز میں خاص بیت اللہ کا استقبال ضروری نہیں اس کی سمت کا استقبال بھی بیرونی دُنیا کے لئے کافی ہے

یہاں ایک فقہی نکتہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس آیت میں کعبہ یا بیت اللہ کے بجائے لفظ مسجدِ حرام کا استعمال فرمایا گیا ہے، جس میں اشارہ ہے کہ بلادِ بعیدہ کے رہنے والوں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ عین بیت اللہ کی محاذات پائی جائے، بلکہ سمتِ بیت اللہ کی طرف رخ کر لینا کافی ہے، ہاں جو شخص مسجدِ حرام میں موجود ہے، یا کسی قریبی پہاڑ پر بیت اللہ کو سامنے

۱ تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۲ ص: ۱۴۸ وصحيح البخاری، كتاب الإيمان، باب الصلاة من الإيمان ج: ۱ ص: ۱۱

۲ ترجمہ:- تم جس طرح چاہتے ہو خدا اس طرح چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ پر ہیزگاروں کی مراد پوری کر دیتا ہے۔

دیکھ رہا ہے، اس کے لئے خاص بیت اللہ ہی کی طرف رُخ کرنا ضروری ہے، اگر بیت اللہ کی کوئی چیز بھی اُس کے چہرے کے محاذات میں نہ آئی تو اس کی نماز نہیں ہوتی، بخلاف ان لوگوں کے جن کے سامنے بیت اللہ نہیں کہ ان کے واسطے سمت بیت اللہ یا سمت مسجد حرام کی طرف رُخ کر لینا کافی ہے۔

بہر حال ہجرت مدینہ سے سولہ سترہ مہینے بعد پھر آپ کا اور مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ کو بنایا گیا، اس پر یہود اور بعض مشرکین و منافقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ پر یہ اعتراض کرنے لگے کہ ان کے دین کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں، ان کا قبلہ بھی روز بروز بدلتا رہتا ہے۔

قرآن کریم نے ان کا یہ اعتراض آیت مذکورہ میں نقل فرمایا، مگر ساتھ ہی عنوان یہ رہا کہ بیوقوف لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں، اور ان کی بیوقوفی اس جواب سے واضح ہوگئی جو اس کے بعد ذکر فرمایا گیا ہے، ارشاد ہے: **قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ** (۱۴۲) یعنی ”آپ فرمادیجئے کہ اللہ ہی کے ہیں مشرق اور مغرب، وہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ چلاتا ہے۔“

اس میں استقبال قبلہ کی حقیقت کو واضح فرمادیا کہ کعبہ اور بیت المقدس کی کوئی خصوصیت بجز اس کے نہیں کہ حکم ربانی نے ان کو کوئی امتیاز دے کر قبلہ بنادیا، وہ اگر چاہیں تو ان دونوں کے علاوہ کسی تیسری چوتھی چیز کو بھی قبلہ بنا سکتے ہیں، پھر جس کو قبلہ بنادیا گیا اس کی طرف رُخ کرنے میں جو کچھ فضیلت اور ثواب ہے اس کی رُوح حکم حق جل شانہ کی اطاعت کے سوا کچھ نہیں، جو ربانی کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا بنیادی اصول ہے، اور اسی لئے دوسری آیت میں اور زیادہ واضح فرمایا کہ:-

لَيْسَ الذِّكْرُ أَنْ تَوَلَّوْا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الدِّينَ أَمْرٌ بِاللَّهِ (البقرة: ۱۷۷)
 ”اس میں ذاتی کوئی نیکی اور ثواب نہیں کہ تم مشرق کی طرف رُخ کرو یا مغرب کی طرف، لیکن نیکی اللہ پر ایمان لانے اور اس کی اطاعت کرنے میں ہے۔“
 اور ایک آیت میں فرمایا:-

فَأَيُّكُمْ تَوَلَّوْا فَتَحَّ وَجْهَ اللَّهِ ۖ (البقرة: ۱۱۵)

”یعنی تم اللہ کے فرمان کے مطابق جس طرف بھی رُخ کرو، اللہ تعالیٰ کی توجہ اسی طرف پاؤ گے۔“

ان آیات نے قبلہ اور استقبال قبلہ کی حقیقت کو بھی واضح فرمادیا، کہ اس میں ان مقامات کی کوئی ذاتی خصوصیت نہیں، بلکہ ان میں فضیلت پیدا ہونے کا سبب ہی یہ ہے کہ ان کو حق تعالیٰ نے قبلہ بنانے کے لئے اختیار فرمالیا، اور اس کی طرف رُخ کرنے میں ثواب کی وجہ بھی صرف یہی ہے کہ حکم ربانی کی اطاعت ہے، اور شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

لئے قبلہ میں تغیر و تبدل فرمانے کی یہ بھی حکمت ہو کہ عملی طور سے لوگوں پر یہ واضح ہو جائے کہ قبلہ کوئی بت نہیں، جس کی پرستش کی جائے، بلکہ اصل چیز حکم خداوندی ہے، وہ بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا آگیا تو اس کی تعمیل کی، پھر جب کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم مل گیا تو اسی کی طرف رُخ کرنا عبادت ہو گیا، اس کے بعد والی آیت میں خود قرآن کریم نے بھی اس حکمت کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں فرمایا ہے:-

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقْبَيْهِ ۖ (البقرة: ۱۴۳)

”یعنی جس قبلے پر آپ پہلے رہ چکے ہیں، اس کو قبلہ بنانا تو محض اس بات کو ظاہر کرنے کے لئے تھا کہ کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرتا ہے اور کون پیچھے ہٹ جاتا ہے۔“

اس حقیقت قبلہ کے بیان سے ان بیوقوف مخالفین کا بھی پورا جواب ہو گیا جو قبلہ کے بارے میں تغیر و تحول کو اصول اسلام کے منافی سمجھتے اور مسلمانوں کو طعن دیتے تھے۔ آخر میں ارشاد فرمایا: **يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ** (۱۴۳) اس میں بتلادیا ہے کہ سیدھی راہ یہی ہے کہ انسان حکم حق جل شانہ کے لئے کمر بستہ منتظر رہے، جو حکم مل جائے اس پر بے چون و چرا عمل کرے اور یہ سیدھی راہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔

مسند احمد کی ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل کتاب کو مسلمانوں کے ساتھ سب سے بڑا حسد تین چیزوں پر ہے، ایک یہ کہ ہفتہ میں ایک دن عبادت کے لئے مخصوص کرنے کا حکم ساری اُمتوں کو ملا تھا، یہود نے سینچر کا دن مقرر کر لیا، اور نصاریٰ نے اتوار کا، اور حقیقت میں عند اللہ وہ جمعہ کا روز تھا، جو مسلمانوں کے انتخاب میں آیا، دوسرے وہ قبلہ جو تحول کے بعد مسلمانوں کے لئے مقرر کیا گیا، اور کسی اُمت کو اس کی توفیق نہیں ہوئی، تیسرے امام کے پیچھے آمین کہنا کہ یہ تینوں خصلتیں صرف مسلمانوں کو میسر ہوئیں، اہل کتاب ان سے محروم ہیں۔

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ

اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو اُمت معتدل تاکہ ہو تم گواہ لوگوں پر

وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ط

اور ہو رسول تم پر گواہی دینے والا۔

آسان ترجمہ قرآن

اور (مسلمانو!) اسی طرح تو ہم نے تم کو ایک معتدل اُمت بنایا ہے تاکہ تم دوسرے لوگوں پر گواہ بنو، اور رسول تم پر گواہ بنے۔

خلاصہ تفسیر

اور (اے متبعانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اسی طرح ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنا دی ہے، جو (ہر پہلو سے) نہایت اعتدال پر ہے، تاکہ (دُنیا میں شرف و امتیاز حاصل ہونے کے علاوہ آخرت میں بھی تمہارا بڑا شرف ظاہر ہو کہ) تم (ایک بڑے مقدمہ میں جس میں ایک فریق حضراتِ انبیاء علیہم السلام ہوں گے، اور فریقِ ثانی ان کی مخالف قومیں ہوں گی، ان مخالف) لوگوں کے مقابلہ میں گواہ (تجویز) ہو، اور (شرف بالا شرف یہ ہوا کہ) تمہارے (قابلِ شہادت اور معتبر ہونے کے) لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گواہ ہوں، (اور اس شہادت سے تمہاری شہادت معتبر ہونے کی تصدیق ہو، پھر تمہاری شہادت سے اس مقدمہ کا حضراتِ انبیاء علیہم السلام کے حق میں فیصلہ ہوا اور مخالفین مجرم قرار پا کر سزایاب ہوں، اور اس امر کا اعلیٰ درجہ کی عزت ہونا ظاہر ہے)۔

معارف و مسائل

اُمتِ محمدیہ کا خاص اعتدال

لفظ ”وَسَطٌ“ بفتح السين بمعنی اوسط ہے، اور خیر الامور اور افضل الاشياء کو ”وَسَطٌ“ کہا جاتا ہے۔ ترمذی میں بروایت ابوسعید خدری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لفظ ”وسط“ کی تفسیر ”عدل“ سے کی گئی ہے، جو بہترین کے معنی میں آیا ہے (قرطبی)۔ اس آیت میں اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی ایک امتیازی فضیلت و خصوصیت کا ذکر ہے، کہ وہ ایک معتدل اُمت بنائی گئی، اس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ جس طرح ہم نے مسلمانوں کو وہ قبلہ عطا کیا، جو سب سے اشرف و افضل ہے، اسی طرح ہم نے اُمتِ اسلامیہ کو ایک خاص امتیازی فضیلت یہ عطا کی ہے کہ اس کو ایک معتدل اُمت بنایا ہے، جس کے نتیجہ میں ان کو میدانِ حشر میں یہ امتیاز حاصل ہوگا کہ سارے انبیاء علیہم السلام کی اُمتیں جب اپنے انبیاء کی ہدایت و تبلیغ سے مکر جائیں گی، اور ان کو جھٹلا کر یہ کہیں گی کہ ہمارے پاس نہ کوئی کتاب آئی، نہ کسی نبی نے ہمیں کوئی ہدایت کی، اُس وقت

اُمّتِ محمدیہ انبیاء علیہم السلام کی طرف سے گواہی میں پیش ہوگی اور یہ شہادت دے گی کہ انبیاء علیہم السلام نے ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائی ہوئی ہدایت ان کو پہنچائیں، اور ان کو صحیح راستہ پر لانے کی مقدور بھرپوری کوشش کی۔ مدعا علیہم اُمّتیں اُمّتِ محمدیہ کی گواہی پر یہ جرح کریں گی کہ اس اُمّتِ محمدیہ کا تو ہمارے زمانے میں وجود بھی نہ تھا، اس کو ہمارے معاملات کی کیا خبر، اس کی گواہی ہمارے مقابلے میں کیسے قبول کی جاسکتی ہے۔

اُمّتِ محمدیہ اس جرح کا یہ جواب دے گی کہ بے شک ہم اس وقت موجود نہ تھے، مگر ان کے واقعات و حالات کی خبر ہمیں ایک صادق مصدوق رسول نے اور اللہ کی کتاب نے دی ہے، جس پر ہم ایمان لائے اور ان کی خبر کو اپنے معائنے سے زیادہ وقیع اور سچا جانتے ہیں، اس لئے ہم اپنی شہادت میں حق بجانب اور سچے ہیں۔ اس وقت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیش ہوں گے، اور ان گواہوں کا تزکیہ و توثیق کریں گے کہ بے شک انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح ہے، اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میری تعلیم کے ذریعے ان کو یہ صحیح حالات معلوم ہوئے۔

محشر کے اس واقعے کی تفصیل صحیح بخاری، ترمذی، نسائی اور مسند احمد کی متعدد احادیث میں مجملًا و مفصلًا مذکور ہے۔^[۱]

الغرض آیت مذکورہ میں اُمّتِ محمدیہ کی اعلیٰ فضیلت و شرف کا راز یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ اُمّت معتدل اُمّت بنائی گئی

ہے، اس لئے یہاں چند باتیں قابلِ غور ہیں:-

اعتدالِ اُمّت کی حقیقت، اہمیت اور اس کی کچھ تفصیل

۱- اعتدال کے معنی اور حقیقت کیا ہیں؟ ۲- وصفِ اعتدال کی یہ اہمیت کیوں ہے کہ اس پر مدارِ فضیلت رکھا گیا؟

۳- اس اُمّتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معتدل ہونے کا واقعات کی رُو سے کیا ثبوت ہے؟ ترتیب وار ان تینوں سوالوں کا جواب یہ ہے:-

- ۱- اعتدال کے لفظی معنی ہیں برابر ہونا، یہ لفظ عدل سے مشتق ہے، اس کے معنی بھی برابر ہونے کے ہیں۔
- ۲- وصفِ اعتدال کی یہ اہمیت کہ اس کو انسانی شرف و فضیلت کا معیار قرار دیا گیا، ذرا تفصیل طلب ہے، اس کو پہلے ایک محسوس مثال سے دیکھئے، دُنیا کے جتنے نئے اور پرانے طریقے جسمانی صحت و علاج کے لئے جاری ہیں، طبِ یونانی، ویدک، ایلوپیتھک، ہومیو پیتھک وغیرہ سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ بدنِ انسانی کی صحت اعتدالِ مزاج سے ہے، اور جہاں یہ اعتدال کسی جانب سے خلل پذیر ہو، وہی بدنِ انسانی کا مرض ہے۔ خصوصاً طبِ یونانی کا تو بنیادی اُصول ہی مزاج کی پہچان پر موقوف ہے، انسان کا بدن چار خلط: خون، بلغم، سوداء، صفراء کے مرکب اور انہی چاروں اخلاط سے پیدا شدہ

صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب قوله كذلك جعلكم الآية ج: ۲، ص: ۶۳۵ وجامع الترمذی، ابواب التفسیر، ومن سورة البقرة ج: ۲

چار کیفیات انسان کے بدن میں ضروری ہیں: گرمی، ٹھنڈک، خشکی اور تری، جس وقت تک یہ چاروں کیفیات مزاجِ انسانی کے مناسب حدود کے اندر معتدل رہتی ہیں، وہ بدنِ انسانی کی صحت و تندرستی کہلاتی ہے، اور جہاں اُن میں سے کوئی کیفیت مزاجِ انسانی کی حد سے زیادہ ہو جائے یا گھٹ جائے وہی مرض ہے، اور اگر اس کی اصلاح و علاج نہ کیا جائے، تو ایک حد میں پہنچ کر وہی موت کا پیام ہو جاتا ہے۔

اس محسوس مثال کے بعد اب روحانیت اور اخلاقیات کی طرف آئیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں بھی اعتدال اور بے اعتدالی کا یہی طریقہ جاری ہے، اس کے اعتدال کا نام روحانی صحت اور بے اعتدالی کا نام روحانی اور اخلاقی مرض ہے، اور اس مرض کا اگر علاج کر کے اعتدال پر نہ لایا جائے تو اس کا نتیجہ روحانی موت ہے، اور یہ بھی کسی صاحبِ بصیرت انسان پر مخفی نہیں کہ جوہرِ انسانیت جس کی وجہ سے انسان ساری مخلوقات کا حاکم اور مخدوم قرار دیا گیا ہے، وہ اس کا بدن یا بدن کے اجزاء و اخلاط یا ان کی کیفیات حرارت و برودت نہیں، کیونکہ ان اجزاء و کیفیات میں تو دُنیا کے سارے جانور بھی انسانیت کے ساتھ شریک بلکہ انسانیت سے زیادہ حصہ رکھنے والے ہیں۔

جوہرِ انسانیت جس کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات اور آقائے کائنات مانا گیا ہے، وہ اس کے گوشت پوست اور حرارت و برودت وغیرہ سے بالاتر کوئی چیز ہے، جو انسان میں کامل اور اکمل طور پر موجود ہے، دوسری مخلوقات کو اس کا وہ درجہ حاصل نہیں، اور اس کا معین کر لینا بھی کوئی باریک اور مشکل کام نہیں، کہ وہ انسان کا روحانی اور اخلاقی کمال ہے، جس نے اس کو مخدوم کائنات بنایا ہے، مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے ۔

آدمیت لحم و ثعم و پوست نیست

آدمیت جز رضائے دوست نیست

اور اسی وجہ سے وہ انسان جو اپنے جوہرِ شرافت و فضیلت کی بے قدری کر کے اس کو ضائع کرتے ہیں ان کے بارے میں فرمایا ۔

اینکہ می بینی خلافِ آدم اند

نیستند آدم غلافِ آدم اند

اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ انسان کا جوہرِ شرافت اور مدارِ فضیلت اس کے روحانی اور اخلاقی کمالات ہیں، اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ بدنِ انسانی کی طرح روحِ انسانی بھی اعتدال و بے اعتدالی کا شکار ہوتی ہے، اور جس طرح بدنِ انسانی کی صحت، اس کے مزاج اور اخلاط کا اعتدال ہے، اسی طرح روح کی صحت روح اور اس کے اخلاق کا اعتدال ہے،

ترجمہ:- آدمیت گوشت، چربی اور کھال کا نام نہیں ہے، آدمیت اللہ تعالیٰ کی رضا کے سوا اور کسی چیز کا نام نہیں ہے۔

ترجمہ:- یہ جن کو تم دیکھ رہے ہو آدم کے خلاف ہیں، یہ آدم نہیں ہیں بلکہ یہ آدم کا صرف غلاف ہیں۔

اس لئے انسانِ کامل کہلانے کا مستحق صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو جسمانی اعتدال کے ساتھ روحانی اور اخلاقی اعتدال بھی رکھتا ہو، یہ کمال تمام انبیاء علیہم السلام کو خصوصیت کے ساتھ عطا ہوتا ہے، اور ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء علیہم السلام میں بھی سب سے زیادہ یہ کمال حاصل تھا، اس لئے انسانِ کامل کے اولین مصداق آپ ہی ہیں، اور جس طرح جسمانی علاج معالجے کے لئے ہر زمانہ اور ہر جگہ، ہر بستی میں طبیب اور ڈاکٹر اور دواؤں اور آلات کا ایک محکم نظام حق تعالیٰ نے قائم فرمایا ہے، اسی طرح روحانی علاج اور قوموں میں اخلاقی اعتدال پیدا کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے، ان کے ساتھ آسمانی ہدایات بھیجی گئیں اور بقدر ضرورت مادی طاقتیں بھی عطا کی گئیں، جن کے ذریعہ وہ یہ قانونِ اعتدال دُنیا میں نافذ کر سکیں، اسی مضمون کو قرآن کریم نے سورہ حدید میں اس طرح بیان فرمایا ہے:-

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (الحديد: ۲۵)

”یعنی ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسولِ نشانیاں دے کر اور اتاری اُن کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہو جائیں، اور ہم نے اُتار لوہا اس میں سخت لڑائی ہے اور لوگوں کے کام چلتے ہیں۔“

اس میں انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے اور ان پر کتابیں نازل کرنے کی حکمت یہی بتلائی ہے کہ وہ ان کے ذریعہ لوگوں میں اخلاقی اور عملی اعتدال پیدا کریں، کتاب، اخلاق اور روحانی اعتدال پیدا کرنے کے لئے نازل کی گئی، اور ترازو معاملات دین میں عملی اعتدال پیدا کرنے کے لئے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ترازو سے مراد ہر پیغمبر کی شریعت ہو، جس کے ذریعہ اعتدال حقیقی معلوم ہوتا ہے اور عدل و انصاف قائم کیا جاسکتا ہے۔

اس تفصیل سے آپ نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے اور اُن پر کتابیں نازل کرنے کی اصلی غرض و حکمت یہی ہے کہ قوموں کو اخلاقی اور عملی اعتدال پر قائم کیا جائے، اور یہی قوموں کی صحت مندی اور تندرستی ہے۔

اُمّتِ محمدیہ میں ہر قسم کا اعتدال

اس بیان سے آپ نے یہ بھی معلوم کر لیا ہوگا کہ اُمّتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی جو فضیلت آیت مذکورہ میں بتلائی گئی: **وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا** یعنی ”ہم نے تمہیں ایک معتدل اُمّت بنایا ہے“ یہ بولنے اور لکھنے میں تو ایک لفظ ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے کسی قوم یا شخص میں جتنے کمالات اس دُنیا میں ہو سکتے ہیں ان سب کے لئے حاوی اور جامع ہے۔

اس میں اُمتِ محمدیہ کو اُمتِ وسط یعنی معتدل اُمت فرما کر یہ بتلادیا کہ انسان کا جو ہر شرافت و فضیلت ان میں بدرجہ کمال موجود ہے، اور جس غرض کے لئے یہ آسمان وزمین کا سارا نظام ہے، اور جس کے لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں بھیجی گئی ہیں، یہ اُمت اس میں ساری اُمتوں سے ممتاز اور افضل ہے۔

قرآن کریم نے اس اُمت کے متعلق اس خاص وصف و فضیلت کا بیان مختلف آیات میں مختلف عنوانات سے کیا ہے، سورہ اعراف کے آخر میں اُمتِ محمدیہ کے لئے ارشاد ہوا:-

وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةً يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ ﴿۱۸﴾ (الاعراف)

”یعنی اُن لوگوں میں جن کو ہم نے پیدا کیا ہے، ایک ایسی اُمت ہے جو سچی راہ بتلاتے ہیں اور اس کے موافق انصاف کرتے ہیں۔“

اس میں اُمتِ محمدیہ کے اعتدالِ روحانی و اخلاقی کو واضح فرمایا ہے، کہ وہ اپنے ذاتی مفادات اور خواہشات کو چھوڑ کر آسمانی ہدایت کے مطابق خود بھی چلتے ہیں، اور دُوروں کو بھی چلانے کی کوشش کرتے ہیں، اور کسی معاملہ میں نزاع و اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ بھی اسی بے لاگ آسمانی قانون کے ذریعہ کرتے ہیں جس میں کسی قوم یا شخص کے ناجائز مفاد کا کوئی خطرہ نہیں۔

اور سورہ آل عمران میں اُمتِ محمدیہ کے اسی اعتدالِ مزاج اور اعتدالِ روحانی کے آثار کو ان الفاظ میں بیان فرمایا

کیا ہے:-

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ﴿۱۱۰﴾ (آل عمران)

”یعنی تم سب اُمتوں میں بہتر ہو جو عالم میں بھیجی گئی ہو، حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو برے کاموں سے اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔“

یعنی جس طرح ان کو رسول سب رسولوں میں افضل نصیب ہوئے، کتاب سب کتابوں میں جامع اور اکمل نصیب ہوئی، اسی طرح ان کو قوموں کا صحت مندانه مزاج اور اعتدال بھی اس اعلیٰ پیمانے پر نصیب ہوا کہ وہ سب اُمتوں میں بہتر اُمت قرار پائی، اس پر علوم و معارف کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں، ایمان و عمل و تقویٰ کی تمام شاخیں ان کی قربانیوں سے سرسبز و شاداب ہوں گی، وہ کسی مخصوص ملک و اقلیم میں محصور نہ ہوگی، بلکہ اس کا دائرہ عمل سارے عالم اور انسانی زندگی کے سارے شعبوں کو محیط ہوگا، گویا اس کا وجود ہی اس لئے ہوگا کہ دُوروں کی خیر خواہی کرے، اور جس طرح ممکن ہو انہیں جنت کے دروازوں پر لا کھڑا کر دے۔ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: ۱۱۰) میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اُمت دُوروں

کی خیر خواہی اور فائدہ کے لئے بنائی گئی ہے، اس کا فرض منصبی اور قومی نشان یہ ہے کہ لوگوں کو نیک کاموں کی ہدایت کرے، برے کاموں سے روکے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: "الَّذِينَ النَّصِيحَةُ" ^[۱] کا یہی مطلب ہے کہ دین اس کا نام ہے کہ سب مسلمانوں کی خیر خواہی کرے۔ پھر برے کاموں میں کفر، شرک، بدعات، رسومِ قبیحہ، فسق و فجور اور ہر قسم کی بد اخلاقی اور نامعقول باتیں شامل ہیں، اُن سے روکنا بھی کئی طرح ہوگا، کبھی زبان سے، کبھی ہاتھ سے، کبھی قلم سے، کبھی تلوار سے، غرض ہر قسم کا جہاد اس میں داخل ہو گیا یہ صفت جس قدر عموم و اہتمام سے اُمتِ محمدیہ میں پائی گئی پہلی اُمتوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

۳- اب تیسری بات غور طلب یہ رہ گئی کہ اس اُمت کے توسط و اعتدال کا واقعات سے ثبوت کیا ہے، اس کی تفصیل طویل اور تمام اُمتوں کے اعتقادات، اعمال و اخلاق اور کارناموں کا موازنہ کر کے بتلانے پر موقوف ہے، اس میں سے چند چیزیں بطور مثال ذکر کی جاتی ہیں۔

اعتقادی اعتدال

سب سے پہلے اعتقادی اور نظری اعتدال کو لے لیجئے، تو پچھلی اُمتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اللہ کے رسولوں کو اس کا بیٹا بنالیا، اور ان کی عبادت اور پرستش کرنے لگے: وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ^(التوبہ: ۳۰)۔ اور دوسری طرف انہی قوموں کے دوسرے افراد کا یہ عالم بھی مشاہدہ میں آئے گا کہ رسول کے مسلسل معجزات دیکھنے اور برتنے کے باوجود جب اُن کا رسول ان کو کسی جنگ و جہاد کی دعوت دیتا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں: فَادْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ ^(المائدہ: ۲۴) (یعنی جائیے آپ اور آپ کا پروردگار وہی مخالفین سے قتال کریں، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں)۔ کہیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ اپنے انبیاء کو خود ان کے ماننے والے طرح طرح کی ایذا میں پہنچاتے ہیں۔

بخلاف اُمتِ محمدیہ کے کہ وہ ہر قرن، ہر زمانے میں ایک طرف تو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ عشق و محبت رکھتے ہیں کہ اس کے آگے اپنی جان و مال اور اولاد و آبرو سب کو قربان کر دیتے ہیں۔

سلام اُس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں

بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا سرفروشی کے فسانے میں

اور دوسری طرف یہ اعتدال کہ رسول کو رسول اور خدا کو خدا سمجھتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو با ایں ہمہ

کمالات و فضائل "عَبْدُ اللَّهِ وَرَسُولُهُ" مانتے اور کہتے ہیں، وہ آپ کے مدائح و مناقب میں بھی یہ پیمانہ رکھتے ہیں جو

قصیدہ بردہ میں فرمایا ۔

دَعَا مَا ادَّعَتْهُ النَّصَارَىٰ فِي نَبِيِّهِمْ

وَاحْكُمُ بِمَا شِئْتَ مَدْحًا فِيهِ وَاحْتِكُم

”یعنی اس کلمہ کفر کو تو چھوڑ دو جو نصاریٰ نے اپنے نبی کے بارے میں کہہ دیا (کہ وہ معاذ اللہ خود خدا، یا

خدا کے بیٹے ہیں) اس کے سوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثنا میں جو کچھ کہو وہ سب حق و صحیح ہے۔“

جس کا خلاصہ کسی نے ایک مصرع میں اس طرح بیان کر دیا ۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر [۱]

عمل اور عبادت میں اعتدال

اعتقاد کے بعد عمل اور عبادت کا نمبر ہے، اس میں ملاحظہ فرمائیے پچھلی اُمّتوں میں ایک طرف تو یہ نظر آئے گا کہ اپنی شریعت کے احکام کو چند ٹکوں کے بدلے فروخت کیا جاتا ہے، رشوتیں لے کر آسمانی کتاب میں ترمیم کی جاتی ہے، یا غلط فتوے دیئے جاتے ہیں، اور طرح طرح کے حیلے بہانے کر کے شرعی احکام کو بدلا جاتا ہے، عبادت سے پیچھا چھڑایا جاتا ہے، اور دوسری طرف عبادت خانوں میں آپ کو ایسے لوگ بھی نظر آئیں گے جنہوں نے ترک دنیا کر کے رہبانیت اختیار کر لی، وہ خدا کی دی ہوئی حلال نعمتوں سے بھی اپنے آپ کو محروم رکھتے اور سختیاں جھیلنے ہی کو عبادت و ثواب سمجھتے ہیں۔

اُمّتِ محمدیہ نے اس کے خلاف ایک طرف رہبانیت کو انسانیت پر ظلم قرار دیا، اور دوسری طرف احکامِ خدا و رسول پر مر مٹنے کا جذبہ پیدا کیا، اور قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کے مالک بن کر دُنیا کو یہ دکھلا دیا کہ دیانت و سیاست میں یا دین و دُنیا میں بیر نہیں، مذہب صرف مسجدوں یا خانقاہوں کے گوشوں کے لئے نہیں آیا بلکہ اس کی حکمرانی بازاروں اور دفاتروں پر بھی ہے، اور وزارتوں اور امارتوں پر بھی، اس نے بادشاہی میں فقیری اور فقیری میں بادشاہی سکھلائی۔

چو فقر اندر لباسِ شاہی آمد

ز تدبیر عبید اللہی آمد [۲]

معاشرتی اور تمدنی اعتدال

اس کے بعد معاشرت اور تمدن کو دیکھئے، تو پچھلی اُمّتوں میں آپ ایک طرف یہ بے اعتدالی دیکھیں گے کہ انسانی

[۱] ترجمہ:- قصہ مختصر یہ ہے کہ خدا کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی بڑے ہیں۔

[۲] ترجمہ:- فقیر شاہانہ انداز میں رہے یہ چیز اللہ تعالیٰ کی عبادت سے پیدا ہوتی ہے۔

حقوق کی کوئی پروا نہیں، حق ناحق کی کوئی بحث نہیں، اپنی اغراض کے خلاف جس کو دیکھا اس کو کچل ڈالنا، قتل کر دینا، لوٹ لینا سب سے بڑا کمال ہے، ایک رئیس کی چراگاہ میں کسی دوسرے کا اونٹ گھس گیا، اور وہاں کچھ نقصان کر دیا تو عرب کی مشہور جنگ حرب بسوس مسلسل سو برس جاری رہی، ہزاروں انسانوں کا خون ہوا، عورتوں کو انسانی حقوق دینا تو کجا زندہ رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی، کہیں بچپن ہی میں ان کو زندہ درگور کر دینے کی رسم تھی، کہیں مردہ شوہروں کے ساتھ سستی کر کے جلا ڈالنے کا رواج تھا، اس کے بالمقابل دوسری طرف یہ سفیہانہ رحم دلی کہ کیڑے مکوڑوں کی ہتھیا کو حرام سمجھیں، جانوروں کے ذبیحہ کو حرام قرار دیں، خدا کے حلال کئے ہوئے جانوروں کے گوشت و پوست سے نفع اٹھانے کو ظلم سمجھیں، اُمتِ محمدیہ اور اس کی شریعت نے ان سب بے اعتدالیوں کا خاتمہ کیا، ایک طرف انسان کو انسان کے حقوق بتلائے، اور نہ صرف صلح و دوستی کے وقت بلکہ عین میدانِ جنگ میں مخالفین کے حقوق کی حفاظت سکھلائی، عورتوں کو مردوں کی طرح حقوق عطا فرمائے، اور دوسری طرف ہر چیز کی حد مقرر فرمائی، جس سے آگے بڑھنے اور پیچھے رہنے کو جرم قرار دیا، اور اپنے حقوق کے معاملہ میں درگزر اور غفو و چشم پوشی کا سبق سکھلایا، دوسروں کے حقوق کا پورا اہتمام کرنے کے آداب سکھلائے۔

اقتصادی اور مالی اعتدال

اس کے بعد دنیا کی ہر قوم و ملت میں سب سے اہم مسئلہ معاشیات اور اقتصادیات کا ہے، اس میں بھی دوسری قوموں اور اُمتوں میں طرح طرح کی بے اعتدالیاں نظر آئیں گی، ایک طرف نظامِ سرمایہ داری ہے جس میں حلال و حرام کی قیود سے اور دوسرے لوگوں کی خوش حالی یا بد حالی سے آنکھیں بند کر کے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کر لینا سب سے بڑی انسانی فضیلت سمجھی جاتی ہے، تو دوسری طرف شخصی اور انفرادی ملکیت ہی کو سرے سے جرم قرار دیا جاتا ہے، اور غور کرنے سے دونوں اقتصادی نظاموں کا حاصل مال و دولت کی پرستش اور اس کو مقصدِ زندگی سمجھنا اور اس کے لئے دوڑ دھوپ ہے۔

اُمتِ محمدیہ اور اس کی شریعت نے اس میں بھی اعتدال کی عجیب و غریب صورت پیدا کی، کہ ایک طرف تو دولت کو مقصدِ زندگی بنانے سے منع فرمایا، اور انسانی عزت و شرافت یا کسی منصب و عہدہ کا مدار اس پر نہیں رکھا، اور دوسری طرف تقسیمِ دولت کے ایسے پاکیزہ اصول مقرر کئے جن سے کوئی انسان ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے، اور کوئی فرد ساری دولت کو نہ سمیٹ لے، قابلِ اشتراک چیزوں کو مشترک اور وقفِ عام رکھا، مخصوص چیزوں میں انفرادی ملکیت کا مکمل احترام کیا، حلال مال کی فضیلت، اس کے رکھنے اور استعمال کرنے کے صحیح طریقے بتلائے، اس کی تفصیل اس قدر طویل ہے کہ ایک مستقل بیان کو چاہتی ہے، اس وقت بطور مثال چند نمونے اعتدال اور بے اعتدالی کے پیش کرنے تھے، اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے جس سے آیتِ مذکورہ کا مضمون واضح ہو گیا کہ اُمتِ محمدیہ کو ایک معتدل اور بہترین اُمت بنایا گیا ہے۔

شہادت کے لئے عدل وثقہ ہونا شرط ہے

لَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ، یعنی اُمتِ محمدیہ کو وسط اور عدل وثقہ اس لئے بنایا گیا کہ یہ شہادت دینے کے قابل ہو جائیں، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص عدل نہیں وہ قابلِ شہادت نہیں، عدل کا ترجمہ ثقہ یعنی قابلِ اعتماد کیا جاتا ہے، اس کی پوری شرائط کتبِ فقہ میں مذکور ہیں۔

اجماع کا حجت ہونا

قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ آیت اجماعِ اُمت کے حجت ہونے پر ایک دلیل ہے کیونکہ جب اس اُمت کو اللہ تعالیٰ نے شہداء قرار دے کر دوسری اُمتوں کے بالمقابل ان کی بات کو حجت بنادیا، تو ثابت ہوا کہ اس اُمت کا اجماع حجت ہے، اور عمل اس پر واجب ہے، اس طرح کہ صحابہ کرامؓ کا اجماع تابعینؒ پر، اور تابعینؒ کا اجماع تبع تابعینؒ پر حجت ہے۔
اور تفسیر مظہری میں ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ اس اُمت کے جو افعال و اعمال متفق علیہ ہیں وہ سب محمود و مقبول ہیں، کیونکہ اگر سب کا اتفاق کسی خطا پر تسلیم کیا جائے تو پھر یہ کہنے کے کوئی معنی نہیں رہتے کہ یہ اُمت وسط اور عدل ہے۔

اور امام جصاصؒ نے فرمایا کہ اس آیت میں اس کی دلیل ہے کہ ہر زمانے کے مسلمانوں کا اجماع معتبر ہے، اجماع کا حجت ہونا صرف قرنِ اول یا کسی خاص زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں، کیونکہ آیت میں پوری اُمت کو خطاب ہے، اور اُمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف وہ نہ تھے جو اُس زمانے میں موجود تھے، بلکہ قیامت تک آنے والی نسلیں جو مسلمان ہیں وہ سب آپ کی اُمت ہیں، تو ہر زمانے کے مسلمان شہداء اللہ ہو گئے، جن کا قول حجت ہے، وہ سب کسی خطا اور غلط پر متفق نہیں ہو سکتے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ

اور نہیں مقرر کیا تھا ہم نے وہ قبلہ کہ جس پر تو پہلے تھا مگر اس واسطے کہ معلوم کریں کہ کون تابع رہے گا رسول کا

۱ تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۲ ص: ۱۵۶

۲ تفسیر المظہری تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۱۳۹

۳ احکام القرآن للجصاص، باب القول فی صحة الإجماع ج: ۱ ص: ۸۸، ۸۹

مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۖ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۚ

اور کون پھر جائے گا اُلٹے پاؤں، اور بے شک یہ بات بھاری ہوئی مگر اُن پر جن کو راہ دکھائی اللہ نے،

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ إِيْمَانَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَّءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿۱۴۳﴾

اور اللہ ایسا نہیں کہ ضائع کرے تمہارا ایمان بے شک اللہ لوگوں پر بہت شفیق نہایت مہربان ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

اور جس قبلے پر تم پہلے کار بند تھے، اُسے ہم نے کسی اور وجہ سے نہیں، بلکہ صرف یہ دیکھنے کے لئے مقرر کیا تھا کہ کون رسول کا حکم مانتا ہے اور کون اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے؟ اور اس میں شک نہیں کہ یہ بات تھی بڑی مشکل، لیکن اُن لوگوں کے لئے (ذرا بھی مشکل نہ ہوئی) جن کو اللہ نے ہدایت دے دی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع کر دے۔ درحقیقت اللہ لوگوں پر بہت شفقت کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ﴿۱۴۳﴾

خلاصہ تفسیر

(اور اصل میں تو شریعت محمدیہ کے لئے ہم نے کعبہ ہی قبلہ تجویز کر رکھا تھا) اور جس سمت قبلہ پر آپ (چند روز قائم) رہ چکے ہیں (یعنی بیت المقدس) وہ تو محض اس (مصلحت کے) لئے تھا کہ ہم کو (ظاہری طور پر بھی) معلوم ہو جاوے کہ (اس کے مقرر ہونے سے یا بدلنے سے یہود اور غیر یہود میں سے) کون تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اختیار کرتا ہے اور کون پیچھے کو ہٹا جاتا ہے (اور نفرت اور مخالفت کرتا ہے، اس امتحان کے لئے اس عارضی قبلہ کو مقرر کیا تھا، پھر اصلی قبلہ سے اس کو منسوخ کر دیا) اور یہ قبلہ کا بدلنا (منحرف لوگوں پر) ہوا بڑا ثقیل (ہاں) مگر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے (سیدھے طریق کی) ہدایت فرمائی ہے (جس کا بیان اُوپر آچکا ہے کہ احکام الہیہ کو بے چون و چرا قبول کر لینا اُن کو کچھ بھی گراں نہیں ہوا، جیسا پہلے اس کو خدا کا حکم سمجھتے تھے، اب اس کو سمجھنے لگے) اور (ہم نے جو کہا ہے کہ بیت المقدس قبلہ غیر اصلی تھا، اس سے کوئی شخص یہ وسوسہ نہ لاوے بس تو جتنی نمازیں اُدھر پڑی ہیں ان میں ثواب بھی کم ملا ہوگا، کیونکہ اصلی قبلہ کی طرف نہ تھیں، سو اس وسوسے کو دل میں نہ لانا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ ایسے نہیں کہ تمہارے ایمان (کے متعلق اعمال مثلاً نماز کے ثواب) کو ضائع (اور ناقص) کر دیں (اور) واقعی اللہ تعالیٰ تو (ایسے) لوگوں پر بہت ہی شفیق (اور) مہربان ہیں (تو ایسے شفیق

مہربان پر یہ گمان کب ہو سکتا ہے، کیونکہ کسی قبلہ کا اصلی یا غیر اصلی ہونا تو ہم ہی جانتے ہیں، تم نے تو دونوں کو ہمارا حکم سمجھ کر قبول کیا، اس لئے ثواب بھی کسی کا کم نہ ہوگا)

معارف مسائل

کعبہ کے قبلہ نماز ہونے کی ابتدا کب ہوئی

اس میں صحابہؓ و تابعینؓ کا اختلاف ہے کہ ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں جب نماز فرض ہوئی اس وقت قبلہ بیت اللہ تھا یا بیت المقدس، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا قول یہ ہے کہ اول ہی سے قبلہ بیت المقدس تھا، جو ہجرت کے بعد بھی سولہ سترہ مہینے تک باقی رہا، اس کے بعد بیت اللہ کو قبلہ بنانے کے احکام نازل ہو گئے، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مکہ مکرمہ میں یہ رہا کہ آپ حجراً سوداً اور رُکنِ یمانی کے درمیان نماز پڑھتے تھے، تاکہ بیت اللہ بھی سامنے رہے اور بیت المقدس کا بھی استقبال ہو جائے، مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد یہ ممکن نہ رہا، اس لئے تحویل قبلہ کا اشتیاق پیدا ہوا۔ (ابن کثیر)

اور دوسرے حضرات نے فرمایا کہ جب نماز فرض ہوئی مکہ مکرمہ میں تو مسلمانوں کا ابتدائی قبلہ بیت اللہ ہی تھا، کیونکہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کا قبلہ بھی بیت اللہ ہی رہا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے، بیت اللہ ہی کی طرف نماز پڑھتے رہے، پھر ہجرت کے بعد آپ کا قبلہ بیت المقدس قرار دے دیا گیا، اور مدینہ منورہ میں سولہ سترہ مہینے آپ نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی، اس کے بعد پھر آپ کا جو پہلا قبلہ تھا یعنی بیت اللہ اسی کی طرف نماز میں توجہ کرنے کا حکم آ گیا۔ تفسیر قرطبی میں بحوالہ ابو عمر و اسی کو اصح القولین قرار دیا ہے، اور حکمت اس کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ مدینہ منورہ میں تشریف لانے کے بعد چونکہ قبائل یہود سے سابقہ پڑا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مانوس کرنے کے لئے انہی کا قبلہ باذن خداوندی اختیار کر لیا، مگر پھر تجربے سے ثابت ہوا کہ یہ لوگ اپنی ہٹ دھرمی سے باز آنے والے نہیں، تو پھر آپ کو اپنے اصلی قبلہ یعنی بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم مل گیا، جو آپ کو اپنے آباء ابراہیم و اسماعیل کا قبلہ ہونے کی وجہ سے طبعاً محبوب تھا۔

اور قرطبی نے ابو العالیہ ریاحیؒ سے نقل کیا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی مسجد کا قبلہ بھی بیت اللہ کی طرف تھا، اور پھر ابو العالیہؒ نے نقل کیا ہے کہ ان کا ایک یہودی سے مناظرہ ہو گیا، یہودی نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کا قبلہ صخرہ بیت المقدس تھا، ابو العالیہؒ نے کہا کہ نہیں، موسیٰ علیہ السلام صخرہ بیت المقدس کے پاس نماز پڑھتے تھے مگر آپ کا رُخ بیت اللہ ہی کی طرف ہوتا تھا، یہودی نے انکار کیا تو ابو العالیہؒ نے کہا کہ اچھا میرے تمہارے جھگڑے کا فیصلہ حضرت صالح علیہ السلام

کی مسجد کر دے گی جو بیت المقدس کے نیچے ایک پہاڑ پر ہے، دیکھا گیا تو اس کا قبلہ بیت اللہ کی طرف تھا۔^[۱] اور جن حضرات نے پہلا قول اختیار کیا ہے ان کے نزدیک حکمت یہ تھی کہ مکہ مکرمہ میں تو مشرکین سے امتیاز اور ان سے مخالفت کا اظہار کرنا تھا، اس لئے ان کا قبلہ چھوڑ کر بیت المقدس کو قبلہ بنا دیا گیا، پھر ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں یہود و نصاریٰ سے امتیاز اور ان کی مخالفت کا اظہار مقصود ہوا تو ان کا قبلہ بدل کر بیت اللہ کو قبلہ بنا دیا گیا، اسی اختلاف اقوال کی بنا پر آیت مذکورہ کی تفسیر میں بھی اختلاف ہو گیا کہ **الْقِبْلَةُ الَّتِي كُنْتُ عَلَيْهَا** سے کیا مراد ہے؟ قول اول کی بنا پر اس سے مراد بیت المقدس ہے، جو آپ کا قبلہ اولیٰ تھا، اور قول ثانی کی بنا پر اس سے مراد کعبہ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ وہی آپ کا پہلا قبلہ تھا۔

اور مفہوم آیت کا دونوں صورتوں میں یہ ہے کہ ہم نے تحویل قبلہ کو آپ کا اتباع کرنے والے مسلمانوں کے لئے ایک امتحان قرار دیا ہے، تاکہ ظاہر طور پر معلوم ہو جائے کہ کون آپ کا صحیح فرمانبردار ہے اور کون اپنی رائے کے پیچھے چلتا ہے، چنانچہ تحویل قبلہ کا حکم نازل ہونے کے بعد بعض ضعیف الایمان، یا وہ جن کے دلوں میں کچھ نفاق تھا، اسلام سے پھر گئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام لگایا کہ یہ تو اپنی قوم کے دین کی طرف پھر گئے۔

بعض احکام متعلقہ

کبھی سنت کو قرآن کے ذریعہ بھی منسوخ کیا جاتا ہے

بہصاؑ نے ”احکام القرآن“^[۲] میں فرمایا کہ قرآن کریم میں کہیں اس کی تصریح نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبل از ہجرت یا بعد ہجرت بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، بلکہ اس کا ثبوت صرف احادیث اور سنت نبویہ ہی سے ہے، تو جو چیز سنت کے ذریعہ ثابت ہوئی تھی اس آیت قرآنی نے اس کو منسوخ کر کے آپ کا قبلہ بیت اللہ کو بنا دیا۔

اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حدیث رسول بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی ہے، اور یہ کہ کچھ احکام وہ بھی ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں، صرف حدیث سے ثابت ہیں، اور قرآن ان کی شرعی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے، کیونکہ اسی آیت کے اخیر میں یہ بھی مذکور ہے کہ جو نمازیں با مر رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف پڑھی گئیں وہ بھی معتبر اور مقبول عند اللہ ہیں۔

[۱] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۲ ص: ۱۵۱

[۲] احکام القرآن للخصاؑص ج: ۱ ص: ۸۶

خبرِ واحد جبکہ قرآنِ قویہ اس کے ثبوت پر موجود ہوں اس سے قرآنی حکم منسوخ سمجھا جاسکتا ہے

بخاری و مسلم اور تمام معتبر کتب حدیث میں متعدد صحابہ کرامؓ کی روایت سے منقول ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تحویلِ قبلہ کا حکم نازل ہوا، اور آپ نے عصر کی نماز جانبِ بیت اللہ پڑھی، (اور بعض روایات میں اس جگہ عصر کے بجائے ظہر مذکور ہے) (ابن کثیر) تو بعض صحابہ کرامؓ یہاں سے نماز پڑھ کر باہر گئے، اور دیکھا کہ قبیلہ بنی سلمہ کے لوگ اپنی مسجد میں حسبِ سابق بیت المقدس کی طرف نماز پڑھ رہے ہیں تو انہوں نے آواز دے کر کہا کہ اب قبلہ بیت اللہ کی طرف ہو گیا ہے، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بجانبِ بیت اللہ نماز پڑھ کر آئے ہیں، ان لوگوں نے درمیانِ نماز ہی اپنا رخ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف پھیر لیا۔ نویلہ بنت مسلم کی روایت میں ہے کہ اس وقت عورتیں جو کچھلی صفوں میں تھیں آگے آگئیں اور مرد جو اگلی صفوں میں تھے پیچھے آگئے، اور جب رخ بیت اللہ کی طرف بدلا گیا تو مردوں کی صفیں آگے اور عورتوں کی پیچھے ہو گئیں۔ (ابن کثیر) [۱]

بنو سلمہ کے لوگوں نے تو ظہر یا عصر ہی سے تحویلِ قبلہ کے حکم پر عمل کر لیا، مگر قباء میں یہ خیراگلے دن صبح کی نماز میں پہنچی، جیسا کہ بخاری و مسلم میں بروایت ابن عمرؓ مذکور ہے، اہلِ قباء نے بھی نماز ہی کے اندر اپنا رخ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف پھیر لیا۔ (ابن کثیر و حصص) [۲]

امام حصصؒ نے یہ متعدد روایات حدیث نقل کر کے فرمایا:-

هَذَا خَبَرٌ صَحِيحٌ مُسْتَفِيزٌ فِي آيِدِي أَهْلِ الْعِلْمِ قَدْ تَلَقَّوْهُ بِالْقُبُولِ فَصَارَ فِي حَيْزِ التَّوَاتُرِ الْمَوْجِبِ لِلْعِلْمِ۔ [۳]

”یعنی یہ حدیث اگرچہ اصل سے خبرِ واحد ہے، مگر قرآنِ قویہ کی وجہ سے اس نے درجہ تواتر کا حاصل کر لیا ہے، جو علم یقین کا موجب ہوتا ہے۔“

مگر حنفیہ اور ان کے متفق فقہاء جن کا ضابطہ یہ ہے کہ خبرِ واحد سے کوئی قطعی حکم منسوخ نہیں ہو سکتا، اُن پر یہ سوال اب بھی باقی رہتا ہے کہ اس حدیث کی شہرت اور تلقی بالقبول تو بعد میں ہوئی، بنو سلمہ اور اہلِ قباء کو تو اچانک ایک ہی آدمی نے

[۱] صحیح البخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب التوجہ نحو القبلة... إلخ ج: ۱ ص: ۵۷ و صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب تحویل القبلة... إلخ ج: ۱ ص: ۲۰۰

[۲] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۳۵۳ و سنن النسائی الکبریٰ رقم الحدیث: ۱۱۰۰۳

[۳] بحوالہ بالا۔

[۴] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۳۶۰

[۵] بحوالہ بالا۔

[۶] احکام القرآن للجصاص ج: ۱ ص: ۸۷

خبر دی تھی، اس وقت اس حدیث کو درجہ شہرت و تواتر حاصل نہیں تھا، انہوں نے اس پر کیسے عمل کر لیا۔ جصاصؒ نے فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ ان حضرات اور سب صحابہؓ کو پہلے سے یہ معلوم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رغبت یہ ہے کہ آپ کا قبلہ بیت اللہ کر دیا جائے، اور آپ اس کے لئے دُعا بھی کر رہے ہیں، اس رغبت و دُعا کی وجہ سے ان حضرات کی نظر میں استقبال بیت المقدس کا حکم آئندہ باقی نہ رہنے کا احتمال ضرور پیدا ہو گیا تھا، اس احتمال کی وجہ سے بقاء قبلہ بیت المقدس ظنی ہو گیا تھا، اس کے منسوخ کرنے کے لئے یہ خبر واحد کافی ہو گئی، ورنہ محض خبر واحد سے کوئی قرآنی قطعی فیصلہ منسوخ ہو جانا معقول نہیں۔

آلہ مکبر الصوت کی آواز پر نماز میں نقل و حرکت کے مفسد نماز نہ ہونے پر استدلال

صحیح بخاری، باب ما جاء في القبلة میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں جو قباء میں تحویل قبلہ کا حکم پہنچنے اور ان لوگوں کے بحالت نماز بیت اللہ کی طرف پھر جانے کا واقعہ ذکر کیا، اس پر علامہ عینی حنفی نے تحریر فرمایا ہے:-

فِيهِ جَوَازُ تَعْلِيمٍ مَنْ لَيْسَ فِي الصَّلَاةِ مَنْ هُوَ فِيهَا - (عمدة القاری ج: ۴ ص: ۱۴۸)

”یعنی اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو شخص نماز میں شریک نہیں وہ کسی نماز پڑھنے والے کو تعلیم و تلقین کر سکتا ہے۔“

نیز علامہ عینی نے دوسری جگہ اس حدیث کے ذیل میں یہ الفاظ لکھے ہیں: ”وَفِيهِ اسْتِمَاعُ الْمُصَلِّي لِكَلَامٍ مَنْ

لَيْسَ فِي الصَّلَاةِ فَلَا يَضُرُّ صَلَاتَهُ (إِلَى) هَكَذَا اسْتَنْبَطَهُ الطَّحَاوِيُّ -“ (عمدة القاری ج: ۱ ص: ۲۴۲)

اور عام فقہائے حنفیہ نے جو خارج صلوة کسی شخص کی اقتدا اور اتباع کو مفسد نماز کہا ہے جو عام متون و شروح حنفیہ میں منقول ہے، اس کا منشا یہ ہے کہ نماز میں غیر اللہ کے امر کا اتباع موجب فساد نماز ہے، لیکن اگر کوئی شخص اتباع امر الہی کا کرے مگر اس اتباع میں کوئی دوسرا شخص واسطہ بن جائے وہ موجب فساد نہیں۔

فقہاء نے جہاں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ کوئی شخص جماعت میں شریک ہونے کے لئے ایسے وقت پہنچے کہ اگلی صف پوری ہو چکی ہے، اب پچھلی صف میں تنہا رہ جاتا ہے تو اس کو چاہئے کہ اگلی صف میں سے کسی آدمی کو پیچھے کھینچ کر اپنے ساتھ ملا لے، اس میں یہی سوال آتا ہے کہ اس کے کہنے سے جو پیچھے آجائے گا وہ نماز میں اتباع امر غیر اللہ کا کرے گا، اس لئے اس کی نماز فاسد ہو جانی چاہئے، لیکن درمختار، باب الإمامة میں اس مسئلے کے متعلق تحریر فرمایا: ”ثُمَّ نُقِلَ تَصْحِيحُهُ عَدَمُ الْفَسَادِ فِي مَسْئَلَةٍ مَنْ جَذِبَ مِنَ الصَّفِّ فَتَأَخَّرَ فَهَلْ ثَمَّ فَرْقٌ فَلْيَحَرَّرْ“ اس پر علامہ طحاویؒ نے تحریر فرمایا: ”لِأَنَّهُ امْتَثَلَ أَمْرَ اللَّهِ“ یعنی اس صورت میں نماز فاسد نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت اس شخص نے آنے والے کے حکم کا

اتباع نہیں کیا، بلکہ امرِ الہی کا اتباع کیا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کو پہنچا ہے، کہ جب ایسی صورت پیش آئے تو اگلی صف والے کو پیچھے آجانا چاہئے۔

اسی طرح شرنبلالیؒ نے شرح وہبانیہ میں اس مسئلہ کا ذکر کر کے پہلے فسادِ نماز کا قول نقل کیا پھر اس کی تردید کی، اس کے الفاظ یہ ہیں: "إِذَا قِيلَ لِمُصَلٍّ تَقَدَّمَ، فَتَقَدَّمَ (إِلَى) فَسَدَتْ صَلَاتُهُ لِأَنَّهُ امْتَثَلَ أَمْرَ غَيْرِ اللَّهِ فِي الصَّلَاةِ، لِأَنَّ امْتِثَالَهُ إِنَّمَا هُوَ لِأَمْرِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَا يَضُرُّ أَهْـ"۔

ان تمام روایات سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی نمازی ایسے شخص کی آواز پر عمل کرے جو اس کے ساتھ نماز میں شریک نہیں تو اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ خود اس شخص کی دلدادگی اور اتباع مقصود ہو تو یہ مفسدِ نماز ہے، لیکن اگر اس نے کوئی حکم شرعی بتلایا اور اس کا اتباع نمازی نے کر لیا تو وہ درحقیقت امرِ الہی کا اتباع ہے، اس لئے مفسدِ نماز نہیں ہوگا، اسی لئے طحاویؒ نے فیصلہ یہی کیا ہے کہ: "أَقُولُ لَوْ قِيلَ بِالتَّفْصِيلِ بَيْنَ كَوْنِهِ امْتِثَالَ أَمْرِ الشَّارِعِ فَلَا تَفْسُدُ وَبَيْنَ كَوْنِهِ امْتِثَالَ أَمْرِ الدَّاخِلِ مُرَاعَاةً لِخَاطِرِهِ مِنْ غَيْرِ نَظَرٍ لِأَمْرِ الشَّارِعِ فَتَفْسُدُ لَكَانَ حَسَنًا۔" (طحاوی علی الدر ج: ۱ ص: ۲۴۶)

اب مسئلہ زیر بحث یعنی آلہ مکبر الصوت کا فیصلہ کر لینا آسان ہو گیا، کیونکہ وہاں اس آلے کے اتباع کا دور دور بھی وہم نہیں ہو سکتا، ظاہر ہے کہ اتباع رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کا ہوتا ہے کہ جب امام رکوع کرے تو رکوع کرو، جب سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو، اس آلے سے صرف یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اب امام رکوع میں گیا، یا سجدہ میں جا رہا ہے، اس علم کے بعد اتباع امام کا کرتا ہے نہ کہ اس آلے کے حکم کا، اور اتباع امام ایک حکمِ الہی ہے۔ اور یہ کلام اس بنیاد پر ہے کہ آلہ مکبر الصوت کی آواز کو عین امام کی آواز نہ مانی جائے بلکہ اس کی نقل و حکایت قرار دیا جائے، اور اہل فن اس کی آواز کو عین آوازِ امام کہتے ہیں، ان کی تحقیق پر تو کوئی اشکال جوازِ صلوٰۃ میں نہیں ہے، اس مسئلہ کی تحقیق پر احقر کا ایک مستقل مفصل رسالہ بھی شائع شدہ ہے اس کو دیکھ لیا جائے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضَيِّعَ إِيمَانَكُمْؕ یہاں اگر ایمان سے مراد اس کے معروف معنی لئے جائیں تو مطلب آیت کا یہ ہے کہ تحویل قبلہ پر جو بعض بیوقوف لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ دین سے منحرف ہو گئے اور ان کا ایمان ہی ضائع ہو گیا، اس کا جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والے نہیں، بے وقوف لوگوں کے کہنے پر کان نہ دھریں۔

اور بعض روایات حدیث اور اقوالِ سلف میں اس جگہ ایمان کی تفسیر نماز سے کی گئی ہے، اور معنی یہ ہیں کہ جو نمازیں سابقہ قبلہ بیت المقدس کی طرف پڑھی گئی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ضائع کرنے والا نہیں، وہ تو صحیح و مقبول ہو چکیں، تحویل قبلہ کے حکم کا پچھلی نمازوں پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔

صحیح بخاری میں بروایت ابن عازبؓ، اور ترمذی میں بروایت ابن عباسؓ منقول ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ بیت اللہ کو بنادیا گیا تو لوگوں نے سوال کیا کہ جو مسلمان اس عرصے میں انتقال کر گئے جبکہ نماز بیت المقدس کی طرف ہوا کرتی تھی، اور بیت اللہ کی طرف نماز پڑھنا ان کو نصیب نہیں ہوا، اُن کا کیا حال ہوگا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں نماز کو ایمان کے لفظ سے تعبیر کر کے واضح کر دیا کہ ان کی نمازیں سب صحیح و مقبول ہو چکی ہیں، ان کے معاملہ میں تحویل قبلہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا ۚ

بے شک ہم دیکھتے ہیں بار بار اٹھنا تیرے منہ کا آسمان کی طرف، سو البتہ پھیریں گے ہم تجھ کو جس قبلہ کی طرف تو راضی ہے،

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ

اب پھیر منہ اپنا طرف مسجد الحرام کے اور جس جگہ تم ہوا کرو پھیرو منہ

شَطْرَهُ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ

اسی کی طرف، اور جن کو ملی ہے کتاب البتہ جانتے ہیں کہ یہی ٹھیک ہے ان کے رب کی طرف سے،

وَمَا لِلَّهِ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴿۱۴۴﴾

اور اللہ بے خبر نہیں اُن کاموں سے جو وہ کرتے ہیں۔

آسان ترجمہ قرآن

(اے پیغمبر!) ہم تمہارے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ ہم تمہارا رخ ضرور اُس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جو تمہیں پسند ہے۔ لو اب اپنا رخ مسجد حرام کی سمت کر لو۔ اور (آئندہ) جہاں کہیں تم ہوا اپنے چہروں کا رخ (نماز پڑھتے ہوئے) اُسی کی طرف رکھا کرو۔ اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ یہی بات حق ہے جو ان کے پروردگار کی طرف سے آئی ہے۔ اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اُس سے غافل نہیں ہے۔ ﴿۱۴۴﴾

خلاصہ تفسیر

(آپ جو دل سے کعبہ کے قبلہ ہونے کی خواہش رکھتے ہیں، اور اُمید و جی میں بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھتے ہیں کہ شاید فرشتہ حکم لے آوے، سو) آپ کے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں (اور چونکہ ہمیں آپ کی خوشی پورا کرنا منظور ہے) اس لئے (ہم وعدہ کرتے ہیں کہ) آپ کو اسی قبلہ کی طرف متوجہ کر دیں گے جو آپ کو پسند ہے (لو پھر ہم حکم ہی دیئے دیتے ہیں کہ) اب سے اپنا چہرہ نماز میں مسجد حرام کی طرف کیا کیجئے اور (یہ حکم صرف آپ کے لئے مخصوص نہیں بلکہ سب لوگ پیغمبر بھی اور اُممتی بھی) جہاں کہیں موجود ہو (خواہ مدینہ منورہ میں یا اور جگہ، یہاں تک کہ خود بیت المقدس میں بھی) اپنے چہروں کو اسی (مسجد حرام) کی طرف کیا کرو (اور اس قبلہ کے مقرر ہونے کے متعلق) یہ اہل کتاب بھی (بالعموم اپنی کتابوں کی پیشین گوئی کی وجہ سے کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ اس طرح ہوگا) یقیناً جانتے ہیں کہ یہ حکم بالکل ٹھیک ہے (اور) ان کے پروردگار ہی کی طرف سے ہے (مگر عناداً مانتے نہیں) اور اللہ تعالیٰ ان کی کارروائیوں سے کچھ بے خبر نہیں ہے۔

معارف و مسائل

اس آیت کے پہلے جملہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اشتیاق کعبہ کا ذکر ہے، اس اشتیاق کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں اور سب میں کوئی تعارض نہیں وہ سب وجوہ ہو سکتی ہیں، مثلاً یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی اور عطاء نبوت سے پہلے اپنی طبیعت و فطرت سے ملتِ ابراہیمی کے تابع کام کرتے تھے، اور نزول وحی کے بعد قرآن نے بھی آپ کی شریعت کو ملتِ ابراہیم کے مطابق قرار دیا، اور حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کا قبلہ بیت اللہ تھا، اس لئے آپ کی دلی خواہش یہی تھی کہ آپ کا اور مسلمانوں کا قبلہ بھی وہی کعبہ بیت اللہ قرار دے دیا جائے۔

یہ وجہ بھی تھی کہ قبائل عرب بھی چونکہ ملتِ ابراہیمی کو کم از کم زبان سے مانتے تھے اور اس کی پیروی کے مدعی تھے، کعبہ کے قبلہ مسلمین ہو جانے سے ان کے اسلام کی طرف مائل ہو جانے کی توقع تھی، اور سابق قبلہ بیت المقدس میں جو موافقتِ اہل کتاب کی توقع کی جاسکتی تھی وہ سولہ سترہ مہینے کے عمل کے بعد منقطع ہو چکی تھی، کیونکہ یہود مدینہ منورہ کو اس کی وجہ سے کوئی اسلام سے قرب ہونے کے بجائے بعد ہی بڑھا تھا۔

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ یعنی کعبہ کو قرار دے دیا جائے، اور چونکہ مقربانِ بارگاہِ الہی انبیاء علیہم السلام اپنی کوئی خواہش اور کوئی درخواست حق تعالیٰ کی بارگاہ میں اُس وقت تک پیش نہیں

کرتے جب تک اُن کو یہ درخواست پیش کرنے کی اجازت کا علم نہ ہو جائے، اس سے سمجھا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دُعا کرنے کی اجازت پہلے مل چکی تھی، اور آپ اس کی دُعا کر رہے تھے اور اس کی قبولیت کے اُمیدوار تھے، اس لئے بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھاتے تھے کہ شاید کوئی فرشتہ حکم لے کر آجائے، آیت مذکورہ میں اس کیفیت کا بیان فرما کر پہلے تو قبولیت دُعا کا وعدہ فرمایا، **فَلَنُؤْتِيَنَّكَ** یعنی ہم آپ کا رُخ اُسی کی طرف پھیر دیں گے جو سمت آپ کو پسند ہے، اس کے فوراً بعد ہی یہ رُخ پھیرنے کا حکم بھی نازل فرمادیا، **قَوْلٍ وَجْهَكَ**، اس طرزِ عمل میں ایک خاص لطف تھا کہ پہلے وعدہ کی خوشی حاصل ہو، پھر ایفاء وعدہ کی خوشی قندِ مکرر ہو جائے۔ (یہ سب مضمون قرطبی، جصاص، مظہری سے لیا گیا ہے) ۱۱۱

مسئلہ استقبالِ قبلہ

یہ تحقیق پہلے آچکی ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کے اعتبار سے تو ساری سمتیں اور ساری جہات برابر ہیں، قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ^۱ (البقرة: ۱۴۲) لیکن مصالحِ اُمت کے لئے بقاضائے حکمت کسی ایک جہت کو تمام دُنیا میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے لئے قبلہ بنا کر سب میں ایک دینی وحدت کا عملی مظاہرہ مقصود تھا، وہ جہت بیت المقدس بھی ہو سکتی تھی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کے مطابق کعبہ کو قبلہ بنانا تجویز کر لیا گیا، اور اسی کا حکم اس آیت میں دیا گیا، اس کا مقتضی یہ تھا کہ اس جگہ ”قَوْلٍ وَجْهَكَ إِلَى الْكَعْبَةِ أَوْ إِلَى بَيْتِ اللَّهِ“ فرمایا جاتا، مگر قرآن حکیم نے یہ عنوان بدل کر **شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ**^۲ کے الفاظ اختیار فرمائے، اس سے کئی اہم مسائل استقبالِ قبلہ کے بارے میں واضح ہو گئے۔

اول یہ کہ اگرچہ اصل قبلہ بیت اللہ ہے جس کو ”کعبہ“ کہا جاتا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اصل بیت اللہ کا استقبال اسی جگہ تک ہو سکتا ہے جہاں تک بیت اللہ نظر آتا ہے، جو لوگ وہاں سے دُور ہیں، اور بیت اللہ اُن کی نظروں سے غائب ہے اگر ان پر یہ پابندی عائد کی جائے کہ عین بیت اللہ کی طرف رُخ کرو تو اس کی تعمیل بہت دُشوار ہو جائے، خاص آلات و حسابات کے ذریعے بھی صحیح سمت کا استخراج دُور کے شہروں میں مشکل اور غیر یقینی ہو جائے، اور شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مدار سہولت و آسانی پر رکھا گیا ہے، اس لئے بجائے بیت اللہ یا کعبہ کے مسجدِ حرام کا لفظ رکھا گیا، جو بہ نسبت بیت اللہ کے بہت زیادہ وسیع رقبے پر مشتمل ہے، اس کی طرف رُخ پھیر لینا دُور دور تک لوگوں کے لئے آسان ہے۔

پھر ایک دوسری سہولت لفظ **شَطْرَ** اختیار کر کے دے دی گئی، ورنہ اس سے مختصر لفظ ”إِلَى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ“ تھا، اس کو چھوڑ کر **شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ**^۳ فرمایا گیا۔ ”شطر“ دو معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک نصفِ شے، دوسرے

سمتِ شے، باتفاقِ مفسرین اس جگہ ”شطر“ سے مراد سمت ہے، تو اس لفظ نے یہ بتلادیا کہ بلادِ بعیدہ میں یہ بھی ضروری نہیں کہ خاص مسجدِ حرام ہی کی طرف ہر ایک کا رخ ہو جائے تو نمازِ درست ہو بلکہ سمتِ مسجدِ حرام کافی ہے۔ (بحرِ محیط)

مثلاً مشرقی ممالک ہندوستان و پاکستان وغیرہ کے لئے جانبِ مغرب مسجدِ حرام کی سمت ہے، تو مغرب کی جانب رخ کر لینے سے استقبالِ قبلہ کا فرض ادا ہو جائے گا، اور چونکہ گرمی، سردی کے موسموں میں سمتِ مغرب میں بھی اختلاف ہوتا رہتا ہے، اس لئے فقہاء رحمہم اللہ نے اس سمت کو سمتِ مغرب و قبلہ قرار دیا ہے جو موسمِ گرما و سرما کی دونوں مغربوں کے درمیان ہے، اور قواعدِ ریاضی کے حساب سے یہ صورت ہوگی کہ مغربِ صیف اور مغربِ شتا کے درمیان ۴۸ ڈگری تک سمتِ قبلہ قرار دی جائے گی، یعنی ۲۴ ڈگری تک بھی اگر دائیں یا بائیں مائل ہو جائے تو سمتِ قبلہ فوت نہیں ہوگی، نمازِ درست ہو جائے گی، ریاضی کی قدیم اور مشہور کتاب شرحِ چغمنی بابِ رابع صفحہ ۶۶ میں دونوں مغربین کا فاصلہ یہی ۴۸ ڈگری قرار دیا ہے۔

سمتِ قبلہ معلوم کرنے کے لئے شرعاً آلاتِ رصدیہ اور حساباتِ ریاضیہ پر مدار نہیں

اس سے اُن لوگوں کی جہالت بھی واضح ہوگئی جنہوں نے ہندوستان و پاکستان کی بہت سی مسجدوں کی سمتِ قبلہ میں معمولی سا فرق دو چار ڈگری کا دیکھ کر یہ فیصلہ کر دیا کہ ان میں نماز نہیں ہوتی، یہ سراسر جہالت ہے، اور بلا وجہ مسلمانوں میں تفریق و انتشار پیدا کرنا ہے۔

شریعتِ اسلامیہ چونکہ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے اور پوری دنیا کے ممالک کے لئے ہے، اس لئے احکامِ شرعیہ کو ہر شعبے میں اتنا آسان رکھا گیا ہے کہ ہر گاؤں، جنگل، پہاڑ، جزیرہ میں بسنے والے مسلمان اس پر اپنے مشاہدہ سے عمل کر سکیں، کسی مرحلے میں حسابات، ریاضی، یا اصطلاح وغیرہ آلات کی ضرورت نہ پڑے، ۴۸ ڈگری تک کی وسیع سمتِ مغرب اہلِ مشرق کا قبلہ ہے، اس میں پانچ دس ڈگری کا فرق ہو بھی جائے تو اس سے نمازوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے اس کی اور وضاحت ہو جاتی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: ”مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ“ (رواہ الترمذی عن ابی ہریرۃ) یعنی مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے، آپ کا یہ ارشاد مدینہ طیبہ والوں کے لئے تھا، کیونکہ ان کا قبلہ مشرق و مغرب کے درمیان جانبِ جنوب واقع تھا، اس حدیث نے گویا شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے لفظ کی تشریح کر دی کہ مسجدِ حرام کی سمت کافی ہے۔ البتہ بناءً مسجد کے وقت اس کی کوشش بہتر ہے کہ ٹھیک بیت اللہ کے رخ سے جتنا قریب ہو سکے وہ کر لیا جائے۔ صحابہؓ و تابعینؓ اور سلف صالحینؓ کا طریقہ تو اس دریافت کے لئے سیدھا

۱ حضرت والد صاحبؒ نے ”جواہر الفقہ“ میں فقہاء کا دوسرا قول ذکر کیا ہے کہ ۴۵ درجے دائیں یا بائیں مائل ہونے سے سمتِ قبلہ فوت نہیں ہوگی۔ محرق

۲ جامع الترمذی، ابواب الصلوٰۃ، باب ما جاء ان بین المشرق والمغرب قیلة ج: ۱ ص: ۷۹

سادہ یہ تھا کہ جس جگہ صحابہ کرامؓ کی بنائی ہوئی کوئی مسجد ہوتی اس سے اس کے قرب و جوار کی مسجدوں کا رخ سیدھا کر لیا، پھر ان کے قرب و جوار کا ان کے ذریعہ، اسی طرح تمام عالم میں مساجد کا رخ تجویز کیا گیا ہے، اس لئے بلادِ بعیدہ میں سمتِ قبلہ معلوم کرنے کا صحیح طریقہ جو سلف سے چلا آتا ہے یہ ہے کہ جن بلاد میں مساجد قدیمہ موجود ہیں ان کا اتباع کیا جائے، کیونکہ اکثر بلاد میں تو حضراتِ صحابہؓ و تابعینؓ نے مساجد کی بنیادیں ڈالی ہیں، اور سمتِ قبلہ متعین فرمائی ہے، اور پھر انہیں دیکھ کر دوسری بستیوں میں مسلمانوں نے اپنی اپنی مساجد بنائی ہیں۔

اس لئے یہ سب مساجدِ مسلمین سمتِ قبلہ معلوم کرنے کے لئے کافی دوانی ہیں، ان میں بلاوجہ شبہاتِ فلسفہ نکالنا شرعاً محمود نہیں، بلکہ مذموم اور موجبِ تشویش ہے، بلکہ بسا اوقات ان تشویشات میں پڑنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ حضراتِ صحابہؓ و تابعینؓ اور عامۃ المسلمین پر بدگمانی ہو جاتی ہے کہ ان کی نمازیں اور قبلہ درست نہیں، حالانکہ یہ باطل محض اور سخت جسارت ہے، آٹھویں صدی ہجری کے مشہور و معروف عالم ابنِ رجب حنبلیؒ اسی بنا پر سمتِ قبلہ میں آلاتِ رصدیہ اور تدقیقاتِ ریاضیہ میں پڑنے کو منع فرماتے ہیں، ولفظہ:-

وَأَمَّا عِلْمُ التَّسْيِيرِ فَإِذَا تَعَلَّمَ مِنْهُ مَا يَحْتَاجُ إِلَيْهِ لِلْإِسْتِهْدَاءِ وَمَعْرِفَةِ الْقِبْلَةِ وَالطَّرِيقِ كَانَ جَائِزًا عِنْدَ الْجُمْهُورِ وَمَا زَادَ عَلَيْهِ فَلَا حَاجَةَ إِلَيْهِ وَهُوَ يُشْغِلُ عَمَّا هُوَ أَهَمُّ مِنْهُ وَرُبَّمَا آدَى التَّدْقِيقُ فِيهِ إِلَى إِسَاءَةِ الظَّنِّ بِمَحَارِبِ الْمُسْلِمِينَ فِي أَمْصَارِهِمْ كَمَا وَقَعَ فِي ذَلِكَ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ هَذَا الْعَمَلِ قَدِيمًا وَحَدِيثًا وَذَلِكَ يُفْضِي إِلَى اعْتِقَادِ خَطَاءِ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِينَ فِي صَلَوَاتِهِمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْصَارِ وَهُوَ بَاطِلٌ وَقَدْ أَنْكَرَ الْإِمَامُ أَحْمَدُ الْإِسْتِدْلَالَ بِالْجُدَى وَقَالَ إِنَّمَا وَرَدَ مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةً۔

”لیکن علمِ تسیر سوا اس قدر حاصل کرنا جمہور کے نزدیک جائز ہے جس سے راہِ یابی اور قبلہ اور راستوں کی شناخت ہو سکے، اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں کہ وہ (یعنی زیادہ سیکھنا) امورِ ضروریہ سے غافل کر دے گا، اور بعض مرتبہ تدقیقاتِ فلکیہ میں پڑنا عامۃ بلادِ اسلامیہ میں جو مسلمانوں کی مسجدیں ہیں ان کے متعلق بدگمانی پیدا کر دیتا ہے، اس فن میں مشغول ہونے والوں کو ہمیشہ اس قسم کے شبہات پیش آتے ہیں، اس سے یہ بھی اعتقاد پیدا ہو گا کہ بہت سے شہروں میں صحابہؓ و تابعینؓ کی نمازیں غلط طریقے پر تھیں، اور یہ بالکل لغو و باطل ہے، امام احمدؒ نے (ستارہ) جدی (جس کو ہمارے بلاد میں ”قطب“ کہتے ہیں) سمتِ قبلہ میں اس سے استدلال کرنے کو منع کیا، اور فرمایا کہ حدیث شریف میں

(صرف) مابین المشرق والمغرب قبلہ آیا ہے، یعنی مشرق و مغرب کے درمیان پوری جہت قبلہ ہے۔“
 اور جن جنگلات یا نوآبادیات وغیرہ میں مساجد قدیمہ موجود نہ ہوں وہاں شرعی طریقہ جو سنت صحابہؓ و تابعینؓ سے ثابت ہے یہ ہے کہ شمس و قمر اور قطب وغیرہ کے مشہور و معروف ذرائع سے اندازہ قائم کر کے سمت قبلہ متعین کر لی جاوے، اگر اس میں معمولی انحراف و میلان بھی رہے تو اس کو نظر انداز کیا جاوے کیونکہ حسب تصریح صاحب بدائع ان بلاد بعیدہ میں تحری اور اندازہ سے قائم کردہ جہت ہی قائم مقام کعبہ کے ہے، اور اسی پر احکام دائر ہیں، جیسے شریعت نے نیند کو قائم مقام خروجِ ریح کا قرار دے کر اسی پر نقض وضو کا حکم کر دیا، یا سفر کو قائم مقام مشقت کا قرار دے کر مطلقاً سفر پر رخصتیں مرتب کر دیں، حقیقت مشقت ہو یا نہ ہو، اسی طرح بلاد بعیدہ میں مشہور و معروف نشانات و علامات کے ذریعے جو سمت قبلہ تحری و اندازہ سے قائم کی جائے گی وہی شرعاً قائم مقام کعبہ کے ہوگی، علامہ بحر العلوم نے ”رسائل الارکان“ میں اسی مضمون کو بالفاظ ذیل بیان کیا ہے:-

وَالشَّرْطُ وَقُوعُ الْمُسَامَاةِ عَلَى حَسَبِ مَا يَرَى الْمُصَلِّي وَنَحْنُ غَيْرُ مَأْمُورِينَ بِالْمُسَامَاةِ
 عَلَى مَا يَحْكُمُ بِهِ الْأَلَاتُ الرَّصْدِيَّةُ وَلِهَذَا افْتَوُوا أَنَّ الْإِنْحِرَافَ الْمُفْسِدَ أَنْ يَتَجَاوَزَ
 الْمَشَارِقَ وَالْمَغَارِبَ۔ (رسائل الأركان ص: ۵۳)

”اور استقبالِ قبلہ میں شرط و ضروری صرف یہ ہے کہ نمازی کی رائے اور اندازے کے موافق کعبہ کے ساتھ مسامتہ (محاذات) واقع ہو جاوے، اور ہم اس کے مکلف نہیں کہ وہ درجہ مسامتہ و محاذات کا پیدا کریں جو آلاتِ رصدیہ کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا ہے، اس لئے عام علماء کا فتویٰ یہ ہے کہ انحرافِ مفسد (صلوٰۃ) وہ ہے جس میں مشرق و مغرب کا تفاوت ہو جاوے۔“
 اس مسئلہ کی مکمل تشریح اور حسابات کے ذریعہ استخراجِ قبلہ کے مختلف طریقے اور ان کی شرعی حیثیت پر مفصل کلام میرے رسالے ”سمت قبلہ“ میں دیکھا جاسکتا ہے۔

وَلَيْنِ اتَّيْتِ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ وَمَا أَنْتَ

اور اگر تو لائے اہل کتاب کے پاس ساری نشانیاں تو بھی نہ مانیں گے تیرے قبلہ کو، اور نہ تو

بِتَابِعِ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعِ قِبْلَةِ بَعْضٍ ۖ وَلَيْنِ اتَّبَعْتَ

مانے اُن کا قبلہ، اور نہ اُن میں ایک ماننا ہے دوسرے کا قبلہ، اور اگر تو چلا

أَهْوَأَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۚ إِنَّكَ إِذًا لِّمِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۱۳۵﴾

ان کی خواہشوں پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بے شک تو بھی ہوا ان بے انصافوں میں۔

آسان ترجمہ قرآن

اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی اگر تم ان کے پاس ہر قسم کی نشانیاں لے آؤ تب بھی یہ تمہارے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے۔ اور نہ تم ان کے قبلے پر عمل کرنے والے ہو، نہ یہ ایک دوسرے کے قبلے پر عمل کرنے والے ہیں۔ اور جو علم تمہارے پاس آچکا ہے اس کے بعد اگر کہیں تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کر لی تو اس صورت میں یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا ﴿۱۳۵﴾

خلاصہ تفسیر

اور (باوجود ان لوگوں کے سب کچھ سمجھنے کے ان کی ضد کی یہ حالت تھی کہ) اگر آپ (ان) اہل کتاب کے سامنے تمام (دنیا بھر کی) دلیلیں (جمع کر کے) پیش کر دیں جب بھی یہ (کبھی) آپ کے قبلے کو قبول نہ کریں اور (ان کی موافقت کی اُمید اس لئے نہ رکھنی چاہئے کہ آپ کا قبلہ بھی منسوخ ہونے والا نہیں، اس لئے) آپ بھی اُن کے قبلے کو قبول نہیں کر سکتے، (پس کوئی صورت موافقت کی باقی نہیں رہی) اور (جیسا ان اہل کتاب کو آپ سے ضد ہے، ان میں باہم بھی موافقت نہیں کیونکہ) ان کا کوئی (فریق) بھی دوسرے (فریق) کے قبلے کو قبول نہیں کرتا، (مثلاً یہود نے بیت المقدس لے رکھا تھا اور نصاریٰ نے مشرق کی سمت کو قبلہ بنا رکھا تھا) اور (خدا نخواستہ آپ تو کسی طرح اُن کے قبلے منسوخ نہ غیر مشروعہ کو لے ہی نہیں سکتے، کیونکہ) اگر آپ ان کے (ان) نفسانی خیالات کو (گو وہ اصل میں حکم آسمانی رہے ہوں لیکن اب بوجہ منسوخ ہونے کے ان پر عمل کرنا محض نفسانی تعصب ہے، سو اگر آپ ایسے خیالات کو) اختیار کر لیں (اور وہ بھی) آپ کے پاس علم (قطعی یعنی وحی) آئے پیچھے، تو یقیناً آپ (نعوذ باللہ) ظالموں میں شمار ہونے لگیں، (جو کہ تارکینِ حکم ہیں، اور آپ کا ظالم ہونا بوجہ معصوم ہونے کے محال ہے، اس لئے یہ بھی محال ہے کہ آپ ان کے خیالات کو جن میں سے ان کا قبلہ بھی ہے قبول کر لیں)۔

معارف مسائل

وَمَا أَنتَ بِتَابِعٍ قَبْلَتَهُمْ ۚ میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب قیامت تک کے لئے آپ کا قبلہ بیت اللہ ہی رہے گا، اس

سے یہود و نصاریٰ کے ان خیالات کا قطع کرنا مقصود تھا کہ مسلمانوں کے قبلہ کو تو کوئی قرار نہیں، پہلے بیت اللہ تھا، پھر بیت المقدس ہو گیا، پھر بیت اللہ ہو گیا، اب بھی ممکن ہے کہ پھر دوبارہ بیت المقدس ہی کو قبلہ بنا لیں۔ (بحر محیط)

وَلَكِنْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ ۖ يَهْدِي اللَّهُ رِسُولَهُ عَلَىٰ سُلُوكٍ مُّسْتَقِيمٍ ۚ وَتَوَقَّعْ كَوْنُ

احتمال نہیں، اور دراصل سنا اُمت محمدیہ کو ہے کہ اس کی خلاف ورزی ایسی چیز ہے کہ خود رسول بھی بفرض محال ایسا کریں تو وہ بھی ظالم قرار پائیں۔

الَّذِينَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ إِنَّا فَتَقْنَاهُمْ ۖ وَإِنَّ فَرِيقًا

جن کو ہم نے دی ہے کتاب پہچانتے ہیں اس کو جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو، اور بے شک ایک فرقہ

مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۖ (۱۳۶) الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا

اُن میں سے چھپاتے ہیں حق کو جان کر۔ حق وہی ہے جو تیرا رب کہے پھر

تَكُونَنَّ مِنَ الْبَاطِلِينَ ۖ (۱۳۷)

تو نہ ہو شک لانے والا۔

آسان ترجمہ قرآن

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو اتنی اچھی طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ اور یقیناً جانو کہ ان میں سے کچھ لوگوں نے حق کو جان بوجھ کر چھپا رکھا ہے۔ (۱۳۶) اور حق وہی ہے جو تمہارے پروردگار کی طرف سے آیا ہے، لہذا شک کرنے والوں میں ہرگز شامل نہ ہو جانا۔ (۱۳۷)

خلاصہ تفسیر

(اس سے پہلی آیت میں اہل کتاب کا قبلہ مسلمین کو دل میں حق جاننے اور زبان سے نہ ماننے کا ذکر تھا، اس آیت میں انہی اہل کتاب کا صاحب قبلہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح دل میں حق جاننے اور زبان سے نہ ماننے کا بیان ہے۔)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب (توراة و انجیل) دی ہے، وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (توراة و انجیل میں آئی ہوئی بشارت کی بنا پر بحیثیت رسالت) ایسا (بے شک و شبہ) پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو (ان کی صورت سے) پہچانتے ہیں (کہ بیٹے کی صورت دیکھ کر کبھی شبہ نہیں ہوتا کہ یہ کون شخص ہے، مگر پہچان کر بھی سب مسلمان نہیں ہوتے، بلکہ بعض تو ایمان لے آئے) اور بعض ان میں سے (ایسے ہیں کہ اس) امر واقعی کو باوجودیکہ خوب جانتے ہیں (مگر) اخفا کرتے ہیں (حالانکہ) یہ امر واقعی من جانب اللہ (ثابت ہو چکا) ہے سو (ایسے امر واقعی ثابت من اللہ میں ہر ہر فرد کو کہا جاسکتا ہے کہ) ہرگز شک و شبہ لانے والوں میں شمار نہ ہونا۔

معارف مسائل

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت رسول پہچاننے کی تشبیہ اپنے بیٹوں کو پہچاننے کے ساتھ دی گئی ہے کہ یہ لوگ جس طرح اپنے بیٹوں کو پوری طرح پہچانتے ہیں، ان میں کبھی شبہ و اشتباہ نہیں ہوتا، اسی طرح توراة و انجیل میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اور آپ کی واضح علامات و نشانات کا ذکر آیا ہے، اس کے ذریعہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یقینی طور سے جانتے پہچانتے ہیں، ان کا انکار محض عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ پوری طرح پہچاننے کے لئے بیٹوں کی مثال دی گئی ہے، ماں باپ کی مثال نہیں دی، حالانکہ آدمی اپنے ماں باپ کو بھی عادتاً خوب پہچانتا ہے، وجہ یہ ہے کہ بیٹوں کی پہچان ماں باپ کی پہچان کی نسبت بہت زیادہ ہے، کیونکہ انسان اپنے بیٹوں کو ابتداءً پیدائش سے اپنے ہاتھوں میں پالتا ہے، اس کے بدن کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہوتا جو ماں باپ کی نظر سے اوجھل رہا ہو، بخلاف ماں باپ کے کہ ان کے اعضاء مستورہ پر اولاد کی کبھی نظر نہیں ہوتی۔

اس بیان سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ یہاں بیٹوں کو بیٹا ہونے کی حیثیت سے پہچانا مراد نہیں، کیونکہ اس کی نسبت تو انسان پر مشتبہ ہو سکتی ہے کہ ممکن ہے کہ بیوی نے خیانت کی ہو اور یہ بیٹا اپنا نہ ہو، بلکہ مراد ان کی شکل و صورت وغیرہ کا پہچانا ہے کہ بیٹائی الواقع اپنا ہو یا نہ ہو، مگر جس کو بحیثیت بیٹے کے انسان پالتا ہے اس کی شکل و صورت کے پہچاننے میں کبھی اشتباہ نہیں ہوتا۔

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۚ أَيْنَ مَا تَكُونُوا

اور ہر کسی کے واسطے ایک جانب ہے یعنی قبلہ کہ وہ منہ کرتا ہے اس طرف، سو تم سبقت کرو نیکیوں میں، جہاں کہیں تم ہو گے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّا جَعَلْنَا لِكُلِّ شَيْءٍ عَدِيرًا ۝ (۱۳۸) وَمِنْ حَيْثُ

کر لائے گا تم کو اکٹھا، بے شک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے۔ اور جس جگہ سے

خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۝ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ

تو نکلے سو منہ کر اپنا مسجد حرام کی طرف اور بے شک یہی حق ہے

مِنْ رَبِّكَ ۝ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ (۱۳۹) وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ

خیرے رب کی طرف سے، اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے۔ اور جہاں سے تو نکلے

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۝ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ

منہ کر اپنا مسجد حرام کی طرف، اور جس جگہ تم ہو کرو منہ کرو

شَطْرَهُ ۝ لَيْسَ لَكُنَّ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ ۝

اسی کی طرف تاکہ نہ رہے لوگوں کو تم سے جھگڑنے کا موقع مگر جو ان میں بے انصاف ہیں،

فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي ۝ وَلَا تَمْنَعَتْكُمْ عَلَيْهِمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝ (۱۴۰)

سو ان سے (یعنی ان کے اعتراضوں سے) نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور اس واسطے کہ کامل کروں تم پر فضل اپنا اور تاکہ تم پاؤ راہ سیدھی۔

آسان ترجمہ قرآن

اور ہر گروہ کی ایک سمت ہے جس کی طرف وہ رخ کرتا ہے۔ لہذا تم نیک کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ تم جہاں بھی ہو گے، اللہ تم سب کو (اپنے پاس) لے آئے گا۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۝ (۱۳۸) اور تم جہاں سے بھی (سفر کے لئے) نکلو، اپنا منہ (نماز کے وقت) مسجد حرام کی طرف کرو۔ اور یقیناً یہی بات حق ہے جو تمہارے پروردگار کی طرف سے آئی ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے بے خبر نہیں ہے۔ ۝ (۱۳۹) اور جہاں سے بھی تم نکلو، اپنا منہ

مسجدِ حرام کی طرف کرو۔ اور تم جہاں کہیں ہو، اپنے چہرے اُسی کی طرف رکھو، تاکہ لوگوں کو تمہارے خلاف حجت بازی کا موقع نہ ملے۔ البتہ اُن میں جو لوگ ظلم کے خوگر ہیں، (وہ کبھی خاموش نہ ہوں گے) سو اُن کا کچھ خوف نہ رکھو، ہاں میرا خوف رکھو، اور تاکہ میں تم پر اپنا انعام مکمل کر دوں، اور تاکہ تم ہدایت حاصل کر لو ①۵۰

خلاصہ تفسیر

اور (دوسری حکمت تحویل قبلہ میں یہ ہے کہ عادتہ اللہ جاری ہے کہ) ہر (مذہب والے) شخص کے واسطے ایک ایک قبلہ رہا ہے، جس کی طرف وہ (عبادت میں) منہ کرتا رہا ہے (چونکہ شریعتِ محمدیہ بھی ایک مستقل دین ہے، اس کا قبلہ بھی ایک خاص ہو گیا، جب حکمت سب پر ظاہر ہو چکی) سو (مسلمانوں) تم (اب اس بحث کو چھوڑ کر اپنے دین کے) نیک کاموں میں آگے بڑھنے کی کوشش کرو (کیونکہ ایک روز اپنے مالک سے سابقہ پڑنا ہے، چنانچہ) تم خواہ کہیں ہو گے (لیکن) اللہ تعالیٰ تم سب کو (اپنے اجلاس میں) حاضر کر دیں گے (اس وقت نیکیوں پر جزا اور اعمالِ بد پر سزا ہوگی اور) بالیقین اللہ تعالیٰ ہر امر پر پوری قدرت رکھتے ہیں، اور (اس حکمت کا مقتضی بھی یہی ہے کہ جس طرح حضر میں کعبہ کی طرف رخ ہوتا ہے، اسی طرح اگر مدینہ سے یا اور کہیں سے) جس جگہ سے بھی (کہیں سفر میں) آپ باہر جاویں تو (بھی) اپنا چہرہ (نماز میں) مسجدِ حرام کی طرف رکھا کیجئے، (غرض حضر و سفر سب حالتوں کا یہی قبلہ ہے) اور (حکم عام قبلہ کا) بالکل حق (اور صحیح) ہے (اور) من جانب اللہ (ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں سے ذرا بے خبر نہیں۔

تحویل قبلہ کی تیسری حکمت

اور (مکرر پھر کہا جاتا ہے کہ) آپ جس جگہ سے بھی (سفر میں) باہر جاویں (اور حضر میں بدرجہ اولیٰ) اپنا چہرہ (نماز میں) مسجدِ حرام کی طرف رکھئے، اور (اسی طرح سب مسلمان بھی سن لیں کہ) تم لوگ جہاں کہیں (موجود) ہو اپنا چہرہ (نماز میں) اُسی (مسجدِ حرام) کی طرف رکھا کرو (اور یہ حکم اس لئے مقرر کیا جاتا ہے) تاکہ (ان مخالف) لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں (اس) گفتگو (کی مجال) نہ رہے، (کہ اگر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وہی نبی موعود آخر الزماں ہوتے تو ان کی علامات میں تو یہ بھی ہے کہ ان کا اصلی قبلہ کعبہ ہوگا، اور یہ تو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے ہیں، یہ تیسری حکمت ہے تحویل قبلہ کی، ہاں) مگر ان میں جو (بالکل ہی) بے انصاف ہیں (وہ اب بھی کٹھ جتنی نکالیں گے، کہ یہ کیسے نبی ہیں جو اتنے نبیوں کے خلاف کعبہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں، لیکن جب ایسے مہمل اعتراضوں سے دین حق کو کوئی ضرر نہیں پہنچ سکا) تو ایسے لوگوں سے (ذرا) اندیشہ نہ کرو (اور ان کے اعتراضوں کے جواب کی فکر میں مت پڑو) اور مجھ سے ڈرتے رہو (کہ میرے احکام

کی مخالفت نہ ہونے پاوے کہ یہی مخالفت البتہ تم کو مضر ہے) اور (ہم نے ان سب احکام مذکورہ پر عمل کرنے کی توفیق بھی دی) تاکہ تم پر جو (کچھ) میرا انعام (اکرام متوجہ) ہے (تم کو آخرت میں داخل بہشت کر کے) اس کی تکمیل کر دوں اور تاکہ (دنیا میں) تم راہ (حق) پر (یعنی اسلام پر قائم رہنے والوں میں) رہو (جس پر وہ تکمیل نعمت مرتب ہوتی ہے)۔

معارف مسائل

تحويل قبلہ کی حکمتیں

مذکورہ آیات میں تحويل قبلہ کے لئے الفاظ: **قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ** ^۱ تین مرتبہ آئے ہیں، اور **وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهُكُمْ شَطْرًا** ^۲ دو مرتبہ، اس تکرار کی ایک عام وجہ تو یہ ہے کہ تحويل قبلہ کا حکم مخالفین کے لئے تو شور و غلب کا ذریعہ تھا ہی، خود مسلمانوں کے لئے بھی عبادات کا ایک عظیم انقلاب تھا، اگر یہ حکم تاکیدات کے ساتھ بہ تکرار نہ لایا جاتا تو قلوب کا اطمینان و سکون آسان نہ ہوتا، اس لئے اس حکم کو بار بار دہرایا گیا، جس میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا کہ یہ تحويل آخری اور قطعی ہے، اب اس کی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔

”بیان القرآن“ کے خلاصہ تفسیر میں جو تطبیق کی صورت لکھی گئی ہے قرطبی نے بھی اس کی ایک ایسی تقریر نقل کی ہے جس سے تکرار محض نہ رہے مثلاً فرمایا کہ پہلی مرتبہ جو حکم آیا: **قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ** ^۱ **وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهُكُمْ شَطْرًا** ^۲ یہ حکم حالت حضر کا ہے کہ جب آپ اپنی جگہ مقیم ہیں تو آپ مسجد حرام کی طرف رخ کیا کریں، اور پھر پوری امت کو اسی کا حکم دیا گیا، اور **وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ** کا مفہوم اس تقریر پر یہ ہوگا کہ اپنے وطن اور شہر میں جس جگہ بھی ہوں استقبال بیت اللہ ہی کا کرنا ہے، یہ حکم صرف مسجد نبوی کے ساتھ مخصوص نہیں۔

پھر دوسری مرتبہ جو انہی الفاظ کے ساتھ حکم آیا اس سے پہلے **وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ** کے الفاظ نے یہ واضح کر دیا کہ یہ حکم وطن سے نکلنے اور سفر کی حالت کے لئے ہے، اور چونکہ سفر کے حالات بھی مختلف ہوتے ہیں، کبھی چند روز کے لئے کسی بستی میں قیام کیا جاتا ہے، کبھی سفر قطع کرنے کا سلسلہ ہوتا ہے، ان دونوں حالتوں کو عام کرنے کے لئے تیسری مرتبہ پھر ان الفاظ کے ساتھ **وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ** کا اضافہ کر کے بتلادیا کہ سفر کی کوئی بھی حالت ہو ہر حال میں استقبال مسجد حرام ہی کا کرنا ہے، اس تیسری مرتبہ کے اعادے کے ساتھ تحويل قبلہ کی ایک حکمت کا بھی جوڑ لگا دیا گیا کہ مخالفین کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ تو راتہ و انجیل کی تصریحات کے مطابق کعبہ ہونا چاہئے، اور یہ رسول کعبہ کے بجائے بیت المقدس کا استقبال کرتے ہیں۔

وَلِكُلٍّ وَّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا۔ وَجْهَةٌ بکسر الواو کے معنی لغوی جس چیز کی طرف رخ کیا جائے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد قبلہ ہے، اور حضرت ابی بن کعب کی قراءت میں اس جگہ وَجْهَةٌ کی بجائے "قِبْلَةٌ" بھی منقول ہے، مراد آیت کی جمہور مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ ہر قوم کا قبلہ جس کی طرف وہ عبادت میں رخ کرتے ہیں مختلف ہے، خواہ من جانب اللہ ان کو ایسا ہی حکم ملا ہے یا انہوں نے خود کوئی جانب مقرر کر لی ہے، بہر حال یہ امر واقعہ ہے کہ مختلف قوموں کے قبلے مختلف ہوتے چلے آئے ہیں، تو اسی حالت میں اگر نبی اُمی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی خاص قبلہ مقرر کر دیا گیا تو انکار و تعجب کی کیا بات ہے۔

مذہبی مسائل میں فضول بحثوں سے اجتناب کی ہدایت

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِؓ اس سے پہلے جملہ میں یہ فرمایا تھا کہ مختلف قوموں کے مختلف قبلے ہیں، کوئی ایک دوسرے کے قبلہ کو تسلیم نہیں کرتا، اس لئے اپنے قبلہ کے حق ہونے پر ان لوگوں سے بحث فضول ہے، اس جملے کا حاصل یہ ہے کہ جب یہ معلوم ہے کہ اس بحث سے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، تو پھر اس فضول بحث کو چھوڑ کر اپنے اصلی کام میں لگ جانا چاہئے، اور وہ کام ہے نیک کاموں میں دوڑ دھوپ اور آگے بڑھنے کی کوشش، اور چونکہ فضول بحثوں میں وقت ضائع کرنا اور مسابقت الی الخیرات میں سستی کرنا، عموماً آخرت سے غفلت کے سبب ہوتے ہیں، جس کو اپنی آخرت اور انجام کی فکر درپیش ہو وہ کبھی فضول بحثوں میں نہیں الجھتا، اپنی منزل طے کرنے کی فکر میں رہتا ہے، اس لئے اگلے جملے میں آخرت کی یاد دلانے کے لئے ارشاد فرمایا: آيْنَ مَا تَكُونُوْا اٰيَاتِ بِكُمْ اللّٰهُ جَمِيْعًاؕ جس کا مطلب یہ ہے کہ بحثوں میں ہارجیت اور لوگوں کے اعتراضات سے بچنے کی فکر سب چند روزہ دنیا کے لئے ہے، اور عنقریب وہ دن آنے والا ہے جس میں اللہ تعالیٰ تمام اقوام عالم کو ایک جگہ جمع کر کے حساب لیں گے، عقل مند کا کام یہ ہے کہ اپنے اوقات اس کی فکر میں صرف کرے۔

عبادات اور نیک اعمال میں بلا وجہ تاخیر کرنا مناسب نہیں، مسارعہ کرنا چاہئے

لفظ فَاسْتَبِقُوا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان کو چاہئے کہ کسی نیک عمل کا جب موقع مل جائے تو اس کے کرنے میں دیر نہ کرے، کیونکہ بعض اوقات اس کے ٹلانے اور تاخیر کرنے سے توفیق سلب ہو جاتی ہے، پھر آدمی کام کر ہی نہیں سکتا، خواہ وہ نماز روزہ ہو یا حج و صدقہ وغیرہ، قرآن کریم میں یہی مضمون سورہ انفال کی آیت میں زیادہ وضاحت سے آیا ہے:-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ؕ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ

الْمَرْءِ وَوَلَدِهِ (الانفال: ۲۴)

”یعنی اے ایمان والو! تم اللہ و رسول کے کہنے کو بجالایا کرو جبکہ رسول تم کو تمہاری زندگی بخش چیز کی طرف بلاتے ہوں، اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ آڑ بن جایا کرتا ہے آدمی کے اور اس کے قلب کے درمیان میں۔“

کیا ہر نماز کا اول وقت میں پڑھنا افضل ہے؟

اس مسابقت فی الخیرات سے بعض فقہاء نے اس پر استدلال کیا ہے کہ ہر نماز کو اول وقت میں پڑھنا افضل ہے، اور وہ روایات حدیث اس کی تائید میں پیش کی ہیں جن میں اول وقت نماز ادا کرنے کی فضیلت آئی ہے۔ امام شافعیؒ کا یہی مذہب ہے، مگر امام اعظم ابوحنیفہ و مالک رحمہما اللہ نے دوسری روایات حدیث کی بنا پر اس معاملے میں تفصیل کی ہے کہ جن نمازوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاخیر کر کے پڑھنے کی تعلیم اپنے قول و عمل سے دی ہے، ان کا اول اور افضل وقت وہی ہے جو ان احادیث میں بیان ہوا ہے، باقی اپنی اصل پر اول وقت میں پڑھی جائیں، مثلاً صحیح بخاری میں بروایت انسؓ عشاء کی نماز کو مؤخر کر کے پڑھنے کی فضیلت مذکور ہے، اور حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عشاء کی تاخیر پسند تھی۔ (قرطبی)

اسی طرح صحیح بخاری و ترمذی میں بروایت ابو ذرؓ منقول ہے کہ ایک سفر میں حضرت بلالؓ نے ظہر کی اذان اول وقت میں دینا چاہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے روکا، اور فرمایا کہ جب وقت ذرا اٹھٹھا ہو جائے اس وقت اذان کہی جائے کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کے آگ سے ہے، مطلب یہ ہے کہ گرمی کے زمانے میں نماز ظہر کو تاخیر سے پڑھنا پسند فرمایا۔

ان روایات کی بنا پر امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ نے فرمایا کہ ان نمازوں میں اول وقت پر عمل کرنے کی صورت یہی ہے کہ جب وقت مستحب ہو جائے تو پھر تاخیر نہ کریں، اور جہاں کوئی تاخیر کا حکم نہیں آیا وہاں بالکل ابتدائے وقت ہی میں نماز پڑھنا افضل ہے جیسے نماز مغرب۔

بہر حال آیت مذکورہ سے یہ بات باتفاق ثابت ہوگئی کہ جب نماز کا وقت آجائے تو بغیر ضرورت شرعیہ یا طبعیہ کے تاخیر کرنا اچھا نہیں، ضرورت شرعیہ تو وہی ہے جو اوپر لکھی گئی کہ بعض نمازوں کی تاخیر کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے، اور ضرورت طبعیہ اپنے ذاتی عوارض بیماری و محتاجی کے سبب تاخیر کرنا، واللہ اعلم۔

۱ صحیح البخاری، کتاب مواقیات الصلوة، باب وقت العشاء... إلخ ج: ۱ ص: ۸۱

۲ تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۲ ص: ۱۶۶

۳ صحیح البخاری، کتاب مواقیات الصلوة، باب الإبراد بالظہر فی شدة الحر ج: ۱ ص: ۷۶ وجامع الترمذی، ابواب الصلوة، باب ما جاء فی تأخیر

الظہر... إلخ ج: ۱ ص: ۴۱

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ

جیسا کہ بھیجا ہم نے تم میں رسول تم ہی میں کا پڑھتا ہے تمہارے آگے آیتیں ہماری اور پاک کرتا ہے تم کو

وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿١٥١﴾

اور سکھلاتا ہے تم کو کتاب اور اس اسرار اور سکھاتا ہے تم کو جو تم نہ جانتے تھے۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿١٥٢﴾

سو تم یاد رکھو مجھ کو، میں یاد رکھوں تم کو، اور احسان مانو میرا اور ناشکری مت کرو۔

آسان ترجمہ قرآن

(یہ انعام ایسا ہی ہے) جیسے ہم نے تمہارے درمیان تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہارے سامنے ہماری آیتوں کی تلاوت کرتا ہے، اور تمہیں پاکیزہ بناتا ہے، اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے ﴿۱۵۱﴾ لہذا مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ اور میرا شکر ادا کرو، اور میری ناشکری نہ کرو۔ ﴿۱۵۲﴾

خلاصہ تفسیر

(یعنی ہم نے کعبہ کو قبلہ مقرر کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک دُعا جو در باب مقبولیت بناء کعبہ تھی اس طرح قبول کی) جس طرح (ان کی دوسری دُعا جو در باب بعثت محمد یہ کے تھی قبول کی کہ) تم لوگوں میں ہم نے ایک (عظیم الشان) رسول کو بھیجا (جو کہ) تم ہی میں سے (ہیں اور وہ) ہماری آیات (و احکام) پڑھ کر تم کو سناتے ہیں اور (خیالات و رسومِ جہالت سے) تمہاری صفائی کرتے رہتے ہیں، اور تم کو کتاب (الہی) اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور تم کو ایسی (مفید) باتیں تعلیم کرتے ہیں جن کی تم کو خبر بھی نہ تھی، (اور نہ کتب سابقہ یا عقل ان کے لئے کافی تھی، اور اس شان کے رسول کے مبعوث ہونے کی ابراہیم علیہ السلام کی دُعا تھی، سو اس کا ظہور ہو گیا) ان (مذکورہ) نعمتوں پر مجھ کو (منعم ہونے کی حیثیت سے) یاد کرو، میں تم کو (عنایت سے) یاد رکھوں گا، اور میری (نعمت کی) شکر گزاری کرو اور (انکارِ نعمت یا ترکِ اطاعت سے) میری ناسپاسی مت کرو۔

معارفِ مسائل

یہاں تک قبلہ کی بحث چلی آرہی تھی، اب اس بحث کو ایسے مضمون پر ختم فرمایا گیا ہے جو اس بحث کی تمہید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام بانی کعبہ کی دُعا میں ضمناً آیا تھا، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اولاد ابراہیم میں ایک خاص شان کے ساتھ مبعوث ہونا، اس میں اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت میں بانی کعبہ کی دُعا کو بھی دخل ہے، اس لئے اگر ان کا قبلہ کعبہ کو بنادیا گیا تو اس میں کوئی تعجب یا انکار کی بات نہیں ہے۔

کَمَا أَمَرْنَا میں حرفِ کاف جو تشبیہ کے لئے آتا ہے اس کی ایک توجیہ تو وہ ہے جو خلاصہ تفسیر سے معلوم ہو چکی ہے، دوسری ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے جس کو قرطبی نے اختیار کیا ہے کہ اس حرفِ کاف کا تعلق بعد کی آیت **فَاذْكُرُونِي** سے ہے، اور معنی یہ ہیں کہ جیسا ہم نے تم پر ایک نعمت قبلہ کی پھر دوسری نعمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی مبذول فرمائی ہے، ایسی ہی نعمت ذکر اللہ بھی ہے، ان سب نعمتوں کا شکر ادا کرو، تاکہ یہ نعمتیں اور زیادہ ہو جائیں۔ قرطبی نے فرمایا کہ **کَمَا أَمَرْنَا** کا ”کاف“ یہاں ایسا ہی ہے جیسے سورہ انفال میں **كَمَا آخُذُ جَكَ** (الانفال: ۵) اور سورہ حجر کے آخر میں **كَمَا أُنْزِلْنَا عَلَى الْمُقْسِبِينَ** (الحجر: ۹۰) آیا ہے۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ ذکر کے اصلی معنی یاد کرنے کے ہیں جس کا تعلق قلب سے ہے، زبان سے ذکر کرنے کو بھی ذکر اس لئے کہا جاتا ہے کہ زبان ترجمانِ قلب ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ذکرِ زبانی وہی معتبر ہے جس کے ساتھ دل میں بھی اللہ کی یاد ہو، مولانا رومیؒ نے اسی کے متعلق فرمایا ہے۔

بر زباں تسبیح در دل گاؤ خر

اِس چنیں تسبیح کے دارد اثر^[۲]

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اگر کوئی شخص زبان سے ذکر و تسبیح میں مشغول ہو مگر اس کا دل حاضرنہ ہو اور ذکر میں نہ لگے تو وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں، حضرت ابو عثمانؒ سے کسی نے ایسی ہی حالت کی شکایت کی کہ ہم زبان سے ذکر کرتے ہیں، مگر قلوب میں اس کی کوئی حلاوت محسوس نہیں کرتے، آپ نے فرمایا: اس پر بھی اللہ کا شکر کرو کہ اس نے تمہارے ایک عضو یعنی زبان کو تو اپنی طاعت میں لگا لیا۔ (قرطبی)^[۳]

[۱] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۲ ص: ۱۷۱

[۲] ترجمہ:- زبان پر تسبیح اور دل میں گائے اور گدھے کا خیال، ایسی تسبیح کیا اثر رکھتی ہے؟

[۳] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۲ ص: ۱۷۱

ذکر اللہ کے فضائل

بے شمار ہیں، اور یہی ایک فضیلت کچھ کم نہیں ہے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد فرماتے ہیں، ابو عثمان نہدیؒ نے کہا کہ میں اس وقت کو جانتا ہوں جس وقت اللہ تعالیٰ ہمیں یاد فرماتے ہیں، لوگوں نے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟ فرمایا: اس لئے کہ قرآن کریم کے وعدے کے مطابق جب کوئی بندہ مؤمن اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اُسے یاد کرتے ہیں، اس لئے سب کو یہ سمجھ لینا آسان ہے کہ جس وقت ہم اللہ کی یاد میں مشغول ہوں گے تو اللہ تعالیٰ بھی یاد فرمائیں گے۔

اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ تم مجھے اطاعت احکام کے ساتھ یاد کرو تو میں تمہیں ثواب اور مغفرت کے ساتھ یاد کروں گا۔ حضرت سعید بن جبیرؒ نے ذکر اللہ کی تفسیر ہی طاعت و فرمانبرداری سے کی ہے، وہ فرماتے ہیں:-
 فَمَنْ لَمْ يُطِعه لَمْ يَذْكُرْهُ وَإِنْ كَثُرَ صَلَوَتُهُ وَتَسْبِيحُهُ
 ”یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی نہ کی، اس نے اللہ کو یاد نہیں کیا، اگرچہ ظاہر میں اس کی نماز اور تسبیح کتنی بھی ہو۔“

ذکر اللہ کی اصل حقیقت

قرطبی نے بحوالہ احکام القرآن ابن خویزہ منذاذ ایک حدیث بھی اس مضمون کی نقل کی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، یعنی اس کے احکام حلال و حرام کا اتباع کیا اس نے اللہ کو یاد کیا، اگرچہ اس کی (نفل) نماز روزہ وغیرہ کم ہوں، اور جس نے احکام خداوندی کی خلاف ورزی کی اس نے اللہ کو بھلا دیا، اگرچہ (بظاہر) اس کی نماز، روزہ، تسبیحات وغیرہ زیادہ ہوں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ نے فرمایا کہ جو شخص حقیقی طور پر اللہ کو یاد کرتا ہے وہ اس کے مقابلے میں ساری چیزوں کو بھول جاتا ہے، اور اس کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ خود اس کے لئے ساری چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں، اور تمام چیزوں کا عوض اس کو عطا کر دیتے ہیں۔

اور حضرت معاذؒ نے فرمایا کہ انسان کا کوئی عمل اس کو خدا تعالیٰ کے عذاب سے نجات دلانے میں ذکر اللہ کے برابر نہیں۔ اور ایک حدیث قدسی بروایت ابو ہریرہؓ میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں، جب تک وہ مجھے یاد کرتا ہے، اور میرے ذکر میں اس کے ہونٹ ہلتے رہیں۔ ذکر اللہ کے فضائل بے شمار ہیں، ان کا مختصر خلاصہ احقر نے اپنے رسالے ”ذکر اللہ“ میں جمع کر دیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿۱۵۳﴾

اے مسلمانو! مدد لو صبر اور نماز سے، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔ بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۱۵۳﴾

رابط

تحویل قبلہ پر جو مخالفین کی طرف سے اعتراض تھا، اس کے دواثر تھے، ایک مذہب اسلام پر کہ اعتراض سے مذہب کی حقانیت میں شبہ پیدا کیا جایا کرتا ہے، اوپر کی آیتوں میں اس اعتراض کا جواب دے کر اس کا اثر کا دفع کرنا مقصود تھا، دوسرا اثر طبائع اہل اسلام پر کہ اعتراض سے بالخصوص جواب دینے کے بعد بھی اس پر بے جا اصرار کرنے سے قلب میں رنج اور صدمہ پیدا ہوتا ہے، آیت آئندہ میں تخفیفِ حزن کا طریقہ کہ صبر و صلوٰۃ ہے، بتلا کر اس دوسرے اثر کو زائل فرماتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو! (طبیعتوں میں غم ہلکا کرنے کے بارے میں) صبر اور نماز سے سہارا (اور مدد) حاصل کرو، بلاشبہ حق تعالیٰ (ہر طرح سے) صبر کرنے والوں کے ساتھ رہتے ہیں، (اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ تو بدرجہ اولیٰ، وجہ یہ کہ نماز سب سے بڑی عبادت ہے، جب صبر میں یہ وعدہ ہے تو نماز جو اس سے بڑھ کر ہے اس میں تو بدرجہ اولیٰ یہ بشارت ہوگی)۔

معارف و مسائل

صبر اور نماز ہر مشکل کا حل اور ہر تکلیف کا علاج ہیں

اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ اس آیت میں یہ ہدایت ہے کہ انسان کی تمام حوائج و ضروریات کے پورا کرنے اور تمام آفات و مصائب اور تکالیف کو دور کرنے کا نسخہ اکسیر و دوز سے مرکب ہے، ایک صبر، دوسرے نماز، اور اس نسخہ کے تمام حوائج اور تمام مصائب کے لئے عام ہونے کی طرف قرآن عظیم نے اس طرح اشارہ کر دیا ہے کہ اسْتَعِينُوا کو عام چھوڑا

ہے، کوئی خاص چیز ذکر نہیں فرمائی کہ فلاں کام میں ان دونوں چیزوں سے مدد حاصل کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ ان سے انسان کی ہر ضرورت میں مدد حاصل کی جاسکتی ہے، تفسیر مظہری میں اس عموم کو واضح کر دیا ہے۔ اب اس دو جزئی نسخے کے دونوں اجزا کو سمجھ لیجئے۔

صبر کی اصل حقیقت

صبر کے اصلی معنی اپنے نفس کو روکنے اور اس پر قابو پانے کے ہیں، قرآن و سنت کی اصطلاح میں صبر کے تین شعبے ہیں، ایک اپنے نفس کو حرام و ناجائز چیزوں سے روکنا، دوسرے طاعات و عبادات کی پابندی پر مجبور کرنا، تیسرے مصائب و آفات پر صبر کرنا، یعنی جو مصیبت آگئی اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھنا، اور اس کے ثواب کا اُمیدوار ہونا، اس کے ساتھ اگر تکلیف و پریشانی کے اظہار کا کوئی کلمہ بھی منہ سے نکل جائے تو وہ صبر کے منافی نہیں۔ (ذکرہ ابن کثیر عن

سعید بن جبیر)

یہ تینوں شعبے صبر کے فرائض میں داخل ہیں، ہر مسلمان پر یہ پابندی عائد ہے کہ تینوں طرح کے صبر کا پابند ہو، عوام کے نزدیک صرف تیسرے شعبے کو تو صبر کہا جاتا ہے، دو شعبے جو صبر کی اصل اور بنیاد ہیں، عام طور پر ان کو صبر میں داخل ہی نہیں سمجھا جاتا۔

قرآن و حدیث کی اصطلاح میں ”صابرین“ انہیں لوگوں کا لقب ہے جو تینوں طرح کے صبر میں ثابت قدم ہوں۔ بعض روایات میں ہے کہ محشر میں ندا کی جائے گی کہ صابرین کہاں ہیں؟ تو وہ لوگ جو تینوں طرح کے صبر پر قائم رہ کر زندگی سے گزرے ہیں وہ کھڑے ہو جائیں گے، اور ان کو بلا حساب جنت میں داخل کی اجازت دے دی جائے گی، ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا کہ آیت قرآن: اِنَّ صَابِرِيں فِي الصُّلُوٰى اَجْرُهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ① (الزمر) سے بھی اس طرف اشارہ ہوتا ہے۔

نماز، دوسرا جز اس نسخے کا جو تمام انسانی ضروریات کو پورا کرنے اور تمام پریشانیوں اور آفتوں سے نجات دلانے میں اکسیر ہے، نماز ہے، صبر کی جو تفسیر ابھی لکھی گئی ہے اس سے معلوم ہو گیا کہ درحقیقت نماز اور تمام عبادات صبر ہی کے جزئیات ہیں، مگر نماز کو جداگانہ بیان اس لئے کر دیا کہ تمام عبادت میں سے نماز ایک ایسی عبادت ہے جو صبر کا مکمل نمونہ ہے، کیونکہ نماز کی حالت میں نفس کو عبادت و طاعت پر مجبوس بھی کیا جاتا ہے، اور تمام معاصی و مکروہات سے بلکہ بہت سے مباحات سے بھی نفس کو بحالت نماز روکا جاتا ہے، اس لئے صبر جس کے معنی نفس کو اپنے قابو میں رکھ کر تمام طاعات کا پیرو اور تمام معاصی سے مجتنب و بیزار بنانا ہے، نماز اس کی ایک عملی تمثیل ہے۔

اس کے علاوہ نماز کو انسان کی تمام حاجات کے پورا کرنے اور تمام آفتوں مصیبتوں سے نجات دلانے میں ایک خاص تاثیر بھی ہے، گو اس کی وجہ اور سبب معلوم نہ ہو، جیسے دواؤں میں بہت سی ادویات کو مؤثر بالخاصہ تسلیم کیا جاتا ہے، یعنی کیفیات حرارت و برودت کے حساب سے جیسے کسی خاص مرض کے ازالہ کے لئے بعض دوائیں بالخاصہ مؤثر ہوتی ہیں، جیسے درِ گردہ کے لئے فرنگی دانہ کو ہاتھ یا منہ میں رکھنا، اور بہت سے امراض کے لئے عود صلیب وغیرہ کو گلے میں ڈالنا مؤثر بالخاصہ ہے، سبب نامعلوم ہے، لوہے کو کھینچنے میں مقناطیس مؤثر بالخاصہ ہے، وجہ معلوم نہیں، اسی طرح نماز تمام انسانی ضروریات کی کفالت اور تمام مصائب سے نجات دلانے میں مؤثر بالخاصہ ہے بشرطیکہ نماز کو نماز کی طرح آداب اور خشوع خضوع کے ساتھ پڑھا جائے۔ ہماری جو نمازیں غیر مؤثر نظر آتی ہیں، اس کا سبب ہمارا قصور ہے کہ نماز کے آداب اور خشوع و خضوع میں کوتاہی ہوتی ہے، ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب کوئی مہم پیش آتی تو نماز کی طرف رجوع فرماتے تھے، اور اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس مہم کو پورا فرمادیتے تھے، حدیث میں ہے:-

إِذَا حَزَبَهُ أَمْرٌ فَرَعَ إِلَى الصَّلَاةِ

”یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی ضرورت پیش آتی تو نماز کی طرف رجوع فرمایا کرتے تھے۔“

صبر اور نماز تمام مشکلات و مصائب سے نجات کا سبب اس لئے ہے کہ صبر سے اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿۱۵۷﴾ اس کلمے میں اس کا راز بتلادیا گیا ہے کہ صبر حل مشکلات اور دفع مصائب کا سبب کیسے بنتا ہے، ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ صبر کے نتیجے میں انسان کو حق تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ جس شخص کے ساتھ رب العزت کی طاقت ہو اس کا کونسا کام رک سکتا ہے اور کونسی مصیبت اس کو عاجز کر سکتی ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ

اور نہ کہو اُن کو جو مارے گئے خدا کی راہ میں کہ مردے ہیں، بلکہ وہ زندے ہیں لیکن

لَا تَشْعُرُونَ ﴿۱۵۸﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ

تم کو خبر نہیں۔ اور البتہ ہم آزمائیں گے تم کو تھوڑے سے ڈر سے اور بھوک سے اور نقصانوں سے

مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۖ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝۱۵۷ الَّذِينَ إِذَا

مالوں کے اور جانوں کے اور میموں کے، اور خوش خبری دے صبر کرنے والوں کو۔ کہ جب

أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ ۖ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝۱۵۸ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ

پہنچے اُن کو مصیبت تو کہیں: ہم تو اللہ ہی کا مال ہیں اور ہم اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں پر

صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝۱۵۹

عنایتیں ہیں اپنے رب کی اور مہربانی اور وہی ہیں سیدھی راہ پر۔

آسان ترجمہ قرآن

اور جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل ہوں ان کو مردہ نہ کہو۔ دراصل وہ زندہ ہیں، مگر تم کو (ان کی زندگی کا) احساس نہیں ہوتا ۝۱۵۷ اور دیکھو ہم تمہیں آزمائیں گے ضرور، (کبھی) خوف سے، اور (کبھی) بھوک سے، اور (کبھی) مال و جان اور بچوں میں کمی کر کے۔ اور جو لوگ (ایسے حالات میں) صبر سے کام لیں اُن کو خوشخبری سنا دو ۝۱۵۸ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ ”ہم سب اللہ ہی کے ہیں، اور ہم کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے“ ۝۱۵۹ یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی طرف سے خصوصی عنایتیں ہیں، اور رحمت ہے۔ اور یہی لوگ ہیں جو ہدایت پر ہیں ۝۱۶۰

رابط

اوپر ایک خاص ناگوار واقعہ میں صبر کی تعلیم اور صابرین کی فضیلت بیان فرمائی تھی، آیات آئندہ میں اور بھی بعض واقعات خلاف طبع کی تفصیل اور اس میں صبر کی ترغیب اور فضیلت بیان فرماتے ہیں، جن میں قتل و قتل مع الکفار کا مضمون مقدم فرماتے ہیں، دو وجہ سے، اول بوجہ اعظم ہونے کے، کہ اعظم پر صبر کرنے والا اصغر پر بدرجہ اولیٰ صبر کرے گا، دوسرے خاص طور پر مناسب مقام ہونے کی وجہ سے، کیونکہ معترضین مذکورین کے ساتھ یہ معاملہ پیش آتا تھا۔

خلاصہ تفسیر

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں (یعنی دین کے واسطے) قتل کئے جاتے ہیں ان (کی ایسی فضیلت ہے کہ ان) کی نسبت

یوں بھی مت کہو کہ وہ (معمولی مردوں کی طرح) مردے ہیں، بلکہ وہ لوگ (ایک ممتاز حیات کے ساتھ) زندہ ہیں، لیکن تم (اپنے موجودہ) حواس سے (اس حیات کا) ادراک نہیں کر سکتے، اور (دیکھو) ہم (صفتِ رضا و تسلیم میں جو کہ مقتضیِ ایمان کا ہے) تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف سے (جو کہ ہجومِ مخالفین یا نزولِ حوادث و شدائد سے پیش آوے) اور (کسی قدر فقر و) فاقہ سے اور (کسی قدر) مال اور جان اور پھلوں کی کمی سے (مثلاً مویشی مر گئے یا کوئی آدمی مر گیا، یا بیمار ہو گیا، یا پھل اور کھیتی کی پیداوار تلف ہو گئی، پس تم صبر کرنا) اور (جو لوگ ان امتحانوں میں پورے اُتر آویں اور مستقل رہیں تو) آپ ایسے صابرین کو بشارتِ سنادیجئے (جن کی یہ عادت ہے) کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ (دل سے سمجھ کر یوں) کہتے ہیں کہ ہم تو (مع مال و اولاد حقیقۃً) اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں (اور مالِ حقیقی کو اپنی ملک میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار حاصل ہے، اس سے مملوک کا تنگ ہونا کیا معنی) اور ہم سب (دُنیا سے) اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جانے والے ہیں (سو یہاں کے نقصانوں کا بدلہ وہاں جا کر مل رہے گا، اور جو مضمون بشارت کا ان کو سنایا جاوے گا وہ یہ ہے کہ) ان لوگوں پر (جدا جدا) خاص خاص رحمتیں بھی ان کے پروردگار کی طرف سے (مبذول) ہوں گی اور (سب پر بالاشتراک) عام رحمت بھی ہوگی، اور یہی لوگ ہیں جن کی (حقیقتِ حال تک) رسائی ہو گئی (کہ حق تعالیٰ کو ہر چیز کا مالک اور نقصان کا تدارک کر دینے والا سمجھ گئے)۔

معارفِ مسائل

شہداء اور انبیاء کی حیاتِ برزخی اور اس کے درجات میں تفاضل

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اسلامی روایات کی رُو سے ہر مرنے والے کو برزخ میں ایک خاص قسم کی حیات ملتی ہے جس سے وہ قبر کے عذاب یا ثواب کو محسوس کرتا ہے، اس میں مؤمن و کافر یا صالح و فاسق میں کوئی تفریق نہیں، لیکن اس حیاتِ برزخی کے مختلف درجات ہیں، ایک درجہ تو سب کو عام اور شامل ہے، کچھ مخصوص درجے انبیاء و صالحین کے لئے مخصوص ہیں، اور ان میں بھی باہمی تفاضل ہے، اس مسئلہ کی تحقیق پر علماء کے مقالات و تحقیقات بے شمار ہیں، لیکن ان میں سے جو بات اقرب الی الکتاب و السنّت ہے اور شبہات سے پاک ہے، اس کو سیدی حکیم الامت تھانویؒ نے ”بیان القرآن“ میں واضح فرما دیا ہے، اس جگہ اسی کو نقل کرنا کافی معلوم ہوا۔

ف:- ایسے مقتول کو جو اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے ”شہید“ کہتے ہیں، اور اس کی نسبت گو یہ کہنا کہ وہ مر گیا صحیح اور جائز ہے، لیکن اس کی موت کو دوسرے مردوں کی سی موت سمجھنے کی ممانعت کی گئی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ بعد مرنے کے گو

برزخی حیات ہر شخص کی رُوح کو حاصل ہے، اور اسی سے جزا و سزا کا ادراک ہوتا ہے، لیکن شہید کو اس حیات میں اور مردوں سے ایک گونہ امتیاز ہے، اور وہ امتیاز یہ ہے کہ اس کی یہ حیات آثار میں اوروں سے قوی ہے، جیسے انگلیوں کے اگلے پورے اور ایڑی، اگرچہ دونوں میں حیات ہے، اور حیات کے آثار بھی دونوں میں موجود ہیں، لیکن انگلیوں کے پوروں میں حیات کے آثار احساس وغیرہ بہ نسبت ایڑی کے زیادہ ہیں، اسی طرح شہداء میں آثار حیات عام مردوں سے بہت زیادہ ہیں، حتیٰ کہ شہید کی اس حیات کی قوت کا ایک اثر برخلاف معمولی مردوں کے اس کے جسد ظاہری تک بھی پہنچا ہے کہ اس کا جسم باوجود مجموعہ گوشت و پوست ہونے کے خاک سے متاثر نہیں ہوتا، اور مثل جسم زندہ کے صحیح سالم رہتا ہے، جیسا کہ احادیث اور مشاہدات شاہد ہیں، پس اس امتیاز کی وجہ سے شہداء کو اُحیاء کہا گیا، اور ان کو دُوسرے اموات کے برابر اموات کہنے کی ممانعت کی گئی، مگر احکام ظاہرہ میں وہ عام مردوں کی طرح ہیں، اُن کی میراث تقسیم ہوتی ہے، اور ان کی بیویاں دُوسروں سے نکاح کر سکتی ہیں، اور یہی حیات ہے جس میں حضرات انبیاء علیہم السلام شہداء سے بھی زیادہ امتیاز اور قوت رکھتے ہیں، یہاں تک کہ سلامت جسم کے علاوہ اس حیات برزخی کے کچھ آثار ظاہری احکام پر بھی پڑتے ہیں، مثلاً ان کی میراث تقسیم نہیں ہوتی، اُن کی ازواج دُوسروں کے نکاح میں نہیں آسکتیں۔

پس اس حیات میں سب سے قوی تر انبیاء علیہم السلام ہیں، پھر شہداء، پھر اور معمولی مردے، البتہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اولیاء و صالحین بھی اس فضیلت میں شہداء کے شریک ہیں، سو مجاہدہ نفس میں مرنے کو بھی معنی شہادت میں داخل سمجھیں گے، اس طور پر وہ بھی شہداء ہو گئے، یا یوں کہا جاوے کہ آیت میں شہداء کی تخصیص عام قرون کے اعتبار سے ہے، شہداء کے ہم رتبہ دُوسرے لوگ صالحین و صدیقین کے اعتبار سے نہیں۔

اور اگر کسی شخص نے کسی شہید کی لاش کو خاک خوردہ پایا ہو تو سمجھ لے کہ ممکن ہے کہ اس کی نیت خالص نہ ہو، جس پر مدار ہے قتل کے شہادت ہونے کا، اور صرف قتل شہادت نہیں ہے، اور اگر فرضاً ایسا شہید خاک خوردہ پایا جاوے جس کا قتل فی سبیل اللہ اور اس کا جامع شرائط شہادت ہونا دلیل قطعی، تو اثر وغیرہ سے ثابت ہو (جس کا شبہ صاحب رُوح المعانی کو ہو گیا ہے) تو اس کی وجہ میں کہا جاوے گا کہ حدیث میں جس چیز کی تصریح ہے وہ یہ کہ انبیاء و شہداء کے جسم کو زمین نہیں کھاتی، یعنی مٹی ان کے جسم کو خراب نہیں کر سکتی، اجزاء ارضیہ مٹی وغیرہ کے علاوہ کسی دُوسری چیز سے ان کے جسم کا متاثر ہو کر فنا ہو جانا پھر بھی ممکن ہے، کیونکہ زمین میں اور بھی بہت سی اقسام اور انواع کی دھاتیں اور ان کے اجزاء اللہ تعالیٰ نے رکھ دیئے ہیں، اگر ان کی وجہ سے کسی شہید کا جسم متاثر ہو جائے تو اس آیت کے منافی نہیں۔

چنانچہ دُوسرے اجسام مرکبہ مثل اسلحہ و ادویہ و اغذیہ و اخلاط و اجسام بسیطہ مثل آب و آتش و باد کی تاثیر انبیاء علیہم السلام کے اجساد میں بھی ثابت ہے، اور شہداء کی حیات بعد الممات انبیاء کی حیات قبل الممات سے اقویٰ نہیں، اور بعض

حصہ ارض میں بعض اجزاء غیر ارضیہ بھی شامل ہو جاتے ہیں، جس طرح دوسرے عناصر میں بھی مختلف عناصر شامل ہو جاتے ہیں، سو اگر ان اجزائے غیر ارضیہ سے ان کے اجساد متاثر ہو جاویں تو اس سے ان احادیث پر اشکال نہیں ہوتا، جن میں حرمت اجساد علی الارض وارد ہے۔

اور ایک جواب یہ ہے کہ امتیاز اجساد شہداء کے لئے یہ کافی ہے کہ دوسری اموات سے زیادہ مدت تک ان کے اجساد خاک سے متاثر نہ ہوں، گو کسی وقت میں ہو جاویں، اور احادیث سے یہی امر مقصود کہا جاوے کہ ان کی محفوظیت اجساد کی خارق عادت ہے، اور خرق عادت کی دونوں صورتیں ہیں، حفظ موبد اور حفظ طویل، اور چونکہ عالم برزخ حواس یعنی آنکھ، کان، ناک، ہاتھ وغیرہ سے مدرک نہیں ہوتا اس لئے **لَا تَشْعُرُونَ** (۱۵۷) فرمایا گیا کہ تم اُن کی حیات کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔

مصائب پر صبر کے آسان کرنے کی خاص تدبیر

ف:- اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بندوں کا امتحان ہوتا ہے، اس کی حقیقت آیت **وَاِذَا بَشُلْ اِبْرٰهٖمَ رَبَّہٗ** (البقرہ: ۱۲۴) کی تفسیر میں گزر چکی ہے، اور حوادث کے واقع ہونے سے پہلے ان کی خبر دے دینے میں یہ فائدہ ہوا کہ صبر آسان ہو جاتا ہے، ورنہ دفعۃً کوئی صدمہ پڑنے سے زیادہ پریشانی ہوتی ہے، اور یہ خطاب ساری اُمت کو ہے تو سب کو سمجھ لینا چاہئے کہ دُنیا دارُ اُخْن ہے (یعنی محنتوں اور تکلیفوں کی جگہ ہے) اس لئے یہاں کے حوادث کو عجیب اور بعید نہ سمجھا جاوے تو بے صبری نہ ہوگی، اور چونکہ یہ لوگ نفسِ عمل صبر میں سب مشترک ہیں، اس لئے اس کا صلہ مشترک تو عام رحمت ہے، جو نفسِ صبر پر موعود ہے، اور چونکہ مقدار اور شان اور خصوصیت ہر صابر کے صبر کی جدا ہے، اس لئے ان خصوصیات کا صلہ جدا جدا خاص عنایتوں سے ہوگا، جو ان خاص خصوصیات پر موعود ہیں، جیسے دُنیا میں مواقعِ انعام پر دعوتِ طعام تو عام ہوتی ہے، پھر روپے اور جوڑے ہر ایک کو علی قدر اُحیثیت والخدمت دیئے جاتے ہیں۔

مصیبت میں اِنَّا لِلّٰہ کو سمجھ کر پڑھا جائے تو تسکینِ قلب کا بہترین علاج ہے

صابرین کی طرف نسبت کر کے جو یہ فرمایا ہے کہ وہ مصیبت کے وقت **اِنَّا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَیْہٖ رٰجِعُونَ** (۱۵۷) کہا کرتے ہیں، حقیقت میں مقصود اس کی تعلیم سے یہ ہے کہ مصیبت والوں کو ایسا کہنا چاہئے، کیونکہ ایسا کہنے میں ثواب بھی بڑا ہے، اور اگر دل سے سمجھ کر یہ الفاظ کہے جائیں تو غم ورنج کے دور کرنے اور قلب کو تسلی دینے کے معاملے میں بھی اکسیر کا حکم رکھتے ہیں۔

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ

بِشَيْءٍ صَفَا أَوْ مَرَوْه نشانوں میں سے ہیں اللہ کی، سو جو کوئی حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ تو کچھ گناہ نہیں

عَلَيْهِ أَنْ يَطُوفَ بِهِمَا ۖ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۖ فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿۱۵۸﴾

اس کو کہ طواف کرے ان دونوں میں، اور جو کوئی اپنی خوشی سے کرے کچھ نیکی تو اللہ قدر دان ہے سب کچھ جاننے والا۔

آسان ترجمہ قرآن

بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانوں میں سے ہیں۔ لہذا جو شخص بھی بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس کے لئے اس بات میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ ان کے درمیان چکر لگائے۔ اور جو شخص خوشی سے کوئی بھلائی کا کام کرے تو اللہ یقیناً قدر دان (اور) جاننے والا ہے ﴿۱۵۸﴾

رابط

آیاتِ مقدمہ میں وَإِذْ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ (البقرة: ۱۲۴) سے دور تک خانہ کعبہ کا مفصل ذکر ہوا ہے جس کے اوّل میں خانہ کعبہ کے جائے عبادت ہونے کا بیان تھا، اور اس کے آگے دُعائے ابراہیمی کی حکایت تھی کہ انہوں نے یہ درخواست کی تھی کہ ہمیں احکامِ مناسک سکھلا دیئے جاویں، اور مناسک میں حج و عمرہ بھی داخل ہے، پس بیت اللہ کا معبد ہونا جیسے اس کے قبلہ نماز بنانے سے ظاہر کیا گیا اسی طرح حج و عمرہ میں بیت اللہ کو مقصد بنا کر اس کی اہمیت کو واضح کیا گیا۔

اب آیتِ آئندہ میں اس کے مقصد حج و عمرہ بننے کے متعلق ایک مضمون کا بیان ہے، وہ یہ کہ صفا و مروہ دو پہاڑیاں مکہ میں ہیں، حج و عمرہ میں کعبہ کا طواف کر کے ان کے درمیان دوڑتے چلتے ہیں، جس کو ”سعی“ کہتے ہیں، چونکہ زمانہ جاہلیت میں بھی یہ سعی ہوتی تھی، اور اس وقت صفا و مروہ پر کچھ مورتیاں رکھی تھیں، اس لئے بعض مسلمانوں کو شبہ پڑ گیا کہ شاید یہ رسوم جاہلیت سے ہو، اور موجبِ گناہ ہو، اور بعض جاہلیت میں بھی اس کو گناہ سمجھتے تھے، ان کو یہ شبہ ہوا کہ شاید اسلام میں بھی گناہ ہو، اللہ تعالیٰ کو یہ شبہ دفع فرمانا مقصود ہے، پس مضمونِ سابق میں کعبہ کے قبلہ نماز ہونے پر اعتراضِ کفار کا دفع کرنا مقصود تھا، اور مضمونِ لاحق میں کعبہ کے مقصد حج و عمرہ ہونے کے متعلق ایک امر یعنی صفا و مروہ کی سعی پر خود مسلمانوں کے شبہ کا ازالہ فرمانا مقصود ہے، یہ وجہ دونوں مضمونوں میں ربط کی ہے۔

خلاصہ تفسیر

(صفا و مروہ کی سعی میں کوئی شبہ نہ کرو، کیونکہ) تحقیقاً صفا اور مروہ (اور ان کے درمیان میں سعی کرنا) من جملہ یادگار (دین) خداوندی ہیں، سو جو شخص حج کرے بیت اللہ کا یا (اس کا) عمرہ کرے اس پر ذرا بھی گناہ نہیں (جیسا تم کو شبہ ہو گیا) ان دونوں کے درمیان (سعی کے معروف طریقے کے مطابق) آمد و رفت کرنے میں (جس کا نام ”سعی“ ہے، اور گناہ کیا بلکہ ثواب ہوتا ہے، کیونکہ یہ سعی تو شرعاً امرِ خیر ہے) اور (ہمارے یہاں کا ضابطہ ہے کہ) جو شخص خوشی سے کوئی امرِ خیر کرے تو حق تعالیٰ (اس کی بڑی) قدر دانی کرتے ہیں (اور اس خیر کرنے والے کی نیت و خلوص) خوب جانتے ہیں (پس اس ضابطے کی رو سے سعی کرنے والے کو بمقدارِ اخلاص ثواب عنایت ہوگا)۔

معارف و مسائل

بعض لغات کی تحقیق

شَعَائِرُ اللّٰہِ شعائر جمع ہے شعیرہ کی، جس کے معنی علامت کے ہیں، ”شعائر اللہ“ سے مراد وہ اعمال ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کی علامتیں قرار دیا ہے۔ ”حج“ کے لغوی معنی قصد کرنے کے ہیں، اور اصطلاح قرآن و سنت میں خاص خانہ کعبہ کا قصد کرنے اور وہاں افعالِ مخصوصہ کے ادا کرنے کو ”حج“ کہا جاتا ہے۔ ”عمرہ“ کے لفظی معنی زیارت کے ہیں، اور اصطلاح شرع میں مسجدِ حرام کی حاضری اور طواف و سعی کو کہا جاتا ہے۔

صفا و مروہ کے درمیان سعی واجب ہے

حج اور عمرہ اور سعی کا طریقہ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، اور یہ سعی امام احمدؒ کے نزدیک سنتِ مستحبہ ہے، اور مالکؒ اور شافعیؒ کے نزدیک فرض ہے، اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے کہ ترک سے ایک بکری ذبح کرنا پڑتی ہے۔ آیتِ مذکورہ کے الفاظ سے یہ شبہ نہ کرنا چاہئے کہ اس آیت میں تو صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کے متعلق صرف اتنا فرمایا گیا ہے کہ وہ گناہ نہیں، اس سے تو زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوا کہ سعیِ مباحت میں سے ایک مباح ہے، وجہ یہ ہے کہ اس جگہ عنوان **فَلَا جُنَاحَ** کا سوال کی مناسبت سے رکھا گیا ہے، سوال اسی کا تھا کہ صفا و مروہ پر بتوں کی صورتیں رکھی تھیں اور اہلِ جاہلیت انہی کی پوجا پاٹ کے لئے صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے تھے، اس لئے یہ عمل حرام ہونا چاہئے، اس

کے جواب میں فرمایا کہ اس میں کوئی گناہ نہیں، چونکہ یہ دراصل سنتِ ابراہیمی ہے کسی کے جاہلانہ عمل سے کوئی گناہ نہیں ہو جاتا، یہ فرمانا اس کے واجب ہونے کے منافی نہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ ہم نے اُتارے صاف حکم اور ہدایت کی باتیں بعد اس کے کہ ہم ان کو کھول چکے

لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۚ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّعْنُونَ ۝ (۱۵۹)

لوگوں کے واسطے کتاب میں، اُن پر لعنت کرتا ہے اللہ اور لعنت کرتے ہیں اُن پر لعنت کرنے والے۔ مگر

الَّذِينَ تَابُوا وَاصْلَحُوا مِن بَيْنِهِمْ ۚ أُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا

جنہوں نے توبہ کی اور درست کیا اپنے کلام کو اور بیان کر دیا حق بات کو تو اُن کو معاف کرتا ہوں اور میں ہوں

التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ (۱۶۰) إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ

بڑا معاف کرنے والا نہایت مہربان۔ بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور مر گئے کافر ہی

أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝ (۱۶۱) خُلِدَ فِيهَا

انہی پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی۔ ہمیشہ رہیں گے اسی لعنت میں،

لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ۝ (۱۶۲)

نہ ہلکا ہوگا اُن پر سے عذاب اور نہ اُن کو مہلت ملے گی۔

آسان ترجمہ قرآن

بیشک وہ لوگ جو ہماری نازل کی ہوئی روشن دلیلوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں، باوجودیکہ ہم انہیں کتاب میں کھول کھول کر لوگوں کے لئے بیان کر چکے ہیں، تو ایسے لوگوں پر اللہ بھی لعنت بھیجتا ہے اور دوسرے لعنت کرنے والے بھی

لعنت بھیجتے ہیں ﴿۱۵۹﴾ ہاں وہ لوگ جنہوں نے توبہ کر لی ہو اور اپنی اصلاح کر لی ہو اور (چھپائی ہوئی باتوں کو) کھول کھول کر بیان کر دیا ہو تو میں ایسے لوگوں کی توبہ قبول کر لیتا ہوں۔ اور میں توبہ قبول کرنے کا خوگر ہوں، بڑا رحمت والا ﴿۱۶۰﴾ بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور کافر ہونے کی حالت ہی میں مرے، ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور سارے انسانوں کی لعنت ہے ﴿۱۶۱﴾ وہ ہمیشہ اسی پھٹکار میں رہیں گے۔ نہ ان پر سے عذاب کو ہلکا کیا جائے گا، اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی ﴿۱۶۲﴾

رابط

اوپر بحث قبلہ کے ضمن میں صاحب قبلہ کی نبوت کے متعلق اہل کتاب کی حق پوشی کا مضمون مذکور تھا، اس آیت میں اَلَّذِينَ اتَّيَهُمُ الْكِتَابُ يَعْرِفُونَهُ... اِلٰی قَوْلِهِ... لَيَكْتُمُنَّ الْحَقَّ (البقرة: ۱۶۲) آگے اس مضمون کی تکمیل کے واسطے حق کو چھپانے والوں کی اور کتمان حق پر اصرار کرنے والوں کی وعید اور توبہ کرنے پر معافی کا وعدہ ارشاد فرماتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

جو لوگ اخفا کرتے ہیں ان مضامین کا جن کو ہم نے نازل کیا ہے جو کہ (اپنی ذات میں) واضح ہیں اور (دوسروں کے لئے) ہادی ہیں (اور اخفا بھی) اس (حالت) کے بعد کہ ہم ان (مضامین) کو کتاب (الہی توراۃ و انجیل) میں (نازل فرما کر) عام لوگوں پر ظاہر کر چکے ہوں، ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں (کہ اپنی رحمت خاصہ سے اُن کو بعید کر دیتے ہیں) اور (دوسرے بہترے) لعنت کرنے والے بھی (جن کو اس فعل سے نفرت ہے) اُن پر لعنت بھیجتے ہیں (کہ ان پر بددعا کرتے ہیں، ہاں) مگر جو لوگ (ان اخفا کرنے والوں میں اپنی اس حرکت سے) توبہ (یعنی حق تعالیٰ کے روبرو گزشتہ سے معذرت) کر لیں اور (جو کچھ ان کے اس فعل سے خرابی ہو گئی تھی، آئندہ کے لئے اس کی) اصلاح کر دیں (اور اس اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ ان اخفا کئے ہوئے مضامین کو عام طور پر) ظاہر کر دیں (تا کہ سب کو اطلاع ہو جائے اور ان پر لوگوں کو گمراہ کرنے کا بار نہ رہے اور اظہارِ معتبر عند الشریعہ یہ ہے کہ اسلام کو قبول کر لیں، کیونکہ اسلام نہ لانے میں نبوتِ محمدیہ کے متعلق عوام پر بھی حق مخفی رہے گا، وہ یہی سمجھیں گے کہ اگر نبوت حق ہوتی تو یہ کتاب جاننے والے لوگ کیوں نہ ایمان لاتے، خلاصہ یہ کہ یہ لوگ مسلمان ہو جاویں) تو ایسے لوگوں (کے حال) پر میں (عنایت سے) متوجہ ہو جاتا ہوں (اور ان کی خطا معاف کر دیتا ہوں) اور میری تو بکثرت عادت ہے توبہ قبول کر لینا، اور مہربانی فرمانا (کوئی توبہ کرنے والا ہونا چاہئے)، البتہ جو لوگ (ان میں سے) اسلام نہ لاویں، اور اسی حالتِ غیرِ اسلام پر مر جاویں ایسے لوگوں پر (وہ) لعنت (مذکورہ) اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں اور آدمیوں کی بھی سب کی (ایسے طور پر برسا کرے گی کہ) وہ ہمیشہ ہمیشہ کو اسی (لعنت) میں رہیں گے (حاصل یہ کہ وہ جہنم میں ہمیشہ کے لئے داخل ہوں گے، اور ہمیشہ کا جہنم میں رہنے والا ہمیشہ ہی خدا کی خاص

رحمت سے دُور بھی رہے گا، اور ہمیشہ ملعون رہنا یہی ہے، اور ہمیشگی لعنت کے ساتھ یہ بھی ہے کہ داخل ہونے کے بعد کسی وقت (ان) پر سے (جہنم کا) عذاب ہلکا (بھی) نہ ہونے پاوے گا اور نہ (داخل ہونے کے قبل) ان کو (کسی میعاد تک) مہلت دی جاوے گی (کیونکہ میعاد اس وقت دی جاتی ہے جبکہ مقدمے میں گنجائش ہو، اور گنجائش نہ ہونے پر اوّل ہی پیشی میں حکم سزا ہو جاتا ہے)۔

معارف مسائل

علم دین کا اظہار اور پھیلا نا واجب اور اس کا چھپانا سخت حرام ہے

آیت مذکورہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایات و بینات نازل کی گئی ہیں ان کا لوگوں سے چھپانا اتنا بڑا جرم عظیم ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت کرتے ہیں اور تمام مخلوق لعنت بھیجتی ہے، اس سے چند احکام حاصل ہوئے:-

اوّل یہ کہ جس علم کے اظہار اور پھیلانے کی ضرورت ہے اس کا چھپانا حرام ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

مَنْ سِئِلَ عَنْ عِلْمٍ يَعْلَمُهُ فَكْتَمَهُ الْجَمْعُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُلْجِمُ مِنَ النَّارِ۔

(رواہ ابو ہریرۃ و عمرو بن العاص، أخرجه ابن ماجہ۔ از قرطبی)

”یعنی جو شخص دین کے کسی حکم کا علم رکھتا ہے اور اس سے وہ حکم دریافت کیا جائے، اگر وہ اس کو چھپائے گا تو قیامت کے روز اس کے منہ میں اللہ تعالیٰ آگ کا لگام ڈالیں گے۔“

حضرات فقہاء نے فرمایا کہ یہ وعید اس صورت میں ہے جبکہ اس کے سوا کوئی دوسرا آدمی مسئلہ کا بیان کرنے والا وہاں موجود نہ ہو، اور اگر دوسرے علماء بھی موجود ہوں تو گنجائش ہے کہ یہ کہہ دے کہ دوسرے علماء سے دریافت کر لو۔ (قرطبی، حصّاص) دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوئی کہ جس کو خود صحیح علم حاصل نہیں اس کو مسائل و احکام بتانے کی جرات نہیں کرنا چاہئے۔

تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ علم کو چھپانے کی یہ سخت وعید انہیں علوم و مسائل کے متعلق ہے جو قرآن و سنت میں واضح بیان کئے گئے ہیں اور جن کے ظاہر کرنے اور پھیلانے کی ضرورت ہے وہ باریک اور دقیق مسائل جو عوام نہ سمجھ سکیں بلکہ خطرہ ہو کہ وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے تو ایسے مسائل و احکام کا عوام کے سامنے بیان نہ کرنا ہی بہتر ہے، اور وہ کتمانِ علم

کے حکم میں نہیں ہے، آیت مذکورہ میں لفظ **مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَى** سے اسی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، ایسے ہی مسائل کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ تم اگر عوام کو ایسی حدیثیں سناؤ گے جن کو وہ پوری طرح نہ سمجھ سکیں تو ان کو فتنہ میں مبتلا کر دو گے۔ (قرطبی) [۱]

اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا کہ عام لوگوں کے سامنے صرف اتنے ہی علم کا اظہار کرو جس کو ان کی عقل و فہم برداشت کر سکے، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کریں، کیونکہ جو بات ان کی سمجھ سے باہر ہوگی، ان کے دلوں میں اس سے شبہات و خدشات پیدا ہوں گے، اور ممکن ہے کہ اس سے انکار کر بیٹھیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ عالم کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ مخاطب کے حالات کا اندازہ لگا کر کلام کرے، جس شخص کے غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو اس کے سامنے ایسے مسائل بیان ہی نہ کرے، اسی لئے حضرات فقہاء بہت سے مسائل کے بیان کے بعد لکھ دیتے ہیں: ”هَذَا مِمَّا يُعْرِفُ وَلَا يُعْرِفُ“ یعنی یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اہل علم کو خود تو سمجھ لینا چاہئے مگر عوام میں پھیلا نا نہیں چاہئے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لَا تَمْنَعُوا الْحِكْمَةَ أَهْلَهَا فَتَظْلِمُوهُمْ وَلَا تَضَعُوهَا فِي غَيْرِ أَهْلِهَا فَتَظْلِمُوَهَا۔

”یعنی حکمت کی بات کو ایسے لوگوں سے نہ روکو جو اس بات کے اہل ہوں، اگر تم نے ایسا کیا تو ان لوگوں پر ظلم ہوگا، اور جو اہل نہیں ہیں ان کے سامنے حکمت کی باتیں نہ رکھو، کیونکہ اس صورت میں اس حکمت پر ظلم ہوگا۔“

امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کسی کافر کو جو مسلمانوں کے مقابلہ میں مناظرے کرتا ہو، یا کوئی متبدع گمراہ جو لوگوں کو اپنے غلط خیالات کی طرف دعوت دیتا ہو اس کو علم دین سیکھانا اُس وقت تک جائز نہیں جب تک یہ ظن غالب نہ ہو جائے کہ علم سکھانے سے اس کے خیالات درست ہو جائیں گے۔

اسی طرح کسی بادشاہ یا حاکم وقت کو ایسے مسائل بتلانا جن کے ذریعے وہ رعیت پر ظلم کرنے کا راستہ نکال لیں جائز نہیں، اسی طرح عوام کے سامنے احکام دین میں رخصتیں اور حیلوں کی صورتیں بلا ضرورت بیان نہ کرنا چاہئے، جس کی وجہ سے وہ احکام دین پر عمل کرنے میں حیلہ جوئی کے عادی بن جائیں۔ (قرطبی)

[۱] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۲ ص: ۱۸۳

[۲] صحیح البخاری، کتاب العلم، باب من خص بالعلم قوما دون قوم... إلخ ج: ۱ ص: ۲۴

حدیث رسول بھی قرآن کے حکم میں ہے

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر قرآن کی یہ آیت نہ ہوتی تو میں تم سے کوئی حدیث بیان نہ کرتا۔ آیت سے مراد یہی آیت ہے جس میں کتمانِ علم پر لعنت کی وعید شدید مذکور ہے، ایسے ہی بعض دوسرے صحابہؓ نے بھی بعض روایات حدیث کے ذکر کرنے کے ساتھ ایسے ہی الفاظ فرمائے کہ اگر قرآن کریم کی یہ آیت کتمانِ علم کے بارے میں نہ ہوتی تو میں یہ حدیث بیان نہ کرتا۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کے نزدیک حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم قرآن ہی کے حکم میں ہے، کیونکہ آیت میں تو کتمان کی وعید ان لوگوں کے لئے آئی ہے جو قرآن میں نازل شدہ ہدایات و بینات کو چھپائیں، اس میں حدیث کا صراحتہ ذکر نہیں، لیکن صحابہ کرامؓ نے حدیثِ رسول کو بھی قرآن ہی کے حکم میں سمجھ کر اس کے اخفا کرنے کو اس وعید کا سبب سمجھا۔

بعض گناہوں کا وبال ایسا ہوتا ہے کہ اس پر ساری مخلوق لعنت کرتی ہے

وَيَلْعَنُهُمُ اللَّعْنُونَ ﴿۱۵۹﴾ میں قرآن کریم نے لعنت کرنے والوں کو متعین نہیں کیا کہ کون لوگ لعنت کرتے ہیں، امام تفسیر مجاہدؒ اور عکرمہؒ نے فرمایا کہ اس عدم تعین سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ دنیا کی ہر چیز اور ہر مخلوق ان پر لعنت کرتی ہے، یہاں تک کہ تمام جانور اور حشرات الارض بھی ان پر لعنت کرتے ہیں، کیونکہ ان کی بد اعمالی سے ان سب مخلوقات کو نقصان پہنچتا ہے، حضرت براء بن عازبؓ کی حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللَّعْنُونَ سے مراد تمام زمین پر چلنے والے جانور ہیں۔ (قرطبی، بحوالہ ابن ماجہ باسناد حسن) ﴿۱۶۰﴾

کسی معین شخص پر لعنت اس وقت تک جائز نہیں

جب تک اس کے کفر پر مرنے کا یقین نہ ہو

وَمَا تَزَاوَاهُمْ كُفَّارًا کے لفظ سے بھصاؒ اور قرطبیؒ وغیرہ نے یہ استنباط کیا ہے کہ جس کافر کے کفر کی حالت میں مرنے کا یقین نہ ہو اس پر لعنت کرنا جائز نہیں، اور چونکہ ہمیں کسی شخص کے خاتمے کا یقینی علم ہونے کا اب کوئی ذریعہ نہیں، اس لئے کسی کافر کا نام لے کر اس پر لعنت کرنا جائز نہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کافروں پر نام لے کر لعنت کی ہے آپ کو ان کی موت علی الکفر کا منجانب اللہ علم ہو گیا تھا، البتہ عام کافروں، ظالموں پر بغیر تعین کے لعنت کرنا درست ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جب لعنت کا معاملہ اتنا شدید ہے کہ کسی کافر پر بھی اُس وقت تک جائز نہیں جب تک اس کا یقین نہ ہو جائے کہ اس کی موت کفر ہی پر ہوگی، تو کسی مسلمان پر یا کسی جانور پر لعنت کیسے جائز ہو سکتی ہے، اور عوام اس سے بالکل غفلت میں ہیں، خصوصاً عورتیں کہ بات بات پر لعنت کے الفاظ اپنے متعلقین کے متعلق استعمال کرتی رہتی ہیں، اور لعنت صرف لفظ ”لعنت“ ہی کے کہنے سے نہیں ہوتی، بلکہ اس کے ہم معنی جو الفاظ ہیں وہ بھی لعنت ہی کے حکم میں ہیں۔ لعنت کے اصلی معنی خدا تعالیٰ کی رحمت سے دُور کرنے کے ہیں، اس لئے کسی کو مردود، راندہ درگاہ، اللہ مارا وغیرہ کے الفاظ کہنا بھی لعنت ہی کے حکم میں ہے۔

وَالْهُكْمُ إِلَهُ وَاحِدٌ ۚ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ۝۱۳۳

اور معبود تم سب کا ایک ہی معبود ہے، کوئی معبود نہیں اس کے سوا، بڑا مہربان ہے نہایت رحم والا۔ بے شک

فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي

آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے بدلتے رہنے میں اور کشتیوں میں جو کہ لے کر

تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ

چلتی ہیں دریا میں لوگوں کے کام کی چیزیں اور پانی میں جس کو کہ اُتارا اللہ نے آسمان سے

فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ ۝۱۳۴

پھر جلایا اس سے زمین کو اس کے مر گئے پیچھے اور پھیلانے میں سب قسم کے جانور

وَتَصْرِيفِ الرِّيْحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ

اور ہواؤں کے بدلنے میں اور بادل میں جو کہ تابعدار ہے اس کے حکم کا درمیان آسمان و زمین کے،

لَا يَتَّبِعُونَ لَآيَاتِ الْقَوْمِ يَعْقِلُونَ ۝۱۳۵

بے شک اُن سب چیزوں میں نشانیاں ہیں عقل مندوں کے لئے۔

آسان ترجمہ قرآن

تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے۔ اُس کے سوا کوئی خدا نہیں جو سب پر مہربان، بہت مہربان ہے۔ ﴿۱۶۴﴾ بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں، رات دن کے لگاتار آنے جانے میں، اُن کشتیوں میں جو لوگوں کے فائدے کا سامان لے کر سمندر میں تیرتی ہیں، اُس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اُتارا اور اس کے ذریعے زمین کو اُس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشی اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے، اور ہواؤں کی گردش میں، اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع دار بن کر کام میں لگے ہوئے ہیں، اُن لوگوں کے لئے نشانیاں ہی نشانیاں ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ ﴿۱۶۴﴾

رابط

مشرکین عرب نے جو آیت **وَاللَّهُمَّ إِلَهٌ وَاحِدٌ** اپنے عقیدہ کے خلاف سنی تو تعجب سے کہنے لگے کہ کہیں سارے جہان کا ایک معبود بھی ہو سکتا ہے، اور اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو کوئی دلیل پیش کرنا چاہئے، حق تعالیٰ آگے دلیل بیان فرماتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اور (ایسا معبود) جو تم سب کے معبود بننے کا مستحق وہ تو ایک ہی معبود (حقیقی) ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی رحمن ہے، رحیم ہے، (اور کوئی ان صفات میں کامل نہیں، اور بدون کمال صفات معبودیت کا استحقاق باطل ہے، پس بجز معبود حقیقی کے کوئی اور مستحق عبادت نہ ہوا) بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے میں اور جہازوں (کے چلنے) میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں آدمیوں کے نفع کی چیزیں (اور اسباب) لے کر، اور (بارش کے) پانی میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے برسایا، پھر اس (پانی) سے زمین کو تروتازہ کیا، اس کے خشک ہوئے پیچھے (یعنی اس میں نباتات پیدا کئے) اور (ان نباتات سے) ہر قسم کے حیوانات اس (زمین) میں پھیلا دیئے (کیونکہ حیوانات کی زندگی اور تولید و تناسل اسی غذائے بناتی کی بدولت ہے) اور ہواؤں کی (سمتیں اور کیفیتیں) بدلنے میں (کہ کبھی پروا ہے، کبھی پچھوا ہوا، کبھی گرم ہے کبھی سرد) اور اُبر (کے وجود) میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقید (اور معلق) رہتا ہے (ان تمام چیزوں میں) دلائل (توحید کے موجود ہیں) ان لوگوں کے (استدلال کے) لئے جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں۔

معارفِ مسائل

توحید کا وسیع مفہوم

وَالْهَلْکُمُ الْاِلٰهُ وَاحِدٌ اللہ تعالیٰ کی توحید متعدد اور مختلف حیثیتوں سے ثابت ہے، مثلاً وہ ایک ہے، یعنی کائنات میں کوئی اس کی نظیر و شبیہ نہیں، نہ کوئی اس کا ہمسر و برابر ہے، اس لئے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو واحد کہا جائے۔ دوسرے یہ کہ وہ ایک ہے استحقاقِ عبادت میں، یعنی اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ ایک ہے یعنی ذی اجزاء نہیں، وہ اجزاء و اعضاء سے پاک ہے، نہ اس کا تجزیہ اور تقسیم ہو سکتی ہے۔ چوتھے یہ کہ وہ ایک ہے، یعنی اپنے وجودِ ازلِ ابدی میں ایک ہے، وہ اس وقت بھی موجود تھا جب کوئی چیز موجود نہ تھی، اور اُس وقت بھی موجود رہے گا جب کوئی چیز موجود نہ رہے گی، اس لئے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو واحد کہا جائے، لفظ واحد میں یہ تمام حیثیتیں توحید کی ملحوظ ہیں۔ (بصا ص)

اس کے بعد حق تعالیٰ کے واحد حقیقی ہونے پر تکوینی علامات و دلائل بتلائے گئے ہیں جن کو ہر عالم و جاہل سمجھ سکتا ہے کہ آسمان و زمین کی تخلیق اور رات دن کے دائمی انقلاب اس کی قدرتِ کاملہ اور توحید کے واضح دلائل ہیں کہ ان چیزوں کی پیدائش اور بقا میں کسی دوسری ہستی کا کوئی دخل نہیں۔

اسی طرح پانی پر کشتیوں کا چلنا ایک بڑی آیتِ قدرت ہے، کہ پانی کو حق تعالیٰ نے ایسا جوہر سیال بنا دیا کہ رقیق اور سیال ہونے کے باوجود اس کی پیٹھ پر لاکھوں من وزن کے جہاز بڑے بڑے وزن کو لے کر مشرق سے مغرب تک منتقل کر دیتے ہیں، اور ان کو حرکت میں لانے کے لئے ہواؤں کا چلانا اور پھر اپنی حکمت کے ساتھ ان کے رخ بدلتے رہنا یہ سب اس کا پتہ دیتے ہیں کہ ان چیزوں کا پیدا کرنے والا اور چلانے والا کوئی بڑا علیم وخبیر اور حکیم ہے۔ اگر پانی کا مادہ سیال نہ ہو تو یہ کام نہیں ہو سکتا، اور مادہ سیال بھی ہو تو جب تک ہوائیں نہ چلیں جو ان جہازوں کو حرکت میں لاتی ہیں، جہازوں کا لمبی لمبی مسافتیں طے کرنا ممکن نہیں، قرآن کریم نے اسی مضمون کو فرمایا:-

اِنْ يَّشَاءِ يُسْكِنِ الْوَيْحَ وَيُظَلِّكُنَّ رَاۤىدًا عَلٰى ظَهْرٍ ؕ (الشوریٰ: ۳۳)

”اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو ہواؤں کو ساکن کر دیں، اور یہ جہاز سمندر کی پشت پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں۔“

بِسَائِفِ النَّاسِ کے لفظ میں اشارہ کر دیا گیا کہ بحری جہازوں کے ذریعہ ایک ملک کا سامان دوسرے ملک میں درآمد و برآمد کرنے کے ذریعہ عام انسانوں کے بے شمار فائدے ہیں جن کو شمار بھی نہیں کیا جاسکتا، اور یہ فائدے ہر زمانے،

ہر ملک میں نئی نئی صورتیں پیدا کر دیتے ہیں۔

اسی طرح آسمان سے پانی کو قطرہ قطرہ کر کے اس طرح نازل کرنا کہ اس سے کسی چیز کو نقصان نہ پہنچے، اگر سیلاب کی طرح آتا تو کوئی آدمی، جانور، سامان کچھ نہ رہتا، پھر پانی برسنے کے بعد اس کا زمین پر محفوظ رکھنا، انسان کے بس کا نہیں، اگر کہہ دیا جاتا کہ چھ مہینے کے پانی کا کوٹہ اپنا اپنا ہر شخص رکھ لے، تو ہر شخص اس کے رکھنے کا کیا انتظام کرتا، اور کسی طرح رکھ بھی لیتا تو اس کو سڑنے اور خراب ہو جانے سے کیسے بچاتا، قدرت نے یہ سب انتظامات خود فرمادیے، ارشاد فرمایا:-

فَاسْكُنْهُمْ فِي الْأَرْضِ ۖ وَإِنَّا عَلَىٰ ذَهَابِهِمْ لَقَدِيرُونَ ﴿۱۸﴾ (المؤمنون)

”یعنی ہم نے ہی پانی کو زمین کے اندر ٹھہرا دیا، اگرچہ ہمیں اس کی بھی قدرت تھی کہ بارش کا پانی برسنے کے بعد بہہ کر ختم ہو جاتا۔“

مگر قدرت نے پانی کو اہل زمین انسان اور جانوروں کے لئے کہیں کھلے طور پر تالابوں اور حوضوں میں جمع کر دیا، کہیں پہاڑوں کی زمین میں پھیلی ہوئی رگوں کے ذریعہ زمین کے اندر اتار دیا، اور پھر ایک غیر محسوس پائپ لائن ساری زمین میں بچھادی، ہر شخص جہاں چاہے کھود کر پانی نکال لیتا ہے، اور اسی پانی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ بحر منجمد بنا کر برف کی صورت میں پہاڑوں کے اوپر لاد دیا، جو سڑنے اور خراب ہونے سے بھی محفوظ ہے، اور آہستہ آہستہ پگھل کر زمین کے اندر قدرتی پائپ لائن کے ذریعے پورے عالم میں پہنچتا ہے، غرض آیت مذکورہ میں قدرت کا ملکہ کے چند مظاہر کا بیان کر کے توحید کو ثابت کیا گیا، علمائے مفسرین نے ان تمام چیزوں پر تفصیلی بحث کی ہے، دیکھئے حصّاص، قرطبی وغیرہ۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ ط

اور بعضے لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اللہ کے برابر اوروں کو، ان کی محبت ایسے رکھتے ہیں جیسے محبت اللہ کی،

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ ط وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرُونَ

اور ایمان والوں کو ان سے زیادہ تر ہے محبت اللہ کی، اور اگر دیکھ لیں یہ ظالم اس وقت کو جبکہ دیکھیں گے

الْعَذَابَ لَا أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۖ وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ ﴿۱۷۵﴾

عذاب کہ قوت ساری اللہ ہی کے لئے ہے اور یہ کہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

اور (اس کے باوجود) لوگوں میں کچھ وہ بھی ہیں جو اللہ کے علاوہ دوسروں کو اس کی خدائی میں اس طرح شریک قرار دیتے ہیں کہ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسے اللہ کی محبت (رکھنی چاہئے)۔ اور جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں۔ اور کاش کہ یہ ظالم جب (دُنیا میں) کوئی تکلیف دیکھتے ہیں اُسی وقت یہ سمجھ لیا کریں کہ تمام تر طاقت اللہ ہی کو حاصل ہے، اور یہ کہ اللہ کا عذاب (آخرت میں) اُس وقت بڑا سخت ہوگا ﴿۱۶۵﴾

رابط

اوپر کی آیات میں توحید کا اثبات تھا، آگے مشرکین کی غلطی اور وعید کا بیان فرماتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اور ایک آدمی وہ (بھی) ہیں جو علاوہ خدا تعالیٰ کے اوروں کو بھی شریک (خدائی) قرار دیتے ہیں (اور ان کو اپنا کارساز سمجھتے ہیں اور) ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے (رکھنا) ضروری ہے، (یہ حالت تو مشرکین کی ہے) اور جو مؤمن ہیں ان کو (صرف) اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے، (کیونکہ اگر کسی مشرک کو یہ ثابت ہو جاوے کہ میرے معبود سے مجھ پر کوئی ضرر پڑے گا تو فوراً محبت منقطع ہو جاوے، اور جو مؤمن باوجود اس کے کہ نافع و ضار حق تعالیٰ ہی کو اعتقاد کرتا ہے، لیکن پھر بھی محبت و رضا اس کی باقی رہتی ہے، و نیز اکثر مشرکین مصیبتِ شدیدہ کے وقت اپنے شرکاء کو چھوڑ دیتے ہیں، اور مؤمنین من حیث الایمان مصیبت میں بھی خدا کو نہ چھوڑتے تھے، اور محاورات میں ایسے قضایا باعتبار حالتِ عالیہ کے بھی صادق ہوتے ہیں) اور کیا خوب ہوتا اگر یہ ظالم (مشرکین) جب (دُنیا میں) کسی مصیبت کو دیکھتے تو (اس کے وقوع میں غور کر کے) یہ سمجھ لیا کرتے کہ سب قوت حق تعالیٰ ہی کو ہے، (اور دوسرے سب اس کے سامنے عاجز ہیں، چنانچہ اس مصیبت کو نہ کوئی روک سکا نہ ٹال سکا اور نہ ایسے وقت میں اور کوئی یاد رہا) اور (اس مصیبت کی شدت میں غور کر کے) یہ (سمجھ لیا کرتے) کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب (آخرت میں) کہ دار الجزاء ہے اور (بھی) سخت ہوگا، (تو اس طرح غور کرنے سے تراشیدہ معبودوں کا عجز اور حق تعالیٰ کی قدرت و عظمت منکشف ہو کر توحید و ایمان اختیار کر لیتے)۔

اِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوْا الْعَذَابَ

جبکہ بیزار ہو جاویں گے وہ کہ جن کی پیروی کی تھی اُن سے جو کہ اُن کے پیرو ہوئے تھے اور دیکھیں گے عذاب

وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً

اور منقطع ہو جاویں گے ان کے سب علاقے۔ اور کہیں گے پیرو: کیا اچھا ہوتا جو ہم کو دنیا کی طرف لوٹ جانا مل جاتا

فَنَتَّبِرَ أَمْنَهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا ۖ كَذَلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ

تو پھر ہم بھی بیزار ہو جاتے ان سے جیسے یہ ہم سے بیزار ہو گئے، اسی طرح پر دکھلائے گا اللہ ان کو ان کے کام

حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾

حسرت دلانے کو اور وہ ہرگز نکلنے والے نہیں نار سے۔

آسان ترجمہ قرآن

جب وہ (پیشوا) جن کے پیچھے یہ لوگ چلتے رہے ہیں، اپنے پیروکاروں سے مکمل بے تعلقی کا اعلان کریں گے، اور یہ سب لوگ عذاب کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لیں گے، اور ان کے تمام باہمی رشتے کٹ کر رہ جائیں گے ﴿۱۶۶﴾ اور جنہوں نے ان (پیشواؤں) کی پیروی کی تھی وہ کہیں گے کہ کاش ہمیں ایک مرتبہ پھر (دنیا میں) لوٹنے کا موقع دے دیا جائے، تو ہم بھی ان (پیشواؤں) سے اسی طرح بے تعلقی کا اعلان کریں جیسے انہوں نے ہم سے بے تعلقی کا اعلان کیا ہے۔ اس طرح اللہ انہیں دکھا دے گا کہ ان کے اعمال (آج) اُن کے لئے حسرت ہی حسرت بن چکے ہیں، اور اب وہ کسی صورت دوزخ سے نکلنے والے نہیں ہیں ﴿۱۶۷﴾

رابط

اوپر عذابِ آخرت کو سخت فرمایا ہے، آگے اس سختی کی کیفیت کا بیان فرماتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

(وہ سختی عذاب کی اس وقت معلوم ہوگی) جبکہ (ان مشرکین میں سے) وہ (ذی اثر) لوگ جن کے کہنے پر دوسرے (عوام) چلتے تھے، ان (عام) لوگوں سے صاف الگ ہو جاویں گے جو ان کے کہنے پر چلے تھے اور سب (خواص و عوام) عذاب کا مشاہدہ کر لیں گے اور باہم ان میں جو تعلقات تھے (کہ ایک تابع تھا، دوسرا متبوع تھا وغیرہ وغیرہ) اس وقت سب قطع ہو جاویں گے (جیسے دُنیا میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ جرم میں سب شریک و متفق ہوتے ہیں، اور تنقیح مقدمہ کے وقت سب الگ الگ بچنا چاہتے ہیں، حتیٰ کہ باہم دگر شناخت تک کے منکر ہو جاتے ہیں) اور (جب) یہ تابع لوگ (متبوعین کی یہ طوطا چشمی دیکھیں گے تو بڑے جھنجھلاویں گے، اور تو کچھ نہ ہو سکے گا مگر جھلا کر) یوں کہنے لگیں گے: کسی طرح ہم سب کو (دُنیا میں) بس ذرا ایک دفعہ جانا مل جاوے تو ہم بھی ان سے (اتنا بدلہ تو لے لیں کہ اگر یہ پھر ہم کو اپنے تابع ہونے کی ترغیب دیں تو ہم بھی ان سے) صاف (ٹکا سا جواب دے کر) الگ ہو جاویں جیسا یہ ہم سے (اس وقت) صاف الگ ہو بیٹھے (اور کہہ دیں کہ جناب آپ وہی ہیں کہ عین موقع پر بے رُخی کی تھی، اب ہم سے کیا غرض، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان تجویزوں اور سوچ بچاروں سے کیا ہاتھ آوے گا فقط) اللہ تعالیٰ یوں ہی اُن کی بد اعمالیوں کو خالی ارمان (کے پیرائے میں) کر کے ان کو دکھلا دیں گے اور ان (تابعین و متبوعین سب) کو دوزخ سے نکلنا کبھی نصیب نہ ہوگا (کیونکہ شرک کی سزا خلود فی النار ہے)۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ

اے لوگو! کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے حلال پاکیزہ اور پیروی نہ کرو

الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿۱۶۸﴾ إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ

شیطان کی، بے شک وہ تمہارا دشمن ہے صریح۔ وہ تو یہی حکم کرے گا تم کو کہ برے کام اور بے حیائی کرو

وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۱۶۹﴾

اور جھوٹ لگاؤ اللہ پر وہ باتیں جن کو تم نہیں جانتے۔

آسان ترجمہ قرآن

اے لوگو! زمین میں جو حلال پاکیزہ چیزیں ہیں وہ کھاؤ، اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ یقین جانو کہ وہ تمہارے لئے ایک کھلا دشمن ہے ﴿۱۶۸﴾ وہ تو تم کو یہی حکم دے گا کہ تم بدی اور بے حیائی کے کام کرو اور اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاؤ جن کا تمہیں علم نہیں ہے۔ ﴿۱۶۹﴾

خلاصہ تفسیر

(بعض مشرکین بتوں کے نام جانور چھوڑتے تھے، اور ان سے منفع ہونے کو باعتبار عقائد ان کی تعظیم کے حرام سمجھتے تھے اور اپنے اس فعل کو حکم الہی اور موجب رضائے حق و وسیلہ تقرب الی اللہ بواسطہ شفاعت ان بتوں کے سمجھتے تھے، حق تعالیٰ اس باب میں خطاب فرماتے ہیں کہ) اے لوگو! جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے (شرعی) حلال پاک چیزوں (کی نسبت اجازت ہے کہ اُن) کو کھاؤ (برقو) اور (ان میں سے کسی حلال چیز سے یہ سمجھ کر پرہیز کرنا کہ اس سے اللہ راضی ہوگا، یہ سب شیطانی خیالات ہیں تم) شیطان کے قدم بقدم مت چلو، فی الواقع وہ (شیطان) تمہارا صریح دشمن ہے (کہ ایسے ایسے خیالات و جہالات سے تم کو خسرانِ ابدی میں گرفتار کر رکھا ہے اور دشمن ہونے کی وجہ سے) وہ تم کو انہی باتوں کی تعلیم کرے گا جو کہ (شرعاً) بری اور گندی ہیں، اور یہ (بھی تعلیم کرے گا) کہ اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاؤ جن کی تم سند بھی نہیں رکھتے (مثلاً یہی کہ ہم کو خدا تعالیٰ کا اس طرح حکم ہے)۔

معارف و مسائل

حل اللغات

حَلَّالًا طَيِّبًا، لفظ ”حَلَّ“ کے اصلی معنی گرہ کھولنے کے ہیں، جو چیز انسان کے لئے حلال کر دی گئی گویا ایک گرہ کھول دی گئی اور پابندی ہٹا دی گئی۔ حضرت سہل بن عبد اللہؓ فرماتے ہیں کہ نجات تین چیزوں میں منحصر ہے: حلال کھانا، فرائض ادا کرنا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کرنا۔ اور لفظ ”طیب“ کے معنی ہیں پاکیزہ جس میں شرعی حلال ہونا بھی داخل ہے اور طبعی مرغوب ہونا بھی۔

خُطُوب، خطوہ کی جمع ہے، اتنی مقدار کو خطوہ کہتے ہیں جو دونوں قدموں کے درمیان کا فاصلہ ہے، خطواتِ شیطان سے مراد شیطانی اعمال و افعال ہیں۔

بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ، ”سوء“ وہ چیز جس کو دیکھ کر عقل مند شریف آدمی کو دکھ ہو، ”فحشاء“ بے حیائی کا کام۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ ”سوء“ سے مراد مطلق معصیت اور ”فحشاء“ سے مراد کبیرہ گناہ ہے۔ اِنَّمَا يَأْمُرُكُمُ شَيْطَانُكَ اَمْرًا وَرَحْمَةً كَرْنِ سے مراد دل میں وسوسہ ڈالنا ہے، جیسا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدم کے بیٹے کے قلب میں ایک شیطانی الہام واثر ہوتا ہے، اور دوسرا فرشتہ کی طرف سے، شیطانی وسوسہ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ برے کام کرنے کے فوائد اور مصالح سامنے آتی ہیں، اور حق کو جھٹلانے کی راہیں کھلتی ہیں، اور الہام فرشتہ کا اثر خیر اور نیکی پر انعام و فلاح کا وعدہ اور حق کی تصدیق پر قلب کا مطمئن ہونا ہوتا ہے۔^[۱]

مسئلہ:- سائد وغیرہ جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں، یا اور کوئی جانور مرغنا، بکرا وغیرہ کسی بزرگ یا اور کسی غیر اللہ کے نامزد کر دیا جاتا ہے، اس کا حرام ہونا ابھی چار آیتوں کے بعد وَمَا أَهْلُ بِهِ لِيُغَيِّرَ اللَّهُ^۱ (البقرة: ۱۷۳) کے تحت آنے والا ہے۔ اس آیت يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ میں ایسے جانور کے حرام ہونے کی نفی کرنا منظور نہیں، جیسا کہ بعضوں کو شبہ ہو گیا بلکہ مقصد اس فعل کی حرمت و ممانعت ہے کہ غیر اللہ کے تقرب کے لئے جانوروں کو چھوڑ دینا اور اس عمل کو موجب برکت و تقرب سمجھنا، اور ان جانوروں کو اپنے اوپر حرام کر لینے کا معاہدہ کر لینا، اس کو دائمی سمجھنا، یہ سب افعال ناجائز اور ان کا کرنا گناہ ہے۔ تو حاصل مطلب آیت کا یہ ہے کہ جن جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے حلال بنایا ہے ان کو بتوں کے نام کر کے حرام نہ بناؤ، بلکہ اپنی حالت پر چھوڑ کر کھاؤ پیو، اور اگر ایسی حرکت جہالت سے ہو جائے تو اصلاح نیت کے ساتھ تجدید ایمان اور توبہ کر کے اس حرمت کو ختم کرو، اس طرح ان جانوروں کو تعظیماً حرام قرار دینا تو گناہ ہوا، مگر غیر اللہ کے نام پر کر دینے سے یہ مردار اور نجس کے حکم میں ہو گیا، نجاست کی وجہ سے حرمت ثابت ہو گئی۔^[۲]

مسئلہ:- اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص نے جہالت یا غفلت سے کسی جانور کو کسی غیر اللہ کے ساتھ نامزد کر کے چھوڑ دیا تو اس کی توبہ یہی ہے کہ اپنے اس خیال حرمت سے رجوع کرے اور اس فعل سے توبہ کرے، تو پھر اس کا گوشت حلال ہو جائے گا، واللہ اعلم۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اتَّبِعُوا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ

اور جب کوئی ان سے کہے کہ تابعداری کرو اس حکم کی جو کہ نازل فرمایا اللہ نے تو کہتے ہیں: ہرگز نہیں، ہم تو تابعداری کریں گے

[۱] جامع الترمذی، ابواب التفسیر، ومن سورة البقرة ج: ۲ ص: ۱۲۸

[۲] شروع میں حضرت مؤلف قدس سرہ کی رائے یہی تھی جو یہاں مذکور ہے کہ یہ جانور حرام ہو گیا، لیکن بعد میں رائے تبدیل ہوئی، جو آگے صفحہ: ۴۲۳ و ۴۲۴ پر آیت ۱۷۲ کے تحت پر مذکور ہے، اسی کے مطابق حضرت نے ”امداد المفتین“ کے صفحہ: ۹۴۱ پر سوال نمبر ۸۳۵ کے جواب کے آخر میں ”قول مختار“ کے عنوان سے فتویٰ دیا ہے۔

احقر محمد تقی عثمانی ۱۴۳۱/۱/۶ھ

مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ 'إِبَاءَنَا' أَوْ لَوْ كَانَ 'أَبَاؤُهُمْ' لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا

اس کی جس پر دیکھا ہم نے اپنے باپ دادوں کو، بھلا اگرچہ اُن کے باپ دادے نہ سمجھتے ہوں کچھ بھی

وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿۱۷۰﴾ وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ

اور نہ جانتے ہو سیدھی راہ۔ اور مثال اُن کافروں کی ایسی ہے جیسے پکارے کوئی شخص ایسی چیز کو جو کچھ نہ سنے

إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ط صُمُّوكُمْ عَنْهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۱۷۱﴾

سوائے پکارنے اور چلانے کے، بہرے، گونگے، اندھے ہیں، سو وہ کچھ نہیں سمجھتے۔

آسان ترجمہ قرآن

اور جب ان (کافروں) سے کہا جاتا ہے کہ اس کلام کی پیروی کرو جو اللہ نے اُتارا ہے، تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو ان باتوں کی پیروی کریں گے جن پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے۔ بھلا کیا اس صورت میں بھی (ان کو یہی چاہئے) جب ان کے باپ دادے (دین کی) ذرا بھی سمجھ نہ رکھتے ہوں، اور انہوں نے کوئی (آسمانی) ہدایت بھی حاصل نہ کی ہو؟ ﴿۱۷۰﴾ اور جن لوگوں نے کفر کو اپنا لیا ہے ان (کو حق کی دعوت دینے) کی مثال کچھ ایسی ہے جیسے کوئی شخص اُن (جانوروں) کو زور زور سے بلائے جو ہانک پکار کے سوا کچھ نہیں سنتے۔ یہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں، لہذا کچھ نہیں سمجھتے ﴿۱۷۱﴾

خلاصہ تفسیر

اور جب کوئی ان (مشرک) لوگوں سے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم (اپنے پیغمبر کے پاس) بھیجا ہے، اس پر چلو تو (جواب میں) کہتے ہیں (کہ نہیں) بلکہ ہم تو اسی (طریقہ) پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے (کیونکہ وہ لوگ اس طریقہ کے اختیار کرنے میں مامور من اللہ تھے، حق تعالیٰ ان پر رد فرماتے ہیں) کیا (ہر حالت میں یہ لوگ اپنے باپ دادا ہی کے طریقہ پر چلیں گے) اگرچہ اُن کے باپ دادا (دین کی) نہ کچھ سمجھ رکھتے ہوں اور نہ (کسی آسمانی کتاب کی) ہدایت رکھتے ہوں۔

وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي (الِی قولہ) فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۱۷۱﴾ اور ان کافروں کی کیفیت (ناہمی میں) اس

(جانور) کی کیفیت کے مثل ہے (جس کا ذکر اس مثال میں کیا جاتا ہے) کہ ایک شخص ہے وہ ایسے (جانور) کے پیچھے چلا رہا ہے، جو بجز بلانے اور پکارنے کے کوئی (پر مضمون) بات نہیں سنتا (اسی طرح) یہ کفار (بھی ظاہری بات چیت تو سنتے ہیں، لیکن کام کی بات سے بالکل) بہرے ہیں (گویا سنا ہی نہیں) گو نگے ہیں (کہ کبھی ایسی بات زبان ہی پر نہیں آتی) اندھے ہیں (کیونکہ نفع نقصان نظر ہی نہیں آتا) سو (جب سارے ہی حواس مختل ہیں تو) سمجھتے (سمجھاتے) کچھ نہیں۔

معارف مسائل

اس آیت سے جس طرح باپ دادوں کی اندھی تقلید و اتباع کی مذمت ثابت ہوئی، اسی طرح جائز تقلید و اتباع کے شرائط اور ایک ضابطہ بھی معلوم ہو گیا، جس کی طرف دو لفظوں میں اشارہ فرمایا ہے لَا يَعْقُلُونَ اور لَا يَهْتَدُونَ ۱۷۱ کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ ان آباء و اجداد کی تقلید و اتباع کو اس لئے منع کیا گیا ہے کہ انہیں نہ عقل تھی نہ ہدایت۔ ”ہدایت“ سے مراد وہ احکام ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صریح طور پر نازل کئے گئے، اور عقل سے مراد وہ جو بذریعہ اجتہاد و نصوص شرعیہ سے استنباط کئے گئے۔

تو وجہ ان کے اتباع و تقلید کے عدم جواز کی یہ ہے کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کئے ہوئے احکام ہیں، اور نہ اس کی صلاحیت کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان سے احکام نکال سکیں، اس میں اشارہ پایا گیا کہ جس عالم کے متعلق یہ اطمینان ہو جائے کہ اس کے پاس قرآن و سنت کا علم ہے، اور اس کو درجہ اجتہاد بھی حاصل ہے کہ جو احکام صراحۃً قرآن و سنت میں نہ ہوں ان کو نصوص قرآن و سنت سے بذریعہ قیاس نکال سکتا ہے، تو ایسے عالم مجتہد کی تقلید و اتباع جائز ہے، نہ اس لئے کہ اس کا حکم ماننا اور اس کا اتباع کرنا ہے، بلکہ اس لئے کہ حکم اللہ کا ماننا اور اسی کا اتباع کرنا ہے، مگر چونکہ ہم براہ راست اللہ کے حکم سے واقف نہیں ہو سکتے، اس لئے کسی عالم مجتہد کا اتباع کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل ہو سکے۔

جاہلانہ تقلید اور ائمہ مجتہدین کی تقلید میں فرق

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ مطلق تقلید ائمہ مجتہدین کے خلاف اس طرح کی آیات پڑھ دیتے ہیں، وہ خود ان آیات کے صحیح مدلول سے واقف نہیں۔

امام قرطبیؒ نے اسی آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اس آیت میں تقلید آبائی کے ممنوع ہونے کا جو ذکر ہے اس سے مراد باطل عقائد و اعمال میں آباء و اجداد کی تقلید کرنا ہے، عقائد صحیحہ و اعمال صالحہ میں تقلید اس میں داخل نہیں، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کلام میں ان دونوں چیزوں کی وضاحت سورہ یوسف میں اس طرح آئی ہے:-

إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿۱۷۳﴾ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي ابْرَاهِيمَ
وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ؑ (يوسف)

”میں نے ان لوگوں کی ملت و مذہب کو چھوڑ دیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، اور جو آخرت کے منکر ہیں، اور میں نے اتباع کیا اپنے آباء ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کا۔“
اس میں پوری وضاحت سے ثابت ہو گیا کہ آباء کی تقلید باطل میں حرام ہے، حق میں جائز بلکہ مستحسن ہے۔
امام قرطبی نے اسی آیت کے ذیل میں ائمہ مجتہدین کی تقلید کے متعلق بھی مسائل و احکام بیان کئے ہیں، اور فرمایا ہے:-

تَعَلَّقَ قَوْمٌ بِهَذِهِ الْآيَةِ فِي ذِمِّ التَّقْلِيدِ (إِلَى) وَهَذَا فِي الْبَاطِلِ صَحِيحٌ أَمَّا التَّقْلِيدُ فِي الْحَقِّ
فَاصِلٌ مِنْ أَصُولِ الدِّينِ وَعِصْمَةٌ مِنْ عِصْمِ الْمُسْلِمِينَ يُلْجَأُ إِلَيْهَا الْجَاهِلُ الْمُقْصِرُ عَنْ
دَرْكِ النَّظَرِ - (تفسير القرطبي تحت هذه الآية ج: ۲ ص: ۲۱۱)

”کچھ لوگوں نے اس آیت کو تقلید کی مذمت میں پیش کیا ہے، اور یہ باطل کے معاملہ میں تو صحیح ہے،
لیکن حق کے معاملہ میں تقلید سے اس کا کوئی تعلق نہیں، حق میں تقلید کرنا تو دین کے اصول میں سے ایک
مستقل بنیاد ہے، اور مسلمانوں کے دین کی حفاظت کا بہت بڑا ذریعہ ہے کہ جو شخص اجتہاد کی صلاحیت
نہیں رکھتا وہ دین کے معاملے سے تقلید ہی پر اعتماد کرتا ہے۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ

اے ایمان والو! کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو روزی دی ہم نے تم کو اور شکر کرو اللہ کا اگر

كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿۱۷۴﴾ إِنِّهَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْبَيْتَةَ وَالْدَّمَ وَلَحْمَ

تم اسی کے بندے ہو۔ اس نے تم پر یہی حرام کیا ہے مردہ جانور اور لہو اور گوشت

الْخِنْزِيرِ وَمَا أَهْلَ بِهِ لغيرِ اللَّهِ ۚ فَسِنْ اضْطَرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ

سورکا اور جس جانور پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا، پھر جو کوئی بے اختیار ہو جائے نہ تو نافرمانی کرے اور نہ زیادتی

فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۷۳﴾

تو اس پر کچھ گناہ نہیں، بے شک اللہ ہے بڑا بخشنے والا نہایت مہربان

آسان ترجمہ قرآن

اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں رزق کے طور پر عطا کی ہیں، ان میں سے (جو چاہو) کھاؤ، اور اللہ کا شکر ادا کرو، اگر واقعی تم صرف اسی کی بندگی کرتے ہو ﴿۱۷۳﴾ اُس نے تو تمہارے لئے بس مردار جانور، خون، اور سور کا گوشت حرام کیا ہے، نیز وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو۔ ہاں اگر کوئی شخص انتہائی مجبوری کی حالت میں ہو (اور ان چیزوں میں سے کچھ کھالے) جبکہ اس کا مقصد نہ لذت حاصل کرنا ہو اور نہ وہ (ضرورت کی) حد سے آگے بڑھے، تو اُس پر کوئی گناہ نہیں۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔ ﴿۱۷۳﴾

خلاصہ تفسیر

(اوپر اکل طیبات کے معاملہ میں مشرکین کی غلطی بتلا کر ان کی اصلاح مقصود تھی، آگے اہل ایمان کو اس بات سے متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ اس غلطی میں مشرکین کی موافقت نہ کرنے لگیں، اسی کے ضمن میں اہل ایمان کو اپنے انعامات کا ذکر اور اس پر ادائے شکر کی تعلیم بھی ہے۔)

اے ایمان والو! (ہماری طرف سے تم کو اجازت ہے کہ) جو (شرع کی رُو سے) پاک چیزیں ہم نے تم کو مرحمت فرمائی ہیں ان میں سے (جو چاہو) کھاؤ (بر تو) اور (اس اجازت کے ساتھ یہ حکم ہے کہ) حق تعالیٰ کی شکر گزاری کرو، (زبان سے بھی ہاتھ پاؤں سے خدمت و طاعت بجالا کر بھی، اور دل سے ان نعمتوں کو من جانب اللہ سمجھ کر بھی) اگر تم خاص ان کے ساتھ غلامی کا تعلق رکھتے ہو (اور یہ تعلق ہونا مُسَلَّم اور ظاہر ہے، پس وجوبِ شکر بھی ثابت ہے)۔

رابط

اوپر تو اس کا بیان تھا کہ حلال کو حرام مت کرو، آگے یہ مذکور ہوتا ہے کہ حرام کو حلال مت سمجھو، جیسا کہ مشرکین اس میں مبتلا تھے، مثلاً مردار جانور اور ایسے جانور جن کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، مشرکین ان کو کھایا کرتے تھے، اس سے منع کیا گیا، اسی کے ضمن میں یہ بھی بتلادیا کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں جانور حرام ہیں، ان کے سوا دوسرے جانوروں کو اپنی طرف سے حرام قرار دینا غلطی ہے، اس سے پچھلے مضمون کی تائید ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ نے تم پر صرف (ان چیزوں کو) حرام کیا ہے (اور ان چیزوں کو حرام نہیں کیا جن کو تم اپنی طرف سے حرام کر رہے ہو، جیسا کہ گزرا یعنی) مردار (جانور) کو (جو باوجود واجب الذبح ہونے کے بلا ذبح شرعی مر جاوے) اور خون کو (جو بہتا ہو) اور خنزیر کے گوشت کو (اسی طرح اس کے سب اجزاء کو بھی) اور ایسے جانور کو جو (بقصد تقرب) غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو (ان سب کو بے شک حرام کیا ہے) پھر بھی (اس میں اتنی آسانی رکھی ہے کہ) جو شخص (بھوک سے بہت ہی) بے تاب ہو جاوے، بشرطیکہ نہ تو (کھانے میں) طالب لذت ہو، اور نہ (قدرِ ضرورت و حاجت سے) تجاوز کرنے والا ہو تو (اس حالت میں ان چیزوں سے کھانے میں بھی) اس شخص پر کچھ گناہ نہیں ہوتا، واقعی اللہ تعالیٰ ہیں بڑے غفور رحیم (کہ ایسے وقت میں یہ رحمت فرمائی کہ گناہ کی چیز میں بھی گناہ اٹھادیا)۔

معارف مسائل

حلال کھانے کی برکت اور حرام کھانے کی نحوست

آیات مذکورہ میں جیسے حرام کھانے کی ممانعت کی گئی ہے، اسی طرح حلال طیب چیزوں کے کھانے اور اس پر شکر گزار ہونے کی ترغیب بھی ہے، کیونکہ جس طرح حرام کھانے سے اخلاقِ رذیلہ پیدا ہوتے ہیں، عبادت کا ذوق جاتا رہتا ہے، دُعا قبول نہیں ہوتی، اسی طرح حلال کھانے سے ایک نور پیدا ہوتا ہے، اخلاقِ رذیلہ سے نفرت، اخلاقِ فاضلہ کی رغبت پیدا ہوتی ہے، عبادت میں دل لگتا ہے، گناہ سے دل گھبراتا ہے، دُعا قبول ہوتی ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے سب رسولوں کو یہ ہدایت فرمائی ہے:-

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا (المؤمنون: ۵۱)

”اے (ہمارے) رسولو! تم پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔“

اس میں اشارہ ہے کہ نیک عمل کرنے میں رزقِ حلال کو بڑا دخل ہے، اسی طرح قبولِ دُعا میں حلال کھانا معین اور حرام مانع قبول ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہت سے لوگ طویل سفر پر نشانِ حال اللہ کے سامنے دُعا کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں، اور ”یا رب، یا رب“ پکارتے ہیں، مگر کھانا اُن کا حرام، پینا اُن کا حرام، لباس اُن کا حرام، غذا اُن کی حرام، ان حالات میں اُن کی دُعا کہاں قبول ہو سکتی ہے۔ (صحیح مسلم، ترمذی، از ابن کثیر)

إِنَّمَا حَرَّمَ، کلمہ إِنَّمَا حصر کے لئے آتا ہے، اس لئے آیت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف وہ چیزیں

حرام کی ہیں جن کا آگے ذکر کیا جاتا ہے، اس کے سوا کچھ حرام نہیں، اس آیت میں تو لفظ اِنَّمَا سے اس کی طرف اشارہ ہوا، اور دوسری آیت میں اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ یہ بھی آیا ہے: قُلْ لَا اَجِدُ فِي مَا اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ يَّتَعَمَّمُهُ الْاَلٰیہ (الانعام: ۱۴۵) اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ اعلان کر دیں کہ میری وحی میں بجز ان چند چیزوں کے جن کا ذکر آگے کیا گیا ہے، اور کوئی چیز حرام نہیں۔

مگر اس پر اشکال یہ ہے کہ دوسری آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے ان چند چیزوں کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں کی حرمت ثابت ہے، تو یہ حصر اور حرمت ماسویٰ کی نفی کیسے درست ہوگی؟

جواب یہ ہے کہ یہاں مطلق حلال و حرام کا بیان نہیں، بلکہ ان مخصوص جانوروں کی حلت و حرمت کا بیان ہے جن کے بارے میں مشرکین مکہ اپنے مشرکانہ عقائد کی غلطیاں کیا کرتے تھے، پچھلی آیت میں اس کی وضاحت آچکی ہے کہ بہت سے حلال جانوروں کو مشرکین حرام سمجھتے تھے، یا اپنے اوپر حرام کر لیتے تھے، اس کی مخالفت کی گئی تھی، اس کے بالمقابل یہاں یہ بتلایا گیا کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں جانور حرام ہیں جن سے تم اجتناب نہیں کرتے، اور جو اللہ کے نزدیک حلال ہیں ان سے پرہیز کرتے ہو، اس لئے اس جگہ حصر مطلق نہیں، بلکہ اضافی ہے مشرکانہ عقائد کے بالمقابل۔

آگے اس آیت میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے، وہ چار چیزیں یہ ہیں:-

۱- میتہ (مردار)، ۲- خون، ۳- لحم خنزیر، ۴- وہ جانور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ پھر چاروں چیزوں کی مزید تشریحات خود قرآن کریم کی دوسری آیات اور احادیث صحیحہ میں آئی ہیں جن کو ملانے کے بعد ان چاروں چیزوں کے احکام حسب ذیل ہیں، ان کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔

میتہ

جس کو اردو میں ”مردار“ کہتے ہیں، اس سے مراد وہ جانور ہے جس کے حلال ہونے کے لئے از روئے شرع ذبح کرنا ضروری ہے، مگر وہ بغیر ذبح کے خود بخود مر جائے، یا گلا گھونٹ کر یا کسی دوسری طرح چوٹ مار کر مار دیا جائے، تو وہ مردار اور حرام ہے، لیکن خود قرآن کریم کی دوسری آیت: اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ (المائدہ: ۹۶) سے معلوم ہوا کہ دریائی جانور کے لئے ذبح کرنا شرط نہیں، وہ بلا ذبح بھی جائز ہے، اس بنا پر احادیث صحیحہ میں مچھلی اور ٹڈی کو میتہ سے مستثنیٰ قرار دے کر حلال کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمارے لئے دو مردار حلال کر دیئے گئے، ایک مچھلی دوسرے ٹڈی، اور دو خون حلال کر دیئے گئے، جگر اور طحال۔ (ابن کثیر از احمد، ابن ماجہ، دارقطنی) [۱]

معلوم ہوا کہ جانوروں میں سے مچھلی اور ٹڈی بغیر ذبح کے حلال ہیں، خواہ وہ خود مر جائیں، یا کسی کے مارنے سے مر جائیں، البتہ جو مچھلی سڑ جانے کی وجہ سے خود پانی کے اوپر آ جائے وہ حرام ہے۔ (بہصا ص) ^[۱]

اسی طرح وہ شکاری جانور جو قابو میں نہیں کہ ذبح کر لیا جائے اور اس کو بھی بسم اللہ پڑھ کر تیر وغیرہ دھاردار چیز سے زخم لگادیں تو بغیر ذبح کے حلال ہو جاتا ہے، مطلقاً زخمی ہو جانا کافی نہیں، کسی آلہ جارحہ تیز دھار سے زخمی ہونا شرط ہے۔

بندوق کی گولی سے شکار

مسئلہ:- بندوق کی گولی سے کوئی جانور زخمی ہو کر قبل ذبح مر جائے تو وہ ایسا ہے جیسے پتھر یا لاٹھی مارنے سے مر جائے، جس کو قرآن کریم کی دوسری آیت میں ”مَوْقُودَةً“ کہا گیا ہے، اور حرام قرار دیا ہے، ہاں مرنے سے پہلے اس کو ذبح کر لیا جائے تو حلال ہو جائے گا۔

مسئلہ:- آج کل بندوق کی ایک گولی نوکدار بنائی گئی ہے، اس کے متعلق بعض علماء کا خیال ہے کہ تیر کے حکم میں ہے، مگر جمہور علماء کے نزدیک یہ بھی تیر کی طرح آلہ جارحہ نہیں، بلکہ خارقہ ہے، جس سے بارود کی طاقت کے ذریعہ گوشت پھٹ جاتا ہے، ورنہ خود اس میں کوئی دھار نہیں جس سے جانور زخمی ہو جائے، اس لئے ایسی گولی کا شکار بھی بغیر ذبح کے جائز نہیں۔

مسئلہ:- آیت مذکورہ میں مطلقاً **میتہ** کو حرام قرار دیا ہے، اس لئے جس طرح اس کا گوشت کھانا حرام ہے اس کی خرید و فروخت بھی حرام ہے، یہی حکم تمام نجاسات کا ہے کہ جیسے ان کا استعمال حرام ہے اُن کی خرید و فروخت اور ان سے نفع اٹھانا بھی حرام ہے، یہاں تک کہ مردار جانور یا ناپاک کوئی چیز باختیار خود جانور کو کھلانا بھی جائز نہیں، ہاں ایسی جگہ رکھ دے جہاں سے کوئی کتابلی خود کھالے، یہ جائز ہے، مگر خود اٹھا کر ان کو کھلانا جائز نہیں۔ (بہصا ص، قرطبی وغیرہ) ^[۲]

مسئلہ:- اس آیت میں **میتہ** کے حرام ہونے کا حکم عام معلوم ہوتا ہے، جس میں **میتہ** کے تمام اجزاء شامل ہیں، لیکن دوسری آیت میں اس کی تشریح: **عَلَى طَائِعٍ يَّطْعُمُهُ** کے الفاظ سے کردی گئی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ مردار جانور کے وہ اجزاء حرام ہیں، جو کھانے کے قابل ہیں، اس لئے مردار جانور کی ہڈی، بال جو کھانے کی چیز نہیں، وہ پاک ہیں، اور ان کا استعمال جائز ہے، آیت قرآن کریم: **وَمِنْ أَصْوَافِهِمْ وَأَوْبَارِهِمْ وَأَشْعَارِهِمْ أَتَاكَ لَذَائِقًا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ** (النحل) میں اُن جانوروں کے بالوں کو مطلقاً جائز الاثقال قرار دیا ہے، ذبیحہ کی شرط نہیں (بہصا ص)۔ کھال پر چونکہ خون وغیرہ کی نجاست لگی

[۱] احکام القرآن للجصاص ج: ۱ ص: ۱۰۷ تا ۱۰۹

[۲] احکام القرآن للجصاص، باب جلود الميتة إذا دُبغت ج: ۱ ص: ۱۱۷

ہوتی ہے اس لئے وہ دباغت سے پہلے حرام ہے، مگر دباغت دینے کے بعد حلال اور جائز ہے، احادیث صحیحہ میں اس کی مزید تصریح موجود ہے۔ (بھٹاوی) ^[۱]

مسئلہ:- مردار جانور کی چربی اور اس سے بنائی ہوئی چیزیں بھی حرام ہیں، ان کا استعمال کسی طرح سے جائز نہیں، اور خرید و فروخت بھی حرام ہے۔

مسئلہ:- یورپ وغیرہ سے آئی ہوئی چیزیں صابون وغیرہ جن میں چربی استعمال ہوتی ہے، ان سے پرہیز کرنا احتیاط ہے، مگر مردار کی چربی ہونے کا علم یقینی نہ ہونے کی وجہ سے گنجائش ہے، نیز اس وجہ سے بھی کہ بعض صحابہ کرام، ابن عمرؓ، ابوسعید خدریؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ نے مردار کی چربی کا صرف کھانے میں استعمال حرام قرار دیا ہے، خارجی استعمال کی اجازت دی ہے، اس لئے اس کی خرید و فروخت کو بھی جائز رکھا ہے۔ (بھٹاوی) ^[۲]

مسئلہ:- دودھ کا پیئر بنانے میں ایک چیز استعمال کی جاتی ہے جس کو عربی زبان میں ”انفحہ“ کہا جاتا ہے، یہ جانور کے پیٹ سے نکالی جاتی ہے، اس کو دودھ میں شامل کرنے سے دودھ جم جاتا ہے، اب اگر یہ جانور اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا ہو تو اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں، مذبوح جانور کا گوشت، چربی وغیرہ سب حلال ہیں، لیکن غیر مذبوح جانور کے پیٹ سے لیا جائے تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ اس کو پاک قرار دیتے ہیں، لیکن صاحبین امام ابو یوسفؒ و محمدؒ اور ثوریؒ وغیرہ اس کو ناپاک کہتے ہیں۔ (بھٹاوی، قرطبی) ^[۳]

یورپ اور دوسرے غیر اسلامی ملکوں سے جو پیئر بنا ہوا آتا ہے، اس میں غیر مذبوح جانوروں کا انفحہ استعمال ہونے کا احتمال غالب ہے، اس لئے جمہور فقہاء کے قول پر اس سے پرہیز کرنا چاہئے، امام اعظمؒ اور امام مالکؒ کے قول پر گنجائش ہے، ہاں یورپ سے آئے ہوئے بعض پیئر ایسے بھی ہیں جن میں خنزیر کی چربی استعمال ہوتی ہے، اور ڈبے پر لکھا ہوا ہوتا ہے، وہ قطعاً حرام اور نجس ہیں۔

خون کے مسائل

دوسری چیز جو آیت مذکورہ میں حرام قرار دی گئی ہے وہ خون ہے، لفظ ”دم“ بمعنی خون اس آیت میں اگرچہ مطلق ہے، مگر سورۃ انعام کی آیت میں اس کے ساتھ ”مَسْفُوحٌ“ یعنی بہنے والا ہونے کی شرط ہے، اَوْدَمًا مَّسْفُوحًا (الانعام: ۱۴۵) اس لئے باتفاق فقہاء خون منجمد جیسے گردہ، تلی وغیرہ وہ حلال اور پاک ہیں۔

۱ احکام القرآن للجصاص باب شعر الميتة ووصفها... إلخ ج: ۱ ص: ۱۲۱

۲ بحوالہ بالا۔

۳ احکام القرآن للجصاص، باب منفعة الميتة ولبنيها ج: ۱ ص: ۱۱۹، ۱۲۰

مسئلہ:- جبکہ حرام صرف بہنے والا خون ہے تو جو خون ذبح کے بعد گوشت میں لگا رہ جاتا ہے وہ پاک ہے، فقہاء و صحابہ و تابعین اور اُمت کا اس پر اتفاق ہے، اسی طرح مچھر، مکھی، کھٹل وغیرہ کا خون بھی ناپاک نہیں، لیکن زیادہ ہو جائے تو اس کو بھی دھونا چاہئے۔ (بہصا ص) [۱]

مسئلہ:- جس طرح خون کا کھانا پینا حرام ہے، اسی طرح اس کا خارجی استعمال بھی حرام ہے، اور جس طرح تمام نجاسات کی خرید و فروخت بھی اور اس سے نفع اٹھانا حرام ہے، اسی طرح خون کی خرید و فروخت بھی حرام ہے، اس سے حاصل کی ہوئی آمدنی بھی حرام ہے، کیونکہ الفاظ قرآنی میں مطلقاً ”دَم“ کو حرام فرمایا ہے، جس میں اس کے استعمال کی تمام صورتیں شامل ہیں۔

مریض کو دوسرے کا خون دینے کا مسئلہ

تحقیق اس مسئلہ کی یہ ہے کہ انسانی خون انسان کا جزء ہے، اور جب بدن سے نکال لیا جائے تو وہ نجس بھی ہے، اس کا اصل تقاضا تو یہی ہے کہ ایک انسان کا خون دوسرے کے بدن میں داخل کرنا دو وجہ سے حرام ہو، اول اس لئے کہ اعضائے انسانی کا احترام واجب ہے، اور یہ اس احترام کے منافی ہے، دوسرے اس لئے کہ خون نجاستِ غلیظہ ہے اور نجس چیزوں کا استعمال ناجائز ہے۔

لیکن اضطراری حالات اور عام معالجات میں شریعتِ اسلام کی دی ہوئی سہولتوں میں غور کرنے سے اُمور ذیل ثابت ہوئے:-

اول یہ کہ خون اگرچہ جزءِ انسانی ہے، مگر اس کو کسی دوسرے انسان کے بدن میں منتقل کرنے کے لئے اعضائے انسانی میں کاٹ چھانٹ اور آپریشن کی ضرورت پیش نہیں آتی، انجکشن کے ذریعے خون نکالا اور دوسرے کے بدن میں ڈالا جاتا ہے، اس لئے اس کی مثال دودھ کی سی ہوگئی جو بدنِ انسانی سے بغیر کسی کاٹ چھانٹ کے نکلتا اور دوسرے انسان کا جزء بنتا ہے، اور شریعتِ اسلام نے بچے کی ضرورت کے پیش نظر انسانی دودھ ہی کو اس کی غذا قرار دیا ہے، اور ماں پر اپنے بچوں کو دودھ پلانا واجب کیا، جب تک وہ بچوں کے باپ کے نکاح میں رہے، طلاق کے بعد ماں کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، بچوں کا رِزق مہیا کرنا باپ کی ذمہ داری ہے، وہ کسی دوسری عورت سے دودھ پلوائے، یا ان کی ماں ہی کو معاوضہ دے کر اس سے دودھ پلوائے، قرآن کریم میں اس کی واضح تصریح موجود ہے:-

فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَارْتَوُوا ۚ لَكُمْ جُزْءٌ مِّمَّا رَضَعْنَ ۚ (الطلاق: ۶)

”اگر تمہاری مطلقہ بیوی تمہارے بچوں کو دودھ پلائے تو اس کو اجرت و معاوضہ دے دو۔“

خلاصہ یہ ہے کہ دودھ جزء انسانی ہونے کے باوجود بوجہ ضرورت اس کے استعمال کی اجازت بچوں کے لئے دی گئی ہے، اور علاج کے طور پر بڑوں کے لئے بھی، جیسا کہ عالمگیری میں ہے:-

وَلَا بَأْسَ بَأَنَّ يُسْعَطَ الرَّجُلُ بِلَبِّنِ الْمَرَاةِ وَيَشْرَبَهُ لِلدَّوَاءِ - (عالمگیری)

”اس میں مضائقہ نہیں کہ دوا کے لئے کسی شخص کی ناک میں عورت کا دودھ ڈالا جائے یا پینے میں استعمال کیا جائے۔“

اور مغنی ابن قدامہ میں اس مسئلہ کی مزید تفصیل مذکور ہے۔ (مغنی، کتاب الصيد ج: ۸ ص: ۶۰۲)

اگر خون کو دودھ پر قیاس کیا جائے تو کچھ بعید از قیاس نہیں، کیونکہ دودھ بھی خون کی بدلی ہوئی صورت ہے، اور جزء انسان ہونے میں مشترک ہے، فرق صرف یہ ہے کہ دودھ پاک ہے اور خون ناپاک، تو حرمت کی پہلی وجہ یعنی جزء انسانی ہونا تو یہاں وجہ ممانعت نہ رہی، صرف نجاست کا معاملہ رہ گیا، علاج و دوا کے معاملے میں بعض فقہاء نے خون کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے۔

اس لئے انسان کا خون دوسرے کے بدن میں منتقل کرنے کا شرعی حکم یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں تو جائز نہیں، مگر علاج و دوا کے طور پر اس کا استعمال اضطراری حالت میں بلاشبہ جائز ہے، اضطراری حالت سے مراد یہ ہے کہ مریض کی جان کا خطرہ ہو اور کوئی دوسری دوا اس کی جان بچانے کے لئے مؤثر یا موجود نہ ہو، اور خون دینے سے اس کی جان بچنے کا ظن غالب ہو، ان شرطوں کے ساتھ خون دینا تو اس نص قرآنی کی رو سے جائز ہے، جس میں مضطر کے لئے مردار جانور کھا کر جان بچانے کی اجازت صراحتہ مذکور ہے، اور اگر اضطراری حالت نہ ہو یا دوسری دوائیں بھی کام کر سکتی ہوں تو ایسی حالت میں مسئلہ مختلف فیہا ہے، بعض فقہاء کے نزدیک جائز ہے، بعض ناجائز کہتے ہیں، جس کی تفصیل کتب فقہ، بحث تدای بالمحرم میں مذکور ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔ احقر کا ایک مستقل رسالہ بھی اس موضوع پر شائع ہو گیا ہے جس کا نام ہے ”اعضائے انسانی کی پیوند کاری“ اس کو ملاحظہ فرمایا جائے۔

تحریم خنزیر

تیسری چیز جو اس آیت میں حرام کی گئی ہے وہ لَحْمُ الْخَنَازِيرِ ہے، آیت میں حرمت خنزیر کے ساتھ ”لحم“ کی قید مذکور ہے، امام قرطبی نے فرمایا کہ اس سے مقصود لحم یعنی گوشت کی تخصیص نہیں، بلکہ اس کے تمام اجزاء ہڈی، کھال، بال، پٹھے سب ہی باجماع امت حرام ہیں، لیکن لفظ ”لحم“ بڑھا کر اشارہ اس طرف ہے کہ خنزیر دوسرے حرام جانوروں

کی طرح نہیں ہے کہ وہ ذبح کرنے سے پاک ہو سکتے ہیں، اگرچہ کھانا حرام ہی رہے، کیونکہ خنزیر کا گوشت ذبح کرنے سے بھی پاک نہیں ہوتا، کہ وہ نجس العین بھی ہے، حرام بھی، صرف چڑا سینے کے لئے اس کے بال کا استعمال حدیث میں جائز قرار دیا ہے۔ (بصا، قرطبی) [۱]

مَا أَهْلَ بِهِ لغيرِ اللَّهِ کی تین صورتیں

چوتھی چیز جس کو آیت میں حرام قرار دیا گیا ہے وہ جانور ہے جو غیر اللہ کے لئے نامزد کر دیا گیا ہو، جس کی تین صورتیں متعارف ہیں، اول یہ کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لئے ذبح کیا جائے، اور بوقت ذبح اسی غیر اللہ کا نام لیا جائے، یہ صورت باتفاق و باجماع امت حرام ہے، اور یہ جانور میتہ ہے، اس کے کسی جز سے انتفاع جائز نہیں، کیونکہ یہ صورت آیت: مَا أَهْلَ بِهِ لغيرِ اللَّهِ کا مدلول صریح ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو تقرب الی غیر اللہ کے لئے ذبح کیا جائے، یعنی اس کا خون بہانے سے تقرب الی غیر اللہ مقصود ہو، لیکن بوقت ذبح اس پر نام اللہ ہی کا لیا جائے جیسے بہت سے نادان مسلمان بزرگوں، پیروں کے نام پر ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بکرے، مرغے وغیرہ ذبح کرتے ہیں، لیکن ذبح کے وقت اس پر نام اللہ ہی کا پکارتے ہیں، یہ صورت بھی باتفاق فقہاء حرام اور مذہب بوجہ مردار ہے۔

مگر تخریج دلیل میں کچھ اختلاف ہے، بعض حضرات مفسرین و فقہاء نے اس کو بھی مَا أَهْلَ بِهِ لغيرِ اللَّهِ کا مدلول صریح قرار دیا ہے، جیسا کہ حواشی بیضاوی میں ہے:-

فَكُلْ مَا نُودِيَ عَلَيْهِ بِغَيْرِ اسْمِ اللَّهِ فَهُوَ حَرَامٌ وَإِنْ ذُبِحَ بِاسْمِ اللَّهِ تَعَالَى حَيْثُ اجْتَمَعَ الْعُلَمَاءُ لَوْ أَنَّ مُسْلِمًا ذَبَحَ ذَبِيحَةً وَقَصَدَ بِذَبِيحِهِ التَّقَرُّبَ إِلَى غَيْرِ اللَّهِ صَادَ مُرْتَدًّا وَذَبِيحَتُهُ ذَبِيحَةُ مُرْتَدٍّ۔
”ہر وہ جانور جس کو غیر اللہ کے نام کر دیا گیا وہ حرام ہے، اگرچہ بوقت ذبح اللہ ہی کا نام لیا ہو، اس لئے کہ علماء فقہاء کا اتفاق ہے کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لئے اگر کوئی مسلمان ذبح کرے تو وہ مرتد ہو جاوے گا، اور اس کا ذبیحہ مرتد کا ذبیحہ کہلائے گا۔“

نیز درمختار، کتاب الذبائح میں ہے:-

ذُبِحَ لِقُدُومِ الْأَمِيرِ وَنَحْوِهِ كَوَاحِدٍ مِنَ الْعُظَمَاءِ يَحْرُمُ لِأَنَّهُ أَهْلَ بِهِ لغيرِ اللَّهِ وَلَوْ ذُكِرَ اسْمُ

اللَّهِ وَأَقْرَأَ الشَّامِي - (ج: ۵ ص: ۲۱۴) [۲]

”کسی امیر یا بڑے کے آنے پر جانور ذبح کیا تو وہ حرام ہوگا، کیونکہ وہ مَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ اللہ میں داخل

ہے، اگرچہ بوقت ذبح اللہ ہی کا نام لیا ہو، اور شامی نے اس کی تائید کی۔“ [۱]

اور بعض حضرات نے اس صورت کو مَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ اللہ کا مدلول صریح تو نہیں بنایا کیونکہ وہ بحیثیت عربیت تکلف سے خالی نہیں، مگر بوجہ اشتراک علت یعنی تقرب الی غیر اللہ کی نیت کے اس کو بھی مَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ اللہ کے ساتھ ملحق کر کے حرام قرار دیا ہے، احقر کے نزدیک یہی وجہ احوط اور اسلم ہے۔

نیز اس صورت کی حرمت کے لئے ایک مستقل آیت بھی دلیل ہے، یعنی وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصَبِ (المائدہ: ۳) ان تمام چیزوں کو کہا جاتا ہے، جن کی باطل طور پر پرستش کی جاتی ہے، معنی یہ ہیں کہ وہ جانور جس کو معبوداتِ باطلہ کے لئے ذبح کیا گیا ہے، اس سے پہلے وَمَا أَهْلٌ بِهِ لغيرِ اللہ کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مَا أَهْلٌ کا مدلول صریح تو وہی جانور ہے جس پر بوقت ذبح غیر اللہ کا نام لیا گیا، اور ذُبِحَ عَلَى النُّصَبِ (المائدہ: ۳) اس کے بالمقابل آیا ہے، جس میں غیر اللہ کے نام لینے کا ذکر نہیں، صرف بتوں وغیرہ کی خوشنودی کی نیت سے ذبح کرنا مراد ہے، اس میں وہ جانور بھی داخل ہیں جن کو ذبح تو کیا گیا ہے غیر اللہ کے تقرب کے لئے مگر بوقت ذبح اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے۔ (افادہ شیخی حکیم الامت)

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے، اُن کی عبارت یہ ہے:-

وَجَرَتْ عَادَةُ الْعَرَبِ بِالصَّيْحِ بِاسْمِ الْمُقْصُودِ بِالذَّبِيحَةِ وَغَلَبَ ذَلِكَ فِي اسْتِعْمَالِهِمْ حَتَّى عَبَّرَ بِهِ عَنِ النِّيَّةِ الَّتِي هِيَ عِلَّةُ التَّحْرِيمِ۔ (تفسیر قرطبی ج: ۲ ص: ۲۰۷) [۲]

”عرب کی عادت تھی کہ جس کے لئے ذبح کرنا مقصود ہوتا ذبح کرنے کے وقت اس کا نام بلند آواز سے پکارتے، اور یہ رواج ان میں عام تھا یہاں تک کہ اس آیت میں تقرب الی غیر اللہ کو جو کہ اصل علتِ تحریم ہے اہلال کے لفظ سے تعبیر کر دیا۔“

امام قرطبی نے اپنی اس تحقیق کی بنیاد صحابہ کرامؓ میں سے دو حضرات حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے فتاویٰ پر رکھی ہے۔

[۱] اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر محض ذبح کے عمل سے کسی بڑے کی تعظیم مقصود ہو تو یہ حرام ہے، لیکن اگر مقصد مہمانی کرنا ہو اور اس مہمانی کے لئے جانور ذبح کیا جائے، یعنی اس کا گوشت مہمان کو کھلانا مقصود ہو، محض ذبح کے عمل سے تعظیم مقصود نہ ہو تو یہ سنتِ ضیافت ہے اور جائز ہے، اور دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ دوسری صورت میں میزبانی کے لئے گوشت کا حصول مقصود ہوتا ہے، اور پہلی صورت میں تعظیم کی علامت کے طور پر جانور کو ذبح کرنا مقصود ہوتا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کا گوشت کھایا جائے گا یا نہیں؟ چنانچہ درمختار میں آگے یہی وضاحت کی گئی ہے: وَلَوْ ذَبَحَ لِلضَّيْفِ لَا يَحْرُمُ لِأَنَّهُ سُنَّةُ الْخَلِيلِ وَإِكْرَامُ الضَّيْفِ إِكْرَامُ اللَّهِ تَعَالَى، وَالْفَارَقُ أَنَّهُ إِنْ قَدَّمَهَا لِأَكْلٍ مِنْهَا كَانَ الذَّبْحُ لِلَّهِ وَالْمَنْفَعَةُ لِلضَّيْفِ أَوْ لِلْوَلِيمَةِ أَوْ لِلرَّبْحِ، وَإِنْ لَمْ يَقْدَمْهَا لِأَكْلٍ مِنْهَا بَلْ يَدْفَعُهَا لِغَيْرِهِ كَانَ لِتَعْظِيمِ غَيْرِ اللَّهِ فَتَحْرُمُ۔ علامہ شامی نے اس کی شرح میں مزید تشریح فرمادیا ہے (رد المحتار ج: ۶ ص: ۳۰۹ و ۳۱۰)۔ محمد تقی عثمانی ۲۷/ ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانے میں فرزدق شاعر کے باپ غالب نے ایک اونٹ ذبح کیا تھا، جس پر کسی غیر اللہ کا نام لینے کا کوئی ذکر نہیں، مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کو بھی مَا أَهْلٌ لِّغَيْرِ اللَّهِ (المائدہ: ۳) میں داخل قرار دے کر حرام فرمایا، اور سب صحابہ کرام نے اس کو قبول کیا، اسی طرح امام مسلم کے شیخ یحییٰ بن یحییٰ کی سند سے صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک طویل حدیث نقل کی، جس کے آخر میں ہے کہ ایک عورت نے حضرت صدیقہ سے سوال کیا کہ اُمّ المؤمنین! ہمارے کچھ رضاعی رشتہ دار عجمی لوگوں میں سے ہیں، اور ان کے یہاں تو روز روز کوئی نہ کوئی تہوار ہوتا رہتا ہے، یہ اپنے تہواروں کے دن کچھ ہدیہ تحفہ ہمارے پاس بھی بھیج دیتے ہیں، ہم اس کو کھائیں یا نہیں؟ اس پر صدیقہ عائشہ نے فرمایا:-

أَمَّا مَا ذُبِحَ لِدَيْكَ الْيَوْمَ فَلَا تَأْكُلُوا وَلَكِنْ كُلُوا مِنْ أَشْجَارِهِمْ۔

(تفسیر قرطبی ج: ۲ ص: ۲۰۷)

”جو جانور اس عید کے دن کے لئے ذبح کیا گیا ہو وہ نہ کھاؤ، لیکن اُن کے درختوں کے پھل وغیرہ کھا سکتے ہو۔“

الغرض یہ صورتِ ثانیہ جس میں نیت تو تقرب الی غیر اللہ کی ہو، مگر ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جائے، اول تو اشتراکِ علت یعنی نیت تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے مَا أَهْلٌ لِّغَيْرِ اللَّهِ کے حکم میں ہے، دوسرے آیت وَمَا ذُبِحَ عَلَى النَّصَبِ (المائدہ: ۳) کا بھی مدلول ہے، اس لئے یہ بھی حرام ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کسی جانور کو کان کاٹ کر یا کوئی دوسری علامت لگا کر تقرب الی غیر اللہ اور تعظیم غیر اللہ کے لئے چھوڑ دیا جائے، نہ اس سے کام لیں اور نہ اس کے ذبح کرنے کا قصد ہو، بلکہ اس کے ذبح کرنے کو حرام جانیں، یہ جانور مَا أَهْلٌ لِّغَيْرِ اللَّهِ اور وَمَا ذُبِحَ عَلَى النَّصَبِ (المائدہ: ۳) دونوں میں داخل نہیں، بلکہ اس قسم کے جانور کو ”بحیرہ“ یا ”سائبہ“ وغیرہ کہا جاتا ہے، اور حکم ان کا یہ ہے کہ یہ فعل تو بنص قرآن حرام ہے، جیسا کہ آیت مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ (المائدہ: ۱۰۳) میں ان شاء اللہ تعالیٰ آئے گا۔

مگر ان کے اس حرام عمل سے اور اس جانور کو حرام سمجھنے کے عقیدہ سے یہ جانور حرام نہیں ہو جاتا بلکہ اس کو حرام سمجھنے میں تو ان کے عقیدہ باطلہ کی تائید و تقویت ہوتی ہے، اس لئے یہ جانور عام جانوروں کی طرح حلال ہے۔

مگر شرعی اصول کے مطابق یہ جانور اپنے مالک کی ملک سے خارج نہیں ہوا، اسی کا مملوک ہے، اگرچہ وہ اپنے عقیدہ سے یہ سمجھتا ہے کہ میری ملک سے نکل کر غیر اللہ کے لئے وقف ہو گیا، مگر شرعاً اس کا یہ عقیدہ باطل ہے، وہ جانور بدستور اس کی ملک میں ہے۔

اب اگر وہ شخص خود اس جانور کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دے یا بہہ کر دے تو اس کے لئے یہ جانور حلال ہے، جیسا کہ بکثرت ہندو اپنے دیوتاؤں کے نام بکری یا گائے وغیرہ کو اپنے نزدیک وقف کر کے چھوڑ دیتے ہیں اور مندروں کے پجاریوں، جوگیوں کو اختیار دیتے ہیں وہ جو چاہیں کریں، یہ مندروں کے پجاری اُن کو مسلمانوں کے ہاتھ بھی فروخت کر دیتے ہیں۔

یا اسی طرح بعض جاہل مسلمان بھی بعض مزارات پر ایسا ہی عمل کرتے ہیں کہ بکریا مرغا چھوڑ دیتے ہیں، اور مزارات کے مجاورین کو اختیار دیتے ہیں وہ ان کو فروخت کر دیتے ہیں، تو جو لوگ ان جانوروں کو اُن لوگوں سے خرید لیں جن کو اصل مالک نے اختیار دیا ہے ان کے لئے ان کا خریدنا اور ذبح کر کے کھانا اور فروخت کرنا سب حلال ہے۔

نذر غیر اللہ کا مسئلہ

یہاں ایک چوتھی صورت اور ہے جس کا تعلق حیوانات کے علاوہ دوسری چیزوں سے ہے، مثلاً مٹھائی، کھانا وغیرہ جن کو غیر اللہ کے نام پر نذر (منت) کے طور سے، ہندو لوگ بتوں پر اور جاہل مسلمان بزرگوں کے مزارات پر چڑھاتے ہیں، حضرات فقہاء نے اس کو بھی اشتراکِ علت یعنی تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے **مَا أَهْلٌ بِهِ لِعَیْرِ اللَّهِ** کے حکم میں قرار دے کر حرام کہا ہے، اور اس کے کھانے پینے، دوسروں کو کھلانے اور بیچنے خریدنے سب کو حرام کہا ہے، کتب فقہ بحر الرائق^۱ وغیرہ میں اس کی تفصیلات مذکور ہیں، یہ مسئلہ قیاسی ہے جس کو نص قرآنی متعلقہ حیوانات پر قیاس کیا گیا ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

اضطرار و مجبوری کے احکام

آیت مذکورہ میں چار چیزوں کو حرام قرار دینے کے بعد ایک حکم استثنائی مذکور ہے **فَمِنْ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ** ^{۱۷۳} **إِنَّ اللَّهَ عَفُوٌّ رَحِيمٌ** اس حکم میں اتنی آسانی کردی گئی ہے کہ جو شخص بھوک سے بہت ہی بے تاب ہو جائے، بشرطیکہ نہ تو کھانے میں طالب لذت ہو، اور نہ قدر ضرورت سے تجاوز کرنے والا ہو تو اس حالت میں اُن حرام چیزوں کو کھالینے سے بھی اس شخص کو کوئی گناہ نہیں ہوتا، بے شک اللہ تعالیٰ ہیں بڑے غفور و رحیم۔

اس میں ”مضطر“ کے لئے جان بچانے کے واسطے دو شرطوں کے ساتھ ان حرام چیزوں کے کھالینے سے بھی گناہ اٹھادیا گیا ہے۔

”مضطر“ شرعی اصطلاح میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کی جان خطرے میں ہو، معمولی تکلیف یا ضرورت سے

مضطر نہیں کہا جاسکتا، تو جو شخص بھوک سے ایسی حالت پر پہنچ گیا کہ اگر کچھ نہ کھائے تو جان جاتی رہے گی، اس کے لئے دو شرطوں کے ساتھ یہ حرام چیزیں کھالینے کی گنجائش دی گئی ہے، ایک شرط یہ ہے کہ مقصود جان بچانا ہو، کھانے کی لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو، دوسری شرط یہ ہے کہ صرف اتنی مقدار کھائے جو جان بچانے کے لئے کافی ہو، پیٹ بھر کر کھانا یا قدر ضرورت سے زائد کھانا اس وقت بھی حرام ہے۔

اہم فائدہ

یہاں قرآن عزیز نے اضطرار کی حالت میں بھی حرام چیزوں کے کھانے کو حلال نہیں فرمایا، بلکہ **فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ** فرمایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں تو اب بھی اپنی جگہ حرام ہی ہیں، مگر اس کے کھانے والے سے بوجہ اضطرار کے استعمال حرام کا گناہ معاف کر دیا گیا، حلال ہو جانے اور گناہ معاف کر دینے میں بڑا فرق ہے، اگر اضطراری حالت میں ان چیزوں کو حلال کر دینا مقصود ہوتا تو حرمت سے صرف استثناء کر دینا کافی ہوتا، مگر یہاں صرف استثناء پر اکتفا کر دینے کے بجائے **فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ** کا اضافہ فرما کر اس نکتے کی طرف اشارہ کر دیا کہ حرام تو اپنی جگہ حرام ہی ہے، اور اس کا استعمال گناہ ہی ہے، مگر مضطر سے یہ گناہ معاف کر دیا گیا۔

حالتِ اضطرار میں دوا کے طور پر حرام چیزوں کا استعمال

آیت مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جس شخص کی جان خطرہ میں ہو وہ جان بچانے کے لئے بطور دوا کے حرام چیز کو استعمال کر سکتا ہے، مگر آیت مذکورہ ہی کے اشارے سے اس میں چند شرطیں معلوم ہوتی ہیں:-

اول یہ کہ حالتِ اضطرار کی ہو، خطرہ جان جانے کا ہو، معمولی تکلیف و بیماری کا یہ حکم نہیں۔ دوسرے یہ کہ بجز حرام چیز کے اور کوئی چیز علاج و دوا کے لئے مؤثر نہ ہو یا موجود نہ ہو، جیسے شدید بھوک کی حالت میں استثناء اُسی وقت ہے جبکہ کوئی دوسری حلال غذا موجود و مقدور نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ اس حرام کے استعمال کرنے سے جان بچ جانا یقینی ہو، جیسے بھوک سے مضطر کے لئے ایک دو لقمے حرام گوشت کا کھالینا عادتاً اس کی جان بچانے کا یقینی سامان ہے، اگر کوئی دوا ایسی ہے کہ اس کا استعمال مفید تو معلوم ہوتا ہے مگر اس سے شفا یقینی نہیں تو اس دوا کا استعمال آیت مذکورہ کے استثنائی حکم میں داخل ہو کر جائز نہیں ہوگا، اس کے ساتھ مزید دو شرطیں آیت قرآنی میں منصوص ہیں کہ اس کے استعمال سے لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو، اور قدر ضرورت سے زائد استعمال نہ کرے۔

آیت مذکورہ کی تصریح اور اشارات سے جو قیود و شرائط حاصل ہوئے ان شرائط کے ساتھ ہر حرام و ناپاک دوا کا استعمال خواہ کھانے پینے میں ہو یا خارجی استعمال میں باتفاق فقہائے امت جائز ہے، اُن شرائط کا خلاصہ پانچ چیزیں ہیں:-

- ۱- حالتِ اضطرار کی ہو یعنی جان کا خطرہ ہو۔
- ۲- دوسری کوئی حلال دوا کارگر نہ ہو یا موجود نہ ہو۔
- ۳- اس دوا سے مرض کا ازالہ عادتاً یقینی ہو۔
- ۴- اس کے استعمال سے لذت حاصل کرنا مقصود نہ ہو۔
- ۵- قدرِ ضرورت سے زائد اس کو استعمال نہ کیا جائے۔

غیر اضطراری حالت میں عام علاج و دوا کے لئے حرام چیز کا استعمال

اضطراری حالت کا مسئلہ تو شرائطِ مذکورہ کے ساتھ نصِ قرآن سے ثابت اور اجماعی حکم ہے، لیکن عام بیماریوں میں بھی کسی ناپاک یا حرام دوا کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے، اکثر فقہاء نے فرمایا کہ بغیر اضطرار اور ان تمام شرائط کے جو اوپر مذکور ہوئیں حرام دوا کا استعمال جائز نہیں، کیونکہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ”اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے لئے حرام میں شفا نہیں رکھی۔“ (بخاری شریف) [۱]

بعض دوسرے فقہاء نے ایک خاص واقعہ حدیث سے استدلال کر کے جائز قرار دیا ہے، وہ واقعہ عُرْنِیِّین کا ہے، جو تمام کتب حدیث میں مذکور ہے، کہ کچھ گاؤں والے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اُونٹ کا دودھ اور پیشاب استعمال کرنے کی اجازت دی جس سے ان کو شفا ہو گئی۔ [۲]

مگر اس واقعہ میں متعدد احتمالات ہیں جن سے حرام چیز کا استعمال مشکوک ہو جاتا ہے، اس لئے اصل حکم تو یہی ہے کہ عام بیماریوں میں جب تک شرائطِ اضطرار مذکورہ موجود نہ ہوں حرام دوا کا استعمال جائز نہیں۔

لیکن فقہائے متاخرین نے موجودہ زمانے میں حرام و ناپاک دواؤں کی کثرت اور ابتلائے عام اور عوام کے ضعف پر نظر کر کے اس شرط کے ساتھ اجازت دی ہے کہ کوئی دوسری حلال اور پاک دوا اس مرض کے لئے کارگر نہ ہو یا موجود نہ ہو۔

كَمَا فِي الدَّرِّ الْمُخْتَارِ قُبِيلَ فَصَلِ الْبَيْرِ اخْتَلَفَ فِي التَّدَاوِي بِالْمَحْرَمِ وَظَاهِرُ الْمَذْهَبِ

[۱] صحیح البخاری، کتاب الأشربة، باب شراب الحلو او العسل ج: ۲ ص: ۸۴۰

[۲] صحیح البخاری، کتاب المحاربین، باب لم یسق المرتدون... إلخ ج: ۲ ص: ۱۰۰۵

الْمَنْعُ كَمَا فِي رِضَاعِ الْبَحْرِ وَلَكِنْ نَقَلَ الْمُصَنِّفُ ثُمَّ وَهَّنَا عَنِ الْحَاوِي قِيلَ يَرِخْصُ إِذَا عَلِمَ فِيهِ الشِّفَاءُ وَلَمْ يُعْلَمْ دَوَاءٌ آخَرَ كَمَا رَخَّصَ فِي الْخَمْرِ لِلْعَطْشَانِ وَعَلَيْهِ الْفَتْوَى^[۱] وَمِثْلُهُ فِي الْعَالَمِ كِيرِيَّةٍ - (ج: ۵ ص: ۳۵۵)^[۲]

”در مختار میں فصل بیر سے پہلے مذکور ہے حرام چیزوں کو بطور دوا استعمال کرنے میں اختلاف ہے، اور ظاہر مذہب میں اس کی ممانعت آئی ہے، جیسا کہ بحر الرائق کتاب الرضاع میں مذکور ہے، لیکن مصنف تنویر نے اس جگہ رضاع میں بھی اور یہاں بھی حاوی قدسی سے نقل کیا ہے کہ بعض علماء نے فرمایا: دوا وعلاج کے لئے حرام چیزوں کا استعمال اس شرط سے جائز ہے کہ اس دوا کے استعمال سے شفا ہو جانا عادتہ یقینی ہو، اور کوئی حلال دوا اس کا بدل نہ ہو سکے، جیسا کہ پیاسے کے لئے شراب کا گھونٹ پینے کی اجازت دی گئی ہے۔“

مسئلہ:- تفصیل مذکور سے اُن تمام انگریزی دواؤں کا حکم معلوم ہو گیا جو یورپ وغیرہ سے آتی ہیں، جن میں شراب وغیرہ نجس اشیاء کا ہونا معلوم و یقینی ہو، اور جن دواؤں میں حرام ونجس اجزاء کا وجود مشکوک ہے ان کے استعمال میں اور زیادہ گنجائش ہے، اور احتیاط بہر حال احتیاط ہے، خصوصاً جبکہ کوئی شدید ضرورت بھی نہ ہو، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا^۱

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ نازل کی اللہ نے کتاب اور لیتے ہیں اس پر تھوڑا سا مول

أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا

وہ نہیں بھرتے اپنے پیٹ میں مگر آگ اور نہ بات کرے گا ان سے اللہ قیامت کے دن اور نہ

يُزَكِّيهِمْ^۲ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ^{۱۴۲} أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلَالَةَ

پاک کرے گا اُن کو اور اُن کے لئے ہے عذاب دردناک۔ یہی ہیں جنہوں نے خریدا گمراہی کو

بِالْهُدَى وَالْعَذَابِ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝۱۷۵

بدلے ہدایت کے اور عذاب بدلے بخشش کے، سو کس قدر صبر کرنے والے ہیں دوزخ پر۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۚ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اٰخْتَلَفُوْا فِی الْكِتٰبِ

یہ اس واسطے کہ اللہ نے نازل فرمائی کتاب سچی، اور جنہوں نے اختلاف ڈالا کتاب میں

لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍ ۝۱۷۶

وہ بے شک ضد میں دُور جا پڑے۔

آسان ترجمہ قرآن

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کو چھپاتے ہیں اور اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت وصول کر لیتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ کے سوا کچھ نہیں بھر رہے۔ قیامت کے دن اللہ ان سے کلام بھی نہیں کرے گا، اور نہ ان کو پاک کرے گا، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے ۝۱۷۵ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی، اور مغفرت کے بدلے عذاب کی خریداری کر لی ہے۔ چنانچہ (اندازہ کرو کہ) یہ دوزخ کی آگ سہنے کے لئے کتنے تیار ہیں! ۝۱۷۶ یہ سب کچھ اس لئے ہوگا کہ اللہ نے حق پر مشتمل کتاب اُتاری ہے، اور جن لوگوں نے ایسی کتاب کے بارے میں مخالفت کا رویہ اختیار کیا ہے وہ ضدِ اضدی میں بہت دُور نکل گئے ہیں۔ ۝۱۷۶

خلاصہ تفسیر ربط آیات

اس سے پہلی آیات میں اُن حرام چیزوں کا ذکر تھا جو محسوسات میں سے ہیں، اگلی آیات میں ایسے حرام کاموں کا ذکر جو محسوس نہیں بلکہ وہ باطنی اور ظاہری اعمالِ شر ہیں، مثلاً علمائے یہود میں یہ مرض تھا کہ عوام سے رشوت لے کر اُن کے مطلب کے موافق غلط فتوے دے دیتے تھے، اور توراۃ کی آیات میں تحریف کر کے اُن کے مطلب کے موافق بناتے تھے، اس میں اُمتِ محمدیہ کے علماء کو بھی تنبیہ ہے کہ وہ ایسے افعال سے اجتناب کریں، کسی نفسانی غرض سے احکامِ حق کے اظہار میں کوتاہی نہ کریں۔

دین فروشی کی سزا

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب (کے مضامین) کا اخفا کرتے ہیں اور (خیانت) کے معاوضہ میں (دُنیا کی) متاعِ قلیل وصول کرتے ہیں ایسے لوگ اور کچھ نہیں اپنے پیٹ میں آگ (کے انگارے) بھر رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان سے نہ تو قیامت میں (لطف کے ساتھ) کلام کریں گے اور نہ (گناہ معاف کر کے) ان کی صفائی کریں گے، اور ان کو سزائے دردناک ہوگی۔ یہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے (دُنیا میں تو) ہدایت چھوڑ کر ضلالتِ اختیار کی اور (آخرت میں) مغفرت چھوڑ کر عذاب (سر پر لیا) سو (شاباش ہے اُن کی ہمت کو) دوزخ (میں جانے) کے لئے کیسے باہمت ہیں (اور) یہ (ساری مذکورہ) سزائیں (ان کو) اس وجہ سے ہیں کہ حق تعالیٰ نے (اس) کتاب کو ٹھیک ٹھیک بھیجا تھا، اور جو لوگ (ایسی ٹھیک ٹھیک بھیجی ہوئی) کتاب میں بے راہی (اختیار) کریں، وہ ظاہر ہے کہ بڑی دُور (و دراز) کی خلاف (ورزی) میں (بتلا) ہوں گے (اور ایسی خلاف ورزی پر ضرور ایسی ہی سخت سزاؤں کا استحقاق ہوگا)۔

معارفِ مسائل

مسئلہ:- آیاتِ مذکورہ سے معلوم ہوا کہ جو شخص مال کے لالچ سے حکمِ شرعی کو بدل دے، وہ جو یہ مال حرام کھاتا ہے گویا اپنے پیٹ میں جہنم کے انگارے بھر رہا ہے، کیونکہ اس عمل کا انجام یہی ہے، اور بعض محقق علماء نے فرمایا کہ مالِ حرام درحقیقت جہنم کی آگ ہی ہے، اگرچہ اس کا آگ ہونا دُنیا میں محسوس نہیں ہوتا، مگر مرنے کے بعد اس کا یہ عمل آگ کی شکل میں سامنے آجائے گا۔

لَيْسَ الْبِرُّ أَنْ تُولُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ

نیکي کچھ یہی نہیں کہ منہ کرو اپنا مشرق کی طرف یا مغرب کی، لیکن بڑی نیکی تو یہ ہے کہ

مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى

جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور سب کتابوں پر اور پیغمبروں پر اور دے

الْبَالِ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۚ

مال اس کی محبت پر رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو

وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ ۚ وَالْمُوفُونَ

اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں، اور قائم رکھے نماز اور دیا کرے زکوٰۃ، اور پورا کرنے والے

بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ۚ وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ ۚ

اپنے اقرار کو جب عہد کریں، اور صبر کرنے والے سختی میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت،

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿۱۷۷﴾

یہی لوگ ہیں سچے اور یہی ہیں پرہیزگار۔

آسان ترجمہ قرآن

نیکی بس یہی تو نہیں ہے کہ اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف کر لو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر اور اللہ کی کتابوں اور اس کے نبیوں پر ایمان لائیں، اور اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سانکوں کو دیں، اور غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کریں، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، اور جب کوئی عہد کر لیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے کے عادی ہوں، اور تنگی اور تکلیف میں، نیز جنگ کے وقت، صبر و استقلال کے خوگر ہوں۔ ایسے لوگ ہیں جو سچے (کہلانے کے مستحق) ہیں، اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔ ﴿۱۷۷﴾

ربط از ”بیان القرآن“

شروع سورت سے یہاں تک تقریباً نصف سورہ بقرہ ہے، زیادہ رُوئے سخن منکرین کی طرف تھا، کیونکہ سب سے اوّل قرآن کی حقانیت کا اثبات کیا، اس ضمن میں اس کے ماننے والے اور نہ ماننے والے فرقوں کا ذکر کیا، پھر توحید و رسالت کو ثابت کیا، پھر اولادِ ابراہیم علیہ السلام پر انعامات و احسانات کو (البقرہ: ۱۲۴) تک بیان فرمایا، وہاں

سے قبلہ کی بحث چلی، اور اس کو بیان کر کے صفا و مروہ کی بحث پر ختم کیا۔

پھر توحید کے اثبات کے بعد شرک کے اُصول و فروع کا ابطال کیا، اور یہاں تک یہی بیان ہوا، اور ان سب مضامین میں ظاہر ہے کہ منکرین کو زیادہ تنبیہ ہے، اور ضمناً کوئی خطاب مسلمانوں کو ہو جانا اور بات ہے۔

اب آیات آئندہ میں کہ بقیہ تقریباً سورہ بقرہ کا نصف ہے، زیادہ تر مقصود مسلمانوں کو بعض اُصول و فروع کی تعلیم کرنا ہے، گو ضمناً غیر مسلمین کو بھی کوئی خطاب ہو جاوے، اور یہ مضمون ختم سورہ تک چلا گیا ہے، جس کو شروع کیا گیا ہے ایک مجمل عنوان ”پر“ سے، لفظ ”پر“ بکسر الباء عربی زبان میں مطلق خیر کے معنی میں ہے، جو تمام ظاہری اور باطنی طاعات و خیرات کو جامع ہے، اور اوّل آیات میں الفاظ جامعہ سے کلی اور اُصولی تعلیم دی گئی ہے، مثلاً ایمان بالکتاب و ایفاء مال و وفاء عہد و صبر حین البأس وغیرہ، جس میں قرآنی تمام احکام کے بنیادی اُصول آگئے، کیونکہ شریعت کے کل احکام کا حاصل تین چیزیں ہیں: عقائد، اعمال، اخلاق، باقی تمام جزئیات انہیں کلیات کے تحت میں داخل ہیں، اور اس آیت میں ان تینوں قسم کے بڑے بڑے شعبے آگئے۔

آگے اس ”پر“ کی تفصیل چلی ہے، جس میں سے بہت سے احکام باقتضائے وقت و مقام مثل قصاص و وصیت و روزہ و جہاد و حج و انفاق و حیض و ایلاء و یمین و طلاق و نکاح و عدت و مہر و تکرار ذکر جہاد، و انفاق فی سبیل اللہ، و بعض معاملات بیع و شراء، و شہادت بقدر ضرورت بیان فرما کر بشارت و وعدہ رحمت و مغفرت پر ختم فرمادیا، سبحان اللہ کیا بلیغ ترتیب ہے، پس چونکہ ان مضامین کا حاصل ”پر“ کا بیان ہے اجمالاً و تفصیلاً، اس لئے اگر اس مجموعے کا لقب ”ابواب البیْر“ رکھا جاوے تو نہایت زیبا ہے، واللہ الموفق۔

خلاصہ تفسیر

ابواب البیْر

کچھ سارا کمال اسی میں نہیں (آگیا) کہ تم اپنا منہ مشرق کو کر لو، یا مغرب کو (کر لو) لیکن (اصلی) کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ (کی ذات و صفات پر) یقین رکھے، اور (اسی طرح) قیامت کے دن (آنے پر) (بھی) اور فرشتوں پر (بھی) کہ وہ اللہ کے فرمانبردار بندے ہیں، نور سے بنے ہیں، گناہ سے معصوم ہیں، کھانے پینے اور انسانی شہوات سے پاک ہیں) اور (سب) کتب (سماویہ) پر (بھی) اور (سب) پیغمبروں پر (بھی) اور (وہ شخص) مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں (اپنے حاجت مند) رشتہ داروں کو اور (نادر) یتیموں کو (یعنی جن بچوں کو ان کا باپ نابالغ چھوڑ کر مر گیا ہو) اور (دوسرے غریب) محتاجوں کو (بھی) اور (بے خرچ) مسافروں کو اور (لا چاری میں) سوال کرنے والوں کو اور (قیدی اور غلاموں

کی) گردن چھڑانے میں (بھی مال خرچ کرتا ہو) اور (وہ شخص) نماز کی پابندی (بھی) رکھتا ہو اور (مقررہ) زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو اشخاص (کہ ان عقائد و اعمال کے ساتھ یہ اخلاق بھی رکھتے ہوں کہ) اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں، جب (کسی امرِ جائز کا) عہد کر لیں اور (اس صفت کو خصوصیت کے ساتھ کہوں گا کہ) وہ لوگ (ان مواقع میں) مستقل (مزاج) رہنے والے ہوں (ایک تو) تنگ دستی میں اور (دوسرے) بیماری میں اور (تیسرے معرکہ) قتال (کفار) میں (یعنی پریشان اور کم ہمت نہ ہوں، بس) یہ لوگ ہیں جو سچے (کمال کے ساتھ موصوف) ہیں، اور یہی لوگ ہیں جو (سچے) متقی (کہے جاسکتے) ہیں (غرض اصلی مقاصد اور کمالاتِ دین کے یہ ہیں، نماز میں کسی سمت کو منہ کرنا انہی کمالاتِ مذکورہ میں سے ایک کمالِ خاص یعنی اقامتِ صلوٰۃ کے توابع اور شرائط میں سے ہے، اور اس کے حسن سے اس میں حسن آگیا، ورنہ اگر نماز نہ ہوتی تو کسی خاص سمت کو منہ کرنا بھی عبادت نہ ہوتا)۔

معارف و مسائل

جب مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کر دیا گیا تو یہود و نصاریٰ اور مشرکین جو اسلام اور مسلمانوں میں عیب جوئی کی فکر میں رہتے تھے، ان میں بڑا شور و شغب ہوا اور طرح طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام پر اعتراضات کا سلسلہ جاری کر دیا، جس کے جوابات پچھلی آیات میں بڑی توضیح و تفصیل کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں۔ ان آیات میں ایک خاص انداز سے اس بحث کو ختم کر دیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ تم نے سارا دین صرف اس بات میں منحصر کر دیا کہ نماز میں انسان کا رخ مغرب کی طرف ہو یا مشرق کی، مراد اس سے مطلق جہات اور سمتیں ہیں، یعنی تم نے صرف سمت و جہت کو دین کا مقصد بنالیا، اور ساری بحثیں اسی میں دائر ہو گئیں، گویا شریعت کا کوئی اور حکم ہی نہیں ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس آیت کا خطاب یہود و نصاریٰ اور مسلمان سب کے لئے ہو، اور مراد یہ ہو کہ اصل برا اور ثواب اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ہے، وہ جس طرف رخ کرنے کا حکم دیں، وہی ثواب و صواب ہو جاتا ہے، اپنی ذات کے اعتبار سے مشرق و مغرب یا کوئی جانب و جہت نہ کوئی اہمیت رکھتی ہے، نہ ثواب، بلکہ ثواب دراصل اطاعتِ حکم کا ہے، جس جانب کا بھی حکم ہو جائے، جب تک بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم تھا وہ ثواب تھا، اور جب بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا ارشاد ہوا تو اب وہی ثواب ہے۔

جیسا کہ بسلسلہ ربط آیات بیان ہو چکا ہے کہ اس آیت سے سورہ بقرہ کا ایک نیا باب شروع ہو رہا ہے جس میں مسلمانوں کے لئے تعلیمات و ہدایات اصل ہیں، مخالفین کے جوابات ضمنی، اسی لئے اس آیت کو احکامِ اسلامیہ کی ایک نہایت جامع آیت کہا گیا ہے۔

اس کے بعد بقرہ کے ختم تک تقریباً اسی آیت کی مزید تشریحات ہیں، اس آیت میں اصولی طور سے تمام احکام شرعیہ، اعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاق کا اجمالی ذکر آ گیا ہے۔

پہلی چیز اعتقادات ہیں، اس کا ذکر مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ میں مفصل آ گیا، دوسری چیز اعمال یعنی عبادات اور معاملات ہیں، ان میں سے عبادات کا ذکر وَ اَتَى الْزَّكٰوٰةَ تک آ گیا، پھر معاملات کا ذکر وَالْمُؤَنِّنَ بِعَهْدِهِمْ سے کیا گیا، پھر اخلاق کا ذکر وَالصّٰدِقِیْنَ سے کیا گیا، آخر میں بتلادیا کہ سچے مومن وہی لوگ ہیں جو ان تمام احکام کی پیروی مکمل کریں اور انہی کو تقویٰ شعار کہا جاسکتا ہے۔

ان احکام کے بیان کرنے میں بہت سے بلیغ اشارات ہیں، مثلاً مال کو خرچ کرنے میں عَلٰی حُبِّہ کی قید لگادی، جس میں تین احتمال ہیں، ایک یہ کہ حُبِّہ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو، تو معنی یہ ہوں گے کہ مال خرچ کرنے میں کوئی نفسانی غرض نام و نمود کی شامل نہ ہو، بلکہ اخلاص کامل کے ساتھ صرف اللہ جل شانہ کے ساتھ محبت اس خرچ کرنے کا داعیہ ہو۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ ضمیر مال کی طرف راجع ہو تو مراد یہ ہوگی کہ اللہ کی راہ میں وہ مال خرچ کرنا موجب ثواب ہے جو انسان کو محبوب ہو، بے کار چیزیں جو پھینکنے کی تھیں ان کو دے کر صدقہ کا نام کرنا کوئی صدقہ نہیں، اگرچہ پھینکنے کی نسبت سے بہتر یہی ہے کہ کسی کے کام آ سکے، تو اس کو دیدے۔

تیسرا احتمال یہ ہے کہ لفظ اَتَى میں جو اس کا مصدر ”اِيتَاء“ مفہوم ہوتا ہے، اس کی طرف ضمیر راجع ہو، اور معنی یہ ہوں کہ وہ اپنے خرچ کرنے پر دل سے راضی ہو، یہ نہ ہو کہ خرچ تو کر رہا ہے مگر اندر سے دل دکھ رہا ہے۔

امام حصّاصؒ نے فرمایا کہ ممکن ہے کہ تینوں ہی چیزیں مراد میں داخل ہوں، پھر اس جگہ مال کے خرچ کرنے کی دو صورتیں مقدم بیان کر دیں، جو زکوٰۃ کے علاوہ ہیں، زکوٰۃ کا ذکر اس کے بعد کیا، شاید تقدیم کی وجہ یہ ہو کہ عام طور سے ان حقوق میں غفلت اور کوتاہی برتی جاتی ہے، صرف زکوٰۃ ادا کر دینے کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔

مسئلہ :- اسی سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ مالی فرض صرف زکوٰۃ سے پورا نہیں ہوتا ہے، زکوٰۃ کے علاوہ بھی بہت جگہ پر مال خرچ کرنا فرض و واجب ہوتا ہے (حصّاص، قرطبی)، جیسے رشتہ داروں پر خرچ کرنا کہ جب وہ کمانے سے معذور ہوں تو نفقہ ادا کرنا واجب ہوتا ہے، کوئی مسکین غریب مر رہا ہے اور آپ اپنی زکوٰۃ ادا کر چکے ہیں، مگر اس وقت مال خرچ کر کے اس کی جان بچانا فرض ہے۔

اسی طرح ضرورت کی جگہ مسجد بنانا، یا دینی تعلیم کے لئے مدارس و مکاتب بنانا یہ سب فرائض مالیہ میں داخل ہیں،

فرق اتنا ہے کہ زکوٰۃ کا ایک خاص قانون ہے اس کے مطابق ہر حال میں زکوٰۃ کا ادا کرنا ضروری ہے، اور یہ دوسرے مصارف ضرورت و حاجت پر موقوف ہیں، جہاں ضرورت ہو خرچ کرنا فرض ہو جائے گا، جہاں نہ ہو فرض نہیں ہوگا۔

فائدہ

جن لوگوں پر مال خرچ کرنا ہے، مثلاً ذوی القربی، مساکین، مسافر، سوال کرنے والے فقیر، ان سب کو تو ایک انداز سے بیان فرمایا، پھر **وَفِي الزَّكَاةِ** میں حرفِ فی بڑھا کر اشارہ کر دیا کہ مملوک غلاموں کو مال کا مالک بنانا مقصود نہیں، بلکہ ان کے مالک سے خرید کر ان کے آزاد کرنے پر خرچ کیا جائے۔ اس کے بعد **وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ** کا ذکر بھی اسی طریق پر آیا، جیسے دوسری چیزوں کا ذکر ہے، آگے معاملات کا باب بیان کرنا تھا اس میں اُسلوب (طریق) بدل کر بجائے صیغہ ماضی استعمال کرنے کے **وَالْمُؤْفُونَ** صیغہ اسم فاعل استعمال کیا، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اس میں ایفاء عہد کی عادت دائمی ہونا چاہئے، اتفاقی طور پر کوئی معاہدہ پورا کر دے تو یہ ہر کافر فاجر بھی کبھی نہ کبھی کرتا ہے، اس کا اعتبار نہیں۔

اسی طرح معاملات کے باب میں صرف ایفاء عہد کا ذکر کیا گیا، کیونکہ اگر غور کیا جائے تو تمام معاملات بیع و شراء، اجارہ، شرکت سب ہی کی رُوح ایفاء معاہدہ ہے۔

اسی طرح آگے اخلاق یعنی اعمالِ باطنہ کا ذکر کرنا تھا، ان میں سے صرف ”صبر“ کو بیان کیا گیا، کیونکہ ”صبر“ کے معنی ہیں نفس کو قابو میں رکھنے اور برائیوں سے بچانے کے، اگر غور کیا جائے تو تمام اعمالِ باطنہ کی اصل رُوح ”صبر“ ہی ہے، اسی کے ذریعے اخلاقِ فاضلہ حاصل کئے جاسکتے ہیں، اور اسی کے ذریعے اخلاقِ رذیلہ سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

ایک اور تغیر اُسلوب بیان میں یہاں یہ کیا گیا کہ پہلے **وَالْمُؤْفُونَ** ذکر کیا تھا، یہاں **وَالصَّابِرُونَ** نہیں بلکہ **وَالصَّابِرِينَ** فرمایا، حضراتِ مفسرین نے فرمایا کہ یہ نصب علی المدح ہے، جس کی مراد یہ ہے کہ اس جگہ لفظ مدح مقدر ہے اور صابرین اس کا مفعول ہے، یعنی ان سب نیکو کار لوگوں میں خصوصیت سے قابلِ مدح صابرین ہیں، کیونکہ صبر ہی ایک ایسا ملکہ اور ایسی قوت ہے جس سے تمام اعمالِ مذکورہ میں مدد ملی جاسکتی ہے، اس طرح آیت مذکورہ میں دین کے تمام شعبوں کے اہم اُصول بھی آگئے ہیں، اور بلیغ اشارات سے ہر ایک کی اہمیت کا درجہ بھی معلوم ہو گیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ ط الْحَرْبِ بِالْحَرْبِ

اے ایمان والو! فرض ہوا تم پر (قصاص) برابر کرنا مقتولوں میں، آزاد کے بدلے آزاد

وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ ۖ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ

اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت، پھر جس کو معاف کیا جائے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی

فَاتَّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَّاءُ إِلَىٰهٖ بِإِحْسَانٍ ۖ ذٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ

تو تابعداری کرنی چاہئے موافق دستور کے اور ادا کرنا چاہئے اس کو خوبی کے ساتھ، یہ آسانی ہوئی تمہارے رب کی طرف سے

وَرَاحَةٌ ۖ فَمِنْ اَعْتَدٰى بِعَدَا ذٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۷۹ وَلَكُمْ

اور مہربانی، پھر جو زیادتی کرے اس فیصلے کے بعد تو اس کے لئے ہے عذاب دردناک، اور تمہارے واسطے

فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَّأُوْلِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۱۷۹

قصاص میں بڑی زندگی ہے اے عقل مندو! تاکہ تم بچتے رہو۔

آسان ترجمہ قرآن

اے ایمان والو! جو لوگ (جان بوجھ کر ناحق) قتل کر دیئے جائیں ان کے بارے میں تم پر قصاص (کا حکم) فرض کر دیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام، اور عورت کے بدلے عورت (ہی کو قتل کیا جائے)، پھر اگر قاتل کو اس کے بھائی (یعنی مقتول کے وارث) کی طرف سے کچھ معافی دے دی جائے تو معروف طریقے کے مطابق (خون بہا کا) مطالبہ کرنا (وارث کا) حق ہے، اور اسے خوش اُسلوبی سے ادا کرنا (قاتل کا) فرض ہے۔ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک آسانی پیدا کی گئی ہے اور ایک رحمت ہے۔ اس کے بعد بھی کوئی زیادتی کرے تو وہ دردناک عذاب کا مستحق ہے ۝۱۷۹ اور اے عقل رکھنے والو! تمہارے لئے قصاص میں زندگی (کا سامان ہے) اُمید ہے کہ تم (اس کی خلاف ورزی سے) بچو گے۔ ۝۱۷۹

ربط آیات اور خلاصہ تفسیر

اس سے پہلی آیات کی تفسیر میں آپ معلوم کر چکے ہیں کہ ان آیات میں اجمالی طور پر نیکی اور خوبی کے اصول

بتلا دیئے گئے ہیں، آگے اُن کی جزئی تفصیلات آئیں گی جن کو ”ابواب البر“ کہا جاسکتا ہے، آگے انہی ابواب البر کے کچھ احکام جزئیہ کا بیان ہوتا ہے، جو ضرورت اور حالات و واقعات کے تابع بیان ہوئے ہیں۔

حکم اول :- قصاص

اے ایمان والو! تم پر (قانون) قصاص فرض کیا جاتا ہے، مقتولین (بہ قتل عمد) کے بارے میں (یعنی ہر) آزاد آدمی (قتل کیا جاوے ہر دوسرے) آزاد آدمی کے عوض میں اور (اسی طرح ہر) غلام (دوسرے ہر) غلام کے عوض میں اور (اسی طرح ہر) عورت (دوسری ہر) عورت کے عوض میں (گویہ قاتلین بڑے درجہ کے اور مقتولین چھوٹے درجہ کے ہوں، جب بھی سب سے برابر قصاص لیا جاوے گا، یعنی قاتل کو سزا میں قتل کیا جاوے گا) ہاں جس (قاتل) کو اس کے فریق (مقدمہ) کی طرف سے کچھ معافی ہو جاوے (مگر پوری معاف نہ ہو) تو (اس سے سزائے قتل سے تو بری ہو گیا، لیکن دیت یعنی خون بہا کے طور پر ایک معین مقدار سے مال بذمہ قاتل واجب ہو جاوے گا، تو اس وقت فریقین کے ذمے ان دو امر کی رعایت ضروری ہے، مدعی یعنی وارثِ مقتول کے ذمہ تو) معقول طور پر (اس مال کا) مطالبہ کرنا (کہ اس کو زیادہ تنگ نہ کرے) اور (مدعا علیہ یعنی قاتل کے ذمہ) خوبی کے ساتھ (اس مال کا) اس (مدعی) کے پاس پہنچا دینا (کہ مقدار میں کمی نہ کرے، اور خواہ مخواہ ٹالے نہیں) یہ (قانونِ دیت و عفو) تمہارے پروردگار کی طرف سے (سزائیں) تخفیف ہے اور (شاہانہ) ترحم ہے (ورنہ بجز سزائے قتل کے کوئی گنجائش ہی نہ ہوتی) پھر جو شخص اس (قانون) کے (مقرر ہوئے) بعد تعدی کا مرتکب ہو (مثلاً کسی پر جھوٹا یا اشتباہ میں دعویٰ قتل کا کر دے یا معاف کر کے پھر قتل کی پیروی کرے) تو اس شخص کو (آخرت میں) بڑا دردناک عذاب ہوگا، اور نفیم لوگو! (اس قانون) قصاص میں تمہاری جانوں کا بڑا بچاؤ ہے (کیونکہ اس قانون کے خوف سے ارتکابِ قتل سے ڈریں گے، تو کئی جانیں بچیں گی) ہم اُمید کرتے ہیں کہ تم لوگ (ایسے قانونِ امن کی خلاف ورزی سے) پرہیز رکھو گے۔

معارف و مسائل

”قصاص“ کے لفظی معنی مماثلت کے ہیں، مراد یہ ہے کہ جتنا ظلم کسی نے کسی پر کیا، اتنا ہی بدلہ لینا دوسرے کے لئے جائز ہے، اس سے زیادتی کرنا جائز نہیں، قرآن مجید کی آیت میں عنقریب اسی سورت میں اس کی زیادہ وضاحت اس طرح آئی ہے: **فَاعْتَدُوا عَلَيْهِمْ مِّمَّا عَتَدُوا عَلَيْكُمْ** (البقرة: ۱۹۴) اور سورہ نحل کی آخری آیات میں **وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوِّقْتُمْ بِهِ** (النحل: ۱۲۶) اسی مضمون کے لئے آیا ہے۔

اسی لئے اصطلاح شرع میں ”قصاص“ کہا جاتا ہے قتل کرنے اور زخم لگانے کی اس سزا کو جس میں مساوات اور مماثلت کی رعایت کی گئی ہو۔

مسئلہ:- قتل عمدہ کہ ارادہ کر کے کسی کو آہنی ہتھیار سے یا ایسی چیز سے جس سے گوشت پوست کٹ کر خون بہہ سکے قتل کیا جاوے، قصاص یعنی جان کے بدلے جان لینا، ایسے ہی قتل کے جرم کے ساتھ مخصوص ہے۔

مسئلہ:- ایسے قتل میں جیسے آزاد آدمی آزاد کے عوض میں قتل کیا جاتا ہے، ایسے ہی غلام کے عوض میں بھی غلام، اور جس طرح عورت کے عوض میں عورت ماری جاتی ہے، اسی طرح مرد بھی عورت کے مقابلے میں قتل کیا جاتا ہے۔

آیت میں آزاد کے مقابل آزاد اور عورت کے مقابل عورت کا جو ذکر آیا ہے یہ اس خاص واقعہ کی بنا پر ہے جس میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

ابن کثیرؒ نے باسناد ابن ابی حاتمؒ نقل کیا ہے کہ زمانہ اسلام سے کچھ پہلے دو عرب قبیلوں میں جنگ ہو گئی، طرفین کے بہت سے آزاد آدمی اور غلام مرد اور عورتیں قتل ہو گئے، ابھی ان کے معاملہ کا تصفیہ ہونے نہیں پایا تھا کہ زمانہ اسلام شروع ہو گیا، اور یہ دونوں قبیلے اسلام میں داخل ہو گئے، اسلام لانے کے بعد اپنے اپنے مقتولوں کا قصاص لینے کی گفتگو شروع ہوئی، تو ایک قبیلہ جو قوت و شوکت والا تھا، اس نے کہا کہ ہم اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک ہمارے غلام کے بدلے میں تمہارا آزاد آدمی اور عورت کے بدلے میں مرد قتل نہ کیا جائے۔^[۱]

قصاص کے متعلق اسلام کا عادلانہ قانون اور قصاص کے مسائل

ان کے جاہلانہ اور ظالمانہ مطالبے کی تردید کرنے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی: **الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ** وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ^۱ جس کا حاصل ان کے مطالبے کو رد کرنا تھا، کہ غلام کے بدلے آزاد کو، اور عورت کے بدلے مرد کو قتل کیا جائے، اگرچہ وہ قاتل نہ ہو، اسلام نے اپنا عادلانہ قانون یہ نافذ کر دیا کہ جس نے قتل کیا ہے وہی قصاص میں قتل کیا جائے، اگر عورت قاتل ہے تو کسی بے گناہ مرد کو اس کے بدلے میں قتل کرنا، اسی طرح قاتل اگر غلام ہے تو اس کے بدلے میں کسی بے گناہ آزاد کو قتل کرنا ظلم عظیم ہے، جو اسلام میں قطعاً برداشت نہیں کیا جاسکتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیت کا حاصل اس کے سوا نہیں کہ جس نے قتل کیا ہے وہی قصاص میں قتل کیا جائے گا، عورت ہو یا غلام، قاتل عورت اور غلام کے بجائے بے گناہ مرد یا آزاد کو قتل کرنا جائز نہیں۔

آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عورت کو کوئی مرد قتل کر دے یا غلام کو کوئی آزاد قتل کر دے تو اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا، قرآن مجید کی اسی آیت کے شروع میں **الْقَصَاصُ فِي الْقَتْلِ**^۱ اس عموم کی واضح دلیل ہے، اور دوسری آیات میں اس سے بھی زیادہ وضاحت ہے مثلاً: **الْكَفَّسُ بِالْكَفَّسِ**^۲ (المائدہ: ۴۵) وغیرہ۔

مسئلہ:- اگر قتل عمد میں قاتل کو پوری معافی دے دی جاوے، مثلاً مقتول کے وارث صرف اس کے دو بیٹے تھے، اور ان دونوں نے اپنا حق معاف کر دیا، تو قاتل پر کوئی مطالبہ نہیں رہا، اور اگر پوری معافی نہ ہو مثلاً صورت مذکورہ میں دو بیٹوں میں سے ایک نے معاف کیا، دوسرے نے معاف نہیں کیا، تو سزائے قصاص سے تو قاتل بری ہو گیا، لیکن معاف نہ کرنے والے کو نصف دیت (خون بہا) دلایا جاوے گا، اور دیت یعنی خون بہا شریعت میں سو اؤنٹ یا ہزار دینار، یا دس ہزار درہم ہوتے ہیں، اور درہم آج کل کے مروّجہ وزن کے اعتبار سے تقریباً ساڑھے تین ماشہ چاندی کا ہوتا ہے، تو پوری دیت دو ہزار نو سو سولہ تولے ۸ ماشہ چاندی ہوگی، یعنی ۳۶ سیر ۳۶ تولے ۸ ماشہ۔^[۱]

مسئلہ:- جس طرح ناتمام معافی سے مال واجب ہو جاتا ہے، اسی طرح اگر باہم کسی قدر مال پر مصالحت ہو جاوے تب بھی قصاص ساقط ہو کر مال واجب ہو جاتا ہے، لیکن اس میں کچھ شرائط ہیں جو کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

مسئلہ:- مقتول کے جتنے شرعی وارث ہیں وہی قصاص اور دیت کے مالک بقدر اپنے حصہ میراث کے ہوں گے، اگر دیت یعنی خون بہا لیا گیا تو مال ان وارثوں میں بحساب وراثت تقسیم ہوگا، اور قصاص کا فیصلہ ہوا تو قصاص کا حق بھی سب میں مشترک ہوگا، مگر چونکہ قصاص ناقابل تقسیم ہے، اس لئے کوئی ادنیٰ درجہ کا حق رکھنے والا بھی اپنا حق قصاص معارف کر دے گا تو دوسرے وارثوں کا حق قصاص بھی معاف ہو جائے گا، ہاں ان کو دیت (خون بہا) کی رقم حسب حصہ ملے گی۔

مسئلہ:- قصاص لینے کا حق اگرچہ اولیائے مقتول کا ہے، مگر باجماع اُمت ان کو اپنا یہ حق خود وصول کرنے کا اختیار نہیں، کہ خود ہی قاتل کو مار ڈالیں بلکہ اس حق کے حاصل کرنے کے لئے حکم سلطان مسلم یا اس کے کسی نائب کا ضروری ہے، کیونکہ قصاص کس صورت میں واجب ہوتا ہے کس میں نہیں، اس کی جزئیات بھی دقیق ہیں جن کو ہر شخص معلوم نہیں کر سکتا، اس کے علاوہ اولیائے مقتول اپنے غصے میں مغلوب ہو کر کوئی زیادتی بھی کر سکتے ہیں، اس لئے باتفاق علمائے اُمت حق قصاص حاصل کرنے کے لئے اسلامی حکومت کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ (قرطبی)^[۲]

۱۔ دیت کی یہ مقدار اس تحقیق پر مبنی ہے کہ درہم کا وزن ساڑھے تین ماشہ چاندی ہو مگر درہم کا صحیح وزن وہ ہے جو حضرت مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے ”اوزان شرعیہ“ میں لکھا ہے کہ درہم تین ماشہ ایک رتی اور ایک پانچواں حصہ رتی کا ہے، اس کے اعتبار سے دیت دو ہزار چھ سو پچیس (۲۶۲۵) تولہ بنتی ہے اور یہی مقدار درست اور مفتی بہ ہے۔

(محمد تقی عثمانی ۱۳۳۲/۲/۳ھ)

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِن تَرَكَ خَيْرًا^ط الْوَصِيَّةَ

فرض کیا گیا تم پر جب حاضر ہو کسی کو تم میں موت بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال وصیت کرنا

لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ^ج حَقًّا عَلَى السَّكِينِ^ط ۱۸۰

ماں باپ کے واسطے اور رشتہ داروں کے لئے انصاف کے ساتھ یہ حکم لازم ہے پرہیزگاروں پر۔ پھر جو کوئی

بَدَلَهُ بَعْدَ مَا سَبَحَهُ فَإِثْمًا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ^ط إِنَّ اللَّهَ سَبِيحٌ

بدل ڈالے وصیت کو بعد اس کے کہ جو سن چکا تو اس کا گناہ انہی پر ہے جنہوں نے اس کو بدلا بے شک اللہ سننے والا

عَلَيْهِمْ^ط ۱۸۱ فَمَنْ خَافَ مِنْ مَوْصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ

جاننے والا ہے، پھر جو کوئی خوف کرے وصیت کرنے والے سے طرف داری کا یا گناہ کا پھر ان میں باہم صلح کرادے

فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ^ط إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ^ع ۱۸۲

تو اس پر کچھ گناہ نہیں، بے شک اللہ بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

تم پر فرض کیا گیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی اپنے پیچھے مال چھوڑ کر جانے والا ہو تو جب اس کی موت کا وقت قریب آجائے، وہ اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے حق میں دستور کے مطابق وصیت کرے۔ یہ متقی لوگوں کے ذمے ایک لازمی حق ہے ۱۸۰ پھر جو شخص اس وصیت کو سننے کے بعد اس میں کوئی تبدیلی کرے گا، تو اس کا گناہ ان لوگوں پر ہوگا جو اس میں تبدیلی کریں گے۔ یقین رکھو کہ اللہ (سب کچھ) سنتا جانتا ہے ۱۸۱ ہاں اگر کسی شخص کو یہ اندیشہ ہو کہ کوئی وصیت کرنے والا بے جا طرف داری یا گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے، اور وہ متعلقہ آدمیوں کے درمیان صلح کرادے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بیشک

اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ۱۸۲

رابطِ آیات و خلاصہ تفسیر

حکم دوم از ابواب البر: ”وَصِيَّت“

”وصیت“ ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے کا حکم دیا جائے، خواہ زندگی میں یا بعد الموت، لیکن عرف میں اس کام کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے کا حکم بعد الموت ہو۔

”خیر“ لفظ خیر کے بہت سے معانی میں سے ایک معنی مال کے بھی آتے ہیں، جیسے قرآن میں ہے: وَارِثَةُ لِحَبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ ۸ (العادیات) اس جگہ باتفاق مفسرین ”خیر“ سے مراد ”مال“ ہے۔

شروع اسلام میں جب تک میراث کے حصے شرع سے مقرر نہ ہوئے تھے، یہ حکم تھا کہ ترکہ کے ایک ثلث میں مرنے والا اپنے والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے لئے جتنا جتنا مناسب سمجھے وصیت کر دے، اتنا تو ان لوگوں کو حق تھا، باقی جو کچھ رہتا وہ سب اولاد کا حق ہوتا تھا، اس آیت میں یہ حکم مذکور ہے یعنی:-

تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب کسی کو (آثار سے) موت نزدیک معلوم ہونے لگے بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو تو (اپنے) والدین اور (دیگر) اقارب کے لئے معقول طور پر (کہ مجموعہ ایک ثلث سے زیادہ نہ ہو) کچھ کچھ بتلا جاوے (اس کا نام ”وصیت“ ہے) جن کو خدا کا خوف ہے ان کے ذمے یہ ضروری (کیا جاتا) ہے، پھر (جن لوگوں نے اس وصیت کو سنا ہے ان میں سے) جو شخص (بھی) سن لینے کے بعد اس (مضمون) کو تبدیل کرے گا (اور باہمی تقسیم و فیصلہ کے وقت غلط اظہار دے گا، اور اس کے موافق فیصلہ ہونے سے کسی کا حق تلف ہو جاوے گا) تو اس (حق تلفی) کا گناہ انہی لوگوں کو ہوگا جو اس (مضمون) کو تبدیل کریں گے (حاکم عدالت یا ثالث کو یا مرنے والے کو گناہ نہ ہوگا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ تو یقیناً سنتے جانتے ہیں (تو تبدیل کرنے والے کے اظہار بھی سنتے ہیں اور حاکم کا بے خبر اور معذور ہونا بھی جانتے ہیں) ہاں (ایک طرح کی تبدیل کی اجازت بھی ہے وہ یہ کہ) جس شخص کو وصیت کرنے والے کی جانب سے (وصیت کے بارے میں) کسی غلطی کی یا (قصداً قانون وصیت کے کسی دفعہ کی خلاف ورزی کے) کسی جرم کے ارتکاب کی تحقیق ہوئی ہو (اور اس بے ضابطہ وصیت کی وجہ سے اس میت کے پسماندہ مستحقان ترکہ و مستحقان مال وصیت میں نزاع کا خطرہ یا وقوع معلوم ہو) پھر یہ شخص ان میں باہم مصالحت کرادے (گو وہ مصالحت اس مضمون وصیت کے خلاف ہو جو ظاہراً تبدیل وصیت ہے) تو اس شخص پر کوئی (بار) گناہ نہیں ہے (اور) واقعی اللہ تعالیٰ تو (خود گناہوں کے) معاف فرمانے والے ہیں اور

(گناہگاروں پر) رحم کرنے والے ہیں (اور اس شخص نے تو کوئی گناہ نہیں کیا کیونکہ وصیت میں تبدیلی اصلاح کے لئے کی ہے، تو اس پر کیوں نہ رحمت ہوگی)۔

معارف و مسائل

اس آیت میں جو وصیت کرنا اس مرنے والے پر فرض کیا ہے جو کچھ مال چھوڑ کر مر رہا ہو، اس حکم کے تین جزء ہیں، ایک یہ کہ مرنے والے کے ترکہ میں اولاد کے سوا کسی دوسرے وارث کے حصے مقرر نہیں ہیں، اُن کے حصوں کا تعین مرنے والے کی وصیت کی بنیاد پر ہوگا۔

دوسرے یہ کہ ایسے اقارب کے لئے وصیت کرنا مرنے والے پر فرض ہے۔

تیسرے یہ کہ ایک تہائی مال سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں۔

ان تین احکام میں سے پہلا حکم تو اکثر صحابہؓ و تابعینؓ کے نزدیک آیت میراث سے منسوخ ہو گیا، ابن کثیرؒ نے بہ تصحیح حاکم وغیرہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اس حکم کو آیت میراث نے منسوخ کر دیا، یعنی: ^[۱] لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرُ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ⑤ (النساء)

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ایک دوسری روایت میں اس کی یہ تفصیل ہے کہ آیت میراث نے ان لوگوں کی وصیت کو منسوخ کر دیا جن کا میراث میں حصہ مقرر ہے، دوسرے رشتہ دار جن کا میراث میں حصہ نہیں، اُن کے لئے حکم وصیت اب بھی باقی ہے۔ (بہصا، قرطبی) ^[۲]

لیکن باجماع اُمت یہ ظاہر ہے کہ جن رشتہ داروں کا میراث میں کوئی حصہ مقرر نہیں، اُن کے لئے میت پر وصیت کرنا کوئی فرض و لازم نہیں، اس لئے فرضیت وصیت اُن کے حق میں بھی منسوخ ہی ہوگی (بہصا، قرطبی)، ^[۳] یعنی بشرط ضرورت صرف مستحب رہ جائے گی۔

دوسرا حکم :- وصیت کا فرض ہونا

یہ بھی باجماع اُمت منسوخ ہے، اور ناخ اس کا وہ حدیث متواتر ہے جس کا اعلان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہؓ کے سامنے فرمایا :-

① تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۲۹۲

② احکام القرآن للجصاص ج: ۱ ص: ۱۶۵ و تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۲ ص: ۲۶۲، ۲۶۳

③ بحوالہ بالا۔

إِنَّ اللَّهَ أَعْطَىٰ لِكُلِّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ فَلَا وَصِيَّةَ لِّوَارِثٍ-

أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ: هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ^[۱]

”اللہ تعالیٰ نے ہر ایک حق والے کو اس کا حق خود دے دیا ہے، اس لئے اب کسی وارث کے لئے وصیت جائز نہیں۔“

اسی حدیث میں بروایت ابن عباسؓ یہ الفاظ بھی منقول ہیں:-

لَا وَصِيَّةَ لِّوَارِثٍ إِلَّا أَنْ تُجِيزَهُ الْوَرَثَةُ- (جصاص)^[۲]

”کسی وارث کے لئے وصیت اس وقت تک جائز نہیں جب تک باقی سب وارث اجازت نہ دے دیں۔“

اس لئے حاصل اس حدیث کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وارثوں کے حصے خود مقرر فرمادیئے ہیں، اس لئے اسے وصیت کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ وارث کے حق میں وصیت کرنے کی اجازت بھی نہیں، ہاں اگر دوسرے ورثہ اس وصیت کی اجازت دے دیں تو جائز ہے۔

امام جصاصؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث ایک جماعت صحابہؓ سے منقول ہے، اور فقہائے اُمت نے باتفاق اس کو قبول کیا ہے، اس لئے بحکم متواتر ہے، جس سے آیت قرآن کا نسخ جائز ہے۔

اور امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ بات علمائے اُمت میں متفق علیہ ہے کہ جب کوئی حکم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یقینی طور پر معلوم ہو جائے جیسے خبر متواتر، مشہور وغیرہ میں ہوتا ہے، تو وہ بالکل بحکم قرآن ہے، اور وہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کا فرمان ہے، اس لئے ایسی حدیث سے کسی آیت قرآن کا منسوخ ہو جانا کوئی محل شبہ نہیں۔ پھر فرمایا کہ اگرچہ یہ حدیث ہم تک خبر واحد ہی کے طریق پر پہنچی ہو، مگر اس کے ساتھ حجۃ الوداع کے سب سے بڑے اجتماع میں ایک لاکھ سے زائد صحابہؓ کے سامنے اس کا اعلان فرمانا اور اس پر اجماع صحابہؓ اور اجماع اُمت نے یہ واضح کر دیا کہ یہ حدیث ان حضرات کے نزدیک قطعی الثبوت ہے، ورنہ شک و شبہ کی گنجائش ہوتے ہوئے اس کی وجہ سے آیت قرآن کے حکم کو چھوڑ کر اس پر اجماع نہ کرتے۔^[۳]

تیسرا حکم:- وصیت ایک تہائی مال سے زیادہ کی جائز نہیں

یہ باتفاق اُمت اب بھی باقی ہے، ہاں وارثوں کی اجازت سے ایک تہائی سے زائد کی بلکہ پورے مال کی بھی

۱ جامع الترمذی، ابواب الفرائض، باب ما جاء لا وصیة لوارث ج: ۲، ص: ۳۲

۲ احکام القرآن للخصاص ج: ۱، ص: ۱۶۲، ۱۶۷

۳ تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۲، ص: ۲۶۳

وصیت جائز اور قابل قبول ہے۔

مسئلہ:- تفصیل مذکور سے یہ واضح ہو چکا کہ اب جن رشتہ داروں کے حصے قرآن کریم نے خود مقرر کر دیے ہیں اُن کے لئے اب وصیت واجب نہیں، بلکہ بدونِ اجازت دوسرے وارثوں کے جائز بھی نہیں، البتہ جو رشتہ دار شرعی وارث نہیں ان کے لئے وصیت کرنے کی اجازت ایک تہائی مال تک ہے۔

مسئلہ:- اس آیت میں ذکر ایک خاص وصیت کا تھا، جو مرنے والا اپنے متروکہ مال کے متعلق کرتا تھا جو منسوخ ہو گیا، لیکن جس شخص کے ذمے دوسرے لوگوں کے حقوق واجب ہوں یا اس کے پاس کسی کی امانت رکھی ہو اُس پر اُن تمام چیزوں کی ادائیگی کے لئے وصیت واجب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ جس شخص کے ذمہ کچھ لوگوں کے حقوق ہوں اس پر تین راتیں ایسی نہ گزرنی چاہئیں کہ اس کی وصیت لکھی ہوئی اس کے پاس موجود نہ ہو۔^[۱]

مسئلہ:- آدمی کو جو ایک تہائی مال میں وصیت کرنے کا حق دیا گیا ہے اپنی زندگی میں اس کو یہ بھی حق رہتا ہے کہ اس وصیت میں کچھ تبدیلی کر دے یا بالکل ختم کر دے۔ (بصّاص)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ

اے ایمان والو! فرض کیا گیا تم پر روزہ جیسے فرض کیا گیا تھا تم سے

قَبْلُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۸۳﴾ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۖ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا

اگلوں پر تاکہ تم پر ہیزگار ہو جاؤ۔ چند روز ہیں گنتی کے، پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو

أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ

یا مسافر تو اُن پر ان کی گنتی ہے اور دنوں سے، اور جن کو طاقت ہے روزے کی اُن کے ذمے بدلہ ہے

طَعَامٍ مُسْكِينٍ ۖ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ ۖ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ

ایک فقیر کا کھانا، پھر جو کوئی خوشی سے کرے نیکی تو اچھا ہے اس کے واسطے، اور روزہ رکھو تو بہتر ہے

لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۴﴾

تمہارے لئے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔

آسان ترجمہ قرآن

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کر دیئے گئے ہیں، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے، تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو ﴿۱۸۴﴾ گنتی کے چند دن روزے رکھنے ہیں۔ پھر بھی اگر تم میں سے کوئی شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کر لے۔ اور جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہوں ان کے ذمہ یہ ہے کہ وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا کر (روزے کا) فدیہ ادا کر دیں۔ اس کے علاوہ اگر کوئی شخص اپنی خوشی سے کوئی نیکی کرے تو یہ اس کے حق میں بہتر ہے۔ اور اگر تم کو سمجھ ہو تو روزے رکھنے میں تمہارے لئے زیادہ بہتری ہے ﴿۱۸۴﴾

خلاصہ تفسیر

حکم سوم :- صوم

اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے (امتوں کے) لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، اس توقع پر کہ تم (روزہ کی بدولت رفتہ رفتہ) متقی بن جاؤ (کیونکہ روزہ رکھنے سے عادت پڑے گی نفس کو اس کے متعدد تقاضوں سے روکنے کی، اور اسی عادت کی پختگی بنیاد ہے تقویٰ کی، سو) تھوڑے دنوں روزہ رکھ لیا کرو (ان تھوڑے دنوں سے مراد رمضان ہے، جیسا اگلی آیت میں آتا ہے) پھر (اس میں بھی اتنی آسانی ہے کہ) جو شخص تم میں (ایسا) بیمار ہو (جس کو روزہ رکھنا مشکل یا مضر ہو) یا (شرعی) سفر میں ہو تو (اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے، اور بجائے رمضان کے) دوسرے ایام کا (انتاہی) شمار (کر کے ان میں روزہ رکھنا) (اس پر واجب) ہے، اور (دوسری آسانی جو بعد میں منسوخ ہو گئی یہ ہے کہ) جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہوں (اور پھر روزہ رکھنے کو دل نہ چاہے تو) اُن کے ذمہ (صرف روزے کا) فدیہ (یعنی بدلہ) ہے کہ وہ ایک غریب کا کھانا (کھلا دینا یا دے دینا) ہے، اور جو شخص خوشی سے (زیادہ) خیر (خیرات) کرے (کہ زیادہ فدیہ دیدے) تو یہ اس شخص کے لئے اور بہتر ہے، اور (گوہم نے آسانی کے لئے ان حالتوں میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت دے دی ہے، لیکن) تمہارا روزہ رکھنا (اس حالت میں بھی) زیادہ بہتر ہے اگر تم (کچھ روزے کی فضیلت کی) خبر رکھتے ہو۔

معارف و مسائل

”صوم“ کے لفظی معنی اِمساک یعنی رُکنے اور بچنے کے ہیں، اور اصطلاح شرع میں کھانے پینے اور عورت سے مباشرت کرنے سے رُکنے اور باز رہنے کا نام ”صوم“ ہے، بشرطیکہ وہ طلوع صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک مسلسل رُکا رہے، اور نیت روزہ کی بھی ہو، اس لئے اگر غروب آفتاب سے ایک منٹ پہلے بھی کچھ کھاپی لیا تو روزہ نہیں ہوا، اسی طرح اگر ان تمام چیزوں سے پرہیز تو پورے دن پوری احتیاط سے کیا، مگر نیت روزہ کی نہیں کی تو بھی روزہ نہیں ہوا۔

”صوم“ یعنی روزہ اُن عبادات میں سے ہے جن کو اسلام کے عمود اور شعائر قرار دیا گیا ہے، اس کے فضائل بے شمار ہیں، جن کے تفصیلی بیان کا یہ موقع نہیں۔

پچھلی اُمتوں میں روزے کا حکم

روزے کی فرضیت کا حکم مسلمانوں کو ایک خاص مثال سے دیا گیا ہے، حکم کے ساتھ یہ بھی ذکر فرمایا کہ یہ روزے کی فرضیت کچھ تمہارے ساتھ خاص نہیں، پچھلی اُمتوں پر بھی روزے فرض کئے گئے تھے، اس سے روزے کی خاص اہمیت بھی معلوم ہوئی، اور مسلمانوں کی دلجوئی کا بھی انتظام کیا گیا کہ روزہ اگرچہ مشقت کی چیز ہے، مگر یہ مشقت تم سے پہلے بھی سب لوگ اٹھاتے آئے ہیں۔ طبعی بات ہے کہ مشقت میں بہت سے لوگ مبتلا ہوں تو وہ ہلکی معلوم ہونے لگتی ہے۔ (روح المعانی)

قرآن کریم کے الفاظ **الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ** عام ہیں، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک کی تمام شریعتوں اور اُمتوں کو شامل ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح نماز کی عبادت سے کوئی شریعت اور کوئی اُمت خالی نہیں رہی، اسی طرح روزہ بھی ہر شریعت میں فرض رہا ہے۔

جن حضرات نے فرمایا ہے کہ **مِنْ قَبْلِكَ** سے اس جگہ نصاریٰ مراد ہیں، وہ بطور ایک مثال کے ہے، اس سے دوسری اُمتوں کی نفی نہیں ہوتی۔ (روح)

آیت میں صرف اتنا بتلایا گیا ہے کہ روزے جس طرح مسلمانوں پر فرض کئے گئے پچھلی اُمتوں میں بھی فرض کئے گئے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پچھلی اُمتوں کے روزے تمام حالات و صفات میں مسلمانوں ہی کے روزوں کے برابر ہوں، مثلاً روزوں کی تعداد، روزوں کے اوقات کی تحدید، اور یہ کہ کن ایام میں رکھے جائیں، ان اُمور میں اختلاف ہو سکتا ہے، چنانچہ واقعہ بھی ایسا ہی ہوا کہ تعداد میں بھی کمی بیشی ہوتی رہی، اور روزے کے ایام اور اوقات میں فرق ہوتا رہا۔ (روح)

۱ روح المعانی تحت هذه الآية ج: ۲ ص: ۱۲۱

۲ روح المعانی تحت هذه الآية ج: ۲ ص: ۱۲۳

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۸۴﴾ میں اشارہ ہے کہ تقویٰ کی قوت حاصل کرنے میں روزہ کو بڑا دخل ہے، کیونکہ روزہ سے اپنی خواہشات کو قابو میں رکھنے کا ایک ملکہ پیدا ہوتا ہے، وہی تقویٰ کی بنیاد ہے۔

مریض کا روزہ

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا، مریض سے مراد وہ مریض ہے جس کو روزہ رکھنے سے ناقابل برداشت تکلیف پہنچے، یا مرض بڑھ جانے کا قوی اندیشہ ہو، بعد کی آیت: وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (البقرة: ۱۸۵) میں اس طرف اشارہ موجود ہے، جمہور فقہائے اُمت کا یہی مسلک ہے۔

مسافر کا روزہ

أَوْ عَلَى سَفَرٍ یہاں لفظ ”مسافر“ کے بجائے عَلَى سَفَرٍ کا لفظ اختیار فرما کر کئی اہم مسائل کی طرف اشارہ فرمادیا:۔
اول یہ کہ مطلقاً لغوی سفر یعنی اپنے گھر اور وطن سے باہر نکل جانا روزہ میں رخصتِ سفر کے لئے کافی نہیں، بلکہ سفر کچھ طویل ہونا چاہئے، کیونکہ لفظ عَلَى سَفَرٍ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ سفر پر سوار ہو، جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ گھر سے دس پانچ میل چلے جانا مراد نہیں، مگر یہ تحدید کہ سفر کتنا طویل ہو قرآن کے الفاظ میں مذکور نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور صحابہؓ کے تعامل سے امام اعظم ابوحنیفہؒ اور بہت سے فقہاء نے اس کی مقدار تین منزل یعنی وہ مسافت جس کو پیادہ سفر کرنے والا باسانی تین روز میں طے کر سکے، قرار دی ہے، اور بعد کے فقہاء نے میلوں کے حساب سے اڑتالیس میل لکھے ہیں۔

دوسرا مسئلہ اسی لفظ عَلَى سَفَرٍ سے یہ نکلا کہ وطن سے نکل جانے والا مسافر اسی وقت تک رخصتِ سفر کا مستحق ہے جب تک اس کے سفر کا سلسلہ جاری رہے، اور یہ ظاہر ہے کہ آرام کرنے یا کچھ کام کرنے کے لئے کسی جگہ ٹھہر جانا مطلقاً اس کے سلسلہ سفر کو ختم نہیں کر دیتا، جب تک کوئی معتد بہ مقدار قیام نہ ہو، اور اسی معتد بہ قیام کی مدت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ثابت ہوئی کہ پندرہ دن ہیں، جو شخص کسی ایک مقام پر پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرے تو وہ عَلَى سَفَرٍ نہیں کہلاتا، اس لئے وہ رخصتِ سفر کا بھی مستحق نہیں۔

مسئلہ:- اسی سے یہ بھی نکل آیا ہے کہ کوئی شخص پندرہ دن کے قیام کی نیت ایک جگہ نہیں بلکہ متفرق مقامات، شہروں اور بستیوں میں کرے تو وہ بدستور مسافر کے حکم میں رہ کر رخصتِ سفر کا مستحق رہے گا، کیونکہ وہ عَلَى سَفَرٍ کی حالت میں ہے۔

روزہ کی قضا

فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۖ یعنی مریض و مسافر کو اپنے فوت شدہ روزوں کی گنتی کے مطابق دوسرے دنوں میں روزے رکھنا واجب ہے، اس میں بتلانا تو یہ منظور تھا کہ مرض یا سفر کی مجبوری سے جو روزے چھوڑے گئے ہیں ان کی قضا ان لوگوں پر واجب ہے جس کے لئے ”فَعَلَيْهِ الْقَضَاءُ“ کا مختصر جملہ بھی کافی تھا، مگر اس کے بجائے **فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ** فرما کر اشارہ کر دیا گیا کہ مریض و مسافر پر فوت شدہ روزوں کی قضا صرف اس صورت میں واجب ہوگی جبکہ مریض صحت کے بعد اور مسافر مقیم ہونے کے بعد اتنے دنوں کی مہلت پائے جنہیں قضا کر سکے، تو اگر کوئی شخص اتنے دن سے پہلے ہی مر گیا تو اس پر قضا یا وصیتِ فدیہ لازم نہیں ہوگی۔

مسئلہ:- **فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ** میں چونکہ اس کی کوئی قید نہیں کہ ترتیب وار رکھے، یا غیر مسلسل رکھے، بلکہ عام اختیار ہے، اس لئے اگر کوئی شخص جس کے رمضان کے ابتدائی دس روزے قضا ہو گئے ہوں وہ دسویں یا نویں روزے کی قضا پہلے کرے اور ابتدائی روزوں کی قضا بعد میں تو اس میں بھی مضائقہ نہیں، اسی طرح متفرق کر کے قضا روزے رکھے، تو یہ بھی جائز ہے، کیونکہ **فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ** میں اس کی گنجائش ہے۔

روزہ کا فدیہ

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ اس آیت کے بے تکلف معنی وہی ہیں جو خلاصہ تفسیر میں بتلائے گئے ہیں، کہ جو لوگ مریض یا مسافر کی طرح روزہ رکھنے سے مجبور نہیں بلکہ روزے کی طاقت تو رکھتے ہیں، مگر کسی وجہ سے دل نہیں چاہتا تو ان کے لئے بھی یہ گنجائش ہے کہ وہ روزے کے بجائے روزے کا فدیہ بصورتِ صدقہ ادا کر دیں، اس کے ساتھ اتنا فرما دیا: **وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ** یعنی تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ روزہ ہی رکھو۔

یہ حکم شروع اسلام میں تھا جب لوگوں کو روزے کا خوگر کرنا مقصود تھا، اس کے بعد جو آیت آنے والی ہے، یعنی **فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ** (البقرة: ۱۸۵) اس سے یہ حکم عام لوگوں کے حق میں منسوخ کر دیا گیا، صرف ایسے لوگوں کے حق میں ابھی باجماع امت باقی رہ گیا جو بہت بوڑھے ہوں (جصاص)، یا ایسے بیمار ہوں کہ اب صحت کی اُمید ہی نہیں رہی، جمہور صحابہ و تابعین کا یہی قول ہے۔ (جصاص، مظہری)

صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد، نسائی، ترمذی، طبرانی وغیرہ تمام ائمہ حدیث نے حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت: **وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ** نازل ہوئی تو ہمیں اختیار دے دیا گیا تھا کہ جس کا جی چاہے

روزے رکھے، جس کا جی چاہے ہر روزے کا فدیہ دیدے، پھر جب دوسری آیت: **فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ** (البقرة: ۱۸۵) نازل ہوئی تو یہ اختیار ختم ہو کر طاقت والوں پر صرف روزہ ہی رکھنا لازم ہو گیا۔^[۱]

مسند احمد میں حضرت معاذ بن جبلؓ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ نماز کے معاملات میں بھی ابتداءً اسلام میں تین تغیرات ہوئے اور روزے کے معاملہ میں بھی تین تبدیلیاں ہوئیں، روزے کی تین تبدیلیاں یہ ہیں کہ:-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو ہر مہینے میں تین روزے اور ایک روزہ یوم عاشورا (یعنی دسویں محرم) کا رکھتے تھے، پھر رمضان کی فرضیت نازل ہو گئی: **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ** تو حکم یہ تھا کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ روزہ رکھ لے یا فدیہ دیدے، اور روزہ رکھنا بہتر اور افضل ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت: **فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ (البقرة: ۱۸۵)** نازل فرمادی، اس آیت نے تندرست قوی کے لئے یہ اختیار ختم کر کے صرف روزہ رکھنا لازم کر دیا، مگر بہت بوڑھے آدمی کے لئے یہ حکم باقی رہا کہ وہ چاہے تو فدیہ ادا کر دے۔

یہ تو دو تبدیلیاں ہوئیں، تیسری تبدیلی یہ ہوئی کہ شروع میں افطار کے بعد کھانے پینے اور اپنی خواہش پورا کرنے کی اجازت صرف اس وقت تک تھی جب تک آدمی سوئے نہیں، جب سو گیا تو دوسرا روزہ شروع ہو گیا، کھانا پینا وغیرہ ممنوع ہو گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے آیت: **أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ (البقرة: ۱۸۷)** الایہ نازل فرما کر یہ آسانی عطا فرمادی کہ اگلے دن کی صبح صادق تک کھانا پینا وغیرہ سب جائز ہیں، سو کر اٹھنے کے بعد سحری کھانے کو سنت قرار دے دیا گیا، صحیح بخاری، مسلم، ابوداؤد میں بھی اس مضمون کی احادیث آئی ہیں۔ (ابن کثیر)^[۲]

فدیہ کی مقدار اور متعلقہ مسائل

ایک روزہ کا فدیہ نصف صاع گندم یا اس کی قیمت ہے، نصف صاع ہمارے مروجہ اسی تولہ کے حساب سے تقریباً پونے دو سیر ہوتے ہیں، اس کی بازاری قیمت معلوم کر کے کسی غریب مسکین کو مالکانہ طور پر دے دینا ایک روزہ کا فدیہ ہے، بشرطیکہ کسی مسجد، مدرسہ کی خدمت کے معاوضہ میں نہ ہو۔

مسئلہ:- ایک روزہ کے فدیہ کو دو آدمیوں میں تقسیم کرنا، یا چند روزوں کے فدیہ کو ایک ہی شخص کو ایک تاریخ میں

[۱] صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب قوله فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ... ج: ۲، ص: ۶۲۷، وصحیح مسلم، کتاب الصیام، باب بیان نسخ قول اللہ تعالیٰ... إلخ ج: ۱، ص: ۳۶۱، وسنن النسائی، کتاب الصیام، باب تأویل قول اللہ عز وجل... إلخ ج: ۱، ص: ۳۱۸، وسنن ابی داؤد، کتاب الصیام، باب قوله تعالیٰ: وَعَلَى الَّذِينَ... إلخ ج: ۱، ص: ۳۱۷، وجامع الترمذی، ابواب الصوم، باب ما جاء على الذين... إلخ ج: ۱، ص: ۱۶۳

[۲] مسند احمد رقم الحدیث: ۲۱۱۰۷

[۳] تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج: ۱، ص: ۵۱۲

دینا درست نہیں، جیسا کہ شامی نے بحوالہ بحر از قنیہ نقل کیا ہے، اور ”بیان القرآن“ میں اسی کو نقل کیا گیا ہے، مگر حضرت نے ”إمداد الفتاویٰ“ میں فتویٰ اس پر نقل کیا ہے کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں، شامی نے بھی فتویٰ اسی پر نقل کیا ہے، البتہ ”إمداد الفتاویٰ“ میں ہے کہ احتیاط اس میں ہے کہ کئی روزوں کا فدیہ ایک تاریخ میں ایک کو نہ دے، لیکن دے دینے میں گنجائش بھی ہے، یہ فتویٰ مورخہ ۱۶ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۷ھ ”إمداد الفتاویٰ“ جلد دوم صفحہ ۱۵۰ میں منقول ہے۔

مسئلہ:- اگر کسی کو فدیہ ادا کرنے کی بھی وسعت نہ ہو تو وہ فقط استغفار کرے اور دل میں نیت رکھے کہ جب ہو سکے گا ادا کر دوں گا۔ (بیان القرآن) ^[۲]

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ

مہینہ رمضان کا ہے جس میں نازل ہوا قرآن ہدایت ہے واسطے لوگوں کے اور دلیلیں روشن

مِّنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ

راہ پانے کی اور حق کو باطل سے جدا کرنے کی، سو جو کوئی پائے تم میں سے اس مہینے کو تو ضرور روزے رکھے اس کے، اور جو کوئی ہو

مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا

بیمار یا مسافر تو اس کی گنتی پوری کرنی چاہئے اور دنوں سے، اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں

يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۚ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدٰكُمُ

چاہتا تم پر دشواری اور اس واسطے کہ تم پوری کرو گنتی اور تاکہ بڑائی کرو اللہ کی اس بات پر کہ تم کو ہدایت کی

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۸۵﴾

اور تاکہ تم احسان مانو۔

[۱] الشامية، كتاب الصوم، فصل في العوارض المبيحة لعدم الصوم ج: ۲ ص: ۴۲۷

[۲] تفسير بيان القرآن تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۱۱۶

آسان ترجمہ قرآن

رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو لوگوں کے لئے سراپا ہدایت، اور ایسی روشن نشانیوں کا حامل ہے جو صحیح راستہ دکھاتی اور حق و باطل کے درمیان دو ٹوک فیصلہ کر دیتی ہیں، لہذا تم میں سے جو شخص بھی یہ مہینہ پائے، وہ اس میں ضرور روزہ رکھے۔ اور اگر کوئی شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کر لے۔ اللہ تمہارے ساتھ آسانی کا معاملہ کرنا چاہتا ہے، اور تمہارے لئے مشکل پیدا کرنا نہیں چاہتا، تاکہ (تم روزوں کی) گنتی پوری کر لو، اور اللہ نے تمہیں جو راہ دکھائی اس پر اللہ کی تکبیر کہو، اور تاکہ تم شکر گزار بنو۔ (۱۸۵)

خلاصہ تفسیر اور ربط آیات

تعیین ایامِ صیام

اوپر ارشاد ہوا تھا کہ تھوڑے روزے رکھ لیا کرو، آگے ان تھوڑے دنوں کا بیان ہے :-

(وہ تھوڑے ایام جن میں روزے کا حکم ہوا ہے) ماہِ رمضان ہے جس میں (ایسی برکت ہے کہ اس کے ایک خاص حصہ یعنی شبِ قدر میں) قرآن مجید (لوح محفوظ سے آسمانِ دنیا پر) بھیجا گیا ہے، جس کا (ایک) وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے (ذریعہ) ہدایت ہے، اور (دوسرا وصف یہ ہے کہ ہدایت کے طریقے بتلانے میں اس کا جزو جزو) واضح الدلالة ہے، (اور ان دونوں وصفوں میں) من جملہ ان کتب (سماویہ) کے (ہے) جو کہ (انہی دو وصفوں سے موصوف ہیں یعنی ذریعہ) ہدایت (بھی) ہیں اور (وضوح دلالت کی وجہ سے حق و باطل کے درمیان) فیصلہ کرنے والی (بھی) ہیں، سو جو شخص اس ماہ میں موجود ہو اس کو ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہئے (اور وہ فدیہ کی اجازت جو اوپر مذکور تھی، منسوخ و موقوف ہوئی) اور (مریض اور مسافر کے لئے جو اوپر قانون تھا وہ البتہ اب بھی اسی طرح باقی ہے کہ) جو شخص (ایسا) بیمار ہو (جس میں روزہ رکھنا مشکل یا مضر ہو) یا (شرعی) سفر میں ہو تو (اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے، اور بجائے ایامِ رمضان کے) دوسرے ایام کا (انتاہی) شمار (کر کے ان میں روزہ) رکھنا (اس پر واجب ہے) اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ (احکام میں) آسانی (کی رعایت) کرنا منظور ہے (اس لئے ایسے احکام مقرر کئے جن کو تم آسانی سے بجالا سکو، چنانچہ سفر اور مرض میں کیسا آسان قانون مقرر کر دیا) اور تمہارے ساتھ (احکام و قوانین مقرر کرنے میں) دُشواری منظور نہیں (کہ سخت احکام تجویز کر دیتے) اور (یہ احکام مذکورہ ہم نے خاص خاص مصلحتوں سے مقرر کئے، چنانچہ اولاً روزہ ادا رکھنے کا اور کسی شرعی عذر

سے رہ جاوے تو دوسرے ایام میں قضا کرنے کا حکم تو اسی لئے کیا) تاکہ تم لوگ (ایامِ آداء، یا قضا کی) شمار کی تکمیل کر لیا کرو، (تاکہ ثواب میں کمی نہ رہے) اور (خود قضا رکھنے کا حکم اس لئے کیا) تاکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی بزرگی (اور ثنا) بیان کیا کرو اس پر کہ تم کو (ایک ایسا) طریقہ بتلادیا (جس سے تم برکات و ثمراتِ صیام سے محروم نہ رہو، ورنہ اگر قضا واجب نہ ہوتی تو کون اتنے روزے رکھ کر ثواب حاصل کرتا) اور (عذر سے خاص رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت اس لئے دے دی) تاکہ تم لوگ (اس نعمتِ آسانی پر اللہ تعالیٰ کا) شکر ادا کیا کرو (ورنہ اگر یہ اجازت نہ ہوتی تو سخت مشقت ہو جاتی)۔

معارف مسائل

اس آیت میں پچھلی مجمل آیت کا بیان بھی ہے اور ماہِ رمضان کی اعلیٰ فضیلت کا ذکر بھی، بیان اس لئے کہ پچھلی آیات میں آیاتاً مَعْدُودَاتٍ^۱ (البقرة: ۱۸۴) کا لفظ مجمل ہے، جس کی شرح اس آیت نے کر دی کہ وہ پورے ماہِ رمضان کے ایام ہیں، اور فضیلت یہ بیان کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کو اپنی وحی اور آسمانی کتابیں نازل کرنے کے لئے منتخب کر رکھا ہے، چنانچہ قرآن بھی اسی ماہ میں نازل ہوا، مسند احمد میں حضرت واثلہ بن اسقعؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے رمضان کی پہلی تاریخ میں نازل ہوئے، اور توراۃ چھ رمضان میں، انجیل تیرہ رمضان اور قرآن چوبیس رمضان میں نازل ہوا۔ اور حضرت جابرؓ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ زبور بارہ رمضان میں، انجیل اٹھارہ رمضان میں نازل ہوئی۔ (ابن کثیر)^۱

حدیث مذکور میں پچھلی کتابوں کا نزول جس تاریخ میں ذکر کیا گیا ہے اسی تاریخ میں وہ کتابیں پوری کی پوری انبیاء پر نازل کر دی گئی ہیں، قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ رمضان کی ایک رات میں پورا کا پورا لوح محفوظ سے سماءِ دنیا پر نازل کر دیا گیا، مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا نزول تیس سال میں رفتہ رفتہ ہوا۔

رمضان کی وہ رات جس میں قرآن نازل ہوا قرآن ہی کی تصریح کے مطابق شبِ قدر تھی: **إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ**^۲، مذکور الصدر حدیث میں اس کو ۲۴ رمضان کی شب بتلایا ہے، اور حضرت حسنؓ کے نزدیک چوبیسویں شب شبِ قدر ہوتی ہے، اس طرح یہ حدیث آیتِ قرآن کے مطابق ہو جاتی ہے، اور اگر یہ مطابقت نہ تسلیم کی جائے تو بہر حال قرآن کریم کی تصریح سب پر مقدم ہے جو رات بھی شبِ قدر ہو وہی اس کی مراد ہوگی۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ^۳ اس ایک جملے میں روزے کے متعلق بہت سے احکام و مسائل کی طرف اشارت ہیں، لفظ **شَهِدَ** شہود سے بنا ہے، جس کے معنی حضور یعنی حاضر و موجود ہونے کے ہیں، اور ”الشہر“ عربی لغت

میں مہینے کے معنی میں آتا ہے، مراد اس سے مہینہ رمضان کا ہے، جس کا ذکر اوپر آیا ہے، اس لئے معنی اس جملے کے یہ ہو گئے کہ تم میں سے جو شخص ماہ رمضان میں حاضر یعنی موجود ہو اس پر لازم ہے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے، روزہ کے بجائے فدیہ دینے کا عام اختیار جو اس سے پہلی آیت میں مذکور ہے اس جملے نے منسوخ کر کے روزہ ہی رکھنا لازم کر دیا ہے۔

ماہ رمضان میں حاضر و موجود ہونے کا مفہوم یہی ہے کہ وہ ماہ رمضان کو ایسی حالت میں پائے کہ اس میں روزہ رکھنے کی صلاحیت موجود ہو، یعنی مسلمان، عاقل، بالغ، مقیم، حیض و نفاس سے پاک ہو۔

اسی لئے جس شخص کا پورا رمضان ایسی حالت میں گزر گیا کہ اس میں روزہ رکھنے کی مطلق صلاحیت ہی نہیں، جیسے کافر، نابالغ، مجنون تو یہ لوگ اس حکم کے مخاطب ہی نہیں، اس لئے ان پر گزشتہ رمضان کے روزے فرض ہی نہیں ہوئے، اور جن میں صلاحیت ذاتی طور پر موجود ہے مگر کسی وقت عذر کی وجہ سے مجبور ہو گئے، جیسے حیض و نفاس والی عورت یا مریض اور مسافر، تو انہوں نے ایک حیثیت سے ماہ رمضان بحالت صلاحیت پایا، اس لئے حکم آیت کا اُن کے حق میں ثابت ہو گیا، مگر وقتی عذر کے سبب اُس وقت روزہ معاف ہے، البتہ بعد میں قضا لازم ہے، جیسا کہ اس کے بعد تفصیل آئے گی۔

مسئلہ:- اس آیت سے معلوم ہوا کہ رمضان کے روزے فرض ہونے کے لئے ماہ رمضان کا بحالت صلاحیت پالینا شرط ہے، اس لئے جس نے پورا رمضان پالیا اس پر پورے رمضان کے روزے فرض ہو گئے، جس نے کچھ کم پایا اُس پر اتنے ہی دن کے روزے فرض ہوئے جتنے دن رمضان کے پائے، اس لئے وسط رمضان میں جو کافر مسلمان ہوا، یا نابالغ بالغ ہوا اس پر صرف آئندہ کے روزے لازم ہوں گے، گزشتہ ایام رمضان کی قضا لازم نہ ہوگی، البتہ مجنون مسلمان اور بالغ ہونے کے اعتبار سے ذاتی صلاحیت رکھتا ہے، وہ اگر رمضان کے کسی حصہ میں ہوش میں آجائے تو گزشتہ ایام رمضان کی قضا بھی اس پر لازم ہو جائے گی، اسی طرح حیض و نفاس والی عورت وسط رمضان میں پاک ہو جائے یا مریض تندرست ہو جائے یا مسافر مقیم ہو جائے تو گزشتہ ایام کی قضا لازم ہوگی۔

مسئلہ:- ماہ رمضان کا پالینا شرعاً تین طریقوں سے ثابت ہوتا ہے، ایک یہ کہ خود رمضان کا چاند دیکھ لے، دوسرے یہ کہ کسی معتبر شہادت سے چاند دیکھنا ثابت ہو جائے، اور جب یہ دونوں صورتیں نہ پائی جائیں تو شعبان کے تیس روزے پورے کرنے کے بعد ماہ رمضان شروع ہو جائے گا۔

مسئلہ:- شعبان کی انیسویں تاریخ کی شام کو اگر ابر وغیرہ کے سبب چاند نظر نہ آئے اور کوئی شرعی شہادت بھی چاند دیکھنے کی نہ پہنچے تو اگلے روز ”یوم الشک“ کہلاتا ہے، کیونکہ اُس میں یہ بھی احتمال ہے کہ حقیقت چاند ہو گیا ہو، مگر مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے نظر نہ آیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ آج چاند ہی مطلع پر نہ آیا ہو، اُس روز میں چونکہ شہر یعنی

رمضان کا پالینا صادق نہیں آتا، اس لئے اُس دن کاروزہ رکھنا واجب نہیں بلکہ مکروہ ہے، حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے تاکہ فرض اور نفل میں اختلاط اور التباس نہ پیدا ہو جائے۔ (بہت خاص) ^(۱)

مسئلہ :- جن ملکوں میں رات دن کئی کئی مہینوں کے طویل ہوتے ہیں، وہاں شہر و شہر یعنی رمضان کا پالینا بظاہر صادق نہیں آتا، اس کا مقتضی یہ ہے کہ اُن پر روزے فرض ہی نہ ہوں، فقہائے حنفیہ میں سے حلوانی اور قبالی وغیرہ نے نماز کے متعلق تو اسی پر فتویٰ دیا ہے کہ ان لوگوں پر اپنے ہی دن رات کے اعتبار سے نماز کا حکم عائد ہوگا، مثلاً جس ملک میں مغرب کے فوراً بعد صبح صادق ہو جاتی ہے وہاں نمازِ عشاء فرض ہی نہیں (شامی)، اس کا مقتضی یہ ہے کہ جہاں چھ مہینے کا دن ہے وہاں چھ مہینے میں صرف پانچ نمازیں ہوں گی، اور رمضان وہاں آئے گا ہی نہیں، اس لئے روزے بھی فرض نہ ہوں گے، حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے ”امداد الفتاویٰ“ میں روزے کے متعلق اسی قول کو اختیار فرمایا ہے۔

وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۖ اس میں مریض اور مسافر کو رخصت دی گئی ہے کہ وہ اُس وقت روزہ نہ رکھیں، تندرستی ہونے پر اور سفر کے ختم ہونے پر اتنے دنوں کی قضا کر لیں، یہ حکم اگرچہ پچھلی آیت میں بھی آچکا تھا، مگر جب اس آیت میں روزہ کے بجائے فدیہ دینے کا اختیار منسوخ کیا گیا تو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید مریض اور مسافر کی رخصت بھی منسوخ ہوگئی، اس لئے دوبارہ اس کا اعادہ کر دیا گیا۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ

اور جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے مجھ کو سو میں تو قریب ہوں، قبول کرتا ہوں دُعا مانگنے والے کی دُعا کو

إِذَا دَعَا ۚ فَلَيْسَتْ جَبِيبًا ۖ وَلِيُؤْمِنُوا بِیْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿۱۸۶﴾

جب مجھ سے دُعا مانگے، تو چاہئے کہ وہ حکم مانیں میرا اور یقین لائیں مجھ پر تاکہ نیک راہ پر آئیں۔

آسان ترجمہ قرآن

اور (اے پیغمبر!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ ان سے کہہ دیجئے کہ) میں اتنا قریب ہوں کہ جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں۔ لہذا وہ بھی میری بات دل سے قبول کریں، اور مجھ پر ایمان لائیں، تاکہ وہ راہِ راست پر آجائیں۔ ﴿۱۸۶﴾

خلاصہ تفسیر مع ربط آیات

پچھلی تین آیتوں میں روزہ اور رمضان کے احکام اور فضائل کا ذکر تھا، اور اس کے بعد بھی ایک طویل آیت میں روزہ اور اعتکاف کے احکام کی تفصیل ہے، درمیان کی اس مختصر آیت میں بندوں کے حال پر حق تعالیٰ کی خاص عنایت، ان کی دعائیں سننے اور قبول کرنے کا ذکر فرما کر اطاعت احکام کی ترغیب دی گئی ہے، کیونکہ روزہ کی عبادت میں رخصتوں اور سہولتوں کے باوجود کسی قدر مشقت ہے، اس کو سہل کرنے کے لئے اپنی مخصوص عنایت کا ذکر فرمایا کہ میں اپنے بندوں سے قریب ہی ہوں جب بھی وہ دعا مانگتے ہیں میں اُن کی دعائیں قبول کرتا ہوں اور ان کی حاجات کو پورا کر دیتا ہوں۔

ان حالات میں بندوں کو بھی چاہئے کہ میرے احکام کی تعمیل میں کچھ مشقت بھی ہو تو برداشت کریں، اور امام ابن کثیرؒ نے اس درمیانی جملہ ترغیب دعا کی یہ حکمت بتلائی ہے کہ اس آیت نے اشارہ کر دیا کہ روزے کے بعد دعا قبول ہوتی ہے، اس لئے اس دعا کا خاص اہتمام کرنا چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لِلصَّائِمِ عِنْدَ فِطْرِهِ دَعْوَةٌ مُسْتَجَابَةٌ۔ (ابوداؤد طیالسی بروایۃ عبد اللہ بن عمروؓ)

”یعنی روزہ افطار کرنے کے وقت روزہ دار کی دعا مقبول ہے۔“

اسی لئے حضرت عبد اللہ بن عمروؓ افطار کے وقت سب گھر والوں کو جمع کر کے دعا کیا کرتے تھے۔ تفسیر آیت کی یہ ہے:- اور (اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم) جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں (کہ میں ان سے قریب ہوں یا دور) تو (میری طرف سے اُن سے فرمادیجئے کہ) میں قریب ہی ہوں (اور باستثناء نامناسب درخواست کے) منظور کر لیتا ہوں (ہر) عرضی درخواست کرنے والے کی جبکہ وہ میرے حضور میں درخواست دے، سو (جس طرح میں اُن کی عرض معروض کو منظور کر لیتا ہوں) ان کو چاہئے کہ میرے احکام کو (بجا آوری کے ساتھ) قبول کیا کریں (اور چونکہ ان احکام میں کوئی حکم نامناسب نہیں اس لئے اس میں استثناء ممکن نہیں) اور مجھ پر یقین رکھیں (یعنی میری ہستی پر بھی، میرے حاکم ہونے پر بھی، میرے حکیم ہونے پر اور رعایت و مصالح پر بھی، اس طرح) اُمید ہے کہ وہ لوگ رُشد (وفلاح) حاصل کر سکیں گے۔

مسئلہ:- اس آیت میں **فَإِنِّي قَرِيبٌ**ؕ فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ دعا آہستہ اور خفیہ کرنا چاہئے، دعا میں آواز بلند کرنا پسند نہیں۔ ابن کثیرؒ نے آیت کا شان نزول یہی ذکر کیا ہے کہ کسی گاؤں والے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سے سوال کیا کہ ہمارا رب اگر ہم سے قریب ہے تو ہم دعا آہستہ آواز سے مانگا کریں، اور دُور ہو تو بلند آواز سے پکارا کریں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

أَحَلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ ۖ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ

حلال ہوا تم کو روزے کی رات میں بے حجاب ہونا اپنی عورتوں سے، وہ پوشاک ہیں تمہاری اور تم

لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۖ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا

پوشاک ہو ان کی، اللہ کو معلوم ہے کہ تم خیانت کرتے تھے اپنی جانوں سے سو معاف کیا تم کو اور درگزر کی

عَنْكُمْ ۚ فَالَّذِينَ بَاشِرُوا هُنَّ وَأَبْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا

تم سے، پھر ملو اپنی عورتوں سے اور طلب کرو اس کو جو لکھ دیا ہے اللہ نے تمہارے لئے، اور کھاؤ اور پیو

حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۚ ثُمَّ

جب تک کہ صاف نظر آئے تم کو دھاری صبح کی جدا دھاری سیاہ سے، پھر

اتُّمُوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوا هُنَّ وَأَنْتُمْ عِكَفُونَ ۚ

پورا کرو روزے کو رات تک، اور نہ ملو عورتوں سے جب تک کہ تم اعتکاف کرو

فِي الْمَسْجِدِ ۚ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۚ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ

مسجدوں میں، یہ حدیں باندھی ہوئی ہیں اللہ کی، سو ان کے نزدیک نہ جاؤ، اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ اپنی آیتیں

لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿۱۸۷﴾

لوگوں کے واسطے تاکہ وہ بچتے رہیں۔

آسان ترجمہ قرآن

تمہارے لئے حلال کر دیا گیا ہے کہ روزوں کی رات میں تم اپنی بیویوں سے بے تکلف صحبت کرو۔ وہ تمہارے لئے لباس ہیں، اور تم ان کے لئے لباس ہو۔ اللہ کو علم تھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے، پھر اس نے تم پر عنایت کی اور تمہاری غلطی معاف فرمادی، چنانچہ اب تم ان سے صحبت کر لیا کرو، اور جو کچھ اللہ نے تمہارے لئے لکھ رکھا ہے اسے طلب کرو، اور اس وقت تک کھاؤ پیو جب تک صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے ممتاز ہو کر تم پر واضح (نہ) ہو جائے۔ اس کے بعد رات آنے تک روزے پورے کرو۔ اور ان (اپنی بیویوں) سے اس حالت میں مباشرت نہ کرو جب تم مسجدوں میں اعتکاف میں بیٹھے ہو۔ یہ اللہ کی (مقرر کی ہوئی) حدود ہیں، لہذا ان (کی خلاف ورزی) کے قریب بھی مت جانا۔ اسی طرح اللہ اپنی نشانیاں لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔ (۱۸۷)

خلاصہ تفسیر

حکم چہارم :- رمضان کی راتوں میں جماع

اس آیت میں روزہ کے بقیہ احکام کی کچھ تفسیر مذکور ہے :-

تم لوگوں کے واسطے روزہ کی شب میں اپنی بیویوں سے مشغول ہونا حلال کر دیا گیا (اور پہلے جو اس سے ممانعت تھی وہ موقوف کی گئی) کیونکہ (بوجہ قرب و اتصال کے) وہ تمہارے (بجائے) اوڑھنے پچھونے (کے) ہیں اور تم ان کے (بجائے) اوڑھنے پچھونے (کے) ہو، خدا تعالیٰ کو اس کی خبر تھی کہ تم (اس حکم الہی میں) خیانت (کر) کے گناہ میں اپنے کو مبتلا کر رہے تھے (مگر) خیر (جب تم معذرت سے پیش آئے تو) اللہ تعالیٰ نے تم پر عنایت فرمائی اور تم سے گناہ کو دھو دیا، سو (جب اجازت ہو گئی تو) اب ان سے ملو ملاؤ اور جو (قانون اجازت) تمہارے لئے تجویز کر دیا ہے، (بے تکلف) اس کا سامان کرو، اور (جس طرح شبِ صیام میں بی بی سے ہم بستری کی اجازت ہے، اسی طرح یہ بھی اجازت ہے کہ تمام رات میں جب چاہو) کھاؤ (بھی) اور پیو (بھی) اس وقت تک کہ تم کو سفید خطِ صبح (صادق کی روشنی) کا متمیز ہو جاوے سیاہ خط سے (یعنی رات کی تاریکی سے) تو پھر (صبح صادق سے) رات (آنے) تک روزے کو پورا کیا کرو۔

(صبح کی سفیدی کا سفید خطِ رات کی تاریکی کے سیاہ خط سے متمیز ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ صبح صادق یقینی طور

سے ثابت ہو جائے۔)

حکم پنجم :- اعتکاف

اور ان بیبیوں (کے بدن) سے اپنا بدن بھی (شہوت کے ساتھ) مت ملنے دو جس زمانے میں کہ تم لوگ اعتکاف والے ہو، (جو کہ) مسجدوں میں (ہوا کرتا ہے) یہ (سب احکام مذکورہ) خداوندی ضابطے ہیں، سو ان (ضابطوں) سے (نکلنا تو کیسا) نکلنے کے نزدیک بھی مت ہونا (اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ احکام بیان کئے ہیں) اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے (اور) احکام (بھی) لوگوں (کی اصلاح) کے واسطے بیان فرمایا کرتے ہیں، اس اُمید پر کہ وہ لوگ (احکام پر مطلع ہو کر ان احکام کے خلاف کرنے سے) پرہیز رکھیں۔

معارف مسائل

أَجَلَ لَكُمْ کے لفظ سے معلوم ہوا کہ جو چیز اس آیت کے ذریعہ حلال کی گئی ہے وہ اس سے پہلے حرام تھی، صحیح بخاری وغیرہ میں بروایت براء بن عازبؓ مذکور ہے کہ ابتدا میں جب رمضان کے روزے فرض کئے گئے تو افطار کے بعد کھانے پینے اور بیبیوں کے ساتھ اختلاط کی صرف اُس وقت تک اجازت تھی جب تک سونہ جائے، سو جانے کے بعد یہ سب چیزیں حرام ہو جاتی تھیں، بعض صحابہ کرامؓ کو اس میں مشکلات پیش آئیں، قیس بن صرمہ انصاریؓ دن بھر مزدوری کر کے افطار کے وقت گھر پہنچے تو گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہ تھا، بیوی نے کہا کہ میں کہیں سے کچھ انتظام کر کے لاتی ہوں، جب وہ واپس آئی تو دن بھر کے تکان کی وجہ سے ان کی آنکھ لگ گئی، اب بیدار ہوئے تو کھانا حرام ہو چکا تھا، اگلے دن اسی طرح روزہ رکھا، دوپہر کو ضعف سے بیہوش ہو گئے (ابن کثیر)، اسی طرح بعض صحابہؓ سونے کے بعد اپنی بیبیوں کے ساتھ اختلاط میں مبتلا ہو کر پریشان ہوئے، ان واقعات کے بعد یہ آیت نازل ہوئی، جس میں پہلا حکم منسوخ کر کے غروب آفتاب کے بعد سے طلوع صبح صادق تک پوری رات میں کھانے پینے اور مباشرت کی اجازت دے دی گئی، اگرچہ سوکر اٹھنے کے بعد ہو، بلکہ سوکر اٹھنے کے بعد آخر شب میں سحری کھانا سنت قرار دیا گیا، جس کا ذکر روایات حدیث میں واضح ہے، اس آیت میں اسی حکم کا بیان کیا گیا ہے۔

”رَفَتْ“ کے لفظی معنی اگرچہ عام ہیں، ایک مرد بی بی سے اپنی خواہش پورا کرنے کے لئے جو کچھ کرتا یا کہتا ہے وہ سب اس میں شامل ہے، لیکن باتفاق اُمت اس جگہ اس سے مراد جماع ہے۔

ثبوت احکام شرعیہ کے لئے قولِ رسولِ کریم بھی بحکم قرآن ہے

اس آیت نے جس حکم کو منسوخ کیا ہے، یعنی سو جانے کے بعد کھانے، پینے وغیرہ کی حرمت کو، یہ حکم قرآن میں کہیں مذکور نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے صحابہ کرامؓ اس حکم پر عمل کرتے تھے (کما رواہ احمد فی مسندہ) ^[۱] اسی کو اس آیت نے حکمِ الہی قرار دے کر منسوخ کیا ہے۔

اس آیت میں پہلے حکم کو حکمِ الہی قرار دیا گیا، اور پھر آسانی کے لئے اس کو منسوخ کیا گیا، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سنت سے ثابت شدہ بعض احکام کو قرآن کے ذریعہ بھی منسوخ کیا جاسکتا ہے۔ (بہصا و غیرہ) ^[۲]

سحری کھانے کا آخری وقت

حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْغَيْظُ الْأَبْيَضُ اس آیت میں رات کی تاریکی کو سیاہ خط اور صبح کی روشنی کو سفید خط کی مثال سے بتلا کر روزہ شروع ہونے اور کھانا پینا حرام ہو جانے کا صحیح وقت متعین فرمادیا، اور اس میں افراط و تفریط کے احتمالات کو ختم کرنے کے لئے **حَتَّى يَتَبَيَّنَ** کا لفظ بڑھا دیا جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ نہ تو وہی مزاج لوگوں کی طرح صبح صادق سے کچھ پہلے ہی کھانے پینے وغیرہ کو حرام سمجھو، اور نہ ایسی بے فکری اختیار کرو کہ صبح کی روشنی کا یقین ہو جانے کے باوجود کھاتے پیتے رہو، بلکہ کھانے پینے اور روزے کے درمیان حدِ فاصل صبح صادق کا یقین ہے، اس یقین سے پہلے کھانے پینے کو حرام سمجھنا درست نہیں، اور یقین کے بعد کھانے پینے میں مشغول رہنا بھی حرام اور روزے کے لئے مفسد ہے، اگرچہ ایک ہی منٹ کے لئے ہو، سحری کھانے میں وسعت اور گنجائش صرف اسی وقت تک ہے جب تک صبح صادق کا یقین نہ ہو، بعض صحابہ کرامؓ کے ایسے واقعات کو بعض کہنے والوں نے اس طرح بیان کیا کہ سحری کھاتے ہوئے صبح ہو گئی اور وہ بے پروائی سے کھاتے رہے، یہ اسی پر مبنی تھا کہ صبح کا یقین نہیں ہوا تھا اس لئے کہنے والوں کی جلد بازی سے متاثر نہیں ہوئے۔

ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلال کی اذان تمہیں سحری کھانے سے مانع نہ ہونی چاہئے، کیونکہ وہ رات سے اذان دے دیتے ہیں، اس لئے تم بلال کی اذان سن کر بھی اُس وقت تک کھاتے پیتے رہو جب تک ابنِ اُمّ مکتوم کی اذان نہ سنو، کیونکہ وہ ٹھیک طلوعِ صبح صادق پر اذان دیتے ہیں۔ (بخاری و مسلم) ^[۳]

اس حدیث کے ناتمام نقل کرنے سے بعض معاصرین کو یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ اذان فجر کے بعد بھی کچھ دیر کھایا پیا

۱۔ مسند احمد رقم الحدیث: ۱۷۸۷۰

۲۔ احکام القرآن للخصا، باب الاکل والشرب ج: ۲ ص: ۷۵

۳۔ صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لا یمنعکم من سحورکم... إلخ ج: ۱ ص: ۲۵۷، وصحیح مسلم، کتاب الصیام،

باب بیان الدخول فی الصوم... إلخ ج: ۱ ص: ۳۲۹، ۳۵۰

جائے تو مضائقہ نہیں، اور جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلی کہ صبح کی اذان ہو رہی تھی اس کے لئے جائز کر دیا کہ وہ جلدی جلدی کچھ کھالے، حالانکہ اسی حدیث میں واضح طور پر بتلادیا گیا ہے کہ اذان ابن اُمّ مکتومؓ جو ٹھیک طلوع فجر کے ساتھ ہوتی تھی اس پر کھانے سے رُک جانا ضروری ہے، اس کے علاوہ قرآن کریم نے خود جو حد بندی فرمادی ہے وہ طلوع صبح کا تین ہے، اس کے بعد ایک منٹ کے لئے بھی کھانے پینے کی اجازت دینا نص قرآن کی خلاف ورزی ہے، صحابہ کرامؓ اور اسلاف اُمت سے جو افطار و سحر میں مسابہت کی روایات منقول ہیں ان سب کا محل نص قرآن کے مطابق یہی ہو سکتا ہے کہ تین صبح صادق سے پہلے پہلے زیادہ احتیاطی تنگی اختیار نہ کی جائے، امام ابن کثیرؒ نے بھی ان روایات کو اسی بات پر محمول فرمایا ہے، ورنہ نص قرآنی کی صریح مخالفت کو کون مسلمان برداشت کر سکتا ہے، اور صحابہ کرامؓ سے تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، خصوصاً جبکہ قرآن کریم نے اسی آیت کے اخیر میں تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ کے ساتھ فَلَا تَقْرَبُوهَاؕ فرما کر خاص احتیاط کی تاکید بھی فرمادی ہے۔

مسئلہ :- یہ سب کلام ان لوگوں کے بارے میں ہے جو ایسے مقام پر ہیں جہاں سے صبح صادق کو چشم خود دیکھ کر یقین حاصل کر سکتے ہیں، اور مطلع بھی صاف ہے، اور وہ صبح صادق کی ابتدائی روشنی کی پہچان بھی رکھتے ہیں، تو ان کو لازم ہے کہ براہ راست اُفق کو دیکھ کر عمل کریں، اور جہاں یہ صورت نہ ہو مثلاً کھلا ہوا اُفق سامنے نہیں یا مطلع صاف نہیں، یا اس کو صبح صادق کی پہچان نہیں، اس لئے وہ دوسرے آثار و علامات یا ریاضی حسابات کے ذریعے وقت کا تعین کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کے لئے کچھ وقت ایسا آئے گا کہ صبح صادق کا ہو جانا مشکوک ہو، یقینی نہ ہو، ایسے لوگوں کو مشکوک حالت میں کیا کرنا چاہئے؟ اس کے متعلق امام حصّاصؒ نے ”احکام القرآن“ میں فرمایا کہ اس حالت میں اصل تو یہی ہے کہ کھانے پینے پر اقدام نہ کرے، لیکن مشکوک حالت میں صبح صادق کا یقین ہونے سے پہلے پہلے کسی نے کچھ کھاپی لیا تو گناہگار نہیں ہوگا، لیکن اگر بعد میں تحقیق سے یہ ثابت ہو گیا کہ اُس وقت صبح ہو چکی تھی تو قضا اس کے ذمے لازم ہے، جیسے شروع رمضان میں چاند نظر نہ آیا اور لوگوں نے روزہ نہیں رکھا، مگر بعد میں شہادت سے ۲۹ کا چاند ثابت ہو گیا، تو جن لوگوں نے اس دن کو شعبان کی تیسویں تاریخ سمجھ کر روزہ نہیں رکھا تھا، وہ گناہگار تو نہیں ہوئے، مگر اس روزے کی قضا اُن پر باتفاق لازم ہے، اسی طرح بادل کے دن میں غروب کے گمان پر روزہ افطار کر لیا، بعد میں آفتاب نکل آیا، تو یہ شخص گناہگار تو نہیں مگر قضا اس پر واجب ہے۔

امام حصّاصؒ کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جس شخص کی آنکھ دیر میں کھلی اور عام طور پر صبح کی اذان ہوئی

۱۔ تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۵۱۵

۲۔ باب الاكل والشرب والجماع ليلة الصيام ج: ۱ ص: ۷۲

تھی جس سے صبح ہونے کا یقین لازمی ہے، وہ جان بوجھ کر اس وقت کچھ کھائے گا تو وہ گناہگار بھی ہوگا اور قضا بھی اس پر لازم ہوگی، اور مشکوک حالت میں کھائے گا تو گناہ ساقط ہو جائے گا، مگر قضا ساقط نہ ہوگی، اور کسی نہ کسی درجہ میں کراہت بھی ہوگی۔

اعتکاف اور اس کے مسائل

”اعتکاف“ کے لغوی معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں، اور اصطلاح قرآن و سنت میں خاص شرائط کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنے اور قیام کرنے کا نام ”اعتکاف“ ہے، لفظ **فِي الْمَسْجِدِ** کے عموم سے ثابت ہوا کہ اعتکاف ہر مسجد میں ہو سکتا ہے، حضرات فقہاء نے جو یہ شرط بیان کی ہے کہ اعتکاف صرف اُس مسجد میں ہو سکتا ہے جس میں جماعت ہوتی ہو، غیر آباد مسجد جہاں جماعت نہ ہوتی ہو اس میں اعتکاف درست نہیں، یہ شرط درحقیقت مسجد کے مفہوم ہی سے مستفاد ہے، کیونکہ مساجد کے بنانے کا اصل مقصد جماعت کی نماز ہے، ورنہ تنہا نماز تو ہر جگہ دکان مکان وغیرہ میں ہو سکتی ہے۔

مسئلہ:- روزے کی رات میں کھانا، پینا، بی بی سے مباشرت سب کا حلال ہونا اوپر بیان ہوا ہے، حالت اعتکاف میں کھانے پینے کا تو وہی حکم ہے جو سب کے لئے ہے، مگر مباشرتِ نساء کے معاملہ میں الگ ہے، کہ وہ رات میں بھی جائز نہیں، اس لئے اس آیت میں اسی کا حکم بتایا گیا ہے۔

مسئلہ:- اعتکاف کے دوسرے مسائل کہ اس کے ساتھ روزہ شرط ہے، اور یہ کہ اعتکاف میں مسجد سے نکلنا بغیر حاجتِ طبعی یا شرعی کے جائز نہیں، کچھ اسی لفظ ”اعتکاف“ سے مستفاد ہیں، کچھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل سے۔

روزے کے معاملے میں احتیاط کا حکم

آخر آیت میں **تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا** فرما کر اشارہ کر دیا کہ روزے میں کھانے پینے اور مباشرت کی جو ممانعت ہے یہ اللہ کے حدود ہیں، ان کے قریب بھی مت جاؤ، کیونکہ قریب جانے سے حد شکنی کا احتمال ہے، اسی لئے روزہ کی حالت میں کلی کرنے میں مبالغہ کرنا مکروہ ہے، جس سے پانی اندر جانے کا خطرہ ہو، منہ کے اندر کوئی دوا استعمال کرنا مکروہ ہے، بی بی سے بوس و کنار مکروہ ہے، اسی طرح سحری کھانے میں احتیاطاً وقت ختم ہونے سے دو چار منٹ پہلے ختم کرنا اور افطار میں دو تین منٹ مؤخر کرنا بہتر ہے، اس میں بے پروائی اور سہل انگاری اس ارشادِ خداوندی کے خلاف ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا

اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق، اور نہ پہنچاؤ اُن کو حاکموں تک کہ کھا جاؤ

فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۸﴾

کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کر کے (ناحق) اور تم کو معلوم ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طریقوں سے نہ کھاؤ، اور نہ ان کا مقدمہ حاکموں کے پاس اس غرض سے لے جاؤ کہ لوگوں کے مال کا کوئی حصہ جانتے بوجھتے ہڑپ کرنے کا گناہ کرو۔ ﴿۱۸۸﴾

ربط آیات خلاصہ تفسیر

پچھلی آیتوں میں روزے کے احکام مذکور تھے، جس میں حلال چیزوں کے استعمال کو ایک معین زمانے میں اور معین وقت میں حرام کر دیا گیا ہے، اس کے بعد مال حرام حاصل کرنے اور اس کے استعمال کرنے کی ممانعت اسی مناسبت سے ذکر کی گئی کہ عبادتِ صوم کا اصل منشا یہی ہے کہ انسان کچھ عرصے حلال چیزوں سے بھی صبر کا خوگر ہو جائے گا، تو حرام چیزوں سے بچنا آسان ہو جائے گا، نیز یہ مناسبت بھی ہے کہ جب روزہ ختم ہو افطار کے لئے مالِ حلال مہیا کرنا چاہئے، جس نے دن بھر روزہ رکھا شام کو مالِ حرام سے افطار کیا اس کا روزہ اللہ کے نزدیک قبول نہیں۔

حکم ششم :- مالِ حرام سے بچنا

اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق مت کھاؤ، اور ان (کے جھوٹے مقدمہ) کو حکام کے یہاں اس غرض سے رُجوع مت کرو کہ (اس کے ذریعہ سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریقِ گناہ (یعنی ظلم) کے کھا جاؤ، جبکہ تم کو (اپنے جھوٹ اور ظلم کا) علم بھی ہو۔

معارف مسائل

اس آیت میں حرام طریقوں سے مال حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی ممانعت ہے، جس طرح اس سے پہلے

اسی سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۶۸ میں حلال طریقہ پر حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی اجازت کا بیان گزر چکا ہے، جس میں ارشاد ہے:-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ﴿۱۶۸﴾
 ”یعنی اے لوگو! کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے جو چیزیں حلال اور ستھری ہیں، اور شیطان کے قدم پر نہ چلو، کیونکہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔“
 اور سورہ نحل آیت ۱۱۴ میں ارشاد فرمایا:-

فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمْ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا وَاشْكُرُوا لِعِمَّتِ اللَّهِ إِنَّ كُنتُمْ لِيَآئِهِ تَعْبُدُونَ ﴿۱۱۴﴾
 ”یعنی کھاؤ جو روزی دی تم کو اللہ تعالیٰ نے حلال اور پاک اور شکر کرو اللہ کے احسان کا، اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔“

کسبِ مال کے اچھے بُرے ذرائع اور اچھائی بُرائی کا معیار

جس طرح مال کی ضرورت اور مدارِ زندگی ہونے پر ساری دُنیا اور اس کی ہر قوم و ملت کا اتفاق ہے، اسی طرح اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس کی تحصیل کے کچھ ذرائع پسندیدہ اور جائز ہیں، کچھ ناپسند اور ممنوع ہیں۔ چوری، ڈاکہ، دھوکہ، فریب کو ساری ہی دُنیا برا سمجھتی ہے، لیکن ان ذرائع کے جائز یا ناجائز ہونے کا کوئی صحیح معیار عام طور پر لوگوں کے ہاتھ میں نہیں، اور ہو بھی نہیں سکتا، کیونکہ اس کا تعلق پوری دُنیا کے انسانوں کی صلاح و فلاح سے ہے اور پورا عالمِ انسانیت اس سے متاثر ہوتا ہے، اس کا صحیح اور معقول معیار صرف وہی ہو سکتا ہے جو ربِّ العالمین کی طرف سے بذریعہ وحی بھیجا گیا ہو، ورنہ اگر خود انسان اس کا معیار بنانے کا مختار ہو تو جو لوگ اس کا قانون بنائیں گے وہ اپنی قوم یا اپنے وطن یا اپنی ملت کے بارے میں جو کچھ سوچیں گے وہ عام عادت کے مطابق اس سے مختلف ہوگا جو دوسری قومیں اور وطنوں کے متعلق سوچا جائے گا، اور بین الاقوامی کانفرنسوں کی صورت میں پوری دُنیا کی نمائندگی کی جائے تو تجربہ شہد ہے کہ وہ بھی ساری مخلوق کو مطمئن کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ قانونی نا انصافی انجام کار جنگ و جدل اور فساد کی صورت اختیار کرے گی۔

اسلامی نظامِ معاش ہی دُنیا میں امنِ عام قائم کر سکتا ہے

شریعتِ اسلام نے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کا جو قانون بتانا ہے وہ صراحۃً وحیِ الہی سے ہے یا اس سے مستفاد، اور وہی ایک ایسا معقول، فطری اور جامع قانون ہے جو ہر قوم و ملت اور ہر ملک و وطن میں چل سکتا ہے، اور امنِ عامہ کا ضامن ہو سکتا ہے، کیونکہ اس قانونِ الہی میں قابلِ اشتراک چیزوں کو مشترک اور وقفِ عام رکھا گیا ہے، جس میں تمام

انسان مساوی حق رکھتے ہیں، جیسے ہوا، پانی، خود روگھاس، آگ کی حرارت اور غیر مملوک جنگلات اور غیر آباد پہاڑی جنگلات کی پیداوار وغیرہ کہ ان میں سب انسانوں کا مشترک حق ہے، کسی کو اُن پر مالکانہ قبضہ جائز نہیں، اور جن چیزوں کے اشتراک میں انسانی معاشرت میں خلل پیدا ہوتا ہے، یا نزاع و جدال کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں ان میں انفرادی ملکیت کا قانون جاری فرمایا گیا، کسی زمین یا اس کی پیداوار پر ابتدائی ملکیت کا قانون جدا ہے، اور پھر انتقال ملکیت کا جدا، اس قانون کی ہر دفعہ میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ کوئی انسان ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے، بشرطیکہ وہ اپنی جدوجہد ان کی تحصیل میں خرچ کرے، اور کوئی انسان دُوسروں کے حقوق غصب کر کے یا دُوسروں کو نقصان پہنچا کر سرمایہ کو محدود افراد میں مقید نہ کر دے، انتقال ملکیت خواہ بعد الموت وراثت کے قانون الہی کے مطابق ہو، یا پھر بیع و شرا وغیرہ کے ذریعے فریقین کی رضامندی سے ہو، مزدوری ہو، یا کسی مال کا معاوضہ دونوں میں اس کو ضروری قرار دیا گیا کہ معاملہ میں کوئی دھوکہ، فریب، یا تلبیس نہ ہو، اور کوئی ایسا ابہام اور اجمال نہ رہے جس کی وجہ سے باہمی منازعت کی نوبت آئے۔

نیز اس کی بھی رعایت رکھی گئی ہے کہ فریقین جو رضامندی دے رہے ہیں وہ حقیقی رضامندی ہو، کسی انسان پر دباؤ ڈال کر کوئی رضامندی نہ لی گئی ہو، شریعت اسلام میں جتنے معاملات باطل یا فاسد اور گناہ کہلاتے ہیں اُن سب کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اُن میں وجوہ مذکور میں سے کسی وجہ سے خلل ہوتا ہے، کہیں دھوکہ فریب ہوتا ہے، کہیں نامعلوم چیز یا نامعلوم عمل کا معاوضہ ہوتا ہے، کہیں کسی کا حق غصب ہوتا ہے، کہیں کسی کو نقصان پہنچا کر اپنا نفع کیا جاتا ہے، کہیں حقوق عامہ میں ناجائز تصرف ہوتا ہے، سود، قمار وغیرہ کو حرام قرار دینے کی اہم وجہ یہ ہے کہ وہ حقوق عامہ کے لئے مضر ہیں، ان کے نتیجے میں چند افراد پلتے بڑھتے ہیں، اور پوری ملت مفلس ہوتی ہے، ایسے معاملات فریقین کی رضامندی سے بھی اس لئے حلال نہیں کہ وہ پوری ملت کے خلاف ایک جرم ہے، آیت مذکورہ ان تمام ناجائز صورتوں پر حاوی ہے، ارشاد ہے: **وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ** یعنی نہ کھاؤ ایک دُوسرے کا مال ناجائز طریق پر۔ اس میں ایک بات تو یہ قابل غور ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ میں ”أَمْوَالَكُمْ“ آیا ہے، جس کے اصلی معنی ہیں اپنے اموال، جس میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا کہ تم جو کسی دُوسرے کے مال میں ناجائز تصرف کرتے ہو تو یہ غور کرو کہ دُوسرے شخص کو بھی اپنے مال سے ایسی ہی محبت اور تعلق ہوگا جیسا تمہیں اپنے مال سے ہے، اگر وہ تمہارے مال میں ایسا ناجائز تصرف کرتا تو تمہیں جو دکھ پہنچتا اُس کا اس وقت بھی ایسا ہی احساس کرو کہ گویا وہ تمہارا مال ہے۔

اس کے علاوہ اشارہ اس طرف بھی ہو سکتا ہے کہ جب ایک شخص دُوسرے کے مال میں کوئی ناجائز تصرف کرتا ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ اگر یہ رسم چل پڑی تو دُوسرے اس کے مال میں ایسا ہی تصرف کریں گے، اس حیثیت سے کسی شخص کے مال میں ناجائز تصرف درحقیقت اپنے مال میں ناجائز تصرف کے لئے راستہ ہموار کرنا ہے، غور کیجئے اشیائے

ضرورت میں ملاوٹ کی رسم چل جائے، کوئی گھی میں تیل یا چربی ملا کر زائد پیسے حاصل کرے، تو اس کو جب دودھ خریدنے کی ضرورت پڑے گی، دودھ والا اس میں پانی ملا کر دے گا، مسالہ کی ضرورت ہوگی اس میں ملاوٹ ہوگی، دوا کی ضرورت ہوگی اس میں بھی یہی منظر سامنے آئے گا، تو جتنے پیسے ایک شخص نے ملاوٹ کر کے زائد حاصل کر لئے، دوسرا آدمی وہ پیسے اس کی جیب سے نکال لیتا ہے، اسی طرح دوسرے کے پیسے تیسرا نکال لیتا ہے، یہ بیوقوف اپنی جگہ بیسیوں کی زیادتی شمار کر کے خوش ہوتا ہے، مگر انجام نہیں دیکھتا کہ اس کے پاس کیا رہا، تو جو کوئی دوسرے کے مال کو غلط طریقے سے حاصل کرتا ہے درحقیقت وہ اپنے مال کے ناجائز تصرف کا دروازہ کھولتا ہے۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ اس ارشاد خداوندی کے الفاظ عام ہیں کہ باطل اور ناجائز طریق سے کسی کا مال نہ کھاؤ، اس میں کسی کا مال غصب کر لینا بھی داخل ہے، چوری اور ڈاکہ بھی، جن میں دوسرے پر ظلم کر کے جبراً مال چھین لیا جاتا ہے، اور سود، قمار، رشوت اور تمام بیوع فاسدہ اور معاملات فاسدہ بھی جوازِ رُوءے شرع جائز نہیں، اگرچہ فریقین کی رضامندی بھی متحقق ہو، جھوٹ بول کر یا جھوٹی قسم کھا کر کوئی مال حاصل کر لینا یا ایسی کمائی جس کو شریعتِ اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے، اگرچہ اپنی جان کی محنت ہی سے حاصل کی گئی ہو وہ سب حرام اور باطل ہیں، اور قرآن کے الفاظ میں اگرچہ صراحت کھانے کی ممانعت مذکور ہے، لیکن مراد اس جگہ صرف کھانا ہی نہیں بلکہ مطلقاً استعمال کرنا ہے، خواہ کھاپی کر، یا پہن کر یا دوسرے طریقے کے استعمال سے، مگر محاورات میں ان سب قسم کے استعمالوں کو کھالینا ہی بولا جاتا ہے، کہ فلاں آدمی فلاں کا مال کھا گیا، اگرچہ وہ مال کھانے پینے کے لائق نہ ہو۔

شانِ نزول

یہ آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے، واقعہ یہ ہے کہ حضراتِ صحابہ کرامؓ میں سے دو صاحبوں کا آپس میں ایک زمین پر جھگڑا ہوا، مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہوا، مدعی کے پاس گواہ نہ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شرعی ضابطہ کے مطابق مدعا علیہ کو حلف کرنے کا حکم دیا، وہ حلف پر آمادہ ہو گیا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور نصیحت اُن کو یہ آیت سنائی: **إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا (آل عمران: ۷۷)** جس میں قسم کھا کر کوئی مال حاصل کرنے پر وعید مذکور ہے، صحابی نے جب یہ آیت سنی تو قسم کھانے کو ترک کر دیا اور زمین مدعی کے حوالے کر دی۔ (روح المعانی) ^[۱]

اس واقعہ میں یہ آیت نازل ہوئی، جس میں ناجائز طریق پر کسی کا مال کھانے یا حاصل کرنے کو حرام قرار دیا ہے،

اور اس کے آخر میں خاص طور پر جھوٹا مقدمہ بنانے اور جھوٹی قسم کھانے اور جھوٹی شہادت دینے اور دلوں کی سخت ممانعت اور اس پر وعید آئی ہے، ارشاد ہے: **وَتَذْلُوْا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتُنَاقِلُوْا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ** ^(۱۸۸) یعنی نہ لے جاؤ اموال کے مقدمات حکام تک، تاکہ ان کے ذریعہ تم لوگوں کے اموال کا کوئی حصہ کھا جاؤ بطریق گناہ جبکہ تم جانتے بھی ہو کہ اس میں تمہارا کوئی حق نہیں، تم جھوٹا مقدمہ بنا رہے ہو۔ **وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ** سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی مغالطہ کی بنا پر اس چیز کو اپنا حق سمجھتا ہے، وہ اگر عدالت میں دعویٰ دائر کر کے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے تو وہ اس وعید میں داخل نہیں، اسی جیسے ایک واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ وَأَنْتُمْ تَخْتَصِمُونَ إِلَيَّ وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ يَكُونَ الْحَنَ بِحُجَّتِهِ مِنْ بَعْضٍ فَأَقْضِي لَهُ عَلَى نَحْوِ مَا أَسْمَعُ مِنْهُ فَمَنْ قَضَيْتُ لَهُ بِشَيْءٍ مِنْ حَقِّ أَخِيهِ فَلَا يَأْخُذْهُ فَإِنَّمَا أَقْطَعُ لَهُ قِطْعَةً مِّنَ النَّارِ - (رواه البخاری ومسلم عن أم سلمة) ^(۱)

”یعنی میں ایک انسان ہوں اور تم میرے پاس اپنے مقدمات لاتے ہو، اس میں یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے معاملہ کو زیادہ رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کرے، اور میں اسی سے مطمئن ہو کر اس کے حق میں فیصلہ کر دوں تو (یاد رکھو کہ حقیقت حال تو صاحب معاملہ کو خود معلوم ہوتی ہے) اگر فی الواقع وہ اس کا حق نہیں ہے تو اس کو لینا نہیں چاہئے، کیونکہ اس صورت میں جو کچھ میں اس کو دوں گا وہ جہنم کا ایک قطعہ ہوگا۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں واضح فرمادیا کہ اگر امام یا قاضی یا امام المسلمین کسی مغالطہ کی وجہ سے کوئی غلط فیصلہ کر دے جس میں ایک کا حق دوسرے کو ناجائز طور پر مل رہا ہو، تو اس عدالتی فیصلہ کی وجہ سے وہ اس کے لئے حلال نہیں ہو جاتا، اور جس کے لئے حلال ہے اس کے لئے حرام نہیں ہو جاتا، الغرض عدالت کا فیصلہ کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال نہیں بناتا، اگر کوئی شخص دھوکہ فریب یا جھوٹی شہادت یا جھوٹی قسم کے ذریعہ کسی کا مال بذریعہ عدالت لے لے، تو اس کا وبال اس کی گردن پر رہے گا، اس کو چاہئے کہ آخرت کے حساب کتاب اور علیم وخبیر کی عدالت میں پیشی کا خیال کر کے اس کو چھوڑ دے۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جن معاملات میں کوئی عقد یا فتح ہوتا ہو اور جن میں قاضی یا جج کو بھی شرعاً اختیارات حاصل ہوتے ہیں، ایسے معاملات میں اگر جھوٹی قسم یا جھوٹی شہادت کی بنا پر بھی کوئی فیصلہ قاضی نے صادر کر دیا تو شرعاً وہ

^(۱) صحیح البخاری، کتاب الأحکام، باب من قضی له بحق أخیه... إلخ ج: ۲ ص: ۱۰۶۳، ۱۰۶۵، وصحیح مسلم، کتاب الأقضية، باب بیان ان حکم

عقد یا فتح صحیح ہو جائے گا، اور حلال و حرام کے احکام اس پر عائد ہو جائیں گے، اگرچہ جھوٹ بولنے اور جھوٹی شہادت دلوانے کا وبال اس کی گردن پر رہے گا۔

مالِ حلال کی برکات اور حرام کی نحوست

حرام سے بچنے اور حلال کے حاصل کرنے کے لئے قرآن کریم نے مختلف مقامات میں مختلف عنوانات سے تاکیدیں فرمائی ہیں، ایک آیت میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ انسان کے اعمال و اخلاق میں بہت بڑا دخل حلال کھانے کو ہے، اگر اس کا کھانا پینا حلال نہیں تو اس سے اخلاقِ حمیدہ اور اعمالِ صالحہ کا صدور مشکل ہے، ارشاد ہے:-

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿۵۱﴾ (المؤمنون)

”یعنی اے گروہِ انبیاء! حلال اور پاک چیزیں کھاؤ، اور نیک عمل کرو، میں تمہارے اعمال کی حقیقت سے واقف ہوں۔“

اس آیت میں حلال کھانے کے ساتھ عملِ صالح کا حکم فرما کر اشارہ کر دیا ہے کہ اعمالِ صالحہ کا صدور جب ہی ہو سکتا ہے جبکہ انسان کا کھانا پینا حلال ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں یہ بھی واضح فرمادیا کہ اس آیت میں اگرچہ خطاب انبیاء علیہم السلام کو ہے، مگر یہ حکم کچھ انہیں کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ سب مسلمان اس کے مأمور ہیں، اس حدیث کے آخر میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ حرام مال کھانے والے کی دُعا قبول نہیں ہوتی، بہت سے آدمی عبادت وغیرہ میں مشقت اٹھاتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ دُعا کے لئے پھیلاتے ہیں، اور ”یا رَبِّ، یا رَبِّ“ پکارتے ہیں، مگر کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس ان کا حرام ہے تو ان کی یہ دُعا کہاں قبول ہو سکتی ہے۔^[۱]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ایک بہت بڑا حصہ اسی کام کے لئے وقف رہا ہے کہ اُمت کو حرام سے بچانے اور حلال کے استعمال کرنے کی ہدایتیں دیں۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے حلال کھایا اور سنت کے مطابق عمل کیا اور لوگ اس کی ایذاؤں سے محفوظ رہے، وہ جنت میں جائے گا، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آج کل تو یہ حالات آپ کی اُمت میں عام ہیں، بیشتر مسلمان ان کے پابند ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! آئندہ بھی ہر زمانہ میں ایسے لوگ رہیں گے جو ان احکام کے پابند ہوں گے۔ (یہ حدیث ترمذی نے روایت کی ہے، اور اس کو صحیح فرمایا ہے)^[۲]

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے فرمایا کہ چار

خصلتیں ایسی ہیں جب وہ تمہارے اندر موجود ہوں تو پھر دنیا میں کچھ بھی حاصل نہ ہو تو تمہارے لئے کافی ہیں، وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ ایک امانت کی حفاظت، دوسرے سچ بولنا، تیسرے حسن خلق، چوتھے کھانے میں حلال کا اہتمام۔^[۱]

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ میرے لئے یہ دُعا فرمادیجئے کہ میں مقبول الدعاء ہو جاؤں، جو دُعا کیا کروں قبول ہوا کرے، آپ نے فرمایا: اے سعد! اپنا کھانا حلال اور پاک بنالو، مستجاب الدعوات ہو جاؤ گے، اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے! بندہ جب اپنے پیٹ میں حرام لقمہ ڈالتا ہے تو چالیس روز تک اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، اور جس شخص کا گوشت حرام مال سے بنا ہو اس گوشت کے لئے تو جہنم کی آگ ہی لائق ہے۔^[۲]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ کوئی بندہ اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوتا جب تک اس کا قلب اور زبان مسلمان نہ ہو جائے، اور جب تک اس کے پڑوسی اس کی ایذاؤں سے محفوظ نہ ہو جائیں، اور جب کوئی بندہ مالِ حرام کھاتا ہے پھر اس کو صدقہ کرتا ہے تو وہ قبول نہیں ہوتا، اور اگر اس میں سے خرچ کرتا ہے تو برکت نہیں ہوتی، اور اگر اس کو اپنے وارثوں کے لئے چھوڑ جاتا ہے تو وہ جہنم کی طرف جانے کے لئے اس کا توشہ ہوتا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ بری چیز سے برے عمل کو نہیں دھوئے، ہاں اچھے عمل سے برے عمل کو دھو دیتے ہیں۔^[۳]

محشر میں ہر انسان سے پانچ سوالات

اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

مَا تَزَالُ قَدَمَا عَبْدٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتَّى يُسْأَلَ عَنْ أَرْبَعٍ: عَنْ عُمْرِهِ فِيمَا أَفْنَاهُ، وَعَنْ شَبَابِهِ فِيمَا أَبْلَاهُ، وَعَنْ مَالِهِ مِنْ آيْنٍ اكْتَسَبَهُ وَفِيمَا أَنْفَقَهُ، وَعَنْ عِلْمِهِ مَاذَا عَمِلَ فِيهِ۔ (البيهقي، ترغيب)^[۴]
”قیامت کے روز محشر میں کوئی بندہ اپنی جگہ سے سرک نہ سکے گا، جب تک اس سے چار سوالوں کا جواب نہ لیا جائے، ایک یہ کہ اس نے اپنی عمر کس کام میں فنا کی، دوسرے یہ کہ اپنی جوانی کس شغل

[۱] شعب الإيمان للبيهقي، باب في الأمانات رقم الحديث: ۵۰۲۹

[۲] المعجم الأوسط للطبرانی رقم الحديث: ۶۶۸۳

[۳] المعجم الكبير للطبرانی رقم الحديث: ۱۰۴۰۱

[۴] الترغيب والترهيب، كتاب العلم، باب الترهيب من ان يعلم ولا يعمل... إلخ رقم الحديث: ۱۲۷

[۵] بعض روایات میں پانچ کا عدد ہے، اس میں مال کے دوسو سوالوں کو الگ الگ شمار کر لیا گیا۔ ۱۲ منہ

میں برباد کی، تیسرے یہ کہ اپنا مال کہاں سے کمایا، اور کہاں خرچ کیا، اور چوتھے یہ کہ اپنے علم پر کہاں تک عمل کیا۔“

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ اے جماعتِ مہاجرین! پانچ خصلتیں ہیں جن کے متعلق میں اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ تمہارے اندر پیدا ہو جائیں، ایک یہ ہے کہ جب کسی قوم میں بے حیائی پھیلتی ہے تو ان پر طاعون اور وبائیں اور ایسے نئے نئے امراض مسلط کر دیئے جاتے ہیں جو ان کے آباء و اجداد نے سنے بھی نہ تھے، اور دوسرے یہ کہ جب کسی قوم میں ناپ تول کے اندر کمی کرنے کا مرض پیدا ہو جائے تو ان پر قحط اور گرانی اور مشقت و محنت اور حکام کے مظالم مسلط کر دیئے جاتے ہیں، اور تیسرے یہ کہ جب کوئی قوم زکوٰۃ ادا نہ کرے تو بارش بند کر دی جاتی ہے، اور چوتھے یہ کہ جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے عہد کو توڑ ڈالے تو اللہ تعالیٰ اُن پر اجنبی دشمن مسلط فرمادیتے ہیں، جو اُن کے مال بغیر کسی حق کے چھین لیتا ہے، اور پانچویں یہ کہ جب کسی قوم کے ارباب اقتدار کتاب اللہ کے قانون پر فیصلہ نہ کریں، اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام اُن کے دل کو نہ لگیں تو اللہ تعالیٰ اُن کے آپس میں منافرت اور لڑائی جھگڑے ڈال دیتے ہیں۔ (یہ روایت ابن ماجہ اور بیہقی وغیرہ نے نقل کی ہے، اور حاکم نے اس کو صحیح علی شرط مسلم فرمایا ہے) ^(۱)

اللہ تعالیٰ ہم کو اور سب مسلمانوں کو ان آفات سے محفوظ رہنے کی توفیق کامل عطا فرمائیں، وَ اخْرُجْ عَوْنًا اِنْ اُحْصِدَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْاَهْلِ ط قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ط

تجھ سے پوچھتے ہیں نئے چاند کا، کہہ دے کہ یہ اوقات مقررہ ہیں لوگوں کے واسطے اور حج کے واسطے،

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَى ج

اور نیکی یہ نہیں کہ گھروں میں آؤ ان کی پشت کی طرف سے، اور لیکن نیکی یہ کہ جو کوئی ڈرے اللہ سے،

وَاْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۱۸۹﴾ وَقَاتِلُوا

اور گھروں میں آؤ دروازوں سے، اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم اپنی مراد کو پہنچو۔ اور لڑو

فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ

اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو لڑتے ہیں تم سے اور کسی پر زیادتی مت کرو، بے شک اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے

الْمُعْتَدِينَ ۱۹۰ ۖ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِّنْ حَيْثُ

زیادتی کرنے والوں کو، اور مار ڈالو اُن کو جس جگہ پاؤ اور نکال دو اُن کو جہاں سے انہوں نے

أَخْرِجُوكُمْ وَالْفِتْنَةَ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تَقْتُلُوهُمْ عِنْدَ

تم کو نکالا، اور دین سے بچلانا مار ڈالنے سے بھی زیادہ سخت ہے، اور نہ لڑو ان سے

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقْتَلُوا فِيهِ ۚ فَإِنْ قُتِلُوا فَاقْتُلُوهُمْ ط

مسجد الحرام کے پاس جب تک کہ وہ نہ لڑیں تم سے اس جگہ، پھر اگر وہ خود ہی لڑیں تم سے تو ان کو مارو،

كَذٰلِكَ جَزَاءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝۱۹۱

یہی ہے سزا کافروں کی۔

آسان ترجمہ قرآن

لوگ آپ سے نئے مہینوں کے چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ انہیں بتا دیجئے کہ یہ لوگوں کے (مختلف معاملات کے) اور حج کے اوقات متعین کرنے کے لئے ہیں۔ اور یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں میں اُن کی پشت کی طرف سے داخل ہو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ انسان تقویٰ اختیار کرے، اور تم گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تمہیں فلاح حاصل ہو۔ ۱۸۹ اور اُن لوگوں سے اللہ کے راستے میں جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں، اور زیادتی نہ کرو۔ یقین جانو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۱۹۰ اور تم ان لوگوں کو جہاں پاؤ قتل کرو، اور انہیں اس جگہ سے نکال باہر کرو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا۔ اور فتنہ قتل سے زیادہ سنگین بُرائی ہے۔ اور تم ان سے مسجد حرام کے پاس اُس وقت تک لڑائی نہ کرو جب تک وہ خود اس میں تم سے لڑائی شروع نہ کریں۔ ہاں اگر وہ تم سے اس میں لڑائی

شروع کر دیں تو تم ان کو قتل کر سکتے ہو۔ ایسے کافروں کی سزا یہی ہے (۱۹۱)

ربط آیات

آیت لَيْسَ الْبِرُّ بِالْإِسْلَامِ (البقرة: ۱۷۷) کے تحت بیان ہو چکا ہے کہ اس کے بعد آخر سورۃ بقرہ تک ابواب البر کا بیان ہوگا، جو اہم احکام شرعیہ پر مشتمل ہیں، ان میں پہلا حکم قصاص کا، دوسرا وصیت کا، تیسرا اور چوتھا صوم اور اس کے متعلقہ مسائل کا، پانچواں اعتکاف کا، چھٹا مال حرام سے بچنے کا تھا، مذکورہ صدر دو آیتوں میں حج اور جہاد کے احکام و مسائل کا بیان ہے، اور حج کے حکم سے پہلے یہ بتلایا گیا کہ روزہ اور حج وغیرہ میں قمری مہینوں اور دنوں کا اعتبار ہوگا۔

لغات :- ”أَهْلًا“ ہلال کی جمع ہے، قمری مہینے کی ابتدائی چند راتوں کے چاند کو ”ہلال“ کہا جاتا ہے۔

مَوَاقِيتُ میقات کی جمع ہے، جس کے معنی مطلق وقت یا منتہائے وقت کے آتے ہیں۔ (قرطبی)

خلاصہ تفسیر

حکم ہفتم :- اعتبار حساب قمری درج وغیرہ

(بعض آدمی) آپ سے (ان) چاندوں کے (ہر مہینے گھٹنے بڑھنے کی) حالت (اور اس میں جو فائدہ ہے اس فائدہ) کی تحقیقات کرتے ہیں، آپ فرمادیتے کہ (فائدہ اس کا یہ ہے کہ) وہ چاند (اپنے اس گھٹنے اور بڑھنے کے اعتبار سے لزوماً یا سہولت) آلہ شناخت اوقات ہیں لوگوں کے (اختیاری معاملات مثل عدت و مطالبہ حقوق کے) لئے اور (غیر اختیاری عبادات مثل) حج (وزکوٰۃ و روزہ وغیرہ) کے لئے۔

حکم ہشتم :- اصلاح رسم جاہلیت

(بعض لوگ قبل اسلام کے اگر حج کا احرام باندھنے کے بعد کسی ضرورت سے گھر جانا چاہتے تھے تو دروازہ سے جانا ممنوع جانتے تھے، اس لئے پشت کی دیوار میں نقب دے کر اس میں سے اندر جاتے تھے، اور اس عمل کو فضیلت سمجھتے تھے، حق تعالیٰ اس کے متعلق بعد ذکر حج کے ارشاد فرماتے ہیں) اور اس میں کوئی فضیلت نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا کرو، ہاں لیکن فضیلت یہ ہے کوئی شخص حرام (چیزوں) سے بچے اور (چونکہ گھروں میں دروازہ کی طرف سے آنا حرام نہیں ہے اس لئے اس سے بچنا بھی ضروری نہیں، سو اگر آنا چاہو تو) گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ، اور (اصل الاصول تو یہ ہے کہ) خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو (اس سے البتہ) اُمید ہے کہ تم (دارین میں) کامیاب ہو۔

حکم نہم :- قتال کفار

(ذی قعدہ ۶ ہجری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ادائے عمرہ کے قصد سے مکہ معظمہ تشریف لے چلے، اُس وقت تک مکہ معظمہ مشرکین کے قبضہ اور حکومت میں تھا، ان لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ہمراہیوں کو مکہ کے اندر نہ جانے دیا اور عمرہ رہ گیا، آخر بڑی گفتگو کے بعد یہ معاہدہ قرار پایا کہ سالِ آئندہ تشریف لا کر عمرہ ادا فرماویں، چنانچہ ذی قعدہ ۷ھ میں پھر آپ اسی قصد سے تشریف لے چلے، لیکن آپ کے ساتھی مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ شاید مشرکین اپنا معاہدہ پورا نہ کریں، اور آمادہ مقابلہ و مقاتلہ نہ ہو جاویں، تو ایسی حالت میں نہ سکوت مصلحت ہے، اور اگر مقابلہ کیا جاوے تو ذی قعدہ میں قتال لازم آتا ہے، اور یہ مہینہ من جملہ اُن چار مہینوں کے ہے جن کو اشہر حرم کہا جاتا ہے، ان چاروں مہینوں میں اُس وقت تک قتل و قتال حرام و ممنوع تھا، یہ چار مہینے ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب تھے، غرض مسلمان اس تردد سے پریشان تھے، حق تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں کہ ان خاص معاہدہ کرنے والوں کے ساتھ بوجہ باہمی معاہدہ کے تم کو اپنی جانب سے ابتداء قتال کرنے کی اجازت نہیں، لیکن اگر وہ لوگ خود عہد شکنی کریں اور تم سے لڑنے کو آمادہ ہو جاویں تو اُس وقت تم کسی طرح کا اندیشہ دل میں مت لاؤ) اور (بے تکلف) تم (بھی) لڑو اللہ کی راہ میں (یعنی اس نیت سے کہ یہ لوگ دین کی مخالفت کرتے ہیں) ان لوگوں کے ساتھ جو (نقض عہد کر کے) تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور (از خود) حد (معاہدہ) سے مت نکلو، (کہ عہد شکنی کر کے لڑنے لگو)، واقعی اللہ تعالیٰ حد (قانون شرعی) سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے اور (جس حالت میں وہ خود عہد شکنی کریں تو اس وقت دل کھول کر خواہ) ان کو قتل کرو جہاں ان کو پاؤ، اور (خواہ) ان کو (مکہ سے) نکال باہر کرو جہاں سے انہوں نے تم کو (تنگ کر کے اور ایذائیں پہنچا کر) نکلنے (اور ہجرت کرنے) پر مجبور کیا ہے، اور (تمہارے اس قتل و اخراج کے بعد بھی عقلاً الزام انہیں پر رہے گا، کیونکہ عہد شکنی جو ان سے واقع ہوگی، بڑی شرارت کی بات ہے اور ایسی) شرارت (ضرر میں) قتل (و اخراج) سے بھی سخت تر ہے (کیونکہ اس قتل و اخراج کی نوبت اس شرارت ہی کی بدولت پہنچتی ہے) اور (علاوہ معاہدہ کے ان کے ساتھ ابتداء قتال کرنے سے ایک اور امر بھی مانع ہے وہ یہ کہ حرم شریف یعنی مکہ اور اس کا گرداگرد ایک واجب الاحترام جگہ ہے اور اس میں قتال کرنا اس کے احترام کے خلاف ہے، اس لئے بھی حکم دیا جاتا ہے کہ) ان کے ساتھ مسجد حرام کے قرب (و نواح) میں (جو حرم کہلاتا ہے) قتال مت کرو جب تک کہ وہ لوگ وہاں تم سے خود نہ لڑیں، ہاں اگر وہ (کفار) خود ہی لڑنے کا سامان کرنے لگیں تو (اس وقت پھر تم کو بھی اجازت ہے کہ) تم (بھی) ان کو مارو (دھاڑو) ایسے کافروں کی (جو حرم میں لڑنے لگیں) ایسی ہی سزا ہے۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں صحابہ کرامؓ کا ایک سوال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب نقل کیا گیا ہے، امام المفسرین حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی ایک خاص شان ہے، کہ انہوں نے بوجہ عظمت و ہیبت کے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات بہت کم کئے ہیں، بخلاف پچھلی اُمتوں کے کہ جنہوں نے بکثرت سوالات کئے اور اس ادب کو ملحوظ نہیں رکھا، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ صحابہ کرامؓ کے سوالات جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے کل چودہ ہیں، جن میں سے ایک سوال ابھی اوپر گزرا ہے: إِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي (البقرة: ۱۸۶)، دوسرا سوال یہ ہے، اور ان کے بعد سورہ بقرہ ہی میں چھ سوال اور مذکور ہیں، اور باقی چھ سوالات مختلف سورتوں میں آئے ہیں۔

آیت مذکورہ میں ذکر یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اَہْلَۃً یعنی شروع مہینے کے چاند کے متعلق سوال کیا کہ اس کی صورت آفتاب سے مختلف ہے، کہ وہ کبھی باریک ہلالی شکل میں ہوتا ہے، پھر آہستہ آہستہ بڑھتا ہے، پھر پورا دائرہ ہو جاتا ہے، پھر اس میں تدریجی کمی اسی طرح آتی ہے، اس کی حقیقت دریافت کی یا حکمت و مصلحت کا سوال کیا، دونوں احتمال ہیں، مگر جو جواب دیا گیا اس میں حکمت و مصلحت کا بیان ہے، اگر سوال ہی یہ تھا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے میں حکمت و مصلحت کیا ہے؟ تب تو جواب اس کے مطابق ہو ہی گیا، اور اگر سوال سے اس گھٹنے بڑھنے کی حقیقت دریافت کرنا مقصود تھا جو صحابہ کرامؓ کی شان سے بعید ہے تو پھر جواب بجائے حقیقت کے حکمت و مصلحت بیان کرنے سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اجرام سماویہ کے حقائق دریافت کرنا انسان کے بس میں بھی نہیں، اور ان کا کوئی دینی یا دنیوی کام اس حقیقت کے علم پر موقوف بھی نہیں، اس لئے حقیقت کا سوال فضول ہے، پوچھنے اور بتلانے کی بات یہ ہے کہ چاند کے اس طرح گھٹنے بڑھنے چھپنے اور طلوع ہونے سے ہمارے کون سے مصالح وابستہ ہیں، اس لئے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرمایا کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ تمہاری مصالح جو چاند سے وابستہ ہیں یہ ہیں کہ اس کے ذریعہ تمہیں اپنے معاملات اور معاہدوں کی میعاد مقرر کرنا اور حج کے ایام معلوم کرنا آسان ہو جائے گا۔

قمری اور شمسی حساب کی شرعی حیثیت

اس آیت سے تو اتنا معلوم ہوا کہ چاند کے ذریعے تمہیں تاریخوں اور مہینوں کا حساب معلوم ہو جائے گا، جس پر تمہارے معاملات اور عبادات حج وغیرہ کی بنیاد ہے، اسی مضمون کو سورہ یونس کی آیت نمبر ۵ میں اس عنوان سے بیان فرمایا ہے: وَقَدْ رَأَىٰ مَنَازِلَ لَتَعْلَمُوْا اَعْدَادَ السِّنِّیْنَ وَالْحِسَابِ (یونس: ۵) جس سے معلوم ہوا کہ چاند کو مختلف منزلوں اور مختلف حالات

سے گزارنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سال اور مہینوں اور تاریخوں کا حساب معلوم ہو سکے، مگر سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۱۲ میں اس حساب کا تعلق آفتاب سے بھی بتلایا گیا ہے، وہ یہ ہے:-

فَمَحَوْنَا آيَةَ الْبَيْلِ وَجَعَلْنَا آيَةَ الْنَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۚ (بنی اسرائیل: ۱۲)

”پھر مٹایا رات کا نمونہ اور بنا دیا دن کا نمونہ دیکھنے کو تاکہ تلاش کرو فضل اپنے رب کا اور تاکہ معلوم کرو گنتی برسوں کی اور حساب۔“

اس تیسری آیت سے اگرچہ یہ ثابت ہوا کہ سال اور مہینوں وغیرہ کا حساب آفتاب سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ (کما ذکرہ فی رُوح المعانی)

لیکن چاند کے معاملہ میں جو الفاظ قرآن کریم نے استعمال کئے ان سے واضح اشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ شریعت اسلام میں حساب چاند ہی کا متعین ہے، خصوصاً اُن عبادات میں جن کا تعلق کسی خاص مہینے اور اس کی تاریخوں سے ہے، جیسے روزہ رمضان، حج کے مہینے، حج کے ایام، محرم، شبِ براءت وغیرہ سے جو احکام متعلق ہیں وہ سب رُویۃ ہلال سے متعلق کئے گئے ہیں، کیونکہ اس آیت میں **هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ** فرما کر بتلادیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حساب چاند ہی کا معتبر ہے، اگرچہ یہ حساب آفتاب سے بھی معلوم ہو سکتا ہے۔

شریعت اسلام نے چاند کے حساب کو اس لئے اختیار فرمایا کہ اس کو ہر آنکھوں والا اُفق پر دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے، عالم، جاہل، دیہاتی، جزیروں، پہاڑوں کے رہنے والے جنگلی سب کو اس کا علم آسان ہے، بخلاف شمسی حساب کے کہ وہ آلاتِ رصدیہ اور قواعدِ ریاضیہ پر موقوف ہے، جس کو ہر شخص آسانی سے معلوم نہیں کر سکتا، پھر عبادات کے معاملہ میں تو قمری حساب کو بطور فرض متعین کر دیا، اور عام معاملات تجارت وغیرہ میں بھی اسی کو پسند کیا جو عبادتِ اسلامی کا ذریعہ ہے، اور ایک طرح کا اسلامی شعار ہے، اگرچہ شمسی حساب کو بھی ناجائز قرار نہیں دیا، شرط یہ ہے کہ اس کا رواج اتنا عام نہ ہو جائے کہ لوگ قمری حساب کو بالکل بھلا دیں، کیونکہ ایسا کرنے میں عباداتِ روزہ و حج وغیرہ میں خلل لازم آتا ہے، جیسا اس زمانے میں عام دفتروں اور کاروباری اداروں بلکہ نجی اور شخصی مکاتبات میں بھی شمسی حساب کا ایسا رواج ہو گیا ہے کہ بہت سے لوگوں کو اسلامی مہینے بھی پورے یاد نہیں رہے، یہ شرعی حیثیت کے علاوہ غیرتِ قومی و ملی کا بھی دیوالیہ پن ہے، اگر دفتری معاملات میں جن کا تعلق غیر مسلموں سے بھی ہے ان میں صرف شمسی حساب رکھیں، باقی نجی خط و کتابت اور روزمرہ کی ضروریات میں

قمری اسلامی تاریخوں کا استعمال کریں تو اس میں فرضِ کفایہ کی ادائیگی کا ثواب بھی ہوگا اور اپنا قومی شعار بھی محفوظ رہے گا۔
مسئلہ:- وَلَيْسَ الْبِرُّ بِان تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا، اس آیت سے یہ مسئلہ بھی نکل آیا کہ جس چیز کو شریعتِ اسلام نے ضروری یا عبادت نہ سمجھا ہو، اس کو اپنی طرف سے ضروری اور عبادت سمجھ لینا جائز نہیں، اسی طرح جو چیز شرعاً جائز ہو اس کو گناہ سمجھنا بھی گناہ ہے، ان لوگوں نے ایسا ہی کر رکھا تھا کہ گھر کے دروازوں سے داخل ہونا جو شرعاً جائز تھا اس کو گناہ قرار دیا، اور مکان کی پشت سے دیوار توڑ کر آنا جو شرعاً ضروری نہیں تھا اس کو ضروری سمجھا، اسی پر ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی، بدعات کے ناجائز ہونے کی بڑی وجہ یہی ہے کہ غیر ضروری چیزوں کو فرض و واجب کی طرح ضروری سمجھ لیا جاتا ہے، یا بعض جائز چیزوں کو حرام و ناجائز قرار دے دیا جاتا ہے، اس آیت سے ایسا کرنے کی ممانعت واضح طور پر ثابت ہوگئی جس سے ہزاروں اعمال کا حکم معلوم ہو گیا۔

حکم نہم:- جہاد و قتال

اس پر ساری اُمت کا اتفاق ہے کہ ہجرتِ مدینہ سے پہلے کفار کے ساتھ جہاد و قتال ممنوع تھا، اس وقت کی تمام آیاتِ قرآنی میں مسلمانوں کو کفار کی ایذاؤں پر صبر اور غفور و درگزر کی ہی تلقین تھی، ہجرتِ مدینہ کے بعد سب سے پہلے اس آیت میں قتالِ کفار کا حکم آیا (قالہ الربیع بن انس وغیرہ)، اور صدیق اکبرؓ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ قتالِ کفار کے متعلق پہلی آیت یہ ہے: اُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتُونَ بِأَنَّهُمْ ظَلَمُوا (الحج: ۳۹) مگر اکثر حضرات صحابہؓ و تابعینؓ کے نزدیک پہلی آیت سورہ بقرہ کی آیت مذکورہ ہی ہے اور صدیق اکبرؓ نے جس کو پہلی فرمایا ہے وہ بھی ابتدائی آیتوں میں ہونے کے سبب پہلی کہی جاسکتی ہے۔

اس آیت میں حکم یہ ہے کہ مسلمان صرف اُن کافروں سے قتال کریں جو اُن کے مقابلہ پر قتال کے لئے آویں، اس سے مراد یہ ہے کہ عورتیں، بچے، بہت بوڑھے اور اپنے مذہبی شغل میں دُنیا سے یکسو ہو کر لگے ہوئے عبادت گزار راہب، پادری وغیرہ اور ایسے ہی اپانچ و معذور لوگ، یا وہ لوگ جو کافروں کے یہاں محنت مزدوری کا کام کرتے ہیں ان کے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوتے، ایسے لوگوں کو جہاد میں قتل کرنا جائز نہیں، کیونکہ حکمِ آیت کا صرف ان لوگوں سے قتال کرنے کا ہے جو مسلمانوں کے مقابلہ میں قتال کریں، اور مذکورہ قسم کے سب افراد قتال کرنے والے نہیں، اسی لئے فقہاءِ رحمہم اللہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر کوئی عورت یا بوڑھا، یا مذہبی آدمی وغیرہ کفار کی طرف سے قتال میں شریک ہوں، یا مسلمانوں کے بالمقابل جنگ میں ان کی مدد کسی طرح سے کر رہے ہوں ان کا قتل جائز ہے، کیونکہ وہ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ

میں داخل ہیں۔ (مظہری، قرطبی، جصاص) [۱]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات جو مجاہدین اسلام کو بوقتِ جہاد دی جاتی تھیں، ان میں اس حکم کی واضح تشریحات مذکور ہیں، صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک حدیث میں ہے:-

نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِ النِّسَاءِ وَالصَّبِيَّانِ [۲]
 ”یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا ہے۔“

اور ابوداؤد میں بروایت انسؓ جہاد پر جانے والے صحابہؓ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایات منقول ہیں: تم اللہ کے نام پر اور رسول اللہ کی ملت پر جہاد کے لئے جاؤ، کسی بوڑھے ضعیف کو اور چھوٹے بچے کو یا کسی عورت کو قتل نہ کرو۔ (مظہری) [۳]

حضرت صدیق اکبرؓ نے جب یزید بن ابی سفیانؓ کو ملکِ شام بھیجا تو ان کو یہی ہدایت دی، اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ عبادت گزار اور راہبوں کو اور کافروں کی مزدوری کرنے والوں کو بھی قتل نہ کریں، جبکہ وہ قتال میں حصہ نہ لیں۔ (قرطبی) [۴]

آیت کے آخر میں **وَلَا تَعْتَدُوا** کا بھی جمہور مفسرین کے نزدیک یہی مطلب ہے کہ قتال میں حد سے تجاوز نہ کرو، کہ عورتوں، بچوں وغیرہ کو قتل کرنے لگو۔

وَأَقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ۔ خلاصہ تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ یہ آیت واقعہ حدیبیہ کے بعد اس وقت نازل ہوئی جب صلح حدیبیہ کی شرط کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے ساتھ اس عمرہ کی قضا کے لئے سفر کا ارادہ کیا، جس سے اس سے پہلے سال میں کفار مکہ نے روک دیا تھا، صحابہ کرامؓ کو اس سفر کے وقت یہ خیال ہو رہا تھا کہ کفار کی صلح اور معاہدہ کا کچھ بھروسہ نہیں، اگر وہ لوگ اس سال بھی آمادہ پیکار ہو گئے تو ہمیں کیا کرنا چاہئے، اس پر آیت مذکورہ کے الفاظ نے ان کو اجازت دے دی کہ اگر وہ قتال کرنے لگیں تو تمہیں بھی اجازت ہے، کہ جہاں پاؤ ان کو قتل کرو، اور اگر قدرت میں ہو تو جس طرح انہوں نے مسلمانوں کو مکہ مکرمہ سے نکال دیا تھا تم بھی ان کو مکہ سے نکال دو۔

اور پوری مکی زندگی میں جو مسلمانوں کو کفار کے ساتھ مقاتلہ سے روکا ہوا تھا، اور ہمیشہ عفو و درگزر کی تلقین ہوتی رہی تھی، اس لئے صحابہ کرامؓ کو اس آیت کے نازل ہونے سے یہی خیال تھا کہ کسی کافر کو قتل کرنا برا اور ممنوع ہے، اس خیال کے

[۱] احکام القرآن للجصاص ج: ۱ ص: ۲۵۷، ۲۵۸، وتفسیر المظہری تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۲۱۲

[۲] صحيح البخاری، كتاب الجهاد، باب قتل النساء في الحرب ج: ۱ ص: ۲۲۳، وصحيح مسلم، كتاب الجهاد، باب النساء الغزيات... إلخ ج: ۲ ص: ۱۱۶

[۳] سنن ابی داؤد، كتاب الجهاد، باب في دعاء المشرکین ج: ۱ ص: ۳۵۱، وتفسیر المظہری تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۲۱۲

[۴] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۲ ص: ۳۳۸

ازالے کے لئے فرمایا: وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ^۱ یعنی یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ کسی کو قتل کرنا سخت برا کام ہے، مگر کفار مکہ کا اپنے کفر و شرک پر جمار ہنا اور مسلمانوں کا ادائے عبادت حج و عمرہ سے روکنا اس سے زیادہ سخت و شدید ہے، اس سے بچنے کے لئے ان کو قتل کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے، آیت میں لفظ ”فتنہ“ سے کفر و شرک اور مسلمانوں کو ادائے عبادت سے روکنا ہی مراد ہے۔ (بہصا، قرطبی وغیرہ)

البتہ اس آیت کے عموم سے جو یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ کفار جہاں کہیں ہوں ان کا قتل کرنا جائز ہے، اس عموم کی ایک تخصیص آیت کے اگلے جملے میں اس طرح کر دی گئی: وَلَا تَقْتُلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقْتَلُوا فِيهِ^۲ یعنی مسجد حرام کے آس پاس جس سے مراد پورا حرم مکہ ہے اُس میں تم اُن لوگوں سے اس وقت تک قتال نہ کرو جب تک وہ خود قتال کی ابتداء نہ کریں۔

مسئلہ:- حرم مکہ میں انسان کیا کسی شکاری جانور کو بھی قتل کرنا جائز نہیں، لیکن اسی آیت سے معلوم ہوا کہ اگر حرم محترم میں کوئی آدمی دوسرے کو قتل کرنے لگے تو اس کو بھی مدافعت میں قتال کرنا جائز ہے، اس پر جمہور فقہاء کا اتفاق ہے۔

مسئلہ:- اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ابتداءً جہاد و قتال کی ممانعت صرف مسجد حرام کے آس پاس حرم مکہ کے ساتھ مخصوص ہے، دوسرے مقامات میں جیسے دفاعی جہاد ضروری ہے اسی طرح ابتدائی جہاد و قتال بھی درست ہے۔

فَإِنْ أَنْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ^(۱۹۲) وَقَتْلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ

پھر اگر وہ باز آئیں تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔ اور لڑوان سے یہاں تک کہ نہ باقی رہے فساد

وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ^ط فَإِنْ أَنْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ^(۱۹۳)

اور حکم رہے خدا تعالیٰ ہی کا، پھر اگر وہ باز آئیں تو کسی پر زیادتی نہیں مگر ظالموں پر۔

الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَتُ قِصَاصٌ^ط فَمَنْ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ

حرمت والا مہینہ بدلہ (مقابل) ہے حرمت والے مہینے کے اور ادب رکھنے میں بدلہ ہے، پھر جس نے تم پر زیادتی کی

فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا عَتَدَىٰ عَلَيْكُمْ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ

تم اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے زیادتی کی تم پر، اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو کہ اللہ

مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿۱۹۴﴾ وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ ۚ

ساتھ ہے پرہیزگاروں کے۔ اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں،

وَأَحْسِنُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۹۵﴾

اور نیکی کرو بے شک اللہ دوست رکھتا ہے نیکی کرنے والوں کو۔

آسان ترجمہ قرآن

پھر اگر وہ باز آجائیں تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے ﴿۱۹۴﴾ اور تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے، اور دین اللہ کا ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو (سمجھ لو کہ) تشدد سوائے ظالموں کے کسی پر نہیں ہونا چاہئے ﴿۱۹۵﴾ حرمت والے مہینے کا بدلہ حرمت والا مہینہ ہے، اور حرمتوں پر بھی بدلے کے احکام جاری ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی شخص تم پر کوئی زیادتی کرے تو تم بھی ویسی ہی زیادتی اس پر کرو جیسی زیادتی اس نے تم پر کی ہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ انہی کا ساتھی ہے جو اس کا خوف دل میں رکھتے ہیں ﴿۱۹۶﴾ اور اللہ کے راستے میں مال خرچ کرو، اور اپنے آپ کو خود اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو، اور نیکی اختیار کرو۔ بیشک اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ ﴿۱۹۷﴾

خلاصہ تفسیر

پھر اگر (بعد شروع قتال کے بھی) وہ لوگ (یعنی مشرکین مکہ اپنے کفر سے) باز آجائیں (اور اسلام قبول کر لیں) تو (ان کا اسلام بے قدر نہ سمجھا جاوے گا بلکہ) اللہ تعالیٰ (ان کے گزشتہ کفر کو) بخش دے گا (اور مغفرت کے علاوہ بے شمار نعمتیں دے کر ان پر) مہربانی (بھی) فرمادیں گے، اور (اگر وہ لوگ اسلام نہ لاویں تو اگرچہ دوسرے کفار کے لئے اسلامی قانون یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب پر رہتے ہوئے بھی اگر اسلامی حکومت کی اطاعت اور جزیہ دینے کا اقرار کر لیں تو ان کا قتل جائز نہیں رہتا، بلکہ ان کے حقوق کی حفاظت اسلامی حکومت پر لازم ہو جاتی ہے، مگر یہ خاص کفار چونکہ اہل عرب ہیں، ان

کے لئے قانونِ جزیہ نہیں، بلکہ ان کے لئے صرف دو راستے ہیں، اسلام یا قتل، اس واسطے (ان کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ ان میں) فسادِ عقیدہ (یعنی شرک) نہ رہے اور (ان کا) دین (خالص) اللہ ہی کا ہو جائے (اور کسی کا دین و مذہب کا خالصاً اللہ کے لئے ہو جانا موقوف ہے، قبولِ اسلام پر، تو حاصل یہ ہوا کہ شرک چھوڑ کر اسلام اختیار کر لیں) اور اگر وہ لوگ (کفر سے) باز آجاویں (جس کا ذکر ابھی ہوا بھی ہے) تو (آخرت میں مغفرت و رحمت کے مستحق ہونے کے ساتھ دنیا میں ان کے لئے تم کو یہ قانون بتلایا جاتا ہے کہ سزا کی) سختی کسی پر نہیں ہوا کرتی، بجز بے انصافی کرنے والوں کے (جو براہ بے انصافی خدائی احسانات کو بھول کر کفر و شرک کرنے لگیں اور جب یہ لوگ اسلام لے آئے تو بے انصاف نہ رہے، لہذا ان پر سزائے قتل کی سختی نہ رہی، اور مسلمانو! تم کو جو یہ خیال ہے کہ کفار مکہ اگر اپنے عہد پر قائم نہ رہے تو شہرِ حرام یعنی ذی قعدہ میں اُن سے لڑنا پڑے گا، سو اس سے بھی بے فکر رہو، کیونکہ) حرمت والا مہینہ (تم کو قتالِ کفار سے مانع ہو سکتا) ہے بعض (اس کے کہ اس) حرمت والے مہینے کے (سبب وہ بھی تم سے قتال نہ کریں) اور (وجہ یہ ہے کہ) یہ حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں (سو جو تمہارے ساتھ ان حرمتوں کی رعایت کرے تو تم بھی رعایت رکھو اور) جو تم پر (ایسی حرمتوں کی رعایت نہ کر کے) زیادتی کرے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو، جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے، اور (ان سب احکام مذکورہ کے برتاؤ میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (کہ کسی امر میں حدِ قانونی سے تجاوز نہ ہونے پاوے) اور یقین کر لو کہ اللہ تعالیٰ (اپنی عنایت و رحمت سے) ان ڈرنے والوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔

حکم دہم :- انفاق فی الجہاد

اور تم لوگ (جان کے ساتھ مال بھی) خرچ کیا کرو اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو (کہ ایسے مواقع میں جان و مال خرچ کرنے سے جن یا بخل کرنے لگو، جس کا نتیجہ تمہارا ضعیف اور مخالف کا قوی ہو جانا ہے، جو کہ عین تباہی ہے) اور (جو) کام (کرو) اچھی طرح کیا کرو (مثلاً اس موقع پر خرچ کرنا ہے دل کھول کر خوشی سے اچھی نیت کے ساتھ خرچ کرو) بلاشبہ اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں اچھی طرح کام کرنے والوں کو۔

معارف و مسائل

۷۷ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے قانون کے مطابق فوت شدہ عمرہ ادا کرنے کے لئے بہ معیت صحابہ مکہ کے سفر کا ارادہ کیا تو صحابہ کرامؓ جانتے تھے کہ ان کفار کے معاہدوں اور صلح کا کچھ اعتبار نہیں، ممکن ہے کہ وہ جنگ کرنے لگیں، تو اس جنگ میں صحابہؓ کے لئے ایک اشکال تو یہ تھا کہ حرمِ مکہ میں جنگ کی نوبت آئے گی، جو اسلام میں

ناجائز ہے، اس کا جواب پچھلی آیت میں دے دیا گیا، کہ حرم مکہ کی حرمت مسلمانوں پر ضرور لازم ہے، لیکن اگر کفار حد و حرم میں ہی مسلمانوں سے جنگ کرنے لگیں تو اُن کو بھی مدافعت میں جنگ کرنا جائز ہے۔

دوسرا اشکال یہ تھا کہ یہ مہینہ ذیقعدہ کا ہے، جو اُن چار مہینوں میں سے ہے، جن کو اُشہر حرم کہا جاتا ہے، اور ان میں کسی سے کسی جگہ جنگ کرنا جائز نہیں، تو اگر مشرکین مکہ نے ہمارے خلاف جنگ شروع کر دی تو ہم اس مہینے میں دفاعی جنگ کیسے کر سکتے ہیں؟ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، کہ جیسے حرم مکہ کی حرمت سے حالتِ دفاع مستثنیٰ ہے، اسی طرح اگر اُشہر حرم میں کافر ہم سے قتال کرنے لگیں تو ہم کو بھی اُن سے دفاعی جنگ لڑنا جائز ہے۔

مسئلہ :- اُشہر حرم چار مہینے ہیں: ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم یہ تین ماہ تو مسلسل ہیں، چوتھا مہینہ رجب کا ہے، اسلام سے پہلے بھی ان چار مہینوں میں جنگ کو حرام سمجھا جاتا تھا، اور مشرکین مکہ بھی اس کے پابند تھے، ابتدائے اسلام میں بھی مکہ ہجری تک یہی قانون نافذ تھا، اسی لئے صحابہ کرامؓ کو اشکال پیش آیا، اس کے بعد یہ حرمت قتال منسوخ کر کے عام قتال کی اجازت باجماع اُمت دے دی گئی، مگر اُفضل اب بھی یہی ہے کہ ان چار مہینوں میں ابتداً بالقتال نہ کی جائے، صرف مدافعت کی ضرورت سے قتال کیا جائے، اس لحاظ سے یہ کہنا بھی فی الجملہ درست ہے کہ اُشہر حرم کی حرمت منسوخ نہیں، باقی ہے، جیسے حرم مکہ میں قتال کی اجازت بضرورت مدافعت دینے سے حرم مکہ کی حرمت منسوخ نہیں ہوئی، بلکہ صرف ایک استثنائی صورت پر عمل ہوا۔

دسواں حکم :- جہاد کے لئے مال خرچ کرنا

وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ، اس میں مسلمانوں پر لازم کیا گیا ہے کہ جہاد کے لئے بقدر ضرورت اپنے اموال بھی اللہ کی راہ میں خرچ کریں، اس سے فقہاء نے یہ حکم بھی نکالا ہے کہ مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض کے علاوہ بھی دوسرے حقوق فرض ہیں، مگر وہ نہ دائمی ہیں اور نہ اُن کے لئے کوئی نصاب اور مقدار متعین ہے، بلکہ جب اور جتنی ضرورت ہو اس کا انتظام کرنا سب مسلمانوں پر فرض ہے، اور ضرورت نہ ہو تو کچھ فرض نہیں، جہاد کا خرچ بھی اسی میں داخل ہے۔

وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ کے لفظی معنی تو ظاہر ہیں، کہ اپنے اختیار سے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کی ممانعت بیان فرمائی ہے، اب یہ بات کہ ہلاکت میں ڈالنے سے اس جگہ کیا مراد ہے؟ اس میں حضرات مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، اور امام بھٹاویؒ نے فرمایا کہ ان سب اقوال میں کوئی تضاد نہیں، سب ہی مراد ہو سکتے ہیں، حضرت ابویوب انصاریؓ نے فرمایا کہ یہ آیت ہمارے ہی بارے میں نازل ہوئی ہے، ہم اس کی تفسیر بخوبی جانتے ہیں، بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ اور قوت عطا فرمادیا تو ہم میں یہ گفتگو ہوئی کہ اب جہاد کی کیا ضرورت ہے، ہم اپنے وطن

میں ٹھہر کر اپنے مال و جائیداد کی خبر گیری کریں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس نے یہ بتلادیا کہ ہلاکت سے مراد اس جگہ ترک جہاد ہے، اور اس سے ثابت ہوا کہ ترک جہاد مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی کا سبب ہے، اسی لئے حضرت ابویوب انصاریؓ نے عمر بھر جہاد میں صرف کر دی، یہاں تک کہ آخر میں قسطنطنیہ میں وفات پا کر وہیں مدفون ہوئے۔^[۱]

حضرت ابن عباسؓ، حذیفہؓ، قتادہؓ، مجاہدؓ، ضحاکؓ ائمہ تفسیر سے بھی یہی مضمون منقول ہے۔

حضرت براء بن عازبؓ نے فرمایا کہ گناہوں کی وجہ سے اللہ کی رحمت اور مغفرت سے مایوس ہو جانا اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں ڈالنا ہے، اس لئے مغفرت سے مایوس ہونا حرام ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے میں حد سے تجاوز کرنا کہ بیوی بچوں کے حقوق ضائع ہو جائیں، یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، ایسا اسراف جائز نہیں۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ ایسی صورت میں قتال کے لئے اقدام کرنا اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے جبکہ یہ اندازہ ظاہر ہے کہ دشمن کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، خود ہلاک ہو جائیں گے، ایسی صورت میں اقدام قتال اس آیت کی بنا پر ناجائز ہے۔ اور حصّاصؓ کے فرمانے کے مطابق یہ سب ہی احکام اس آیت سے مستفاد ہوتے ہیں۔

وَ احْسِنُوا ۙ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۹۵﴾ اس جملے میں ہر کام کو اچھی طرح کرنے کی ترغیب ہے، اور کام کو اچھی طرح کرنا جس کو قرآن میں ”احسان“ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، دو طرح کا ہے، ایک عبادت میں، دوسرے آپس کے معاملات و معاشرت میں۔ عبادت میں احسان کی تفسیر حدیث جبریلؓ میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے کہ ایسی طرح عبادت کرو جیسے تم خدا کو دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ درجہ حاصل نہ ہو تو کم از کم یہ تو اعتقاد لازم ہی ہے کہ خدا تعالیٰ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔^[۲]

اور معاملات و معاشرت میں احسان کی تفسیر مسند احمد^[۳] میں بروایت حضرت معاذؓ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے کہ تم سب لوگوں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو، اور جس چیز کو تم اپنے لئے برا سمجھتے ہو وہ دوسروں کے لئے بھی برا سمجھو۔ (مظہری)

وَاتَّبِعُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ط فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ج

اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ کے واسطے، پھر اگر تم روک دیئے جاؤ تو تم پر ہے جو کچھ کہ میسر ہو قربانی سے،

[۱] احکام القرآن للخصاص ج: ۱ ص: ۲۶۲

[۲] صحيح البخاری، کتاب الإیمان، باب سؤال جبریل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الإیمان... إلخ ج: ۱ ص: ۱۲

[۳] مسند احمد رقم الحدیث: ۲۱۱۱۳

وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحَلَّهُ^ط فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ

اور حجامت نہ کرو اپنے سروں کی جب تک نہ پہنچ چکے قربانی اپنے ٹھکانے پر، پھر جو کوئی تم میں سے

مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِّن رَّأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ

بیمار ہو یا اس کو تکلیف ہو سر کی تو بدلہ دیوے روزے یا خیرات

أَوْ نُسْكَ^ج فَإِذَا أَمِنْتُمْ^{وقفہ} فَمَنْ تَبَتَّ بِالْعِمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ

یا قربانی، پھر جب تمہاری خاطر جمع ہو تو جو کوئی فائدہ اٹھاوے عمرہ ملا کر حج کے ساتھ تو اس پر ہے جو کچھ میسر ہو

مِن الْهَدْيِ^ج فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا

قربانی سے، پھر جس کو قربانی نہ ملے تو روزے رکھے تین حج کے دنوں میں اور سات روزے جب

رَاجَعْتُمْ^ط تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ^ط ذَلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهُ

لوٹو، یہ دس روزے ہوئے پورے، یہ حکم اس کے لئے ہے جس کے گھر والے نہ رہتے ہوں

حَاضِرٍ السَّجْدِ الْحَرَامِ^ط وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ^ع (۱۹۶)

مسجد الحرام کے پاس، اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو کہ بے شک اللہ کا عذاب سخت ہے۔

الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَةٌ^ج فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ^{لا}

حج کے چند مہینے ہیں معلوم، پھر جس شخص نے لازم کر لیا ان میں حج تو بے حجاب ہونا جائز نہیں عورت سے اور نہ گناہ کرنا

وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ^ط وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمُهُ اللَّهُ^ط وَتَزَوَّدُوا

اور نہ جھگڑا کرنا حج کے زمانے میں، اور جو کچھ تم کرتے ہو نیکی اللہ اس کو جانتا ہے، اور زادِ راہ لے لیا کرو کہ

فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ ۚ وَ اتَّقُونَ يَا أُولِيَ الْأَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾

بے شک بہتر فائدہ زادِ راہ کا بچنا ہے سوال سے، اور مجھ سے ڈرتے رہو اے عقل مندو۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ ۖ فَإِذَا آفَضْتُمْ

کچھ گناہ نہیں تم پر کہ تلاش کرو فضل اپنے رب کا، پھر جب طواف کے لئے لوٹو

مِّنْ عَرَفَاتٍ ۖ فَإِذْ كُرُوا اللَّهَ عِندَ الشَّعَرِ الْحَرَامِ ۖ وَ اذْكُرُوا كَمَا

عرفات سے تو یاد کرو اللہ کو نزدیک مشعر الحرام کے اور اس کو یاد کرو جس طرح

هَدَّيْكُمْ ۚ وَإِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ أَفِيضُوا مِمَّنْ حَيْثُ

تم کو سکتا ہوا اور بے شک تم تھے اس سے پہلے ناواقف۔ پھر طواف کے لئے پھرو جہاں سے

أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۹۹﴾ فَإِذَا قَضَيْتُمْ

سب لوگ پھریں، اور مغفرت چاہو اللہ سے، بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے مہربان۔ پھر جب پورے کر چکو

مَنَاسِكَكُمْ فَإِذْ كُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۖ فَمِنَ النَّاسِ

اپنے حج کے کام کو تو یاد کرو اللہ کو جیسے تم یاد کرتے تھے اپنے باپ دادوں کو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو، پھر کوئی آدمی

مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنْهُمْ

تو کہتا ہے: اے رب ہمارے! دے ہم کو دنیا میں اور اس کے لئے آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔ اور کوئی

مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا

ان میں کہتا ہے: اے رب ہمارے! دے ہم کو دنیا میں خوبی اور آخرت میں خوبی اور بچا ہم کو

عَذَابِ النَّارِ ۲۰۱ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۖ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۲۰۲

دوزخ کے عذاب سے۔ انہی لوگوں کے واسطے حصہ ہے اپنی کمائی سے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ ۖ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ

اور یاد کرو اللہ کو گنتی کے چند دنوں میں، پھر جو کوئی جلدی چلا گیا دو ہی دن میں تو اس پر گناہ نہیں،

وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ لِمَنِ الْتَفَى ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ

اور جو کوئی رہ گیا تو اس پر بھی کچھ گناہ نہیں جو کہ ڈرتا ہے، اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو بے شک تم سب

إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۲۰۳

اسی کے پاس جمع ہو گے۔

آسان ترجمہ قرآن

اور حج اور عمرہ اللہ کے لئے پورا پورا ادا کرو، ہاں اگر تمہیں روک دیا جائے تو جو قربانی میسر ہو، (اللہ کے حضور پیش کر دو)۔ اور اپنے سراسر اس وقت تک نہ منڈاؤ جب تک قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ ہاں اگر تم میں سے کوئی شخص بیمار ہو، یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو روزوں یا صدقے یا قربانی کا فدیہ دے۔ پھر جب تم امن حاصل کر لو تو جو شخص حج کے ساتھ عمرے کا فائدہ بھی اٹھائے، وہ جو قربانی میسر ہو (اللہ کے حضور پیش کرے)۔ ہاں اگر کسی کے پاس اس کی طاقت نہ ہو تو وہ حج کے دنوں میں تین روزے رکھے، اور سات (روزے) اُس وقت جب تم (گھروں کو) لوٹ جاؤ۔ اس طرح یہ کل دس روزے ہوں گے۔ یہ حکم ان لوگوں کے لئے ہے جن کے گھر والے مسجد حرام کے پاس نہ رہتے ہوں۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے (۱۹۶) حج کے چند متعین مہینے ہیں۔ چنانچہ جو شخص ان مہینوں میں (احرام باندھ کر) اپنے اوپر حج لازم کر لے تو حج کے دوران نہ وہ کوئی فحش بات کرے، نہ کوئی گناہ، نہ کوئی جھگڑا۔ اور تم جو کوئی نیک کام کرو گے، اللہ اسے جان لے گا۔ اور (حج کے سفر میں) زادِ راہ ساتھ لے جایا کرو، کیونکہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔ اور اے عقل والو! میری نافرمانی سے ڈرتے رہو (۱۹۷) تم پر اس بات میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم (حج کے دوران تجارت یا مزدوری کے

ذریعے) اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرو۔ پھر جب تم عرفات سے روانہ ہو تو مشعر حرام کے پاس (جو مزدلفہ میں واقع ہے) اللہ کا ذکر کرو، اور اس کا ذکر اسی طرح کرو جس طرح اس نے تمہیں ہدایت کی ہے، جبکہ اس سے پہلے تم بالکل ناواقف تھے ①۹۸ اس کے علاوہ (یہ بات بھی یاد رکھو کہ) تم اسی جگہ سے روانہ ہو جہاں سے عام لوگ روانہ ہوتے ہیں۔ اور اللہ سے مغفرت مانگو۔ بیشک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ①۹۹ پھر جب تم اپنے حج کے کام پورے کر چکو تو اللہ کا اس طرح ذکر کرو جیسے تم اپنے باپ دادوں کا ذکر کیا کرتے ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ ذکر کرو۔ اب بعض لوگ تو وہ ہیں جو (دُعا میں بس) یہ کہتے ہیں کہ: ”اے ہمارے پروردگار! ہمیں دُنیا میں بھلائی عطا فرما“ اور آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا ②۰۰ اور انہی میں سے وہ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ: ”اے ہمارے پروردگار! ہمیں دُنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی، اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے“ ②۰۱ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اپنے اعمال کی کمائی کا حصہ (ثواب کی صورت میں) ملے گا، اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ ②۰۲ اور اللہ کو گنتی کے (ان چند) دنوں میں (جب تم منیٰ میں مقیم ہو) یاد کرتے رہو۔ پھر جو شخص دو ہی دن میں جلدی چلا جائے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے، اور جو شخص (ایک دن) بعد میں جائے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ یہ (تفصیل) اس کے لئے ہے جو تقویٰ اختیار کرے۔ اور تم سب تقویٰ اختیار کرو، اور یقین رکھو کہ تم سب کو اسی کی طرف لے جا کر جمع کیا جائے گا ②۰۳

خلاصہ تفسیر

گیارہواں حکم متعلق حج و عمرہ

اور (جب حج یا عمرہ کرنا ہو تو اس) حج اور عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے (راضی کرنے کے) واسطے پورا پورا ادا کیا کرو (کہ اعمال و آداب بھی سب بجالاؤ اور نیت بھی خالص ثواب ہی کی ہو) پھر اگر (کسی دشمن کی جانب سے یا کسی مرض کے سبب سے حج و عمرہ کے پورا کرنے سے) روک دیئے جاؤ تو (اس حالت میں یہ حکم ہے کہ) قربانی کا جانور جو کچھ میسر ہو (ذبح کرے اور حج و عمرہ کی جو وضع اختیار کر رکھی تھی موقوف کرے، اس کو احرام کھولنا کہتے ہیں، جس کا طریقہ شرع میں سرمنڈانا ہے، اور بال کٹا دینے کا بھی یہی اثر ہے) اور (یہ نہیں کہ فوراً روک ٹوک کے ساتھ ہی تم کو احرام کھولنا درست ہو جاوے، بلکہ) اپنے سروں کو (احرام کھولنے کی غرض سے) اس وقت تک مت منڈاؤ جب تک کہ (وہ) قربانی (کا جانور جس کے ذبح کا اس حالت میں حکم تھا) اپنے موقع پر نہ پہنچ جاوے (اور وہ موقع حرم ہے کہ اس قربانی کا جانور حد و حرم ہی میں ذبح کیا جاسکتا ہے، وہاں اگر خود نہ جاسکے، تو کسی کے ہاتھ بھیج کر ذبح کرایا جاوے، جب جانور ذبح ہو جاوے اس وقت احرام کھولنا

جائز ہوگا) البتہ اگر کوئی تم میں سے (کچھ) بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ (زخم یا درد یا جوؤوں وغیرہ کی) تکلیف ہو (اور اس بیماری یا تکلیف کی وجہ سے پہلے ہی سر منڈانے کی ضرورت پڑے) تو (اس کو اجازت ہے کہ وہ سر منڈا کر) فدیہ (یعنی اس کا شرعی بدلہ) دیدے (یعنی خواہ تین) روزے سے یا (چھ مسکینوں کو فی مسکین صدقہ فطر کے برابر یعنی نصف صاع گیہوں) خیرات (کے طور پر) دے دینے سے، یا (ایک بکری) ذبح کر دینے سے، پھر جب تم امن کی حالت میں ہو (خواہ تو پہلے ہی سے کوئی خوف و مزاحمت پیش نہیں آیا، یا ہو کر جاتا رہا) تو (اس صورت میں حج و عمرہ کے متعلق قربانی کرنا ہر ایک کے ذمہ نہیں ہے بلکہ خاص) جو شخص عمرہ سے اس کو حج کے ساتھ ملا کر مشفق ہوا ہو، (یعنی ایام حج میں عمرہ بھی کیا ہو) تو (فقط اس پر واجب ہے کہ) جو کچھ قربانی میسر (ذبح کرے اور جس نے صرف عمرہ کیا ہو، یا صرف حج کیا ہو اس پر حج و عمرہ کے متعلق کوئی قربانی نہیں) پھر (ایام حج میں حج و عمرہ کو جمع کرنے والوں میں سے) جس شخص کو قربانی کا جانور میسر نہ ہو (مثلاً غریب ہے) تو (اس کے ذمہ بجائے قربانی کے) تین دن کے روزے ہیں (ایام حج میں) (کہ آخر ان ایام کا نویں تاریخ ذی الحجہ ہے) اور سات (دن کے روزے) ہیں، جبکہ حج سے تمہارے لوٹنے کا وقت آ جاوے (یعنی حج کر چکو خواہ لوٹنا ہو یا کہ وہیں رہنا ہو) یہ پورے دس (دن کے روزے) ہوئے، (اور یہ بھی یاد رکھو کہ ابھی حج و عمرہ کے ملانے کا حکم ہوا ہے) یہ (ملانا ہر ایک کو درست نہیں، بلکہ خاص) اس شخص کے لئے (درست) ہے جس کے اہل (و عیال) مسجد حرام (یعنی کعبہ) کے قرب (نواح) میں نہ رہتے ہوں (یعنی حدود حرم مکہ میں ان کا وطن نہ ہو) اور (ان سب احکام کی بجا آوری میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (کہ کسی امر میں خلاف نہ ہو جاوے) اور (خوب) جان لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ (بے باکی اور مخالفت کرنے والوں کو) سزائے سخت دیتے ہیں۔

(زمانہ افعال) حج (کا) چند مہینے ہیں جو (مشہور و) معلوم ہیں (ایک شوال، دوسرا ذی قعدہ، تیسرا دس تاریخیں ذی الحجہ کی) سو جو شخص ان (ایام) میں (اپنے ذمہ) حج مقرر کر لے (کہ حج کا احرام باندھ لے) تو پھر (اس شخص کو) نہ کوئی فحش بات (جائز) ہے، اور نہ کوئی بے حکمی (درست) ہے، اور نہ کسی قسم کا نزاع (وتکرار) زیبا ہے، (بلکہ اس کو چاہئے کہ ہر وقت نیک ہی کاموں میں لگا رہے) اور جو نیک کام کرو گے خدا تعالیٰ کو اس کی اطلاع ہوتی ہے (سو اس کا ثمرہ تم کو عنایت ہوگا) اور (جب حج کو جانے لگو تو) خرچ ضرور (ساتھ) لے لیا کرو، سب سے بڑی بات (اور خوبی) خرچ میں (گداگری سے) بچا رہنا ہے، اور اے ذی عقل لوگو! (ان احکام کی تعمیل میں) مجھ سے ڈرتے رہو (اور کسی حکم کے خلاف مت کرو)۔

(اور اگر حج میں کچھ اسباب تجارت ہمراہ لے جانا مصلحت سمجھو تو) تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ (حج میں) معاش کی تلاش کرو جو (تمہاری قسمت میں) تمہارے پروردگار کی طرف سے (لکھی) ہے، پھر جب تم لوگ عرفات (میں)

ٹھہر کر وہاں) سے واپس آنے لگو تو مشعر حرام کے پاس (یعنی مزدلفہ میں آ کر شب کو وہاں قیام کر کے) خدا تعالیٰ کی یاد کرو اور (یاد کرنے کے طریقہ میں اپنی رائے کو دخل مت دو، بلکہ) اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو (اللہ تعالیٰ نے) بتلا رکھا ہے، اور حقیقت میں قبل اس (بتلانے) کے تم محض ہی ناواقف تھے، پھر (اس میں اور بھی بات یاد رکھو کہ جیسا قریش نے دستور نکال رکھا تھا کہ تمام حجاج تو عرفات میں ہو کر پھر وہاں سے مزدلفہ کو آتے تھے اور یہ مزدلفہ ہی میں رہ جاتے تھے، عرفات نہ جاتے تھے، یہ جائز نہیں، بلکہ) تم سب کو (خواہ قریش ہوں یا غیر قریش) ضروری ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ، جہاں اور لوگ جا کر وہاں سے واپس آتے ہیں اور (احکام حج میں پرانی رسموں پر عمل کرنے سے) خدا تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے اور مہربانی فرما دیں گے۔

(جاہلیت میں بعضوں کی تو یہ عادت تھی کہ حج سے فارغ ہو کر منیٰ میں جمع ہو کر اپنے آباء و اجداد کے مفاخر و فضائل بیان کیا کرتے، حق تعالیٰ بجائے اس بیہودہ شغل کے اپنے ذکر کی تعلیم کے لئے فرماتے ہیں کہ) پھر جب تم اپنے اعمال حج پورے کر چکا کرو تو حق تعالیٰ کا (شکر و عظمت کے ساتھ) ذکر کیا کرو جس طرح تم اپنے آباء (و اجداد) کا ذکر کیا کرتے ہو، بلکہ یہ ذکر اس سے (بدرجہا) بڑھ کر ہو (ناچاہئے، اور بعضوں کی عادت تھی کہ حج میں ذکر تو اللہ تعالیٰ ہی کا کرتے تھے لیکن چونکہ آخرت کے قائل نہ تھے، لہذا تمام تر ذکر ان کا صرف دنیا کے لئے دُعا مانگنا ہوتا تھا، حق تعالیٰ صرف دُنیا طلبی کی مذمت بیان فرما کر بجائے اس کے خیر داریں طلب کرنے کی ترغیب دینے کے لئے فرماتے ہیں) سو بعضے آدمی (جو کہ کافر ہیں) ایسے ہیں جو (دُعا میں یوں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو (جو کچھ دینا ہو) دُنیا میں دے دیجئے (ولبس، سوان کو جو کچھ ملنا ہوگا دُنیا ہی میں مل رہے گا) اور ایسے شخص کو آخرت میں (بوجہ انکارِ آخرت کے) کوئی حصہ نہ ملے گا، اور بعضے آدمی (جو کہ مؤمن ہیں) ایسے ہیں جو (دُعا میں یوں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو دُنیا میں بھی بہتری عنایت کیجئے، اور آخرت میں بھی بہتری دیجئے، اور ہم کو عذابِ دوزخ سے بچائیے (سو یہ لوگ اوپر کے لوگوں کی طرح بے بہرہ نہیں بلکہ) ایسے لوگوں کو (دونوں جہان میں) بڑا حصہ ملے گا، بدولت ان کے اس عمل (یعنی طلبِ خیر داریں) کے اور اللہ تعالیٰ جلدی ہی حساب لینے والے ہیں (کیونکہ قیامت میں حساب ہوگا، اور قیامت نزدیک آتی جاتی ہے، جب حساب جلدی ہونے والا ہے تو وہاں کی بہتری کو مت بھولو) اور (منیٰ میں خاص طریقے سے بھی) اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، کئی روز تک (وہ خاص طریقہ کنکریوں کا خاص تین پتھروں پر مارنا ہے، اور وہ کئی روز دسویں، گیارہویں، بارہویں تاریخیں ذی الحجہ کی ہیں، یا تیرہویں بھی کہ ان میں کنکریاں ماری جاتی ہیں) پھر جو شخص (کنکریاں مار کر دسویں تاریخ کے بعد) دودن میں (مکہ واپس آنے میں) تعیل کرے اس پر بھی کچھ گناہ نہیں اور جو شخص (ان) دودن میں (واپسی مکہ میں) تاخیر کرے (یعنی بارہویں کو نہ آوے، بلکہ تیرہویں کو آوے) اس پر بھی کچھ گناہ نہیں (اور یہ سب باتیں) اس شخص کے واسطے (ہیں) جو (خدا سے)

بذریعہ احرام شروع کر دے تو اس کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے، جیسا عام نفلی نماز اور روزے کا بھی حکم یہی ہے کہ شروع کرنے سے واجب ہو جاتے ہیں، اس لئے اس آیت سے یہ مسئلہ معلوم نہیں ہوتا کہ عمرہ واجب ہے یا نہیں، صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شروع کر دے تو اس کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

ابن کثیرؒ نے بحوالہ ترمذی، احمد، بیہقی حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ عمرہ واجب ہے، آپ نے فرمایا: واجب تو نہیں، لیکن کر لو تو بہتر و افضل ہے (قال الترمذی هذا حدیث حسن صحیح)۔ اس وجہ سے امام اعظم ابو حنیفہؒ، مالکؒ وغیرہ کے نزدیک عمرہ واجب نہیں سنت ہے، آیت مذکورہ میں جب یہ بیان ہوا کہ حج یا عمرے کا احرام باندھ لیں تو ان کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے، تو اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر احرام باندھنے کے بعد کوئی مجبوری پیش آجائے، حج و عمرہ ادا نہ کر سکیں تو کیا کریں؟ اس کا بیان بعد کے جملے میں **فَإِنْ أَحْصَرْتُمْ** سے فرمادیا۔

احرام کے بعد کوئی مجبوری پیش آجائے حج و عمرہ ادا نہ کر سکیں تو کیا کریں؟

یہ آیت چونکہ واقعہ حدیبیہ میں نازل ہوئی ہے، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے عمرہ کا احرام باندھا ہوا تھا، کفار مکہ نے مکہ میں داخل ہونے اور عمرہ ادا کرنے سے روک دیا، اس پر یہ حکم نازل ہوا کہ احرام کا فدیہ ایک قربانی دینا ہے، بکری، گائے، اونٹ وغیرہ کی جو آسان ہو، قربانی دے کر احرام کھول دیں، مگر ساتھ ہی اگلے جملے **وَلَا تَحْلِفُوا رَاءُ وُسْكُمْ** میں یہ بھی بتلادیا کہ احرام کھولنا جس کی شرعی صورت سر کے بال منڈوانا یا کٹوانا ہے اس وقت تک جائز نہیں جب تک محرم کی قربانی اپنے موقع پر پہنچ کر ذبح نہ ہو جائے۔

موقع پر پہنچنے سے مراد امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ ہے کہ حدودِ حرم میں پہنچ کر ذبح کی جائے، خود نہ کر سکیں تو کسی دوسرے سے کرا دیں، اس آیت میں مجبوری کی یہ صورت کہ کوئی دشمن حائل ہو جائے صراحتہً مذکور ہے، امام اعظم ابو حنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہ نے بیماری وغیرہ کی مجبوری کو بھی اس میں با شتر اکِ علت داخل قرار دیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی بیان سے یہ امر بھی ثابت ہو گیا کہ مجبوری کی حالت میں قربانی دے کر احرام کھول دینا جائز ہے مگر بعد میں قضا کرنا واجب ہے، جیسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے اگلے سال عمرہ کی قضا کی ہے۔

اس آیت میں سر منڈانے کو احرام کھولنے کی علامت قرار دیا گیا، جس سے ثابت ہوا کہ حالتِ احرام میں سر منڈانا یا بال کٹوانا ممنوع ہے، اس کی مناسبت سے اگلا حکم یہ بتلایا گیا کہ جو شخص حج و عمرہ کے افعال ادا کرنے سے تو مجبور نہیں، مگر حالتِ احرام میں کوئی مجبوری سر کے بال منڈانے یا کٹوانے کی پیش آجائے تو وہ کیا کرے۔

حالتِ احرام میں بال منڈانے پر کوئی مجبور ہو جائے تو وہ کیا کرے؟

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِّن رَّأْسِهِ ۖ فِيهِ إِشْرَافٌ فَرَمَايَا كَمَا كَرِهَ ۚ لَّيْسَ عَلَيْهِ جُنَاحٌ وَلَا عِلْمٌ عَلَيْهِ إِذَا عَمَّ ۚ

دوسرے حصہ کے بال منڈانے کی مجبوری ہو، یا سر میں جوویں پیدا ہو کر تکلیف دے رہی ہوں تو ایسی صورت میں بال منڈانا بقدر ضرورت جائز ہے، مگر اس کا فدیہ اور بدلہ یہ ہے کہ روزے رکھے، یا صدقہ دے یا قربانی کرے، قربانی کے لئے تو حدودِ حرم کی جگہ متعین ہے، روزے اور صدقہ کے لئے کوئی جگہ متعین نہیں، ہر جگہ ادا کر سکتا ہے، قرآن کے الفاظ میں صیام کا کوئی عدد اور صدقہ کی کوئی مقدار مذکور نہیں ہے، مگر حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن عجرہ صحابی کی ایسی ہی حالت میں یہ فرمایا کہ تین روزے رکھیں یا چھ مسکینوں کو آدھا صاع گندم کا بطور صدقہ دے دیں (صحیح بخاری)۔ آدھا صاع ہمارے اسی تولے کے سیر کے حساب سے تقریباً پونے دو سیر گندم ہوتے ہیں، اُن کی قیمت صدقہ کر دینا بھی کافی ہے۔

حج کے مہینوں میں حج و عمرہ کو جمع کرنے کے احکام

اسلام سے پہلے عرب اہل جاہلیت کا خیال تھا کہ جب حج کے مہینے شروع ہو جائیں یعنی ماہِ شوال شروع ہو جائے تو ان ایام میں حج و عمرہ کا جمع کرنا سخت گناہ ہے، اس آیت کے آخری حصے میں ان کے اس خیال کی اصلاح اس طرح کر دی گئی کہ حدودِ میقات کے اندر رہنے والوں کے لئے تو حج و عمرہ دونوں کو اشہرِ حج میں جمع کرنا ممنوع رکھا گیا، کیونکہ ان کو اشہرِ حج کے بعد دوبارہ عمرہ کے لئے سفر کرنا مشکل نہیں، لیکن حدودِ میقات کے باہر سے آنے والوں کے لئے جمع کرنے کو جائز قرار دیا، کہ دُور دراز سے عمرہ کے لئے مستقل سفر کرنا ان کے لئے آسان نہیں۔ ”میقات“ وہ معین مقامات ہیں جو اطرافِ عالم سے مکہ میں آنے والوں کے ہر راستے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین ہیں کہ جب بقصدِ مکہ آنے والا مسافر یہاں پہنچے تو یہاں سے حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھنا لازم ہے، بغیر احرام کے یہاں سے آگے بڑھنا جرم و گناہ ہے، لَسَنَ لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَافِظِي السَّجْدِ الْحَرَامِ کا یہی مفہوم ہے کہ جس شخص کے اہل و عیال مسجدِ حرام کے قرب و جوار یعنی حدودِ میقات کے اندر نہیں رہتے، مقصد یہ ہے کہ اس کا وطن حدودِ میقات کے اندر نہیں ہے اس کے لئے حج و عمرہ کو اشہرِ حج میں جمع کرنا جائز ہے۔

البتہ جو لوگ حج و عمرہ کو اشہرِ حج میں جمع کریں اُن پر واجب ہے کہ دونوں عبادتوں کو جمع کرنے کا شکرانہ ادا کریں، وہ یہ ہے کہ جس کو قربانی دینے کی قدرت ہو وہ ایک قربانی دیدے، بکری، گائے، اونٹ جو اس کے لئے آسان ہو، لیکن جس

شخص کی مالی حیثیت قربانی ادا کرنے کے قابل نہیں اس پر دس روزے اس طرح واجب ہیں کہ تین روزے تو ایام حج کے اندر ہی رکھے، یعنی نویں ذی الحجہ تک پورے کر دے، باقی سات روزے حج سے فارغ ہو کر جہاں چاہے اور جب چاہے رکھے، وہیں مکہ مکرمہ میں رہ کر پورے کرے یا گھر واپس آ کر، اختیار ہے، اگر کوئی شخص تین روزے ایام حج میں نہ رکھ سکا تو پھر امام ابوحنیفہؒ اور اکابر صحابہؓ کے نزدیک اس کے لئے قربانی کرنا ہی متعین ہے، جب قدرت ہو کسی کے ذریعے حرم میں قربانی کرادے۔ (بصا ص) ^[۵۱]

تمتع و قرآن

اشہر حج میں حج کے ساتھ عمرہ کو جمع کرنے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ میقات سے ہی سے حج اور عمرہ دونوں کا احرام ایک ساتھ باندھ لے، اس کو اصطلاح حدیث میں ”قرآن“ کہا گیا ہے، اس کا احرام حج کے احرام کے ساتھ کھلتا ہے، آخر ایام حج تک اس کو احرام ہی کی حالت میں رہنا پڑتا ہے، دوسرے یہ کہ میقات سے صرف عمرہ کا احرام باندھے، اور مکہ مکرمہ پہنچ کر عمرہ کے افعال ادا کر کے احرام کھول دے، پھر آٹھویں تاریخ ذی الحجہ کو منیٰ جانے کے وقت حج کا احرام حرم شریف کے اندر ہی باندھ لے، اس کو اصطلاح میں ”تمتع“ کہا جاتا ہے، اور لفظی معنی کے اعتبار سے لفظ ”تمتع“ دونوں صورتوں پر حاوی ہے، کیونکہ اس کے معنی ہیں حج و عمرہ کو جمع کر کے نفع اٹھانا اور وہ دونوں صورتوں میں برابر ہے، قرآن کی آیت مذکورہ میں **فَسَنُتِمِّتُكَ** اسی عام معنی میں ہے۔

احکام حج و عمرہ میں خلاف ورزی اور کوتاہی موجب عذاب ہے

آخر آیت میں اول تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا جس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی سے ڈرنے اور بچنے کے، اس کے بعد فرمایا: **وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ** ^[۱۹۶] یعنی جو شخص جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا عذاب سخت ہے۔ آج کل حج و عمرہ کو جانے والے بکثرت اس سے غافل ہیں، اول تو حج و عمرہ کے احکام معلوم کرنے ہی کی پوری کوشش نہیں کرتے، پھر معلوم بھی ہو تو بکثرت ان کے مطابق عمل نہیں کرتے، غلط کار معلوموں اور ساتھیوں کی بے پروائی سے بہت سے واجبات تک چھوٹ جاتے ہیں، اور آداب و سنن کا تو کہنا کیا، اللہ تعالیٰ سب کو اصلاح عمل کی توفیق عطا فرماویں۔

احکام حج کی آٹھ آیتوں میں سے دوسری آیت اور اس کے مسائل

الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَاتٌ ۚ ”أَشْهُرٌ“ شَهْر کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں مہینہ، پچھلی آیت میں یہ بتلایا گیا تھا کہ جو کوئی

حج یا عمرہ کا احرام باندھ لے، تو اس پر لازم آتا ہے کہ اس کے احکام پورے ادا کرے، ان دونوں میں عمرہ کے لئے تو کوئی تاریخ اور مہینہ مقرر نہیں، سال بھر میں جب چاہیں کر سکتے ہیں، لیکن حج کے لئے مہینہ اور اس کے افعال و اعمال کے لئے خاص تاریخیں اور اوقات مقرر ہیں، اس لئے اس آیت کے شروع میں یہ بتلادیا کہ حج کا معاملہ عمرہ کی طرح نہیں ہے، اس کے لئے کچھ مہینے مقرر ہیں، وہ مہینے شوال، ذیقعدہ اور دس روز ذی الحجہ کے ہیں، جیسا کہ حدیث میں بروایت ابو امامہؓ وابن عمرؓ منقول ہے (مظہری)، شوال سے حج کے مہینے شروع ہونے کا حاصل یہ ہے کہ اس سے پہلے حج کا احرام باندھنا جائز نہیں، بعض ائمہ کے نزدیک تو قبل شوال کے احرام سے حج کی ادائیگی ہی نہیں ہو سکتی، امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس احرام سے حج تو ادا ہو جائے گا مگر مکروہ ہوگا۔ (مظہری) ۲۰

فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۚ اس میں حج کا احرام باندھنے والے کے لئے کچھ منفی آداب و احکام کا بیان ہے، جن سے حالت احرام میں پرہیز کرنا لازم و واجب ہے، وہ تین چیزیں ہیں: رَفَثٌ، فسوق، جدال۔

”رَفَثٌ“ ایک لفظ جامع ہے، جس میں عورت سے مباشرت اور اس کے مقدمات یہاں تک کہ زبان سے عورت کے ساتھ اس کی کھلی گفتگو بھی داخل ہے، محرم کو حالت احرام میں یہ سب چیزیں حرام ہیں، تعریض و کنایہ کا مضائقہ نہیں۔

”فسوق“ کے لفظی معنی خروج کے ہیں، اصطلاح قرآن میں عدول حکمی اور نافرمانی کو ”فسوق“ کہا جاتا ہے، جو اپنے عام معنی کے اعتبار سے سب گناہوں کو شامل ہے، اسی لئے بعض حضرات نے اس جگہ عام معنی ہی مراد لئے ہیں، مگر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس جگہ ”فسوق“ کی تفسیر محظورات احرام سے فرمائی ہے، یعنی وہ کام جو حالت احرام میں ممنوع و ناجائز ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ اس مقام کے مناسب یہی تفسیر ہے، کیونکہ عام گناہوں کی ممانعت احرام کے ساتھ خاص نہیں ہر حال میں حرام ہیں۔

وہ چیزیں جو اصل سے گناہ نہیں مگر احرام کی وجہ سے ناجائز ہو جاتی ہیں چھ چیزیں ہیں: اول عورت کے ساتھ مباشرت اور اس کے تمام متعلقات یہاں تک کہ کھلی گفتگو بھی، دوسرے بری جانوروں کا شکار، خود کرنا یا شکاری کو بتلانا، تیسرے بال یا ناخن کٹوانا، چوتھے خوشبو کا استعمال، یہ چار چیزیں تو مرد و عورت دونوں کے لئے حالت احرام میں ناجائز ہیں، باقی دو چیزیں مردوں کے ساتھ خاص ہیں، یعنی سلے ہوئے کپڑے پہننا، اور سر اور چہرے کو ڈھانپنا، امام اعظم ابو حنیفہؒ

۱ صحیح البخاری، کتاب الحج، باب قول اللہ تعالیٰ: الْحَجَّ أَشْهُرٌ مَعْلُومَاتٌ ج: ۱ ص: ۲۱۱

۲ تفسیر المظہری تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۲۳۱

وما لک کے نزدیک چہرے کو ڈھانپنا حالتِ احرام میں عورت کے لئے بھی ناجائز ہے، اس لئے یہ بھی مشترک محظوراتِ احرام میں شامل ہے۔

ان چھ چیزوں میں پہلی یعنی عورت سے مباشرت وغیرہ، اگرچہ ”فسوق“ میں داخل ہے، لیکن اس کو ”فسوق“ سے پہلے الگ کر کے لفظ ”رَفَث“ سے اس لئے بتلادیا کہ احرام میں اس سے اجتناب سب سے زیادہ اہم ہے، کیونکہ دوسرے محظوراتِ احرام کا تو کوئی بدل اور کفارہ بھی ہو جاتا ہے، اور مباشرت کی بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ اگر ان میں کوئی مبتلا ہو جائے تو حج ہی فاسد ہو جاتا ہے، اس کا کوئی کفارہ بھی نہیں ہو سکتا، مثلاً وقوفِ عرفات سے پہلے بی بی سے صحبت کر لی، تو حج فاسد ہو گیا، اور اس کا جرمانہ بھی گائے یا اونٹ کی قربانی سے دینا پڑے گا، اور اگلے سال پھر حج کرنا پڑے گا، اس مزید اہمیت کی بنا پر اس کو **فَلَا رَفَثَ** کے لفظ سے مستقلاً بیان فرمادیا۔

”جدال“ کے معنی ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی کوشش کے ہیں، اس لئے سخت قسم کے جھگڑے کو ”جدال“ کہا جاتا ہے، یہ لفظ بھی بہت عام ہے، اور بعض حضرات مفسرین نے عام ہی معنی مراد لئے ہیں، اور بعض حضرات نے مقامِ حج و احرام کی مناسبت سے اس جگہ ”جدال“ کے معنی یہ لئے ہیں کہ جاہلیتِ عرب کے لوگ مقامِ وقوف میں اختلاف رکھتے تھے، کچھ لوگ عرفات میں وقوف کرنا ضروری سمجھتے تھے جیسا کہ حقیقت ہے، اور کچھ مزدلفہ میں وقوف ضروری کہتے تھے، عرفات میں جانے کو ضروری نہیں سمجھتے تھے، اور اسی کو موقفِ ابراہیم علیہ السلام قرار دیتے تھے، اور کچھ ذیقعدہ ہی میں کر لیتے تھے، اور پھر ان معاملات میں باہمی نزاعات اور جھگڑے ہوتے تھے، ایک دوسرے کو گمراہ کہتا تھا، قرآنِ کریم نے **وَلَا جِدَالَ** فرما کر ان جھگڑوں کا خاتمہ فرمایا، اور جو بات حق تھی کہ وقوفِ فرض عرفات میں اور پھر وقوفِ واجب مزدلفہ میں کیا جائے، اور حج صرف ذی الحجہ کے ایام میں کیا جائے، اس کا اعلان کر کے اس کے خلاف جھگڑا کرنے کو ممنوع کر دیا۔

اس تفسیر و تقریر کے لحاظ سے اس آیت میں صرف محظوراتِ احرام کا بیان ہوا جو اگرچہ فی نفسہ جائز ہیں، مگر احرام کی وجہ سے ممنوع کر دی گئی ہیں، جیسے نماز، روزے کی حالت میں کھانا پینا، کلام کرنا وغیرہ جائز چیزوں کو منع کر دیا گیا ہے۔ اور بعض حضرات نے اس جگہ ”فسوق“ و ”جدال“ کو عام معنی میں لے کر مقصد یہ قرار دیا کہ اگرچہ فسق و گناہ اسی طرح باہم جدال و خلاف ہر جگہ ہر حال میں مذموم و گناہ ہے، لیکن حالتِ احرام میں اس کا گناہ اور زیادہ شدید ہو جاتا ہے، مبارک ایام اور مقدس سرزمین میں جہاں صرف اللہ کے لئے عبادت کے واسطے آتے ہیں، اور لبیک لبیک پکار رہے ہیں، احرام کا لباس ان کو ہر وقت اس کی یاد دہانی کرا رہا ہے کہ تم اس وقت عبادت میں ہو، ایسی حالت میں فسق و فجور اور نزاع و جدال انتہائی بے باکی اور اشد ترین گناہ ہو جاتا ہے۔

اس عام معنی کے اعتبار سے اس جگہ **رَفَثَ، فسوق، جدال** سے روکنے اور ان کی حرمت کو بیان کرنے میں ایک

حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مقام حج اور زمانہ حج کے حالات ایسے ہیں کہ ان میں انسان کو ان تینوں چیزوں میں ابتلا کے مواقع بہت پیش آتے ہیں، حالت احرام میں اکثر اپنے اہل و عیال سے ایک طویل مدت تک علیحدہ رہنا پڑتا ہے، اور پھر مطاف و سعی، عرفات، مزدلفہ، منیٰ کے اجتماعات میں کتنی بھی احتیاط برتی جائے عورتوں مردوں کا اختلاط ہو ہی جاتا ہے، ایسی حالت میں نفس پر قابو پانا آسان نہیں، اس لئے سب سے پہلے ”رَفَث“ کی حرمت کا بیان فرمایا، اسی طرح اس عظیم الشان اجتماع میں چوری وغیرہ دوسرے گناہوں کے مواقع بھی بے شمار پیش آتے ہیں، اس لئے ”وَلَا فُسُوقَ“ کی ہدایت فرمادی، اسی طرح سفر حج میں اول سے آخر تک بے شمار مواقع اس کے بھی پیش آتے ہیں کہ رفقاء سفر اور دوسروں لوگوں سے جگہ کی تنگی اور دوسرے اسباب کی بنا پر جھگڑا لڑائی ہو جائے، اس لئے ”وَلَا جِدَالَ“ کا حکم دیا گیا۔

بلاغت قرآن

اس آیت **فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ** کے الفاظ نفی کے الفاظ ہیں کہ یہ سب چیزیں حج میں نہیں ہیں، حالانکہ مقصود ان چیزوں سے نہی اور ممانعت کرنا ہے، جس کا مقتضی یہ تھا کہ ”لَا تَرْفَثُوا وَلَا تَفْسُقُوا وَلَا تُجَادِلُوا“ کہا جاتا، مگر یہاں نفی کی جگہ نفی کے الفاظ رکھ کر اس طرف اشارہ فرمادیا کہ ان افعال کی حج میں کوئی گنجائش اور تصور ہی نہیں۔

وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمُهُ اللَّهُؕ محظورات و ممنوعات احرام بیان فرمانے کے بعد آخر میں اس جملے میں یہ ہدایت دی گئی کہ حج کے مبارک ایام اور مقدس مقامات میں تو صرف یہی نہیں کہ محظورات اور گناہوں سے بچو، بلکہ غنیمت جان کر عبادت و ذکر اللہ اور نیک کاموں میں لگے رہو، تم جو بھی نیک کام کرو گے وہ اللہ کے علم میں ہے اور تمہیں اس پر بڑے انعامات ملیں گے۔

وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰؕ اس میں ان لوگوں کی اصلاح ہے جو حج و عمرہ کے لئے بے سروسامانی کے ساتھ نکل کھڑے ہوتے ہیں، اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ہم اللہ پر توکل کرتے ہیں، پھر راستے میں بھیک مانگنا پڑتی ہے، یا خود بھی تکلیف اٹھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی پریشان کرتے ہیں، اُن کی ہدایت کے لئے حکم ہوا کہ سفر حج کے لئے ضروریات سفر ساتھ لینا چاہئے، یہ توکل کے منافی نہیں، بلکہ توکل کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اسباب و وسائل کو اپنے مقدور کے مطابق حاصل اور جمع کرے، پھر اللہ پر توکل کرے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے توکل کی یہی تفسیر منقول ہے، بالکل ترک اسباب کا نام توکل رکھنا جہالت ہے۔

سفر حج میں تجارت یا مزدوری کرنا کیسا ہے؟

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْؕ یعنی ”تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم سفر حج میں تجارت یا

مزدوری کے ذریعے کچھ روزی کما لو اور اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق حاصل کرو۔“ واقعہ نزول اس آیت کا یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب نے جس طرح تمام عبادات و معاملات کو منسوخ کر کے طرح طرح کی بیہودہ رسمیں ان میں شامل کر دی تھیں، اور عبادات کو بھی کھیل تماشا بنا دیا تھا، اسی طرح افعال حج میں بھی طرح طرح کی بیہودگیاں کرتے تھے، منیٰ کے عظیم اجتماع میں ان کے خاص خاص بازار لگتے تھے، نمائش ہوتی تھی، تجارتوں کے فروغ کے ذرائع لگائے جاتے تھے۔ اسلام آیا، اور حج مسلمانوں پر فرض کیا گیا تو ان تمام بیہودہ رسموں کا قلع قمع کیا گیا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر مٹ جانے والے تھے، اب ان کو یہ خیال ہوا کہ ایام حج میں تجارت کرنا یا مزدوری کر کے کچھ کمالینا یہ بھی جاہلیت کی پیداوار ہے، شاید اسلام میں اس کی مطلقاً حرمت و ممانعت ہو جائے، یہاں تک کہ ایک صاحب حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے پاس آئے اور یہ سوال کیا کہ ہمارا پیشہ پہلے سے یہ ہے کہ ہم اونٹ کرایہ پر چلاتے ہیں، کچھ لوگ ہمارے اونٹ حج کے لئے کرایہ پر لے جاتے ہیں، ہم ان کے ساتھ جاتے ہیں اور حج کرتے ہیں، کیا ہمارا حج نہیں ہوگا؟ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، اور آپ سے وہی سوال کیا تھا، جو تم مجھ سے کر رہے ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس وقت کوئی جواب نہ دیا، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: **لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ** ^۱ اُس وقت آپ نے اس شخص کو بلوایا اور فرمایا کہ ہاں تمہارا حج صحیح ہے۔ ^۲

الغرض اس آیت نے یہ واضح کر دیا کہ اگر کوئی شخص دوران حج میں کوئی بیع و شراء یا مزدوری کرے جس سے کچھ نفع ہو جائے تو اس میں کوئی گناہ نہیں، ہاں کفار عرب نے جو حج کو تجارت کی منڈی اور نمائش گاہ بنا لیا تھا، اس کی اصلاح قرآن کے دو لفظوں سے کر دی گئی، ایک تو یہ کہ جو کچھ کمائیں اس کو اللہ تعالیٰ کا فضل اور عطا سمجھ کر حاصل کریں، شکر گزار ہوں، محض سرمایہ سمیٹنا مقصد نہ ہو، **فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ** ^۱ میں اسی کی طرف اشارہ ہے، دوسرے **لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ** کے لفظ نے یہ بتلادیا کہ اس کمائی میں تم پر کوئی گناہ نہیں، جس میں ایک اشارہ اس طرف ہے کہ اگر اس سے بھی اجتناب کیا جائے تو بہتر ہے، کیونکہ اخلاص کامل میں فرق آتا ہے، اور حقیقت مسئلہ کی یہ ہے کہ اس کا مدار اصل نیت پر ہے، اگر کسی شخص کی نیت اصل میں دنیوی نفع تجارت یا مزدوری ہے اور ضمنی طور پر حج کا بھی قصد کر لیا، یا نفع تجارت اور قصد حج دونوں مساوی صورت میں ہیں، تب تو یہ اخلاص کے خلاف ہے، حج کا ثواب اس سے کم ہو جائے گا اور برکات حج جیسی حاصل ہونی چاہئیں وہ حاصل نہ ہوں گی، اور اگر اصل نیت حج کی ہے اسی کے شوق میں نکلا ہے، لیکن مصارف حج میں یا گھر کی ضروریات میں تنگی ہے، اس

۱ صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب قوله: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ... إلخ ج: ۲، ص: ۶۳۸

۲ سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، باب الکری ج: ۱، ص: ۲۳۲

کو پورا کرنے کے لئے کوئی معمولی تجارت یا مزدوری کر لی، یہ اخلاص کے بالکل منافی نہیں، ہاں اس میں بھی بہتر یہ ہے کہ خاص اُن پانچ ایام میں جن میں حج کے افعال ادا ہوتے ہیں، ان میں کوئی مشغلہ تجارت و مزدوری کا نہ رکھے، بلکہ ان ایام کو خالص عبادت و ذکر میں گزارے، اسی وجہ سے بعض علماء نے خاص ان ایام میں تجارت و مزدوری کو ممنوع بھی فرمایا ہے۔

عرفات میں وقوف اور اس کے بعد مزدلفہ کا وقوف

اس کے بعد اسی آیت میں ارشاد ہے: **فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِندَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوا هَٰذَا يَوْمَ ۖ إِنَّ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهِ لَمَنِ الصَّٰلِّينَ** (۹۸) یعنی ”پھر جب تم عرفات سے واپس آنے لگو تو مشعر حرام کے پاس خدا تعالیٰ کی یاد کرو، اور اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو بتلا رکھا ہے، اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے بتلانے سے پہلے تم محض ہی ناواقف تھے۔“ اس میں بتلایا گیا ہے کہ عرفات سے واپسی میں رات کو مزدلفہ میں قیام اور اس کا خاص ذکر واجب ہے۔

عرفات، لفظاً جمع ہے، اور ایک خاص میدان کا نام ہے، جس کے حدود اربعہ معروف و مشہور ہیں، یہ میدان حرم سے خارج واقع ہوا ہے، حجاج کو اس میں پہنچنا اور زوال آفتاب سے مغرب تک یہاں قیام کرنا حج میں حج کا اہم ترین فرض ہے، جس کے فوت ہونے کا کوئی کفارہ اور فدیہ نہیں ہو سکتا۔

عرفات کو ”عرفات“ کہنے کی بہت سی وجوہ بتلائی جاتی ہیں، اُن میں واضح یہ ہے کہ اس میدان میں انسان اپنے رب کی معرفت اور بذریعہ عبادت و ذکر اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے، نیز مشرق و مغرب کے مسلمانوں کو آپس میں تعارف کا ایک موقع ملتا ہے۔ ارشاد قرآنی میں اس کی تاکید فرمائی ہے کہ عرفہ کے دن بعد مغرب عرفات سے واپس آتے ہوئے مشعر حرام کے پاس ٹھہرنا چاہئے، ”مشعر حرام“ ایک پہاڑ کا نام ہے، جو مزدلفہ میں واقع ہے، ”مشعر“ کے معنی شعار اور علامت کے ہیں، اور ”حرام“ بمعنی محترم و مقدس کے ہے، معنی یہ ہیں کہ یہ پہاڑ شعار اسلام کے اظہار کے لئے ایک مقدس مقام ہے، اس کے آس پاس کے میدان کو ”مزدلفہ“ کہتے ہیں، اس میدان میں رات گزارنا اور مغرب و عشاء دونوں نمازوں کو ایک وقت میں مزدلفہ میں پڑھنا واجب ہے، مشعر حرام کے پاس اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا، اگرچہ ہر طرح کے ذکر اللہ کو شامل ہے، مگر خصوصیت سے دونوں نمازوں کو ایک وقت یعنی مغرب کو عشاء کے ساتھ ادا کرنا اس جگہ کی مخصوص عبادت ہے، آیت کے جملے: **وَاذْكُرُوا هَٰذَا يَوْمَ ۖ كَمَا هَلَكْتُمْ** میں شاید اسی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی یاد اور ذکر کے لئے جو طریقہ بتلایا ہے، اسی طرح اس کو یاد کرو، اپنی رائے اور قیاس کو اس میں دخل نہ دو، کیونکہ رائے اور قیاس کا مقتضی تو یہ تھا کہ مغرب کی نماز مغرب کے وقت میں پڑھی جاتی، عشاء کی عشاء کے وقت میں، لیکن اُس روز اُس مقام پر حق تعالیٰ کو یہی پسند ہے کہ

مغرب کی نماز مؤخر کی جائے، اس کو عشاء کے ساتھ پڑھا جائے۔ ارشادِ قرآنی: **وَادْكُرُوهُ كَمَا هَدَيْتُمْ** سے ایک اور بھی اصولی مسئلہ نکل آیا کہ ذکر اللہ اور عبادت میں آدمی خود مختار نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو جس طرح چاہے یاد کرے، اور جس طرح چاہے اس کی عبادت کرے، بلکہ ذکر اللہ اور ہر عبادت کے خاص آداب ہیں، اُن کے موافق ادا کرنا ہی عبادت ہے، اس کے خلاف کرنا جائز نہیں، اور اس میں کمی بیشی یا مقدم مؤخر کرنا خواہ اس میں ذکر اللہ کی کچھ زیادتی بھی ہو وہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، نفلی عبادات اور صدقہ و خیرات وغیرہا میں جو لوگ بلا دلیل شرعی اپنی طرف سے کچھ خصوصیات اور اضافے کر لیتے ہیں، اور ان کی پابندی کو ضروری سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ضروری قرار نہیں دیا، اور ان افعال کے نہ کرنے والوں کو خطا وار سمجھتے ہیں، اس آیت نے اُن کی غلطی کو واضح کر دیا کہ وہ اہل جاہلیت کی سی عبادت ہے کہ اپنی رائے و قیاس سے عبادت کی صورتیں گھڑ رکھی تھیں، اور چند رسموں کا نام عبادت رکھ لیا تھا۔

اس کے بعد تیسری آیت میں ارشاد ہے: **ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا لِلَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَفُوٌّ رَحِيمٌ** (۱۹۹) یعنی ”پھر تم سب کو ضروری ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ جہاں اور لوگ جا کر واپس آتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے اور مہربانی فرمادیں گے۔“

اس جملے کا شانِ نزول یہ ہے کہ قریشِ عرب جو بیت اللہ کے محافظ و مجاور تھے اور سارے عرب میں ان کا اقتدار مُسلم تھا، اور ان کی ایک ممتاز حیثیت تھی، زمانہ جاہلیت میں وہ اپنی امتیازی شان بنانے کے لئے یہ حرکت کرتے تھے، اور سب لوگ تو عرفات کو جاتے اور وہاں وقوف کر کے واپس آتے تھے، یہ لوگ راستہ میں مزدلفہ کے اندر ہی ٹھہر جاتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم چونکہ بیت اللہ اور حرم کے مجاور ہیں، اس لئے حدودِ حرم سے باہر جانا ہمارے لئے مناسب نہیں، مزدلفہ حدودِ حرم کے اندر ہے، اور عرفات اس سے خارج، یہ بہانہ کر کے مزدلفہ ہی میں قیام کر لیتے، اور وہیں سے واپس آ جایا کرتے تھے، اور درحقیقت وجہ اس حیلے بہانے کی اپنا فخر و غرور اور عام لوگوں سے ممتاز ہو کر رہنا تھا، حق تعالیٰ کے اس فرمان نے ان کی غلط کاری واضح فرمادی اور ان کو حکم دیا کہ تم بھی وہیں جاؤ جہاں سب لوگ جاتے ہیں، یعنی عرفات میں، اور پھر وہیں سے سب کے ساتھ واپس آؤ۔

اول تو عام انسانوں سے اپنے آپ کو ممتاز کر کے رکھنا خود ایک متکبرانہ فعل ہے، جس سے ہمیشہ ہی پرہیز لازم ہے، خصوصاً حج کے ایام میں جہاں لباسِ احرام اور پھر قیام و مقام کی یکسانیت کے ذریعے اسی کا سبق دینا ہے کہ انسان سب برابر ہیں، امیر و غریب یا عالم و جاہل یا بڑے چھوٹے کا یہاں کوئی امتیاز نہیں، حالتِ احرام میں یہ امتیازی شان بنانا اور بھی زیادہ جرم ہے۔

انسانی مساوات کا زریں سبق اور اس کی بہترین عملی صورت

اس ارشادِ قرآنی سے اصولِ معاشرت کی ایک اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ رہن سہن، قیام و مقام میں بڑوں کو چاہئے کہ چھوٹوں سے الگ ممتاز ہو کر نہ رہیں، بلکہ مل جل کر رہیں، کہ اس میں باہمی اخوت و ہمدردی اور محبت و تعلق پیدا ہوتا ہے، اور امیر و غریب کی تفریق مٹتی ہے، مزدور و سرمایہ دار کی جنگ ختم ہو جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں اس کو خوب واضح کر کے ارشاد فرمایا کہ کسی عربی کو عجی پر، یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں، فضیلت کا مدار تقویٰ اور اطاعتِ خداوندی پر ہے، اسی لئے جو لوگ ان کے خلاف مزدلفہ میں قیام کر کے اپنی ممتاز حیثیت بنانا چاہتے تھے، ان کے اس فعل کو گناہ قرار دے کر ان پر لازم کیا کہ اپنے اس گناہ سے توبہ و استغفار کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی خطائیں معاف فرمادیں اور اپنی رحمت فرمادیں۔

رُسومِ جاہلیت کی اصلاح منیٰ میں فضولِ اجتماعات کی ممانعت

چوتھی، پانچویں اور چھٹی آیات میں چند رُسومِ جاہلیت کی اصلاح کی گئی ہے، ایک تو یہ کہ عرب زمانہ جاہلیت میں عرفات و مزدلفہ اور طواف و قربانی سے فارغ ہو کر جب منیٰ میں قیام کرتے تھے تو ان کی مجلسیں صرف اس کام کے لئے ہوتی تھیں کہ مشاعرے منعقد کریں، اور ان میں اپنے مفاخر اور اپنے آباء و اجداد کے مفاخر اور کارناموں کا بیان کریں، ان کی مجلسیں ذکر اللہ سے یکسر خالی ہوتی تھیں، ان مبارک ایام کو ایسی لغو اور فضول چیزوں میں ضائع کرتے تھے، اس لئے ارشاد ہوا کہ جب تم اپنے افعالِ احرام کو پورا کر چکو اور منیٰ میں قیام کرو تو وہاں رہ کر اللہ تعالیٰ کو یاد کرو، اپنے آباء و اجداد کو یاد کرنا اور خصوصاً ان کے جھوٹے سچے مفاخر اور کارناموں کو بیان کرنا چھوڑو، جتنا تم ان کو یاد کرتے ہو اس کی جگہ بلکہ اس سے زیادہ خدا تعالیٰ کو یاد کرو، اور ذکر اللہ میں مشغول رہو۔ قرآن کی اس آیت نے عرب کی ایک جاہلانہ رسم کو مٹا کر مسلمانوں کو یہ ہدایت کی کہ یہ ایام اور یہ مقام عبادت اور ذکر اللہ کے لئے مخصوص ہیں، ان میں ذکر اللہ و عبادت کے جو فضائل و برکات ہیں وہ پھر ہاتھ نہ آئیں گے، ان کو غنیمت جانا چاہئے۔

علاوہ ازیں حج ایک ایسی عبادت ہے جو عموماً سفر طویل کی مشقت، اہل و عیال کی مفارقت، کاروبار کو ترک کرنے اور ہزاروں روپے اور بہت سا وقت خرچ کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے، اس میں حوادث کا پیش آ جانا کچھ بعید نہیں کہ آدمی باوجود کوشش کے اپنے مقصد حج میں کامیاب نہ ہو سکے، جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تمام موانع ہٹا کر آپ کے مقصد میں کامیاب فرمایا اور فرائض حج پورے ہو گئے، تو یہ مقام شکر ہے، جس کا اقتضایہ ہے کہ اور زیادہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں

مشغول ہوں، ان اوقات کو فضولِ اجتماعات اور فضولِ کام یا کلام میں ضائع نہ کرو، اہل جاہلیت ان اوقات میں اپنے آباء و اجداد کے تذکرے کرتے تھے، جن کا کوئی نفعِ دین و دنیا میں نہ تھا، تم اس کی جگہ اللہ کا ذکر کرو جو نور ہی نور اور نفع ہی نفع ہے، دنیا کے لئے بھی آخرت کے لئے بھی، آج کل اگرچہ مسلمانوں میں وہ رسم جاہلیت تو نہیں رہی کہ مشاعرے قائم کریں اور آباء و اجداد کے تذکرے کریں، لیکن آج بھی ہزاروں مسلمان ہیں جو ان ایام کو فضولِ اجتماعات میں، فضولِ دعوتوں اور تفریحات میں صرف کرتے ہیں، یہ آیت ان کی تنبیہ کے لئے کافی ہے۔

بعض حضرات مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کو ایسا یاد کرو جیسے بچپن میں اپنے باپ کو یاد کرتے ہیں کہ ان کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ کلام ”یا اَب، یا اَب“ ہوتا ہے، تم اب بالغ ہو، جوان ہو، عاقل ہو، ”یا اَب، یا اَب“ کی جگہ ”یا رَب، یا رَب“ کو اختیار کرو، اور اس پر نظر ڈالو کہ بچہ اپنے باپ کو اس لئے پکارتا ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں میں اپنے آپ کو باپ کا محتاج سمجھتا ہے۔ انسان اگر ذرا غور کرے تو وہ ہر وقت، ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا محتاج اس سے زیادہ ہے، جیسا بچہ اپنے باپ کا محتاج ہے۔ نیز بعض اوقات کچھ لوگ اپنے باپ کا ذکر فخراً بھی کیا کرتے ہیں، جیسے اہل جاہلیت کرتے تھے، تو اس آیت نے یہ بھی ہدایت کر دی کہ فخر و عزت کے لئے بھی ذکر اللہ سے زیادہ کوئی چیز مؤثر نہیں۔ (روح البیان) [۱]

ایک اور رسم جاہلیت کی اصلاح دین و دنیا کی طلب میں اسلامی اعتدال

جس طرح جاہلیت کی یہ رسم بیہودہ تھی کہ ان مبارک ایام کو اپنے باپ دادوں کے تذکروں اور مشاعروں میں گزاریں، اسی طرح کچھ لوگوں کی یہ عادت تھی کہ اگرچہ ایامِ حج میں شغل تو ذکر اللہ اور دعاؤں ہی کا رکھتے تھے، مگر ان کی تمام تر دعائیں صرف دنیوی حاجات اور دنیا کی راحت و عزت یا دولت کے لئے ہوتی تھیں، آخرت کی طرف کوئی دھیان نہ ہوتا تھا، ان کی اصلاح کے لئے اس آیت کے آخر میں فرمایا کہ بعض لوگ وہ ہیں جو حج میں دعا بھی مانگتے ہیں تو صرف دنیا کی بھلائی مانگتے ہیں، آخرت کی فکر نہیں کرتے، ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، کیونکہ ان کے اس طرزِ عمل سے معلوم ہوا کہ فریضہ حج بھی انہوں نے محض رسماً ادا کیا ہے، یا دنیا میں فخر و جاہت حاصل کرنے کے لئے کیا ہے، اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا اور آخرت میں نجات حاصل کرنا ان کے پیشِ نظر ہے ہی نہیں۔

اس جگہ یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ صرف دنیاوی دعا مانگنے والوں کا ذکر اس آیت میں اس طرح کیا گیا ہے کہ وہ کہتے ہیں رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا اس کے ساتھ حَسَنَةً کا لفظ مذکور نہیں، جس میں اشارہ اس کی طرف ہے کہ وہ دنیا کے لئے

بھی حسنہ کے طلب گار نہیں، بلکہ اغراض دُنیویہ میں ایسے مست و سرشار ہیں کہ ان کی طلب یہ رہ گئی ہے کہ اپنی خواہش کسی طرح پوری ہو، خواہ وہ اچھی ہو یا بری اور اچھے طریقہ سے حاصل ہو یا برے راستہ سے، لوگ اُن کو اچھا کہیں یا برا۔

اس آیت میں اُن مسلمانوں کے لئے بھی بڑی تنبیہ ہے جو موسم حج اور مقامات مقدسہ میں بھی دُعاؤں میں اپنی اغراض دُنیویہ ہی کو ترجیح دیتے ہیں، اور بیشتر اوقات انہیں کے لئے صرف کرتے ہیں۔ اور اگر ہمارے حالات کا جائزہ لیا جائے تو ثابت ہوگا کہ بہت سے دولت مند لوگ یہاں بھی جو وظائف اور دُعاؤں کرتے ہیں یا بزرگوں سے کراتے ہیں، ان میں بکثرت لوگ ایسے ہیں کہ ان کی غرض ان تمام وظائف و دُعاؤں سے بھی صرف دولت کی ترقی، تجارت میں برکت، اغراض دُنیویہ میں کامیابی ہوتی ہے، وہ بہت سے وظائف اور نوافل پڑھ کر یہ بھی سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم بہت عبادت گزار ہیں، لیکن وہ حقیقت میں ایک طرح کی دُنیا پرستی ہوتی ہے۔ بہت سے حضرات زندہ بزرگوں سے اور وفات یافتہ اولیاء اللہ سے بڑا تعلق رکھتے ہیں، لیکن اس تعلق کا بھی بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی دُعا یا تعویذ سے ہمارے کام نکلیں گے، دُنیا کی آفات دُور ہوں گی، مال میں برکت ہوگی، ایسے لوگوں کے لئے بھی اس آیت میں خاص ہدایت ہے، معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے جو علیم وخبیر ہے، ہر شخص کو اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہئے کہ وظائف و نوافل اور دُعا و دُرد سے اور حج و زیارت سے اس کی نیت کیا ہے۔ اس آیت کے آخری حصہ میں کم نصیب محروم القسمہ لوگوں کا تذکرہ کرنے کے بعد حق تعالیٰ نے نیک اور مقبول بندوں کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:-

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۲۱ یعنی ”اُن میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی دُعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے دُنیا کی بھلائی اور بہتری بھی مانگتے ہیں اور آخرت کی بہتری بھی اور عذابِ جہنم سے پناہ مانگتے ہیں۔“

اس میں لفظ **حَسَنَةً** تمام ظاہری اور باطنی خوبیوں اور بھلائیوں کو شامل ہے، مثلاً دُنیا کی ”حسنہ“ میں بدن کی صحت، اہل و عیال کی صحت، رزقِ حلال میں وسعت و برکت، دُنیوی سب ضروریات کا پورا ہونا، اعمالِ صالحہ، اخلاقِ محمودہ، علمِ نافع، عزت و وجاہت، عقائد کی دُرستی، صراطِ مستقیم کی ہدایت، عبادات میں اخلاصِ کامل سب داخل ہیں۔ اور آخرت کی ”حسنہ“ میں جنت اور اس کی بے شمار اور لازوال نعمتیں اور حق تعالیٰ کی رضا اور اس کا دیدار، یہ سب چیزیں شامل ہیں۔

الغرض یہ دُعا ایک ایسی جامع ہے کہ اس میں انسان کے تمام دُنیوی اور دینی مقاصد آجاتے ہیں، دُنیا و آخرت دونوں جہان میں راحت و سکون میسر آتا ہے۔ آخر میں خاص طور پر جہنم کی آگ سے پناہ کا بھی ذکر ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت یہ دُعا مانگا کرتے تھے: رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ اور

حالتِ طواف میں خصوصیت کے ساتھ یہ دُعا مسنون ہے۔ اس آیت میں ان جاہل درویشوں کی بھی اصلاح کی گئی ہے جو صرف آخرت ہی کی دُعا مانگنے کو عبادت جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں دُنیا کی کوئی پروا نہیں ہے، کیونکہ درحقیقت یہ ان کا دعویٰ غلط اور خیالی خام ہے، انسان اپنے وجود اور بقا اور عبادت و طاعت سب میں ضروریاتِ دُنیوی کا محتاج ہے، وہ نہ ہوں تو دین کا بھی کوئی کام کرنا مشکل ہے، اسی لئے انبیاء علیہم السلام کی سنت یہ ہے کہ جس طرح وہ آخرت کی بھلائی اور بہتری اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں اسی طرح دُنیا کی بھلائی اور آسائش بھی طلب کرتے ہیں، جو شخص دُنیوی حاجات کے لئے دُعا مانگنے کو زہد و بزرگی کے خلاف سمجھے وہ مقامِ انبیاء سے بے خبر اور جاہل ہے، ہاں صرف دُنیوی حاجات ہی کو مقصدِ زندگی نہ بنائے، اس سے زیادہ آخرت کی فکر کرے اور اس کے لئے دُعا مانگے۔

آیت کے آخر میں اسی دوسرے طبقہ کا جو کہ اپنی دُعاؤں میں دُنیا و آخرت دونوں کی بھلائی مانگتا ہے، انجامِ ذکر کیا گیا ہے کہ ان کے اس صحیح اور نیک عمل اور دُعاؤں کا نتیجہ ان کو دُنیا و آخرت میں ملے گا، اس کے بعد ارشاد ہے: **وَاللَّهُ سَرِيعٌ الْحِسَابِ** (۲۰۳) یعنی ”اللہ جلد حساب کرنے والا ہے۔“ کیونکہ اس کا علم محیط اور قدرتِ کاملہ کے لئے ساری مخلوقات کے ایک ایک فرد اور پھر اس کی عمر بھر کے اعمال کا حساب لینے میں اُن آلات و ذرائع کی ضرورت نہیں جن کا انسان محتاج ہے، اس لئے وہ بہت جلد ساری مخلوقات کا حساب لے لیں گے، اور اُن پر جزا و سزا مرتب فرمائیں گے۔

منیٰ میں دو یا تین دن کا قیام اور ذکر اللہ کی تاکید

آٹھویں آیت جو اس جگہ احکامِ حج کی آخری آیت ہے، اس میں حجاج کو ذکر اللہ کی طرف متوجہ کر کے ان کے مقصدِ حج کی تکمیل اور آئندہ زندگی کو درست رکھنے کی ہدایت اس طرح فرمائی گئی ہے: **وَادْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ** طیعنی ”اللہ کو یاد کرو گنتی کے چند دنوں میں“ ان چند دنوں سے مراد ایامِ تشریق ہیں جن میں ہر نماز کے بعد تکبیر کہنا واجب ہے۔

آگے ایک مسئلہ کی وضاحت کی گئی ہے کہ منیٰ میں قیام اور جمرات پر کنکریاں مارنا کب تک ضروری ہے، اس میں اہلِ جاہلیت کا اختلاف رہا کرتا تھا، بعض لوگ تیرہویں تاریخ ذی الحجہ تک منیٰ میں قیام اور جمرات پر رمی کرنے کو ضروری سمجھتے تھے، اس سے پہلے بارہویں کو واپس آجانے کو ناجائز اور ایسا کرنے والوں کو گنہگار کہا کرتے تھے، اسی طرح دوسرے لوگ بارہویں تاریخ کو چلے آنا ضروری سمجھتے اور تیرہویں تک ٹھہرنے کو گناہ جانتے تھے، اس آیت میں ان دونوں کی اصلاح اس طرح کی گئی کہ **فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ** یعنی ”جو شخص عید کے بعد صرف دو دن منیٰ میں قیام کر کے واپس آجائے، اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، اور جو تیسرے دن تک مؤخر کرے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔“ یہ دونوں فریق جو ایک دوسرے کو گنہگار کہتے ہیں غلو اور غلطی میں مبتلا ہیں۔

صحیح یہ ہے کہ حجاج کو دونوں صورتوں میں اختیار ہے جس پر چاہیں عمل کریں، ہاں افضل واولیٰ یہی ہے کہ تیسرے دن تک ٹھہریں، فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو شخص دوسرے دن غروبِ آفتاب سے پہلے منیٰ سے چلا آیا اس پر تیسرے دن کی رمی واجب نہیں، لیکن اگر آفتاب منیٰ میں غروب ہو گیا پھر تیسرے دن کی رمی کرنے سے پہلے وہاں سے واپس آ جانا جائز نہیں رہتا، البتہ تیسرے دن کی رمی میں یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ وہ زوالِ آفتاب سے پہلے صبح کے بعد بھی ہو سکتی ہے۔

منیٰ سے واپسی کا اور اس میں حجاج کو اختیار دینے کا ذکر فرمانے کے بعد جو کچھ کہا گیا کہ دوسرے دن واپس آ جائے گا تو کچھ گناہ نہیں، اور تیسرے دن واپس آ جائے تو کچھ گناہ نہیں، یہ سب اس شخص کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اس کے احکام کی پابندی کرنے والا ہے، کیونکہ درحقیقت حج اسی کا ہے، جیسا قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہے: **إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ** (المائدہ) یعنی ”اللہ تعالیٰ عبادت انہی کی قبول کرتا ہے جو اللہ سے ڈرنے والے اور اطاعت شعار بندے ہیں۔“ اور جو شخص حج سے پہلے بھی گناہوں میں ملوث تھا اور حج کے اندر بھی بے پروائی سے کام لیتا رہا، حج کے بعد بھی گناہوں سے پرہیز نہ کیا تو اس کو اس کا حج کوئی فائدہ نہ دے گا، اگرچہ اس کا حج فرض ادا ہو گیا، ترک حج کا مجرم نہیں رہا۔

آخر میں ارشاد فرمایا: **وَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَعْلَمُوا أَنَّكُمُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ** (۲۳) یعنی ”ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اور یقین کرو کہ تم سب اللہ کے پاس جمع ہونے والے ہو۔“ وہ تمہارے کھلے ہوئے اور چھپے ہوئے اعمال کا حساب لیں گے، اور ان پر جزا و سزا دیں گے، احکام حج جو اوپر کی آیات میں بیان کئے گئے ہیں یہ جملہ درحقیقت اُن سب کی رُوح ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ خاص ایام حج میں جبکہ اعمال حج میں مشغول ہو، اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور گناہوں سے اجتناب کرو، کیونکہ وزنِ اعمال کے وقت انسان کے گناہ اس کے نیک اعمال کو کھا جائیں گے، نیک اعمال کا اثر اور وزن ظاہر نہ ہونے دیں گے، عبادت حج کے متعلق حدیث میں ہے کہ جب انسان حج سے فارغ ہو کر آتا ہے تو اپنے سابقہ گناہوں سے ایسا پاک صاف ہو جاتا ہے جیسے وہ ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوا ہے، اس لئے خاص طور سے حجاج کو آئندہ کے لئے تقویٰ کی ہدایت کی گئی کہ پچھلے گناہوں سے پاک ہو چکے ہو، آگے احتیاط رکھو، تو دنیا و آخرت کی بھلائی تمہارے لئے ہے، ورنہ جو شخص حج کے بعد پھر گناہوں میں مبتلا ہو گیا تو پچھلے گناہوں کی معافی اس کو کوئی خاص کام نہ آوے گی، بلکہ علماء نے فرمایا ہے کہ حج مقبول کی علامت یہ ہے کہ اپنے حج سے اس طرح واپس آئے کہ اس کا دل دنیا کی محبت سے فارغ اور آخرت کی طرف راغب ہو، ایسے شخص کا حج مقبول اور گناہ معاف ہیں، اور دُعا اس کی مقبول ہے، دورانِ حج میں جگہ جگہ انسان اللہ تعالیٰ سے اطاعت و فرمانبرداری کا معاہدہ اس کے بیت کے سامنے کرتا ہے، اگر حج کرنے والے اس کا دھیان رکھیں تو اس معاہدہ کے پورا کرنے کا آئندہ اہتمام میسر آ سکتا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں حج سے واپس آیا تو اتفاقاً میرے دل میں ایک گناہ کا وسوسہ پیدا ہوا، مجھے غیب سے آواز آئی کہ کیا تو نے حج نہیں کیا؟ کیا تو نے حج نہیں کیا؟ یہ آواز میرے اور اس گناہ کے درمیان ایک دیوار بن گئی، اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ فرمادیا۔

ایک ترکی بزرگ جو مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے، ان کا حال یہ تھا کہ ہمیشہ اپنے سر پر ایک نور کا مشاہدہ کیا کرتے تھے، وہ حج کو گئے اور فارغ ہو کر واپس آئے تو یہ کیفیت بجائے بڑھنے کے بالکل سلب ہو گئی، اپنے مرشد مولانا جامی سے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے فرمایا کہ حج سے پہلے تمہارے اندر تواضع و انکسار تھا، اپنے آپ کو گناہگار سمجھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے الحاح و زاری کرتے تھے، حج کے بعد تم اپنے آپ کو نیک اور بزرگ سمجھنے لگے، اس لئے یہ حج ہی تمہارے لئے غرور کا سبب بن گیا، اسی وجہ سے یہ کیفیت زائل ہو گئی۔

احکام حج کے ختم پر تقویٰ کی تاکید میں ایک راز یہ بھی ہے کہ حج ایک بڑی عبادت ہے، اس کے ادا کرنے کے بعد شیطان عموماً انسان کے دل میں اپنی بڑائی اور بزرگی کا خیال ڈالتا ہے، جو اس کے تمام عمل کو بیکار کر دینے والا ہے، اس لئے خاتمہ کلام میں فرمایا کہ جس طرح حج سے پہلے اور حج کے اندر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس کی اطاعت لازم ہے، اسی طرح حج کے بعد اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور گناہوں سے پرہیز کا اہتمام کرتے رہو کہ کہیں یہ کی کرائی عبادت ضائع نہ ہو جائے، اَللّٰهُمَّ وَفَّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی مِنَ الْقَوْلِ وَالْفِعْلِ وَالنِّيَّةِ۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُ قَوْلَهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ يَشْهَدُ اللّٰهُ

اور بعض آدمی وہ ہے کہ پسند آتی ہے تجھ کو اس کی بات دُنیا کی زندگانی کے کاموں میں، اور گواہ کرتا ہے اللہ کو

عَلٰی مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۚ وَهُوَ الَّذِيْ الْخَصَامِ ۙ ۚ (۲۰۴) وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِي الْاَرْضِ

اپنے دل کی بات پر، اور وہ سخت جھگڑالو ہے۔ اور جب پھرے تیرے پاس سے تو دوڑتا پھرے ملک میں

لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۚ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفُسَادَ ۚ (۲۰۵) وَاِذَا

تاکہ اس میں خرابی ڈالے اور تباہ کرے کھیتیاں اور جانیں، اور اللہ ناپسند کرتا ہے فساد کو۔ اور جب

قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسِبُهُ جَهَنَّمَ ط

اُس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈر، تو آمادہ کرے اس کو غرور گناہ پر، سو کافی ہے اس کو دوزخ

وَلَيْسَ الْبِرَّ بِمَا كُنَّا نَبْرَأُ ۚ وَالَّذِينَ يَبْتِغَاءُ مَرْضَاتِ اللَّهِ ط

اور وہ بے شک برا ٹھکانا ہے۔ اور لوگوں میں ایک شخص وہ ہے کہ بیچتا ہے اپنی جان کو اللہ کی رضا جوئی میں،

وَاللَّهُ سَرِيعٌ بِالْعِبَادِ ۝۲۰۷

اور اللہ نہایت مہربان ہے اپنے بندوں پر۔

آسان ترجمہ قرآن

اور لوگوں میں ایک وہ شخص بھی ہے کہ دنیوی زندگی کے بارے میں اس کی باتیں تمہیں بڑی اچھی لگتی ہیں، اور جو کچھ اس کے دل میں ہے اُس پر وہ اللہ کو گواہ بھی بناتا ہے، حالانکہ وہ (تمہارے) دشمنوں میں سب سے زیادہ کڑ ہے ۲۰۷ اور جب اُٹھ کر جاتا ہے تو زمین میں اس کی دوڑ دھوپ اس لئے ہوتی ہے کہ وہ اس میں فساد مچائے، اور فصلیں اور نسلیں تباہ کرے، حالانکہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا ۲۰۸ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کا خوف کر، تو نخوت اس کو گناہ پر اور آمادہ کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایسے شخص کو تو جہنم ہی راس آئے گی، اور یقین کرو وہ بہت برا بچھونا ہے ۲۰۹ اور (دوسری طرف) لوگوں میں وہ شخص بھی ہے جو اللہ کی خوشنودی کی خاطر اپنی جان کا سودا کر لیتا ہے، اور اللہ (ایسے) بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ ۲۱۰

ربط آیات

اوپر کی آیتوں میں دُعا مانگنے والے آدمیوں کی دو قسمیں ٹھہرائی تھیں، ایک کافر کہ منکرِ آخرت ہے، اس لئے صرف دُنیا مانگتا ہے، دُوسرا مومن کہ معتقدِ آخرت ہے، دُنیا کی بھلائی کے ساتھ آخرت کی بھلائی بھی مانگتا ہے، اب اگلی آیت میں اسی طرح کی تقسیم نفاق و اخلاص کے اعتبار سے فرماتے ہیں کہ بعض منافق ہوتے ہیں اور بعض مخلصین۔

خلاصہ تفسیر

(کوئی شخص تھا انص بن شریق، بڑا فصیح و بلیغ، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر قسمیں کھا کھا کر دعویٰ اسلام کیا کرتا اور مجلس سے اُٹھ کر جاتا تو فساد و شرارت و ایذا رسانی خلق میں لگ جاتا، اس منافق کے باب میں فرماتے ہیں) اور بعض آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو جو محض دُنیوی غرض سے ہوتی ہے (کہ اظہارِ اسلام سے مسلمانوں کی طرح قرب و خصوصیت کے ساتھ رہوں گا، اس کی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے) مزہ دار معلوم ہوتی ہے، اور وہ (اپنا اعتبار بڑھانے کو) اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہے اپنے دل کی سچائی پر، حالانکہ (بالکل جھوٹا ہے، کیونکہ واقع میں) وہ (آپ کی) مخالفت میں (نہایت) شدید ہے، اور (جس طرح آپ کا مخالف ہے اسی طرح اور مسلمانوں کو بھی ایذا پہنچاتا ہے، چنانچہ جب (آپ کی مجلس سے) پیٹھ پھیرتا ہے تو اس دوڑ دھوپ میں پھرتا رہتا ہے کہ شہر میں (کوئی) فساد کر دے اور (کسی کی) کھیتی اور مویشی کو تلف کر دے، (چنانچہ ایک مسلمان کا اس طرح نقصان کر دیا) اور اللہ تعالیٰ فساد (کی باتوں) کو پسند نہیں فرماتے، اور (اس مخالفت و ایذا کے ساتھ مغرور اس درجہ ہے کہ) جب اس سے کوئی کہتا ہے خدا سے ڈر، تو (اور زیادہ) آمادہ کر دیتا ہے اس کو غرور گناہ پر، سوائے شخص کی کافی سزا ہے جہنم، اور وہ برا ٹھکانا ہے۔ اور بعض آدمی ایسے بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے بدلہ میں اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہیں۔

معارف مسائل

آیت کا آخری حصہ جس میں مومن و مخلص کا یہ حال بیان کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کی بھی بازی لگا دیتا ہے، یہ اُن مخلص صحابہ کرام کی شان میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے بے مثال قربانیاں اللہ کی راہ میں پیش کی ہیں، مستدرک حاکم، ابن جریر، مسند ابن ابی حاتم وغیرہ میں بسند صحیح منقول ہے کہ یہ آیت حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ میں نازل ہوئی ہے کہ جب وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کے لئے روانہ ہوئے تو راستہ میں کفارِ قریش کی ایک جماعت نے راستہ روک لیا یہ دیکھ کر حضرت صہیب رومی اپنی سواری سے اتر کر کھڑے ہو گئے، اور ان کے ترکش میں جتنے تیر تھے سب نکال لئے، اور قریش کی اس جماعت سے خطاب کیا کہ اے قبیلہ قریش! تم سب جانتے ہو کہ میں تیر اندازی میں تم سب سے زیادہ ماہر ہوں، میرا تیر کبھی خطا نہیں کرتا، اور اب میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ تم میرے پاس اس وقت تک نہ پہنچ سکو گے جب تک میرے ترکش میں ایک تیر بھی باقی ہے، اور تیروں کے بعد میں تلواریں سے کام لوں گا، جب تک مجھ میں دم رہے گا، پھر جو تم چاہو کر لینا، اور اگر تم نفع کا سودا چاہتے ہو تو میں تمہیں اپنے مال کا پتہ دیتا ہوں جو مکہ

مکرمہ میں رکھا ہے، تم وہ مال لے لو، اور میرا راستہ چھوڑ دو، اس پر قریش کی جماعت راضی ہو گئی، اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے صحیح سالم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر واقعہ سنایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ فرمایا:-

رَبِّهِ الْبَيْعُ أَبَا يَحْيَىٰ رَبِّهِ الْبَيْعُ أَبَا يَحْيَىٰ -

”تمہارا بیوپار بیع بخش رہا، تمہاری بیع نفع بخش رہی۔“

اسی واقعہ میں آیت مذکورہ کے نزول نے اس کلام کی تصدیق کر دی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک

سے نکلا تھا۔^[۱]

اور بعض حضرات مفسرین نے کچھ دوسرے صحابہ کرامؓ کے ایسے ہی واقعات کو آیت کا شان نزول بتلایا ہے۔ (مظہری)^[۲]

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ

اے ایمان والو! ہو جاؤ اسلام میں پورے اور مت چلو قدموں پر

الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿۲۰۸﴾ فَإِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمْ

شیطان کے، بے شک وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔ پھر اگر تم بچلنے لگو بعد اس کے کہ پہنچ چکے تم کو

الْبَيْتِ فَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۰۹﴾ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ

صاف حکم تو جان رکھو کہ بے شک اللہ زبردست ہے حکمت والا۔ کیا وہ اسی کی راہ دیکھتے ہیں کہ

يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ وَالْبَلَاكَةِ وَقُضِيَ الْأَمْرُ ۚ وَإِلَى اللَّهِ

آوے اُن پر اللہ ابر کے سائبانوں میں اور فرشتے اور طے ہو جاوے قصہ، اور اللہ ہی کی طرف

تَرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿۲۱۰﴾

لوٹیں گے سب کام۔

[۱] المستدرک علی الصحیحین، ذکر مناقب صہیب رقم الحدیث: ۵۷۲۹

[۲] تفسیر مظہری تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۲۳۸

آسان ترجمہ قرآن

اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ یقیناً جانو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے (۲۸) پھر جو روشن دلائل تمہارے پاس آچکے ہیں، اگر تم اُن کے بعد بھی (راہِ راست سے) پھسل گئے تو یاد رکھو کہ اللہ اقتدار میں بھی کامل ہے، حکمت میں بھی کامل۔ (۲۹) یہ (کفار ایمان لانے کے لئے) اس کے سوا کس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ خود بادل کے سائبانوں میں ان کے سامنے آ موجود ہو، اور فرشتے بھی (اس کے ساتھ ہوں) اور سارا معاملہ ابھی چکا دیا جائے؟ حالانکہ آخر کار سارے معاملات اللہ ہی کی طرف تو لوٹ کر رہیں گے (۳۰)

ربط آیات

اوپر مخلص کی مدح تھی، بعض اوقات اس اخلاص میں غلطی سے غلو اور افراط ہو جاتا ہے، یعنی قصد تو ہوتا ہے زیادہ اطاعت کا مگر وہ اطاعت بنظر غائر حد شریعت و سنت سے متجاوز ہوتی ہے، اس کو ”بدعت“ کہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ جو پہلے علمائے یہود سے تھے، اور اس مذہب میں ہفتہ کا روز معظم تھا، اور اُونٹ کا گوشت حرام تھا، ان صاحبوں کو بعد اسلام کے یہ خیال ہوا کہ شریعت موسوی میں ہفتہ کی تعظیم واجب تھی، اور شریعت محمدیہ میں اس کی بے تعظیمی واجب نہیں، اسی طرح شریعت موسویہ میں اُونٹ کا گوشت کھانا حرام تھا اور شریعت محمدیہ میں اس کا کھانا فرض نہیں، سو اگر ہم بدستور ہفتہ کی تعظیم کرتے رہیں اور اُونٹ کا گوشت باوجود حلال اعتقاد رکھنے کے صرف عملاً ترک کر دیں تو شریعت موسویہ کی بھی رعایت ہو جاوے اور شریعت محمدیہ کے بھی خلاف نہ ہوگا، اور اس میں خدا تعالیٰ کی زیادہ اطاعت اور دین کی زیادہ رعایت معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خیال کی اصلاح آیت آئندہ میں کسی قدر اہتمام سے فرماتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام کامل فرض ہے اور اس کا کامل ہونا جب ہے کہ جو امر اسلام میں قابل رعایت نہ ہو اس کی رعایت دین ہونے کی حیثیت سے نہ کی جاوے، اور ایسے امر کو دین سمجھنا ایک شیطانی لغزش ہے، اور بہ نسبت ظاہری معاصی کے اس کا عذاب زیادہ سخت ہونے کا خطرہ ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو (یہ نہیں کہ کچھ یہودیت کی بھی رعایت کرو) اور (ایسے خیالات میں پڑ کر) شیطان کے قدم بقدم مت چلو، واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے (کہ ایسی پٹی پڑھا دیتا ہے کہ ظاہر میں تو

سراسر دین معلوم ہو اور فی الحقیقت بالکل دین کے خلاف) پھر اگر تم بعد اس کے کہ تم کو واضح دلیلیں (احکام و شرائع اسلام کی) پہنچ چکی ہیں، (پھر بھی صراطِ مستقیم سے) لغزش کرنے لگو تو یقین رکھو کہ حق تعالیٰ (بڑے) زبردست ہیں (سخت سزا دیں گے، اور کچھ دنوں تک سزا نہ دیں تو اس سے دھوکا مت کھانا کیونکہ وہ) حکمت والے (بھی) ہیں (کسی حکمت و مصلحت سے کبھی سزا میں دیر بھی کر دیتے ہیں، معلوم ہوتا ہے) یہ لوگ (جو کہ بعد وضوح دلائل حق کے کج راہی اختیار کرتے ہیں) صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ حق تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں ان کے پاس (سزا دینے کے لئے) آویں اور سارا قصہ ہی ختم ہو جاوے (یعنی کیا اس وقت امرِ حق قبول کریں گے جس وقت کا قبول کرنا مقبول بھی نہ ہوگا) اور یہ سارے (جزا و سزا کے) مقدمات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کئے جاویں گے (کوئی دوسرا صاحب اختیار نہ ہوگا، سوائے زبردست کے ساتھ مخالفت کرنے کا انجام بجز خرابی کے کیا ہو سکتا ہے)۔

معارفِ مسائل

اَدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً "سِلْم" بالکسر و الفتح دو معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک صلح، دوسرے اسلام، اس جگہ جمہور صحابہؓ و تابعینؓ کے نزدیک اسلام مراد ہے (ابن کثیر)۔ لفظ کَآفَّةً جمیعاً اور عامۃً کے معنی میں آتا ہے، یہ لفظ اس جگہ ترکیب میں حال واقع ہوا ہے، جس میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ ضمیر اَدْخُلُوا کا حال قرار دیا جائے، دوسرے یہ کہ "سِلْم" بمعنی اسلام کا حال ہو، پہلی صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ تم پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ، یعنی تمہارے ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان، دل اور دماغ سب کا سب دائرۃ اسلام و اطاعتِ الہیہ کے اندر داخل ہونا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ ہاتھ پاؤں سے تو احکامِ اسلامیہ بجالا رہے ہو مگر دل و دماغ اس پر مطمئن نہیں، یا دل دماغ سے تو اس پر مطمئن ہو مگر ہاتھ پاؤں اور اعضاء و جوارح کا عمل اس سے باہر ہے۔

اور دوسری صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ تم داخل ہو جاؤ مکمل اور پورے اسلام میں، یعنی ایسا نہ ہو کہ اسلام کے بعض احکام تو قبول کرو، بعض میں پس و پیش رہے، اور چونکہ اسلام نام ہے اس مکمل نظامِ حیات کا جو قرآن و سنت میں بیان ہوا ہے خواہ اس کا تعلق عقائد و عبادات سے ہو، یا معاملات و معاشرت سے، حکومت و سیاست سے اس کا تعلق ہو یا تجارت و صنعت وغیرہ سے، اسلام کا جو مکمل نظامِ حیات ہے تم سب اس پورے نظام میں داخل ہو جاؤ۔

خلاصہ دونوں صورتوں کا قریب قریب یہی ہے کہ احکامِ اسلام خواہ وہ کسی شعبہ زندگی سے متعلق ہوں اور اعضاء ظاہری سے متعلق ہوں یا قلب اور باطن سے ان کا تعلق ہو، جب تک ان تمام احکام کو سچے دل سے قبول نہ

کرو گے مسلمان کہلانے کے مستحق نہیں ہو گے۔

اس آیت کا شان نزول جو اوپر بیان ہوا ہے، اس کا بھی حاصل یہی ہے کہ صرف اسلام ہی کی تعلیمات تمہارا ^{مط} نظر ہونا چاہئے، اس کو پورا پورا اختیار کر لو تو وہ تمہیں سارے مذاہب و ملل سے بے نیاز کر دے گا۔

تنبیہ:- اس میں اُن لوگوں کے لئے بڑی تنبیہ ہے جنہوں نے اسلام کو صرف مسجد اور عبادات کے ساتھ مخصوص کر رکھا ہے، معاملات اور معاشرت کے احکام کو گویا دین کا جزء ہی نہیں سمجھتے، اصطلاحی دین داروں میں یہ غفلت عام ہے، حقوق و معاملات اور خصوصاً حقوق معاشرت سے بالکل بیگانہ ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام کو وہ اسلام کے احکام ہی یقین نہیں کرتے، نہ اُن کے معلوم کرنے یا سیکھنے کا اہتمام کرتے ہیں، نہ اُن پر عمل کرنے کا، نعوذ باللہ، کم از کم مختصر رسالہ ”آداب معاشرت“ حضرت سیدی حکیم الامتؒ کا ہر مسلمان مرد و عورت کو ضرور پڑھ لینا چاہئے۔

اور یہ واقعہ کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں اُن کے پاس آجائیں، قیامت میں پیش آئے گا، اور اللہ تعالیٰ کا اس طرح آنا تشابہات میں سے ہے، جس کے متعلق جمہور صحابہؓ و تابعینؓ اور اسلافِ اُمت کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے مضمون کے حق و صحیح ہونے کا اعتقاد و یقین رکھے، اور کیفیت کہ کس طرح یہ کام ہوگا، اس کی دریافت کی فکر میں نہ پڑے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات اور تمام صفات کی حقیقت اور کیفیت کا معلوم کرنا انسان کی عقل سے بالاتر ہے، یہ بھی اسی میں داخل ہے۔

سَلِّبْنِي إِسْرَآءَ يٰلَ كَمْ أَتَيْنَهُم مِّنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ ۖ وَمَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ

پوچھ بنی اسرائیل سے کس قدر عنایت کیں ہم نے ان کو نشانیاں کھلی ہوئی، اور جو کوئی بدل ڈالے اللہ کی نعمت

مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ ۲۱۱ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا

بعد اس کے کہ پہنچ چکی ہو وہ نعمت اس کو تو اللہ کا عذاب سخت ہے۔ فریفتہ کیا ہے کافروں کو

الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا ۚ وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ

دُنیا کی زندگی پر اور ہنستے ہیں ایمان والوں سے، اور جو پرہیزگار ہیں وہ ان کافروں سے بالاتر ہوں گے

يَوْمَ الْقِيَمَةِ ۖ وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۲۱۲

قیامت کے دن، اور اللہ روزی دیتا ہے جس کو چاہے بے شمار۔

آسان ترجمہ قرآن

بنی اسرائیل سے پوچھو ہم نے ان کو کتنی ساری کھلی نشانیاں دی تھیں! اور جس شخص کے پاس اللہ کی نعمت آچکی ہو، پھر وہ اس کو بدل ڈالے، تو (اسے یاد رکھنا چاہئے کہ) اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے ۝۲۱۱ جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، ان کے لئے دُنیوی زندگی بڑی دلکش بنا دی گئی ہے، اور وہ اہل ایمان کا مذاق اڑاتے ہیں، حالانکہ جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے وہ قیامت کے دن ان سے کہیں بلند ہوں گے۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ ۝۲۱۲

رابط آیات

اوپر فرمایا تھا کہ بعد دلائل واضحہ آجانے کے حق کی مخالفت کرنا موجب سزا ہے، پہلی آیت میں اس کی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ جیسے بعض بنی اسرائیل کو ایسی ہی مخالفت پر سزا دی گئی۔

خلاصہ تفسیر

آپ (علمائے) بنی اسرائیل سے (ذرا) پوچھئے (تو سہی) ہم نے ان کو (یعنی اُن کے بزرگوں کو) کتنی واضح دلیلیں دی تھیں (مگر ان لوگوں نے بجائے اس کے کہ اس سے ہدایت حاصل کرتے اور اُلٹی گمراہی پر کمر باندھی، پھر دیکھو سزائیں بھی بھگتیں، مثلاً توراۃ ملی، چاہئے تو یہ تھا کہ اس کو قبول کرتے، مگر انکار کیا، آخر کوہ طور گرانے کی ان کو دھمکی دی گئی، اور مثلاً حق تعالیٰ کا کلام سنا، چاہئے تھا سر آنکھوں پر رکھتے مگر شبہات نکالے، آخر بجلی سے ہلاک ہوئے، اور مثلاً دریا میں شگاف کر کے فرعون سے نجات دی گئی، احسان مانتے مگر گوسالہ پرستی شروع کی، جس پر سزائے قتل دی گئی، اور مثلاً من وسلوی نازل ہوا، شکر کرنا چاہئے تھا، نافرمانی کی وہ سڑنے لگا، اور اس سے نفرت ظاہر کی تو وہ موقوف ہو گیا، اور کھیتی کی مصیبت سر پر پڑی، اور مثلاً انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ ان میں جاری رہا، غنیمت سمجھتے، ان کو قتل کرنا شروع کر دیا، جس پر یہ سزا دی گئی کہ ان سے حکومت و سلطنت چھین لی گئی، علیٰ ہذا بہت سے معاملات اسی سورہ بقرہ کے شروع میں بھی مذکور ہو چکے ہیں) اور (ہمارا قانون یہی ہے کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کی (ایسی بڑی) نعمت (دلائل واضحہ) کو بدلتا ہے، اس کے پاس پہنچنے

کے بعد (یعنی بجائے اس کے کہ اس سے ہدایت حاصل کرے اور الٹا گمراہ بنتا ہے) تو یقیناً حق تعالیٰ (ایسے شخص کو) سخت سزا دیتے ہیں۔

(دوسری آیت میں مخالفت حق کی اصلی علت اکثر یہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ دنیا کی محبت ہے، جس کے آثار میں سے اہل دین کو حقیر سمجھنا بھی ہے، کیونکہ جب دنیا کا غلبہ ہوتا ہے دین کی طلب نہیں رہتی، بلکہ دین کو اپنی دنیوی اغراض کے خلاف دیکھ کر ترک کر بیٹھتا ہے، اور دوسرے طالبان دین پر ہاتھ زاپش آیا کرتے تھے، ان لوگوں کا بیان فرماتے ہیں کہ) دنیوی معاش کفار کو آراستہ پیراستہ معلوم ہوتی ہے اور (اسی وجہ سے) ان مسلمانوں سے تمسخر کرتے ہیں، حالانکہ یہ (مسلمان) جو کفر و شرک سے بچتے ہیں ان کافروں سے اعلیٰ درجہ (کی حالت) میں ہوں گے قیامت کے روز (کیونکہ کفار جہنم میں ہوں گے اور مسلمان جنت میں) اور (آدمی کو محض معاشی وسعت پر مغرور نہ ہونا چاہئے، کیونکہ) روزی تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے انداز (یعنی بکثرت) دے دیتے ہیں (پس اس کا مدار قسمت پر ہے نہ کہ کمال اور مقبولیت پر، سو یہ ضرور نہیں کہ جو روزی میں بڑا ہو وہ اللہ کے نزدیک بھی معزز ہو، اور بڑی عزت وہی ہے جو اللہ کے نزدیک معتبر ہو، پھر محض اس کے اوپر اپنے کو معزز اور دوسرے کو ذلیل سمجھنا بیوقوفی ہے)۔

معارف و مسائل

دنیا کے مال و دولت اور عزت و جاہ پر مغرور ہونے اور غریب لوگوں کا استہزاء کرنے کی حقیقت قیامت کے روز آنکھوں کے سامنے آجائے گی۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص کسی مؤمن مرد یا عورت کو اس کے فقر و فاقہ کی وجہ سے ذلیل و حقیر سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو اولین و آخرین کے مجمع میں رسوا اور ذلیل کریں گے، اور جو شخص کسی مسلمان مرد یا عورت پر بہتان باندھتا ہے اور کوئی ایسا عیب اس کی طرف منسوب کرتا ہے جو اس میں نہیں ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو آگ کے ایک اونچے ٹیلہ پر کھڑا کریں گے جب تک کہ وہ خود اپنی تکذیب نہ کرے۔ (ذکر الحدیث القرطبی)

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً ۖ فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ ۖ

تھے سب لوگ ایک دین پر، پھر بھیجے اللہ نے پیغمبر خوش خبری سنانے والے اور ڈرانے والے

وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِي مَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ط

اور اُناری اُن کے ساتھ کتاب سچی کہ فیصلہ کرے لوگوں میں جس بات میں وہ جھگڑا کریں،

وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ

اور نہیں جھگڑا ڈالا کتاب میں مگر اُنہی لوگوں نے جن کو کتاب ملی تھی اس کے بعد کہ ان کو پہنچ چکے صاف حکم

بَعِيًّا بَيْنَهُمْ ج فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ

آپس کی ضد سے، پھر اب ہدایت کی اللہ نے ایمان والوں کو اس سچی بات کی جس میں وہ جھگڑا کر رہے تھے

بِأَذْنِهِ ط وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝۲۱۳

اپنے حکم سے اور اللہ بتلاتا ہے جس کو چاہے سیدھا راستہ۔

آسان ترجمہ قرآن

(شروع میں) سارے انسان ایک ہی دین کے پیرو تھے۔ پھر (جب ان میں اختلاف ہوا تو) اللہ نے نبی بھیجے جو (حق والوں کو) خوشخبری سناتے، اور (باطل والوں کو) ڈراتے تھے، اور ان کے ساتھ حق پر مشتمل کتاب نازل کی، تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرے جن میں ان کا اختلاف تھا۔ اور (افسوس کی بات یہ ہے کہ) کسی اور نے نہیں بلکہ خود انہوں نے جن کو وہ کتاب دی گئی تھی، روشن دلائل آجانے کے بعد بھی، صرف باہمی ضد کی وجہ سے اسی (کتاب) میں اختلاف نکال لیا۔ پھر جو لوگ ایمان لائے اللہ نے انہیں اپنے حکم سے حق کی ان باتوں میں راہِ راست تک پہنچایا جن میں انہوں نے اختلاف کیا تھا، اور اللہ جسے چاہتا ہے راہِ راست تک پہنچا دیتا ہے۔ ۝۲۱۳

ربط آیات

اوپر دینِ حق سے اختلاف کرنے کی علت حبِ دنیا کو بتایا ہے، آگے اسی مضمون کی تائید فرماتے ہیں کہ مدت سے یہی قصہ چلا آرہا ہے کہ ہم دلائلِ واضحہ دینِ حق پر قائم کرتے ہیں، اور طالبانِ دنیا اپنی دنیوی اغراض کے سبب اس سے خلاف کرتے رہے۔

خلاصہ تفسیر

(ایک زمانہ میں) سب آدمی ایک ہی طریق پر تھے (کیونکہ اول دنیا میں حضرت آدم علیہ السلام مع اپنی بی بی کے تشریف لائے اور جو اولاد ہوتی گئی ان کو دین حق کی تعلیم فرماتے رہے، اور وہ ان کی تعلیم پر عمل کرتے رہے، ایک مدت اسی حالت میں گزر گئی، پھر اختلاف طبائع سے اغراض میں اختلاف ہونا شروع ہوا، حتیٰ کہ ایک عرصہ کے بعد اعمال و عقائد میں اختلاف کی نوبت آ گئی) پھر (اس اختلاف کے رفع کرنے کو) اللہ تعالیٰ نے (مختلف) پیغمبروں کو بھیجا جو کہ (حق ماننے والوں کو) خوشی (کے وعدے) سناتے تھے اور (نہ ماننے والوں کو عذاب سے) ڈراتے تھے، اور ان (پیغمبروں کی مجموعی جماعت) کے ساتھ (آسمانی) کتابیں بھی ٹھیک طور پر نازل فرمائیں (اور ان پیغمبروں کا بھیجنا اور کتابوں کا نازل فرمانا) اس غرض سے (تھا) کہ اللہ تعالیٰ (ان رسل و کتب کے ذریعے سے اختلاف کرنے والے) لوگوں میں ان کے امور اختلافیہ (مذہبی) میں فیصلہ فرمادیں (کیونکہ رسل و کتب امر واقعی کا اظہار کر دیتے ہیں اور امر واقعی کے متعین ہونے سے ظاہر ہے کہ غیر واقعی کا غلط ہو جانا معلوم ہو جاتا ہے، اور یہی فیصلہ ہے، اور ان پیغمبروں کے ساتھ کتاب اللہ آنے سے چاہئے تھا کہ اس کتاب کو قبول کرتے، اور اس پر مدار کار رکھ کر اپنے سب اختلافات مٹا دیتے، مگر بعضوں نے خود اس کتاب ہی کو نہ مانا، اور خود اسی میں اختلاف کرنا شروع کر دیا) اور اس کتاب میں (یہ) اختلاف اور کسی نے نہیں کیا، مگر صرف ان لوگوں نے جن کو (اولاً) وہ کتاب ملی تھی (یعنی اہل علم و اہل فہم نے) کہ اول مخاطب وہی لوگ ہوتے ہیں، دوسرے عوام اُن کے ساتھ لگ لیا کرتے ہیں، اور اختلاف بھی کیسے وقت کیا) بعد اس کے کہ ان کے پاس دلائل واضح پہنچ چکے تھے (یعنی ان کے ذہن نشین ہو چکے تھے، اور اختلاف کیا کس وجہ سے صرف) باہمی ضد اضدی کی وجہ سے (اور اصلی وجہ ضد اضدی کی حب دنیا ہوتی ہے، حب مال ہو یا حب جاہ، پس مدار علت مخالفت حق کا وہی حب دنیا ٹھہری، اور یہی مضمون تھا سابق میں) پھر (یہ) اختلاف کفار کا کبھی اہل ایمان کو مضر نہیں ہوا، بلکہ (اللہ تعالیٰ نے) ہمیشہ (ایمان والوں کو وہ امر حق جس میں) (مختلفین) اختلاف کیا کرتے تھے بفضلہ تعالیٰ (رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانے کی بدولت) بتلادیا اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اسی کو راہِ راست بتلادیتے ہیں۔

معارف و مسائل

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی زمانہ میں تمام انسان ایک ہی مذہب و ملت اور عقیدہ و خیال پر تھے، جو ملت حق اور دین فطرت تھی، پھر اُن میں مزاج و مذاق اور رائے و فکر کے اختلاف سے بہت سے مختلف خیالات و عقائد پیدا

ہو گئے، جن میں یہ امتیاز کرنا دشوار تھا کہ ان میں حق کونسا ہے اور باطل کونسا، حق کو واضح کرنے اور صحیح راہ حق بتلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام بھیجے اور ان پر کتابیں اور وحی نازل فرمائی، انبیاء علیہم السلام کی جدوجہد اور تبلیغ و اصلاح کے بعد انسان دو گروہوں میں منقسم ہو گئے، ایک وہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایات کو قبول کیا اور انبیاء علیہم السلام کے متبع ہو گئے، جن کو ”مؤمن“ کہا جاتا ہے، دوسرے وہ جنہوں نے آسمانی ہدایات اور انبیاء علیہم السلام کو جھٹلایا، ان کی بات نہ مانی، یہ لوگ ”کافر“ کہلاتے ہیں۔ اس آیت کے پہلے جملہ میں ارشاد ہے: **كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً** امام راغب اصفہانی نے ”مفردات القرآن“ میں فرمایا ہے کہ لفظ ”أمة“ عربی لغت کے اعتبار سے ہر ایسی جماعت کو کہا جاتا ہے جس میں کسی وجہ سے رابطہ و اتحاد اور وحدت قائم ہو، خواہ یہ وحدت نظریات و عقائد کی ہو، یا ایک زمانہ میں یا کسی ایک خطہ ملک میں جمع ہونے کی، یا کسی دوسرے علاقہ یعنی نسب، زبان، رنگ وغیرہ کی، مفہوم اس جملہ کا یہ ہے کہ کسی زمانہ میں تمام انسان باہم متفق و متحد ایک جماعت تھے، اس میں دو باتیں قابل غور ہیں:-

اول یہ کہ اس جگہ وحدت سے کس قسم کی وحدت مراد ہے، دوسرے یہ کہ وحدت کس زمانہ میں تھی۔ امر اول کا فیصلہ تو اسی آیت کے آخری جملہ نے کر دیا، جس میں اس وحدت کے بعد اختلاف واقع ہونے کا اور مختلف راہوں میں حق متعین کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے کا ذکر ہے، کیونکہ یہ اختلاف جس میں فیصلہ کرنے کے لئے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں بھیجی گئی ہیں، ظاہر ہے کہ وہ نسب یا زبان یا رنگ یا وطن اور زمانہ کا اختلاف نہ تھا، بلکہ نظریات اور عقائد و خیالات کا اختلاف تھا، اسی کے مقابلہ سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں وحدت سے بھی وحدت فکر و خیال اور وحدت عقیدہ و مسلک مراد ہے۔

تو اب مفہوم آیت کا یہ ہو گیا کہ ایک زمانہ ایسا تھا جبکہ تمام افراد انسانی صرف ایک ہی عقیدہ و خیال اور ایک ہی مذہب و مسلک رکھتے تھے، وہ عقیدہ و مسلک کیا تھا، اس میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ سب عقیدہ توحید و ایمان پر متفق تھے، دوسرے یہ کہ سب کفر و ضلال پر متحد تھے، مگر جمہور مفسرین کے نزدیک رائج یہ ہے کہ مراد عقائد صحیحہ، توحید و ایمان پر سب کا متحد ہونا ہے، سورہ یونس میں بھی اسی مضمون کی ایک آیت آئی ہے:-

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَفُتِنُوا بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۹﴾ (یونس)

”یعنی سب آدمی ایک ہی امت تھے، پھر آپس میں اختلاف پڑ گیا، اور اگر اللہ تعالیٰ کا یہ ازل فیصلہ نہ ہوتا (کہ اس عالم دنیا میں حق و باطل، کھرا کھوٹا، سچ اور جھوٹ ملے جلے چلیں گے) تو قدرت الہیہ ان

سب جھگڑوں کا ایسا فیصلہ کر دیتی کہ حق سے اختلاف کرنے والوں کا نام ہی نہ رہتا۔“
اور سورہ انبیاء میں فرمایا:-

إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ ۝۹۷ (الانبیاء)

”یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں، اس لئے سب میری ہی عبادت کرتے رہو۔“

اسی طرح سورہ مؤمنون میں فرمایا:-

وَأَنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ ۝۹۸ (المؤمنون)

”یعنی یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں، اس لئے مجھ سے ہی ڈرتے رہو۔“

ان تمام آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ وحدت سے عقیدہ و مسلک کی وحدت اور دین حق تو حید و ایمان میں سب کا متحد ہونا مراد ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ دین حق اسلام و ایمان پر تمام انسانوں کا اتفاق و اتحاد کس زمانہ کا واقعہ ہے، یہ وحدت کہاں تک قائم رہی؟ مفسرین صحابہؓ میں سے حضرت اُبی بن کعبؓ اور ابن زیدؓ نے فرمایا کہ یہ واقعہ عالم ازل کا ہے، جب تمام انسانوں کی ارواح کو پیدا کر کے ان سے سوال کیا گیا تھا: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟ (الاعراف: ۱۷۲) یعنی ”کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں“ اور سب نے بلا استثناء یہ جواب دیا تھا کہ بے شک آپ ہمارے رب اور پروردگار ہیں، اس وقت تمام افراد انسانی ایک ہی عقیدہ حقہ پر قائم تھے، جس کا نام ایمان و اسلام ہے۔ (قرطبی) ^۱

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ وحدت عقیدہ کا واقعہ اس وقت کا ہے جبکہ آدم علیہ السلام مع اپنی زوجہ محترمہ کے دنیا میں تشریف لائے، اور آپ کی اولاد ہوئی اور پھیلتی گئی، وہ سب کے سب حضرت آدم علیہ السلام کے دین اور انہی کی تعلیم و تلقین کے تابع تو حید کے قائل تھے، اور سب کے سب باستثناء قابیل وغیرہ متبع شریعت و فرمانبردار تھے۔

مسند بزار میں حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ وحدت عقیدہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت ادریس علیہ السلام تک قائم رہی، اس وقت سب کے سب مسلم اور تو حید کے معتقد تھے، اور آدم علیہ السلام اور ادریس علیہ السلام کے درمیان زمانہ دس قرن ہے، بظاہر ”قرن“ سے ایک صدی مراد ہے، تو کل زمانہ ایک ہزار سال کا ہو گیا۔ اور بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ وحدت عقیدہ کا زمانہ وہ ہے جبکہ نوح علیہ السلام کی بددعا سے دنیا میں طوفان آیا، اور بجز ان لوگوں کے جو نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہو گئے تھے، باقی ساری دنیا غرق ہو گئی تھی، طوفان

ختم ہونے کے بعد جتنے آدمی اُس دُنیا میں رہے وہ سب مسلمان موحد اور دین حق کے پیرو تھے۔^[۱]

اور درحقیقت ان تینوں اقوال میں کوئی اختلاف نہیں، یہ تینوں زمانے ایسے ہی تھے جن میں سارے انسان ملتِ واحدہ اور اُمتِ واحدہ بنے ہوئے دین حق پر قائم تھے۔

آیت کے دوسرے جملہ میں ارشاد ہے: **فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ ۖ وَانْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِي مَا اخْتَلَفُوا فِيهِ** یعنی ”پھر اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیجا جو خوشی سناتے تھے اور ڈراتے تھے، اور ان کے ساتھ کتابیں بھی ٹھیک طور پر نازل فرمائیں اس غرض سے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں میں ان کے اُمورِ اختلافیہ میں فیصلہ فرمادیں۔“ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ اوپر کے جملہ میں تمام انسانوں کا اُمتِ واحدہ اور ملتِ واحدہ ہونا بیان کیا تھا، اور اس جملہ میں اسی پر تفریع کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ ہم نے انبیاء اور کتابیں بھیجی تاکہ اختلاف کا فیصلہ کیا جائے، ان دونوں جملوں میں بظاہر جوڑ نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ انبیاء اور کتابوں کے بھیجنے کی علت لوگوں کا اختلاف ہے، اور اختلاف اس وقت تھا نہیں، مگر جواب بالکل واضح ہے کہ مراد آیت مذکورہ کی یہ ہے کہ ابتدائے عالم میں تمام انسان ایک ہی عقیدہ حق کے قائل اور پابند تھے، پھر رفتہ رفتہ اختلافات پیدا ہو گئے، اختلافات پیدا ہونے کے بعد انبیاء علیہم السلام اور کتابیں بھیجنے کی ضرورت پیش آئی۔

اب ایک بات رہ جاتی ہے کہ اوپر صرف اُمتِ واحدہ ہونے کا ذکر کیا گیا، اختلاف پیدا ہونے کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا، جو لوگ قرآن کریم کے اُسلوبِ حکیم پر کچھ نظر رکھتے ہیں، ان کے لئے اس کا جواب مشکل نہیں، کہ قرآن کریم احوالِ ماضیہ کے بیان میں قصہ کہانی یا تاریخ کی کتابوں کے سارے قصہ کو کہیں نقل نہیں کرتا، بلکہ درمیان سے وہ حصہ حذف کر دیتا ہے جو اس سیاقِ کلام سے خود بخود سمجھا جاسکے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں جو قیدی رہا ہو کر آیا اور خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لئے اس نے بادشاہ سے کہا کہ مجھے یوسف علیہ السلام کے پاس بھیج دو، تو قرآن میں اس قیدی کی تجویز نقل کرنے کے بعد بات یہاں سے شروع ہوتی ہے: **يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ (يوسف: ۴۶)** اس کا ذکر نہیں کیا کہ بادشاہ نے اس کی تجویز کو پسند کیا، اور اس کو جیل خانے میں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس بھیجا، وہ وہاں پہنچ کر ان سے مخاطب ہوا، کیونکہ پچھلے اور اگلے جملوں کے ملانے سے یہ ساری باتیں خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہیں۔

اسی طرح اس آیت میں وحدتِ ملت کے بعد اختلاف واقع ہونے کا تذکرہ اس لئے ضروری نہیں سمجھا گیا کہ اختلافات کا وقوع تو ساری دُنیا جانتی ہے، ہر وقت مشاہدہ میں آتا ہے، ضرورت اس امر کے اظہار کی تھی کہ ان

[۱] مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: تفسیر الطبری تحت هذه الآية ج: ۴ ص: ۲۷۵ و تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۵۶۹ و تفسیر

القرطبي تحت هذه الآية ج: ۳ ص: ۳۱

اختلافات کثیرہ سے پہلے ایک زمانہ ایسا بھی گزر چکا ہے جس میں سارے انسان ایک ہی مذہب و ملت اور ایک ہی دین حق کے پیرو تھے، اسی کو بیان فرمایا، پھر جو اختلافات دُنیا میں پھیلے ہوئے اور سب کے مشاہدہ میں آرہے ہیں ان کے وقوع کا بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی، ہاں یہ بتلایا گیا کہ ان اختلافات میں راہِ حق کی ہدایت اور رہنمائی کا سامان حق تعالیٰ نے کیا فرمایا، اس کے متعلق ارشاد ہوا: **فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ**، یعنی حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا جو دین حق کا اتباع کرنے والوں کو دائمی آرام و راحت کی خوش خبری اور اس سے اعراض کرنے والوں کو عذابِ جہنم کی وعید سنادیں، اور ان کے ساتھ اپنی وحی اور کتابیں بھیجیں جو مختلف عقائد و خیالات میں سے صحیح اور حق کو واضح کر کے بتلادیں، اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ انبیاء و رسل اور آسمانی کتابوں کے کھلے ہوئے فیصلوں کے بعد بھی یہ دُنیا دو گروہوں میں تقسیم ہوگئی، کچھ لوگوں نے ان ہدایات واضحہ کو قبول نہ کیا، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ قبول نہ کرنے والے اوّل وہی لوگ ہوئے جن کے پاس یہ انبیاء اور آیاتِ الہیہ بھیجی گئی تھیں، یعنی اہل کتاب یہود و نصاریٰ، اور اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ آسمانی کتابوں میں کوئی اشتباہ یا التباس کی گنجائش نہ تھی، کہ ان کی سمجھ میں نہ آئے یا غلط فہمی کا شکار ہو جائیں، بلکہ حقیقت یہ تھی کہ جاننے بوجھنے کے باوجود ان لوگوں نے محض ضد اور ہٹ دھرمی سے انکار کیا۔

اور دُوسرا گروہ وہ ہوا جن کو اللہ تعالیٰ نے راہِ ہدایت پر لگادیا اور جس نے انبیاء و رسل اور آسمانی کتابوں کے فیصلے ٹھنڈے دل سے تسلیم کئے، انہیں دونوں گروہوں کا بیان قرآنِ کریم نے سورہ تغابن میں اس طرح فرمایا ہے:-

خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۖ (التغابن: ۲)

”یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو پیدا کیا، پھر تم میں سے کچھ کافر و منکر ہو گئے کچھ مومن و مسلم۔“

خلاصہ مضمون آیت **كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً** کا یہ ہے کہ پہلے دُنیا کے سب انسان دین حق پر قائم تھے، پھر اختلافِ طبائع سے اغراض میں اختلاف ہونا شروع ہوا، ایک عرصے کے بعد اعمال و عقائد میں اختلاف کی نوبت آگئی، یہاں تک کہ حق و باطل میں التباس ہونے لگا، تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام اور اپنی کتابیں راہِ حق کی ہدایت کرنے کے لئے اور اسی دین حق پر دوبارہ قائم ہو جانے کے لئے بھیجیں جس پر سب انسان پہلے قائم تھے، لیکن ان سب ہدایات واضحہ اور آیاتِ بینات کے ہوتے ہوئے کچھ لوگوں نے مانا اور کچھ لوگوں نے ضد اور عناد سے انکار و انحراف کی راہ اختیار کر لی۔

مسائل

مسئلہ:- اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوئیں، اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو بہت سے انبیاء اور کتابیں دُنیا میں بھیجیں یہ سب اس واسطے تھیں کہ یہ لوگ جو دین حق کی ملتِ واحدہ کو چھوڑ کر مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں، پھر ان کو اسی

ملتِ واحدہ پر قائم کر دیں، انبیاء کا یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا کہ جب لوگ اس راہِ حق سے بچلے تو ان کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی بھیجا، اور کتاب اُتاری کہ اس کے موافق چلیں، پھر کبھی بے کسے تو دوسرا نبی اور کتاب اللہ تعالیٰ نے اسی راہِ حق پر قائم کرنے کے لئے بھیج دیا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے تندرستی ایک ہے اور بیماریاں بے شمار، جب ایک مرض پیدا ہوا تو اس کے موافق دوا اور پرہیز مقرر فرمایا، جب دوسرا مرض پیدا ہوا تو دوسری دوا اور پرہیز اس کے موافق بتلایا، اب آخر میں ایسا جامع نسخہ تجویز فرمایا جو ساری بیماریوں سے بچانے میں اس وقت تک کے لئے کامیاب ثابت ہو جب تک اس عالم کو باقی رکھنا منظور ہو، یہ مکمل اور جامع نسخہ، ایک جامع اصولِ علاج سب پچھلے نسخوں کے قائم مقام اور آئندہ سے بے نیاز کرنے والا ہو، اور وہ نسخہ جامعِ اسلام ہے، جس کے لئے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن بھیجے گئے، اور پچھلی کتابوں میں تحریف ہو کر جو پچھلے انبیاء کی تعلیمات ضائع اور گم ہو جانے کا سلسلہ اوپر سے چلا آیا تھا جس کے سبب نئے نبی اور نئی کتاب کی ضرورت پیش آتی تھی، اس کا یہ انتظام فرما دیا گیا کہ قرآن کریم کے تحریف سے محفوظ رہنے کا ذمہ خود حق تعالیٰ نے لے لیا اور قرآن کریم کی تعلیمات کو قیامت تک ان کی اصلی صورت میں قائم اور باقی رکھنے کے لئے اللہ جل شانہ نے اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں تاقیامت ایک ایسی جماعت قائم رکھنے کا وعدہ فرمایا جو ہمیشہ دینِ حق پر قائم رہ کر کتاب و سنت کی صحیح تعلیم مسلمانوں میں شائع کرتی رہے گی، کسی کی مخالفت و عداوت اُن پر اثر انداز نہ ہوگی، اس لئے اس کے بعد دروازہ نبوت اور وحی کا بند ہو جانا گزیرا مرتھا، آخر ختم نبوت کا اعلان کر دیا گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مختلف زمانوں میں مختلف انبیاء اور ان کی مختلف کتابیں آنے سے کوئی اس دھوکہ میں نہ پڑ جائے کہ انبیاء اور کتابیں لوگوں کو مختلف فرقوں میں تقسیم کرنے اور افتراق پیدا کرنے کے لئے نازل کی گئی ہیں، بلکہ نشانِ سب انبیاء اور کتابوں کا یہ ہے کہ جس طرح پہلے سارے انسان ایک ہی دینِ حق کے پیرو ہو کر ملتِ واحدہ تھے، اسی طرح پھر اُسی دینِ حق پر سب جمع ہو جائیں۔

مسئلہ:- دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مذہب کی بنا پر قومیت کی تقسیم مسلم و غیر مسلم کا دو قومی نظریہ عین منشائے قرآنی کے مطابق ہے، آیت: **فَبُيِّنَتْ لَهُمْ مَا كَفَرُوا مِنْكُمْ مُؤْمِنُونَ** (التغابن: ۲) اس پر شاہد ہے، اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو گیا کہ اسلام میں اس دو قومی نظریے کی اصل بنیاد درحقیقت صحیح متحدہ قومیت پیدا کرنے پر ہے جو ابتدائے آفرینش میں قائم تھی، جس کی بنیاد وطنیت پر نہ تھی بلکہ عقیدہ حق اور دینِ حق کی پیروی پر تھی، ارشادِ قرآنی: **كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً** نے بتلایا کہ ابتدائے عالم میں اعتقادِ صحیح اور دینِ حق کی پیروی کے اعتبار سے ایک صحیح اور حقیقی وحدتِ قومی قائم تھی، بعد میں لوگوں نے اختلافات پیدا کئے، انبیاء نے لوگوں کو اسی اصلی وحدت کی طرف بلایا، جنہوں نے ان کی دعوت کو قبول نہ کیا، وہ اس متحدہ قومیت سے کٹ گئے اور جدا گانہ قوم قرار دیئے گئے۔

مسئلہ:- تیسری بات اس آیت سے یہ معلوم ہوئی کہ ازل سے سنت اللہ یہی جاری ہے کہ برے لوگ ہر نبی مبعوث کے خلاف اور ہر کتاب الہی سے اختلاف کو پسند کرتے رہے اور ان کے مقابلہ و مخالفت میں پورا زور خرچ کرنے کے لئے آمادہ رہے ہیں، تو اب اہل ایمان کو ان کی بدسلوکی اور فساد سے تنگدل نہ ہونا چاہئے، جس طرح کفار نے اپنے بڑوں کا طریقہ کفر و عناد اور انبیاء کی مخالفت کا اختیار کیا، اسی طرح مؤمنین صالحین کو چاہئے کہ وہ اپنے بزرگوں کا یعنی انبیاء علیہم السلام کا وظیفہ اختیار کریں، کہ اُن لوگوں کی ایذاؤں اور مخالفتوں پر صبر کریں، اور حکمت و موعظت اور نرمی کے ساتھ ان کو دین حق کی طرف بلاتے رہیں، اور شاید اسی مناسبت سے اگلی آیت میں مسلمانوں کو مصائب و آفات پر تحمل اور صبر کی تلقین کی گئی ہے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ وَلَسَّيَاتِكُمْ مِّثْلُ الَّذِينَ خَلَوْا

کیا تم کو یہ خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ تم پر نہیں گزرے حالات اُن لوگوں کے جیسے جو ہو چکے

مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمْ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ

تم سے پہلے کہ پہنچی ان کو سختی اور تکلیف اور جھڑپا گئے یہاں تک کہ کہنے لگا رسول

وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصْرُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴿۲۱۴﴾

اور جو اُس کے ساتھ ایمان لائے: کب آوے گی اللہ کی مدد، سن رکھو اللہ کی مدد قریب ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

(مسلمانو!) کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں (یونہی) داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تمہیں اس جیسے حالات پیش نہیں آئے جیسے اُن لوگوں کو پیش آئے تھے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ ان پر سختیاں اور تکلیفیں آئیں، اور انہیں ہلا ڈالا گیا، یہاں تک کہ رسول اور ان کے ایمان والے ساتھی بول اُٹھے کہ ”اللہ کی مدد کب آئے گی؟“، یاد رکھو! اللہ کی مدد نزدیک ہے۔ ﴿۲۱۴﴾

ربط آیات

اوپر کی آیت میں کفار کا ہمیشہ سے انبیاء و مؤمنین کے ساتھ اختلاف اور خلاف کرتے رہنا مذکور تھا، جس میں ایک گونہ مسلمانوں کو اس طور پر تسلی دینا بھی مقصود تھا جن کو استہزاء کفار سے ایذا ہوتی تھی، کہ یہ خلاف تمہارے ساتھ نیا نہیں ہے، ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، آگے ان کفار مخالفین سے انبیاء و مؤمنین کو انواع انواع کی ایذائیں اور شدائد پہنچنے کی حکایت بیان فرماتے ہیں، اور اس سے بھی مسلمانوں کو تسلی دلاتے ہیں کہ تم کو بھی کفار سے جو ایذائیں پہنچتی ہیں ان پر صبر کرنا چاہئے، کیونکہ کامل راحت تو آخرت کی محنت ہی اٹھانے سے ہے۔

خلاصہ تفسیر

(دوسری بات سنو) کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جنت میں (بے مشقت) جاداخل ہو گے، حالانکہ (ابھی کچھ مشقت تو اٹھانی ہی نہیں، کیونکہ) تم کو ہنوز ان (مسلمان) لوگوں کا ساعجیب واقعہ پیش نہیں آیا جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں، ان پر (مخالفین کے سبب) ایسی ایسی تنگی اور سختی واقع ہوئی اور (مصائب سے) ان کو یہاں تک جنبشیں ہوئیں کہ (اس زمانہ کے) پیغمبر تک اور جو ان کے ہمراہ اہل ایمان تھے (بے قرار ہو کر) بول اُٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد (موعود) کب ہوگی (جس پر ان کو جواب سے تسلی کی گئی کہ) یاد رکھو! بے شک اللہ تعالیٰ کی امداد (بہت) نزدیک (ہونے والی) ہے۔

معارف و مسائل

اس آیت میں چند باتیں قابل غور ہیں :-

اول یہ کہ اس آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بغیر مشقت و محنت کے اور بغیر مصائب و آفات میں مبتلا ہوئے کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا، حالانکہ ارشادات قرآنی اور ارشادات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ بہت سے گنہگار محض اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مغفرت سے جنت میں داخل ہوں گے، ان پر کوئی مشقت بھی نہ ہوگی، وجہ یہ ہے کہ مشقت و محنت کے درجات مختلف ہیں، ادنیٰ درجہ نفس و شیطان سے مزاحمت کر کے یا دین حق کے مخالفین کے ساتھ مخالفت کر کے اپنے عقائد کا درست کرنا ہے، اور یہ ہر مؤمن کو حاصل ہے، آگے اوسط اور اعلیٰ درجات ہیں، جس درجہ کی محنت و مشقت ہوگی اسی درجہ کا دخول جنت ہوگا، اس طرح محنت و مشقت سے خالی کوئی نہ رہا، ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

أَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً الْأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ ۚ

”سب سے زیادہ سخت بلائیں اور مصیبتیں انبیاء علیہم السلام کو پہنچتی ہیں، اُن کے بعد جو اُن کے قریب تر ہیں۔“
دوسری بات یہاں قابلِ نظریہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے ساتھیوں کا یہ عرض کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کب آئے گی، کسی شک و شبہ کی وجہ سے نہ تھا، جو اُن کی شان کے خلاف ہے، بلکہ اس سوال کا منشا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ مدد کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کا وقت اور مقام متعین نہیں فرمایا، اس لئے حالتِ اضطرار میں ایسے الفاظ عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ مدد جلد بھیجی جائے، اور ایسی دُعا کرنا توکل یا منصبِ نبوت کے منافی نہیں، بلکہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کی إلحاح و زاری کو پسند فرماتے ہیں، اس لئے انبیاء اور صلحاء اُمت اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلْ مَا أَنْفَقْتُ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ

تجھ سے پوچھتے ہیں: کیا چیز خرچ کریں؟ کہہ دو کہ جو کچھ تم خرچ کرو مال سو ماں باپ کے لئے

وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَى وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۚ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ

اور قرابت والوں کے اور یتیموں کے اور محتاجوں کے اور مسافروں کے، اور جو کچھ کرو گے تم بھلائی

فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۙ

سو وہ بے شک اللہ کو خوب معلوم ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ (اللہ کی خوشنودی کے لئے) کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجئے کہ جو مال بھی تم خرچ کرو وہ والدین، قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہونا چاہئے۔ اور تم بھلائی کا جو کام بھی کرو، اللہ اُس سے پوری طرح باخبر ہے۔ ۲۱۵

خلاصہ تفسیر

بارہواں حکم :- صدقہ کے مصارف

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ (ثواب کے واسطے) کیا چیز خرچ کیا کریں (اور کس موقع پر صرف کیا کریں) آپ فرمادیجئے کہ جو مال تم کو صرف کرنا ہو سو (اس کی تعیین تو تمہاری ہمت پر ہے، مگر ہاں موقع ہم بتلائے دیتے ہیں کہ) ماں باپ کا حق ہے اور قرابت داروں اور بے باپ کے بچوں کا اور محتاجوں کا اور مسافر کا، اور جو نسیک کام کرو گے (خواہ راہ خدا میں خرچ کرنا ہو یا اور کچھ ہو) سو اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے (وہ اس پر ثواب دیں گے)۔

معارف مسائل

اس سے پہلی آیتوں میں مجموعی حیثیت سے یہ مضمون بہت تاکید کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ کفر و نفاق کو چھوڑ دو اور اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ، حکم الہی کے مقابل میں کسی کی بات مت سنو، اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جان اور مال خرچ کیا کرو، اور ہر طرح کی شدت اور تکلیف پر تحمل کرو۔ اب یہاں سے اسی اطاعت و فرمانبرداری اور اللہ کی راہ میں جان و مال خرچ کرنے کے متعلق کچھ جزئیات کی تفصیل بیان ہوتی ہے، جو کہ مال اور جان اور دیگر معاملات مثل نکاح و طلاق وغیرہ کے متعلق ہیں، اور اوپر سے جو سلسلہ احکام ابواب البر کا جاری ہے اس میں داخل ہیں۔

اور ان جزئیات کا بیان بھی ایک خاص نوعیت رکھتا ہے کہ اکثر ان میں سے وہ ہیں جن کے متعلق صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، ان کے استفتاء اور سوالات کا جواب براہ راست عرشِ رحمن سے بواسطہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دیا گیا، اس کو اگر یوں سمجھا جائے کہ حق تعالیٰ نے خود فتویٰ دیا تو یہ بھی صحیح ہے، اور قرآن کریم کی آیت: **قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ** (النساء: ۵۹) میں صراحۃً حق تعالیٰ نے فتویٰ دینے کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے، اس لئے اس نسبت میں کوئی استبعاد بھی نہیں۔

اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ فتاویٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں جو آپ کو بذریعہ وحی تلقین کئے گئے ہیں، بہر حال اس رکوع میں جو احکام شرعیہ صحابہ کرامؓ کے چند سوالات کے جواب میں بیان ہوئے ہیں، وہ ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں، پورے قرآن میں اس طرح سوال و جواب کے انداز سے خاص احکام تقریباً سترہ جگہ میں آئے ہیں، جن میں سے سات تو اسی جگہ سورہ بقرہ میں ہیں، ایک سورہ مائدہ میں، ایک سورہ انفال میں، یہ نو سوالات تو صحابہ کرامؓ کی طرف سے ہیں، سورہ اعراف میں دو اور سورہ بنی اسرائیل، سورہ کہف، سورہ طہ، سورہ نازعات میں ایک ایک، یہ کل چھ سوال کفار کی

طرف سے ہیں، جن کا جواب قرآن میں ”جواب“ کے عنوان سے دیا گیا ہے۔

مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی جماعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ سے بہتر نہیں دیکھی کہ دین کے ساتھ انتہائی شغف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی محبت و تعلق کے باوجود انہوں نے سوالات بہت کم کئے، کل تیرہ مسائل میں سوال کیا ہے، جن کا جواب قرآن میں دیا گیا ہے، کیونکہ یہ حضرات بے ضرورت سوال نہ کرتے تھے۔ (قرطبی) [۱]

متذکرہ بالا آیات میں سے پہلی آیت میں صحابہ کرامؓ کا استفناء یعنی سوال ان الفاظ سے نقل فرمایا گیا ہے: **يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ**ؓ، یعنی ”لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں“ یہی سوال اس رکوع میں تین آیتوں کے بعد پھر انہی الفاظ کے ساتھ دہرایا گیا: **وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ**ؓ (البقرہ: ۲۱۹) لیکن اس ایک ہی سوال کا جواب آیت متذکرہ میں کچھ اور دیا گیا ہے، اور تین آیتوں کے بعد آنے والے سوال کا جواب اور ہے۔

اس لئے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ایک ہی سوال کے دو مختلف جواب کس حکمت پر مبنی ہیں، یہ حکمت اُن حالات و واقعات میں غور کرنے سے واضح ہو جاتی ہے جن میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں، مثلاً آیت متذکرہ کا شان نزول یہ ہے کہ عمرو بن جموحؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ: ”مَا نُنْفِقُ مِنْ أَمْوَالِنَا وَآيِنَ نَضَعُهَا“ (اخرجه ابن المنذر، مظہری) یعنی ”ہم اپنے اموال میں سے کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں۔“ اور ابن جریرؒ کی روایت کے موافق یہ سوال تنہا عمرو بن جموحؓ کا نہیں تھا، بلکہ عام مسلمانوں کا سوال تھا، اس سوال کے دو جزو ہیں، ایک یہ کہ مال میں سے کیا اور کتنا خرچ کریں، دوسرے یہ کہ اس کا مصرف کیا ہو، کن لوگوں کو دیں۔

اور دوسری آیت جو دو آیتوں کے بعد اسی سوال پر مشتمل ہے، اس کا شان نزول بروایت ابن ابی حاتمؒ یہ ہے کہ جب قرآن میں مسلمانوں کو اس کا حکم دیا گیا کہ اپنے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کریں، تو چند صحابہ کرامؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ انفاق فی سبیل اللہ کا جو حکم ہمیں ملا ہے، ہم اس کی وضاحت چاہتے ہیں، کہ کیا مال اور کونسی چیز اللہ کی راہ میں خرچ کیا کریں۔ اس سوال میں صرف ایک ہی جزء ہے، یعنی کیا خرچ کریں، اس طرح ان دونوں سوالوں کی نوعیت کچھ مختلف ہو گئی کہ پہلے سوال میں کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں، کا سوال تھا، اور دوسرے میں صرف کیا خرچ کریں کا سوال ہے، اور پہلے سوال کے جواب میں جو کچھ قرآن میں ارشاد فرمایا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال کے دوسرے جزء کو یعنی کہاں خرچ کریں زیادہ اہمیت دے کر اس کا جواب تو صریح طور پر دیا گیا، اور

۱۔ تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۳ ص: ۲۰

۲۔ تفسیر ابن ابی حاتم رقم الحديث: ۲۰۵۱، ۲۰۵۲ ج: ۲ ص: ۸۳

پہلے جز یعنی کیا خرچ کریں کا جواب ضمنی طور پر دے دینا کافی سمجھا گیا۔ اب الفاظ قرآنی میں دونوں اجزاء پر نظر فرمائیں، پہلے جز یعنی ”کہاں خرچ کریں“ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے: مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالتَّائِبِينَ وَالسَّائِلِينَ وَابْنِ السَّبِيلِ ۚ یعنی ”جو کچھ بھی تم کو اللہ کے لئے خرچ کرنا ہو اس کے مستحق ماں باپ اور رشتہ دار اور بے باپ کے بچے اور مساکین اور مسافر ہیں۔“

اور دوسرے جز یعنی کیا خرچ کریں کا جواب ضمنی طور پر ان الفاظ سے دیا گیا: وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۖ یعنی ”تم جو کچھ بھلائی کرو گے اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے۔“ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر کوئی تحدید اور پابندی نہیں کہ مال کی اتنی ہی مقدار صرف کرو، بلکہ جو کچھ بھی اپنی استطاعت کے موافق خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ کے پاس اس کا اجر و ثواب پاؤ گے۔

الغرض پہلی آیت میں شاید سوال کرنے والوں کے پیش نظر زیادہ اہمیت اسی سوال کی ہو کہ ہم جو مال خرچ کریں، اس کا مصرف کیا ہو، کہاں خرچ کریں، اسی لئے اس کے جواب میں اہمیت کے ساتھ مصارف بیان فرمائے گئے، اور کیا خرچ کریں، اس سوال کا جواب ضمنی طور پر دے دینا کافی سمجھا گیا، اور بعد والی آیت میں سوال صرف اتنا ہی تھا کہ ہم کیا چیز اور کیا مال خرچ کریں، اس لئے اس کا جواب ارشاد ہوا: قُلِ الْعَفْوَ ۖ (البقرة: ۲۱۹) یعنی آپ فرمادیں کہ جو کچھ بچے اپنی ضروریات سے وہ خرچ کیا کریں، ان دونوں آیتوں سے اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنے کے متعلق چند ہدایات و مسائل معلوم ہوئے۔

مسئلہ:- اوّل یہ کہ دونوں آیتیں زکوٰۃ فرض کے متعلق نہیں، کیونکہ زکوٰۃ فرض کے لئے تو نصاب مال بھی مقرر ہے، اور اس میں جتنی مقدار خرچ کرنا فرض ہے، وہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے پوری طرح متعین و مقرر فرمادی گئی ہے، ان دونوں آیتوں میں نہ کسی نصاب مال کی قید ہے، نہ خرچ کرنے کی مقدار بتلائی گئی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں آیتیں صدقاتِ نافلہ کے متعلق ہیں، اس سے یہ شبہ بھی رفع ہو گیا کہ پہلی آیت میں خرچ کا مصرف والدین کو بھی قرار دیا گیا ہے، حالانکہ ماں باپ کو زکوٰۃ دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق جائز نہیں، کیونکہ ان آیتوں کا تعلق فریضہ زکوٰۃ سے ہے ہی نہیں۔

مسئلہ:- دوسری ہدایت اس آیت سے یہ حاصل ہوئی کہ ماں باپ اور دوسرے اعزاء و اقرباء کو جو کچھ بطور ہدیہ دیا یا کھلایا جاتا ہے اگر اس میں بھی اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانے کی نیت ہو تو وہ بھی موجب اجر و ثواب اور انفاق فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔

مسئلہ:- تیسری ہدایت یہ حاصل ہوئی کہ نفلی صدقات میں اس کی رعایت ضروری ہے کہ جو مال اپنی ضروریات

سے زائد ہو وہی خرچ کیا جائے، اپنے اہل و عیال کو تنگی میں ڈال کر اور ان کے حقوق کو تلف کر کے خرچ کرنا ثواب نہیں، اسی طرح جس کے ذمہ کسی کا قرض ہے، قرض خواہ کو ادا نہ کرے اور نفلی صدقات و خیرات میں اڑائے، یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں، پھر ضروریات سے زائد مال کے خرچ کرنے کا جو ارشاد اس آیت میں ہے اس کو حضرت ابوذر غفاریؓ اور بعض دوسرے حضرات نے حکم و جوبی قرار دیا کہ اپنی ضروریات سے زائد مال زکوٰۃ اور تمام حقوق ادا کرنے کے بعد بھی اپنی ملک میں جمع رکھنا جائز نہیں، ضروریات سے زائد جو کچھ ہے سب کا صدقہ کر دینا واجب ہے، مگر جمہور صحابہؓ و تابعینؓ اور ائمہ دینؓ اس پر ہیں کہ ارشاد قرآنی کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہو وہ ضروریات سے زائد ہونا چاہئے، یہ نہیں کہ ضرورت سے زائد جو کچھ ہو اس کو صدقہ کر دینا ضروری یا واجب ہے، صحابہ کرامؓ کے تعامل سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ

فرض ہوئی تم پر لڑائی اور وہ بری لگتی ہے تم کو، اور شاید کہ بری لگے تم کو ایک چیز اور وہ بہتر ہو

لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَنْ تَحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ

تمہارے حق میں، اور شاید تم کو بھلی لگے ایک چیز اور وہ بری ہو تمہارے حق میں، اور اللہ جانتا ہے اور تم

لَا تَعْلَمُونَ ﴿۲۱۶﴾ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ۖ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ

نہیں جانتے۔ تجھ سے پوچھتے ہیں مہینہ حرام کو کہ اس میں لڑنا کیسا؟ کہہ دے: اس میں لڑائی

كَبِيرٌ ۖ وَصَدُّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَإِخْرَاجُ

بڑا گناہ ہے، اور روکنا اللہ کی راہ سے اور اس کو نہ ماننا اور مسجد الحرام سے روکنا اور نکال دینا

أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۖ

اس کے لوگوں کو وہاں سے، اس سے بھی زیادہ گناہ ہے اللہ کے نزدیک، اور لوگوں کو دین سے بچلانا قتل سے بھی بڑھ کر ہے،

وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا ۖ وَمَنْ

اور کفار تو ہمیشہ تم سے لڑتے ہی رہیں گے یہاں تک کہ تم کو پھیر دیں تمہارے دین سے اگر قابو پاویں، اور جو کوئی

يُرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ

پھرے تم میں سے اپنے دین سے پھر مر جاوے حالت کفر ہی میں تو ایسوں کے ضائع ہوئے عمل

فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۱۸﴾

دُنیا اور آخرت میں، اور وہ لوگ رہنے والے ہیں دوزخ میں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ بے شک

الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور لڑے اللہ کی راہ میں وہ

يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۲۱۸﴾

امیدوار ہیں اللہ کی رحمت کے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

تم پر (دشمنوں سے) جنگ کرنا فرض کیا گیا ہے، اور وہ تم پر گراں ہے۔ اور یہ عین ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو بُرا سمجھو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو، حالانکہ وہ تمہارے حق میں بُری ہو۔ اور (اصل حقیقت تو) اللہ جانتا ہے، اور تم نہیں جانتے۔ ﴿۲۱۸﴾ لوگ آپ سے حرمت والے مہینے کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ اس میں جنگ کرنا کیسا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ اس میں جنگ کرنا بڑا گناہ ہے، مگر لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنا، اس کے خلاف کفر کی روش اختیار کرنا، مسجد حرام پر بندش لگانا اور اس کے باسیوں کو وہاں سے نکال باہر کرنا اللہ کے نزدیک زیادہ بڑا گناہ ہے۔ اور فتنہ قتل سے بھی زیادہ سنگین چیز ہے۔ اور یہ (کافر) تم لوگوں سے برابر جنگ کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو یہ تم کو تمہارا دین چھوڑنے پر آمادہ کر دیں۔ اور اگر تم میں سے کوئی شخص اپنا دین چھوڑ دے، اور کافر ہونے کی

حالت ہی میں مرے، تو ایسے لوگوں کے اعمال دُنیا اور آخرت دونوں میں اکارت ہو جائیں گے۔ ایسے لوگ دوزخ والے ہیں۔ وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ (۲۱۸) (اس کے برخلاف) جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا، تو وہ بیشک اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں، اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ (۲۱۸)

خلاصہ تفسیر

تیرہواں حکم :- فرضیتِ جہاد

جہاد کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے اور وہ تم کو (طبعاً) گراں (معلوم ہوتا) ہے، اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی بات کو گراں سمجھو اور (واقع میں) وہ تمہارے حق میں خیر (اور مصلحت) ہو، اور یہ (بھی) ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور (واقع میں) وہ تمہارے حق میں (باعث) خرابی (کا) ہو، اور (ہر شے کی حقیقتِ حال کو) اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، اور تم (پورا) نہیں جانتے (ایچھے برے کا فیصلہ اپنی خواہش کی بنیاد پر نہ کرو، جو کچھ اللہ کا حکم ہو جائے، اسی کو اجمالاً مصلحت سمجھ کر اس پر کاربند رہا کرو)۔

چودھواں حکم :- تحقیقِ قتال در شہرِ حرام

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہؓ کا ایک سفر میں اتفاق سے کفار کے ساتھ مقابلہ ہو گیا، ایک کافر ان کے ہاتھ سے مارا گیا، اور جس روز یہ قصہ ہوا رجب کی پہلی تاریخ تھی، مگر صحابہؓ اس کو جمادی الاخریٰ کی تیس سمجھتے تھے، اور رجب اشہر حرم میں سے ہے، کفار نے اس واقعہ پر طعن کیا کہ مسلمانوں نے شہرِ حرام کی حرمت کا بھی خیال نہیں کیا، مسلمانوں کو اس کی فکر ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، اور بعض روایات میں ہے کہ خود بعض کفار قریش نے بھی حاضر ہو کر اعتراضاً سوال کیا، اس کا جواب ارشاد ہوتا ہے) :-

لوگ آپ سے شہرِ حرام میں قتال کرنے کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ فرمادیجئے کہ اس میں خاص طور پر (یعنی عمداً) قتال کرنا جرمِ عظیم ہے (مگر مسلمانوں سے یہ فعل بالقصد صادر نہیں ہوا، بلکہ تاریخ کی تحقیق نہ ہونے کے سبب غلطی سے ایسا ہو گیا، یہ تو تحقیقی جواب ہے) اور (الزامی جواب یہ ہے کہ کفار و مشرکین کا تو کسی طرح منہ ہی نہیں مسلمانوں پر اعتراض کرنے کا، کیونکہ اگرچہ شہرِ حرام میں لڑنا جرمِ عظیم ہے، لیکن ان کفار کی جو حرکتیں ہیں (یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ (دین)

سے (لوگوں کو) روک ٹوک کرنا (یعنی مسلمان ہونے پر تکلیفیں پہنچانا کہ ڈر کے مارے لوگ مسلمان نہ ہوں) اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجدِ حرام (یعنی کعبہ) کے ساتھ کفر کرنا (کہ وہاں بہت سے بت رکھ چھوڑے تھے، اور بجائے خدا کی عبادت کے ان کی عبادت اور طواف کرتے تھے) اور جو لوگ مسجدِ حرام کے اہل تھے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مؤمنین) ان کو (تنگ اور پریشان کر کے) اس (مسجدِ حرام) سے خارج (ہونے پر مجبور) کر دینا (جس سے نوبت ہجرت یعنی ترکِ وطن کی پہنچی، سو یہ حرکتیں شہرِ حرام میں قتال کرنے سے بھی زیادہ) جرمِ عظیم ہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک (کیونکہ یہ حرکتیں دینِ حق کے اندر فتنہ پرداز کرنا ہے) اور (ایسی) فتنہ پردازی کرنا (اس) قتل (خاص) سے (جو) مسلمانوں سے صادر ہوا) بدرجہا (قباحت میں) بڑھ کر ہے (کیونکہ اس قتل سے دینِ حق کو تو کوئی مضرت نہیں پہنچی بہت سے بہت اگر کوئی جان کر کرے خود ہی گنہگار ہوگا، اور ان حرکتوں سے تو دینِ حق کو ضرر پہنچتا ہے کہ اس کی ترقی رکتی ہے) اور یہ کفار تمہارے ساتھ ہمیشہ جنگ (و جدال کا سلسلہ جاری ہی) رکھیں گے، اس غرض سے کہ اگر (خدا نہ کرے) قابو پاویں تو تم کو تمہارے دین (اسلام) سے پھیر دیں (ان کے اس فعل سے دین کی مزاحمت ظاہر ہے)۔

انجامِ ارتداد

اور جو شخص تم میں سے اپنے دین (اسلام) سے پھر جاوے، پھر کافر ہی ہونے کی حالت میں مرجاوے تو ایسے لوگوں کے (نیک) اعمال دنیا اور آخرت میں سب غارت ہو جاتے ہیں (اور) یہ لوگ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔
(شہرِ حرام میں قتال کرنے کے بارے میں مسلمانوں کو جوابِ مذکور سن کر گناہ نہ ہونے کا تو اطمینان ہو گیا تھا، مگر اس خیال سے دل شکستہ تھے کہ ثواب تو ہوا ہی نہ ہوگا، آگے اس میں تسلی کی گئی۔)

وعدہ ثواب برِ اخلاصِ نیت

حقیقتہً جو لوگ ایمان لائے ہوں اور جن لوگوں نے راہِ خدا میں ترکِ وطن کیا ہو اور جہاد کیا ہو، ایسے لوگ تو رحمتِ خداوندی کے اُمیدوار ہوا کرتے ہیں (اور تم لوگوں میں یہ صفات علی السبیل منع الخلو موجود ہیں، چنانچہ ایمان اور ہجرت تو ظاہر ہے، رہا اس جہادِ خاص میں شبہ ہو سکتا ہے، سو چونکہ تمہاری نیت تو جہاد ہی کی تھی، لہذا ہمارے نزدیک بھی وہ جہاد ہی میں شمار ہے، پھر ان صفات کے ہوتے ہوئے تم کیوں نا اُمید ہوتے ہو) اور اللہ تعالیٰ (اس غلطی کو) معاف کر دیں گے اور (ایمان و جہاد و ہجرت کی وجہ سے تم پر) رحمت کریں گے۔

معارف مسائل

بعض احکام جہاد

مسئلہ:- مذکورہ صدر آیات میں سے پہلی آیت میں جہاد کے فرض ہونے کا حکم ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے: **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ**، یعنی ”تم پر جہاد فرض کیا گیا“ ان الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاد ہر مسلمان پر ہر حالت میں فرض ہے، بعض آیات قرآنی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فریضہ فرض عین کے طور پر ہر مسلم پر عائد نہیں، بلکہ فرض کفایہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت اس فرض کو ادا کر دے تو باقی مسلمان سبکدوش سمجھے جائیں گے، ہاں کسی زمانہ یا کسی ملک میں کوئی جماعت بھی فریضہ جہاد ادا کرنے والی نہ رہے تو سب مسلمان ترک فرض کے گنہگار ہو جائیں گے۔ حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: **”الْجِهَادُ مَاضٍ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ“** کا یہ مطلب ہے کہ ”قیامت تک ایسی جماعت کا موجود رہنا ضروری ہے جو فریضہ جہاد ادا کرتی رہے“ قرآن مجید کی دوسری آیت میں ارشاد ہے:-

فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً ۖ وَكَلَّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ (النساء: ۹۵)

”یعنی اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو تارکین جہاد پر فضیلت دی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے دونوں سے بھلائی کا وعدہ کیا ہے۔“

اس میں ایسے لوگوں سے جو کسی عذر کے سبب یا کسی دوسری دینی خدمت میں مشغول ہونے کی وجہ سے جہاد میں شریک نہ ہوں اُن سے بھی بھلائی کا وعدہ مذکور ہے، ظاہر ہے کہ اگر جہاد ہر فرد مسلم پر فرض عین ہوتا تو اس کے چھوڑنے والوں سے وعدہ حسنیٰ یعنی بھلائی کا وعدہ ہونے کی صورت نہ تھی۔

اسی طرح ایک دوسری آیت میں ہے:-

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ (التوبة: ۱۲۲)

”اور کیوں نہ نکل کھڑی ہوئی تمہاری ہر بڑی جماعت میں سے چھوٹی جماعت اس کام کے لئے کہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں۔“

اس میں خود قرآن کریم نے یہ تقسیم عمل پیش فرمائی کہ کچھ مسلمان جہاد کا کام کریں، اور کچھ تعلیم دین میں مشغول

رہیں، اور یہ جی بھی ہو سکتا ہے جبکہ جہاد فرض عین نہ ہو بلکہ فرض کفایہ ہو۔

نیز صحیح بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شرکت جہاد کی اجازت چاہی تو آپ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟ اس نے عرض کیا کہ ہاں زندہ ہیں، آپ نے فرمایا کہ ”پھر جاؤ، ماں باپ کی خدمت کر کے جہاد کا ثواب حاصل کرو۔“^[۱] اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاد فرض کفایہ ہے، جب مسلمانوں کی ایک جماعت فریضہ جہاد کو قائم کئے ہوئے ہو تو باقی مسلمان دوسری خدمتوں اور کاموں میں لگ سکتے ہیں، ہاں اگر کسی وقت امام المسلمین ضرورت سمجھ کر نفیر عام کا حکم دے اور سب مسلمانوں کو شرکت جہاد کی دعوت دے تو پھر جہاد سب پر فرض عین ہو جاتا ہے، قرآن کریم نے سورہ توبہ میں ارشاد فرمایا:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمَالَكُمْ إِذَا قُتِلَ لَكُمْ أَنْفُسُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَثَقَلْتُمْ (التوبہ: ۳۸)

”اے مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو تم بوجھل بن جاتے ہو۔“

اس آیت میں اسی نفیر عام کا حکم مذکور ہے، اسی طرح اگر خدا نخواستہ کسی وقت کفار کسی اسلامی ملک پر حملہ آور ہوں اور مدافعت کرنے والی جماعت ان کی مدافعت پر پوری طرح قادر اور کافی نہ ہو تو اس وقت بھی یہ فریضہ اس جماعت سے متعدی ہو کر پاس والے سب مسلمانوں پر عائد ہو جاتا ہے، اور اگر وہ بھی عاجز ہوں تو ان کے پاس والے مسلمانوں پر، یہاں تک کہ پوری دنیا کے ہر ہر فرد مسلم پر ایسے وقت جہاد فرض عین ہو جاتا ہے، قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیات کے مطالعہ سے جمہور فقہاء و محدثین نے یہ حکم قرار دیا ہے کہ عام حالات میں جہاد فرض کفایہ ہے۔

مسئلہ:- اسی لئے جب تک جہاد فرض کفایہ ہو، اولاد کو بغیر ماں باپ کی اجازت کے جہاد میں جانا جائز نہیں۔

مسئلہ:- جس شخص کے ذمہ کسی کا قرض ہو اس کے لئے جب تک قرض ادا نہ کر دے اس فرض کفایہ میں حصہ لینا

دُرست نہیں، ہاں اگر کسی وقت نفیر عام کے سبب یا کفار کے زعم کے باعث جہاد سب پر فرض عین ہو جائے تو اس وقت نہ والدین کی اجازت شرط ہے، نہ شوہر کی اور نہ قرض خواہ کی۔ اس آیت کے آخر میں جہاد کی ترغیب کے لئے ارشاد فرمایا ہے کہ جہاد اگرچہ طبعی طور پر تمہیں بھاری معلوم ہو، لیکن خوب یاد رکھو کہ انسانی بصیرت و دانش مندی اور تدبیر و محنت عواقب و نتائج کے بارے میں بکثرت فیل ہوتی ہے، کسی مفید کو مضر، یا مضر کو مفید سمجھ لینا بڑے سے بڑے ہوشیار، عقل مند سے بھی مستبعد نہیں، ہر انسان اگر اپنی عمر میں پیش آنے والے وقائع پر نظر ڈالے تو اپنی ہی زندگی میں اس کو بہت سے واقعات ایسے نظر پڑیں گے کہ وہ کسی چیز کو نہایت مفید سمجھ کر حاصل کر رہے تھے، اور انجام کار یہ معلوم ہوا کہ وہ انتہائی مضرت تھی، یا کسی چیز کو نہایت مضرت سمجھ کر اس سے اجتناب کر رہے تھے، اور انجام کار یہ معلوم ہوا کہ وہ نہایت مفید تھی، انسانی عقل و تدبیر کی رسوائی

اس معاملہ میں بکثرت مشاہدہ میں آتی رہتی ہے ۔

خولیش را دیدم و رسوائی خویش^[۱]

اس لئے فرمایا کہ جہاد و قتال میں اگرچہ بظاہر مال اور جان کا نقصان نظر آتا ہے، لیکن جب حقائق سامنے آئیں گے تو کھلے گا کہ یہ نقصان ہرگز نقصان نہ تھا، بلکہ سراسر نفع اور دائمی راحت کا سامان تھا۔

اشہر حرم میں قتال کا حکم

آیات مذکورہ میں سے دوسری آیت اس پر شاہد ہے کہ اشہر حرم یعنی چار مہینے: رجب، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم میں قتال حرام ہے، اسی طرح قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں پوری تصریح کے ساتھ اشہر حرم میں قتال کی ممانعت آئی ہے، مثلاً: **مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۖ ذَٰلِكَ الْيَمِينُ الْقَدِيمُ** (التوبہ: ۳۶) اور حجۃ الوداع کے معروف و مشہور خطبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **”مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ، ثَلَاثٌ مِّتَوَالِيَاتٌ وَرَجَبٌ مُضَرٌ“**^[۲]۔

ان آیات و روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ چار مہینوں میں قتال حرام ہے، اور یہ حرمت ہمیشہ کے لئے ہے۔ اور امام تفسیر عطاء بن ابی رباحؒ قسم کھا کر فرماتے تھے کہ یہ حکم ہمیشہ کے لئے باقی ہے، اور بھی متعدد حضرات تابعین اس حکم کو ثابت، غیر منسوخ قرار دیتے ہیں، مگر جمہور فقہاء کے نزدیک اور بقول بصاصؒ عام فقہائے امصار کے مسلک پر یہ حکم منسوخ ہے، اب کسی مہینہ میں قتال ممنوع نہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ اس کا نسخ کونسی آیت ہے، اس میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں، بعض نے فرمایا کہ آیت کریمہ: **وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَآفَّةً** (التوبہ: ۳۶) اس کی نسخ ہے، اور اکثر حضرات نے آیت: **فَاَقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ** (التوبہ: ۵) کو نسخ قرار دیا ہے، اور لفظ **حَيْثُ** کو اس جگہ زمانے کے معنی میں لیا ہے کہ مشرکین کو جس مہینے اور جس زمانے میں پاؤ قتل کرو۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس حکم کا نسخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل ہے کہ خود آپ نے طائف کا محاصرہ اشہر حرم میں فرمایا، اور حضرت عامر اشعریؒ کو اشہر حرم ہی میں ”اوطاس“ کے جہاد کے لئے بھیجا، اسی بنا پر عامہ فقہاء اس حکم کو منسوخ قرار دیتے ہیں، بصاصؒ نے فرمایا: **”وَهُوَ قَوْلُ فُقَهَاءِ الْأَمْصَارِ“**^[۳]۔

روح المعانی نے اسی آیت کے تحت میں اور بیضاوی نے سورہ براءت کے پہلے رکوع کی تفسیر میں اشہر حرم میں

[۱] ترجمہ:- میں نے اپنے آپ کو بھی دیکھا اور اپنی رسوائی کو بھی دیکھا۔

[۲] صحیح البخاری، کتاب الاضاحی، باب من قال الاضحیٰ يوم النحر ج: ۲ ص: ۸۳۳۔ ترجمہ:- یعنی چار مہینے قابل احترام ہیں، تین تو مسلسل ہیں اور ایک رجب کا مہینہ ہے۔

[۳] احکام القرآن للخصاص ج: ۱ ص: ۳۲۲

حرمتِ قتال کے منسوخ ہونے پر اجماع اُمت نقل کیا ہے (بیان القرآن) ^[۱] مگر تفسیر مظہری میں مذکورہ تمام دلائل کا جواب یہ دیا ہے کہ اشہرِ حرم کی حرمت کی تصریح خود اس آیت میں موجود ہے جس کو آیۃ السیف کہا جاتا ہے، یعنی: **إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ** **عِنْدَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ** ^[۲] (التوبة: ۳۶) اور یہ آیت آیاتِ قتال میں سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے، اور خطبہ حجۃ الوداع جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف اسی روز پہلے ہوا ہے اس میں بھی اشہرِ حرم کی حرمت کی تصریح موجود ہے، اس لئے آیاتِ متذکرہ کو اس کا نسخ نہیں کہا جاسکتا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محاصرہ طائف ذوالقعدہ میں نہیں، شوال میں ہوا ہے، اس لئے اس کو بھی نسخ نہیں کہہ سکتے، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اشہرِ حرم میں قتال کی حرمتِ مطلقہ جو مذکورہ آیات سے معلوم ہوتی ہے، اس میں سے وہ صورت مستثنیٰ کر دی گئی ہے کہ خود کفار ان مہینوں میں مسلمانوں سے قتال کرنے لگیں تو جوابی حملہ اور دفاع مسلمانوں کے لئے بھی جائز ہے، اتنے حصہ کو منسوخ کہا جاسکتا ہے، جس کی تصریح اس آیت میں ہے: **الشُّهُرُ الْحَرَامُ بِالشُّهُرِ الْحَرَامِ الْآیۃ۔** (البقرة: ۱۹۳) ^[۳]

تو خلاصہ یہ ہوا کہ ابتداءً قتال تو ان مہینوں میں ہمیشہ کے لئے حرام ہے، مگر جب کفار ان مہینوں میں حملہ آور ہوں تو مدافعتانہ قتال کی مسلمانوں کو بھی اجازت ہے، جیسا کہ امام جصاص نے بروایت حضرت جابر بن عبد اللہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شہرِ حرام میں اس وقت تک قتال نہ کرتے تھے جب تک قتال کی ابتدا کفار کی طرف سے نہ ہو جائے۔ ^[۴]

انجامِ ارتداد

آیتِ مذکورہ **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشُّهُرِ الْحَرَامِ** کے آخر میں مسلمان ہونے کے بعد کفر و ارتداد اختیار کرنے کا یہ حکم ذکر فرمایا ہے کہ **حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ** یعنی ”ان لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت میں سب غارت ہو جائیں گے۔“ **مسئلہ:-** دنیا میں اعمال کا ضائع ہونا یہ ہے کہ اس کی بی بی نکاح سے نکل جاتی ہے، اگر اس کا کوئی مورث مسلمان مرے، اس شخص کو میراث کا حصہ نہیں ملتا، حالتِ اسلام میں نماز، روزہ جو کچھ کیا تھا سب کا عدم ہو جاتا ہے، مرنے کے بعد جنازے کی نماز نہیں پڑھی جاتی، مسلمانوں کے مقابر میں دفن نہیں ہوتا۔

اور آخرت میں ضائع ہونا یہ ہے کہ عبادات میں ثواب نہیں ملتا، ابد الابد کے لئے دوزخ میں داخل ہوتا ہے۔

[۱] رُوحُ الْمَعْنَى تحت هذه الآية ج: ۲، ص: ۱۰۸، وتفسير البيضاوي ج: ۱، ص: ۲۲۸

[۲] تفسير المظهری تحت هذه الآية ج: ۱، ص: ۲۶۳

[۳] احكام القرآن للجصاص ج: ۱، ص: ۳۲۱

مسئلہ :- اگر یہ شخص پھر مسلمان ہو جاوے تو آخرت میں دوزخ سے بچنے اور دنیا میں آئندہ کے لئے احکام اسلام کا جاری ہونا تو یقینی ہے، لیکن دنیا میں اگر حج کر چکا تو بشرط وسعت دوبارہ اس کا فرض ہونا نہ ہونا اور آخرت میں پچھلے نماز روزے کے ثواب کا عود کرنا نہ کرنا اس میں اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ دوبارہ حج کو فرض کہتے ہیں، اور گزشتہ نماز و روزے پر ثواب ملنے کے قائل نہیں، اور امام شافعی دونوں امر میں اختلاف کرتے ہیں۔

مسئلہ :- لیکن جو کافر اصلی ہو، اور اس حالت میں کوئی نیک کام کر لے اس کا ثواب معلق رہتا ہے، اگر کبھی اسلام لے آیا سب پر ثواب ملتا ہے، اور اگر کفر پر مر گیا تو سب بیکار جاتا ہے، حدیث میں ”اَسْلَمْتُ عَلَى مَا اَسْلَفْتُ مِنْ خَيْرٍ“ اسی معنی میں وارد ہے۔

مسئلہ :- غرض مرتد کی حالت کافر اصلی سے بدتر ہے، اسی واسطے کافر اصلی سے جزیہ قبول ہو سکتا ہے، اور مرتد اگر اسلام نہ لاوے، اگر مردے قتل کر دیا جاتا ہے، اگر عورت ہو تو دوام جس کی سزا دی جاتی ہے، کیونکہ اس سے اسلام کی اہانت ہوئی ہے، سرکاری اہانت اسی سزا کے لائق ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ط قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ز

تجھ سے پوچھتے ہیں حکم شراب کا اور جوئے کا، کہہ دے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور فائدے بھی لوگوں کو،

وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِّنْ نَّفْعِهِمَا ط

اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے ان کے فائدے سے۔

﴿آسان ترجمہ قرآن﴾

لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ بھی ہے، اور لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں، اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔

۱ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان حکم عمل الکافر إذا أسلم بعده ج: ۱ ص: ۷۶۔ ترجمہ:- جو نیک کام تم نے زمانہ جاہلیت میں کئے تھے وہ حالت اسلام میں باقی ہیں۔

خلاصہ تفسیر

پندرہواں حکم :- متعلقہ شراب و قمار

لوگ آپ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں، آپ فرمادیتے ہیں کہ ان دونوں (چیزوں کے استعمال) میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی (پیدا ہو جاتی) ہیں اور لوگوں کو (بعضے) فائدے بھی ہیں اور (وہ) گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں (اس لئے دونوں قابل ترک ہیں)۔

معارف و مسائل

صحابہ کرامؓ کے سوالات اور ان کے جوابات کا جو سلسلہ اس سورت میں بیان ہو رہا ہے، اس میں یہ آیت بھی ہے، اس میں شراب اور جوئے کے متعلق صحابہ کرامؓ کا سوال اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ہے، یہ دونوں مسئلے نہایت اہم ہیں، اس لئے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان کی پوری حقیقت اور احکام سنئے :-

حرمت شراب اور اس کے متعلقہ احکام

ابتدائے اسلام میں عام رسومِ جاہلیت کی طرح شراب خوری بھی عام تھی، جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ میں بھی شراب اور قمار یعنی جو ا کھیلنے کا رواج تھا، عام لوگ تو ان دونوں چیزوں کے صرف ظاہری فوائد کو دیکھ کر ان پر فریفتہ تھے، ان کے اندر جو بہت سے مفاسد اور خرابیاں ہیں ان کی طرف نظر نہیں تھی، لیکن عادۃ اللہ یہ بھی ہے کہ ہر قوم اور ہر خطہ میں کچھ عقل والے بھی ہوتے ہیں، جو طبیعت پر عقل کو غالب رکھتے ہیں، کوئی طبعی خواہش اگر عقل کے خلاف ہو تو وہ اس خواہش کے پاس نہیں جاتے، اس معاملہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام تو بہت ہی بلند تھا، کہ جو چیز کسی وقت حرام ہونے والی تھی آپ کی طبیعت اس سے پہلے ہی نفرت کرتی تھی، صحابہ کرامؓ میں بھی کچھ ایسے حضرات تھے جنہوں نے حلال ہونے کے زمانے میں بھی کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا، مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد چند حضرات صحابہؓ کو ان کے مفاسد کا زیادہ احساس ہوا، حضرت فاروق اعظمؓ اور معاذ بن جبلؓ اور چند انصاری صحابہؓ اسی احساس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ شراب اور قمار انسان کی عقل کو بھی خراب کرتے ہیں اور مال بھی برباد کرتے ہیں، ان کے بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے، اس سوال کے جواب میں آیت مذکورہ نازل ہوئی، یہ پہلی آیت ہے جس میں شراب اور جوئے سے مسلمانوں کو روکنے کا ابتدائی قدم اٹھایا گیا۔

اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ شراب اور جوئے میں اگرچہ لوگوں کے کچھ ظاہری فوائد ضرور ہیں، لیکن ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں پیدا ہو جاتی ہیں، جو ان کے منافع اور فوائد سے بڑھی ہوئی ہیں، اور گناہ کی باتوں سے وہ چیزیں مراد ہیں جو کسی گناہ کا سبب بن جائیں، مثلاً شراب میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ عقل و ہوش زائل ہو جاتا ہے جو تمام کمالات اور شرفِ انسانی کا اصلِ اصول ہے، کیونکہ عقل ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسانوں کو برے کاموں سے روکتی ہے، جب وہ نہ رہی تو ہر برے کام کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔

اس آیت میں صاف طور پر شراب کو حرام تو نہیں کہا گیا، مگر اس کی خرابیاں اور مفسد بیان کر دیئے گئے، کہ شراب کی وجہ سے انسان بہت سے گناہوں اور خرابیوں میں مبتلا ہو سکتا ہے، گویا اس کے ترک کرنے کے لئے ایک قسم کا مشورہ دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بعض صحابہ کرامؓ تو اس مشورہ ہی کو قبول کر کے اسی وقت شراب چھوڑ بیٹھے، اور بعض نے یہ خیال کیا کہ اس آیت نے شراب کو حرام تو کیا نہیں، بلکہ مفسدِ دینی کا سبب بننے کی وجہ سے اس کو سببِ گناہ قرار دیا ہے، ہم اس کا اہتمام کریں گے کہ وہ مفسد واقع نہ ہوں، تو پھر شراب میں کوئی حرج نہیں، اس لئے پیتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک روز یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرامؓ میں سے چند اپنے دوستوں کی دعوت کی، کھانے کے بعد حسبِ دستور شراب پی گئی، اسی حال میں نمازِ مغرب کا وقت آ گیا، سب نماز کے لئے کھڑے ہو گئے، تو ایک صاحب کو امامت کے لئے آگے بڑھایا، انہوں نے نشہ کی حالت میں جو تلاوت شروع کی تو سورہ قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ کو غلط پڑھا، اس پر شراب سے روکنے کے لئے دُوسرا قدم اٹھایا گیا اور یہ آیت نازل ہوئی:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى (النساء: ۴۳)

”یعنی اے ایمان والو! تم نشہ کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ۔“

اس میں خاص اوقاتِ نماز کے اندر شراب کو قطعی طور پر حرام کر دیا گیا، باقی اوقات میں اجازت رہی، جن حضرات صحابہؓ نے پہلی آیت نازل ہونے کے وقت شراب کو نہ چھوڑا تھا، اس آیت کے نازل ہونے کے وقت شراب کو مطلقاً ترک کر دیا کہ جو چیز انسان کو نماز سے روکے اُس میں کوئی خیر نہیں ہو سکتی، جب نشہ کی حالت میں نماز کی ممانعت ہو گئی تو ایسی چیز کے پاس نہ جانا چاہئے جو انسان کو نماز سے محروم کر دے، مگر چونکہ علاوہ اوقاتِ نماز کے شراب کی حرمت صاف طور پر اب بھی نازل نہیں ہوئی تھی، اس لئے کچھ حضرات اب بھی اوقاتِ نماز کے علاوہ دُوسرے اوقات میں پیتے رہے، یہاں تک کہ ایک اور واقعہ پیش آیا، عتبہ بن مالکؓ نے چند صحابہ کرامؓ کی دعوت کی، جن میں سعد بن ابی وقاصؓ بھی تھے، کھانے کے بعد حسبِ دستور شراب کا دور چلا، نشہ کی حالت میں عرب کی عام عادت کے مطابق شعر و شاعری اور اپنے اپنے

مفاخر کا بیان شروع ہوا، سعد بن ابی وقاصؓ نے ایک قصیدہ پڑھا، جس میں انصارِ مدینہ کی ہجو اور اپنی قوم کی مدح و ثنا تھی، اس پر ایک انصاری نوجوان کو غصہ آگیا، اور اُونٹ کے جڑے کی ہڈی سعد رضی اللہ عنہ کے سر پر دے ماری، جس سے ان کو شدید زخم آگیا، حضرت سعدؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اس انصاری جوان کی شکایت کی، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا فرمائی: ”اَللّٰهُمَّ بَيِّنْ لَّنَا فِى الْخَمْرِ بَيِّنًا شَافِيًا“ یعنی ”یا اللہ! شراب کے بارے میں ہمیں کوئی واضح بیان اور قانون عطا فرما دے“ اس پر شراب کے متعلق تیسری آیت سورہ مائدہ کی مفصل نازل ہوگئی، جس میں شراب کو مطلقاً حرام قرار دے دیا گیا، آیت یہ ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَذْلَامُ رِجَاسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوا لَعَلَّكُمْ تَفْلَحُونَ ﴿٩٠﴾ إِنَّمَا يُرِي الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ﴿٩١﴾ (المائدة)

”یعنی اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت اور جوئے کے تیر، یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں، سو اس سے بالکل الگ الگ رہو، تاکہ تم کو فلاح ہو۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے آپس میں بغض اور عداوت پیدا کر دے اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے تم کو باز رکھے، سو کیا اب بھی باز آؤ گے۔“

حرمتِ شراب کے تدریجی احکام

احکامِ الہیہ کی اصلی اور حقیقی حکمتوں کو تو احکام الحاکمین ہی جانتا ہے، مگر احکام شرعیہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعتِ اسلام نے احکام میں انسانی جذبات کی بڑی رعایت فرمائی ہے، تاکہ انسان کو ان کے اتباع میں زیادہ تکلیف نہ ہو، خود قرآن کریم نے فرمایا: لَا يَكْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (البقرة: ۲۸۶) یعنی ”اللہ تعالیٰ کسی انسان کو ایسا حکم نہیں دیتا جو اس کی قدرت اور وسعت میں نہ ہو۔“ اسی رحمت و حکمت کا تقاضا تھا کہ اسلام نے شراب کے حرام کرنے میں بڑی تدریج سے کام لیا۔

شراب کی تدریجی ممانعت اور حرمت کی قرآنی تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں شراب کے متعلق چار آیتیں نازل ہوئی ہیں، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، ان میں سے ایک آیت سورہ بقرہ کی ہے جس کی تفسیر آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں، اس میں تو شراب سے پیدا ہو جانے والے گناہوں اور مفسد کا ذکر کر کے چھوڑ دیا گیا ہے، حرام نہیں کیا، گویا

ایک مشورہ دیا کہ یہ چھوڑنے کی چیز ہے، مگر چھوڑنے کا حکم نہیں دیا۔

دوسری آیت سورہ نساء کی: لَا تَقْرُبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى (النساء: ۴۳) میں خاص اوقاتِ نماز کے اندر شراب کو حرام کر دیا گیا، باقی اوقات میں اجازت رہی۔

تیسری اور چوتھی دو آیتیں سورہ مائدہ کی ہیں، جو اوپر مذکور ہو چکی ہیں، ان میں صاف اور قطعی طور پر شراب کو حرام قرار دے دیا۔

شریعتِ اسلام نے شراب کے حرام کرنے میں اس تدریج سے اس لئے کام لیا کہ عمر بھر کی عادت خصوصاً نشہ کی عادت کو چھوڑ دینا طبیعت پر انتہائی شاق اور گراں ہوتا، علماء نے فرمایا: ”فِطَامُ الْعَادَةِ أَشَدُّ مِنْ فِطَامِ الرِّضَاعَةِ“ یعنی ”جیسے بچے کو ماں کا دودھ پینے کی عادت چھوڑ دینا بھاری معلوم ہوتا ہے، انسان کو اپنی کسی عادتِ مستمرہ کو بدلنا اس سے زیادہ شدید اور سخت ہے۔“ اس لئے اسلام نے حکیمانہ اصول کے مطابق اول اس کی برائی ذہن نشین کرائی، پھر نمازوں کے اوقات میں ممنوع کیا، پھر ایک خاص مدت کے بعد قطعی طور پر حرام کر دیا گیا۔

ہاں جس طرح ابتداءً تحریم شراب میں آہستگی اور تدریج سے کام لینا حکمت کا تقاضا تھا، اسی طرح حرام کر دینے کے بعد اس کی ممانعت کے قانون کو پوری شدت کے ساتھ نافذ کرنا بھی حکمت ہی کا تقاضا تھا، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے بارے میں اول سخت وعیدیں عذاب کی بتلائیں، ارشاد فرمایا کہ یہ اُمّ النجاست اور اُمّ الفواحش ہے، اس کو پی کر آدمی برے سے برے گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ شراب اور ایمان جمع نہیں ہو سکتے، یہ روایتیں نسائی میں ہیں، اور جامع ترمذی میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے بارے میں دس آدمیوں پر لعنت فرمائی: ۱- نچوڑنے والا، ۲- بنانے والا، ۳- پینے والا، ۴- پلانے والا، ۵- اس کو لاد کر لانے والا، ۶- اور جس کے لئے لائی جائے، ۷- اور اس کا بیچنے والا، ۸- خریدنے والا، ۹- اس کو بہہ کرنے والا، ۱۰- اس کی آمدنی کھانے والا۔ اور پھر صرف زبانی تعلیم و تبلیغ پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ عملی اور قانونی طور پر اعلان فرمایا کہ جس کے پاس کسی قسم کی شراب موجود ہو اس کو فلاں جگہ جمع کر دے۔

صحابہؓ میں تعمیلِ حکم کا بے مثال جذبہ

فرمانبردار صحابہ کرامؓ نے پہلا حکم پاتے ہی اپنے اپنے گھروں میں جو شراب استعمال کے لئے رکھی تھی اُس کو تو اسی

وقت بہادیا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے مدینہ کی گلیوں میں یہ آواز دی کہ شراب حرام کر دی گئی ہے تو جس کے ہاتھ میں جو برتن شراب کا تھا اس کو وہیں پھینک دیا، جس کے پاس کوئی سبویا خم شراب کا تھا اس کو گھر سے باہر لا کر توڑ دیا۔ حضرت انسؓ اُس وقت ایک مجلس میں دو رجام کے ساقی بنے ہوئے تھے، ابوطلمحہ، ابو عبیدہ بن جراح، ابی بن کعب، سہیل رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے جلیل القدر صحابہ موجود تھے، منادی کی آواز کان میں پڑتے ہی سب نے کہا کہ اب یہ شراب سب گرا دو، اس کے جام و سبوتوڑ دو۔ بعض روایات میں ہے کہ اعلانِ حرمت کے وقت جس کے ہاتھ میں جام شراب لبوں تک پہنچا ہوا تھا اُس نے وہیں سے اس کو پھینک دیا۔^۱ مدینہ میں اُس روز شراب اس طرح بہہ رہی تھی جیسے بارش کی رو کا پانی، اور مدینہ کی گلیوں میں عرصہ دراز تک یہ حالت رہی کہ جب بارش ہوتی تو شراب کی بو اور رنگ مٹی میں نکھر آتا تھا۔

جس وقت اُن کو یہ حکم ملا کہ جس کے پاس کسی قسم کی شراب ہے وہ فلاں جگہ جمع کر دے، اس وقت صرف وہ ذخیرے کچھ رہ گئے تھے جو مال تجارت کی حیثیت سے بازار میں تھے، اُن کو فرمانبردار صحابہ کرامؓ نے بلا تامل مقررہ جگہ پر جمع فرمادیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تشریف لے گئے، اور اپنے ہاتھ سے شراب کے بہت سے مشکیزوں کو چاک کر دیا، اور باقی دوسرے صحابہ کرامؓ کے حوالے کر کے چاک کر دیا۔ ایک صحابی جو شراب کی تجارت کرتے تھے اور ملک شام سے شراب لینے کے لئے گئے ہوئے تھے، اور جب یہ تجارتی مال لے کر واپس ہوئے تو مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی اُن کو اعلانِ حرمت کی خبر مل گئی، جاں نثار صحابی نے اپنے پورے سرمائے اور محنت کی حاصلات کو جس سے بڑے نفع کی امیدیں لئے ہوئے آرہے تھے اعلانِ حرمت سن کر اسی جگہ ایک پہاڑی پر ڈال دیا، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سوال کیا کہ اب میرے اس مال کے متعلق کیا حکم ہے، اور مجھ کو کیا کرنا چاہئے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمانِ خداوندی کے مطابق حکم دے دیا کہ سب مشکیزوں کو چاک کر کے شراب بہا دو، فرمانبردار محبِ خدا و رسول نے بلا کسی جھجک کے اپنے ہاتھ سے اپنا پورا سرمایہ زمین پر بہا دیا۔ یہ بھی اسلام کا ایک معجزہ اور صحابہ کرامؓ کی حیرت انگیز و بے مثال اطاعت ہے جو اس واقعہ میں ظاہر ہوئی، کہ جس چیز کی عادت ہو جائے سب جانتے ہیں کہ چھوڑنا سخت دشوار ہے، اور یہ حضرات بھی اس کے ایسے عادی تھے کہ تھوڑی دیر اس سے صبر کرنا دشوار تھا، ایک حکم الہی اور فرمانِ نبوی نے ان کی عادات میں ایسا عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا کہ اب یہ شراب اور جوئے سے ایسے ہی متنفر ہیں، جیسے اس سے پہلے ان کے عادی تھے۔

اسلامی سیاست اور عام ملکی سیاستوں کا فرق عظیم

مذکورہ آیات پھر واقعات میں حرمت شراب کے حکم پر مسلمانوں کے عمل کا ایک نمونہ سامنے آ گیا ہے، جس کو اسلام کا معجزہ کہو یا پیغمبرانہ تربیت کا بے مثال اثر، یا اسلامی سیاست کا لازمی نتیجہ کہ نشہ کی عادت جس کے چھوڑنے کا انتہائی دُشوار ہونا ہر شخص کو معلوم ہے، اور عرب میں اس کا رواج اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ چند گھنٹے اس کے بغیر صبر نہیں کر سکتے تھے، وہ کیا چیز تھی جس نے ایک ہی اعلان کی آواز کان میں پڑتے ہی ان سب کے مزاجوں کو بدل ڈالا، اُن کی عادتوں میں وہ انقلاب پیدا کر دیا کہ اب سے چند منٹ پہلے جو چیز انتہائی مرغوب بلکہ زندگی کا سرمایہ تھی وہ چند منٹ کے بعد انتہائی مبغوض اور فحش و ناپاک ہو گئی۔

اس کے بالمقابل آج کی ترقی یافتہ سیاست کی ایک مثال کو سامنے رکھ لیجئے کہ اب سے چند سال پہلے امریکا کے ماہرین صحت اور سماجی مصلحین نے جب شراب نوشی کی بے شمار اور انتہائی مہلک خرابیوں کو محسوس کر کے ملک میں شراب نوشی کو قانوناً ممنوع کرنا چاہا تو اس کے لئے اپنے نشر و اشاعت کے وہ نئے سے نئے ذرائع جو اس ترقی یافتہ سیاست کا بڑا کمال سمجھے جاتے ہیں سب ہی شراب نوشی کے خلاف ذہن ہموار کرنے پر لگا دیئے، سینکڑوں اخبارات اور رسائل اس کی خرابیوں پر مشتمل ملک میں لاکھوں کی تعداد میں شائع کئے گئے، پھر امریکی دستور میں ترمیم کر کے امتناع شراب کا قانون نافذ کیا گیا، مگر ان سب کا اثر جو کچھ امریکا میں آنکھوں نے دیکھا، اور وہاں کے ارباب سیاست کی رپورٹوں سے دُنیا کے سامنے آیا وہ یہ تھا کہ اس ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ قوم نے اس ممانعت قانونی کے زمانے میں عام زمانوں کی نسبت بہت زیادہ شراب استعمال کی، یہاں تک کہ مجبور ہو کر حکومت کو اپنا قانون منسوخ کرنا پڑا۔

عرب مسلمانوں اور موجودہ ترقی یافتہ امریکنوں کے حالات و معاملات کا یہ عظیم فرق تو ایک حقیقت اور واقعہ ہے جس کا کسی کو انکار کرنے کی گنجائش نہیں، یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس عظیم الشان فرق کا اصلی سبب اور راز کیا ہے۔ ذرا سا غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ شریعت اسلام نے صرف قانون کو قوم کی اصلاح کے لئے کبھی کافی نہیں سمجھا، بلکہ قانون سے پہلے ان کی ذہنی تربیت کی اور عبادت و زہادت اور فکرِ آخرت کے کیمیادی نسخے سے ان کے مزاجوں میں ایک بڑا انقلاب لا کر ایسے افراد پیدا کر دیئے جو رسول کی آواز پر اپنی جان و مال آبرو سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو جائیں، مکی زندگی کے پورے دور میں یہی افراد سازی کا کام ریاضتوں کے ذریعے ہوتا رہا، جب جاں نثاروں کی جماعت تیار ہو گئی اس وقت قانون جاری کیا گیا، ذہنوں کو ہموار کرنے کے لئے تو امریکا نے بھی اپنے بے مثال ذرائع

استعمال کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی، ان کے سامنے سب کچھ تھا مگر فکرِ آخرت نہیں تھی، اور مسلمانوں کے رگ و پے میں فکرِ آخرت سماؤی ہوئی تھی۔

کاش! آج بھی ہمارے عقلاء اس نسخہِ کیمیا کو استعمال کر کے دیکھیں تو دُنیا کو اَمَن و سکون نصیب ہو جائے۔

شراب کے مفاسد اور فوائد میں موازنہ

اس آیت میں شراب اور قمار دونوں کے متعلق قرآن کریم نے یہ بتلایا ہے کہ ان دونوں میں کچھ مفاسد بھی ہیں اور کچھ فوائد بھی، مگر اس کے مفاسد فوائد سے بڑھے ہوئے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ اس پر نظر ڈالی جائے کہ ان کے فوائد کیا ہیں اور مفاسد کیا، اور پھر یہ کہ فوائد سے زیادہ مفاسد ہونے کے کیا وجوہ ہیں، آخر میں چند فقہی ضابطے بیان کئے جائیں گے جو اس آیت سے مستفاد ہوتے ہیں۔

پہلے شراب کو لے لیجئے، اس کے فوائد تو عام لوگوں میں مشہور و معروف ہیں کہ اس سے لذت و فرحت حاصل ہوتی ہے، اور وقتی طور پر قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے، رنگ صاف ہو جاتا ہے، مگر ان حقیر وقتی فوائد کے مقابلے میں اس کے مفاسد اتنے کثیر و وسیع اور گہرے ہیں کہ شاید کسی دوسری چیز میں اتنے مفاسد اور مضرات نہ ہوں گے، بدنِ انسانی پر شراب کے مضرات یہ ہیں کہ وہ رفتہ رفتہ معدے کے فعل کو فاسد کر دیتی ہے، کھانے کی خواہش کم کر دیتی ہے، چہرے کی ہیئت بگاڑ دیتی ہے، پیٹ بڑھ جاتا ہے، مجموعی حیثیت سے تمام قویٰ پر یہ اثر ہوتا ہے جو ایک جرمِ نڈا کٹر نے بیان کیا ہے کہ: ”جو شخص شراب کا عادی ہو، چالیس سال کی عمر میں اس کے بدن کی ساخت ایسی ہو جاتی ہے جیسے ساٹھ سالہ بوڑھے کی۔“ وہ جسمانی، اور قوت کے اعتبار سے سٹھیاے ہوئے بوڑھوں کی طرح ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ شراب جگر اور گردوں کو خراب کر دیتی ہے، ”سل“ کی بیماری شراب کا خاص اثر ہے، یورپ کے شہروں میں ”سل“ کی کثرت کا بڑا سبب شراب ہی کو بتلایا جاتا ہے، وہاں کے بعض ڈاکٹروں کا قول ہے کہ یورپ میں آدھی اموات مرضِ سل میں ہوتی ہیں، اور آدھی دوسرے امراض میں، اور اس بیماری کی کثرت یورپ میں اسی وقت سے ہوئی جب سے وہاں شراب کی کثرت ہوئی۔

یہ تو شراب کی جسمانی اور بدنی مضرتیں ہیں، اب عقل پر اس کی مضرت کو تو ہر شخص جانتا ہے، مگر صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ شراب پی کر جب تک نشہ رہتا ہے اُس وقت تک عقل کام نہیں کرتی، لیکن اہل تجربہ اور ڈاکٹروں کی تحقیق یہ ہے کہ نشہ کی عادت خود قوتِ عاقلہ کو بھی ضعیف کر دیتی ہے، جس کا اثر ہوش میں آنے کے بعد بھی رہتا ہے، بعض اوقات جنون تک اس کی نوبت پہنچ جاتی ہے، اطباء اور ڈاکٹروں کا اتفاق ہے کہ شراب نہ جز و بدن بنتی ہے اور نہ اس سے خون بنتا ہے جس کی وجہ سے بدن میں طاقت آئے، بلکہ اس کا فعل صرف یہ ہوتا ہے کہ خون میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے، جس سے وقتی طور پر

قوت کی زیادتی محسوس ہونے لگتی ہے، اور یہی خون کا دفعۃً ہیجان بعض اوقات اچانک موت کا سبب بھی بن جاتا ہے، جس کو ڈاکٹر ہارٹ فیل ہونے سے تعبیر کرتے ہیں۔

شراب سے شرائین یعنی وہ رگیں جن کے ذریعے سارے بدن میں رُوح پہنچتی ہے سخت ہو جاتی ہے جس سے بڑھاپا جلدی آ جاتا ہے، شراب کا اثر انسان کے حلقوم اور تنفس پر بھی خراب ہوتا ہے، جس کی وجہ سے آواز بھاری ہو جاتی ہے، اور کھانسی داگی ہو جاتی ہے، اور وہی آخر کار ”سل“ تک نوبت پہنچا دیتی ہے، شراب کا اثر نسل پر بھی برا پڑتا ہے، شرابی کی اولاد کمزور رہتی ہے اور بعض اوقات اس کا نتیجہ قطع نسل تک پہنچتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شراب پینے کی ابتدائی حالت میں بظاہر انسان اپنے جسم میں چستی و چالاکی اور قوت محسوس کرتا ہے، اسی لئے بعض لوگ جو اس میں مبتلا ہوتے ہیں وہ ان طبی حقائق کا انکار کرتے ہیں، لیکن انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ شراب کا یہ زہر ایسا زہر ہے جس کا اثر تدریجی طور پر ظاہر ہونا شروع ہوتا ہے اور کچھ عرصے کے بعد یہ سب مضر تیں مشاہدے میں آ جاتی ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔

شراب کا ایک بڑا مفسدہ تمدنی یہ ہے کہ وہ اکثر لڑائی جھگڑے کا سبب بنتی ہے، اور پھر یہ بغض و عداوت دُور تک انسان کو نقصان پہنچاتی ہے، شریعتِ اسلام کی نظر میں یہ مفسدہ سب سے بڑا ہے، اس لئے قرآن نے سورہ مائدہ میں خصوصیت کے ساتھ اس مفسدہ کا ذکر فرمایا ہے: اِنَّ الشَّيْطَانَ اَنْ يُدْعَىٰ بَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْبَيْسِرِ (المائدة: ۹۱) یعنی ”شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے آپس میں بغض و عداوت پیدا کر دے۔“

شراب کا ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ مدہوشی کے عالم میں بعض اوقات آدمی اپنا پوشیدہ راز بیان کر ڈالتا ہے، جس کی مضرت اکثر بڑی تباہ کن ہوتی ہے، خصوصاً وہ اگر کسی حکومت کا ذمہ دار آدمی ہے اور راز بھی حکومت کا راز ہے، جس کے اظہار سے پورے ملک میں انقلاب آ سکتا ہے اور ملکی سیاست اور جنگی مصالح سب برباد ہو جاتے ہیں، ہوشیار جاسوس ایسے مواقع کے منتظر رہتے ہیں۔

شراب کا ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ وہ انسان کو ایک کھلونا بنا دیتی ہے، جس کو دیکھ کر بچے بھی ہنستے ہیں، کیونکہ اس کا کلام اور اس کی حرکات سب غیر متوازن ہو جاتی ہیں۔ شراب کا ایک عظیم تر مفسدہ یہ ہے کہ وہ اُمّ الخبائث ہے، انسان کو تمام برے سے برے جرائم پر آمادہ کر دیتی ہے، زنا اور قتل اکثر اس کے نتائج ہوتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ عام شراب خانے زنا اور قتل کے اڈے ہوتے ہیں، یہ شراب کی جسمانی مضرتیں ہیں۔ اور اس کی روحانی مضرت تو ظاہر ہی ہے کہ نشہ کی حالت میں نہ نماز ہو سکتی ہے نہ اللہ کا ذکر، نہ اور کوئی عبادت، اسی لئے قرآن کریم میں شراب کی مضرت کے بیان میں فرمایا: وَيَصْدَلُّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ (المائدة: ۹۱) یعنی ”شراب تم کو ذکر اللہ اور نماز سے روکتی ہے۔“

اب مالی مضرت اور نقصان کا حال سنئے جس کو ہر شخص جانتا ہے، کسی بستی میں اگر ایک شراب خانہ کھل جاتا ہے تو وہ پوری بستی کی دولت کو سمیٹ لیتا ہے، اس کی قسمیں بے شمار ہیں، اور بعض اقسام تو بے حد گراں ہیں، بعض اعداد و شمار لکھنے والوں نے صرف ایک شہر میں شراب کا مجموعی خرچہ پوری مملکت فرانس کے مجموعی خرچ کے برابر بتلایا ہے۔

یہ شراب کے دینی، دنیوی، جسمانی اور روحانی مفاسد کی مختصر فہرست ہے، جس کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کلمہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ ”اُمّ الخبائث“^[۱] یا ”اُمّ الفواحش“ ہے۔ جرمنی کے ایک ڈاکٹر کا یہ مقولہ ضربِ اشل کی طرح مشہور ہے کہ اس نے کہا کہ اگر آدھے شراب خانے بند کر دیئے جائیں تو میں اس کی ضمانت لیتا ہوں کہ آدھے شفا خانے اور آدھے جیل خانے بے ضرورت ہو کر بند ہو جائیں گے۔ (تفسیر المنار لمفتی عبدہ ج: ۲ ص: ۲۲۶)

علامہ طنطاویؒ نے اپنی کتاب ”الجواہر“ میں اس سلسلے کی چند اہم معلومات لکھی ہیں، اُن میں سے بعض یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

ایک فرانسیسی محقق ہنری اپنی کتاب ”خواطر وسوانح فی الاسلام“ میں لکھتے ہیں:-

”بہت زیادہ مہلک ہتھیار جس سے اہل مشرق کی بیخ کنی کی گئی، اور وہ دودھاری تلوار جس سے مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ یہ شراب تھی۔ ہم نے الجزائر کے لوگوں کے خلاف یہ ہتھیار آزمایا، لیکن ان کی اسلامی شریعت ہمارے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئی، اور وہ ہمارے اس ہتھیار سے متاثر نہیں ہوئے، اور نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کی نسل بڑھتی ہی چلی گئی، یہ لوگ اگر ہمارے اس تحفہ کو قبول کر لیتے جس طرح کہ اُن کے ایک منافق قبیلے نے اس کو قبول کر لیا ہے تو یہ بھی ہمارے سامنے ذلیل و خوار ہو جاتے، آج جن لوگوں کے گھروں میں ہماری شراب کے دور چل رہے ہیں وہ ہمارے سامنے اتنے حقیر و ذلیل ہو گئے ہیں کہ سر نہیں اٹھا سکتے۔“

ایک انگریز قانون داں بنام لکھتے ہیں کہ:-

”اسلامی شریعت کی بے شمار خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں شراب حرام ہے، ہم نے دیکھا کہ جب افریقہ کے لوگوں نے اسے استعمال کرنا شروع کیا تو ان کی نسلوں میں پاگل پن سراپت کرنے لگا، اور یورپ کے جن لوگوں کو اس کا چسکا لگ گیا اُن کی بھی عقلوں میں تغیر آنے لگا، لہذا افریقہ کے لوگوں کے لئے بھی اس کی ممانعت ہونی چاہئے، اور یورپین لوگوں کو بھی اس پر شدید سزائیں دینی چاہئیں۔“

غرض جس بھلے مانس نے بھی ٹھنڈے دل سے غور کیا وہ بے اختیار پکار اٹھا کہ یہ رَجَس ہے، شیطانی عمل ہے، زہر ہے، تباہی اور بربادی کا ذریعہ ہے، اس اُمّ الخبائث سے باز آ جاؤ، فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ﴿۹۱﴾ (المائدہ: ۹۱)

شراب کی حرمت و ممانعت کے متعلق قرآن کریم کی چار آیتوں کا بیان اوپر آچکا ہے، سورہ نحل میں ایک جگہ اور بھی نشہ کی چیزوں کا ذکر ایک دوسرے انداز سے آیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بھی یہاں ذکر کر دیا جائے، تاکہ شراب و نشہ کے متعلق تمام قرآنی ارشادات مجموعی طور پر سامنے آجائیں، وہ آیت یہ ہے:-

وَمِنْ شَرَابِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا حَسَنًا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۹۲﴾ (النحل)

”اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم لوگ نشہ کی چیز اور عمدہ کھانے کی چیزیں بناتے ہو، بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے بڑی دلیل ہے جو عقل رکھتے ہیں۔“

تشریح و تفسیر

پچھلی آیتوں میں حق تعالیٰ کی اُن نعمتوں کا ذکر تھا جو انسانی غذائیں پیدا کرنے میں عجیب و غریب صنعت و قدرت کا مظہر ہیں، اس میں پہلے دودھ کا ذکر کیا، جس کو قدرت نے حیوان کے پیٹ میں خون اور فضلہ کی آلائشوں سے الگ کر کے صاف ستھری غذا انسان کے لئے عطا کر دی، جس میں انسان کو کسی مزید صنعت کی ضرورت نہیں، اسی لئے یہاں لفظ نُسْقِيكُمْ (النحل: ۶۶) استعمال فرمایا، کہ ہم نے دودھ پلایا، اس کے بعد فرمایا کہ کھجور اور انگور کے کچھ پھلوں میں سے بھی انسان اپنی غذا اور نفع کی چیزیں بناتا ہے، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ کھجور اور انگور کے پھلوں میں سے اپنی غذا اور منفعت کی چیزیں بنانے میں انسانی صنعت کا کچھ دخل ہے، اور اسی دخل کے نتیجہ میں دو طرح کی چیزیں بنائی گئیں، ایک نشہ آور چیز، جس کو ”خمر“ یا ”شراب“ کہا جاتا ہے، دوسری رزق حسن یعنی عمدہ رزق کہ کھجور اور انگور کو تروتازہ کھانے میں استعمال کریں یا خشک کر کے ذخیرہ کر لیں، مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے کھجور اور انگور کے پھل انسان کو دے دیئے، اور ان سے اپنی غذا وغیرہ بنانے کا اختیار بھی دے دیا، اب یہ اس کا انتخاب ہے کہ اس سے کیا بنائے، نشہ آور چیز بنا کر عقل کو خراب کرے یا غذا بنا کر قوت حاصل کرے۔

اس تفسیر کے مطابق اس آیت سے نشہ آور شراب کے حلال ہونے پر کوئی استدلال نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہاں مقصود قدرت کے عطیات اور ان کے استعمال کی مختلف صورتوں کا بیان ہے، جو ہر حال میں نعمتِ خداوندی ہے، جیسے تمام غذائیں

اور انسانی منفعت کی چیزیں کہ اُن کو بہت سے لوگ ناجائز طریقوں پر بھی استعمال کرتے ہیں، مگر کسی کے غلط استعمال سے اصل نعمت، نعمت ہونے سے نہیں نکل جاتی، اس لئے یہاں یہ تفصیل بتلانے کی ضرورت نہیں کہ ان میں کونسا استعمال حلال ہے، کونسا حرام ہے، تاہم ایک لطیف اشارہ اس میں بھی اس طرف کر دیا کہ ”سکر“ کے مقابل ”رزقِ حسن“ رکھا، جس سے معلوم ہوا کہ سکر اچھا رزق نہیں، سکر کے معنی جمہور مفسرین کے نزدیک نشہ آور چیز کے ہیں۔ (روح المعانی، قرطبی، جصاص) [۲]

یہ آیات باتفاق امت مکی ہیں، اور شراب کی حرمت اس کے بعد مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، نزول آیات کے وقت اگرچہ شراب حلال تھی اور مسلمان عام طور پر پیتے تھے، مگر اُس وقت بھی اس آیت میں اشارہ اس طرف کر دیا گیا کہ اس کا پینا اچھا نہیں، بعد میں صراحۃً شراب کو شدت کے ساتھ حرام کرنے کے لئے قرآنی احکام نازل ہو گئے۔ (لہذا ملخص مافی الجصاص والقرطبی) [۳]

حرمتِ قمار (جوا)

”میسر“ مصدر ہے، اور اصل لغت میں اس کے معنی تقسیم کرنے کے ہیں، ”یاسر“ تقسیم کرنے والے کو کہا جاتا ہے، جاہلیتِ عرب میں مختلف قسم کے جوئے رائج تھے جن میں ایک قسم یہ بھی تھی کہ اُونٹ ذبح کر کے اس کے حصے تقسیم کرنے میں جوا کھیلا جاتا تھا، بعض کو ایک یا زیادہ حصے ملتے، بعض محروم رہتے تھے، محروم رہنے والے کو پورے اُونٹ کی قیمت ادا کرنا پڑتی تھی، گوشت سب فقراء میں تقسیم کیا جاتا، خود استعمال نہ کرتے تھے۔

اس خاص جوئے میں چونکہ فقراء کا فائدہ اور جوا کھیلنے والوں کی سخاوت بھی تھی، اسی لئے اس کھیل کو باعثِ فخر سمجھتے تھے، جو اس میں شریک نہ ہوتا اس کو کنجوس اور منحوس کہتے تھے۔

تقسیم کی مناسبت سے قمار کو ”میسر“ کہا جاتا ہے، تمام صحابہؓ و تابعینؓ اس پر متفق ہیں کہ میسر میں قمار یعنی جوئے کی تمام صورتیں داخل اور سب حرام ہیں، ابنِ کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اور جصاصؒ نے ”احکام القرآن“ میں نقل کیا ہے کہ مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ابنِ عمرؓ اور قتادہؓ اور معاویہ بن صالحؓ اور عطاءؓ اور طاؤسؓ نے فرمایا:-

”الْمَيْسِرُ الْقِمَارُ حَتَّى لَعَبِ الصَّبْيَانِ بِالْكَعَابِ وَالْجَوْزِ“ یعنی ”ہر قسم کا قمار میسر ہے، یہاں تک کہ بچوں کا کھیل لکڑی کے گٹکوں اور اخروٹ وغیرہ کے ساتھ۔“

[۱] بعض علماء نے اس کے معنی ”سکر“ یا بے نشہ نیز کے بھی لئے ہیں (جصاص، قرطبی) مگر اس جگہ اس اختلاف کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ ۱۲ منہ

[۲] رُوحُ الْمَعَانِي تحت هذه الآية ج: ۲ ص: ۱۱۱، ۱۱۲ وتفسير القرطبي تحت سورة النحل: ۶۷ ج: ۱۰ ص: ۱۲۸ واحكام القرآن للجصاص، باب

تحريم الخمر ج: ۲ ص: ۳۱۳، ۳۱۴

[۳] بحوالہ بالا۔

اور ابن عباسؓ نے فرمایا: "الْمُخَاطَرَةُ مِنَ الْقَمَارِ" یعنی "مخاطرہ قمار میں سے ہے" (بصا ص)۔ ابن سیرینؒ نے فرمایا: جس کام میں مخاطرہ ہو وہ میسر میں داخل ہے۔ (روح البیان) ^۲

"مخاطرہ" کے معنی ہیں کہ ایسا معاملہ کیا جائے جو نفع و ضرر کے درمیان دائر ہو، یعنی یہ بھی احتمال ہو کہ بہت سامان مل جائے اور یہ بھی کہ کچھ نہ ملے، جیسے آج کل کی لٹری کے مختلف طریقوں میں پایا جاتا ہے، یہ سب قسمیں قمار اور میسر میں داخل اور حرام ہیں، اس لئے میسر یا قمار کی تعریف یہ ہے کہ جس معاملہ میں کسی مال کا مالک بنانے کو ایسی شرط پر موقوف رکھا جائے جس کے وجود و عدم کی دونوں جانبیں مساوی ہوں، اور اسی بنا پر نفع خالص یا تاوان خالص برداشت کرنے کی دونوں جانبیں بھی برابر ہوں (شامی، کتاب الحظر والإباحة ج: ۵ ص: ۳۵۵)۔ مثلاً یہ بھی احتمال ہے کہ زید پر تاوان پڑ جائے، اور یہ بھی ہے کہ عمر پر پڑ جائے، اس کی جتنی قسمیں اور صورتیں پہلے زمانے میں رائج تھیں یا آج رائج ہیں یا آئندہ پیدا ہوں، وہ سب میسر اور قمار اور جو اکھلائے گا، معمر حل کرنے کا چلتا ہوا کاروبار اور تجارتی لٹری کی عام صورتیں سب اس میں داخل ہیں، ہاں اگر صرف ایک جانب سے انعام مقرر کیا جائے کہ جو شخص فلاں کام کرے گا اس کو یہ انعام ملے گا، اس میں مضائقہ نہیں، بشرطیکہ اس شخص سے کوئی فیس وصول نہ کی جائے، کیونکہ اس میں معاملہ نفع و ضرر کے درمیان دائر نہیں، بلکہ نفع اور عدم نفع کے درمیان دائر ہے۔

اسی لئے احادیث صحیحہ میں شطرنج اور چوسرو وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا ہے، جن میں مال کی ہارجیت پائی جاتی ہے، تاش پراگر و پیہ کی ہارجیت ہو تو وہ بھی میسر میں داخل ہے۔

صحیح مسلم میں بروایت بریدہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص زرد شیر (چوسر) کھیلتا ہے وہ گویا خنزیر کے گوشت اور خون میں اپنے ہاتھ رنگتا ہے۔ ^۳ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ شطرنج میسر یعنی جوے میں داخل ہے، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا: شطرنج تو زرد شیر سے بھی زیادہ بری ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

ابتدائے اسلام میں شراب کی طرح قمار بھی حلال تھا، مکہ میں جب سورہ روم کی آیات: غُلِبَتِ الرُّومُ ﴿۱﴾ نازل ہوئیں، اور قرآن نے خبر دی کہ اس وقت روم اگرچہ اپنے حریف کسریٰ سے مغلوب ہو گئے، لیکن چند سال بعد پھر رومی غالب آجائیں گے، اور مشرکین مکہ نے اس کا انکار کیا تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ان سے اسی طرح قمار کی شرط ٹھہرائی کہ اگر اتنے سال میں رومی غالب آگئے تو اتنا مال تمہیں دینا پڑے گا، یہ شرط مان لی گئی، اور واقعہ قرآن کی خبر کے مطابق پیش

۱ احکام القرآن للجصاص ج: ۱ ص: ۳۲۹

۲ تفسیر روح البیان ج: ۱ ص: ۲۳۰

۳ صحیح مسلم، کتاب الشعر، باب تحریم اللعاب بالنرد شیر ج: ۲ ص: ۲۳۰

آیا، تو ابوبکرؓ نے یہ مال وصول کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے، آپ نے اس واقعہ پر اظہارِ مسرت فرمایا مگر مال کو صدقہ کرنے کا حکم دے دیا۔

کیونکہ جو چیز آئندہ حرام ہونے والی تھی اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حلال ہونے کے زمانے میں بھی اس سے محفوظ فرمادیا تھا، اسی لئے شراب اور قمار سے ہمیشہ آپ نے اجتناب کیا، اور خاص خاص صحابہ کرامؓ بھی ان چیزوں سے ہمیشہ محفوظ رہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جبریل امین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جعفر طیارؓ کی چار خصلتیں زیادہ محبوب ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ سے پوچھا کہ آپ میں وہ چار خصلتیں کیا ہیں؟ عرض کیا کہ میں نے اس کا اظہار اب تک کسی سے نہیں کیا تھا، مگر جبکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے خبر دے دی ہے تو عرض کرتا ہوں کہ وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ میں نے دیکھا کہ شراب عقل کو زائل کر دیتی ہے، اس لئے میں کبھی اس کے پاس نہیں گیا، اور میں نے بتوں کو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں کسی کا نفع و ضرر نہیں، اس لئے جاہلیت میں بھی کبھی بت پرستی نہیں کی، اور مجھے چونکہ اپنی بیوی اور لڑکیوں کے معاملہ میں سخت غیرت ہے، اس لئے میں نے کبھی زنا نہیں کیا، اور میں نے دیکھا کہ جھوٹ بولنا دناست اور ذالت کی بات ہے اس لئے کبھی جہالت میں بھی جھوٹ نہیں بولا۔ (روح البیان) ^[۱]

قمار کے سماجی اور اجتماعی نقصانات

قمار یعنی جوئے کے متعلق بھی قرآن کریم نے وہی ارشاد فرمایا جو شراب کے متعلق آیا ہے، کہ اس میں کچھ منافع بھی ہیں، مگر نفع سے اس کا نقصان و ضرر بڑھا ہوا ہے، اس کے منافع کو تو ہر شخص جانتا ہے کہ جیت جائے تو بیٹھے بیٹھے ایک فقیر بد حال آدمی ایک ہی دن میں مال دار و سرمایہ دار بن سکتا ہے، مگر اس کی معاشی، اجتماعی، سماجی اور روحانی خرابیاں اور مفساد بہت کم لوگ جانتے ہیں، اس کا اجمالی بیان یہ ہے کہ جوئے کا کھیل سارا اس پر دائر ہے کہ ایک شخص کا نفع دوسرے کے ضرر پر موقوف ہے، جیتنے والے کا نفع ہی نفع، ہارنے والے کے نقصان ہی نقصان کا نتیجہ ہوتا ہے، کیونکہ اس کا روبرو سے کوئی دولت بڑھتی نہیں وہ اسی طرح منجمد حالت میں رہتی ہے، اس کھیل کے ذریعے ایک کی دولت سلب ہو کر دوسرے کے پاس پہنچ جاتی ہے، اس لئے قمار مجموعی حیثیت سے قوم کی تباہی اور انسانی اخلاق کی موت ہے، کہ جس انسان کو نفع رسانی خلق اور ایثار و ہمدردی کا پیکر ہونا چاہئے، وہ ایک خونخوار درندہ کی خاصیت اختیار کر لے کہ دوسرے بھائی کی موت میں اپنی زندگی، اس کی مصیبت میں اپنی راحت، اس کے نقصان میں اپنا نفع سمجھنے لگے، اور اپنی پوری قابلیت اس خود غرضی پر صرف کرے،

بخلاف تجارت اور بیع و شراء کی جائز صورتوں کے، ان میں طرفین کا فائدہ ہوتا ہے، اور بذریعہ تجارت اموال کے تبادلہ سے دولت بڑھتی ہے، اور خریدنے والا اور بیچنے والا دونوں اس کا فائدہ محسوس کرتے ہیں۔

ایک بھاری نقصان جوے میں یہ ہے کہ اس کا عادی اصل کمائی اور کسب سے عادتاً محروم ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کی خواہش یہی رہتی ہے کہ بیٹھے بٹھائے ایک شرط لگا کر دوسرے کا مال چند منٹ میں حاصل کرے، جس میں نہ کوئی محنت ہے نہ مشقت۔ بعض حضرات نے جوے کا نام ”میسر“ رکھنے کی یہ وجہ بھی بیان کی ہے کہ اس کے ذریعہ آسانی سے دوسرے کا مال اپنا بن جاتا ہے، جوے کا معاملہ اگر دو چار آدمیوں کے درمیان دائر ہو تو اس میں بھی مذکورہ مضرتیں بالکل نمایاں نظر آتی ہیں، لیکن اس نئے دور میں جس کو بعض سطحی نظروالے انسان عاقبت نااندیشی سے ترقی کا دور کہتے ہیں، جیسے شراب کی نئی نئی قسمیں اور نئے نام رکھ لئے گئے، سود کی نئی نئی قسمیں اور نئے نئے اجتماعی طریقے ”بینکنگ“ کے نام سے ایجاد کر لئے گئے ہیں، اسی طرح قمار اور جوے کی بھی ہزاروں قسمیں چل گئیں، جن میں بہت سی قسمیں ایسی اجتماعی ہیں کہ قوم کا تھوڑا تھوڑا روپیہ جمع ہوتا ہے، اور جو نقصان ہوتا ہے وہ ان سب پر تقسیم ہو کر نمایاں نہیں رہتا، اور جس کو یہ رقم ملتی ہے اس کا فائدہ نمایاں ہوتا ہے، اس لئے بہت سے لوگ اس کے شخصی نفع کو دیکھتے ہیں، لیکن قوم کے اجتماعی نقصان پر دھیان نہیں دیتے، اس لئے ان کا خیال ان نئی قسموں کے جواز کی طرف چلا جاتا ہے، حالانکہ اس میں وہ سب مضرتیں موجود ہیں جو دو چار آدمیوں کے جوے میں پائی جاتی ہیں، اور ایک حیثیت سے اس کا ضرر اس قدیم قسم کے قمار سے بہت زیادہ اور اس کے خراب اثرات دُور رس اور پوری قوم کی بربادی کا سامان ہیں، کیونکہ اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ ملت کے عام افراد کی دولت گھٹتی جائے گی اور چند سرمایہ داروں کے سرمایہ میں مزید اضافہ ہوتا رہے گا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری قوم کی دولت سمٹ کر محدود افراد اور محدود خاندانوں میں مرکوز ہو جائے گی، جس کا مشاہدہ سٹہ بازار اور قمار کی دوسری قسموں میں روزمرہ ہوتا رہتا ہے، اور اسلامی معاشیات کا اہم اصول یہ ہے کہ ہر ایسے معاملے کو حرام قرار دیا جس کے ذریعے دولت پوری ملت سے سمٹ کر چند سرمایہ داروں کے حوالے ہو سکے، قرآن کریم نے اس کا اعلان خود تقسیم دولت کا اصول بیان کرتے ہوئے اس طرح فرما دیا ہے: **كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً لِّبَيْنِ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ** (الحشر: ۷) یعنی مالِ فئے کی تقسیم مختلف طبقوں میں کرنے کا جو اصول قرآن نے مقرر کیا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ دولت سمٹ کر صرف سرمایہ داروں میں جمع نہ ہو جائے۔

قمار یعنی جوے کی خرابی یہ بھی ہے کہ شراب کی طرح قمار بھی آپس میں لڑائی جھگڑے اور فتنہ و فساد کا سبب ہوتا ہے، ہارنے والے کو طبعی طور پر جیت جانے والے سے نفرت اور عداوت پیدا ہوتی ہے، اور یہ تمدن و معاشرت کے لئے سخت مہلک چیز ہے، اسی لئے قرآن حکیم نے خاص طور پر اس مفسدہ کو ذکر فرمایا ہے:-

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخُبْرِ وَالْيُسْرِ وَيَصَدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ
وَعَنِ الصَّلَاةِ (المائدة: ۹۱)

”شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے آپس میں عداوت اور بغض و نفرت پیدا کر دے اور تم کو اللہ کے ذکر اور نماز سے روک دے۔“

اسی طرح قمار کا ایک لازمی اثر یہ ہے کہ شراب کی طرح آدمی اس میں مست ہو کر ذکر اللہ اور نماز سے غافل ہو جاتا ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے شراب اور قمار کو ایک ہی جگہ ایک انداز سے ذکر فرمایا ہے کہ معنوی طور پر قمار کا بھی ایک نشہ ہوتا ہے جو آدمی کو اس کے بھلے برے کی فکر سے غافل کر دیتا ہے، مذکورہ آیات میں بھی ان دونوں چیزوں کو جمع کر کے دونوں کے یہ مفسد ذکر فرمائے ہیں کہ وہ آپس کی عداوت و بغض کا سبب بنتی ہے، اور ذکر اللہ اور نماز سے مانع بن جاتی ہیں۔

قمار کی ایک اصولی خرابی یہ بھی ہے کہ یہ باطل طریقہ پر دوسرے لوگوں کا مال ہضم کرنے کا ایک طریق ہے، کہ بغیر کسی معقول معاوضہ کے دوسرے بھائی کا مال لے لیا جاتا ہے، اسی کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں منع فرمایا ہے:-
وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (البقرة: ۱۸۸) ”لوگوں کے مال باطل طریقے پر مت کھاؤ۔“

قمار میں ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ دفعۃً بہت سے گھر برباد ہو جاتے ہیں، لکھ پتی آدمی فقیر بن جاتا ہے، جس سے صرف یہی شخص متاثر نہیں ہوتا، جس نے جرم قمار کا ارتکاب کیا ہے، بلکہ اس کا پورا گھرانہ اور خاندان مصیبت میں پڑ جاتا ہے، اور اگر غور کیا جائے تو پوری قوم اس سے متاثر ہوتی ہے، کیونکہ جن لوگوں نے اس کی مالی ساکھ کو دیکھ کر اس سے معاہدے اور معاملات کئے ہوئے ہیں یا قرض دیئے ہوئے ہیں، وہ اب دیوالیہ ہو جائے گا تو ان سب پر اس کی بربادی کا اثر پڑنا لازمی ہے۔

قمار میں ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ اس سے انسان کی قوت عمل سست ہو کر وہی منافع پر لگ جاتی ہے، اور وہ بجائے اس کے کہ اپنے ہاتھ یا دماغ کی محنت سے کوئی دولت بڑھاتا رہے، اُس کی فکر اس بات میں محصور ہو کر رہ جاتی ہے کہ کسی طرح دوسرے کی کمائی پر اپنا قبضہ جنمائے۔

یہ مختصر فہرست ہے قمار کے مفسد کی جن سے نہ صرف اس جرم کا مرتکب متاثر ہوتا ہے بلکہ اس کے سب متعلقین، اہل و عیال اور پوری قوم متاثر ہوتی ہے، اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا: **وَالْتُهُمَا كَبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا** یعنی ”شراب و قمار کے مفسدان کے نفع سے زیادہ ہیں۔“

چند فقہی ضابطے اور فوائد

اس آیت میں شراب اور قمار کے بعض فوائد کو تسلیم کرتے ہوئے اُن سے رُکنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، جس سے ایک اہم نتیجہ یہ نکل آیا کہ کسی چیز یا کسی کام میں کچھ دُنیوی منافع ہونا اس کے منافی نہیں ہے کہ اس کو شرعاً حرام قرار دیا جائے، کیونکہ جس طرح محسوسات میں اُس دوا اور غذا کو مضر کہا جاتا ہے جس کی مضرتیں بہ نسبت اُس کے فائدے کے زیادہ سخت ہوں، ورنہ یوں تو دُنیا کی کوئی بری سے بری چیز بھی منافع سے خالی نہیں، زہر قاتل میں، سانپ اور بچھو میں، درندوں میں کتنے فوائد ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے اُن کو مضر کہا جاتا ہے، اور ان کے پاس جانے سے بچنے کی ہدایت کی جاتی ہے، اسی طرح معنوی اعتبار سے جن کاموں کے مفاسد ان کے منافع سے زائد ہوں شرعاً ان کو حرام کر دیا جاتا ہے، چوری، ڈاکہ، زنا، اغواء، دھوکہ، فریب وغیرہ تمام جرائم میں کونسا جرم ایسا ہے جس میں کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ اگر یہ بالکل بے فائدہ ہوتے تو کوئی عقل و ہوش والا انسان اُن کے پاس نہ جاتا، حالانکہ ان سب جرائم میں کامل وہی لوگ ہوتے ہیں جو ہوشیاری، عقل مندی میں معروف سمجھے جاتے ہیں، اس سے ہی معلوم ہوا کہ فوائد تو کچھ نہ کچھ تمام جرائم میں ہیں، مگر چونکہ ان کی مضرت فائدہ سے بڑھی ہوئی ہے، اس لئے کوئی عقل مند انسان اُن کو مفید اور جائز نہیں کہتا، شریعتِ اسلام نے شراب اور جوئے کو اسی اصول کے تحت حرام قرار دیا ہے کہ اس کے فوائد سے زیادہ مفاسد اور دینی و دُنیوی مضرتیں ہیں۔

ایک اور فقہی ضابطہ

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جلبِ منفعت سے دفعِ مضرت مقدم ہے، یعنی ایک کام کے ذریعے کچھ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے اور ساتھ ہی کوئی مضرت بھی پہنچتی ہے، تو مضرت سے بچنے کے لئے اس منفعت کو چھوڑ دینا ہی ضروری ہوتا ہے، ایسی منفعت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جو مضرت کے ساتھ حاصل ہو۔

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ ۚ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ

اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ کہہ دے: جو کچھ بچے اپنے خرچ سے، اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تمہارے واسطے حکم

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۱۹﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ ۖ قُلِ

تاکہ تم فکر کرو، دُنیا و آخرت کی باتوں میں۔ اور تجھ سے پوچھتے ہیں یتیموں کا حکم، کہہ دے:

إِصْلَاحٌ لَهُمْ خَيْرٌ^ط وَإِنْ تَخَالَطَوْهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ^ط وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ

سنوارنا ان کے کام کا بہتر ہے اور اگر ان کا خرچ ملا تو وہ تمہارے بھائی ہیں، اور اللہ جانتا ہے خرابی کرنے والے

مِنَ الْمُصْلِحِ^ط وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَعْنَتَكُمْ^ط إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ^{۲۲۰}

اور سنوارنے والے کو، اور اگر اللہ چاہتا تو تم پر مشقت ڈالتا بے شک اللہ زبردست ہے تدبیر والا۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّى يُؤْمِنُوا^ط وَلَا مَؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ

اور نکاح مت کرو مشرک عورتوں سے جب تک ایمان نہ لے آئیں اور البتہ لونڈی مسلمان بہتر ہے مشرک بی بی سے

وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ^ج وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّى يُؤْمِنُوا^ط وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ

اگرچہ وہ تم کو بھلی لگے، اور نکاح نہ کرو مشرکین سے جب تک وہ ایمان نہ لے آویں اور البتہ غلام مسلمان

خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ^ج وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ^ط أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ^ج وَاللَّهُ يَدْعُو

بہتر ہے مشرک سے، اگرچہ وہ تم کو بھلا لگے، وہ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف اور اللہ بلاتا ہے

إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ^ج وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ^ع

جنت کی طرف اور بخشش کی طرف اپنے حکم سے، اور بتلاتا ہے اپنے حکم لوگوں کو تاکہ وہ نصیحت قبول کریں۔

آسان ترجمہ قرآن

اور لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ (اللہ کی خوشنودی کے لئے) کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجئے کہ ”جو تمہاری ضرورت سے زائد ہو۔“ اللہ اسی طرح اپنے احکام تمہارے لئے صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر سے کام لو (۲۱۹) دنیا کے بارے میں بھی اور آخرت کے بارے میں بھی۔ اور لوگ آپ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ ان کی بھلائی چاہنا نیک کام ہے، اور اگر تم ان کے ساتھ مل جل کر رہو تو (کچھ حرج نہیں کیونکہ) وہ تمہارے بھائی ہی تو

ہیں۔ اور اللہ خوب جانتا ہے کہ کون معاملات بگاڑنے والا ہے اور کون سنوارنے والا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشکل میں ڈال دیتا۔ یقیناً اللہ کا اقتدار بھی کامل ہے، حکمت بھی کامل۔ (۲۲۰) اور مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ یقیناً ایک مؤمن باندی کسی بھی مشرک عورت سے بہتر ہے، خواہ وہ مشرک عورت تمہیں پسند آ رہی ہو۔ اور اپنی عورتوں کا نکاح مشرک مردوں سے نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ اور یقیناً ایک مؤمن غلام کسی بھی مشرک مرد سے بہتر ہے، خواہ وہ مشرک مرد تمہیں پسند آ رہا ہو۔ یہ سب دوزخ کی طرف بلاتے ہیں، جبکہ اللہ اپنے حکم سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے، اور اپنے احکام لوگوں کے سامنے صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ (۲۲۱)

خلاصہ تفسیر

سولہواں حکم :- مقدارِ انفاق

اور لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ (خیر خیرات میں) کتنا خرچ کیا کریں؟ آپ فرمادیتے کہ جتنا آسان ہو (کہ اس کے خرچ کرنے سے خود پریشان ہو کر دُنیوی تکلیف میں یا کسی کا حق ضائع کر کے اُخروی تکلیف میں نہ پڑ جائیں) اللہ تعالیٰ اس طرح احکام کو صاف صاف بیان فرماتے ہیں تاکہ تم (کو ان کا علم ہو جائے اور اس علم کی وجہ سے ہر عمل کرنے سے پہلے) دُنیا و آخرت کے معاملات میں (ان احکام کو) سوچ لیا کرو (اور سوچ کر ہر معاملہ میں اُن احکام کے موافق عمل کیا کرو)۔

سترہواں حکم :- مخالطتِ یتیم

(چونکہ ابتدا میں مثل ہندوستان کے عرب میں بھی یتیموں کا حق دینے میں پوری احتیاط نہ تھی، اس لئے یہ وعید سنائی گئی کہ یتیموں کا مال کھانا ایسا ہے جیسا دوزخ کے انگارے پیٹ میں بھرنا، تو سننے والے ڈر کے مارے اتنی احتیاط کرنے لگے کہ اُن کا کھانا بھی الگ پکواتے اور الگ رکھواتے، اور اتفاقاً اگر بچہ کم کھاتا تو کھانا بچتا اور سڑتا تھا، کیونکہ اس کا استعمال نہ اُن لوگوں کے لئے جائز تھا، اور نہ یتیم کے مال کو صدقہ کر دینے کا اختیار تھا، اس طرح تکلیف بھی ہوتی اور یتیم کا نقصان بھی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا، اس کے متعلق آیت میں یہ ارشاد آیا) اور لوگ آپ سے یتیم بچوں (کے خرچ علیحدہ یا شامل رکھنے) کا حکم پوچھتے ہیں، آپ فرمادیتے کہ (اصل مقصود ہمارا ان کے اموال کھانے کی ممانعت سے یہ ہے کہ ان کی مصلحت کو ضائع نہ کیا جائے، اور جب خرچ شامل رکھنے میں ان کی مصلحت ہے تو) ان کی مصلحت کی رعایت رکھنا (علحدہ خرچ رکھنے سے جو خلافِ مصلحت ہے) زیادہ بہتر ہے اور تم ان کے ساتھ خرچ شامل رکھو تو

(کچھ ڈر کی بات نہیں کیونکہ) وہ (بچے) تمہارے (دینی) بھائی ہیں (اور بھائی بھائی شامل رہا ہی کرتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ مصلحت کے ضائع کرنے والے کو اور مصلحت کی رعایت رکھنے والے کو (الگ الگ) جانتے ہیں (اس لئے کھانے پینے میں اشتراک ایسا نہ ہونا چاہئے جس میں یتیم کی مصلحت ضائع ہو جائے اور بلا علم و بلا قصد کچھ کمی بیشی ہو بھی جائے تو چونکہ اللہ تعالیٰ کو اس کی نیک نیتی معلوم ہے اس لئے اس پر مواخذہ نہ ہوگا) اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو (اس معاملہ میں سخت قانون مقرر کر کے) تم کو مصیبت میں ڈال دیتے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ زبردست ہیں (مگر قانون سہل اس لئے مقرر فرمادیا کہ وہ) حکمت والے (بھی) ہیں (ایسا حکم نہیں دیتے جو نہ ہو سکے)۔

اٹھارواں حکم :- مناکحت کفار

اور نکاح مت کرو کافر عورتوں کے ساتھ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جاویں، اور مسلمان عورت (چاہے) لونڈی (کیوں نہ ہو وہ ہزار درجہ) بہتر ہے کافر عورت سے (چاہے وہ آزاد بی بی ہی کیوں نہ ہو) گو وہ (کافر عورت بوجہ مال یا جمال کے) تم کو اچھی معلوم ہو (مگر پھر بھی واقع میں مسلمان عورت ہی اس سے اچھی ہے) اور (اسی طرح اپنے اختیار کی) عورتوں کو کافر مردوں کے نکاح میں مت دو جب تک وہ مسلمان نہ ہو جاویں، اور مسلمان مرد (چاہے) غلام (ہی کیوں نہ ہو وہ ہزار درجہ) بہتر ہے کافر مرد سے (چاہے وہ آزاد ہی کیوں نہ ہو) گو وہ (کافر مرد بوجہ مال یا جاہ کے) تم کو اچھا ہی معلوم ہو (مگر پھر بھی واقع میں مسلمان ہی اس سے اچھا ہے، اور وجہ ان کافروں کے برا ہونے کی، اور وہی اصل سبب ان سے ممانعت نکاح کا ہے، یہ ہے کہ) یہ (کافر) لوگ دوزخ (میں جانے) کی تحریک دیتے ہیں (کیونکہ کفر کی تحریک کرتے ہیں اور اس کا انجام جہنم ہے) اور اللہ تعالیٰ جنت اور مغفرت (کے حاصل کرنے) کی تحریک کرتے ہیں اپنے حکم سے (اور اس حکم کا ظہور اس طرح ہوا کہ کفار کے متعلق یہ حکم صادر فرمادیا کہ ان سے نکاح نہ کیا جائے، تاکہ اُن کی تحریک کے اثر سے پوری حفاظت رہ سکے، اور اس سے محفوظ رہ کر جنت اور مغفرت حاصل ہو جاوے) اور اللہ تعالیٰ اس واسطے اپنے احکام بتلا دیتے ہیں تاکہ وہ لوگ نصیحت پر عمل کریں (اور مستحق جنت و مغفرت ہو جاویں)۔

فوائد از ”بیان القرآن“

مسئلہ :- جو قوم اپنی وضع اور طرز سے اہل کتاب سمجھے جاتے ہوں، لیکن عقائد کی تحقیق کرنے سے کتابی ثابت نہ ہوں، اس قوم کی عورتوں سے نکاح درست نہیں، جیسے آج کل عموماً انگریزوں کو عام لوگ عیسائی سمجھتے ہیں، حالانکہ تحقیق سے اُن کے بعض عقائد بالکل ملحدانہ ثابت ہوئے کہ نہ خدا کے قائل، نہ عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے معتقد، نہ انجیل کی نسبت آسمانی کتاب ہونے کا اعتقاد، سو ایسے لوگ عیسائی نہیں، ایسی جماعت میں کی جو عورت ہو اس سے نکاح درست نہیں، لوگ

بڑی غلطی کرتے ہیں کہ بلا تحقیق یورپ کی عورتیں بیاہ لاتے ہیں۔

مسئلہ:- اس طرح جو مرد ظاہری حالت سے مسلمان سمجھا جائے لیکن عقائد اس کے کفر تک پہنچے ہوں، اس سے مسلمان عورت کا نکاح درست نہیں، اور اگر نکاح ہو جانے کے بعد ایسے عقائد خراب ہو جاویں تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے، جیسے آج کل بہت سے آدمی اپنے مذہب سے ناواقف سائنس کے اثر سے اپنے عقائد تباہ کر لیتے ہیں، لڑکی والوں پر واجب ہے کہ پیام آنے کے وقت اول عقائد کی تحقیق کر لیا کریں تب زبان دیں۔

معارف مسائل

مسلم و کافر کا باہمی ازدواج ممنوع ہے

آیات مذکورہ میں ایک اہم مسئلہ یہ بیان فرمایا گیا کہ مسلمان مردوں کا نکاح کافر عورتوں سے، اور کافر مردوں کا نکاح مسلمان عورتوں سے جائز نہیں، وجہ یہ ہے کہ کافر مرد اور عورتیں انسان کو جہنم کی طرف لے جانے کا سبب بنتے ہیں، کیونکہ ازدواجی تعلقات، آپس کی محبت و مودت اور یگانگت کو چاہتے ہیں، اور بغیر اس کے ان تعلقات کا اصلی مقصد پورا نہیں ہوتا، اور مشرکین کے ساتھ اس قسم کے تعلقات قریبہ محبت و مودت کا لازمی اثر یہ ہے کہ اُن کے دل میں بھی کفر و شرک کی طرف میلان پیدا ہو، یا کم از کم کفر و شرک سے نفرت اُن کے دلوں سے نکل جائے، اور اس کا انجام یہ ہے کہ یہ بھی کفر و شرک میں مبتلا ہو جائیں، اور اس کا نتیجہ جہنم ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ یہ لوگ جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ انسان کو جنت اور مغفرت کی طرف دعوت دیتا ہے، اور صاف صاف اپنے احکام بیان فرما دیتا ہے، تاکہ لوگ نصیحت پر عمل کریں۔ اس جگہ چند باتیں قابل غور ہیں:-

اول یہ کہ اس آیت میں لفظ مشرک سے اگر مطلقاً غیر مسلم مراد ہوں تو قرآن کریم کی ایک دوسری آیت کی بنا پر اہل کتاب کی غیر مسلم عورتیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے: **وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ (المائدة: ۵)** اور اگر مشرک سے خاص وہ غیر مسلم مراد ہیں جو اہل کتاب نہیں تو یہ آیت اپنی جگہ عام ہے تمام اُن غیر مسلموں کو جو کسی پیغمبر اور آسمانی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ مسلم و کافر کے درمیان ازدواجی تعلقات کو حرام قرار دینے کی جو وجہ قرآن کریم میں بیان فرمائی گئی ہے کہ ان کے ساتھ ایسے تعلقات قریبہ کفر و شرک میں مبتلا ہو جانے کا سبب بن سکتے ہیں، یہ بات تو بظاہر تمام غیر مسلم قوموں میں مساوی ہے، پھر اہل کتاب کی عورتوں کو مستثنیٰ کرنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب ظاہر ہے کہ اہل کتاب کا اختلاف اسلام کے ساتھ بہ نسبت دوسرے غیر مسلموں کے کم اور ہلکا ہے، کیونکہ عقائد اسلام کے تین عمود ہیں: توحید، آخرت، رسالت۔ ان میں سے عقیدہ آخرت میں تو اہل کتاب یہود و نصاریٰ بھی اپنے اصل مذہب کے اعتبار سے مسلمانوں کے ساتھ متفق ہیں، اسی طرح خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا خود ان کے اصل مذہب میں بھی کفر ہے، یہ دوسری بات ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت و محبت کے غلو میں شرک تک جا پہنچے۔

اب بنیادی اختلاف صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول نہیں مانتے، اور اسلام میں یہ عقیدہ بھی بنیادی عقیدہ ہے، اس کے بغیر کوئی انسان مؤمن نہیں ہو سکتا۔ بہر حال دوسرے غیر مسلم فرقوں کی نسبت سے اہل کتاب کا اختلاف ہلکا اور کم ہے، اس لئے اس میں مفسدہ کا خطرہ زیادہ نہیں۔

تیسری بات قابل غور یہ ہے کہ جب اہل کتاب کا اختلاف ہلکا قرار دے کر ان کی عورتوں سے نکاح مسلمان کا جائز ہوا تو اس کے برعکس مسلمان عورتوں کا نکاح بھی غیر مسلم اہل کتاب سے جائز ہو جانا چاہئے، مگر ذرا غور کرنے سے فرق واضح ہو جاتا ہے کہ عورت کچھ فطرۃً ضعیف ہے، اور پھر شوہر اس پر حاکم اور نگران بنایا گیا ہے، اس کے عقائد و نظریات سے عورت کا متاثر ہو جانا مستبعد نہیں، اس لئے اگر مسلمان عورت غیر مسلم کتابی کے نکاح میں رہے تو اس کے عقائد خراب ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے، بخلاف اس کے کہ غیر مسلم کتابی عورت مسلمان کے نکاح میں رہے تو اس کے خیالات کا اثر شوہر پر پڑنا اصولاً مستبعد ہے، کوئی بے اصول اور افراط کا شکار ہو جائے یہ اس کا اپنا قصور ہے۔

چوتھی بات قابل غور یہ ہے کہ ازدواجی تعلقات میں جو کچھ اثر ہوتا ہے وہ طرفین پر یکساں ہوتا ہے، اس لئے جیسے یہ اندیشہ ہے کہ مسلمان کے عقائد غیر مسلم سے متاثر ہو جائیں اسی طرح یہ بھی تو احتمال ہے کہ معاملہ برعکس ہو، غیر مسلم کے عقائد مسلمان سے متاثر ہوں اور وہ ہی اسلام قبول کر لے تو اس کا مقتضی یہ ہے کہ مسلم و غیر مسلم کے ازدواجی تعلقات کو ممنوع نہ کیا جائے۔

لیکن یہاں حکمت کی بات یہ ہے کہ جب کسی چیز میں ایک نفع کی اُمید بھی ہو اور کسی ضرر کا خطرہ بھی ہو تو عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ ضرر سے بچنے کا اہتمام نفع کی فکر سے زیادہ ضروری ہے، فارسی کا ایک حکیمانہ مقولہ مشہور ہے کہ ”عقل مند تریاق یقین وز ہر بگماں نخورد“ اس لئے اس نفع کی اُمید کو نظر انداز کیا گیا کہ شاید وہ غیر مسلم متاثر ہو کر اسلام قبول کر لے، اہتمام اس کا کیا گیا کہ مسلمان متاثر ہو کر کفر میں مبتلا نہ ہو جائے۔

پانچویں بات قابل غور یہ ہے کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے مسلمان مردوں کو نکاح کی اجازت کے بھی معنی یہ ہیں کہ اگر نکاح کر لیا جائے تو نکاح صحیح ہو جائے گا، اولاد ثابت النسب ہوگی، لیکن روایات حدیث اس پر شاہد ہیں کہ یہ نکاح بھی پسندیدہ نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کو اپنے نکاح کے لئے دین دار صالح عورت تلاش کرنا چاہئے، تاکہ خود اس کے لئے بھی دین میں معین ثابت ہو، اور اس کی اولاد کو بھی دین دار ہونے کا موقع میسر آئے۔ اور جب غیر متدین مسلمان عورت سے نکاح پسند نہیں کیا گیا تو کسی غیر مسلم سے کیسے پسند کیا جاتا، یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جب خبر پہنچی کہ عراق و شام کے مسلمانوں میں کچھ ایسے ازدواج کی کثرت ہونے لگی تو بذریعہ فرمان اُن کو اس سے روک دیا گیا، اور اس پر توجہ دلائی گئی کہ یہ ازدواجی تعلق دیائے بھی مسلم گھرانوں کے لئے خرابی کا سبب ہے، اور سیاست بھی (کتاب الآثار للإمام محمد)۔ اور آج کے غیر مسلم اہل کتاب یہود و نصاریٰ اور ان کے سیاسی مکر و فریب اور سیاسی شادیاں اور مسلم گھرانوں میں داخل ہو کر ان کو اپنی طرف مائل کرنا اور ان کے راز حاصل کرنا وغیرہ جس کا اقرار خود بعض مسیحی مصنفین کی کتابوں میں میجر جنرل اکبر کی کتاب ”حدیث دفاع“ میں اس کی کچھ تفصیلات حوالوں کے ساتھ مذکور ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاروق اعظمؓ کی دُور بین نظریں ان واقعات کو دیکھ رہی تھیں خصوصاً اس زمانہ کے یورپ کے اکثر وہ لوگ جو عیسائی یا یہودی کہلائے جاتے ہیں، اور مردم شماری کے رجسٹروں میں ان کی قومیت عیسائی یا یہودی لکھی جاتی ہے اگر ان کے حالات کی تحقیق کی جائے تو ان میں بکثرت ایسے لوگ ملیں گے جن کو عیسائیت اور یہودیت سے کوئی تعلق نہیں وہ بالکل ملحد بے دین ہیں، نہ عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں نہ انجیل کو، نہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان ہے نہ توراۃ پر، نہ خدا تعالیٰ پر نہ آخرت پر، ظاہر ہے کہ حلتِ نکاح کا قرآنی حکم ایسے لوگوں کو شامل نہیں، ان کی عورتوں سے نکاح قطعاً حرام ہے، ایسے لوگ ظاہر ہے کہ آیت قرآن: وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ (المائدة: ۵) کے استثناء میں داخل نہیں ہوتے، غیر مسلموں کی طرح ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح بھی قطعاً حرام ہے۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى ۖ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ ۖ

اور تجھ سے پوچھتے ہیں حکم حیض کا، کہہ دے: وہ گندگی ہے سو تم الگ رہو عورتوں سے حیض کے وقت

۱ مشکوٰۃ، کتاب النکاح ج ۲: ص ۲۶۷

۲ کتاب الآثار، کتاب النکاح، باب من تزوج اليهودية... إلخ رقم الحديث: ۴۱۵

وَلَا تَقْرَبُوا هُنَّ حَتَّى يَطْهَرْنَ ۚ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ

اور نزدیک نہ ہو ان کے جب تک پاک نہ ہوویں، پھر جب خوب پاک ہو جاویں تو جاؤ ان کے پاس جہاں سے حکم دیا تم کو

اللَّهُ ۖ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴿۳۲۲﴾ نِسَاؤُكُمْ

اللہ نے، بے شک اللہ کو پسند آتے ہیں توبہ کرنے والے اور پسند آتے ہیں گندگی سے بچنے والے۔ تمہاری عورتیں

حَرِّثُ لَكُمْ ۚ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَلَىٰ شَعْبَتُمْ ۚ وَقَدْ مَوْلَا أَنْفُسَكُمْ ۖ وَاتَّقُوا

تمہاری کھیتی ہیں، سو جاؤ اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو، اور آگے کی تدبیر کرو اپنے واسطے اور ڈرتے رہو

اللَّهُ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُّلَقَوُا ۖ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۳۲۳﴾

اللہ سے اور جان رکھو کہ تم کو اس سے ملنا ہے اور خوش خبری سنا ایمان والوں کو۔

آسان ترجمہ قرآن

اور لوگ آپ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ وہ گندگی ہے، لہذا حیض کی حالت میں عورتوں سے الگ رہو، اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں، ان سے قربت (یعنی جماع) نہ کرو۔ ہاں جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس اسی طریقے سے جاؤ جس طرح اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔ بیشک اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی طرف کثرت سے رجوع کریں، اور ان سے محبت کرتا ہے جو خوب پاک صاف رہیں۔ ﴿۳۲۲﴾ تمہاری بیویاں تمہارے لئے کھیتیاں ہیں؛ لہذا اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو جاؤ، اور اپنے لئے (اچھے عمل) آگے بھیجو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور یقین رکھو کہ تم اس سے جا کر ملنے والے ہو۔ اور مومنوں کو خوشخبری سنا دو۔ ﴿۳۲۳﴾

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۱۹:- حیض میں جماع کی حرمت اور پاکی کی شرائط

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ (القولہ) وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۳۲۳﴾ اور لوگ آپ سے حیض (کی حالت میں صحبت وغیرہ

کرنے) کا حکم پوچھتے ہیں، آپ فرمادیجئے کہ وہ (حیض) گندگی کی چیز ہے، تو حالتِ حیض میں عورتوں (کے ساتھ صحبت کرنے) سے علیحدہ رہا کرو اور (اس حالت میں) ان سے قربت مت کرو جب تک وہ (حیض سے) پاک نہ ہو جاویں، پھر جب وہ (عورتیں) اچھی طرح پاک ہو جاویں (کہ ناپاکی کا شک و شبہ نہ رہے) تو ان کے پاس آؤ جاؤ (یعنی ان سے صحبت کرو) جس جگہ سے تم کو خدا تعالیٰ نے اجازت دی ہے (یعنی آگے سے) یقیناً اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہیں تو بہ کرنے والوں سے (مثلاً اتفاقاً بے احتیاطی سے حالتِ حیض میں صحبت کر بیٹھا، پھر متنبہ ہو کر توبہ کر لی) اور محبت رکھتے ہیں پاک صاف رہنے والوں سے (جو حالتِ حیض میں صحبت کرنے سے اور دوسرے منہیات سے بچتے ہیں، اور حالتِ پاکی میں اجازت صحبت کی دینا پھر اس قید سے اجازت دینا کہ آگے کے موقع میں صحبت ہو، اس لئے ہے کہ) تمہاری پیماں تمہارے لئے (بمنزلہ) کھیت (کے) ہیں (جس میں نطفہ بجائے تخم کے، اور بچہ بجائے پیداوار کے ہے) سوائے کھیت میں جس طرف سے چاہو آؤ (اور جس طرح کھیتوں میں اجازت ہے اسی طرح بیبیوں کے پاس پاکی کی حالت میں ہر طرف سے آنے کی اجازت ہے، خواہ کروٹ سے ہو، یا پیچھے سے، یا آگے بیٹھ کر ہو یا اوپر یا نیچے لیٹ کر ہو، یا جس ہیئت سے ہو، مگر آنا ہو ہر حال میں کھیت کے اندر کہ وہ خاص آگے کا موقع ہے، کیونکہ پیچھے کا موقع کھیت کے مشابہ نہیں، اس میں صحبت نہ ہو، اور ان لذات میں ایسے مشغول مت ہو جاؤ کہ آخرت ہی کو بھول جاؤ، بلکہ) آئندہ کے واسطے اپنے لئے کچھ (اعمالِ صالحہ) کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ سے (ہر حال میں) ڈرتے رہو، اور یہ یقین رکھو کہ بے شک تم اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے والے ہو، اور (اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ایسے) ایمان داروں کو (جو نیک کام کریں، خدا سے ڈریں، خدا تعالیٰ کے سامنے جانے کا یقین رکھیں) خوشی کی خبر سنا دیجئے (کہ ان کو آخرت میں ہر طرح کی نعمتیں ملیں گی)۔

وَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ عُرْضَةً لِأَيَّانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَتَّقُوا

اور مت بناؤ اللہ کے نام کو نشانہ اپنی قسمیں کھانے کے لئے کہ سلوک کرنے سے اور پرہیزگاری سے

وَتُصْلِحُوا بَيْنَ النَّاسِ ۖ وَاللّٰهُ سَبِيْعٌ عَلَيْهِمُ ۖ

اور لوگوں میں صلح کرانے سے بچ جاؤ، اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

اور اللہ (کے نام) کو اپنی قسموں میں اس غرض سے استعمال نہ کرو کہ اس کے ذریعے نیکی اور تقویٰ کے کاموں اور

لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرانے سے بچ سکو۔ اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔ (۲۲۱)

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۰ :- نیک کام نہ کرنے کی قسم کی ممانعت

اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کے ذریعے سے ان امور کا حجاب مت بناؤ کہ تم نیکی کے اور تقویٰ کے اور اصلاح فیما بین خلق کے کام کرو (یعنی اللہ کے نام کی یہ قسم نہ کھاؤ کہ ہم یہ نیک کام نہ کریں گے) اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتے جانتے ہیں (تو زبان سنبھال کر بات کرو، اور دل میں برے خیالات مت لاؤ)۔

لَا يَأْخُذُكُمْ اللَّهُ بِاللَّعْنَةِ فِي آيَاتِنَا وَلَكِنْ يُؤْخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ

نہیں پکڑتا تم کو اللہ بیہودہ قسموں پر تمہاری، لیکن پکڑتا ہے تم کو ان قسموں پر جن کا قصد کیا

قُلُوبُكُمْ ۝ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ (۲۲۵)

تمہارے دلوں نے اور اللہ بخشنے والا تحمل کرنے والا ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

اللہ تمہاری لعنوں قسموں پر تمہاری گرفت نہیں کرے گا، البتہ جو قسمیں تم نے اپنے دلوں کے ارادے سے کھائی ہوں گی ان پر گرفت کرے گا۔ اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا بردبار ہے۔ (۲۲۵)

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۱ :- جھوٹی قسمیں کھانے کا حکم

اللہ تعالیٰ تم پر آخرت میں دارو گیر نہ فرماویں گے تمہاری قسموں میں ایسی بیہودہ قسم پر (جس میں بلا قصد جھوٹ بولا

گیا) لیکن داروگیر فرماویں گے اس جھوٹی قسم پر جس میں تمہارے دلوں نے (جھوٹ بولنے کا) ارادہ کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ غفور ہیں (کہ ایسی بیہودہ قسم پر داروگیر نہ فرمائی) حلیم ہیں (کہ قصداً جھوٹی قسم کھانے کی سزا میں آخرت تک کی مہلت دی)۔

لِّلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ ۚ فَإِنْ فَاءُوا فَإِنَّ

جو لوگ قسم کھا لیتے ہیں اپنی عورتوں کے پاس جانے سے اُن کے لئے مہلت ہے چار مہینے کی، پھر اگر باہم مل گئے تو

اللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۚ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَبِيْعٌ عَلِيمٌ ۚ

اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اگر ٹھہرایا چھوڑ دینے کو تو بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

جو لوگ اپنی بیویوں سے ایلاء کرتے ہیں (یعنی ان کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیتے ہیں) ان کے لئے چار مہینے کی مہلت ہے۔ چنانچہ اگر وہ (قسم توڑ کر) رُجوع کر لیں تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ۲۲۶ اور اگر انہوں نے طلاق ہی کی ٹھان لی ہو تو (بھی) اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۲۲۷

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۲ :- ایلاء کا حکم

لِّلَّذِينَ يُؤْلُونَ (الی قولہ) سَبِيْعٌ عَلِيمٌ ۚ (۲۲۷) یعنی جو لوگ (بلا قید مدت یا چار ماہ یا زائد مدت کے لئے) قسم کھا بیٹھتے ہیں اپنی بیویوں کے پاس جانے سے ان کے لئے چار مہینے تک کی مہلت ہے، سو اگر (ان چار مہینے کے اندر) یہ لوگ (اپنی قسم توڑ کر عورت کی طرف) رُجوع کر لیں (تب تو نکاح باقی رہے گا اور) اللہ تعالیٰ (ایسی قسم کو توڑنے کا گناہ کفارہ سے) معاف کر دیں گے (اور چونکہ اب بی بی کے حقوق ادا کرنے لگا اس پر) رحمت فرما دیں گے، اور اگر بالکل چھوڑ ہی دینے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے (اور اس لئے چار ماہ کے اندر قسم توڑ کر رُجوع نہیں کیا) تو (چار ماہ گزرتے ہی قطعی طلاق

پڑ جاویں گی اور) اللہ تعالیٰ (ان کی قسم کو بھی) سنتے ہیں (اور ان کے اس پختہ ارادے کو بھی) جانتے ہیں (اس لئے اس کے متعلق حکم مناسب ارشاد فرمایا)۔

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ ۖ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ

اور طلاق والی عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو تین حیض تک، اور ان کو حلال نہیں کہ

يَكُنَّ مِمَّنْ مَّا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنُنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ

چھارکھیں جو پیدا کیا اللہ نے ان کے پیٹ میں اگر وہ ایمان رکھتی ہیں اللہ پر اور پچھلے دن پر،

وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا ۚ وَلَهُنَّ

اور اُن کے خاوند حق رکھتے ہیں ان کے لوٹالینے کا اس مدت میں اگر چاہیں سلوک سے رہنا، اور عورتوں کا بھی حق ہے

مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۚ

جیسا کہ مردوں کا اُن پر حق ہے دستور کے موافق، اور مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے،

وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۚ

اور اللہ زبردست ہے تدبیر والا۔

آسان ترجمہ قرآن

اور جن عورتوں کو طلاق دے دی گئی ہو وہ تین مرتبہ حیض آنے تک اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں۔ اور اگر وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہوں تو ان کے لئے حلال نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو کچھ (حمل یا حیض) پیدا کیا ہے اسے چھپائیں۔ اور اس مدت میں اگر ان کے شوہر حالات بہتر بنانا چاہیں تو ان کو حق ہے کہ وہ ان عورتوں کو (اپنی زوجیت میں) واپس لے لیں۔ اور ان عورتوں کو معروف طریقے کے مطابق ویسے ہی حقوق حاصل ہیں جیسے (مردوں کو) اُن پر حاصل ہیں۔ ہاں مردوں کو ان پر ایک درجہ فوقیت ہے۔ اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ (۲۲۸)

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۳ و ۲۴ :- مطلقہ کی عدت اور مدت رجعت کا بیان

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ (الی قولہ) اِنْ اَمَّا ذَا الْاِصْلَاحِ اور طلاق دی ہوئی عورتیں (جن میں اتنی صفتیں ہوں، خاوند نے اُن سے صحبت یا خلوت صحیحہ کی ہو، ان کو حیض آتا ہو، آزاد ہوں، یعنی شرعی قاعدہ سے لونڈی نہ ہوں) اپنے آپ کو (نکاح سے) روکے رکھیں تین حیض (ختم ہونے) تک (اس کو ”عدت“ کہتے ہیں) اور ان عورتوں کو یہ بات حلال نہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ ان کے رحم (بچہ دانی) میں پیدا کیا ہو (خواہ حمل ہو یا حیض) اس کو پوشیدہ کریں (کیونکہ اس کے پوشیدہ کرنے سے عدت کا حساب غلط ہو جاوے گا) اگر وہ عورتیں اللہ تعالیٰ پر اور یومِ آخرت پر یقین رکھتی ہیں (بوجہ اس کے کہ اس یقین کا مقتضی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈریں کہ قیامت میں نافرمانی پر سزا نہ ہو جاوے) اور ان عورتوں کے شوہر (جبکہ اُن کو طلاقِ رجعی ملی ہو جس کا بیان آگے آئے گا) ان کے (بلا تجدید نکاح) پھر لوٹا لینے کا حق رکھتے ہیں اس عدت کے اندر (اور اس لوٹا لینے کو ”رجعت“ کہتے ہیں) بشرطیکہ (رجعت کرنے سے) اصلاح کا قصد رکھتے ہوں (ورنہ تنگ کرنے کے لئے رجعت کرنا لا حاصل ہے، گور رجعت تو ہو ہی جاوے گی) اور (یہ حکم اصلاح کا اس لئے کیا گیا کہ) عورتوں کے حقوق ہیں (مردوں پر) جو کہ (نفسِ وجوب میں) مثل انہی کے حقوق کے ہیں جو اُن عورتوں پر ہیں (مردوں کے کہ ان کو) قاعدہ (شرعی) کے موافق (ادا کیا جاوے) اور (اتنی بات ضرور ہے کہ) مردوں کا اُن کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے (اس لئے ان کے حقوق کی نوعیت عورتوں کے حقوق کی نوعیت سے بڑھی ہوئی ہے) اور اللہ تعالیٰ زبردست (حاکم) ہیں (اور) حکیم (بھی) ہیں۔

مسائل متعلقہ آیت از ”بیان القرآن“

- ۱- اگر غلبہ شہوت سے حالتِ حیض میں صحبت ہوگئی، تو خوب توبہ کرنا واجب ہے، اور کچھ خیر خیرات بھی دیدے تو زیادہ بہتر ہے۔
- ۲- پیچھے کے موقع میں اپنی بی بی سے بھی صحبت کرنا حرام ہے۔
- ۳- لغو قسم کے دو معنی ہیں، ایک تو یہ کہ کسی گزری ہوئی بات پر جھوٹی قسم بلا ارادہ نکل گئی، یا نکلی تو ارادے سے، مگر اس کو اپنے گمان میں صحیح سمجھتا ہے، جیسے اپنے علم و گمان کے مطابق قسم کھا بیٹھا کہ زید آگیا ہے، اور واقع میں وہ نہ آیا تھا، یا آئندہ بات پر اس طرح قسم نکل گئی کہ کہنا چاہتا تھا کچھ اور بے ارادہ منہ سے قسم نکل گئی، اس میں گناہ نہیں ہوتا، اور اس کو اسی واسطے

”لغو“ کہتے ہیں، آخرت میں اس پر مواخذہ نہیں ہوگا۔ اور اس کے مقابلہ میں جس پر مواخذہ ہونے کا ذکر فرمایا ہے یہ وہ قسم ہے جو قصداً جھوٹی سمجھ کر کھائی ہو، اس کو ”غموس“ کہتے ہیں، اس میں گناہ ہوتا ہے، مگر امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کفارہ نہیں آتا، اور لغو بالمعنی المذکور میں بدرجہ اولیٰ کفارہ نہیں، اس آیت میں انہی دونوں کا بیان ہے، جن میں کفارہ نہیں۔

دوسری معنی ”لغو“ کے یہ ہیں جس پر کفارہ نہ ہو، اور اس کو ”لغو“ اس لئے کہیں گے کہ مواخذہ دنیوی یعنی کفارہ اس پر نہیں آتا، اس معنی کے لحاظ سے لفظ ”لغو“، ”غموس“ کو بھی شامل ہے، کہ اس میں اگرچہ گناہ ہوتا ہے لیکن کفارہ نہیں آتا، اس کے مقابلہ میں وہ قسم جس پر کفارہ بھی آتا ہے ”منعقدہ“ کہلاتی ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ قصداً یوں قسم کھائے کہ میں فلاں فعل کروں گا، یا فلاں کام نہ کروں گا، اس میں خلاف کرنے سے کفارہ لازم آتا ہے۔

۴- اگر کوئی قسم کھالے کہ اپنی بیوی سے صحبت نہ کروں گا، اس کی چار صورتیں ہیں:-

ایک یہ کہ کوئی مدت معین نہ کرے، دوم یہ کہ چار مہینے کی مدت کی قید لگا دے، سوم یہ کہ چار ماہ سے زیادہ کی مدت کی قید لگا دے، چہارم یہ کہ چار ماہ سے کم کی مدت کا نام لے۔ پس صورت اول، دوم اور سوم کو شرع میں ”ایلاء“ کہتے ہیں، اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر چار ماہ کے اندر اپنی قسم توڑ ڈالے اور بیوی کے پاس چلا آوے تو قسم کا کفارہ دے اور نکاح باقی ہے، اور اگر چار ماہ گزر گئے اور قسم نہ توڑی، تو اس عورت پر قطعی طلاق پڑ گئی، یعنی بلا نکاح رجوع کرنا درست نہیں رہا، البتہ اگر دونوں رضامندی سے پھر نکاح کر لیں تو درست ہے، حلالہ کی ضرورت نہ ہوگی، اور چوتھی صورت کا حکم یہ ہے کہ اگر قسم توڑے تو کفارہ لازم ہوگا، اور اگر قسم پوری کر لی جب بھی نکاح باقی ہے۔ (بیان القرآن)

معارف و مسائل

مرد و عورت کے فرق اور میاں بیوی کے باہمی حقوق و درجات پر ایک جامع آیت

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ الْآیۃ، یہ آیت عورتوں اور مردوں کے باہمی حقوق و فرائض اور ان کے درجات کے بیان میں ایک شرعی ضابطہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد کئی رُکوع تک اسی ضابطہ کی اہم جزئیات کا بیان ہوا ہے۔

اسلام میں عورت کا موقف

اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے عورت کے اس موقف کی کچھ تشریح کر دی جائے جو اسلام نے اس کو عطا کیا

ہے، جس کو سمجھ لینے کے بعد یقینی طور پر اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ایک عادلانہ اور معتدلانہ نظام کا مقتضی یہی تھا، اور یہی وہ مقام ہے جس سے اُونچ نیچ یا انحراف انسان کے دین و دنیا کے لئے عظیم خطرہ بن جاتا ہے۔

غور کیا جائے تو دُنیا میں دو چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو اس عالم کی بقا اور تعمیر و ترقی میں عمود کا درجہ رکھتی ہیں، ایک عورت، دوسرے دولت، لیکن تصویر کا دوسرا رخ دیکھا جائے تو یہی دونوں چیزیں دُنیا میں فساد و خوں ریزی اور طرح طرح کے فتنوں کا سبب بھی ہیں، اور غور کرنے سے اس نتیجے پر پہنچنا کچھ دشوار نہیں کہ یہ دونوں چیزیں اپنی اصل میں دُنیا کی تعمیر و ترقی اور اس کی رونق کا ذریعہ ہیں، لیکن جب کہیں ان کو اپنے اصلی مقام اور موقف سے ادھر ادھر کر دیا جاتا ہے تو یہی چیزیں دُنیا میں سب سے بڑا زلزلہ بھی بن جاتی ہیں۔

قرآن نے انسان کو نظام زندگی دیا ہے، اس میں ان دونوں چیزوں کو اپنے اپنے صحیح مقام پر ایسا رکھا گیا ہے کہ اُن کے فوائد و ثمرات زیادہ سے زیادہ حاصل ہوں، اور فتنہ و فساد کا نام نہ رہے۔ دولت کا صحیح مقام، اس کے حاصل کرنے کے ذرائع اور خرچ کرنے کے طریقے اور تقسیم دولت کا عادلانہ نظام یہ ایک مستقل علم ہے جس کو ”اسلام کا معاشی نظام“ کہا جاسکتا ہے، اس کا بیان ان شاء اللہ کسی اور موقع پر ہوگا، احقر کا مطبوعہ رسالہ ”تقسیم دولت“ بھی ضروری اشارات کا کام دے سکتا ہے۔

اس وقت عورت اور اس کے حقوق و فرائض کا ذکر ہے، اس کے متعلق آیت مذکورہ میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جس طرح عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں جن کی ادائیگی ضروری ہے، اسی طرح مردوں پر عورتوں کے حقوق ہیں جن کا ادا کرنا ضروری ہے، ہاں اتنا فرق ضروری ہے کہ مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے، اور تقریباً یہی مضمون سورہ نساء کی آیت میں اس طرح آیا ہے:-

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِأَنفُقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ^ط (النساء: ۳۴)
 ”یعنی مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس واسطے کہ بڑائی اللہ نے دی ایک کو ایک پر، اور اس واسطے کہ خرچ کئے انہوں نے اپنے مال۔“

اسلام سے پہلے معاشرہ میں عورت کا درجہ

اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں تمام دُنیا کی اقوام میں جاری تھا کہ عورت کی حیثیت گھریلو استعمال کی اشیاء سے زیادہ نہ تھی، چوپاؤں کی طرح اس کی خرید و فروخت ہوتی تھی، اس کو اپنی شادی بیاہ میں کسی قسم کا کوئی اختیار نہ تھا، اس کے اولیاء جس کے حوالے کر دیتے وہاں جانا پڑتا تھا، عورت کو اپنے رشتہ داروں کی میراث میں کوئی حصہ نہ ملتا تھا، بلکہ وہ خود

گھریلو اشیاء کی طرح مال وراثت سمجھی جاتی تھی، وہ مردوں کی ملکیت تصور کی جاتی تھی، اس کی ملکیت کسی چیز پر نہ تھی، اور جو چیزیں عورت کی ملکیت کہلاتی تھیں ان میں اس کو مرد کی اجازت کے بغیر کسی قسم کے تصرف کا کوئی اختیار نہ تھا، ہاں اس کے شوہر کو ہر قسم کا اختیار تھا کہ اس کے مال کو جہاں چاہے اور جس طرح چاہے خرچ کر ڈالے، اس کو پوچھنے کا بھی کوئی حق نہ تھا، یہاں تک کہ یورپ کے وہ ممالک جو آج کل دنیا کے سب سے زیادہ متمدن ملک سمجھے جاتے ہیں ان میں بعض لوگ اس حد کو پہنچے ہوئے تھے کہ عورت کے انسان ہونے کو بھی تسلیم نہ کرتے تھے۔

عورت کے لئے دین و مذہب میں بھی کوئی حصہ نہ تھا، نہ اس کو عبادت کے قابل سمجھا جاتا تھا نہ جنت کے، روم کی بعض مجلسوں میں باہمی مشورہ سے یہ طے کیا گیا تھا کہ وہ ایک ناپاک جانور ہے جس میں رُوح نہیں، عام طور پر باپ کے لئے لڑکی کا قتل بلکہ زندہ درگور کر دینا جائز سمجھا جاتا تھا، بلکہ یہ عمل باپ کے لئے عزت کی نشانی اور شرافت کا معیار تصور کیا جاتا تھا، بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ عورت کو کوئی بھی قتل کر دے نہ تو اس پر قصاص واجب ہے نہ خون بہا، اور اگر شوہر مر جائے تو بیوی کو بھی اس کی لاش کے ساتھ جلا کر سستی کر دیا جاتا تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بعد اور آپ کی نبوت سے پہلے ۵۸۶ء میں فرانس نے عورت پر یہ احسان کیا کہ بہت سے اختلافات کے بعد یہ قرارداد پاس کی کہ عورت ہے تو انسان مگر وہ صرف مرد کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

الغرض پوری دنیا اور اس میں بسنے والے تمام اقوام و مذاہب نے عورت کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہوا تھا کہ جس کو سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس بیچاری مخلوق کے لئے نہ کہیں عقل و دانش سے کام لیا جاتا تھا، نہ عدل و انصاف سے۔

قربان جائیے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لائے ہوئے دین حق کے جس نے دنیا کی آنکھیں کھولیں، انسان کو انسان کی قدر کرنا سکھلایا، عدل و انصاف کا قانون جاری کیا، عورتوں کے حقوق مردوں پر ایسے ہی لازم کئے جیسے عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں، اس کو آزاد و خود مختار بنایا، وہ اپنی جان و مال کی ایسی ہی مالک قرار دی گئی جیسے مرد، کوئی شخص خواہ باپ دادا ہی ہو، بالغ عورت کو کسی شخص کے ساتھ نکاح پر مجبور نہیں کر سکتا، اور اگر بلا اس کی اجازت کے نکاح کر دیا جائے تو وہ اس کی اجازت پر موقوف رہتا ہے، اگر نا منظور کر دے تو باطل ہو جاتا ہے، اس کے اموال میں کسی مرد کو بغیر اس کی رضا و اجازت کے کسی تصرف کا کوئی حق نہیں، شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد وہ خود مختار ہے کوئی اس پر جبر نہیں کر سکتا، اپنے رشتہ داروں کی میراث میں اس کو بھی ایسا ہی حصہ ملتا ہے جیسا لڑکوں کو، اس پر خرچ کرنے اور اس کے راضی رکھنے کو شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے ایک عبادت قرار دیا، شوہر اس کے حقوق واجبہ ادا نہ کرے تو وہ اسلامی عدالت کے ذریعہ اس کو ادائے حقوق پر، ورنہ طلاق پر مجبور کر سکتی ہے۔

عورتوں کو مردوں کی سیادت اور نگرانی سے بالکل آزاد کر دینا بھی فسادِ عالم کا بہت بڑا سبب ہے

عورت کو اس کے حقوق مناسبت نہ دینا ظلم و جور اور قساوت و شقاوت تھی جس کو اسلام نے مٹایا ہے، اسی طرح ان کو کھلے مہار چھوڑ دینا اور مردوں کی نگرانی و سیادت سے آزاد کر دینا، اس کو اپنے گزارے اور معاش کا خود متکفل بنانا بھی اس کی حق تلفی اور بربادی ہے، نہ اس کی ساخت اس کی متحمل ہے اور نہ گھریلو کاموں کی ذمہ داری اور اولاد کی تربیت کا عظیم الشان کام جو فطرۃً اس کے سپرد ہے وہ اس کا متحمل ہے۔

علاوہ ازیں مردوں کی سیادت و نگرانی سے نکل کر عورت پورے انسانی معاشرہ کے لئے خطرۂ عظیم ہے، جس سے دُنیا میں فساد و خون ریزی اور طرح طرح کے فتنے پیدا ہونا لازمی اور روزمرہ کا مشاہدہ ہے، اس لئے قرآن کریم نے عورتوں کے حقوق واجبہ کے بیان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ **وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ** یعنی مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے، اور دوسرے لفظوں میں یہ کہ مردان کے نگران اور ذمہ دار ہیں۔

مگر جس طرح اسلام سے پہلے جاہلیتِ اولیٰ میں اقوامِ عالم سب اس غلطی کا شکار تھیں کہ عورتوں کو ایک گھریلو سامان یا چوپایہ کی حیثیت میں رکھا ہوا تھا، اسی طرح اسلام کے زمانہ انحطاط میں جاہلیتِ آخری کا دور شروع ہوا، اس میں پہلی غلطی کا ردِ عمل اس کے بالمقابل دوسری غلطی کی صورت میں کیا جا رہا ہے، کہ عورتوں پر مردوں کی اتنی سیادت سے بھی چھٹکارا حاصل کرنے اور کرانے کی سعی مسلسل جاری ہے، جس کے نتیجے میں فحش و بے حیائی عام ہو گئی، دُنیا جھگڑوں اور فساد کا گھر بن گئی، قتل و خون ریزی کی اتنی کثرت ہو گئی کہ جاہلیتِ اولیٰ کو مات دے دی، عرب کا مشہور مقولہ ہے: **”الْجَاهِلُ اِمَّا مُفْرِطٌ اَوْ مُفَرِّطٌ“** (یعنی جاہل آدمی کبھی اعتدال پر نہیں رہتا، اگر افراط یعنی حد سے زیادہ کرنے سے باز آ جاتا ہے تو کوتاہی اور تقصیر میں مبتلا ہو جاتا ہے)۔

یہی حال اس وقت ابنائے زمانہ کا ہے کہ یا تو عورت کو انسان کہنے اور سمجھنے کے لئے بھی تیار نہ تھے، اور آگے بڑھے تو یہاں تک پہنچے کہ مردوں کی سیادت و نگرانی جو مردوں، عورتوں اور پوری دُنیا کے لئے عین حکمت و مصلحت ہے اس کا جو ابھی گردن سے اتارا جا رہا ہے، جس کے نتائج بدروزانہ آنکھوں کے سامنے آرہے ہیں، اور یقین کیجئے کہ جب تک وہ قرآن کے اُس ارشاد کے سامنے نہ جھکیں گے ایسے فتنے روز بڑھتے رہیں گے۔

آج کی حکومتیں دُنیا میں قیامِ امن کے لئے روز نئے نئے قانون بناتی ہیں، اس کے لئے نئے نئے ادارے قائم کرتی ہیں، کروڑوں روپیہ اُن پر صرف ہوتا ہے، لیکن فتنے جس چشمے سے پھوٹ رہے ہیں اس کی طرف دھیان نہیں

دیتیں، اگر آج کوئی کمیشن اس تحقیق کے لئے بٹھایا جائے کہ فساد و خون ریزی اور باہمی جنگ و جدل کے اسباب کی تحقیق کرے تو خیال یہ ہے کہ پچاس فی صد سے زائد ایسے جرائم کا سبب عورت اور اس کی بے مہار آزادی نکلتی گی، مگر آج کی دُنیا میں نفس پرستی کے غلبے نے بڑے بڑے حکماء کی آنکھوں کو خیرہ کیا ہوا ہے، خواہشاتِ نفسانی کے خلاف کسی مصلحانہ قدغن کو گوارا نہیں کیا جاتا۔

اللہ تعالیٰ ہمارے قلوب کو نورِ ایمان سے منور فرمائیں اور اپنی کتاب اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات پر پورا عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں کہ وہی دُنیا و آخرت میں سرمایہٴ سعادت ہے۔

مسئلہ:- اس آیت کے ضمن میں یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن حکیم نے زوجین کو اُن کے ذمہ عائد ہونے والے فرائض بتلائے کہ مردوں کے ذمہ عورتوں کے حقوق ادا کرنا ایسا ہی فرض ہے جیسے کہ عورتوں پر مردوں کے حقوق کا ادا کرنا فرض ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ ہر فریق کو اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے کے بجائے اپنے فرائض پر نظر رکھنا چاہئے، اور اگر وہ ایسا کر لیں تو مطالبہٴ حقوق کا قضیہ ہی درمیان میں نہیں آئے گا، کیونکہ مرد کے فرائض ادا ہو گئے تو خود بخود حقوق ادا ہو جائیں گے، آج کل دُنیا کے سارے جھگڑے یہاں سے چلتے ہیں کہ ہر شخص اپنے حقوق کا مطالبہ تو سامنے رکھتا ہے مگر اپنے فرائض کی ادائیگی سے غافل ہے۔

اس کا نتیجہ مطالبہٴ حقوق کی جنگ ہوتی ہے جو آج کل عام طور پر حکومتوں اور عوام میں، زوجین میں، اور دوسرے اہل معاملہ میں چلی ہوئی ہے۔ قرآن کریم کے اس اشارہ نے معاملہ کے رُخ کو یوں بدلا ہے کہ ہر شخص کو چاہئے کہ اپنے فرائض پورا کرنے کا اہتمام کرے، اور اپنے حقوق کے معاملہ میں مسابقت اور عفو و درگزر سے کام لے، اگر اس قرآنی تعلیم پر دُنیا میں عمل ہونے لگے تو گھروں اور خاندانوں کے بلکہ ملکوں اور حکومتوں کے بیشتر نزاعات ختم ہو جائیں۔

مرد و عورت میں درجہ کا تفوق دُنیوی معاملات میں ہے، آخرت کی فضیلت میں اس کا کوئی اثر نہیں

دُنیا میں نظامِ عالم اور انسانی فطرت اور خود عورتوں کی مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ مردوں کو عورتوں پر ایک قسم کی حاکمیت اور نگرانی کا نہ صرف حق دیا جائے بلکہ اُن پر لازم کیا جائے، اسی کا بیان آیت: اَلرِّجَالُ قَوُّمُونَ عَلَى النِّسَاءِ (النساء: ۳۴) میں آیا ہے، لیکن اس سے سب مردوں کا سب عورتوں سے افضل ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ فضیلت عند اللہ کا تمام تر مدارِ ایمان اور عملِ صالح پر ہے، وہاں درجات کی ترقی و تنزلِ ایمان اور عمل کے مطابق ہوتا ہے، اس لئے اُمورِ آخرت میں یہ ضروری نہیں کہ مردوں ہی کا درجہ عورتوں سے بلند رہے، یہ بھی ہو سکتا ہے اور حسبِ تصریح آیات

وروايات ایسا ہوگا بھی کہ بعض عورتیں اپنی طاعت و عبادت کے ذریعہ بہت سے مردوں پر فائق ہو جائیں گی، اُن کا درجہ بہت سے مردوں سے بڑھ جائے گا۔

قرآن مجید میں احکام شرعیہ اور اعمال کی جزا و سزا اور ثواب و عذاب کے بیان میں اگرچہ حسب تصریح قرآن کریم عورتیں اور مرد بالکل برابر ہیں، اور جن احکام میں کچھ فرق ہے، ان کو مستقل طور پر وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، لیکن عام طور پر خطاب مردوں کو کیا گیا ہے، اور صیغہ مذکر کے استعمال کئے گئے ہیں، اور یہ بات صرف قرآن کریم کے ساتھ مخصوص نہیں، عام طور پر حکومتوں کے قوانین میں بھی صیغہ مذکر کے استعمال کئے جاتے ہیں، حالانکہ قانون مرد و عورت کے لئے عام ہوتا ہے، اس کا ایک سبب تو وہی فرق ہے جس کا ذکر قرآن کریم کی آیات میں مذکور ہوا ہے، کہ مردوں کو عورتوں پر ایک حیثیت سے تفوق حاصل ہے۔

دوسری بات شاید یہ بھی مضمّن ہو کہ مستورات کے ذکر کے لئے بھی ستر ہی بہتر ہے، لیکن قرآن کریم میں جا بجا مردوں کی طرح عورتوں کا ذکر نہ ہونے سے اُن کو خیال پیدا ہوا تو اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا اظہار کیا تو سورہ احزاب کی یہ آیت نازل ہو گئی: **إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَنِينَ وَالْقَنَاتِ** (الاحزاب: ۳۵) جس میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا مستقل ذکر واضح کر دیا گیا کہ طاعت و عبادت اور اس کی وجہ سے حق تعالیٰ کے قرب و رضا اور درجاتِ جنت میں عورتوں کا درجہ مردوں سے کچھ کم نہیں۔ (یہ روایت نسائی، مسند احمد اور تفسیر ابن جریر وغیرہ میں مفصل مذکور ہے) [۱]

اور تفسیر ابن کثیر میں ایک روایت یہ ہے کہ بعض مسلمان عورتیں ازواجِ مطہرات کے پاس آئیں اور کہا کہ قرآن کریم میں جا بجا مردوں کا تو ذکر ہے، عورتوں میں سے ازواجِ مطہرات کا بھی مستقل تذکرہ ہے مگر عام مسلمان عورتوں کا ذکر نہیں، اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ [۲]

خلاصہ یہ ہے کہ دنیوی نظام میں عورتوں پر مردوں کا ایک گونہ تفوق اور حاکمیت ان کی مصلحت اور حکمت کا تقاضا ہے، ورنہ نیک و بد عمل کی جزا و سزا اور درجات کا آخرت میں کوئی فرق نہیں۔

قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ یہی مضمون اور بھی وضاحت سے اس طرح مذکور ہے:-

مَنْ عَمِلْ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (النحل: ۹۷)

”یعنی جو مرد و عورت نیک عمل کرے اور وہ مؤمن بھی ہو، تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے۔“

۱ تفسیر ابن جریر ج: ۷ ص: ۴۸۶ فی تفسیر سورۃ آل عمران: ۱۹۵، والسنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۱۱۴۰۴، ومسند احمد رقم الحدیث: ۲۷۳۳۲

۲ تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج: ۶ ص: ۴۱۷

اس تمہید کے بعد اصل آیت کے الفاظ پر غور کیجئے، ارشاد فرمایا: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ یعنی ”ان کے حقوق مردوں کے ذمہ ہیں جیسے کہ اُن کے ذمے مردوں کے حقوق ہیں۔“ اس میں عورتوں کے حقوق کا ذکر مردوں کے حقوق سے پہلے کیا، جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مرد تو اپنی قوت اور خداداد تفوق کی بنا پر عورت سے اپنے حقوق وصول کر رہی لیتا ہے، فکر عورتوں کے حقوق کی ہونی چاہئے کہ وہ عادتاً اپنے حقوق زبردستی وصول نہیں کر سکتیں۔

دوسرا اشارہ اس میں یہ بھی ہے کہ مردوں کو عورت کے حقوق ادا کرنے میں مسابقت کرنا چاہئے، اور یہاں جو لفظ ”مثل“ کے ساتھ دونوں کے حقوق کی مثلیت اور مساوات کا ارشاد ہے اس کا یہ مطلب تو ہو ہی نہیں سکتا کہ جس طرح کے کام مرد کرے اسی طرح کے عورت بھی، یا برعکس کیونکہ مرد و عورت میں تقسیم کار اور ہر ایک کے فرائض فطرۃً جدا جدا ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ دونوں کے حقوق کی ادائیگی یکساں طور پر واجب ہے، اور اس میں کوتاہی اور تقصیر کی سزا بھی یکساں ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ قرآن کریم نے ایک مختصر سے جملے میں ایک عظیم الشان دفترِ حقوق و فرائض کو کیسا سمویا ہے، کیونکہ مفہومِ آیت میں عورتوں کے تمام حقوق مردوں پر، اور مردوں کے تمام حقوق عورتوں پر داخل اور شامل ہیں (بحرِ محیط)، اس جملے کے آخر میں ایک لفظ **بِالْمَعْرُوفِ** اور بڑھا کر آپس میں پیش آنے والے جھگڑوں کا خاتمہ فرما دیا کہ حقوق کی ادائیگی معروف طریقے پر کی جائے، کیونکہ معروف کے معنی یہ ہیں کہ جو شرعاً بھی منکر و ناجائز نہ ہو اور عام عادات اور عرف کے لحاظ سے بھی اس میں کوئی تشدد اور زیادتی نہ ہو، اس کا حاصل یہ ہوا کہ زوجین کے حقوق اور ان کو اذیت سے بچانے کے معاملہ میں خالص ضابطہ پری کافی نہیں، بلکہ عام عرف و عادت کے اعتبار سے دیکھا جائے گا کہ اس معاملہ میں دوسرے کو کوئی ایذا ضرر تو نہیں پہنچتا، جو چیزیں عرف و عادت کے اعتبار سے ایذا اور اضرار کی قرار دی جائیں وہ ممنوع و ناجائز ہوں گی، مثلاً بے رُخی، بے التفاتی یا ایسے افعال اور حرکات جن سے دوسرے کو ایذا پہنچے، یہ چیزیں قانونی دفعات میں تو نہیں آسکتیں، مگر **بِالْمَعْرُوفِ** کے لفظ نے ان کا احاطہ کر لیا۔ اس کے بعد فرمایا: وَلِلرَّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ اس کا مشہور مطلب و مفہوم تو یہی ہے کہ حقوقِ طرفین مساوی ہونے کے باوجود حق تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ کا تفوق اور حاکمیت عطا فرمادی ہے، اور اس میں بڑی حکمتیں ہیں جس کی طرف آخر آیت کے الفاظ **وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ** (۲۲۸) میں اشارہ فرما دیا ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس جملے کا مطلب یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ مردوں کو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے مقابلہ میں بڑا درجہ دیا ہے، اس لئے اُن کو زیادہ تحمل سے کام لینا چاہئے کہ اگر عورتوں کی طرف سے اُن کے حقوق میں کوئی کوتاہی ہو بھی جائے تو اُن کا درجہ یہ ہے کہ یہ اس کو برداشت کریں، اور صبر سے کام لیں، اور ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں۔ (قرطبی)

الطَّلَاقِ مَرَّتَيْنِ ۖ فَاِمْسَاكِ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِیْهِ بِاِحْسَانٍ ط

طلاق رجعی ہے دو بار تک، اس کے بعد رکھ لینا موافق دستور کے یا چھوڑ دینا بھلی طرح سے،

وَلَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا اَتَتْهُنَّ شَیْءًا اِلَّا اَنْ یَّخَافَا

اور تم کو روا نہیں کہ لے لو کچھ اپنا دیا ہوا عورتوں سے مگر جبکہ خاوند عورت دونوں ڈریں اس بات سے

اَلَّا یُقِیْبَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ط فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْبَا حُدُوْدَ اللّٰهِ لَا فَلَ جُنَاحَ

کہ قائم نہ رکھ سکیں گے حکم اللہ کا، پھر اگر تم لوگ ڈرو اس بات سے کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کا حکم تو کچھ گناہ نہیں

عَلَيْهِمَا فَاِذَا فُتِدَتْ بِهٖ ط تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ

دونوں پر اس میں کہ عورت بدلہ دے کر چھوٹ جاوے، یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں، سو ان سے آگے مت بڑھو،

وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ ۝۲۳۹ ۚ فَاِنْ طَلَّقَهَا

اور جو کوئی بڑھ چلے اللہ کی باندھی ہوئی حدوں سے سو وہی لوگ ہیں ظالم۔ پھر اگر اس عورت کو طلاق دی (یعنی تیسری بار)

فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ ط فَاِنْ طَلَّقَهَا

تو اب حلال نہیں اس کو وہ عورت اس کے بعد جب تک کہ نکاح نہ کر لے کسی خاوند سے اس کے سوا، پھر اگر طلاق دیدے دوسرا خاوند

فَلَ جُنَاحَ عَلَیْہِمَا اَنْ یَّتَرَاجَعَا اِنْ ظَنَّا اَنْ یُقِیْبَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ط وَتِلْكَ

تو کچھ گناہ نہیں اُن دونوں پر کہ باہم مل جاویں اگر خیال کریں کہ قائم رکھیں گے اللہ کا حکم، اور یہ

حُدُوْدُ اللّٰهِ یُبَیِّنُهَا الْقَوْمُ یَعْلَمُوْنَ ۝۲۴۰

حدیں باندھی ہوئی ہیں اللہ کی، بیان فرماتا ہے ان کو واسطے جاننے والوں کے۔

آسان ترجمہ قرآن

طلاق (زیادہ سے زیادہ) دوبارہ ہونی چاہئے۔ اس کے بعد (شوہر کے لئے دوہی راستے ہیں) یا تو قاعدے کے مطابق (بیوی کو) روک رکھے (یعنی طلاق سے رجوع کر لے) یا خوش اُسلوبی سے چھوڑ دے (یعنی رجوع کے بغیر عدت گزر جانے دے)۔ اور (اے شوہر!) تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ تم نے ان (بیویوں) کو جو کچھ دیا ہو وہ (طلاق کے بدلے) ان سے واپس لو، الا یہ کہ دونوں کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ وہ (نکاح باقی رہنے کی صورت میں) اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ چنانچہ اگر تمہیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان دونوں کے لئے اس میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ عورت مالی معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کر لے۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود ہیں، لہذا ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ بڑے ظالم لوگ ہیں۔ ۲۲۹ پھر اگر شوہر (تیسری) طلاق دیدے تو وہ (مطلقہ عورت) اس کے لئے اس وقت تک حلال نہیں ہوگی جب تک وہ کسی اور شوہر سے نکاح نہ کرے۔ ہاں اگر وہ (دوسرا شوہر بھی) اسے طلاق دیدے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ایک دوسرے کے پاس (نیا نکاح کر کے) دوبارہ واپس آجائیں، بشرطیکہ انہیں یہ غالب گمان ہو کہ اب وہ اللہ کی حدود کو قائم رکھیں گے۔ اور یہ سب اللہ کی حدود ہیں جو وہ ان لوگوں کے لئے واضح کر رہا ہے جو سمجھ رکھتے ہوں۔ ۲۳۰

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۵ :- طلاقِ رجعی کی تعداد

طلاق دو مرتبہ کی ہے، پھر (دو مرتبہ طلاق دینے کے بعد دو اختیار ہیں) خواہ (یہ کہ رجعت کر کے عورت کو) قاعدہ کے مطابق رکھ لے، خواہ (یہ کہ رجعت نہ کرے، عدت پوری ہونے دے، اور اس طرح) اچھے طریقے سے اس کو چھوڑ دے۔

حکم نمبر ۲۶ :- خُلْع

اور تمہارے لئے یہ بات حلال نہیں کہ (بیویوں کو چھوڑنے کے وقت ان سے) کچھ بھی لو (اگرچہ وہ لیا ہوا) اسی (مال) میں سے (کیوں نہ ہو) جو تم نے (ہی مہر میں) ان کو دیا تھا مگر (ایک صورت البتہ حلال ہے، وہ) یہ کہ (کوئی) میاں بیوی (ایسے ہوں کہ) دونوں کو خطرہ ہو کہ (دوبارہ حقوقِ زوجیت) وہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ ضابطوں کو قائم نہ رکھ

سکیں گے، سوا اگر تم کو (یعنی میاں بیوی کو) یہ خطرہ ہو کہ وہ دونوں ضوابط خداوندی کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہ ہوگا، اس (مال کے لینے دینے) میں جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑائے (بشرطیکہ مہر سے زیادہ نہ ہو) یہ سب احکام خدائی ضابطے ہیں، تم ان سے باہر نہ نکلنا، اور جو شخص خدائی ضابطوں (کو توڑ کر) باہر نکل جائے تو ایسے لوگ اپنا ہی نقصان کرنے والے ہیں۔

حکم نمبر ۲ :- تین طلاقوں کے بعد حلالہ

پھر اگر (دو طلاق کے بعد) کوئی (تیسری) طلاق (بھی) دیدے تو پھر وہ عورت اس (تیسری طلاق دینے) کے بعد اس شخص کے لئے حلال نہ ہوگی جب تک وہ اس خاوند کے سوا دوسرے شخص کے ساتھ (عدت کے بعد) نکاح نہ کرے (اور حقوق زوجیت صحبت کے ادا نہ کرے)، پھر اگر یہ دوسرا خاوند اس کو طلاق دیدے (اور اس کی عدت بھی گزر جائے) تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ دوبارہ (آپس میں نکاح کر کے) بدستور پھر مل جاویں، بشرطیکہ دونوں کو اپنے اوپر یہ اعتماد ہو کہ آئندہ خداوندی ضابطوں کو قائم رکھیں گے، اور یہ خداوندی ضابطے ہیں، حق تعالیٰ ان کو بیان فرماتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے جو دلانش مند ہیں۔

معارف و مسائل

طلاق و نکاح کے احکام پورے قرآن کریم میں بہت سی آیتوں میں آئے ہیں، مگر یہ چند آیتیں جو یہاں مذکور ہیں طلاق کے معاملہ میں اہم ضابطوں کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کو سمجھنے کے لئے پہلے نکاح کی شرعی حیثیت کو جاننا ضروری ہے۔

نکاح و طلاق کی شرعی حیثیت اور حکیمانہ نظام

نکاح کی ایک حیثیت تو ایک باہمی معاملے اور معاہدے کی ہے، جیسے بیع و شراء اور لین دین کے معاملات ہوتے ہیں۔ دوسری حیثیت ایک سنت اور عبادت کی ہے، اس پر تو تمام اُمت کا اتفاق ہے کہ نکاح عام معاملات و معاہدات سے بالاتر ایک حیثیت شرعی عبادت و سنت کی رکھتا ہے، اسی لئے نکاح کے منعقد ہونے کے لئے باجماع اُمت کچھ ایسی شرائط ضروری ہیں جو عام معاملات بیع و شراء میں نہیں ہوتیں۔

اول تو یہ کہ ہر عورت سے اور ہر مرد سے نکاح نہیں ہو سکتا، اس میں شریعت کا ایک مستقل قانون ہے، جس کے تحت بہت سی عورتوں اور مردوں کا آپس میں نکاح نہیں ہو سکتا۔

دوسرے تمام معاملات و معاہدات کے منعقد اور مکمل ہونے کے لئے کوئی گواہی شرط نہیں، گواہی کی ضرورت اس

وقت پڑتی ہے جب فریقین میں اختلاف ہو جائے، لیکن نکاح ایسا معاملہ نہیں، یہاں اس کے منعقد ہونے کے لئے بھی گواہوں کا سامنے ہونا شرط ہے، اگر دو مرد و عورت بغیر گواہوں کے آپس میں نکاح کر لیں، اور دونوں میں کوئی فریق کبھی اختلاف و انکار بھی نہ کرے اس وقت بھی شرعاً وہ نکاح باطل کا عدم ہے جب تک گواہوں کے سامنے دونوں کا ایجاب و قبول نہ ہو، اور سنت یہ ہے کہ نکاح اعلان عام کے ساتھ کیا جائے، اسی طرح کی اور بہت سی شرائط اور آداب ہیں جو معاملہ نکاح کے لئے ضروری یا مسنون ہیں۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ اور بہت سے دوسرے حضرات ائمہ کے نزدیک تو نکاح میں معاملہ اور معاہدہ کی حیثیت سے زیادہ عبادت و سنت کی حیثیت غالب ہے، اور قرآن و سنت کے شواہد اس پر قائم ہیں۔

نکاح کی اجمالی حقیقت معلوم کرنے کے بعد طلاق کو سمجھئے، طلاق کا حاصل نکاح کے معاملے اور معاہدے کو ختم کرنا ہے، جس طرح شریعت اسلام نے نکاح کے معاملے اور معاہدے کو ایک عبادت کی حیثیت دے کر عام معاملات و معاہدات کی سطح سے بلند رکھا ہے اور بہت سی پابندیاں اس پر لگائی ہیں، اسی طرح اس معاملہ کا ختم کرنا بھی عام لین دین کے معاملات کی طرح آزاد نہیں رکھا، کہ جب چاہے جس طرح چاہے اس معاملہ کو فسخ کر دے، اور دوسرے سے معاملہ کر لے، بلکہ اس کے لئے ایک خاص حکیمانہ قانون بنایا ہے، جس کا بیان آیات مذکورہ میں کیا گیا ہے۔

اسلامی تعلیمات کا اصل رُخ یہ ہے کہ نکاح کا معاملہ اور معاہدہ عمر بھر کے لئے ہو، اس کے توڑنے اور ختم کرنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئے، کیونکہ اس معاملہ کے انقطاع کا اثر صرف فریقین پر نہیں پڑتا، نسل و اولاد کی تباہی و بربادی اور بعض اوقات خاندانوں اور قبیلوں میں فساد تک کی نوبت پہنچتی ہے، اور پورا معاشرہ بری طرح اس سے متاثر ہوتا ہے، اسی لئے جو اسباب اور وجوہ اس معاملہ کو توڑنے کا سبب بن سکتے ہیں قرآن و سنت کی تعلیمات نے ان تمام اسباب کو راہ سے ہٹانے کا پورا انتظام کیا ہے، زوجین کے ہر معاملے اور ہر حال کے لئے جو ہدایتیں قرآن و سنت میں مذکور ہیں ان سب کا حاصل یہی ہے کہ یہ رشتہ ہمیشہ زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوتا چلا جائے، ٹوٹنے نہ پائے، ناموافقت کی صورت میں اول افہام و تفہیم کی پھر زجر و تنبیہ کی ہدایتیں دی گئیں، اور اگر بات بڑھ جائے اور اس سے بھی کام نہ چلے تو خاندان ہی کے چند افراد کو حکم اور ثالث بنا کر معاملہ طے کرنے کی تعلیم دی، آیت: **حُكِّمُوا مِنْ أَهْلِهِ وَحُكِّمُوا مِنْ أَهْلِهَا** (النساء: ۳۵) میں خاندان ہی کے افراد کو ثالث بنانے کا ارشاد کس قدر حکیمانہ ہے، کہ اگر معاملہ خاندان سے باہر گیا تو بات بڑھ جانے اور دلوں میں زیادہ بعد پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے۔

لیکن بعض اوقات ایسی صورتیں بھی پیش آتی ہیں کہ اصلاح حال کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں، اور تعلق نکاح کے مطلوبہ ثمرات حاصل ہونے کے بجائے طرفین کا آپس میں مل کر رہنا ایک عذاب بن جاتا ہے، ایسی حالت میں اس

ازدواجی تعلق کا ختم کر دینا ہی طرفین کے لئے راحت اور سلامتی کی راہ ہو جاتی ہے، اس لئے شریعتِ اسلام نے بعض دوسرے مذاہب کی طرح یہ بھی نہیں کیا کہ رشتہ ازدواج ہر حال میں ناقابلِ فسخ ہی رہے، بلکہ طلاق اور فسخِ نکاح کا قانون بنایا، طلاق کا اختیار تو صرف مرد کو دیا، جس میں عادتِ فکر و تدبیر اور تحمل کا مادہ عورت سے زائد ہوتا ہے، عورت کے ہاتھ میں یہ آزاد اختیار نہیں دیا، تاکہ وقتی تاثرات سے مغلوب ہو جانا جو عورت میں بہ نسبت مرد کے زیادہ ہے وہ طلاق کا سبب نہ بن جائے۔

لیکن عورت کو بھی بالکل اس حق سے محروم نہیں رکھا کہ وہ شوہر کے ظلم و ستم سہنے ہی پر مجبور ہو جائے، اس کو یہ حق دیا کہ حاکم شرعی کی عدالت میں اپنا معاملہ پیش کر کے اور شکایات کا ثبوت دے کر نکاح فسخ کر اسکے یا طلاق حاصل کر سکے، پھر مرد کو طلاق کا آزادانہ اختیار تو دے دیا مگر اول تو یہ کہہ دیا کہ اس اختیار کا استعمال کرنا اللہ کے نزدیک بہت مبغوض و مکروہ ہے، صرف مجبوری کی حالت میں اجازت ہے، حدیث میں ارشادِ نبوی ہے:-

أَبْغَضُ الْحَلَائِلِ إِلَى اللَّهِ الطَّلَاقُ^[۱]

”یعنی حلال چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض اور مکروہ اللہ کے نزدیک طلاق ہے۔“

دوسری پابندی یہ لگائی کہ حالتِ غیظ و غضب میں یا کسی وقتی اور ہنگامی ناگواری میں اس اختیار کو استعمال نہ کریں، اسی حکمت کے ماتحت حالتِ حیض میں طلاق دینے کو ممنوع قرار دیا، اور حالتِ طہر میں بھی جس طہر میں صحبت و ہم بستری ہو چکی ہے، اس میں طلاق دینے کو اس بنا پر ممنوع قرار دیا کہ اس کی وجہ سے عورت کی عدت طویل ہو جائے گی، اس کو تکلیف ہوگی، ان دونوں چیزوں کے لئے قرآن کریم کا ارشاد یہ آیا: فَطَلَّقُوهُنَّ إِعْدَتِهِنَّ (الطلاق: ۱) یعنی طلاق دینا ہو تو ایسے وقت میں دو جس میں بلا وجہ عورت کی عدت طویل نہ ہو، حیض کی حالت میں طلاق ہوئی تو موجودہ حیض عدت میں شمار نہ ہوگا، اس کے بعد طہر اور پھر طہر کے بعد حیض سے عدت شمار ہوگی، اور جس طہر میں ہم بستری ہو چکی ہے، اس میں یہ امکان ہے کہ حمل رہ گیا ہو، تو عدت وضع حمل تک طویل ہو جائے گی۔ طلاق دینے کے لئے مذکورہ وقت طہر کا مقرر کرنے میں یہ بھی حکمت ہے کہ اس انتظار کے وقفہ میں بہت ممکن ہے کہ غصہ فرو ہو، معافی تلافی ہو کر طلاق کا ارادہ ہی ختم ہو جائے۔

تیسری پابندی یہ لگائی کہ معاہدہ نکاح توڑنے اور فسخ کرنے کا طریقہ بھی وہ نہیں رکھا جو عام بیع و شراء کے معاملات و معاہدات کا ہے کہ ایک مرتبہ معاہدہ فسخ کر دیا تو اسی وقت اسی منٹ میں فریقین آزاد ہو گئے، اور پہلا معاملہ بالکل ختم ہو گیا، ہر ایک کو اختیار ہو گیا کہ دوسرے سے معاہدہ کر لے، بلکہ معاملہ نکاح کو قطع کرنے کے لئے اول تو اس کے تین درجے تین طلاقوں کی صورت میں رکھے گئے، پھر اس پر عدت کی پابندی لگا دی کہ عدت پوری ہونے تک معاملہ نکاح

کے بہت سے اثرات باقی رہیں گے، عورت کو دوسرا نکاح حلال نہ ہوگا، مرد کے لئے بھی بعض پابندیاں باقی رہیں گی۔ چوتھی پابندی یہ لگائی کہ اگر صاف و صریح لفظوں میں ایک یا دو طلاق دی گئی ہے تو طلاق دیتے ہی نکاح نہیں ٹوٹا، بلکہ رشتہ ازدواج عدت پوری ہونے تک قائم ہے، دورانِ عدت میں اگر یہ اپنی طلاق سے رجوع کر لے تو نکاح سابق بحال ہو جائے گا۔

لیکن یہ رجوع کرنے کا اختیار صرف ایک یا دو طلاق تک محدود کر دیا گیا، تاکہ کوئی ظالم شوہر ایسا نہ کر سکے کہ ہمیشہ طلاق دیتا رہے، پھر رجوع کر کے اپنی قید میں رکھتا رہے، اس لئے حکم یہ دے دیا کہ اگر کسی نے تیسری طلاق بھی دے دی تو اب اس کو رجوع کرنے کا بھی اختیار نہیں، بلکہ اگر دونوں راضی ہو کر آپس میں دوبارہ بھی نکاح کرنا چاہیں تو بغیر ایک مخصوص صورت کے جس کا ذکر آگے آتا ہے، دوبارہ نکاح بھی آپس میں حلال نہیں۔

آیات مذکورہ میں اسی نظام طلاق کے اہم احکام کا ذکر ہے، اب ان آیات کے الفاظ پر غور کیجئے، پہلی آیت میں اول تو ارشاد فرمایا: **الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ** یعنی طلاق دو ہی مرتبہ ہے، پھر ان دونوں مرتبہ کی طلاقیوں میں یہ لچک رکھ دی کہ ان سے نکاح بالکل ختم نہیں ہوا، بلکہ عدت پوری ہونے تک مرد کو اختیار ہے کہ رجوع کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے یا پھر رجوع نہ کرے، عدت پوری ہونے دے، عدت پوری ہونے پر نکاح کا تعلق ختم ہو جائے گا، اسی مضمون کو ان الفاظ میں ارشاد فرمایا: **فَامْسَاكَ بِمَعْرُوفٍ اَوْ نَسْرَيْتَ بِاِحْسَانٍ** یعنی یا تو شرعی قاعدے کے مطابق رجعت کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے، یا پھر خوب صورتی اور خوش معاملگی کے ساتھ اس کی عدت پوری ہونے دے تاکہ وہ آزاد ہو جائے۔

ابھی تیسری طلاق کا ذکر نہیں آیا، درمیان میں ایک اور مسئلہ بیان فرمادیا جو ایسے حالات میں عموماً زیر بحث آجاتا ہے، وہ یہ کہ بعض ظالم شوہر بیوی کو نہ رکھنا چاہتے ہیں، نہ اس کے حقوق کی فکر کرتے ہیں، نہ طلاق دیتے ہیں، بیوی تنگ ہوتی ہے، اس کی مجبوری سے یہ ناجائز فائدہ اٹھا کر طلاق دینے کے لئے اس سے کچھ مال کا یا کم از کم مہر کی معافی یا واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں، قرآن کریم نے اس کو حرام قرار دیا، ارشاد فرمایا: **وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا اَتَيْتُمْوهُنَّ شَيْئًا** یعنی ”تمہارے لئے حلال نہیں کہ طلاق کے معاوضہ میں ان سے اپنا دیا ہوا مال اور مہر وغیرہ واپس لے لو۔“

البتہ ایک صورت اس سے مستثنیٰ فرمادی کہ اس میں مہر کی واپسی یا معافی جائز کر دی، وہ یہ کہ عورت بھی یہ محسوس کرے کہ طبیعتوں میں بعد و مخالفت کی وجہ سے میں شوہر کے حقوق ادا نہیں کر سکتی، اور مرد بھی یہی سمجھے تو ایسی صورت میں یہ بھی جائز ہے کہ مہر کی واپسی یا معافی کے بدلے میں طلاق دی جائے اور لی جائے۔

یہ مسئلہ ضمنی بیان فرمانے کے بعد پھر تیسری طلاق کا ذکر اس طرح فرمایا: **فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدِ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرًا** یعنی اگر اس شخص نے تیسری طلاق بھی دے ڈالی (جو شرعاً پسندیدہ نہ تھی) تو اب نکاح کا معاملہ بالکلیہ ختم ہو گیا،

اس کو رجعت کرنے کا کوئی اختیار نہ رہا، اور چونکہ اس نے شرعی حدود سے تجاوز کیا کہ بلا وجہ تیسری طلاق دے دی تو اس کی سزا یہ ہے کہ اب اگر یہ دونوں راضی ہو کر پھر آپس میں نکاح کرنا چاہیں تو وہ بھی نہیں کر سکتے، اب ان کے آپس میں دوبارہ نکاح کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ عورت (عدت طلاق پوری کر کے) کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے اور حقوق زوجیت ادا کر کے دوسرے شوہر کے ساتھ رہے، پھر اگر اتفاق سے وہ دوسرا شوہر بھی طلاق دیدے (یا مر جائے) تو اس کی عدت پوری کرنے کے بعد پہلے شوہر سے نکاح ہو سکتا ہے، آیت کے آخری جملے **فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا** کا یہی مطلب ہے۔

تین طلاق اور اس کے احکام کی تفصیل

یہاں قرآن کریم کے اُسلوب بیان پر غور کرنے سے یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آ جاتی ہے کہ طلاق دینے کا اصل شرعی طریقہ یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ دو طلاق تک پہنچا جائے، تیسری طلاق تک نوبت پہنچانا مناسب نہیں، الفاظِ آیت: **الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ** کے بعد تیسری طلاق کو حرف ”اِنْ“ کے ساتھ **فَإِنْ طَلَّقَهَا** فرمانے میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے، ورنہ سیدھی تعبیر یہ تھی کہ ”الطَّلَاقُ ثَلَاثٌ“ کہا جاتا، اس کو چھوڑ کر یہ تعبیر اختیار کرنے میں واضح اشارہ ہے کہ تیسری طلاق تک پہنچنا نہیں چاہئے، یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ اور بہت سے فقہاء نے تیسری طلاق کی اجازت ہی نہیں دی، وہ اس کو ”طلاق بدعت“ کہتے ہیں، اور دوسرے فقہاء نے تین طلاق کو صرف اس شرط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے کہ الگ الگ تین طہروں میں تین طلاقیں دی جائیں، ان فقہاء کی اصطلاح میں اس کو بھی ”طلاق سنت“ کے لفظ سے تعبیر کر دیا گیا ہے، مگر اس کا یہ مطلب کسی کے نزدیک نہیں ہے کہ اس طرح تین طلاقیں دینا مسنون اور محبوب ہے، بلکہ طلاق بدعت کے مقابلے میں اس کو طلاق سنت اس معنی سے کہہ دیا گیا کہ یہ صورت بھی بدعت میں داخل نہیں۔

قرآن و سنت کے ارشادات اور تعامل صحابہؓ و تابعینؓ سے عد طلاق کے متعلق جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب طلاق دینے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہے تو طلاق کا احسن طریقہ یہ ہے کہ صرف ایک طلاق حالتِ طہر میں دیدے جس میں مجامعت نہ کی ہو، اور یہ ایک طلاق دے کر چھوڑ دے، عدت ختم ہونے کے ساتھ رشتہ نکاح خود ٹوٹ جائے گا، اس کو فقہاء نے ”طلاق احسن“ کہا ہے، اور حضراتِ صحابہؓ نے اسی کو طلاق کا بہتر طریق قرار دیا ہے۔

ابن ابی شیبہؒ نے اپنے مصنف میں حضرت ابراہیم نخعیؒ سے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرامؓ طلاق دینے میں اس کو پسند کرتے تھے کہ صرف ایک طلاق دے کر چھوڑ دی جائے اور عدت طلاق تین حیض پورے ہونے دیئے جائیں تاکہ عورت آزاد ہو جائے۔^۱

قرآن کریم کے الفاظ مذکورہ سے اس کی بھی اجازت نکلتی ہے کہ دو طلاق تک دے دی جائیں، مگر مَرَّتَيْنِ کے لفظ میں اس طرف اشارہ فرما دیا گیا ہے کہ دو طلاق بیک لفظ و بیک وقت نہ ہوں بلکہ دو طہروں میں الگ الگ ہوں، ”الطَّلَاقُ طَلَا قَان“ سے بھی دو طلاق کی اجازت ثابت ہو سکتی تھی، مگر مَرَّتَيْنِ ایک ترتیب و تراخی کی طرف مشیر ہے، جس سے استفاد ہوتا ہے کہ دو طلاقیں ہوں تو الگ الگ ہوں، مثال سے یوں سمجھئے کہ کوئی شخص کسی کو دو روپیہ ایک دفعہ دیدے تو اس کو دو مرتبہ دینا نہیں کہتے، الفاظ قرآن میں دو مرتبہ دینے کا مقصد یہی ہے کہ الگ الگ طہر میں دو طلاق دی جائیں۔ (روح المعانی)

بہر حال دو طلاقوں تک قرآن حکیم کے الفاظ سے ثابت ہے، اس لئے باتفاق ائمہ و فقہاء یہ طلاق سنت میں داخل ہے، یعنی بدعت نہیں، تیسری طلاق کے غیر مستحسن ہونے کی طرف تو خود اسلوب قرآن میں واضح اشارہ پایا جاتا ہے، اس کے غیر مستحسن ہونے میں کسی کا بھی اختلاف نہیں۔

اور حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے تیسری طلاق کا مبعوض و مکروہ ہونا ثابت ہوتا ہے، امام نسائی نے بروایت محمود بن لبیدؒ نقل کیا ہے کہ:-

أَخْبَرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ رَجُلٍ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ ثَلَاثَ تَطْلِيقَاتٍ جَمِيعًا فَقَامَ غَضْبَانًا ثُمَّ قَالَ: أَيْلَعَبُ بِكِتَابِ اللَّهِ وَأَنَا بَيِّنٌ أَظْهَرُكُمْ، حَتَّى قَامَ رَجُلٌ وَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَلَا أَقْتُلُهُ؟ (نسائی، کتاب الطلاق ج: ۲ ص: ۹۸)

”رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک آدمی کے متعلق خبر دی گئی جس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دی تھیں، آپ غصہ ہو کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا: کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیل کیا جاتا ہے، حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں، اتنے میں ایک آدمی کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! کیا میں اس کو قتل نہ کر دوں؟“

اس حدیث کی اسناد کو حافظ ابن قیمؒ نے صحیح علی شرط مسلم قرار دیا ہے (زاد المعاد)، اور جوہر نقیؒ میں علامہ ماوردیؒ نے اس حدیث کی سند کو صحیح اور ابن کثیرؒ نے اسناد جید، ابن حجرؒ نے رَوَاتُهُ مُوْتَقُونٌ فرمایا ہے۔

اسی بنا پر حضرت امام مالکؒ اور بعض دوسرے ائمہ فقہاء نے تیسری طلاق کو مطلقاً ناجائز اور طلاق بدعت قرار دیا ہے، دوسرے ائمہ نے تین طہروں میں تین طلاقوں کو اگرچہ طلاق سنت میں داخل کہہ کر طلاق بدعت سے نکال دیا ہے، مگر اس کے غیر مستحسن ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔

۱ نسائی کتاب الطلاق، باب الثالث المجموعة وما فيه من التغليظ ج: ۲ ص: ۹۹

۲ یعنی حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث کے راوی قابل اعتماد ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریعتِ اسلام نے جو طلاق کے تین درجے تین طلاقوں کی صورت میں رکھے ہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان تینوں درجوں کو عبور کرنا ضروری یا بہتر ہے، بلکہ منشا شریعت کا تو یہ ہے کہ اول تو طلاق پر اقدام ہی ایک مبغوض و مکروہ فعل ہے، اگر بجبوری اس اقدام کی نوبت آجائے تو اس کے کم سے کم درجے یعنی ایک طلاق پر اکتفا کیا جائے اور عدت گزرنے دیں، تو عدت ختم ہوتے ہی یہی ایک طلاق رشتہ زوجیت قطع کرنے کے لئے کافی ہو جائے گی، اور عورت آزاد ہو کر دوسرے شخص سے نکاح کر سکے گی، یہی طریقہ طلاق احسن کہلاتا ہے، اس طریقے میں یہ حکمت اور فائدہ بھی ہے کہ صریح الفاظ طلاق سے ایک طلاق دینے کی صورت میں طرفین کے لئے مصالحت کی راہیں کھلی رہیں گی، عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے تو صرف طلاق سے رجوع کر لینا بقائے نکاح کے لئے کافی ہوگا، اور عدت ختم ہو جانے کے بعد اگر چہ نکاح ٹوٹ چکے گا اور عورت آزاد ہو جائے گی، مگر پھر بھی یہ گنجائش باقی رہے گی کہ اگر دونوں میں اب مصالحت ہو جائے اور باہم نکاح کرنا چاہیں تو نکاح جدید اسی وقت ہو سکتا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص اس طلاق احسن کے طریقے پر اکتفا نہ کرے، دورانِ عدت میں مزید ایک طلاق صریح اور صاف لفظوں میں دیدے تو اس نے قطع نکاح کے دو درجے طے کر لئے جس کی ضرورت نہ تھی، اور ایسا کرنا شرعاً پسندیدہ بھی نہ تھا، مگر بہر حال دو درجے طے ہو گئے، مگر ان دو درجوں کے طے ہو جانے تک بھی بات وہی رہی کہ دورانِ عدت میں رجعت کا اختیار باقی ہے، اور عدت ختم ہو جانے کے بعد بتراضی طرفین نکاح جدید ہو سکتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ دو طلاق تک پہنچنے میں شوہر نے اپنے اختیارات کی ایک کڑی اور توڑ ڈالی اور اس سرحد پر پہنچ گیا کہ اگر اب ایک مرتبہ بھی طلاق دیدے تو معاملہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔

جس شخص نے یہ دو درجے طلاق کے طے کر لئے اس کے لئے آگے یہ ہدایت دی گئی: **فَامْسَاكَ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٍ بِإِحْسَانٍ** ^ط اس میں **فَامْسَاكَ بِمَعْرُوفٍ** کے لفظوں میں دو حکم بتلائے گئے، اول یہ کہ عدت کے دوران رجعت کر لینا نکاح جدید کا محتاج نہیں، بلکہ صرف امساک یعنی طلاق سے رجعت کر کے روک لینا کافی ہے، اگر ایسا کر لیا تو سابق نکاح ہی کی بنیاد پر تعلق زوجیت بحال ہو جائے گا۔

دوسرے اس میں شوہر کو یہ ہدایت دی گئی کہ اگر اس کا ارادہ اصلاح حال اور صلح وصفائی کے ساتھ زندگی گزارنے کا ہے تب تو رجعت پر اقدام کرے، ورنہ چھوڑ دے کہ عدت گزر کر تعلق زوجیت ختم ہو جائے، ایسا نہ ہو کہ بغیر ارادہ اصلاح کے محض عورت کو پریشان کرنے کے لئے رجعت کرے۔

اس کے بالمقابل **أَوْ تَسْرِيحٍ بِإِحْسَانٍ** ^ط فرمایا، ”تسریح“ کے معنی کھول دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں، اس سے اشارہ کر دیا کہ قطع تعلق کے لئے کسی مزید طلاق یا دوسرے کسی عمل کی ضرورت نہیں، بغیر رجعت کے عدت ختم ہو جانا ہی

تعلقاتِ زوجیت ختم کرنے کے لئے کافی ہے۔

امام حدیث ابوداؤدؒ نے بروایت ابورزین اسدی نقل کیا ہے کہ اس آیت کے نزول پر ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے **الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ** فرمایا، تیسری طلاق کا یہاں کیوں ذکر نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا کہ **تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ** جو بعد میں مذکور ہے وہی تیسری طلاق ہے (روح المعانی)، مطلب اس کا جمہور علماء کے نزدیک یہ ہے کہ جو کام تعلقاتِ زوجیت کے کلی انقطاع کا تیسری طلاق سے ہوتا، وہی کام اس طرزِ عمل سے ہو جائے گا کہ عدت کے اندر رجعت نہ کرے۔ اور جس طرح **فَامْسَاكٌ** کے ساتھ **بَعْدُ** کی قید لگا کر یہ ہدایت فرمادی کہ رجعت کر کے بیوی کو روکا جائے تو حسنِ سلوک کے ساتھ روکا جائے، اسی طرح **تَسْرِيحٌ** کے ساتھ **بِإِحْسَانٍ** کی قید لگا کر یہ ہدایت دے دی کہ طلاق ایک معاملہ کا فسخ ہے، شریف انسان کا کام یہ ہے کہ جس طرح معاملہ اور معاہدہ خوش دلی اور حسنِ سلوک کے ساتھ کیا جاتا ہے، اسی طرح اگر فسخ معاہدہ کی ضرورت پیش آجائے تو اس کو بھی غصہ یا لڑائی جھگڑے کے ساتھ نہ کریں، بلکہ وہ بھی احسان و سلوک کے ساتھ کریں، کہ رخصت کے وقت مطلقہ بیوی کو کچھ تحفہ، کپڑے وغیرہ کا دے کر رخصت کریں، جس کا ذکر قرآن کریم کی دوسری آیت میں ہے:-

وَمِمَّا يُغْنِي عَنْكَ عَلَى الْمُؤْسِعِ قَدْ رَأَى عَلَى الْمُقْتِرِ قَدْ رَأَى (البقرة: ۲۳۶)

”یعنی مطلقہ بیوی کو کچھ جوڑا کپڑے کا دے کر رخصت کریں مالی حیثیت کے مطابق۔“

اور اگر اس نے اس پر بھی ایسا نہ کیا بلکہ تیسری طلاق بھی دے ڈالی، تو اب اس نے اپنے سارے اختیارات شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظر انداز کر کے بلاوجہ اور بلا ضرورت ختم کر دیئے، تو اب اس کی سزا یہ ہے کہ نہ رجعت ہو سکے اور نہ بغیر دوسری شادی کے آپس میں نکاح ہو سکے۔

اگر کسی غیر مستحسن یا غیر مشروع طریقہ سے تین طلاق دے دی تو اس کا اثر کیا ہوگا؟

اس کا جواب عقلی اور عرفی طور پر تو یہی ہے کہ کسی فعل کا جرم و گناہ ہونا اس کے مؤثر ہونے میں کہیں بھی مانع نہیں ہوتا، قتلِ ناحق جرم و گناہ ہے، مگر جس کو گولی یا تلوار مار کر قتل کیا گیا ہے وہ تو قتل ہو ہی جاتا ہے، اس کی موت تو اس کا انتظار نہیں کرتی کہ یہ گولی جائز طریقہ سے ماری گئی ہے یا ناجائز طریقہ سے، چوری کرنا بافتاق مذاہب جرم و گناہ ہے، مگر جو مال اس طرح غائب کر دیا گیا وہ تو ہاتھ سے نکل ہی جاتا ہے، اسی طرح تمام معاصی اور جرائم کا یہی حال ہے کہ ان کا جرم و گناہ ہونا ان کے مؤثر ہونے میں مانع نہیں ہوتا۔

اس اصول کا مقتضی یہی ہے کہ شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظر انداز کرنا اور بلا وجہ اپنے سارے اختیارات طلاق کو ختم کر کے تین طلاق تک پہنچنا اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا سبب ہوا جیسا کہ سابقہ روایت میں لکھا جا چکا ہے، اور اسی لئے جمہور اُمت کے نزدیک یہ فعل غیر مستحسن اور بعض کے نزدیک ناجائز ہے، مگر ان سب باتوں کے باوجود جب کسی نے ایسا اقدام کر لیا تو اس کا وہی اثر ہونا چاہئے جو جائز طلاق کا ہوتا، یعنی تین طلاق واقع ہو جائیں اور رجعت ہی کا اختیار نہیں، نکاح جدید کا اختیار بھی سلب ہو جائے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ اس پر شاہد ہے کہ اظہارِ غضب کے باوجود آپ نے تین طلاقوں کو نافذ فرمایا، جس کے بہت سے واقعات کتب حدیث میں مذکور ہیں، اور جن علماء نے اس مسئلہ پر مستقل کتابیں لکھی ہیں ان میں ان واقعات کو جمع کر دیا ہے، حال میں مولانا ابوالزہد محمد سر فراز خان صاحب کی کتاب ”عمدة الاثاث“ بھی اس مسئلہ پر شائع ہو گئی ہے جو بالکل کافی ہے، یہاں صرف دو تین حدیثیں نقل کی جاتی ہیں۔

محمود بن لبید کی روایت جو بحوالہ نسائی اوپر لکھی گئی ہے، اس میں تین طلاقیں بیک وقت دینے پر انتہائی ناراضگی کا اظہار تو منقول ہے، یہاں تک کہ بعض صحابہؓ نے اس شخص کو مستوجبِ قتل سمجھا، مگر یہ کہیں منقول نہیں کہ آپ نے اس کی طلاق کو ایک رجعی طلاق قرار دے کر بیوی اس کے حوالے کر دی ہو۔

بلکہ دوسری روایت جو آگے آتی ہے جس طرح اس میں اس کی تصریح موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمرؓ کی بیک وقت تین طلاق کو باوجود ناراضی کے نافذ فرمادیا، اسی طرح مذکورہ حدیث محمود بن لبید کے متعلق قاضی ابوبکر بن عربی نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمرؓ کی تین طلاقوں کی طرح اس کی بھی تین طلاقوں کو نافذ فرمادیا تھا، اُن کے الفاظ یہ ہیں:-

فَلَمْ يَرُدَّهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلْ أَمْضَاهُ كَمَا فِي حَدِيثِ عُوَيْمَرَ الْعَجَلَانِيِّ فِي
الْبَعَانِ حَيْثُ أَمْضَى طَلَاقَهُ الثَّلَاثَ وَلَمْ يَرُدَّهُ- (تہذیب سنن ابی داؤد، طبع مصر ج: ۳
ص: ۱۲۹ از عمدة الاثاث)

”تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رد نہیں کیا، بلکہ اُسے نافذ فرمادیا، جیسا کہ عویمر عجلانی کی لعان والی حدیث میں ہے کہ آپ نے اُن کی تین طلاقوں کو نافذ فرمادیا تھا اور رد نہیں کیا تھا۔“
دوسری حدیث صدیقہ عائشہؓ کی صحیح بخاری میں بالفاظ ذیل ہے:-

إِنَّ رَجُلًا طَلَّقَ امْرَأَتَهُ ثَلَاثًا فَتَزَوَّجَتْ فَطَلَّقَ فَسُئِلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَتَحِلُّ

لِلأَوَّلِ؟ قَالَ: لَا، حَتَّى يَذُوقَ عُسَيْلَتَهَا كَمَا ذَاقَهَا الْأَوَّلُ۔ (صحیح بخاری ج: ۲ ص: ۹۱، صحیح مسلم ص: ۳۶۳)

”ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاق دی، اس عورت نے دوسری جگہ نکاح کیا تو اس دوسرے شوہر نے بھی اُسے طلاق دے دی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: کیا یہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، جب تک کہ دوسرا شوہر اس سے ہم بستری کر کے لطف اندوز نہ ہو جائے جس طرح پہلے شوہر نے کیا تھا، اس وقت تک طلاق دینے سے پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں ہوگی۔“

الفاظِ روایت سے ظاہر یہی ہے کہ یہ تینوں طلاق بیک وقت دی گئی تھیں، شروح حدیث فتح الباری، عمدۃ القاری، قسطلانی وغیرہ میں روایت کا مفہوم یہی قرار دیا گیا ہے کہ بیک وقت تین طلاق دی تھیں، اور حدیث میں یہ فیصلہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین طلاق کو نافذ قرار دے کر یہ حکم دیا کہ جب تک شوہر ثانی سے ہم بستری اور صحبت نہ ہو جائے، تو اس کے طلاق دینے سے شوہرِ اول کے لئے حلال نہیں ہوگی۔

تیسری روایت حضرت عویمر عجلانیؓ کی ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی سے لعان کیا، اور اس کے بعد عرض کیا:-

فَلَمَّا فَرَعَا قَالَ عُوَيْمَرُ: كَذَبْتُ عَلَيْهَا يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ أَمْسَكْتُهَا فَطَلَقْتُهَا ثَلَاثًا قَبْلَ أَنْ يَأْمُرَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (صحیح بخاری مع فتح الباری ج: ۹ ص: ۳۰۱، صحیح مسلم ج: ۱ ص: ۲۸۹)

”پس جب وہ دونوں لعان سے فارغ ہو گئے تو عویمرؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں اس پر جھوٹ بولنے والا ہوں گا اگر میں نے اس کو اپنے پاس رکھ لیا، تو عویمر رضی اللہ عنہ نے اس کو تین طلاقیں دے دیں قبل اس کے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں حکم دیتے۔“

اور ابوذرؓ نے اس واقعے کو بروایت حضرت سہل بن سعدؓ نقل کر کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:-

فَأَنفَذَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ مَا صَنَعَ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُنَّةً قَالَ سَعْدُ: حَضَرْتُ هَذَا عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَضَتْ السَّنَةُ بَعْدُ فِي الْمُتَلَاعِنَيْنِ أَنْ يَفْرَقَ بَيْنَهُمَا ثُمَّ لَا يَجْتَمِعَانِ أَبَدًا۔ (ابوداؤد، ص: ۳۰۶ طبع اصح المطابع)

”تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے نافذ فرما دیا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جو

کچھ پیش آیا وہ سنت قرار پایا۔ سعدؓ فرماتے ہیں: اس موقع پر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھا، پس اس کے بعد لعان کرنے والوں کے بارے میں یہ طریقہ رائج ہو گیا کہ اُن کے درمیان فریق کر دی جائے، اور پھر وہ کبھی بھی جمع نہ ہوں۔“

اس حدیث میں پوری وضاحت کے ساتھ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عویمرؓ کی بیک وقت تین طلاق کو تین ہی قرار دے کر نافذ فرمایا ہے۔

اور محمود بن لبید کی سابقہ روایت میں بھی ابوبکر ابن عربی کی روایت کے مطابق تین طلاقوں کو نافذ کرنے کا ذکر موجود ہے، اور بالفرض یہ بھی نہ ہوتا تو یہ کہیں منقول نہیں کہ آپ نے اس کو ایک طلاق رجعی قرار دے کر بیوی اس کے سپرد کر دی ہو۔

الحاصل مذکورہ تینوں احادیث سے یہ ثابت ہو گیا کہ اگرچہ تین طلاق بیک وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سخت ناراضی کا موجب تھیں، مگر بہر حال اثر اُن کا یہی ہوا کہ تینوں طلاقیں واقع قرار دی گئیں۔

حضرت فاروق اعظمؓ کا واقعہ اور اس پر اشکال و جواب

مذکورہ صدر تحریر سے یہ ثابت ہوا کہ بیک وقت تین طلاق کو تین قرار دینا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ تھا، مگر یہاں ایک اشکال حضرت فاروق اعظمؓ کے ایک واقعے سے پیدا ہوتا ہے جو صحیح مسلم اور اکثر کتب حدیث میں منقول ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:-

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: كَانَ الطَّلَاقُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبْنَى بَكْرٍ وَسَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً، فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ: إِنَّ النَّاسَ قَدْ اسْتَعْجَلُوا فِي أَمْرِ كَانَتْ لَهُمْ فِيهِ آثَةٌ فَلَوْ أَمْضَيْنَا عَلَيْهِمْ فَأَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ۔ (صحیح مسلم ج: ۱ ص: ۴۷۷)

”حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں طلاق کا یہ طریقہ تھا کہ تین طلاقوں کو ایک قرار دیا جاتا تھا، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے معاملہ میں جس میں اُن کے لئے مہلت تھی، تو مناسب رہے گا ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں، تو آپ نے اُن پر نافذ کر دیا۔“

فاروقِ اعظمؓ کا یہ اعلان فقہاء صحابہؓ کے مشورہ سے صحابہؓ و تابعینؓ کے مجمع عام میں ہوا، کسی سے اس پر انکار یا تردید منقول نہیں، اسی لئے حافظِ حدیث امام ابن عبدالبر مالکیؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے، زرقانی شرح مؤطا میں یہ الفاظ ہیں :-

وَالْجُمُھُورُ عَلَى وَقُوعِ الثَّلَاثِ بَلْ حَكَى ابْنُ عَبْدِ الْبَرِّ الْإِجْمَاعُ قَائِلًا أَنَّ خِلَافَهُ لَا يُلْتَفَتُ إِلَيْهِ - (زرقانی شرح مؤطا ج: ۳ ص: ۱۶۷)

”اور جمہور اُمت تین طلاقوں کے واقع ہونے پر متفق ہیں، بلکہ ابن عبدالبر نے اس پر اجماع نقل کر کے فرمایا کہ اس کا خلاف شاذ ہے جس کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا۔“
اور شیخ الاسلام نوویؒ نے شرح مسلم میں فرمایا :-

قَالَ الشَّافِعِيُّ وَمَالِكٌ وَأَبُو حَنِيفَةَ وَأَحْمَدُ وَجَمَاهِيرُ الْعُلَمَاءِ مِنَ السَّلَفِ وَالْخَلْفِ يَقَعُ الثَّلَاثُ، وَقَالَ طَاوُوسٌ وَبَعْضُ أَهْلِ الظَّاهِرِ لَا يَقَعُ بِذَلِكَ إِلَّا وَحْدَةً - (شرح مسلم ج: ۱ ص: ۴۷۸)
”امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام احمدؒ اور سلف و خلف کے جمہیر علماء نے فرمایا کہ تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں، اور طاووسؒ اور بعض اہل ظاہر نے کہا کہ اس سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے۔“
امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں فرمایا :-

فَخَاطَبَ عُمَرُ بِذَلِكَ النَّاسَ جَمِيعًا وَفِيهِمْ أَصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ الَّذِينَ قَدْ عَلِمُوا مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَلِكَ فِي زَمَنِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يُنْكِرْ عَلَيْهِ مِنْهُمْ مُنْكَرٌ وَلَمْ يَدْفَعْهُ دَافِعٌ - (شرح معانی الآثار ج: ۲ ص: ۲۹)
”پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے ساتھ لوگوں کو مخاطب فرمایا، اور ان لوگوں میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ صحابہؓ بھی تھے جن کو اس سے پہلے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے طریقے کا علم تھا، تو ان میں سے کسی انکار کرنے والے نے انکار نہیں کیا، اور کسی رد کرنے والے نے اسے رد نہیں کیا۔“

مذکورہ واقعہ میں اگرچہ اُمت کے لئے عمل کی راہ باجماع صحابہؓ و تابعینؓ مقرر ہو گئی کہ تین طلاقیں بیک وقت دینا اگرچہ غیر مستحسن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا سبب ہے، مگر اس کے باوجود جس نے اس غلطی کا ارتکاب کیا اس کی بیوی اس پر حرام ہو جائے گی، اور بغیر دوسرے شخص سے نکاح و طلاق کے اس کے لئے حلال نہ ہوگی۔

لیکن علمی اور نظری طور پر یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں، اول تو یہ کہ سابقہ تحریر میں متعدد روایاتِ حدیث کے

حوالے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تین طلاق بیک وقت دینے والے پر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طلاق کو نافذ فرمایا ہے، اس کو رجعت یا نکاح جدید کی اجازت نہیں دی، پھر اس واقعہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اس کلام کا کیا مطلب ہوگا کہ عہد رسالت میں اور عہد صدیقی میں اور دو سال تک عہد فاروقی میں تین طلاق کو ایک ہی مانا جاتا تھا، فاروق اعظمؓ نے تین طلاق کا فیصلہ فرمایا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر واقعہ اسی طرح تسلیم کر لیا جائے کہ عہد رسالت، عہد صدیقی میں تین طلاق کو ایک مانا جاتا تھا، تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس فیصلہ کو کیسے بدل دیا، اور بالفرض ان سے کوئی غلطی بھی ہو گئی تھی تو تمام صحابہ کرامؓ نے اس کو کیسے تسلیم کر لیا؟

ان دونوں سوالوں کے حضرات فقہاء و محدثین نے مختلف جوابات دیئے ہیں، ان میں صاف اور بے تکلف جواب وہ ہے جس کو امام نوویؒ نے شرح مسلم^[۱] میں ”أَصَحُّ“ کہہ کر نقل کیا ہے، کہ فاروق اعظمؓ کا یہ فرمان اور اس پر صحابہ کرامؓ کا اجماع طلاق ثلاث کی ایک خاص صورت کے متعلق قرار دیا جائے، وہ یہ کہ کوئی شخص تین مرتبہ ”تجھ کو طلاق، تجھ کو طلاق، تجھ کو طلاق“ کہے یا ”میں نے طلاق دی، طلاق دی، طلاق دی“ کہے۔

یہ صورت ایسی ہے کہ اس کے معنی میں دو احتمال ہوتے ہیں، ایک یہ کہ کہنے والے نے تین طلاق دینے کی نیت سے یہ الفاظ کہے ہوں، دوسرے یہ کہ تین مرتبہ محض تاکید کے لئے مکرر کہا ہو، تین طلاق کی نیت نہ ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ نیت کا علم کہنے والے ہی کے اقرار سے ہو سکتا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں صدق و دیانت عام اور غالب تھی، اگر ایسے الفاظ کہنے کے بعد کسی نے یہ بیان کیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی، بلکہ محض تاکید کے لئے یہ الفاظ مکرر بولے تھے، تو آپ اس کے حلفی بیان کی تصدیق فرما دیتے اور اس کو ایک ہی طلاق قرار دیتے تھے۔

اس کی تصدیق حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے، جس میں مذکور ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو لفظ ”البتة“ کے ساتھ طلاق دے دی تھی، یہ لفظ عرب کے عرف عام میں تین طلاق کے لئے بولا جاتا تھا، مگر تین اس کا مفہوم صریح نہیں تھا، اور حضرت رکانہؓ نے کہا کہ میری نیت تو اس لفظ سے تین طلاق کی نہیں تھی، بلکہ ایک طلاق دینے کا قصد تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قسم دی، انہوں نے اس پر حلف کر لیا، تو آپ نے ایک ہی طلاق قرار دے دی۔

یہ حدیث ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی میں مختلف سندوں اور مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہے، بعض الفاظ

۱ ج: ۱ ص: ۴۸

۲ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب بقیہ نسخ المراجعة بعد التطلیقات الثلاث ج: ۱ ص: ۲۹۸، وجامع الترمذی، ابواب الطلاق، باب ما جاء فی

الرجل طلق امرأته البتة ج: ۱ ص: ۲۲۲

میں یہ بھی ہے کہ حضرت رکانہؓ نے اپنی بیوی کو تین طلاق دے دی تھیں مگر ابوداؤد نے ترجیح اس کو دی ہے کہ دراصل رکانہؓ نے لفظ ”البتة“ سے طلاق دی تھی، یہ لفظ چونکہ عام طور پر تین طلاق کے لئے بولا جاتا تھا، اس لئے کسی راوی نے اس کو تین طلاق سے تعبیر کر دیا ہے۔

بہر حال اس حدیث سے یہ بات باتفاق ثابت ہے کہ حضرت رکانہؓ کی طلاق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اُس وقت قرار دیا جبکہ انہوں نے حلف کے ساتھ بیان دیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی، اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے تین طلاق کے الفاظ صریح اور صاف نہیں کہے تھے، ورنہ پھر تین کی نیت نہ کرنے کا کوئی احتمال ہی نہ رہتا، نہ اُن سے سوال کی کوئی ضرورت رہتی۔

اس واقعہ نے یہ بات واضح کر دی کہ جن الفاظ میں یہ احتمال ہو کہ تین کی نیت کی ہے یا ایک ہی کی تاکید کی ہے، اُن میں آپ نے حلفی بیان پر ایک قرار دے دیا، کیونکہ زمانہ صدق و دیانت کا تھا، اس کا احتمال بہت بعید تھا کہ کوئی شخص جھوٹی قسم کھالے۔

صدیق اکبرؓ کے عہد میں اور فاروق اعظمؓ کے ابتدائی عہد میں دو سال تک یہی طریقہ جاری رہا، پھر حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے زمانے میں یہ محسوس کیا کہ اب صدق و دیانت کا معیار گھٹ رہا ہے، اور آئندہ حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق اور گھٹ جائے گا، دوسری طرف ایسے واقعات کی کثرت ہو گئی کہ تین مرتبہ الفاظ طلاق کہنے والے اپنی نیت صرف ایک طلاق کی بیان کرنے لگے، تو یہ محسوس کیا گیا کہ اگر آئندہ اسی طرح طلاق دینے والے کے بیان نیت کی تصدیق کر کے ایک طلاق قرار دی جاتی رہی تو بعید نہیں کہ لوگ شریعت کی دی ہوئی اس سہولت کو بے جا استعمال کرنے لگیں، اور بیوی کو واپس لینے کے لئے جھوٹ کہہ دیں کہ نیت ایک ہی کی تھی، فاروق اعظمؓ کی فراست اور انتظام دین میں دُور بینی کو سبھی صحابہؓ نے دُرست سمجھ کر اتفاق کیا، یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس تھے، انہوں نے سمجھا کہ اگر ہمارے اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہوتے تو یقیناً وہ بھی اب دلوں کی مخفی نیت اور صاحبِ معاملہ کے بیان پر مدار رکھ کر فیصلہ نہ فرماتے، اس لئے قانون یہ بنادیا کہ اب جو شخص تین مرتبہ لفظ طلاق کا تکرار کرے گا اس کی تین ہی طلاقیں قرار دی جائیں گی، اس کی یہ بات نہ سنی جائے گی کہ اس نے نیت صرف ایک طلاق کی تھی۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے مذکور الصدروا قعے میں جو الفاظ منقول ہیں وہ بھی اسی مضمون کی شہادت دیتے ہیں، انہوں نے فرمایا:-

إِنَّ النَّاسَ قَدْ اسْتَعْجَلُوا فِي أَمْرِ كَانَتْ لَهُمْ فِيهِ أَنَاةٌ فَلَوْ أَمْضَيْنَا عَلَيْهِمْ^۱

”لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے معاملہ میں جس میں اُن کے لئے مہلت تھی، تو مناسب رہے گا کہ ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں۔“

حضرت فاروقِ اعظمؓ کے اس فرمان اور اس پر صحابہ کرامؓ کے اجماع کی یہ توجیہ جو بیان کی گئی ہے، اس کی تصدیق روایاتِ حدیث سے بھی ہوتی ہے، اور اس سے ان دونوں سوالوں کا خود بخود حل نکل آتا ہے کہ روایاتِ حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین طلاق کو تین ہی قرار دے کر نافذ کرنا متعدد واقعات سے ثابت ہے، تو حضرت ابن عباسؓ کا یہ فرمانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ عہدِ رسالت میں تین کو ایک ہی مانا جاتا تھا، کیونکہ معلوم ہوا کہ ایسی طلاق جو تین کے لفظ سے دی گئی یا تکرارِ طلاق تین کی نیت سے کیا گیا اس عہدِ رسالت میں بھی تین ہی قرار دی جاتی تھیں، ایک قرار دینے کا تعلق ایسی طلاق سے ہے جس میں ”ثلاث“ کی تصریح نہ ہو، یا تین طلاق دینے کا اقرار نہ ہو، بلکہ تین بطور تاکید کے کہنے کا دعویٰ ہو۔ اور یہ سوال بھی ختم ہو جاتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کو ایک قرار دیا تھا تو فاروقِ اعظمؓ نے اس کی مخالفت کیوں کی، اور صحابہ کرامؓ نے اس سے اتفاق کیسے کر لیا، کیونکہ اس صورت میں فاروقِ اعظمؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی سہولت کے بے جا استعمال سے روکا ہے، معاذ اللہ آپ کے کسی فیصلہ کے خلاف کا یہاں کوئی شائبہ نہیں۔

اس طرح تمام اشکالات رفع ہو گئے، والحمد للہ، اس جگہ مسئلہ طلاقِ ثلاث کی مکمل بحث اور اس کی تفصیلات کا احاطہ مقصود نہیں، وہ شروحِ حدیث میں بہت مفصل ہے، اور بہت سے علماء نے اس کو مفصل رسالوں میں بھی واضح کر دیا ہے، سمجھنے کے لئے اتنا بھی کافی ہے، واللہ الموفق والمعین۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ

اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پہنچیں اپنی عدت کو تو رکھ لو اُن کو موافق دستور کے یا

سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُنْسِكُوهُنَّ ضَرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَنْ

چھوڑ دو اُن کو بھلی طرح سے، اور نہ روکے رکھو ان کو ستانے کے لئے تاکہ اُن پر زیادتی کرو، اور جو

يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۖ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ وَادْكُرُوا

ایسا کرے گا وہ بے شک اپنا ہی نقصان کرے گا، اور مت ٹھہراؤ اللہ کے احکام کو ہنسی، اور یاد کرو

نُعَبِّتُ اللَّهُ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ

اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور اس کو جو اُتاری تم پر کتاب اور علم کی باتیں کہ تم کو نصیحت کرتا

بِهِ^ط وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ^ع وَإِذَا طَلَّقْتُمُ

اس کے ساتھ، اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ اور جب طلاق دی تم نے

النِّسَاءَ فَلْيُغْنِ أَجَلُهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا

عورتوں کو پھر پورا کر چیں اپنی عدت کو تو اب نہ روکو ان کو اس سے کہ نکاح کر لیں اپنے انہی خاوندوں سے جبکہ

تَرَاضُوا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ^ط ذَلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ

راضی ہو جاویں آپس میں موافق دستور کے، یہ نصیحت اس کو کی جاتی ہے جو کہ تم میں سے ایمان رکھتا ہے اللہ پر

وَالْيَوْمِ الْآخِرِ^ط ذَلِكَمُ أَزْكَى لَكُمْ وَأَطْهَرُ^ط وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ^{۳۳۲}

اور قیامت کے دن پر، اس میں تمہارے واسطے بڑی ستھرائی ہے اور بہت پاکیزگی، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

آسان ترجمہ قرآن

اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دے دی ہو، اور وہ اپنی عدت کے قریب پہنچ جائیں، تو یا تو ان کو بھلائی کے ساتھ (اپنی زوجیت میں) روک رکھو، یا انہیں بھلائی کے ساتھ چھوڑ دو۔ اور انہیں ستانے کی خاطر اس لئے روک کر نہ رکھو کہ ان پر ظلم کر سکو۔ اور جو شخص ایسا کرے گا وہ خود اپنی جان پر ظلم کرے گا۔ اور اللہ کی آیتوں کو مذاق مت بناؤ اور اللہ نے تم پر جو انعام فرمایا ہے اُسے، اور تم پر جو کتاب اور حکمت کی باتیں تمہیں نصیحت کرنے کے لئے نازل کی ہیں انہیں یاد رکھو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ (۳۳۱) اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دے دی ہو، اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں، تو (اے میکے والو!) انہیں اس بات سے منع نہ کرو کہ وہ اپنے (پہلے) شوہروں سے (دوبارہ) نکاح کریں، بشرطیکہ وہ بھلائی کے ساتھ ایک دوسرے سے راضی ہو گئے ہوں۔ ان باتوں کی نصیحت تم میں سے ان لوگوں کو کی

جارہی ہے جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہوں۔ یہی تمہارے لئے زیادہ سہرا اور پاکیزہ طریقہ ہے۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ ۳۱

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۲۸ :- عورتوں کو معلق رکھنے کی ممانعت

اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دی ہو، پھر وہ اپنی عدت گزرنے کے قریب پہنچ جائیں تو تم ان کو قاعدہ کے موافق (رجعت کر کے) نکاح میں رہنے دو، یا قاعدے کے موافق ان کو رہائی دو، اور ان کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے مت روکو، اس ارادہ سے کہ اُن پر ظلم کیا جائے، اور جو شخص ایسا برتاؤ کرے گا تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، اور حق تعالیٰ کے احکام کو کھیل نہ بناؤ، اور حق تعالیٰ کی جو تم پر نعمتیں ہیں ان کو یاد کرو، اور خصوصاً کتاب و حکمت کی باتوں کو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر (اس حیثیت سے) نازل فرمائی ہے کہ ان کے ذریعے تم کو نصیحت فرماتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔

حکم نمبر ۲۹ :- عورتوں کو نکاحِ ثانی سے منع کرنے کی ممانعت

اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو اور عورتیں اپنی میعادِ عدت پوری کر چکیں تو تم ان کو اس امر سے مت روکو کہ وہ اپنے (تجویز کئے ہوئے) شوہروں سے نکاح کر لیں، جبکہ باہم سب رضا مند ہو جائیں قاعدہ کے موافق، اس مضمون سے نصیحت کی جاتی ہے اس شخص کو جو تم میں سے اللہ تعالیٰ اور روزِ قیامت پر یقین رکھتا ہو، اس نصیحت کا قبول کرنا تمہارے لئے زیادہ صفائی اور زیادہ پاکی کی بات ہے، اور اللہ تعالیٰ (تمہاری مصلحتوں کو) جانتے ہیں تم نہیں جانتے۔

معارف و مسائل

ان سے پہلے بھی دو آیتوں میں قانونِ طلاق کی اہم دفعات اور اسلام میں طلاق کا عادلانہ اور معتدلانہ نظام قرآن کریم کے حکیمانہ اسلوب کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے، اب مذکور الصدر دو آیتوں میں چند احکام و مسائل مذکور ہیں۔

احکام طلاق کے بعد رجعت یا انقطاعِ نکاح دونوں کے لئے خاص ہدایات

پہلی آیت میں پہلا مسئلہ یہ ارشاد ہوا ہے کہ جب مطلقہ رجعی عورتوں کی عدت گزرنے کے قریب آئے تو شوہر کو دو

اختیار حاصل ہیں، ایک یہ کہ رجعت کر کے اس کو اپنے نکاح میں رہنے دو، دوسرے یہ کہ رجعت نہ کرے، اور تعلق نکاح ختم کر کے اس کو بالکل آزاد کر دے۔

لیکن دونوں اختیارات کے ساتھ قرآن کریم نے یہ قید لگائی کہ رکھنا ہو تو قاعدہ کے مطابق رکھا جائے، اور چھوڑنا ہو تب بھی شرعی قاعدے کے مطابق چھوڑا جائے، اس میں **بِعَرُوفٍ** کا لفظ دونوں جگہ علیحدہ علیحدہ لا کر اس کی طرف اشارہ فرمادیا ہے کہ رجعت کے لئے بھی کچھ شرائط اور قواعد ہیں اور آزاد کرنے کے لئے بھی، دونوں حالتوں میں سے جس کو بھی اختیار کرے شرعی قاعدے کے موافق کرے، محض وقتی غصے یا جذبات کے ماتحت نہ کرے، دونوں صورتوں کے شرعی قواعد کا کچھ حصہ تو خود قرآن میں بیان کر دیا گیا ہے، باقی تفصیلات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں۔

مثلاً اگر واقعہ طلاق کے بعد مفارقت کے ناگوار عواقب کا خیال کر کے رائے یہ ہو جائے کہ رجعت کر کے نکاح قائم رکھنا ہے، تو اس کے لئے شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ پچھلے غصہ و ناراضی کو دل سے نکال کر حسن معاشرت کے ساتھ زندگی گزارنا اور حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھنا پیش نظر ہو، عورت کو اپنی قید میں رکھ کر ستانا اور تکلیف پہنچانا مقصود نہ ہو، اسی کے لئے آیت متذکرہ میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے گئے: **وَلَا تَسْكُونُ لَهُنَّ صُدْرًا لِّتَعْتَدُوا** یعنی ”عورتوں کو اپنے نکاح میں اس لئے نہ روکو کہ ان پر ظلم کرو۔“

دوسرا قاعدہ رجعت کا یہ ہے جو سورہ طلاق میں ذکر کیا گیا ہے: **وَأَشْهِدُوا ذُوَى عَدْلِ مِّنكُمْ وَاقْبِلُوا الشَّهَادَةَ** اللہ (الطلاق: ۲) ”اور آپس میں سے دو معتبر شخصوں کو گواہ کرلو، پھر اگر گواہی کی حاجت پڑے تو ٹھیک ٹھیک اللہ کے واسطے بلا رو و رعایت گواہی دو۔“

مطلب یہ ہے کہ جب رجعت کا ارادہ کرو تو اس پر دو معتبر مسلمانوں کو گواہ بنا لو، اس میں کئی فائدے ہیں، ایک یہ کہ اگر عورت کی طرف سے رجعت کے خلاف کوئی دعویٰ ہو تو اس گواہی سے کام لیا جاسکے۔ دوسرے خود انسان کو اپنے نفس پر بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہئے، اگر رجعت پر شہادت کا قاعدہ نہ جاری کیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص عدت پوری گزر جانے کے بعد بھی اپنی غرض یا شیطانی اغوا سے یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ میں نے عدت گزرنے سے پہلے رجعت کر لی تھی۔

ان مفاسد کے انسداد کے لئے قرآن نے یہ قاعدہ مقرر فرمادیا کہ رجعت کرو تو اس پر دو معتبر گواہ بنا لو۔ معاملہ کا دوسرا رخ یہ تھا کہ عدت کی مہلت اور غور و فکر کا وقت ملنے کے باوجود دلوں کا انقباض اور ناراضی ختم نہ ہوئی اور قطع تعلق ہی برقرار رکھنا ہے تو اس صورت میں بہت اندیشہ ہوتا ہے کہ دشمنی اور انتقامی جذبے بھرک اٹھیں، جن کا اثر دو شخصوں سے متعدی ہو کر دو خاندانوں تک پہنچ سکتا ہے، اور طرفین کی دنیا و آخرت کے لئے خطرہ بن سکتا ہے، اس کے

انسداد کے لئے مختصر طور پر تو یہی ارشاد فرمایا گیا کہ: **اَوْسِرْ حَوْهْنًا بِمَعْرُوفٍ** یعنی چھوڑنا اور قطع کرنا ہی ہو تو وہ بھی قاعدے کے موافق کریں، اس قاعدہ کی کچھ تفصیلات خود قرآن کریم میں مذکور ہیں، باقی تفصیلات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قولی اور عملی بیان سے ثابت ہیں۔

مثلاً اس سے پہلی آیت میں ارشاد فرمایا: **وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا اَتَيْتُسُوْهُنَّ شَيْئًا** (البقرة: ۲۲۹)، یعنی بلا کسی عذر شرعی کے ایسا نہ کرو کہ عورت سے طلاق کے معاوضہ میں اپنا دیا ہو یا سامان یا مہر واپس لے لو، یا کچھ اور معاوضہ طلب کرو۔ اور اس کے بعد کی ایک آیت میں ارشاد فرمایا: **وَلِلْمُطَلَّقاتِ مِمَّا بَالِهَعْرُوفٍ حَقٌّ عَلَى الْمُتَّقِينَ** (البقرة: ۲۳۱) ”سب طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے کچھ فائدہ پہنچانا قاعدہ کے موافق مقرر ہوا ہے، اُن پر جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔“ فائدہ پہنچانے کی تفسیر، رخصت کے وقت مطلقہ عورت کو کچھ تحفہ نقد یا کم از کم ایک جوڑا کپڑے کا دینا ہے، اس میں طلاق دینے والے شوہر پر مطلقہ بی بی کے کچھ حقوق واجب و لازم کر کے اور کچھ بطور احسان و سلوک کے عائد کر دیئے گئے ہیں، جو بلند اخلاق اور حسن معاشرت کی پاکیزہ تعلیم ہے، اور جس میں اس طرف ہدایت ہے کہ جس طرح نکاح ایک معاملہ اور باہمی معاہدہ تھا، اسی طرح طلاق بھی ایک معاملہ کا ختم کرنا ہے، اس فتح معاملہ کو دشمنی اور جنگ و جدل کا سامان بنانے کی کوئی وجہ نہیں، معاملہ کا انقطاع بھی خوب صورتی اور حسن سلوک کے ساتھ ہونا چاہئے کہ طلاق کے بعد مطلقہ بی بی کو فائدہ پہنچایا جائے۔

اس فائدہ کی تفصیل یہ ہے کہ ایام عدت میں اس کو اپنے گھر میں رہنے دے، اس کا پورا خرچ برداشت کرے، اگر مہر اب تک نہیں دیا ہے اور خلوت ہو چکی تو پورا مہر ادا کرے، اور خلوت سے پہلے ہی طلاق کا واقعہ پیش آ گیا ہے تو آدھا مہر خوش دلی کے ساتھ ادا کرے۔ یہ تو سب حقوق واجبہ ہیں جو طلاق دینے والے کو لازمی طور پر ادا کرنا ہیں، اور مستحب اور افضل یہ بھی ہے کہ مطلقہ بی بی کو رخصت کرنے کے وقت کچھ نقد یا کم از کم ایک جوڑا دے کر رخصت کیا جائے، سبحان اللہ کیا پاکیزہ تعلیم ہے کہ جو چیزیں عرفاً جنگ و جدال اور لڑائی جھگڑے کے اسباب اور خاندانوں کی تباہی تک پہنچانے والی ہیں ان کو دائمی محبت و مسرت میں تبدیل کر دیا گیا۔

ان سب احکام کے بعد ارشاد فرمایا: **وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ** یعنی ”جو شخص ان حدودِ خداوندی کے خلاف کرے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا“ آخرت میں تو ظاہر ہے کہ وہاں ہر ظلم و جور کا انتقام بارگاہِ خداوندی میں لیا جائے گا، اور جب تک مظلوم کا بدلہ ظالم سے نہ لے لیا جائے گا آگے نہ بڑھے گا۔

اور دُنیا میں بھی اگر بصیرت اور تجربہ کے ساتھ غور کیا جائے تو نظر آئے گا کہ کوئی ظالم بظاہر تو مظلوم پر ظلم کر کے اپنا دل ٹھنڈا کر لیتا ہے، لیکن اس کے نتائج بد اس دُنیا میں بھی اس کو اکثر ذلیل و خوار کرتے ہیں، اور وہ سمجھے یا نہ سمجھے اکثر ایسی

آفتوں میں مبتلا ہوتا ہے کہ ظلم کا نتیجہ اس کو دنیا میں بھی کچھ نہ کچھ چکھنا پڑتا ہے، اسی کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا :-

پنداشت ستمگر کہ جفا برما کرد

برگردن وے بماند و برما بگذشت

قرآن کریم کا اُسلوبِ حکیم اور خاص اندازِ بیان ہے کہ وہ قانون کو دنیا کے قوانینِ تعزیرات کی طرح بیان نہیں کرتا، بلکہ مربیانہ انداز میں قانون کا بیان، اس کی حکمت و مصلحت کی وضاحت، اس کے خلاف کرنے میں انسان کی مضرت و نقصان کا ایسا سلسلہ بیان کرتا ہے جس کو دیکھ کر کوئی انسان جو انسانیت کے جامے سے باہر نہ ہو ان جرائم پر اقدام کر ہی نہیں سکتا، ہر قانون کے پیچھے خدا کا خوف و آخرت کا حساب یاد دلایا جاتا ہے۔

نکاح و طلاق کو کھیل نہ بناؤ

دوسرا مسئلہ اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو کھیل نہ بناؤ: وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ كَيْفَ تَكْفُرُونَ؟ (نکاح و طلاق کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو حدود و شرائط مقرر کر دیئے ہیں ان کی خلاف ورزی کرنا۔ اور دوسری تفسیر حضرت ابوالدرداءؓ سے منقول ہے وہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بعض لوگ طلاق دے کر یا غلام آزاد کر کے مکر جاتے اور کہتے تھے کہ میں نے تو ہنسی مذاق میں کہہ دیا تھا، طلاق یا عتاق کی نیت نہیں تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس نے یہ فیصلہ کر دیا کہ طلاق و نکاح کو اگر کسی نے کھیل یا مذاق میں بھی پورا کر دیا تو وہ نافذ ہو جائیں گے، نیت نہ کرنے کا عذر مسموع نہ ہوگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن میں ہنسی کے طور پر کرنا اور واقعی طور پر کرنا دونوں برابر ہیں، ایک طلاق، دوسرے عتاق، تیسرے نکاح۔ (اخرجه ابن مردويه عن ابن عباس وابن المنذر عن عبادة بن الصامت)

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے اس حدیث میں یہ الفاظ منقول ہیں :-

ثَلَاثٌ جَدُّهُنَّ جَدٌّ وَهَزْلُهُنَّ جَدٌّ: النِّكَاحُ وَالطَّلَاقُ وَالرَّجْعَةُ۔

”یعنی تین چیزیں ایسی ہیں جن کو قصد و ارادہ سے کہنا اور ہنسی مذاق کے طور پر کہنا برابر ہے، ایک نکاح،

دوسرے طلاق، تیسری رجعت۔“ (مظہری)

ترجمہ :- جس ظالم نے مجھ پر ظلم کیا ہے وہ سمجھ لے کہ اس کی گردن پر ظلم موجود ہے اور میرے اوپر سے گزر چکا ہے۔

مجمع الزوائد رقم الحديث: ۷۵۲۹

سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی الطلاق علی الہزل ج: ۱ ص: ۲۹۸

ان تینوں چیزوں میں حکم شرعی یہ ہے کہ دو مرد و عورت اگر بلا قصد نکاح ہنسی میں گواہوں کے سامنے نکاح کا ایجاب و قبول کر لیں تو بھی نکاح منعقد ہو جاتا ہے، اسی طرح اگر بلا قصد ہنسی میں صریح طور پر طلاق دیدے تو طلاق ہو جاتی ہے، یا رجعت کرے تو رجعت ہو جاتی ہے، ایسے ہی کسی غلام کو ہنسی میں آزاد کرنے کو کہہ دے تو غلام، باندی آزاد ہو جاتے ہیں، ہنسی مذاق کوئی عذر نہیں مانا جاتا۔

اس حکم کے بیان کے بعد پھر قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں انسان کو حق تعالیٰ کی اطاعت اور آخرت کے خوف کا سبق دیا، ارشاد فرمایا: **وَادْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝** یعنی ”یاد کرو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو جو تم پر نازل فرمائی اور یاد کرو اس خاص نعمت کو جو کتاب و حکمت کی صورت میں تمہیں دی گئی، اور اللہ سے ڈرو، اور یہ سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔“ تمہاری نیتوں اور ارادوں اور دلوں میں چھپے ہوئے بھیدوں سے باخبر ہیں، اس لئے اگر بیوی کو طلاق دے کر آزاد ہی کرنا ہو تو باہمی نزاع اور ایک دوسرے کی حق تلفی اور ظلم سے بچنے بچانے کی نیت سے کرو، غصہ کے انتقام یا بیوی کو ذلیل و رسوا کرنے یا تکلیف پہنچانے کی نیت سے نہ کرو۔

طلاق میں اصل یہی ہے کہ صریح اور رجعی طلاق دی جائے

تیسرا مسئلہ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا یہ ہے کہ شریعت و سنت کی نظر میں اصل یہی ہے کہ کوئی آدمی اگر طلاق دینے پر مجبور ہی ہو جائے تو صاف و صریح لفظوں میں ایک طلاق رجعی دیدے، تاکہ عدت تک رجعت کا حق باقی رہے، ایسے الفاظ نہ بولے جن سے فوری طور پر تعلق زوجیت منقطع ہو جائے، جس کو ”طلاق بائن“ کہتے ہیں، اور نہ تین طلاق تک پہنچے، جس کے بعد آپس میں نکاح جدید بھی حرام ہو جائے، یہ اشارہ لفظ **طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ** کو مطلق بلا قید کے ذکر کرنے سے حاصل ہوا، کیونکہ جو حکم اس آیت میں بتلایا ہے وہ اگرچہ صرف طلاق رجعی ایک دو تک کے لئے ہے، طلاق بائن یا تین طلاق کا یہ حکم نہیں، مگر قرآن کریم نے کوئی قید اس کی ذکر نہ فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اصل طلاق مشروع رجعی طلاق ہی ہے، دوسری صورتیں کراہت یا ناپسندیدگی سے خالی نہیں۔

مطلقہ عورتوں کو اپنی مرضی کی شادی کرنے سے بلا وجہ شرعی روکنا حرام ہے

دوسری آیت میں اس ناروا ظالمانہ سلوک کا انسداد کیا گیا ہے جو عام طور پر مطلقہ عورتوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، کہ ان کو دوسری شادی کرنے سے روکا جاتا ہے، پہلا شوہر بھی عموماً اپنی مطلقہ بیوی کو دوسرے شخص کے نکاح میں جانے سے روکتا اور اس کو اپنی عزت کے خلاف سمجھتا ہے، اور بعض خاندانوں میں لڑکی کے اولیاء بھی اس کو دوسری شادی کرنے سے

روکتے ہیں، اور ان میں بعض اس طمع میں روکتے ہیں کہ اس کی شادی پر ہم کوئی رقم اپنے لئے حاصل کر لیں، بعض اوقات مطلقہ عورت پھر اپنے سابق شوہر سے نکاح پر راضی ہو جاتی ہے، مگر عورت کے اولیاء و اقرباء کو طلاق دینے کی وجہ سے ایک قسم کی عداوت اس سے ہو جاتی ہے، وہ اب دونوں کے راضی ہونے کے بعد بھی ان کے باہمی نکاح سے مانع ہوتے ہیں، آزاد عورتوں کو اپنی مرضی کی شادی سے بلا عذر شرعی روکنا خواہ پہلے شوہر کی طرف سے ہو یا لڑکی کے اولیاء کی طرف سے، بڑا ظلم ہے، اس ظلم کا انسداد اس آیت میں فرمایا گیا ہے۔

اس آیت کا شان نزول بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت معقل بن یسارؓ نے اپنی بہن کی شادی ایک شخص کے ساتھ کر دی تھی، اس نے طلاق دے دی اور عدت بھی گزر گئی، اس کے بعد یہ شخص اپنے فعل پر پشیمان ہوا، اور چاہا کہ دوبارہ نکاح کر لیں، اس کی بیوی یعنی معقل بن یسارؓ کی بہن بھی اس پر آمادہ ہو گئی، لیکن جب اس شخص نے معقلؓ سے اس کا ذکر کیا تو ان کو طلاق دینے پر غصہ تھا، انہوں نے کہا کہ میں نے تمہارا اعزاز کیا، اپنی بہن تمہارے نکاح میں دے دی، تم نے اس کی یہ قدر کی کہ اس کو طلاق دے دی، اب پھر تم میرے پاس آئے ہو کہ دوبارہ نکاح کرو، خدا کی قسم! اب وہ تمہارے نکاح میں نہ لوٹے گی۔^[۱]

اسی طرح ایک واقعہ جابر بن عبد اللہؓ کی چچا زاد بہن کا پیش آیا تھا، ان واقعات پر آیت مذکورہ نازل ہوئی، جس میں معقلؓ اور جابرؓ کے اس رویے کو ناپسند و ناجائز قرار دیا گیا۔

صحابہ کرامؓ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق تھے، آیت کریمہ کے سنتے ہی معقل بن یسارؓ کا سارا غصہ ٹھنڈا ہو گیا، اور خود جا کر اس شخص سے بہن کا دوبارہ نکاح کر دیا، اور قسم کا کفارہ ادا کیا، اسی طرح جابر بن عبد اللہؓ نے بھی تعمیل فرمائی۔

اس آیت کے خطاب میں وہ شوہر بھی داخل ہیں جنہوں نے طلاق دی ہے، اور لڑکی کے اولیاء بھی، دونوں کو یہ حکم دیا گیا کہ: **فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاصُوا بَيْنَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ** یعنی ”مت روکو مطلقہ عورتوں کو اس بات سے کہ وہ اپنے تجویز کئے ہوئے شوہروں سے نکاح کریں“ خواہ پہلے ہی شوہر ہوں جنہوں نے طلاق دی تھی، یا دوسرے لوگ، مگر اس کے ساتھ ہی یہ شرط لگا دی گئی: **إِذَا تَرَاصُوا بَيْنَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ** یعنی ”جب دونوں مرد و عورت شرعی قاعدہ کے مطابق رضامند ہو جائیں“ تو نکاح سے نہ روکو، جس میں اشارہ فرمایا گیا کہ اگر ان دونوں کی رضامندی نہ ہو، کوئی کسی پر زور و برستی کرنا چاہے تو سب کو روکنے کا حق ہے، یا رضامندی بھی ہو مگر شرعی قاعدہ کے موافق نہ ہو، مثلاً بلا نکاح آپس میں میاں بیوی کی طرح رہنے پر رضامند ہو جائیں، یا تین طلاقیں کے بعد ناجائز طور پر آپس میں نکاح کر لیں، یا ایام عدت میں دوسرے

شوہر سے نکاح کا ارادہ ہو تو ہر مسلمان کو بالخصوص اُن لوگوں کو جن کا ان مرد و عورت کے ساتھ تعلق ہے روکنے کا حق حاصل ہے، بلکہ بقدر استطاعت روکنا واجب ہے۔

اسی طرح کوئی لڑکی بلا اجازت اپنے اولیاء کے اپنے کفو کے خلاف دوسرے کفو میں نکاح کرنا چاہے، یا اپنے مہر مثل سے کم پر نکاح کرنا چاہے جس کا اثر خاندان پر پڑتا ہے، جس کا اس کو حق نہیں، تو یہ رضامندی بھی قاعدہ شرعی کے مطابق نہیں، اس صورت میں لڑکی کے اولیاء کو اس نکاح سے روکنے کا حق حاصل ہے، **إِذَا تَرَاصُوا** کے الفاظ سے اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ عاقلہ بالغہ لڑکی کا نکاح بغیر اس کی رضایا اجازت کے نہیں ہو سکتا۔

آیت کے آخر میں تین جملے ارشاد فرمائے گئے، ایک یہ کہ **ذَلِكَ يُؤْخَذُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ** **الْآخِرِ** یعنی ”یہ احکام اُن لوگوں کے لئے ہیں جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔“ اس میں اشارہ فرما دیا گیا کہ اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آدمی ان احکامِ الہیہ کا پورا پابند ہو، اور جو لوگ ان احکام کے اتباع میں کوتاہی کرتے ہیں وہ سمجھ لیں کہ ان کے ایمان میں خلل ہے۔

دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ: **ذَلِكَمُ أَذَى لِّكُمْ وَأَضْهَرُ** یعنی ”ان احکام کی پابندی تمہارے لئے پاکی اور صفائی کا ذریعہ ہے۔“ اس میں اشارہ فرمایا گیا کہ ان کی خلاف ورزی کا نتیجہ گناہوں کی غلاظت میں آلودگی اور فتنہ و فساد ہے، کیونکہ عاقلہ بالغہ جو ان لڑکیوں کو مطلقاً نکاح سے روکا گیا تو ایک طرف اُن پر ظلم اور ان کی حق تلفی ہے، اور دوسری طرف اُن کی عفت و عصمت کو خطرہ میں ڈالنا ہے، تیسرے اگر خدا نخواستہ وہ کسی گناہ میں مبتلا ہوں، تو اس کا وبال ان لوگوں پر بھی عائد ہوگا جنہوں نے ان کو نکاح سے روکا، اور وبالِ آخرت سے پہلے بہت ممکن ہے کہ ان مجبور عورتوں کا یہ ابتلا خود مردوں میں جنگ و جدال اور قتل و قتل تک نوبت پہنچا دے جیسا کہ رات دن مشاہدہ میں آتا ہے، اس صورت میں وبالِ آخرت سے پہلے ان کا عمل دنیا ہی میں وبال بن جائے گا۔ اور اگر مطلقاً نکاح سے تو نہ روکا، مگر ان کی پسند کے خلاف دوسرے شخص سے نکاح پر مجبور کیا گیا تو اس کا نتیجہ بھی دائمی مخالفت اور فتنہ و فساد یا طلاق و خلع ہوگا، جس کے ناگوار اثرات ظاہر ہیں، اس لئے فرمایا گیا کہ ان کو ان کے تجویز کئے ہوئے شوہروں سے نکاح کرنے سے نہ روکنا ہی تمہارے لئے پاکی اور صفائی کا ذریعہ ہے۔

تیسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ: **وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ** (۳۳) یعنی ”تمہاری مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، تم نہیں جانتے۔“ اس ارشاد کا منشا یہ ہے کہ جو لوگ مطلقہ عورتوں کو نکاح سے روکتے ہیں، وہ اپنے نزدیک اس میں کچھ مصالح اور فوائد سوچتے ہیں، مثلاً اپنی عزت و غیرت کا تحیل، یا یہ کہ اُن کی شادی کے بدلے کچھ مالی منفعت حاصل کی جائے، اس شیطانی تلبیس اور بے جا مصلحت اندیشی کے ازالہ کے لئے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مصلحتوں اور فائدوں سے خوب

واقف ہیں، اُن کی رعایت کر کے احکام دیتے ہیں، اور تم چونکہ حقائق اُمور اور معاملات کے انجام سے بے خبر ہو، اس لئے اپنے ناتمام غور و فکر اور ناقص رائے سے کبھی ایسی چیزوں کو مصلحت اور فائدہ سمجھ لیتے ہو جس میں تمہاری ہلاکت و بربادی ہے، تم جس عزت و غیرت کو تھامتے پھرتے ہو، اگر مطلقہ عورتیں بے قابو ہو گئیں تو سب عزت خاک میں مل جائے گی، اور مالی منافع کے ناجائز تصورات ممکن ہے کہ تمہیں ایسے فتنوں اور جھگڑوں میں مبتلا کر دیں جن میں مال کے ساتھ جان کا بھی خطرہ ہو جائے۔

قانون سازی اور اس کی تنفیذ میں قرآن کریم کا بے نظیر حکیمانہ اصول

قرآن کریم نے اس جگہ ایک قانون پیش فرمایا کہ مطلقہ عورتوں کو اپنی مرضی کے مطابق نکاح سے روکنا جرم ہے، اس قانون کو بیان فرمانے کے بعد اس پر عمل کرنے کو سہل اور اس کے لئے عوام کے ذہنوں کو ہموار کرنے کے واسطے یہ تین جملے ارشاد فرمائے جن میں سے پہلے جملے میں روز قیامت کے حساب اور جرائم کی سزا سے ڈر کر انسان کو اس قانون پر عمل کرنے کے لئے آمادہ فرمایا، دوسرے جملے میں اس قانون کی خلاف ورزی میں جو مفسد اور انسانیت کے لئے مضرتیں ہیں ان کو بتلا کر قانون کی پابندی کے لئے تیار کیا، تیسرے جملے میں یہ ارشاد فرمایا کہ تمہاری اپنی مصلحت بھی اسی میں ہے کہ خدا تعالیٰ کے بتائے ہوئے قانون کی پابندی کرو، اس کے خلاف کرنے میں اگر تم کوئی مصلحت سوچتے ہو تو وہ تمہاری کوتاہ نظری اور عواقب سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔

قرآن کریم کا یہ اُسلوب اور طرزِ بیان صرف یہیں نہیں بلکہ تمام احکام میں جاری ہے، کہ ایک قانون بتایا جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ اور آخرت کے حساب و عذاب سے ڈرایا جاتا ہے، ہر قانون کے آگے پیچھے اِتَّقُوا اللَّهَ يَا اِنَّ اللّٰهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ، اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ وغیرہ جملے لگائے ہوئے ہیں، قرآن ساری دُنیا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے ایک مکمل نظامِ حیات اور ہر شعبہ زندگی پر حاوی قانون ہے، اس میں حدود و تعزیرات کا بھی بیان ہے، لیکن اس کی ادا ساری دُنیا کے قانون کی کتابوں سے نرالی ہے، اس کا طرزِ بیان حاکمانہ سے زیادہ مربیانہ ہے، اس میں ہر قانون کے بیان کے ساتھ اس کی کوشش کی گئی ہے کہ کوئی انسان اس قانون کی خلاف ورزی کر کے مستحقِ سزا نہ بنے، دُنیا کی حکومتوں کی طرح نہیں کہ انہوں نے ایک قانون بنادیا، اور شائع کر دیا، جو کوئی اس قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ اپنی سزا بھگتا ہے۔

اس کے علاوہ اس اُسلوبِ قرآن اور اس کے مخصوص اندازِ بیان سے ایک دُور رس بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کو دیکھنے سننے کے بعد انسان اس قانون کی پابندی صرف اس بنا پر نہیں کرتا کہ اگر خلاف کرے گا تو دُنیا میں اس کو کوئی سزا مل جائے

گی، بلکہ دنیا کی سزا سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور آخرت کی سزا کی فکر ہوتی ہے، اور اسی فکر کی بنا پر اس کا ظاہر و باطن، خفیہ و علانیہ برابر ہو جاتا ہے، وہ کسی ایسی جگہ میں بھی قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا، جہاں کسی ظاہری یا خفیہ پولیس کی بھی رسائی نہ ہو، کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ ہر جگہ حاضر و ناظر اور ڈرے ڈرے سے باخبر ہیں، یہی سبب ہے کہ قرآنی تعلیم نے جو اصول معاشرت تیار کئے تھے ہر مسلمان اس کی پابندی کو اپنا مقصدِ حیات تصور کرتا تھا۔

قرآنی نظامِ حکومت کا یہی امتیاز ہے کہ اس میں ایک طرف قانون کی حدود و قیود کا ذکر ہے تو دوسری طرف ترغیب و ترہیب کے ذریعے انسان کے اخلاق و کردار کو ایسا بلند کیا گیا ہے کہ قانونی حدود و قیود اس کے لئے ایک طبعی چیز بن جاتی ہیں، جس کے سامنے وہ اپنے جذبات اور تمام نفسانی خواہشات کو پس پشت ڈال دیتا ہے، دنیا کی حکومتوں اور قوموں کی تاریخ اور ان میں جرم و سزا کے واقعات پر ذرا گہری نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ نرے قانون سے کبھی کسی قوم یا فرد کی اصلاح نہیں ہوئی، محض پولیس اور فوج سے کبھی جرائم کا انسداد نہیں ہوا، جب تک قانون کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے خوف و عظمت کا سکہ اس کے قلب پر نہ بیٹھے، جرائم سے روکنے والی چیز دراصل خوفِ خدا اور خوفِ حسابِ آخرت ہے، یہ نہ ہو تو کوئی شخص کسی سے جرائم کو نہیں چھڑا سکتا۔

وَالْوَالِدَتُ يُرْضَعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ

اور بچے والی عورتیں دودھ پلاویں اپنے بچوں کو دو برس پورے جو کوئی چاہے کہ پوری کرے

الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ط

دودھ کی مدت، اور لڑکے والے یعنی باپ پر ہے کھانا اور کپڑا اُن عورتوں کا موافق دستور کے،

لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا

تکلیف نہیں دی جاتی کسی کو مگر اس کی گنجائش کے موافق، نہ نقصان دیا جاوے ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے، اور نہ

مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ ق وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ ج فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا

اس کو جس کا وہ بچہ ہے یعنی باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے اور وارثوں پر بھی یہی لازم ہے، پھر اگر ماں باپ چاہیں کہ دودھ چھڑالیں

عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۖ وَإِنْ أَرَادْتُمْ أَنْ

یعنی دو برس کے اندر ہی اپنی رضا اور مشورے سے تو اُن پر کچھ گناہ نہیں اور اگر تم لوگ چاہو کہ

تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا آتَيْتُمْ

دُودھ پلواؤ کسی دایہ سے اپنی اولاد کو تو بھی تم پر کچھ گناہ نہیں جبکہ حوالے کردو جو تم نے دینا ٹھہرایا تھا

بِالْمَعْرُوفِ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۲۳۳﴾

موافق دستور کے، اور ڈرو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ تمہارے سب کاموں کو خوب دیکھتا ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں۔ یہ مدت ان کے لئے ہے جو دودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہیں۔ اور جس باپ کا وہ بچہ ہے اس پر واجب ہے کہ وہ معروف طریقے پر ان ماؤں کے کھانے اور لباس کا خرچ اٹھائے۔ (ہاں) کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی۔ نہ تو ماں کو اپنے بچے کی وجہ سے ستایا جائے، اور نہ باپ کو اپنے بچے کی وجہ سے۔ اور اسی طرح کی ذمہ داری وارث پر بھی ہے۔ پھر اگر وہ دونوں (یعنی والدین) آپس کی رضا مندی اور باہمی مشورے سے (دو سال گزرنے سے پہلے ہی) دودھ چھڑانا چاہیں تو اس میں بھی ان پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور اگر تم یہ چاہو کہ اپنے بچوں کو کسی انا سے دودھ پلواؤ تو بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، جبکہ تم نے جو اجرت ٹھہرائی تھی وہ (دودھ پلانے والی انا کو) بھلے طریقے سے دے دو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ اللہ تمہارے سارے کاموں کو اچھی طرح دیکھ رہا ہے۔ ﴿۲۳۳﴾

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۰ :- رضاعت

اور مائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلایا کریں (یہ مدت اس کے لئے ہے) جو شیر خواری کی تکمیل کرنا

چاہے، اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے ان ماؤں کا کھانا کپڑا قاعدہ کے موافق، اور کسی شخص کو کوئی حکم نہیں دیا جاتا مگر اس کی برداشت کے موافق، کسی ماں کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہئے اس کے بچے کی وجہ سے، اور نہ کسی کے باپ کو تکلیف دینی چاہئے اس کے بچہ کی وجہ سے، اور (اگر باپ زندہ نہ ہو تو) مثل طریق مذکور کے (بچے کی پرورش کا انتظام) اس کے (محرم قرابت دار کے) ذمہ ہے جو (شرعاً بچے کا) وارث (ہونے کا حق رکھتا) ہے، پھر (یہ سمجھ لو کہ) اگر دونوں (ماں اور باپ دو سال سے کم میں) دودھ چھڑانا چاہیں باہمی رضامندی اور مشورے سے تو بھی ان دونوں پر کسی قسم کا گناہ نہیں، اور اگر تم لوگ (ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی کسی مصلحت ضروریہ سے مثلاً یہ کہ ماں کا دودھ اچھا نہیں، بچے کو ضرر ہوگا) اپنے بچوں کو کسی اور انا کا دودھ پلوانا چاہو تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، جبکہ اُن کے حوالے کر دو جو کچھ ان کو دینا طے ہے قاعدہ کے موافق، اور حق تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھ رہے ہیں۔

معارف مسائل

اس آیت میں رضاعت یعنی بچوں کو دودھ پلانے کے متعلق احکام ہیں، اس سے پہلی اور بعد کی آیات میں طلاق کے احکام مذکور ہیں، درمیان میں دودھ پلانے کے احکام اس مناسبت سے ذکر کئے گئے ہیں کہ عموماً طلاق کے بعد بچوں کی پرورش اور دودھ پلانے یا پلوانے کے معاملات زیر نزاع آجاتے ہیں، اور ان میں جھگڑے فساد ہوتے ہیں، اس لئے اس آیت میں ایسے معتدل احکام بیان فرمادیئے گئے جو عورت و مرد دونوں کے لئے سہل اور مناسب ہیں، خواہ دودھ پلانے یا چھڑانے کے معاملات قیام نکاح کی حالت میں پیش آئیں یا طلاق دینے کے بعد، بہر دو صورت اس کا ایک ایسا نظام بتادیا گیا جس سے جھگڑے فساد یا کسی فریق پر ظلم و تعدی کا راستہ نہ رہے۔

مثلاً آیت کے پہلے جملے میں ارشاد فرمایا: **وَالْوَالِدَتُ يُرْضَعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ** یعنی ”مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلایا کریں دو سال کامل جبکہ کوئی عذر قوی اس سے پہلے دودھ چھڑانے کے لئے مجبور نہ کرے۔“

اس آیت سے رضاعت کے چند مسائل معلوم ہوئے:-

دودھ پلانا ماں کے ذمہ واجب ہے

اول یہ کہ دودھ پلانا دینا ماں کے ذمہ واجب ہے، بلا عذر کسی ضد یا ناراضی کے سبب دودھ نہ پلائے تو گنہگار ہوگی، اور دودھ پلانے پر وہ شوہر سے کوئی اجرت و معاوضہ نہیں لے سکتی، جب تک وہ اس کے اپنے نکاح میں ہے، کیونکہ وہ اس کا اپنا فرض ہے۔

پوری مدت رضاعت

دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ پوری مدت رضاعت دو سال ہے، جب تک کوئی خاص عذر مانع نہ ہو بچے کا حق ہے کہ یہ مدت پوری کی جائے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دودھ پلانے کے لئے پوری مدت دو سال دی گئی ہے، اس کے بعد دودھ نہ پلایا جائے، البتہ بعض آیات قرآن اور احادیث کی بنا پر امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر تیس مہینے یعنی ڈھائی سال کے عرصہ میں بھی دودھ پلادیا تو احکام رضاعت کے ثابت ہو جائیں گے، اور اگر بچے کی کمزوری وغیرہ کے عذر سے ایسا کیا گیا تو گناہ بھی نہ ہوگا، ڈھائی سال پورے ہونے کے بعد بچے کو ماں کا دودھ پلانا بافتاق حرام ہے۔

اس آیت کے دوسرے جملے میں ارشاد ہے: **وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا** یعنی ”باپ کے ذمہ ہے ماؤں کا کھانا اور کپڑا قاعدہ کے موافق، کسی شخص کو ایسا حکم نہیں دیا جاتا جس کو وہ برداشت نہ کر سکے۔“

اس میں پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ ماؤں کے لئے تو قرآن نے لفظ ”وَالِدَاتُ“ استعمال کیا، مگر باپ کے لئے مختصر لفظ ”والد“ چھوڑ کر **الْمَوْلُودُ لَهُ** اختیار فرمایا، حالانکہ قرآن میں دوسری جگہ لفظ والد بھی مذکور ہے: لَا يَجْزِي وَالِدًا عَنْ وَلَدِهِ (لقمان: ۳۳) مگر یہاں والد کی جگہ ”مَوْلُودٌ لَهُ“ کے اختیار کرنے میں ایک خاص راز ہے، وہ یہ کہ پورے قرآن کریم کا ایک خاص اسلوب اور طرز بیان ہے کہ وہ کسی قانون کو دنیا کی حکومتوں کی طرح بیان نہیں کرتا، بلکہ مربیانہ اور مشفقانہ طرز سے بیان کرتا ہے، اور ایسے انداز سے بیان کرتا ہے جس کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا انسان کے لئے آسان ہو جائے۔

یہاں بھی چونکہ بچہ کا نفقہ باپ کے ذمہ ڈالا گیا ہے، حالانکہ وہ ماں اور باپ کی متاع مشترک ہے، تو ممکن تھا کہ باپ کو یہ حکم کچھ بھاری معلوم ہو، اس لئے بجائے ”والد“ کے ”مَوْلُودٌ لَهُ“ کا لفظ اختیار کی (وہ شخص جس کا بچہ ہے) اس میں اس طرف اشارہ کر دیا کہ اگرچہ بچے کی تولید میں ماں اور باپ دونوں کی شرکت ضرور ہے، مگر بچہ باپ ہی کا کہلاتا ہے، نسب باپ ہی سے چلتا ہے، اور جب بچہ اس کا ہوا تو ذمہ داری خرچ کی اس کو بھاری نہ معلوم ہونی چاہئے۔

بچے کو دودھ پلانا ماں کے ذمہ اور ماں کا نان و نفقہ و ضروریات باپ کے ذمہ ہیں

تیسرا مسئلہ شرعیہ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ اگرچہ دودھ پلانا ماں کے ذمہ ہے، لیکن ماں کا نان و نفقہ اور ضروریات زندگی باپ کے ذمہ ہے، اور یہ ذمہ داری جس وقت تک بچے کی ماں اس کے نکاح میں یا عدت میں ہے اس وقت تک ہے، اور طلاق اور عدت پوری ہونے کے بعد نفقہ زوجیت تو ختم ہو جائے گا، مگر بچے کو دودھ پلانے کا معاوضہ دینا

باپ کے ذمہ پھر بھی لازم رہے گا۔ (مظہری)

زوجہ کا نفقہ شوہر کی حیثیت کے مناسب ہونا چاہئے یا زوجہ کی؟

چوتھا مسئلہ اس پر توافق ہے کہ میاں بیوی دونوں امیر مال دار ہوں تو نفقہ امیرانہ واجب ہوگا، اور دونوں غریب ہوں تو نفقہ غریبانہ واجب ہوگا، البتہ جب دونوں کے حالات مالی مختلف ہوں تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، صاحب ہدایہ نے خصاف کے اس قول پر فتویٰ دیا ہے کہ اگر عورت غریب اور مرد مال دار ہو تو اس کا نفقہ درمیانہ حیثیت کا دیا جائے گا کہ غریبوں سے زائد مال داروں سے کم، اور کرخی کے نزدیک اعتبار شوہر کے حال کا ہوگا، ”فتح القدیر“ میں بہت سے فقہاء کا فتویٰ اس پر نقل کیا ہے، واللہ اعلم۔ (فتح القدیر ج: ۳ ص: ۴۲۲)

آیت مذکورہ میں احکام کے بعد ارشاد فرمایا: لَا تَضَارَّ وَالِدَا بَوْلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِہٖ یعنی ”نہ تو کسی ماں کو اُس کے بچے کی وجہ سے تکلیف میں ڈالنا جائز ہے، اور نہ کسی باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے۔“ مطلب یہ ہے کہ بچے کے ماں باپ آپس میں ضد اضدی نہ کریں، مثلاً ماں دودھ پلانے سے معذور ہو اور باپ اس پر یہ سمجھ کر زبردستی کرے کہ آخر اس کا بھی تو بچہ ہے، یہ مجبور ہوگی اور پلاوے گی، یا باپ مفلس ہے، اور ماں کو کوئی معذوری بھی نہیں پھر دودھ پلانے سے اس لئے انکار کرے کہ اس کا بھی تو بچہ ہے، جھک مار کر کسی سے پلاوے لے گا۔

ماں کو دودھ پلانے پر مجبور کرنے یا نہ کرنے کی تفصیل

لَا تَضَارَّ وَالِدَا بَوْلَدِہَا سے پانچواں مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ ماں اگر بچے کو دودھ پلانے سے کسی ضرورت کے سبب انکار کرے تو باپ کو اسے مجبور کرنا جائز نہیں، اور اگر بچہ کسی دوسری عورت یا جانور کا دودھ نہیں لیتا تو ماں کو مجبور کیا جائے گا، یہ مسئلہ وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِہٖ سے معلوم ہوا۔

عورت جب تک نکاح میں ہے تو اپنے بچے کو دودھ پلانے کی اجرت کا مطالبہ نہیں کر سکتی، طلاق وعدت کے بعد کر سکتی ہے

چھٹا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر بچے کی ماں دودھ پلانے کی اجرت مانگتی ہے تو جب تک اس کے نکاح یا عدت کے اندر ہے اجرت کے مطالبہ کا حق نہیں، یہاں اس کا نان نفقہ جو باپ کے ذمہ ہے وہی کافی ہے، مزید اجرت کا مطالبہ باپ کو ضرر پہنچانا ہے، اور اگر طلاق کی عدت گزر چکی ہے اور نفقہ کی ذمہ داری ختم ہو چکی ہے، اب اگر یہ مطلقہ بیوی اپنے بچے کو

دودھ پلانے کا معاوضہ باپ سے طلب کرتی ہے تو باپ کو دینا پڑے گا، کیونکہ اس کے خلاف کرنے میں ماں کا نقصان ہے، شرط یہ ہے کہ یہ معاوضہ اتنا ہی طلب کرے کہ جتنا کوئی دوسری عورت لیتی ہے، زائد کا مطالبہ کرے گی تو باپ کو حق ہوگا کہ اس کی بجائے کسی انا کا دودھ پلوائے۔

یتیم بچے کے دودھ پلوانے کی ذمہ داری کس پر ہے؟

آیت متذکرہ میں اس کے بعد یہ ارشاد ہے: **وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ** یعنی اگر باپ زندہ نہ ہو تو بچے کو دودھ پلانے یا پلوانے کا انتظام اس شخص پر ہے جو بچے کا جائز وارث اور محرم ہو، یعنی اگر بچہ مر جائے تو جن کو اس کی وراثت پہنچتی ہے وہی باپ نہ ہونے کی حالت میں اس کے نفقہ کے ذمہ دار ہوں گے، اگر ایسے وارث کئی ہوں تو ہر ایک پر بقدر میراث اس کی ذمہ داری عائد ہوگی۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ یتیم بچے کو دودھ پلوانے کی ذمہ داری وارث پر ڈالنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نابالغ بچے کا خرچہ دودھ چھڑانے کے بعد بھی وارثوں پر ہوگا، کیونکہ دودھ کی کوئی خصوصیت نہیں، مقصود بچے کا گزارہ ہے، مثلاً اگر یتیم بچے کی ماں اور دادا زندہ ہیں تو یہ دونوں اس بچے کے محرم بھی ہیں اور وارث بھی، اس لئے اس کا نفقہ ان دونوں پر بقدر حصہ میراث عائد ہوگا، یعنی ایک تہائی خرچہ ماں کے ذمہ اور دو تہائی دادا کے ذمہ ہوگا، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یتیم پوتے کا حق دادا پر اپنے بالغ بیٹوں سے بھی زیادہ ہے، کیونکہ بالغ اولاد کا نفقہ اس کے ذمہ نہیں، اور یتیم پوتے کا نفقہ اس کے ذمہ واجب ہے، ہاں میراث میں بیٹوں کے موجود ہوتے ہوئے پوتے کو حق دار بنانا اصول میراث اور انصاف کے خلاف ہے، کہ قریب تر اولاد کے ہوتے ہوئے بعید کو دینا معقول بھی نہیں، اور صحیح بخاری کی حدیث: **”لَا وَلِیَ رَجُلٍ ذَكَرَ“** کے بھی خلاف ہے، البتہ دادا کو یہ حق ہے کہ اگر ضرورت سمجھے تو یتیم پوتے کے لئے کچھ وصیت کر جائے، اور یہ وصیت بیٹوں کے حصے سے زائد بھی ہو سکتی ہے، اسی طرح یتیم پوتے کی ضرورت کو بھی پورا کر دیا گیا اور وراثت کا اصول کہ قریب کے ہوتے ہوئے بعید کو نہ دیا جائے، یہ بھی محفوظ رہا۔

دودھ چھڑانے کے احکام

اس کے بعد آیت متذکرہ میں ارشاد ہوتا ہے: **فَإِنْ أَرَادَ اِفْصَالًا عَنْ تَرَاثُصٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوَرًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا** یعنی ”اگر بچے کے ماں باپ دونوں آپس کی رضامندی اور باہمی مشورے سے یہ ارادہ کریں کہ شیر خوارگی کی مدت یعنی دو سال سے کم میں ہی دودھ چھڑا دیں، خواہ ماں کی معذوری کے سبب یا بچے کی کسی بیماری کے سبب، تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں۔“ آپس کے مشورے اور رضامندی کی شرط اس لئے لگائی کہ دودھ چھڑانے میں بچے کی مصلحت پیش نظر ہونی چاہئے، آپ

کے لڑائی جھگڑے کا بچے کو تختہ مشق نہ بنائیں۔

ماں کے سوا دوسری عورت کا دودھ پلوانے کے احکام

آخر میں ارشاد فرمایا گیا: **وَإِنْ أَرَادْتُمْ أَنْ تُستَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا اتَّيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ** یعنی ”اگر تم یہ چاہو کہ اپنے بچوں کی کسی مصلحت سے ماں کی بجائے کسی انا کا دودھ پلواؤ تو اس میں بھی کچھ گناہ نہیں، شرط یہ ہے کہ دودھ پلانے والی کی جو اجرت مقرر کی گئی تھی وہ پوری پوری ادا کر دیں“ اور اگر اس کو مقررہ اجرت نہ دی گئی تو اس کا گناہ ان کے ذمہ رہے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ماں دودھ پلانے پر راضی ہے لیکن باپ یہ دیکھتا ہے کہ ماں کا دودھ بچے کے لئے مضر ہے تو ایسی حالت میں اس کو حق ہے کہ ماں کو دودھ پلانے سے روک دے اور کسی انا سے پلوائے۔

اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ جس عورت کو دودھ پلانے پر رکھا جائے اس سے معاملہ تنخواہ یا اجرت کا پوری صفائی کے ساتھ طے کر لیا جائے کہ بعد میں جھگڑا نہ پڑے، اور پھر وقت مقررہ پر یہ طے شدہ اجرت اس کو سپرد بھی کر دے، اس میں ٹال مٹول نہ کرے۔

یہ سب احکام رضاعت بیان کرنے کے بعد پھر قرآن نے اپنے مخصوص انداز اور اسلوب کے ساتھ قانون پر عمل کو آسان کرنے اور ظاہر و غائب ہر حال میں اس کا پابند رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کے علم محیط کا تصور سامنے کر دیا، ارشاد ہوتا ہے: **وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ** (۳۳) یعنی ”اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور یہ سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کھلے اور چھپے اور ظاہر و غائب کو پوری طرح دیکھ رہے ہیں۔“ اور وہ تمہارے دلوں کے مخفی ارادوں اور نیتوں سے باخبر ہیں، اگر کسی فریق نے دودھ پلانے یا چھڑانے کے مذکورہ احکام کی خلاف ورزی کی یا بچے کی مصلحت کو نظر انداز کر کے اس بارے میں کوئی فیصلہ کیا تو وہ مستحق سزا ہوگا۔

وَالَّذِينَ يَتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ

اور جو لوگ مرجاویں تم میں سے اور چھوڑ جاویں اپنی عورتیں تو چاہئے کہ وہ عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو

أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ۖ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا

چار مہینے اور دس دن، پھر جب پورا کر چکیں اپنی عدت کو تو تم پر کچھ گناہ نہیں اس بات میں کہ

فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ط وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۳۳۳﴾ وَلَا جُنَاحَ

کریں وہ اپنے حق میں قاعدے کے موافق، اور اللہ کو تمہارے تمام کاموں کی خبر ہے۔ اور کچھ گناہ نہیں

عَلَيْكُمْ فَبِإِعْرَاضَتُمْ بِهِ مِنْ خُطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكُنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ ط

تم پر اس میں کہ اشارے میں کہو پیغام نکاح اُن عورتوں کا یا پوشیدہ رکھو اپنے دل میں،

عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَكِنْ لَا تُؤَاوِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَنْ

اللہ کو معلوم ہے کہ تم البتہ اُن عورتوں کا ذکر کرو گے لیکن ان سے نکاح کا وعدہ نہ کر رکھو چھپ کر مگر یہی کہ

تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا ط وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّى يَبْلُغَ

کہہ دو کوئی بات رواجِ شریعت کے موافق، اور نہ ارادہ کرو نکاح کا یہاں تک کہ پہنچ جاوے

الْكِتَابِ أَجَلَهُ ط وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ج

عدت مقررہ اپنی انتہا کو، اور جان رکھو کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ تمہارے دل میں ہے سو اس سے ڈرتے رہو

وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ع ﴿۳۳۵﴾

اور جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا اور تحمل کرنے والا ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں، اور بیویاں چھوڑ کر جائیں تو وہ بیویاں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن انتظار میں رکھیں گی۔ پھر جب وہ اپنی (عدت کی) میعاد کو پہنچ جائیں تو وہ اپنے بارے میں جو کارروائی (مثلاً دوسرا نکاح) قاعدے کے مطابق کریں تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ ﴿۳۳۳﴾ اور (عدت کے دوران) اگر تم ان عورتوں کو اشارے کنائے میں نکاح کا پیغام دو یا (ان سے نکاح کا ارادہ) دل میں چھپائے رکھو تو تم پر کوئی

گناہ نہیں ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ تم ان (سے نکاح) کا خیال تو دل میں لاؤ گے، لیکن ان سے نکاح کا دوطرفہ وعدہ مت کرنا، الا یہ کہ مناسب طریقے سے کوئی بات کہہ دو۔ اور نکاح کا عقد پکا کرنے کا اس وقت تک ارادہ بھی مت کرنا جب تک عدت کی مقررہ مدت اپنی میعاد کو نہ پہنچ جائے۔ اور یاد رکھو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اللہ اسے خوب جانتا ہے، لہذا اس سے ڈرتے رہو، اور یاد رکھو کہ اللہ بہت بخشنے والا، بڑا بردبار ہے۔ (۲۳۵)

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۱:- شوہر کی وفات ہونے کی صورت میں عدت کا بیان

وَالَّذِينَ يَتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ (الی قولہ) وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (۲۳۲) اور جو لوگ تم میں وفات پا جاتے ہیں، اور بیبیاں چھوڑ جاتے ہیں وہ بیبیاں اپنے آپ کو (نکاح وغیرہ سے) روک رکھیں چار مہینے اور دس دن، پھر جب اپنی (عدت کی) میعاد ختم کر لیں تو تم کو (بھی) کچھ گناہ نہ ہوگا ایسی بات (کے جائز رکھنے) میں کہ وہ عورتیں اپنی ذات کے لئے کچھ کارروائی (نکاح کی) کریں قاعدہ کے موافق (البتہ اگر کوئی بات خلاف قاعدہ شرع کے کریں اور تم باوجود روک سکنے کے نہ روکو تو تم بھی شریک گناہ ہو گے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام افعال کی خبر رکھتے ہیں۔

حکم نمبر ۳۲:- عدت میں نکاح کا پیغام دینا

اور تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا جو ان مذکورہ عورتوں کو (جو عدت وفات میں ہیں) پیغام (نکاح) دینے کے بارے میں کوئی بات اشارہ کہہ دو (مثلاً یہ کہ مجھ کو ایک نیک عورت سے نکاح کی ضرورت ہے) یا اپنے دل میں (آئندہ نکاح کرنے کے ارادے کو) پوشیدہ رکھو (جب بھی گناہ نہیں اور وجہ اس اجازت کی یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کو یہ بات معلوم ہے کہ تم ان عورتوں کا (ضرور) ذکر مذکور کرو گے (سو خیر ذکر مذکور کرو) لیکن ان سے (صاف لفظوں میں) نکاح کا وعدہ (اور گفتگو) مت کرو، مگر یہ کہ کوئی بات قاعدہ کے موافق کہو (تو مضائقہ نہیں، اور وہ بات قاعدہ کے مطابق یہی ہے کہ اشارہ کہو) اور تم تعلق نکاح (فی الحال) کا ارادہ بھی مت کرو، یہاں تک کہ عدت اپنے مقررہ وقت پر ختم ہو جائے، اور یقین رکھو اس کا کہ اللہ کو اطلاع ہے تمہارے دلوں کی بات کی، سو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو (اور ناجائز امر کا دل میں ارادہ بھی مت کیا کرو) اور (یہ بھی) یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ معاف بھی کرنے والے ہیں اور حلیم بھی ہیں۔

معارفِ مسائل

عدت کے بعض احکام

۱- جس کا خاوند مر جائے اس کو عدت کے اندر خوشبو لگانا، سنگھار کرنا، سرمہ اور تیل بلا ضرورت دوا لگانا، مہندی لگانا، رنگین کپڑے پہننا درست نہیں، اور صریح گفتگوئے نکاح ثانی بھی درست نہیں، جیسا اگلی آیت میں آتا ہے، اور رات کو دوسرے گھر میں رہنا بھی درست نہیں۔ ترجمہ میں ”نکاح“ کے ساتھ جو ”وغیرہ“ کہا گیا ہے اس سے یہی امور مراد ہیں، اور یہی حکم ہے اس عورت کا جس پر طلاق بائن واقع ہوئی، یعنی جس میں رجعت درست نہیں، مگر اس کو اپنے گھر سے دن کو بھی بدون سخت مجبوری کے نکلنا درست نہیں۔

۲- اگر چاند رات کو خاوند کی وفات ہوئی تب تو یہ مہینے خواہ تیس کے ہوں خواہ اُن تیس کے ہوں، چاند کے حساب سے پورے کئے جاویں گے، اور اگر چاند رات کے بعد وفات ہوئی ہے تو یہ سب مہینے تیس تیس دن کے حساب سے پورے کئے جاویں گے، پس کل ایک سو تیس دن پورے کریں گے، اس مسئلہ سے بہت لوگ غافل ہیں، اور جس وقت وفات ہوئی ہو جب یہ مدت گزر کر وہی وقت آوے گا، عدت ختم ہو جاوے گی۔ اور یہ جو فرمایا کہ اگر عورتیں قاعدہ کے موافق کچھ کریں تو تم کو بھی گناہ نہ ہوگا، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کوئی کام خلاف شرع کرے تو اوروں پر بھی واجب ہوتا ہے کہ بشرط قدرت اس کو روکیں، ورنہ یہ لوگ بھی گنہگار ہوتے ہیں، اور قاعدہ کے موافق سے یہ مراد ہے کہ جو نکاح تجویز ہو وہ شرعاً صحیح اور جائز ہو، تمام شرائط حلت کی وہاں جمع ہوں۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ

کچھ گناہ نہیں تم پر اگر طلاق دو تم عورتوں کو اس وقت کہ اُن کو ہاتھ بھی نہ لگایا ہو اور نہ مقرر کیا ہو اُن کے لئے

فَرِيضَةً ۖ وَمَتَعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسَعِ قَدْرُاهُ وَعَلَى الْمُقْتَرِ قَدْرُاهُ ۚ

کچھ مہر، اور اُن کو کچھ خرچ دو مقدور والے پر اس کے موافق ہے اور تنگی والے پر اس کے موافق،

مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿۳۳﴾ وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ

جو خرچ کہ قاعدے کے موافق ہے لازم ہے نیکی کرنے والوں پر۔ اور اگر طلاق دو اُن کو

مِنْ قَبْلِ أَنْ تَنْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ

ہاتھ لگانے سے پہلے اور ٹھہرا چکے تھے تم اُن کے لئے مہر تو لازم ہوا آدھا اس کا کہ تم مقرر کر چکے تھے

إِلَّا أَنْ يَعْفُوَنْ أَوْ يَعْفُوا الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۖ وَ أَنْ تَعْفُوا

مگر یہ کہ درگزر کریں عورتیں یا درگزر کرے وہ شخص کہ اس کے اختیار میں ہے گرہ نکاح کی یعنی خاوند، اور تم مرد درگزر کرو تو

أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى ۖ وَلَا تَنْسُوا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ بِمَا

قریب ہے پرہیزگاری کے، اور نہ بھلاؤ احسان کرنا آپس میں، بے شک اللہ جو کچھ

تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۳۴﴾

تم کرتے ہو خوب دیکھتا ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

تم پر اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم عورتوں کو ایسے وقت طلاق دو جبکہ ابھی تم نے ان کو چھوا بھی نہ ہو، اور نہ کوئی مہر ان کے لئے مقرر کیا ہو۔ اور (ایسی صورت میں) ان کو کوئی تحفہ دو، خوشحال شخص اپنی حیثیت کے مطابق اور غریب آدمی اپنی حیثیت کے مطابق بھلے طریقے سے یہ تحفہ دے۔ یہ نیک آدمیوں پر ایک لازمی حق ہے۔ ﴿۳۳﴾ اور اگر تم نے انہیں چھونے سے پہلے ہی اس حالت میں طلاق دی ہو جبکہ ان کے لئے (نکاح کے وقت) کوئی مہر مقرر کر لیا تھا تو جتنا مہر تم نے مقرر کیا تھا اس کا آدھا دینا (واجب ہے) الا یہ کہ وہ عورتیں رعایت کر دیں (اور آدھے مہر کا بھی مطالبہ نہ کریں) یا وہ (شوہر) جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے، رعایت کرے (اور پورا مہر دیدے) اور اگر تم رعایت کرو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ اور آپس میں فراخ دلی کا برتاؤ کرنا مت بھولو۔ جو عمل بھی تم کرتے ہو، اللہ یقیناً اسے دیکھ رہا ہے۔ ﴿۳۴﴾

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۳:- طلاق قبل الدخول کی صورت میں مہر کے وجوب اور عدم وجوب کا بیان

طلاق قبل الدخول کے معنی یہ ہیں کہ زوجین میں یک جائی اور خلوت صحیحہ سے پہلے ہی طلاق کی نوبت آجائے، اس کی دو صورتیں ہیں، یا تو اس نکاح کے وقت مہر مقرر کی مقدار متعین نہیں کی گئی، یا مقدار مہر متعین کر دی گئی، پہلی صورت کا حکم اولاً مذکور ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَنْسُوهُنَّ (الی قولہ) حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ۳۳ یعنی تم پر (مہر کا) کچھ مواخذہ نہیں اگر بیبیوں کو ایسی حالت میں طلاق دے دو کہ نہ ان کو تم نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ ان کے لئے کچھ مہر مقرر کیا ہے، (سو اس صورت میں مہر اپنے ذمہ مت سمجھو) اور (صرف) ان کو (ایک) فائدہ پہنچاؤ، صاحب وسعت کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے، اور تنگ دست کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے، ایک خاص قسم کا فائدہ پہنچانا جو قاعدہ کے موافق واجب ہے خوش معاملہ لوگوں پر (یعنی سب مسلمانوں پر، کیونکہ خوش معاملگی کا بھی سب ہی کو حکم ہے، مراد اس سے ایک جوڑا کپڑوں کا دینا ہے)۔

اور دوسری صورت کا حکم یہ ہے: وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ (الی قولہ) إِنَّ اللَّهَ يَتَعَمَّلُونَ بَصِيرَةً ۳۴ اور اگر تم ان بیبیوں کو طلاق دو قبل اس کے کہ اُن کو ہاتھ لگاؤ، اور ان کے لئے کچھ مہر بھی مقرر کر چکے تھے تو (اس صورت میں) جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہو اس کا نصف (واجب) ہے (اور نصف معاف) مگر (دو صورتیں اس مجموعی حکم سے مستثنیٰ ہیں، ایک صورت تو یہ کہ وہ عورتیں (اپنا نصف) بھی معاف کر دیں (تو اس صورت میں نصف بھی واجب نہ رہا) یا (دوسری صورت) یہ (ہے) کہ وہ شخص رعایت کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا تعلق (رکھنا اور توڑنا) ہے (یعنی خاوند پورا مہر ہی اس کو دیدے تو اس صورت میں خاوند کی مرضی سے پورا ہی مہر ادا کرنا ہوگا) اور (اے اہل حق!) تمہارا (اپنے حقوق کو) معاف کر دینا (بہ نسبت وصول کرنے کے) تقویٰ سے زیادہ قریب ہے (کیونکہ معاف کرنے سے ثواب ملتا ہے، اور ثواب کا کام کرنا ظاہر ہے کہ تقویٰ کی بات ہے) اور آپس میں احسان (اور رعایت) کرنے سے غفلت مت کرو، (بلکہ ہر شخص دوسرے کے ساتھ رعایت کرنے کا خیال رکھا کرے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو خوب دیکھتے ہیں (تو تم اگر کسی کے ساتھ رعایت و احسان کرو گے اللہ تعالیٰ اس کی جزائے خیر تم کو دیں گے)۔ (بیان القرآن)

معارفِ مسائل

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ (الی قولہ) **إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ** ﴿۳۷﴾ طلاق کی، مہر اور صحبت کے لحاظ سے چار صورتیں ہو سکتی ہیں، ان میں سے دو کا حکم ان آیات میں بیان کیا گیا ہے، ایک یہ کہ نہ مہر مقرر ہو، نہ صحبت و خلوت، دوسری یہ کہ مہر تو مقرر ہو لیکن صحبت و خلوت کی نوبت نہ آئے، تیسری صورت یہ ہے کہ مہر بھی مقرر ہو اور صحبت کی بھی نوبت آوے، اس میں جو مہر مقرر کیا ہے پورا دینا ہوگا، یہ حکم قرآن مجید میں دوسرے مقام پر بیان کیا گیا ہے، چوتھی صورت یہ ہے کہ مہر معین نہ کیا، اور صحبت یا خلوت کے بعد طلاق دی، اس میں مہر مثل پورا دینا ہوگا، یعنی جو اس عورت کی قوم میں رواج ہے، اس کا بیان بھی ایک دوسری آیت میں آیا ہے۔

مذکورہ آیت میں پہلی دو قسموں کا حکم بیان کیا گیا ہے، اس میں سے پہلی صورت کا حکم یہ ہے کہ مہر کچھ واجب نہیں مگر زوج پر واجب ہے کہ اپنے پاس سے عورت کو کچھ دیدے، کم از کم یہی کہ ایک جوڑا کپڑے کا دیدے، دراصل قرآن کریم نے اس عطیہ کی کوئی مقدار متعین نہیں کی، البتہ یہ بتلادیا کہ مال دار کو اپنی حیثیت کے مطابق دینا چاہئے، جس میں اس کی ترغیب ہے کہ صاحب وسعت اس میں تنگی سے کام نہ لے۔ حضرت حسنؓ نے ایسے ہی ایک واقعہ میں مطلقہ عورت کو بیس ہزار کا عطیہ دیا، اور قاضی شریحؒ نے پانچ سو درہم کا، اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ایک جوڑا کپڑے کا دیدے۔ (قرطبی) ^[۱]

اور دوسری صورت کا حکم یہ ہے کہ جس عورت کا مہر نکاح کے وقت مقرر ہوا ہو، اور اس کو قبل صحبت و خلوت صحیحہ کے طلاق دے دی ہو تو مقرر کئے ہوئے مہر کا نصف مرد کے ذمے واجب ہوگا، البتہ اگر عورت معاف کر دے یا مرد پورا دیدے تو اختیاری بات ہے، جیسا کہ آیت: **إِلَّا أَنْ يَتَّقُونَ أَوْ يُعْفُوا** **الَّذِي بَيْنَهُمَا عُقْدَةُ النِّكَاحِ** ^ط سے معلوم ہوتا ہے۔

۱- مرد کے پورا مہر دینے کو بھی معاف کرنے کے لفظ سے شاید اس لئے تعبیر کیا کہ عام عادت عرب کی یہ تھی کہ مہر کی رقم شادی کے ساتھ ہی دے دی جاتی تھی، تو طلاق قبل از خلوت کی صورت میں وہ نصف واپس لینے کا حق دار ہو گیا، اب اگر وہ رعایت کر کے اپنا نصف واپس نہ لے تو یہ بھی معاف ہی کرنا ہے، اور معاف کرنے کو افضل اور اقرب للتقویٰ قرار دیا، کیونکہ یہ معافی علامت اس کی ہے کہ تعلق نکاح کا قطع کرنا بھی احسان اور حسن سلوک کے ساتھ ہوا جو مقصد شریعت اور موجب ثواب عظیم ہے، خواہ معافی عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے۔

۲- **الَّذِي بَيْنَهُمَا عُقْدَةُ النِّكَاحِ** ^ط کی تفسیر خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی: ”وَلَيْسَ عُقْدَةُ النِّكَاحِ الزَّوْجُ“

یعنی ”عقدہ نکاح کا مالک شوہر ہے۔“ یہ حدیث دارقطنی میں بروایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ منقول ہے، اور حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی۔ (قرطبی) ۲

اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ نکاح مکمل ہو جانے کے بعد نکاح کو قائم رکھنے یا ختم کرنے کا مالک شوہر ہے، طلاق وہی دے سکتا ہے، عورت کا طلاق میں کوئی اختیار نہیں۔

حِفْظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ ۖ وَقُومُوا لِلَّهِ قَنِتِينَ ﴿۳۳۸﴾

خبردار رہو سب نمازوں سے اور بیچ والی نماز سے، اور کھڑے رہو اللہ کے آگے ادب سے۔

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا ۖ فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَأَدْكُوا لِلَّهِ كَمَا عَلَّمَكُم

پھر اگر تم کو ڈر ہو کسی کا تو پیادہ پڑھ لو یا سوار، پھر جس وقت تم امن پاؤ تو یاد کرو اللہ کو جس طرح کہ تم کو سکھایا ہے

مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿۳۳۹﴾

جس کو تم نہ جانتے تھے۔

آسان ترجمہ قرآن

تمام نمازوں کا پورا پورا خیال رکھو، اور (خاص طور پر) بیچ کی نماز کا۔ اور اللہ کے سامنے باادب فرماں بردار بن کر کھڑے ہوا کرو ﴿۳۳۸﴾ اور اگر تمہیں (دشمن کا) خوف لاحق ہو تو کھڑے کھڑے یا سوار ہونے کی حالت ہی میں (نماز پڑھ لو) پھر جب تم امن کی حالت میں آ جاؤ تو اللہ کا ذکر اس طریقے سے کرو جو اس نے تمہیں سکھایا ہے جس سے تم پہلے ناواقف تھے ﴿۳۳۹﴾

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۳۴ :- نمازوں کی حفاظت کا بیان

اس سے آگے پیچھے طلاق وغیرہ کے احکام ہیں، درمیان میں نماز کے احکام بیان فرمانا اشارہ اس طرف ہے کہ

مقصود اصلی توجہ الی الحق ہے، اور معاشرت اور معاملات کے احکام سے، علاوہ اور مصلحتوں کے اس توجہ کی حفاظت اور ترقی بھی مقصود ہے، چنانچہ جب ان کو خدائی احکام سمجھ کر عمل کیا جاوے گا تو توجہ لازم ہوگی، پھر یہ کہ ان احکام میں ادائے حقوق عباد بھی ہے اور حقوق عباد کے اِتلاف سے درگاہ الہی سے دُوری ہوتی ہے، جس کے لوازم میں سے حق و عہدوں کی طرف سے بے توجہی ہے، چونکہ نماز میں یہ توجہ زیادہ ظاہر ہے اس لئے اس کے درمیان میں لانے سے اس توجہ کے مقصود ہونے پر زیادہ دلالت ہوگی، تا کہ بندہ اس توجہ کو ہر وقت پیش نظر رکھے۔

حُفِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ (الی قولہ) مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿۲۳۹﴾ محافظت کرو سب نمازوں کی (عموماً) اور درمیان والی نماز (یعنی عصر) کی (خصوصاً) اور (نماز میں) کھڑے ہوا کرو واللہ کے سامنے عاجز بنے ہوئے، پھر اگر تم کو (باقاعدہ نماز پڑھنے میں کسی دشمن وغیرہ کا) اندیشہ ہو تو کھڑے کھڑے یا سواری پر چڑھے چڑھے (جس طرح بن سکے خواہ قبلہ کی طرف بھی منہ ہو یا نہ ہو، اور گوز کو ع و سجد صرف اشارہ ہی سے ممکن ہو) پڑھ لیا کرو (اس حالت میں بھی اس پر محافظت رکھو اس کو ترک مت کرو) پھر جب تم کو (بالکل) اطمینان ہو جاوے (اور اندیشہ جاتا رہے) تو تم خدا تعالیٰ کی یاد (یعنی ادائے نماز) اس طریق سے کرو جو تم کو (اطمینان کی حالت میں) سکھایا ہے جس کو تم (پہلے سے) جانتے نہ تھے۔

معارف مسائل

کثرت سے علماء کا قول بعض احادیث کی دلیل سے یہ ہے کہ بیچ والی نماز سے مراد نمازِ عصر ہے، کیونکہ اس کے ایک طرف دو نمازیں دن کی ہیں فجر اور ظہر، اور ایک طرف دو نمازیں رات کی ہیں مغرب اور عشاء، اس کی تاکید خصوصیت کے ساتھ اس لئے کی گئی کہ اکثر لوگوں کو یہ وقت کام کی مصروفیت کا ہوتا ہے، اور ”عاجزی“ کی تفسیر حدیث میں ”سکوت“ کے ساتھ آئی ہے۔

اسی آیت سے نماز میں باتیں کرنے کی ممانعت ہوئی ہے، پہلے کلام کرنا دُرست تھا، اور یہ نماز کھڑے کھڑے اشارہ سے جب صحیح ہوگی جب ایک جگہ کھڑا ہو سکے، اور اس میں سجدے کا اشارہ ذرا زیادہ پست کرے، اور چلنے سے نماز نہیں ہوگی، البتہ جب ایسا ممکن نہ ہو، مثلاً عین لڑائی کا وقت ہے، تو نماز کو قضا کر دیا جاوے گا، دُوسرے وقت پڑھ لیں۔ (بیان القرآن) ۲

۱ صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلوة، باب الدلیل لمن قال... إلخ ج: ۱ ص: ۲۲۶

۲ تفسیر بیان القرآن تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۱۶۳

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا ۖ وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ مَتَاعًا

اور جو لوگ تم میں سے مر جاویں اور چھوڑ جاویں اپنی عورتیں تو وہ وصیت کر دیں اپنی عورتوں کے واسطے خرچ دینا

إِلَى الْحَوْلِ غَيْرِ إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ

ایک برس تک بغیر نکالنے کے گھر سے، پھر اگر وہ عورتیں آپ نکل جاویں تو کچھ گناہ نہیں تم پر اس میں کہ کریں وہ عورتیں

فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوفٍ ۖ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۚ (۲۲۰) وَلِلْمُطَلَّاتِ مَتَاعٌ

اپنے حق میں بھلی بات اور اللہ زبردست ہے حکمت والا۔ اور طلاق دی ہوئی عورتوں کے واسطے خرچ دینا

بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۚ (۲۲۱) كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ

ہے قاعدے کے موافق لازم ہے پرہیزگاروں پر۔ اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے واسطے اپنے حکم

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۚ (۲۲۲)

تاکہ تم سمجھ لو۔

آسان ترجمہ قرآن

اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ اپنی بیویوں کے حق میں یہ وصیت کر جایا کریں کہ ایک سال تک وہ (ترکے سے نفقہ وصول کرنے کا) فائدہ اٹھائیں گی اور ان کو (شوہر کے گھر سے) نکالا نہیں جائے گا۔ ہاں اگر وہ خود نکل جائیں تو اپنے حق میں قاعدے کے مطابق وہ جو کچھ بھی کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ اور اللہ صاحب اقتدار بھی ہے، صاحب حکمت بھی۔ (۲۲۰) اور مطلقہ عورتوں کو قاعدے کے مطابق فائدہ پہنچانا متقیوں پر ان کا حق ہے۔ (۲۲۱) اللہ اپنے احکام اسی طرح وضاحت سے تمہارے سامنے بیان کرتا ہے، تاکہ تم سمجھ داری سے کام لو۔ (۲۲۲)

خلاصہ تفسیر

حکم نمبر ۵۳ :- بیوہ عورت کی سکونت اور متاع کی بعض اقسام کا بیان

وَالَّذِينَ يَتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ (الی قولہ) وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۲۳۰ اور جو لوگ وفات پا جاتے ہیں تم میں سے اور چھوڑ جاتے ہیں بیبیوں کو (ان کے ذمہ لازم ہے کہ) وہ وصیت کر جایا کریں اپنی بیبیوں کے واسطے ایک سال تک (نان و نفقہ اور گھر میں سکونت رکھنے سے) منتفع ہونے کی اس طور پر کہ وہ گھر سے نکالی نہ جاویں، ہاں اگر (چار مہینے دس دن کے بعد، یا وضع حمل کے بعد عدت گزار کر) خود نکل جاویں تو تم کو کوئی گناہ نہیں، اس قاعدہ کی بات میں جس کو اپنے بارے میں (تجویز) کریں (جیسے نکاح وغیرہ) اور اللہ تعالیٰ زبردست ہیں (ان کے خلاف حکم مت کرو) اور حکمت والے ہیں (کہ تمام احکام میں تمہاری مصلحتیں ملحوظ رکھی ہیں، گو تمہاری فہم میں نہ آسکیں)۔

وَاللَّطَّلَفُ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۲۳۱ (الی قولہ) لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۲۳۲ اور سب طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے کچھ کچھ فائدہ پہنچانا (کسی درجہ میں مقرر ہے) قاعدہ کے موافق (اور یہ) مقرر ہوا ہے ان پر جو (شرک و کفر سے) پرہیز کرتے ہیں (یعنی مسلمانوں پر خواہ یہ مقرر ہونا وجوب کے درجہ میں ہو یا استحباب کے مرتبہ میں) اسی طرح حق تعالیٰ تمہارے (عمل کرنے کے) لئے اپنے احکام بیان فرماتے ہیں اس توقع پر کہ تم (ان کو) سمجھو (اور عمل کرو)۔

معارف مسائل

۱- وَالَّذِينَ يَتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ (الی قولہ) وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۲۳۰ زمانہ جاہلیت میں وفات زوج کی عدت ایک سال تھی، اور اسلام میں بجائے ایک سال کے، چار مہینے دس دن مقرر ہوئے جیسا کہ ماقبل میں آیت: يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُدٍ وَعَشْرًا ۲۳۱ (البقرة: ۲۳۲) سے معلوم ہو چکا ہے، مگر اس میں عورت کی اتنی رعایت رکھی گئی تھی کہ چونکہ اس وقت تک میراث کا حکم نازل نہ ہوا تھا، اور بیوی کا کوئی حصہ میراث میں مقرر نہ ہوا تھا، بلکہ اوروں کے حق کا مدار محض مردے کی وصیت پر تھا جیسا کہ آیت: كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ (البقرة: ۱۸۰) کی تفسیر میں معلوم ہو چکا ہے، اس لئے یہ حکم ہو گیا تھا کہ اگر عورت اپنی مصلحت سے خاوند کے ترکہ کے گھر میں رہنا چاہے تو سال بھر تک اس کو رہنے کا حق حاصل ہے، اور اسی ترکہ سے اس مدت میں اس کو نان و نفقہ بھی دیا جاوے، اس آیت میں اسی کا بیان ہے، اور خاوندوں کو حکم ہے کہ اس طرح کی وصیت کر جایا کریں، اور چونکہ یہ حق عورت کا تھا، اس کو اس کے وصول کرنے نہ کرنے کا اختیار حاصل تھا اس لئے وارثوں کو تو

گھر سے نکالنا جائز نہ تھا، لیکن خود اس کو جائز تھا کہ خود اس کے گھر نہ رہے، اور اپنا حق ورثہ کو چھوڑے، بشرطیکہ عدت پوری ہو چکے، اور نکاح وغیرہ سب درست تھا، اور یہی مراد ہے قاعدہ کی بات سے، البتہ عدت کے اندر نکلتا اور نکاح کرنا وغیرہ سب گناہ تھا، عورت کے لئے بھی اور جو منع کر سکے اور نہ روکے اس کے لئے بھی، پھر جب آیت میراث کی نازل ہوئی، گھر بار سب ترکہ میں سے عورت کا حق مل گیا، سواپنے حصہ میں رہے اور اپنے حصہ سے خرچ کرے، یہ آیت منسوخ ہو گئی۔

۲- وَلِلْمُطَلَّقاتِ مَتَاعٌ بِالنَّكَاحِ ۖ مطلقہ عورتوں کو متاع یعنی فائدہ پہنچانا اس سے پہلی آیات میں بھی آچکا ہے مگر وہ صرف دو قسم کی مطلقات کے لئے تھا، جن کو صحبت و خلوت سے پہلے طلاق ہو گئی ہو، ایک کو فائدہ پہنچانا یہ تھا کہ جوڑا دیا جائے، دوسری کو فائدہ پہنچانا یہ تھا کہ آدھا مہر دیا جائے، اب وہ طلاق والیاں رہ گئیں جن کو صحبت یا خلوت کے بعد طلاق دی جاوے سو ان میں جس کا مہر مقرر کیا گیا ہو اس کو فائدہ پہنچانا یہ ہے کہ پورا مہر دینا چاہئے، اور جس کا مہر مقرر نہ کیا جاوے اس کے لئے بعد دخول کے مہر مثل واجب ہے، یہ متاع بمعنی مطلق فائدہ پہنچانا اس تفصیل سے تو واجب ہے، اور اگر متاع سے مراد فائدہ خاص یعنی تحفہ یا جوڑا دینا ہی لیا جائے تو ایک مطلقہ کو تو دینا واجب ہے، جس کا ذکر ماقبل میں آچکا ہے، اور باقی سب اقسام میں مستحب ہے، اور اگر متاع سے مراد نفقہ لیا جاوے تو جس طلاق میں عدت ہے اس میں عدت گزرنے تک واجب ہے، خواہ طلاق رجعی ہو یا بائن، غرض آیت اپنے الفاظ عامہ سے سب صورتوں کو شامل ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۖ

کیا نہ دیکھا تو نے اُن لوگوں کو جو کہ نکلے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے،

فَقَالَ لَهُمْ اللَّهُ مُوتُوا ۖ ثُمَّ أَحْيَاهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ

پھر فرمایا اُن کو اللہ نے کہ مر جاؤ، پھر اُن کو زندہ کر دیا، بے شک اللہ فضل کرنے والا ہے لوگوں پر

وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿۲۴۴﴾ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا

لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اور لڑو اللہ کی راہ میں اور جان لو

۱ اور قاعدہ سے مراد یہی تفصیل ہو جائے گی، اور ہر صورت کے وجوب اور استحباب کا فرق دوسرے دلائل سے ثابت کیا جائے گا، اور ”حَقًّا“ کو واجب کے معنی میں نہ لیں گے، اور ”عَلَى“ التزام کے لئے نہ ہوگا، بلکہ محض تاکید کے لئے ہوگا گورجہ استحباب ہی میں تھی۔ (بیان القرآن تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۱۶۳)

اِنَّ اللّٰهَ سَيُعْلِمُ عَلَيُّهٖ ۝۲۴۴

کہ اللہ بے شک خوب سنتا جانتا ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

کیا تمہیں ان لوگوں کا حال معلوم نہیں ہوا جو موت سے بچنے کے لئے اپنے گھروں سے نکل آئے تھے، اور وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے؟ چنانچہ اللہ نے ان سے کہا: ”مر جاؤ“ پھر انہیں زندہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بہت فضل فرمانے والا ہے، لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ ۝۲۴۴ اور اللہ کے راستے میں جنگ کرو، اور یقین رکھو کہ اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔ ۝۲۴۴

خلاصہ تفسیر

(اے مخاطب!) کیا تجھ کو ان لوگوں کا قصہ تحقیق نہیں ہوا جو کہ اپنے گھروں سے نکل گئے اور وہ لوگ ہزاروں ہی تھے موت سے بچنے کے لئے سو اللہ نے اُن کے لئے (حکم) فرمادیا کہ مر جاؤ (سب مر گئے) پھر اُن کو جلا دیا، بے شک اللہ تعالیٰ بڑا فضل کرنے والے ہیں لوگوں (کے حال) پر مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے اور (اس واقعہ پر غور کر کے) اللہ کی راہ میں قتال کرو اور یقین رکھو اس بات کہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں (جہاد کرنے اور نہ کرنے والوں کی باتیں سنتے اور ہر ایک کی نیت جانتے ہیں، اور سب کو مناسب جزا دیں گے)۔

معارف مسائل

یہ تین آیتیں جو اوپر مذکور ہوئی ہیں، ان میں ایک عجیب بلوغ انداز میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان و مال کی قربانی پیش کرنے کی ہدایت ہے کہ ان احکام کے بیان کرنے سے پہلے تاریخ کا ایک اہم واقعہ ذکر کیا گیا ہے، جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ موت و حیات تقدیر الہی کے تابع ہے، جنگ و جہاد میں جانا موت کا سبب نہیں، اور بزدلی سے جان چرانا موت سے بچنے کا ذریعہ نہیں۔ تفسیر ابن کثیر میں سلف صحابہؓ اور تابعینؒ کے حوالے سے اس واقعہ کی تشریح یہ بیان کی ہے کہ بنی اسرائیل کی کوئی جماعت ایک شہر میں بستی تھی، اور وہاں کوئی سخت و باطا عون وغیرہ پھیلا، یہ لوگ جو تقریباً دس ہزار کی تعداد میں تھے گھبرا اُٹھے، اور موت کے خوف سے اس شہر کو چھوڑ کر سب کے سب دو پہاڑوں کے درمیان ایک وسیع میدان میں

جا کر مقیم ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے ان پر اور دنیا کی دوسری قوموں پر یہ واضح کرنے کے لئے کہ موت سے کوئی شخص بھاگ کر جان نہیں چھڑا سکتا، دو فرشتے بھیج دیئے، جو میدان کے دونوں سروں پر آکھڑے ہوئے، اور کوئی ایسی آواز دی جس سے سب کے سب بیک وقت مرے ہوئے رہ گئے، ایک بھی زندہ نہ رہا، آس پاس کے لوگوں کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی، یہاں پہنچے، دس ہزار انسانوں کے کفن و دفن کا انتظام آسان نہ تھا، اس لئے ان کے گرد ایک احاطہ کھینچ کر حظیرہ جیسا بنادیا، اُن کی لاشیں حسب دستور گل سڑ گئیں، ہڈیاں پڑی رہ گئیں، ایک زمانہ دراز کے بعد بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر جن کا نام حزقیل علیہ السلام بتلایا گیا ہے، اس مقام پر گزرے، اس حظیرہ میں جگہ جگہ انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے بکھرے ہوئے دیکھ کر حیرت میں رہ گئے، بذریعہ وحی ان کو ان لوگوں کا پورا واقعہ بتلادیا گیا، حضرت حزقیل علیہ السلام نے دعا کی کہ یا اللہ! ان لوگوں کو پھر زندہ فرمادے، اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا قبول فرمائی اور انہیں حکم دیا گیا کہ آپ ان شکستہ ہڈیوں کو اس طرح خطاب فرمائیں:-

أَيُّهَا الْعِظَامُ الْبَالِيَةُ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكَ أَنْ تَجْتَمِعِيْ-

”یعنی اے پرانی ہڈیو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ہر جوڑ کی ہڈی اپنی جگہ جمع ہو جائے۔“

پیغمبر کی زبان سے خدا تعالیٰ کا حکم ان ہڈیوں نے سنا اور حکم کی تعمیل کی، جن کو دنیا بے عقل و بے شعور سمجھتی ہے مگر دنیا کے ہر ڈرے ڈرے کی طرح وہ بھی تابع فرمان اور اپنے وجود کے مناسب عقل و ادراک رکھتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی مطیع ہیں، قرآن کریم نے آیت: اَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ حَلْفَهُ ثُمَّ هَدَى ۝ (طہ) میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے، یعنی ”اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا فرمایا پھر اس کو اس کے مناسب حال ہدایت فرمائی۔“ مولانا رومیؒ نے ایسے ہی امور کے متعلق فرمایا ہے:-

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند

بامن و تو مردہ باحق زندہ اند [۱]

بہر حال ایک آواز پر ہر انسان کی ہڈیاں اپنی اپنی جگہ لگ گئیں، پھر حکم ہوا کہ اب ان کو یہ آواز دو:-

أَيُّهَا الْعِظَامُ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكَ أَنْ تَكْتَسِي لَحْمًا وَعَصَبًا وَجِلْدًا-

”یعنی اے ہڈیو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ اپنا گوشت پہن لو اور پٹھے اور کھال درست کر لو۔“

یہ کہنا تھا کہ ہڈیوں کا ہر ڈھانچہ ان کے دیکھتے دیکھتے ایک مکمل لاش بن گئی، پھر حکم ہوا کہ اب ارواح کو یہ خطاب

کیا جائے:-

أَيُّهَا الْأَرْوَاحُ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكَ أَنْ تَرْجِعَ كُلُّ رُوحٍ إِلَى الْجَسَدِ الَّذِي كَانَتْ تَعْمُرُهُ-

”یعنی اے ارواح! تمہیں اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ اپنے اپنے بدنوں میں لوٹ آئیں، جن کی تعمیر و حیات اُن سے وابستہ تھی۔“

یہ آواز دیتے ہی اُن کے سامنے سارے لاشے زندہ ہو کر کھڑے ہو گئے اور حیرت سے چار طرف دیکھنے لگے، سب کی زبانوں پر تھا: ”سُبْحَانَكَ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ“۔^[۱]

یہ واقعہ ہالک دنیا کے فلاسفوں اور عقلاء کے لئے دعوتِ فکر اور منکرینِ قیامت پر حجتِ قاطعہ ہونے کے ساتھ اس ہدایت پر بھی مشتمل ہے کہ موت کے خوف سے بھاگنا خواہ جہاد سے ہو یا کسی وبا و طاعون سے اللہ تعالیٰ اور اس کی تقدیر پر ایمان رکھنے والے کے لئے ممکن نہیں، جس کا یہ ایمان ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے، نہ اس سے ایک سیکنڈ پہلے آسکتی ہے، اور نہ ایک سیکنڈ مؤخر ہو سکتی ہے، اس لئے یہ حرکت فضول بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہونے کی وجہ بھی۔

اب اس واقعہ کو قرآن کے الفاظ سے دیکھئے، بیانِ واقعہ کے لئے قرآن نے فرمایا: **أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ** یعنی ”کیا آپ نے ان لوگوں کے واقعہ کو نہیں دیکھا جو اپنے گھروں سے بخوفِ موت نکل کھڑے ہوئے تھے۔“ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ہزاروں برس پہلے کا ہے، اس کے دیکھنے کا حضور سے سوال ہی نہیں ہو سکتا، تو یہاں **أَلَمْ تَرَ** فرمانے کا کیا منشا ہے، مفسرین نے فرمایا ہے کہ ایسے تمام مواقع میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لفظ **أَلَمْ تَرَ** کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، حالانکہ واقعہ آپ کے زمانے سے پہلے کا ہے، جس کے دیکھنے کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا، ان سب مواقع میں رُؤیت سے رُؤیتِ قلبی مراد ہوتی ہے، جس کے معنی ہیں علم و ادراک یعنی **أَلَمْ تَرَ** ایسے مواقع میں ”أَلَمْ تَعْلَمْ“ کے معنی میں ہوتا ہے، لیکن اس کو لفظ **أَلَمْ تَرَ** سے تعبیر کرنے میں حکمت اس واقعہ کے مشہور و معروف ہونے کی طرف اشارہ کرنا ہے، کہ یہ واقعہ ایسا یقینی ہے جیسے کوئی آج دیکھ رہا ہو اور دیکھنے کے قابل ہو، **أَلَمْ تَرَ** کے بعد حرفِ **إِلَى** بڑھانے سے اُزروئے زبان اس کی طرف اشارہ بھی ہوتا ہے۔

اس کے بعد قرآن میں اُن کی ایک بڑی تعداد ہونے کا بیان فرمایا گیا **وَهُمُ الْأَوَّلُونَ** یعنی وہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے، اس تعداد کی تعیین میں روایات مختلفہ ہیں، لیکن عربی زبان کے قاعدے سے یہ لفظ جمع کثرت ہے، جس کا اطلاق دس سے کم پر نہیں ہوتا، اس سے معلوم ہوا کہ ان کی تعداد دس ہزار سے کم نہ تھی۔

اس کے بعد ارشاد ہے: **فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا** یعنی ”کہہ دیا اُن کو اللہ تعالیٰ نے کہ مر جاؤ۔“ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم بلا واسطہ بھی ہو سکتا ہے اور بواسطہ کسی فرشتے کے بھی، جیسے دوسری آیت میں ارشاد ہے: **إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ** (یس)

اس کے بعد فرمایا ہے: إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ، یعنی ”اللہ تعالیٰ بڑا فضل کرنے والے ہیں لوگوں پر۔“ اس میں وہ فضل بھی داخل ہے جو بنی اسرائیل کی اس قوم کو دوبارہ زندہ کر کے فرمایا، اور یہ فضل بھی شامل ہے جو یہ واقعہ اُمتِ محمدیہ کو بتلا کر ان کے لئے درسِ عبرت بنایا۔

آخر میں غفلت شعار انسان کو بیدار کرنے کے لئے فرمایا: وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿۳۳﴾ یعنی ”اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کے ہزاروں مظاہر انسان کے سامنے آتے رہتے ہیں، مگر اس کے باوجود اکثر انسان شکر گزار نہیں ہوتے۔“

مسائل متعلقہ

اس آیت سے چند مسائل اور احکام مستفاد ہوئے:-

تدبیر پر تقدیر غالب ہے

اول یہ کہ تقدیرِ الہی کے مقابلے میں کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی، اور جہاد سے یا طاعون وغیرہ سے بھاگنا جان بچانے کا ذریعہ نہیں ہو سکتا، اور نہ اُن میں قائم رہنا موت کا باعث ہوتا ہے، بلکہ موت کا ایک وقت معین ہے، نہ اُس میں کمی ہو سکتی ہے نہ زیادتی۔

جس بستی میں کوئی و باطاعون وغیرہ ہو اس میں جانا یا وہاں سے بھاگ کر کہیں اور جانا دونوں ناجائز ہیں

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جس شہر میں کوئی وبائی مرض طاعون وغیرہ پھیل جائے وہاں سے بھاگ کر دوسری جگہ جانا جائز نہیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں اس پر اتنا اور اضافہ ہے کہ دوسرے لوگوں کو وہاں جانا بھی درست نہیں، حدیث میں ہے:-

إِنَّ هَذَا السَّقَمَ عَذَابٌ بِهِ الْأُمَمُ قَبْلَكُمْ فَإِذَا سَمِعْتُمْ بِهِ فِي الْأَرْضِ فَلَا تَدْخُلُوهَا وَإِذَا وَقَعَ بِأَرْضٍ وَأَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوا فِرَارًا۔ (بخاری و مسلم، ابن کثیر)

”یعنی اس بیماری (طاعون) کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے تم سے پہلی قوموں پر عذاب نازل فرمایا ہے، سو جب تم یہ سنو کہ کسی شہر میں طاعون وغیرہ وبائی مرض پھیل رہا ہے تو وہاں نہ جاؤ، اور اگر کسی بستی میں یہ

مرض پھیل جائے اور تم وہاں موجود ہو تو وہاں سے بھاگ کر نہ نکلو۔“

تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت فاروقِ اعظمؓ نے ایک مرتبہ ملکِ شام کے قصد سے سفر کیا، سرحدِ شام پر تبوک کے قریب ایک مقام سرخ ہے، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ملکِ شام میں سخت طاعون پھیلا ہوا ہے، یہ طاعون ملکِ شام کی تاریخ میں ایک عظیم سانحہ تھا، یہ طاعون ”عمواس“ کے نام سے مشہور ہے، کیونکہ اول یہ طاعون ایک بستی عمواس نامی میں شروع ہوا، جو بیت المقدس کے قریب ہے، پھر سارے ملک میں پھیل گیا، ہزار ہا انسان جن میں بہت سے صحابہؓ و تابعینؓ بھی تھے، اس طاعون میں شہید ہوئے۔

فاروقِ اعظمؓ نے طاعون کی شدت کی خبر سنی تو اسی مقام پر ٹھہر کر صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کہ ہمیں ملکِ شام میں اس وقت جانا چاہئے یا واپس ہونا مناسب ہے، اُس وقت جتنے حضرات مشورہ میں شریک تھے اُن میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق کوئی حکم سنا ہو، بعد میں حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے اطلاع دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس معاملے کے متعلق یہ ہے:-

أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَكَرَ الْوُجُعَ فَقَالَ: رَجُزٌ وَعَذَابٌ عَذِيبٌ بِهِ الْأُمَمُ ثُمَّ بَقِيَ مِنْهُ بَقِيَّةٌ فَيَذْهَبُ الْمَرَّةَ وَيَأْتِي الْأُخْرَى فَمَنْ سَمِعَ بِهِ يَارِضٍ فَلَا يَقْدِمَنَّ عَلَيْهِ وَمَنْ كَانَ يَارِضٍ وَقَعَ بِهَا فَلَا يَخْرُجْ فِرَارًا مِنْهُ۔ (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ، وَأَخْرَجَهُ الْأَيْمَنُ بِمِثْلِهِ)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (طاعونی گلٹی کے) درد کا ذکر کیا تو فرمایا کہ یہ ایک عذاب ہے جس سے بعض اُمتوں کو عذاب دیا گیا تھا، پھر اس کا کچھ بقیہ رہ گیا، اب اس کا یہ حال ہے کہ کبھی چلا جاتا ہے اور پھر آ جاتا ہے، تو جو شخص یہ سنے کہ فلاں خطہ زمین میں یہ عذاب آیا ہوا ہے تو اس کو چاہئے کہ اس خطہ زمین میں نہ جائے، اور جو شخص اس خطہ میں پہلے سے موجود ہو تو طاعون سے بھاگنے کے لئے وہاں سے نہ نکلے۔ (بخاری وغیرہ)

حضرت فاروقِ اعظمؓ نے جب یہ حدیث سنی تو رفقاء کو واپسی کا حکم دے دیا، حضرت ابو عبیدہؓ ملکِ شام کے عامل و امیر (گورنر) بھی اس مجلس میں موجود تھے، فاروقِ اعظمؓ کا یہ حکم سن کر فرمانے لگے: ”أَفِرَارًا مِّنْ قَدَرِ اللَّهِ“ یعنی کیا آپ اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگنا چاہتے ہیں؟ فاروقِ اعظمؓ نے جواب میں فرمایا: ابو عبیدہ! کاش یہ بات کوئی اور کہتا، یعنی تمہاری زبان سے ایسی بات قابلِ تعجب ہے، اور پھر فرمایا:-

نَعَمْ نَقَرُّ مِنْ قَدَرِ اللَّهِ إِلَى قَدَرِ اللَّهِ۔

”بے شک ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ ہی کی تقدیر کی طرف بھاگتے ہیں۔“

مطلب یہ تھا کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ اللہ ہی کے حکم کے مطابق کر رہے ہیں، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔

دربارہ طاعون ارشاد نبوی کی حکمتیں

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مذکور سے معلوم ہوا کہ جس شہر یا بستی میں طاعون وغیرہ امراض وبائی پھیلے ہوئے ہوں، باہر والوں کو وہاں جانا ممنوع ہے، اور وہاں کے رہنے والوں کو اُس جگہ سے بخوفِ موت بھاگنا ممنوع ہے۔ اور اس کے ساتھ اسلام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ نہ کسی جگہ جانا موت کا سبب ہے، نہ کہیں سے بھاگنا نجات کا سبب، اس اہم عقیدہ کے ہوتے ہوئے حکم مذکور بڑی دُور رس حکمتوں پر مبنی ہے، باہر والوں کو وہاں جانے سے روکنے کی ایک حکمت تو یہ ہے کہ ممکن ہے کہ وہاں پہنچ کر کسی کی عمر ختم ہو چکی ہو اور اس مرض میں مبتلا ہو کر انتقال ہو گیا تو مرنے والے کو کبھی یہ گمان ہوگا کہ اگر میں یہاں نہ آتا تو زندہ رہتا، اور دُوروں کو بھی یہی خیال ہوگا کہ یہاں آنے سے اس کی موت واقع ہوئی، حالانکہ جو کچھ ہوا وہ پہلے سے لکھا ہوا تھا، اس کی عمر اتنی ہی تھی، کہیں بھی رہتا، اس وقت اس کی موت لازمی تھی، اس حکم میں مسلمانوں کے عقیدہ کو تذبذب سے بچایا گیا کہ وہ غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔

دوسری حکمت یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان کو یہ ہدایت دی ہے کہ جس جگہ تکلیف پہنچنے کا خطرہ ہو یا جہاں ہلاکت کا اندیشہ ہو وہاں نہ جائے، بلکہ مقدور بھر ایسی چیزوں سے بچنے کی فکر کرے جو اس کے لئے مضر یا ہلاکت کا سبب بن سکتی ہیں، اور اپنی جان کی حفاظت ہر انسان کے ذمے پر واجب قرار دی ہے، اس قاعدہ کا مقتضی بھی یہی ہے کہ تقدیرِ الہی پر ایمان کامل رکھتے ہوئے احتیاطی تدبیروں میں کمی نہ کرے، اور ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ ایسی جگہ نہ جائے جہاں جان کا خطرہ ہو۔

اسی طرح اُس بستی کے رہنے والوں کو بخوفِ موت وہاں سے بھاگنے کی ممانعت میں بھی بہت سی حکمتیں ہیں۔ ایک حکمت تو اجتماعی اور عوامی ہے کہ اگر یہ بھاگنے کا سلسلہ چلا تو امیر اور پیسے والے اور قدرت و طاقت والے آدمی تو بھاگ جائیں گے، مگر بستی میں ایسے ضعفاء، مرد و عورت کا بھی عادی ہونا لازمی ہے جو کہیں جانے پر قدرت نہیں رکھتے، اُن کا حشر کیا ہوگا، اول تو وہ تنہا رہ کر ہیبت ہی سے مرنے لگیں گے، پھر اُن میں جو بیمار ہیں اُن کی خبر گیری کون کرے

گا، مرجائیں گے تو دفن کفن کا انتظام کیسے ہوگا۔

دوسری حکمت یہ ہے کہ جو لوگ اس جگہ موجود ہیں بعید نہیں کہ ان میں اس مرض کے جراثیم اثر کر چکے ہوں ایسی حالت میں وہ سفر کریں گے تو اور زیادہ مصیبتوں اور مشقتوں کے شکار ہوں گے، سفر کی حالت میں بیمار ہوئے تو ظاہر ہے کہ ان پر کیا گزرے گی، ابن المدینی نے علماء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:-

مَا فَرَّ أَحَدٌ مِنَ الْوَبَاءِ فَسَلِمَ - (قرطبی)

”یعنی جو شخص وبا سے بھاگتا ہے وہ کبھی سالم نہیں رہتا۔“

تیسری حکمت یہ بھی ہے کہ اگر ان میں مرض کے جراثیم سرایت کر چکے ہیں تو یہ مختلف بستیوں میں پہنچیں گے، تو وہاں وبائی جراثیم پھیلیں گے، اور اگر اپنی جگہ صبر و توکل کے ساتھ ٹھہرے رہے تو بہت ممکن ہے کہ مرض سے نجات حاصل ہو جائے، اور بالفرض اسی مرض میں موت مقدر تھی تو ان کو اپنے صبر و ثبات کی وجہ سے درجہ شہادت کا ملے گا، جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے:-

رَوَى الْبُخَارِيُّ عَنْ يَحْيَى بْنِ يَعْمَرَ عَنْ عَائِشَةَ أَنَّهَا أَخْبَرَتْهُ أَنَّهَا سَأَلَتْ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الطَّاعُونَ فَأَخْبَرَهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ كَانَ عَذَابًا يَبْعَثُهُ اللَّهُ عَلَى مَنْ يَشَاءُ فَجَعَلَهُ اللَّهُ رَحْمَةً لِلْمُؤْمِنِينَ فَلَيْسَ مِنْ عَبْدٍ يَقَعُ الطَّاعُونَ فَيَمُوتُ فِي بَلَدِهِ صَابِرًا يَعْلَمُ أَنَّهُ لَنْ يُصِيبَهُ إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَهُ إِلَّا كَانَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِ شَهِيدٍ^[۱] وَهَذَا تَفْسِيرُ لِقَوْلِهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الطَّاعُونَ شَهَادَةٌ وَالْمُطْعُونَ شَهِيدٌ^[۲] - (قرطبی ج: ۳ ص: ۲۳۵)

”امام بخاری نے یحییٰ بن یعمر کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اُن کو خبر دی کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طاعون کے متعلق سوال کیا تھا، تو آپ نے ان کو بتلایا کہ یہ بیماری اصل میں عذاب کی حیثیت سے نازل ہوئی تھی اور جس قوم کو عذاب دینا منظور ہوتا تھا اس پر بھیج دی جاتی تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو مؤمنین کے لئے رحمت بنا دیا، تو جو اللہ کا بندہ طاعون پھیلنے کے بعد اپنی بستی میں صبر و سکون کے ساتھ ٹھہرا رہے اور یہ اعتقاد رکھے کہ اس کو صرف وہی مصیبت پہنچ سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے لکھ دی ہے، تو ایسے شخص کو شہید کے برابر ثواب ملے گا۔ اور یہی تشریح

[۱] تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۳ ص: ۲۳۳

[۲] صحيح البخاری، كتاب الطب، باب اجر الصابر في الطاعون ج: ۲ ص: ۸۵۳، ۸۵۴

[۳] صحيح البخاری ج: ۲ ص: ۸۵۲

ہے اس حدیث کی جس میں ارشاد ہے کہ طاعون شہادت ہے اور طاعون زدہ شخص شہید ہے۔“

بعض خاص صورتوں کا استثناء

حدیث کے الفاظ میں ”فَلَا تَخْرُجُوا فِرَادًا مِّنْهُ“ آیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص موت سے فرار کے لئے نہیں بلکہ اپنی کسی دوسری ضرورت سے دوسری جگہ چلا جائے تو وہ اس ممانعت میں داخل نہیں، اسی طرح اگر کسی شخص کا عقیدہ اپنی جگہ پختہ ہو کہ یہاں سے دوسری جگہ چلا جانا مجھے موت سے نجات نہیں دے سکتا، اگر میرا وقت آگیا ہے تو جہاں جاؤں گا موت لازمی ہے، اور وقت نہیں آیا تو یہاں رہنے سے بھی موت نہیں آئے گی، یہ عقیدہ پختہ رکھتے ہوئے محض آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے یہاں سے چلا جائے تو وہ بھی ممانعت سے مستثنیٰ ہے۔

اسی طرح کوئی آدمی کسی ضرورت سے اس جگہ میں داخل ہو جہاں وبا پھیلی ہوئی ہے، اور عقیدہ اس کا پختہ ہو کہ یہاں آنے سے موت نہیں آئے گی، وہ اللہ کی مشیت کے تابع ہے، تو ایسی حالت میں اُس کے لئے وہاں جانا بھی جائز ہوگا۔ تیسرا مسئلہ اس آیت سے یہ مستفاد ہوا کہ بخوف موت جہاد سے بھاگنا بھی حرام ہے، قرآن کریم میں یہ مسئلہ دوسری جگہ زیادہ تفصیل اور وضاحت سے آیا ہے، جس میں بعض خاص صورتوں کو مستثنیٰ بھی فرمایا گیا ہے۔ جو مضمون اس آیت کا ہے تقریباً یہی مضمون دوسری آیت میں جہاد سے بھاگنے والوں یا اس میں شامل نہ ہونے والوں کے بارے میں آیا ہے، ارشاد یہ ہے:-

الَّذِينَ قَالُوا الْإِحْوَائِهِمْ وَقَعْدُوا أَلَا طَاعُوا مَا قِيلُوا ۖ قُلْ فَادْرَءُوا عَنِ أَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۸﴾ (آل عمران)

”یعنی کچھ لوگ خود بھی جہاد میں شریک نہ ہوئے، اور جہاد میں شریک ہو کر شہید ہو جانے والوں کے متعلق لوگوں سے کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے ہماری بات نہ سنی اس لئے مارے گئے، اگر یہ ہماری بات مانتے تو قتل نہ ہوتے، (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ) آپ ان سے فرمادیں کہ اگر موت سے بچنا تمہارے اختیار میں ہے تو اوروں کی کیا فکر کرتے ہو، تم خود اپنی فکر کرو، اور اپنے آپ کو موت سے بچالو، یعنی جہاد میں جانے نہ جانے پر موقوف نہیں، تمہیں گھر بیٹھے ہوئے بھی آخر موت آئے گی۔“

عجائب قدرت سے ہے کہ صحابہ کرامؓ کے سب سے بڑے جنگی جرنیل سیف اللہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کی اسلامی عمر ساری جہاد ہی میں گزری ہے، وہ کسی جہاد میں شہید نہیں ہوئے، بیمار ہو کر گھر میں وفات پائی، وفات کے قریب اپنے بستر پر مرنے کا افسوس کرتے ہوئے گھر والوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ میں فلاں فلاں عظیم الشان

جنگوں اور جہادوں میں شریک ہوا، اور میرا کوئی عضو ایسا نہیں جس میں تیر یا نیزے یا چوٹ کے زخم کا اثر و نشان نہ ہو، مگر افسوس ہے کہ میں اب گدھے کی طرح بستر پر مر رہا ہوں، خدا تعالیٰ بزدلوں کو آرام نہ دے، اُن کو میری نصیحت پہنچاؤ۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کا یہ واقعہ بطور تمہید لایا گیا تھا، اگلی آیت میں جہاد و قتال کا حکم دیا گیا جو اس قصہ کے ذکر کرنے سے اصل مقصود تھا، کہ جہاد میں جانے کو موت یا بھاگنے کو نجات نہ سمجھو، بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کر کے فلاح دارین حاصل کرو، اللہ تعالیٰ تمہاری سب باتیں سننے والے اور جاننے والے ہیں۔

تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی فضیلت کا ذکر ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فُضِّلَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً ط

کون شخص ہے ایسا جو قرض دے اللہ کو اچھا قرض، پھر دُگنا کر دے اللہ اس کو کئی گنا،

وَاللَّهُ يَقْضِي وَيَبْضِطُ ۖ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۲۲۵﴾

اور اللہ ہی تنگی کر دیتا ہے اور وہی کشائش کرتا ہے، اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

آسان ترجمہ قرآن

کون ہے جو اللہ کو اچھے طریقے پر قرض دے، تاکہ وہ اسے اس کے مفاد میں اتنا بڑھائے چڑھائے کہ وہ بدرجہا زیادہ ہو جائے؟ اور اللہ ہی تنگی پیدا کرتا ہے، اور وہی وسعت دیتا ہے، اور اسی کی طرف تم سب کو لوٹایا جائے گا۔ ﴿۲۲۵﴾

خلاصہ تفسیر

جہاد وغیرہ کارِ خیر میں انفاق کی ترغیب

کون شخص ہے (ایسا) جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے اچھے طور پر قرض دینا (یعنی اخلاص کے ساتھ) پھر اللہ تعالیٰ اس (قرض کے ثواب) کو بڑھا کر بہت سے حصے کر دیوے اور (اس کا اندیشہ مت کرو کہ خرچ کرنے سے مال کم ہو جائے گا، کیونکہ یہ تو) اللہ (ہی) کے قبضہ میں ہے وہی) کمی کرتے ہیں اور (وہی) فراخی کرتے ہیں (کچھ خرچ کرنے نہ کرنے پر اس کا اصلی مدار نہیں) اور تم اُسی کی طرف (بعد مرنے کے) لے جائے جاؤ گے (سو اس وقت نیک کام میں خرچ کرنے کی جزا اور

واجب موقع پر خرچ نہ کرنے کی سزا تم کو ملے گی۔

معارف مسائل

۱- **يُقْرِضُ اللَّهُ قَرْضًا حَسَنًا**، قرض سے مراد نیک عمل کرنا، اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنا ہے، اس کو ”قرض“ مجازاً کہہ دیا، ورنہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے قرض کا عوض ضروری دیا جاتا ہے اسی طرح تمہارے اتفاق کا عوض ضروری ملے گا، اور بڑھانے کا بیان ایک حدیث میں آیا ہے، کہ ایک خرم اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیا جاوے تو خدا تعالیٰ اس کو اتنا بڑھاتے ہیں کہ وہ اُحد پہاڑ سے بڑا ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کا یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ اس کے بندوں کو قرض دیا جائے اور اُن کی حاجت برآری کی جائے، چنانچہ حدیث میں قرض دینے کی بہت فضیلت وارد ہوئی ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُقْرِضُ مُسْلِمًا قَرْضًا مَرَّةً إِلَّا كَانَ كَصَدَقَتِهِ مَرَّتَيْنِ۔ (مظہری بحوالہ ابن ماجہ)

”جو مسلمان دوسرے مسلمان کو قرض دے دیتا ہے، یہ قرض دینا اللہ کے راستے میں اس مال کے دو دفعہ صدقہ کرنے کے برابر ہے۔“

۲- ابن عربیؒ فرماتے ہیں اس آیت کو سن کر لوگوں کے تین فرقے ہو گئے، پہلا فرقہ اُن بد نصیب لوگوں کا ہے جنہوں نے یہ آیت سن کر کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رب ہماری طرف محتاج ہے، اور ہم غنی ہیں۔ اس کا جواب قرآن کریم کی ایک اور آیت: **لَقَدْ سَبَّحَ اللَّهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ** (آل عمران: ۱۸۱) سے دیا۔ دوسرا فرقہ اُن لوگوں کا ہے جنہوں نے اس آیت کو سن کر اس کے خلاف کیا، اور بخل ہی کو اختیار کر لیا، مال کی طرف زیادہ رغبت اور اس کی حرص نے ان کو اس طرح باندھ لیا کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی۔ تیسرا فرقہ ان مخلص مسلمانوں کا ہے جنہوں نے فوراً ہی اس آیت پر عمل کر لیا، اور اپنا پسندیدہ مال اللہ کے راستے میں دے دیا، جیسا کہ ابوالدحداحؒ وغیرہ، جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابوالدحداحؒ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آپ سے پوچھا: اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض مانگتے ہیں، حالانکہ وہ قرض سے مستغنی ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے تم کو جنت میں داخل کر دیں، ابوالدحداحؒ نے یہ سن کر کہا: اللہ کے رسول ہاتھ بڑھائیں، آپ نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا، ابوالدحداحؒ نے کہنا شروع کیا:-

میں کھجور کے دو باغوں کا مالک ہوں، اس کے علاوہ میری ملک میں کچھ نہیں، میں اپنے یہ دونوں باغ اللہ تعالیٰ کو قرض دیتا ہوں۔

آپ نے اُن سے فرمایا: ایک اللہ کے راستے میں وقف کر دو اور دوسرا اپنے اہل و عیال کی معاشی ضرورت کے لئے باقی رکھو۔ ابوالدحداحؓ نے کہا: آپ گواہ رہے ان دونوں میں سے بہترین باغ جس میں کھجور کے چھ سو درخت ہیں، اس کو میں اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: اللہ تمہیں اس کے بدلے میں جنت عطا کریں گے۔ ابوالدحداحؓ اپنے گھر آئے اور بیوی کو اس کی اطلاع دے دی، تو وہ بھی ابوالدحداحؓ کے اس بہترین سودے پر بہت خوش ہوئیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

كَمْ مِّنْ عَدُوٍّ رَّدَّاحٍ وَدَارٍ فَيَاجِرٍ لِأَبِي الدَّحْدَاحِ - (قرطبی)

”کھجوروں سے لبریز بے شمار درخت اور کشادہ محلات کس قدر ابوالدحداح کے لئے تیار ہیں (یعنی جنت میں)۔“

۳- قرض میں واپسی کے وقت اگر زیادتی کی شرط نہ ٹھہرائی گئی ہو اور اپنی طرف سے قرض سے کچھ زیادہ ادا کر دیا، تو یہ پسندیدہ ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

إِنْ خِيَارَكُمُ أَحْسَنُكُمْ قَضَاءً -

”تم میں بہترین شخص وہ ہے جو اپنے حق (قرض) کو اچھے طریقے سے ادا کرے۔“

لیکن اگر زیادتی کی شرط ٹھہرائی گئی ہو تو وہ حرام ہے اور سود ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَا مِنْ بَنِي إِسْرَآءِ يُلُّ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ ۖ إِذْ قَالُوا النَّبِيُّ لَهُمْ

کیا نہ دیکھا تو نے ایک جماعت بنی اسرائیل کو موسیٰ کے بعد جب انہوں نے کہا اپنے نبی سے

ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ

مقرر کرو ہمارے لئے ایک بادشاہ تاکہ ہم لڑیں اللہ کی راہ میں، پیغمبر نے کہا: کیا تم سے بھی یہ توقع ہے کہ اگر حکم ہو لڑائی کا

۱- تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۳ ص: ۲۳۹ ومسنند احمد باختصار رقم الحديث: ۱۲۸۱۸

۲- صحيح البخاری، كتاب الوكالة، باب وكالة الشاهد والغائب جائزة ج: ۱ ص: ۳۰۹

عَلَيْكُمْ الْقِتَالُ إِلَّا تَقَاتِلُوا^ط قَالُوا وَمَا نَأَىٰ لَنَا الْقِتَالُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

تو تم اس وقت نہ لڑو؟ وہ بولے: ہم کو کیا کہ ہم نہ لڑیں اللہ کی راہ میں

وَقَدْ أَخْرَجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَاءَنَا^ط فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا

اور ہم تو نکال دیئے گئے اپنے گھروں سے اور بیٹوں سے، پھر جب حکم ہوا اُن کو لڑائی کا تو وہ سب پھر گئے

إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ^ط وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ^{۲۳۶} وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ

مگر تھوڑے سے ان میں کے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے گنہگاروں کو۔ اور فرمایا اُن سے اُن کے نبی نے: بے شک اللہ نے

قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلَكًا^ط قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ

مقرر فرمادیا تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ، کہنے لگے: کیونکر ہو سکتی ہے اس کو حکومت ہم پر اور ہم

أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ^ط قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ

زیادہ مستحق ہیں سلطنت کے اس سے، اور اس کو نہیں ملی کسائش مال میں، پیغمبر نے کہا: بے شک اللہ نے پسند فرمایا اس کو

عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ^ط وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ

تم پر اور زیادہ فراخی دی اس کو علم اور جسم میں، اور اللہ دیتا ہے ملک اپنا جس کو

يَشَاءُ^ط وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ^{۲۳۷} وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ

چاہے اور اللہ ہے فضل کرنے والا سب کچھ جاننے والا۔ اور کہا بنی اسرائیل سے اُن کے نبی نے کہ طالوت کی سلطنت کی نشانی

أَنْ يَأْتِيَكُمْ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ

یہ ہے کہ آوے تمہارے پاس ایک صندوق کہ جس میں تسلی خاطر ہے تمہارے رب کی طرف سے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں

مِمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحِثُّهُ الْمَلَكَةُ ۖ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً ۚ

اُن میں سے جو چھوڑ گئی تھی موسیٰ و ہارون کی اولاد اور اٹھالاویں گے اس صندوق کو فرشتے، بے شک اُس میں پوری نشانی ہے

لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ ۚ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ

تمہارے واسطے اگر تم یقین رکھتے ہو۔ پھر جب باہر نکلا طالوت فوجیں لے کر کہا: بے شک اللہ

مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ

تمہاری آزمائش کرتا ہے ایک نہر سے، سو جس نے پانی پیا اس نہر کا تو وہ میرا نہیں، اور جس نے اس کو نہ چکھا تو وہ بے شک

مِنِّيْ اِلَّا مَنْ غُرِفَ غُرْفَةً يَّيْدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۚ فَلَمَّا

میرا ہے، مگر جو کوئی بھرے ایک چلو اپنے ہاتھ سے، پھر پی لیا سب نے اس کا پانی مگر تھوڑوں نے ان میں سے، پھر جب

جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ

پار ہوا طالوت اور ایمان والے ساتھ اس کے تو کہنے لگے: طاقت نہیں ہم کو آج جالوت

وَجُنُودِهٖ ۚ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلْكُوْا اللّٰهَ ۚ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ

اور اس کے لشکروں سے لڑنے کی، کہنے لگے وہ لوگ جن کو خیال تھا کہ ان کو اللہ سے ملنا ہے: بارہا تھوڑی جماعت

غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۚ وَلَمَّا بَرَزُوْا

غالب ہوئی بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور جب سامنے ہوئے

لِجَالُوتَ وَجُنُودِهٖ قَالُوْا رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا

جالوت کے اور اس کی فوجوں کے تو بولے: اے رب ہمارے! ڈال دے ہمارے دلوں میں صبر اور جمائے رکھ ہمارے پاؤں،

وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٢٥٠﴾ فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُدُ

اور ہماری مدد کر اس کافر قوم پر۔ پھر شکست دی مومنوں نے جالوت کے لشکر کو اللہ کے حکم سے، اور مار ڈالا داؤد نے

جَالُوتَ وَاتَّاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مَبَاشِئًا ط وَلَوْلَا دَفْعُ

جالوت کو اور دی داؤد کو اللہ نے سلطنت اور حکمت اور سکھایا اُن کو جو چاہا، اور اگر نہ ہوتا دفع کر دینا

اللَّهُ النَّاسَ بَعْضُهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ

اللہ کا ایک کو دوسرے سے تو خراب ہو جاتا ملک، لیکن اللہ بہت مہربان ہے

عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٢٥١﴾

جہان کے لوگوں پر۔

آسان ترجمہ قرآن

کیا تمہیں موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے گروہ کے اس واقعے کا علم نہیں ہوا جب انہوں نے اپنے ایک نبی سے کہا تھا کہ ہمارا ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے تاکہ (اس کے جھنڈے تلے) ہم اللہ کے راستے میں جنگ کر سکیں۔ نبی نے کہا: ”کیا تم لوگوں سے یہ بات کچھ بعید ہے کہ جب تم پر جنگ فرض کی جائے تو تم نہ لڑو؟“ انہوں نے کہا: ”بھلا ہمیں کیا ہو جائے گا جو ہم اللہ کے راستے میں جنگ نہ کریں گے حالانکہ ہمیں اپنے گھروں اور اپنے بچوں کے پاس سے نکال باہر کیا گیا ہے۔“ پھر (ہوا یہی کہ) جب ان پر جنگ فرض کی گئی تو ان میں سے تھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب پیٹھ پھیر گئے۔ اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ ﴿۲۵۱﴾ اور ان کے نبی نے ان سے کہا کہ: ”اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ بنا کر بھیجا ہے۔“ کہنے لگے: ”بھلا اس کو ہم پر بادشاہت کرنے کا حق کہاں سے آگیا؟ ہم اس کے مقابلے میں بادشاہت کے زیادہ مستحق ہیں۔ اور اس کو تو مالی وسعت بھی حاصل نہیں۔“ نبی نے کہا: ”اللہ نے ان کو تم پر فضیلت دے کر چنا ہے، اور انہیں علم اور جسم میں (تم سے) زیادہ وسعت عطا کی ہے۔ اور اللہ اپنا ملک جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اور اللہ بڑی وسعت اور بڑا علم رکھنے والا ہے۔“ ﴿۲۵۲﴾ اور ان سے ان کے نبی نے یہ بھی کہا کہ: ”طالوت کی بادشاہت کی علامت یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق

(واپس) آجائے گا جس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے سکینت کا سامان ہے، اور موسیٰ اور ہارون نے جو اشیاء چھوڑی تھیں ان میں سے کچھ باقی ماندہ چیزیں ہیں۔ اسے فرشتے اٹھائے ہوئے لائیں گے، اگر تم مؤمن ہو تو تمہارے لئے اس میں بڑی نشانی ہے۔ ﴿۳۸﴾ چنانچہ جب طالوت لشکر کے ساتھ روانہ ہوا تو اس نے (لشکر والوں سے) کہا کہ: ”اللہ ایک دریا کے ذریعے تمہارا امتحان لینے والا ہے۔ جو شخص اس دریا سے پانی پیئے گا وہ میرا آدمی نہیں ہوگا، اور جو اسے نہیں چکھے گا وہ میرا آدمی ہوگا، الا یہ کہ کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے (تو کچھ حرج نہیں)۔“ پھر (ہوا یہ کہ) ان میں سے تھوڑے آدمیوں کے سوا باقی سب نے اس دریا سے (خوب) پانی پیا۔ چنانچہ جب وہ (یعنی طالوت) اور اس کے ساتھ ایمان رکھنے والے دریا کے پار اترے، تو یہ لوگ (جنہوں نے طالوت کا حکم نہیں مانا تھا) کہنے لگے کہ: ”آج جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی ہم میں بالکل طاقت نہیں ہے۔“ (مگر) جن لوگوں کا ایمان تھا کہ وہ اللہ سے جاملنے والے ہیں انہوں نے کہا کہ: ”نجانے کتنی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں۔ اور اللہ ان لوگوں کا ساتھی ہے جو صبر سے کام لیتے ہیں“ ﴿۳۹﴾ اور جب یہ لوگ جالوت اور اس کے لشکروں کے آمنے سامنے ہوئے تو انہوں نے کہا: ”اے ہمارے پروردگار! صبر و استقلال کی صفت ہم پر اُنڈیل دے، ہمیں ثابت قدمی بخش دے، اور ہمیں اس کافر قوم کے مقابلے میں فتح و نصرت عطا فرما دے“ ﴿۴۰﴾ چنانچہ انہوں نے اللہ کے حکم سے ان (جالوت کے ساتھیوں) کو شکست دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کیا، اور اللہ نے اس کو سلطنت اور دانائی عطا کی، اور جو علم چاہا اس کو عطا فرمایا۔ اگر اللہ لوگوں کا ایک دوسرے کے ذریعے دفاع نہ کرے تو زمین میں فساد پھیل جائے، لیکن اللہ تمام جہانوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ ﴿۴۱﴾

خلاصہ تفسیر

رابط آیات

مقصود اس مقام میں زیادہ تر غیب قتال کی ہے، اوپر کا قصہ اسی کی تمہید ہے، انفاق فی سبیل اللہ کا مضمون اسی کی تائید ہے، آگے طالوت و جالوت کا قصہ اسی کی تاکید ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے اس قصے میں قبض و بسط کا بھی مشاہدہ کرادیا، جس کا ذکر ما قبل کی آیت: **وَاللّٰهُ يُقِضُ وَيَضْطُّ** (البقرة: ۲۴۵) میں آیا ہے، کہ فقیر کو بادشاہ بنانا اور بادشاہ سے بادشاہت چھین لینا سب اسی کے اختیار میں ہے۔

طالوت اور جالوت کا قصہ

(اے مخاطب!) کیا تجھ کو بنی اسرائیل کی جماعت کا قصہ جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا ہے، تحقیق نہیں ہوا (جس

سے پہلے اُن پر کافر جالوت غالب آچکا تھا، اور ان کے کئی صوبے دبا لئے تھے) جبکہ ان لوگوں نے اپنے ایک پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے کہ ہم (اس کے ساتھ ہو کر) اللہ کی راہ میں (جالوت سے) قتال کریں، اس پیغمبر نے فرمایا کہ کیا یہ احتمال ہے اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے کہ تم (اس وقت) جہاد نہ کرو، وہ لوگ کہنے لگے کہ ہمارے واسطے ایسا کون سا سبب ہوگا کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں، حالانکہ (جہاد کے لئے ایک محرک بھی ہے، وہ یہ کہ) ہم (اُن کافروں کے ہاتھوں) اپنی بستیوں اور اپنے فرزندوں سے بھی جدا کر دیئے گئے ہیں (کیونکہ ان کی بعض بستیاں بھی کافروں نے دبا لی تھیں اور ان کی اولاد کو بھی قید کر لیا گیا تھا) پھر جب ان لوگوں کو جہاد کا حکم ہوا تو باستثناء ایک قلیل مقدار کے (باقی) سب بھر گئے، (جیسا کہ آگے جہاد کی غرض سے بادشاہ کے مقرر ہونے کا اور ان لوگوں کے پھر جانے کا تفصیلاً بیان آتا ہے) اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو (یعنی خلاف حکم کرنے والوں کو) خوب جانتے ہیں (سب کو مناسب سزا دیں گے) اور ان لوگوں سے ان کے پیغمبر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا، کہنے لگے: ان کو ہم پر حکمرانی کا کیسے حق حاصل ہو سکتا ہے، حالانکہ بہ نسبت ان کے ہم حکمرانی کے زیادہ مستحق ہیں، اور اُن کو کچھ مالی وسعت بھی نہیں دی گئی (کیونکہ طالوت غریب آدمی تھے) ان پیغمبر نے (جواب میں) فرمایا کہ (اول تو) اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقابلے میں اُن کو منتخب فرمایا ہے (اور انتخاب کی مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں) اور (دوسرے) علم (سیاست و حکمرانی) اور جسامت میں اس کو زیادتی دی ہے (اور بادشاہ ہونے کے لئے اس علم کی زیادہ ضرورت ہے، تاکہ ملکی انتظام پر قادر ہو اور جسامت بھی بایں معنی ہے کہ موافق و مخالف کے قلب میں وقعت و ہیبت ہو) اور (تیسرے) اللہ تعالیٰ (مالک الملک ہیں) اپنا ملک جس کو چاہیں دیں (ان سے کوئی سال کا منصب نہیں رکھتا) اور (چوتھے) اللہ تعالیٰ وسعت دینے والے ہیں (ان کو مال دے دینا کیا مشکل ہے، جس کے اعتبار سے تم کوشبہ ہو، اور) جاننے والے ہیں (کہ کون لیاقت سلطنت کی رکھتا ہے) اور (جب ان لوگوں نے پیغمبر سے یہ درخواست کی کہ اگر کوئی ظاہری حجت بھی ان کی منجانب اللہ بادشاہ ہونے کی ہم مشاہدہ کر لیں تو اور زیادہ اطمینان ہو جاوے، اس وقت) اُن سے اُن کے پیغمبر نے فرمایا کہ ان کے (منجانب اللہ) بادشاہ ہونے کی یہ علامت ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق (بدون تمہارے لائے ہوئے) آ جاوے گا جس میں تسکین (اور برکت) کی چیز ہے، تمہارے رب کی طرف سے (یعنی توراۃ، اور توراۃ کا منجانب اللہ ہونا ظاہر ہے) اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں جن کو حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام چھوڑ گئے ہیں (یعنی ان حضرات کے کچھ ملبوسات وغیرہ، غرض) اُس صندوق کو فرشتے لے آویں گے اس (طرح کے صندوق کے آجانے) میں تم لوگوں کے واسطے پوری نشانی ہے اگر تم یقین لانے والے ہو۔ پھر جب (بنی اسرائیل نے طالوت کو بادشاہ تسلیم کر لیا اور جالوت کے مقابلے کے لئے لوگ جمع ہو گئے اور) طالوت فوجوں کو لے کر (اپنے مقام یعنی بیت المقدس سے عمالقہ کی طرف) چلے تو انہوں نے (اپنے ہمراہی پیغمبر کی وحی کے ذریعے دریافت کر کے

۲- اَنْ يَّاتِيَكُمْ التَّابُوتُ، بنی اسرائیل میں ایک صندوق چلا آتا تھا، اس میں تمہرے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ انبیاء کے، بنی اسرائیل اس صندوق کو لڑائی میں آگے رکھتے، اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے فتح دیتا، جب جالوت بنی اسرائیل پر غالب آیا، تو یہ صندوق بھی وہ لے گیا تھا، جب اللہ تعالیٰ کو صندوق کا پہنچانا منظور ہوا تو یہ کیا کہ وہ کافر جہاں صندوق کو رکھتے وہیں وبا اور بلا آئی، پانچ شہر ویران ہو گئے، ناچار ہو کر دو بیلوں پر اس کو لاد کر ہانک دیا، فرشتے بیلوں کو ہانک کر طالوت کے دروازے پر پہنچا گئے، بنی اسرائیل اس نشانی کو دیکھ کر طالوت کی بادشاہت پر یقین لائے، اور طالوت نے جالوت پر فوج کشی کر دی اور موسم نہایت گرم تھا۔

۳- قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍؕ اس امتحان کی حکمت اور توجیہ احقر کے ذوق میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایسے مواقع پر جوش و خروش میں بھیڑ بھڑکا بہت ہو جایا کرتا ہے، لیکن وقت پر جسے والے کم ہوتے ہیں، اور اُس وقت ایسوں کا اُکھڑ جانا باقی لوگوں کے پاؤں بھی اُکھاڑ دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگوں کا علیحدہ کرنا منظور تھا، اس کا یہ امتحان مقرر کیا گیا جو کہ نہایت ہی مناسب ہے، کیونکہ قتال میں ضرورت استقلال و جفا کشی کی ہوتی ہے، سوشدت پیاس کے وقت بے منت پانی ملنے پر ضبط کرنا دلیل استقلال کی اور اندھے باؤلوں کی طرح جاگنا دلیل بے استقلال کی ہے، آگے خرقِ عادت ہے کہ زیادہ پانی پینے والے غیبی طور پر بھی زیادہ بے کار اور ازکار رفتہ ہو گئے، جیسا ”رُوح المعانی“ میں بسند ابن ابی حاتم حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے، اور اس قصے میں جو احوال و اقوال مذکور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تین قسم کے لوگ تھے: ناقص الایمان جو امتحان میں پورے نہ اُترے، اور کامل جو امتحان میں پورے اُترے، مگر اپنی قلت کی فکر ہوئی، اور اکمل جن کو یہ بھی فکر نہیں ہوئی۔

تِلْكَ آيَاتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ ۖ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

یہ آیتیں اللہ کی ہیں ہم تجھ کو سناتے ہیں ٹھیک ٹھیک اور تو بے شک ہمارے رسولوں میں ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم آپ کے سامنے ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سناتے ہیں، اور آپ بیشک ان پیغمبروں میں سے ہیں جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ ﴿۲۵۲﴾

خلاصہ تفسیر

چونکہ قرآن کریم کا ایک بڑا مقصد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اثبات بھی ہے، اس لئے جس جگہ مضمون کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے اس کا اعادہ کر دیا جاتا ہے، اس موقع پر اس قصہ کی صحیح صحیح خبر دینا جبکہ آپ نے نہ کسی سے پڑھانہ کہیں سنا نہ دیکھا، ایک معجزہ ہے، آپ کی نبوت کی صحیح دلیل ہے، اس لئے ان آیات میں آپ کی نبوت پر استدلال فرماتے ہیں:

نبوت محمدیہ پر استدلال

یہ (آیتیں جن میں یہ قصہ مذکور ہوا) اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو صحیح صحیح طور پر ہم تم کو پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور (اس سے ثابت ہوتا ہے کہ) آپ بلاشبہ پیغمبروں میں سے ہیں۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِّنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ

یہ سب رسول فضیلت دی ہم نے ان میں بعض کو بعض سے، کوئی تو وہ ہے کہ کلام فرمایا اس سے اللہ نے اور بلند کئے

بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ ۖ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ

بعضوں کے درجے اور دیئے ہم نے عیسیٰ مریم کے بیٹے کو معجزے صریح اور قوت دی اس کو

بِرُوحِ الْقُدُسِ ۖ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِينَ مِن بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا

روح القدس یعنی جبریل سے، اور اگر اللہ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ جو ہوئے ان پیغمبروں کے پیچھے بعد اس کے کہ

جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ وَلَكِنْ اخْتَلَفُوا فِيهِمْ مِّنْ أَمْنٍ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ۖ وَلَوْ

پہنچ چکے ان کے پاس صاف حکم لیکن ان میں اختلاف پڑ گیا، پھر کوئی تو ان میں ایمان لایا اور کوئی کافر ہوا، اور اگر

شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا ۚ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ۚ

اللہ چاہتا تو وہ باہم نہ لڑتے، لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہے۔

آسان ترجمہ قرآن

یہ پیغمبر جو ہم نے (مخلوق کی اصلاح کے لئے) بھیجے ہیں، ان کو ہم نے ایک دوسرے پر فضیلت عطا کی ہے۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام فرمایا، اور ان میں سے بعض کو اس نے بدرجہا بلندی عطا کی۔ اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو کھلی نشانیاں دیں، اور رُوح القدس سے ان کی مدد فرمائی۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے بعد والے لوگ اپنے پاس روشن دلائل آجانے کے بعد آپس میں نہ لڑتے، لیکن انہوں نے خود اختلاف کیا، چنانچہ ان میں سے کچھ وہ تھے جو ایمان لائے، اور کچھ وہ جنہوں نے کفر اپنایا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے، لیکن اللہ وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ ﴿۱۵۳﴾

خلاصہ تفسیر

بعض انبیاء اور اُمتوں کے کچھ احوال

یہ حضرات مرسلین (جن کا ذکر ابھی ﴿۱۵۲﴾ میں آیا ہے) ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے، (مثلاً) بعضے ان میں وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ (بلا واسطہ فرشتہ کے) ہم کلام ہوئے ہیں، (مراد موسیٰ علیہ السلام)، اور بعضوں کو ان میں بہت سے درجوں میں (اعلیٰ مقام سے) سرفراز کیا، اور ہم نے حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کو کھلے کھلے دلائل (یعنی معجزات) عطا فرمائے، اور ہم نے ان کی تائید رُوح القدس (یعنی جبریل علیہ السلام) سے فرمائی (ہر وقت یہود سے ان کی حفاظت کرنے کے لئے ساتھ رہتے تھے) اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو (اُمت کے) جو لوگ ان (پیغمبروں) کے بعد ہوئے ہیں (کبھی دین میں اختلاف کر کے) باہم قتل و قتال نہ کرتے بعد اس کے کہ اُن کے پاس (اُمر حق کے) دلائل (پیغمبروں کی معرفت) پہنچ چکے تھے (جن کا مقتضی تھا دین حق کے قبول پر متفق ہونا) لیکن (چونکہ اللہ تعالیٰ کو بعض حکمتیں منظور تھیں، اس لئے ان میں اتفاق مذہبی نہیں پیدا کیا) وہ لوگ باہم (دین میں) مختلف ہوئے، سو اُن میں کوئی تو ایمان لایا، اور کوئی کافر رہا، (پھر اس اختلاف میں نوبت قتل و قتال بھی پہنچ گئی) اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو وہ لوگ باہم قتل و قتال نہ کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ (اپنی حکمت سے) جو چاہتے ہیں (اپنی قدرت سے) وہی کرتے ہیں۔

معارف سائل

۱- تِلْكَ الرُّسُلُ الْآیَہ، اس مضمون میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک گونہ تسلی دینا ہے، کیونکہ جب آپ کی رسالت

دلیل سے ثابت تھی، جس کو وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۷۵۲﴾ میں بھی فرمایا ہے، اور پھر بھی منکرین نہ مانتے تھے، تو یہ آپ کے رنج و افسوس کا محل تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ بات سنادی کہ اور بھی پیغمبر مختلف درجوں کے گزر رہے ہیں، لیکن ایمان عام کسی کی اُمت میں نہیں ہوا، کسی نے موافقت کی، کسی نے مخالفت، اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہوتی ہیں، گو ہر شخص پر منکشف نہ ہوں، مگر اجمالاً اتنا عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ کوئی حکمت ضرور ہے۔

۲- تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ یہاں یہ اشکال پیش آسکتا ہے کہ یہ آیت صراحتہً اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ بعض انبیاء بعض سے افضل ہیں، حالانکہ حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-
لَا تَفْضِلُوا بَيْنَ أَنْبِيَائِ اللَّهِ۔ ﴿۱﴾ ”انبیاء کے درمیان تفضیل نہ کیا کرو۔“

نیز فرمایا:-

لَا تُخَيِّرُونِي عَلَى مُوسَى۔ ﴿۲﴾ ”مجھے موسیٰ پر فضیلت نہ دو۔“

اور فرمایا:-

لَا أَقُولُ إِنَّ أَحَدًا أَفْضَلُ مِنْ يُونُسَ بْنِ مَتَّى۔ ﴿۳﴾

”میں نہیں کہہ سکتا کہ کوئی یونس بن متی سے افضل ہے۔“

ان احادیث میں بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دینے کی ممانعت وارد ہوئی ہے؟

جواب یہ ہے کہ احادیث کا مطلب یہ ہے کہ دلیل کے بغیر اپنی رائے سے بعض کو بعض پر فضیلت نہ دو، اس لئے کہ کسی نبی کے افضل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے یہاں اُن کا مرتبہ بہت زیادہ ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کا علم رائے اور قیاس سے حاصل نہیں ہو سکتا، لیکن قرآن و سنت کی کسی دلیل سے اگر بعض انبیاء کی بعض پر فضیلت معلوم ہوگئی تو اس کے مطابق اعتقاد رکھا جائے گا۔

رہا آپ کا یہ ارشاد کہ ”لَا أَقُولُ إِنَّ أَحَدًا أَفْضَلُ مِنْ يُونُسَ بْنِ مَتَّى“ اور ”لَا تُخَيِّرُونِي عَلَى مُوسَى“ تو یہ اس وقت سے متعلق ہے جبکہ آپ کو یہ علم نہیں دیا گیا تھا کہ آپ تمام انبیاء سے افضل ہیں، بعد میں بذریعہ وحی آپ کو یہ بات بتلا دی گئی اور صحابہ کرامؓ سے آپ نے اس کا اظہار بھی فرما دیا۔ (مظہری)

۳- مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ، موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہم کلامی گوبلا واسطہ فرشتہ کے ہو مگر بے حجاب نہ تھی، پس سورہ شوریٰ

۱ صحیح البخاری، کتاب الأنبياء، باب قول الله عز وجل وان يونس الآية ج: ۱ ص: ۳۸۵

۲ صحیح البخاری، کتاب الخصومات، باب ما يذکر فی الأشخاص... إلخ ج: ۱ ص: ۳۲۵

۳ صحیح البخاری ج: ۱ ص: ۳۸۵

کی آیت: وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ السَّمْعَ (الشوری: ۵۱) جس میں بے حجاب کلام کی نفی کی گئی اس سے کچھ تعارض نہ رہا، البتہ بعد موت کے بے حجاب کلام ہونا بھی شرعاً ممکن ہے، پس وہ شوریٰ کی آیت دُنیا کے اعتبار سے ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمْ يَوْمٌ

اے ایمان والو! خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے تم کو روزی دی پہلے اُس دن کے آنے سے کہ جس میں

لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ ۖ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۵۴﴾

نہ خرید و فروخت ہے اور نہ آشنائی اور نہ سفارش، اور جو کافر ہیں وہی ہیں ظالم۔

آسان ترجمہ قرآن

اے ایمان والو! جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے وہ دن آنے سے پہلے پہلے (اللہ کے راستے میں) خرچ کر لو جس دن نہ کوئی سودا ہوگا، نہ کوئی دوستی (کام آئے گی)، اور نہ کوئی سفارش ہو سکے گی۔ اور ظالم وہ لوگ ہیں جو کفر اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ﴿۲۵۴﴾

خلاصہ تفسیر

انفاق فی سبیل اللہ میں تعجیل کرنا

اے ایمان والو! خرچ کرو ان چیزوں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں قبل اس کے کہ وہ دن آ جاوے (یعنی قیامت کا دن) جس میں (کوئی چیز اعمالِ خیر کا بدل نہ ہو سکے گی، کیونکہ اس میں) نہ تو خرید و فروخت ہوگی (کہ کوئی چیز دے کر اعمالِ خیر کی خرید کر لو) اور نہ (ایسی) دوستی ہوگی (کہ کوئی تم کو اپنے اعمالِ خیر دیدے) اور نہ (بلا اذنِ الہی کسی کی) کوئی سفارش ہوگی (جس سے اعمالِ خیر کی تم کو حاجت نہ رہے) اور کافر ہی لوگ ظلم کرتے ہیں (کہ اعمال اور مال کو بے موقع استعمال کرتے ہیں، اس طرح کہ طاعاتِ بدنہ و مالیہ کو ترک اور معصیتِ مالیہ و بدنہ کو اختیار کرتے ہیں، تم تو ایسے نہ بنو)۔

معارف مسائل

اس سورۃ میں عبادات و معاملات کے متعلق احکام کثیرہ بیان فرمائے جن میں سب کی تعمیل نفس کو ناگوار اور بھاری

ہے، اور تمام اعمال میں زیادہ دُشوار انسان کو جان اور مال کا خرچ کرنا ہوتا ہے، اور احکامِ الہی اکثر جو دیکھے جاتے ہیں یا جان کے متعلق یا مال کے، اور گناہ میں بندہ کو جان یا مال کی محبت اور رعایت ہی اکثر مبتلا کرتی ہے، گویا ان دونوں کی محبت گناہوں کی جڑ اور اس سے نجات جملہ طاعات کی سہولت کا منشا ہے، اس لئے ان احکامات کو بیان فرما کر قتال اور انفاق کو بیان فرمانا مناسب ہوا۔ (البقرة: ۲۴۴) میں اوّل کا بیان تھا، اور مَنْ ذَا الَّذِي يَقْرِضُ اللَّهَ الْغَنَاءَ (البقرة: ۲۴۵) میں دُوسرے کا ذکر ہے، اس کے بعد قصہ طالوت سے اوّل کی تاکید ہوئی تو اب أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ الْغَنَاءَ (البقرة: ۲۵۴) سے دُوسرے کی تاکید منظور ہے، اور چونکہ انفاق مال پر بہت سے اُمور عبادات و معاملات کے موقوف ہیں، تو اس کے بیان میں زیادہ تفصیل اور تاکید سے کام لیا، چنانچہ اب جو رُکوع آتے ہیں ان میں اکثروں میں امرِ ثانی یعنی انفاق مال کا ذکر ہے، خلاصہ معنی یہ ہوا کہ عمل کا وقت ابھی ہے، آخرت میں تو نہ عمل بکتے ہیں، نہ کوئی دوستی سے دیتا ہے، نہ کوئی سفارش سے چھڑا سکتا ہے، جب تک پکڑنے والا نہ چھوڑے۔

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۚ لَا تَأْخُذُهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ ۚ لَهُ مَا

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ ہے، سب کا تھامنے والا، نہیں پکڑ سکتی اس کو اُونگھ اور نہ نیند، اسی کا ہے جو کچھ

فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ

آسمانوں اور زمین میں ہے، اور ایسا کون ہے جو سفارش کرے اس کے پاس مگر اس کی اجازت سے،

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ

جانتا ہے جو کچھ خلقت کے رُوبرو ہے اور جو کچھ اُن کے پیچھے ہے، اور وہ سب احاطہ نہیں کر سکتے کسی چیز کا اس کی معلومات میں سے

إِلَّا بِإِشَاءٍ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ ۚ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ۚ

مگر جتنا کہ وہ چاہے، گنجائش ہے اس کی کرسی میں تمام آسمانوں اور زمین کو، اور گراں نہیں اس کو تھامنا ان کا،

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿۲۵۵﴾

اور وہی ہے سب سے برتر عظمت والا۔

آسان ترجمہ قرآن

اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو سدا زندہ ہے، جو پوری کائنات سنبھالے ہوئے ہے؛ جس کو نہ کبھی اُٹکھ لگتی ہے، نہ نیند۔ آسمانوں میں جو کچھ ہے (وہ بھی) اور زمین میں جو کچھ ہے (وہ بھی)، سب اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کر سکے؟ وہ سارے بندوں کے تمام آگے پیچھے کے حالات کو خوب جانتا ہے، اور وہ لوگ اُس کے علم کی کوئی بات اپنے علم کے دائرے میں نہیں لاسکتے، سوائے اُس بات کے جسے وہ خود چاہے۔ اس کی کرسی نے سارے آسمانوں اور زمین کو گھیرا ہوا ہے، اور ان دونوں کی نگہبانی سے اسے ذرا بھی بوجھ نہیں ہوتا، اور وہ بڑا عالی مقام، صاحبِ عظمت ہے۔ (۱۵۵)

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ (ایسا ہے کہ) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، زندہ ہے (جس کو کبھی موت نہیں آسکتی)، سنبھالنے والا ہے (تمام عالم کا) نہ اس کو اُٹکھ دیا سکتی ہے اور نہ نیند (دبا سکتی ہے)، اسی کے مملوک ہیں سب جو کچھ (بھی) آسمانوں میں (موجودات) ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں، ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس (کسی کی) سفارش کر سکے بدون اس کی اجازت کے، وہ جانتا ہے ان (تمام موجودات) کے تمام حاضر و غائب حالات کو، اور وہ موجودات اس کی معلومات میں سے کسی چیز کو اپنے احاطہ علمی میں نہیں لاسکتے مگر جس قدر (علم دینا وہی) چاہے، اس کی کرسی (اتنی بڑی ہے کہ اس) نے سب آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لے رکھا ہے، اور اللہ تعالیٰ کو ان دونوں (آسمان و زمین) کی حفاظت کچھ گراں نہیں گزرتی، اور وہ عالی شان عظیم الشان ہے۔

معارف مسائل

آیت الکرسی کے خاص فضائل

یہ آیت قرآن کریم کی عظیم ترین آیت ہے، احادیث میں اس کے بڑے فضائل و برکات مذکور ہیں، مسند احمد کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سب آیات سے افضل فرمایا ہے، اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ قرآن میں کونسی آیت سب سے زیادہ عظیم

ہے، اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: آیت الکرسی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا: اے ابوالمنذر تمہیں علم مبارک ہو۔ [۱]

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: یا رسول اللہ! قرآن میں عظیم تر آیت کونسی ہے؟ فرمایا: آیت الکرسی۔ (ابن کثیر عن احمد فی المسند) [۲]

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورہ بقرہ میں ایک آیت ہے جو سیدہ آیات القرآن ہے، وہ جس گھر میں پڑھی جائے شیطان اس سے نکل جاتا ہے۔ [۳]

نسائی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص ہر نماز فرض کے بعد آیت الکرسی پڑھا کرے تو اس کو جنت میں داخل ہونے کے لئے بجز موت کے کوئی مانع نہیں ہے، یعنی موت کے بعد فوراً وہ جنت کے آثار اور راحت و آرام کا مشاہدہ کرنے لگے گا۔

اس آیت میں اللہ جل شانہ کی توحید ذات و صفات کا بیان ایک عجیب و غریب انداز میں بیان کیا گیا ہے، جس میں اللہ جل شانہ کا موجود ہونا، زندہ ہونا، سمیع و بصیر ہونا، متکلم ہونا، واجب الوجود ہونا، دائم و باقی ہونا، سب کائنات کا موجد و خالق ہونا، تغیرات اور تاثرات سے بالاتر ہونا، تمام کائنات کا مالک ہونا، صاحب عظمت و جلال ہونا، کہ اس کے آگے کوئی بغیر اس کی اجازت کے بول نہیں سکتا، ایسی قدرت کاملہ کا مالک ہونا کہ سارے عالم اور اس کی کائنات کو پیدا کرنے باقی رکھنے اور ان کا نظام محکم قائم رکھنے سے اس کو نہ کوئی تھکان پیش آتا ہے نہ سستی، ایسے علم محیط کا مالک ہونا جس سے کوئی کھلی یا چھپی چیز کا کوئی ذرہ یا قطرہ باہر نہ رہے، یہ اجمالی مفہوم ہے اس آیت کا، اب تفصیل کے ساتھ اس کے الفاظ کے معنی سنئے:-

اس آیت میں دس جملے ہیں، پہلا جملہ ہے: **اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ** اس میں لفظ **اللَّهُ** اسم ذات ہے، جس کے معنی ہیں ”وہ ذات جو تمام کمالات کی جامع اور تمام نقائص سے پاک ہے“، **لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ** میں اسی ذات کا بیان ہے، کہ قابل عبادت اس ذات کے سوا کوئی چیز نہیں۔

دوسرا جملہ ہے **الْحَيُّ الْقَيُّومُ** لفظ **”حَيٌّ“** کے معنی عربی زبان میں ہیں ”زندہ“ اسمائے الہیہ میں سے یہ لفظ لا کر یہ بتلانا ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والا ہے، وہ موت سے بالاتر ہے، لفظ **”قَيُّومُ“** قیام سے نکلا ہے، قیام کے معنی کھڑا ہونا، ”قائم“ کھڑا ہونے والے کو کہتے ہیں۔ ”قَيُّوم“ اور ”قَيَّام“ مبالغہ کے صیغہ کہلاتے ہیں، ان کے معنی ہیں وہ جو خود قائم رہ کر دوسروں کو قائم رکھتا اور سنبھالتا ہے۔ ”قَيُّوم“ حق تعالیٰ کی خاص صفت ہے، جس میں کوئی مخلوق شریک نہیں ہو سکتی،

کیونکہ جو چیزیں خود اپنے وجود و بقا میں کسی دوسرے کی محتاج ہوں وہ کسی دوسری چیز کو کیا سنبھال سکتی ہیں؟ اس لئے کسی انسان کو ”قیوم“ کہنا جائز نہیں، جو لوگ ”عبدالقیوم“ کے نام کو بگاڑ کر صرف ”قیوم“ بولتے ہیں گنہگار ہوتے ہیں۔

اللہ جل شانہ کے اسمائے صفات میں ”حی و قیوم“ کا مجموعہ بہت سے حضرات کے نزدیک اسم اعظم ہے، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوہ بدر میں میں نے ایک وقت یہ چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھوں آپ کیا کر رہے ہیں، پہنچا تو دیکھا کہ آپ سجدہ میں پڑے ہوئے بار بار ”يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ، يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ“ کہہ رہے ہیں۔^[۱]

تیسرا جملہ لَا تَأْخُذُكَ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ^۲ ہے، لفظ ”سِنَّةٌ“ سین کے زیر کے ساتھ، اُونگھ کو کہتے ہیں، جو نیند کے ابتدائی آثار ہوتے ہیں، اور ”نَوْمٌ“ مکمل نیند کو۔ اس جملے کا مفہوم یہ کہ اللہ جل شانہ اُونگھ اور نیند سب سے بری و بالا ہے، پچھلے جملے میں لفظ ”قیوم“ نے جب انسان کو یہ بتلایا کہ اللہ جل شانہ سارے آسمانوں، زمینوں اور ان میں سمانے والی تمام کائنات کو تھامے اور سنبھالے ہوئے ہیں، اور ساری کائنات اسی کے سہارے قائم ہے، تو ایک انسان کا خیال اپنی جبلت و فطرت کے مطابق اس طرف جانا ممکن ہے کہ جو ذات پاک اتنا بڑا کام کر رہی ہے اس کو کسی وقت تھکان بھی ہونا چاہئے، کچھ وقت آرام اور نیند کے لئے بھی ہونا چاہئے، اس دوسرے جملے میں محدود علم و بصیرت اور محدود قدرت رکھنے والے انسان کو اس پر متنبہ کر دیا کہ اللہ جل شانہ کو اپنے اوپر یا دوسری مخلوقات پر قیاس نہ کرے، اپنا جیسا نہ سمجھے، وہ مثل و مثال سے بالاتر ہے، اس کی قدرت کاملہ کے سامنے یہ سارے کام نہ کچھ مشکل ہیں، نہ اُس کے لئے تکان کا سبب ہیں، اور اس کی ذات پاک تمام تاثرات اور تکان و تعب اور اُونگھ اور نیند سے بالاتر ہے۔

چوتھا جملہ ہے لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ^۳ اس کے شروع میں لفظ لَهُ کا ”لام“ تملیک کے معنی کے لئے آیا ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ تمام چیزیں جو آسمانوں یا زمین میں ہیں سب اللہ تعالیٰ کی مملوک ہیں، وہ مختار ہے، جس طرح چاہے اُن میں تصرف فرماوے۔

پانچواں جملہ ہے مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ^۴ اِلَّا بِاِذْنِهِ^۵ یعنی ”ایسا کون ہے جو اس کے آگے کسی کی سفارش کر سکے بدون اس کی اجازت کے“، اس میں چند مسائل بیان فرمادیئے ہیں:-

اول یہ کہ جب اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا مالک ہے، کوئی اس سے بڑا اور اس کے اوپر حاکم نہیں تو کوئی اس سے کسی کام کے بارے میں باز پرس کرنے کا بھی حق دار نہیں، وہ جو حکم جاری فرمائیں اس میں کسی کو چون و چرا کی مجال نہیں، ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص کسی کی سفارش و شفاعت کرے سو اس کو بھی واضح فرما دیا کہ بارگاہِ عزت و جلال میں کسی کو مجالِ دم زدن نہیں، ہاں کچھ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں جن کو خاص طور پر کلام اور شفاعت کی اجازت دے دی جائے گی، غرض

بلا اجازت کوئی کسی کی سفارش و شفاعت بھی نہ کر سکے گا، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر میں سب سے پہلے میں ساری اُمتوں کی شفاعت کروں گا، اسی کا نام مقام محمود ہے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے۔

چھٹا جملہ ہے **يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ** یعنی ”اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کے آگے پیچھے کے تمام حالات و واقعات سے واقف و باخبر ہے۔“ آگے اور پیچھے کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اُن کے پیدا ہونے سے پہلے اور پیدا ہونے کے بعد کے تمام حالات و واقعات حق تعالیٰ کے علم میں ہیں، اور یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ آگے سے مراد وہ حالات ہیں جو انسان کے لئے کھلے ہوئے ہیں، اور پیچھے سے مراد اس سے مخفی واقعات و حالات ہوں تو معنی یہ ہوں گے کہ انسان کا علم تو بعض چیزوں پر ہے، اور بعض پر نہیں، کچھ چیزیں اس کے سامنے کھلی ہوئی ہیں کچھ چھپی ہوئی، مگر اللہ جل شانہ کے سامنے یہ سب چیزیں برابر ہیں، اس کا علم ان سب چیزوں کو یکساں محیط ہے، اور ان دونوں مفہوموں میں کوئی تعارض نہیں، آیت کی وسعت میں یہ دونوں داخل ہیں۔

ساتواں جملہ **وَلَا يُحِيطُونَ شَيْئًا مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ** ہے، یعنی ”انسان اور تمام مخلوقات اللہ کے علم کے کسی حصہ کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے، مگر اللہ تعالیٰ ہی خود جس کو جتنا حصہ علم عطا کرنا چاہیں صرف اتنا ہی اس کو علم ہو سکتا ہے۔“ اس میں بتلادیا گیا کہ تمام کائنات کے ذرہ ذرہ کا علم محیط صرف اللہ جل شانہ کی خصوصی صفت ہے، انسان یا کوئی مخلوق اس میں شریک نہیں ہو سکتی۔

آٹھواں جملہ ہے **وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ** یعنی ”اس کی کرسی اتنی بڑی ہے جس کی وسعت کے اندر ساتوں آسمان اور زمین سمائے ہوئے ہیں۔“ اللہ جل شانہ نشست و برخاست اور حیّز و مکان سے بالاتر ہیں۔ اس قسم کی آیات کو اپنے معاملات پر قیاس نہ کیا جائے، اس کی کیفیت و حقیقت کا ادراک انسانی عقل سے بالاتر ہے، البتہ مستند روایات حدیث سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ”عرش“ اور ”کرسی“ بہت عظیم الشان جسم ہیں جو تمام آسمان و زمین سے بدرجہا بڑے ہیں۔

ابن کثیرؒ نے بروایت حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کرسی کیا اور کیسی ہے؟ آپ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ ساتوں آسمانوں اور زمینوں کی مثال کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے ایک بڑے میدان میں کوئی حلقہ انگشتی جیسا ڈال دیا جائے۔^۲

۱ تفسیر ابن کثیر، تحت تفسیر بنی اسرائیل آیت: ۷۹: ج: ۵: ص: ۱۰۳

۲ تفسیر ابن کثیر تحت هذه الآية ج: ۱: ص: ۶۸۰

اور بعض دوسری روایات میں ہے کہ عرش کے سامنے کرسی کی مثال بھی ایسی ہی ہے جیسے ایک بڑے میدان میں انگشتی کا حلقہ۔

نواں جملہ ہے **وَلَا يُوَدُّهُ حِفْظُهُمْ** یعنی ”اللہ تعالیٰ کو ان دونوں عظیم مخلوقات آسمان وزمین کی حفاظت کچھ گراں نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ اس قادرِ مطلق کی قدرتِ کاملہ کے سامنے یہ سب چیزیں نہایت آسان ہیں۔

دسواں آخری جملہ ہے **وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ** (۲۵۵) یعنی ”وہ عالی شان اور عظیم الشان ہے“، پچھلے نو جملوں میں حق تعالیٰ کی ذات و صفات کے کمالات بیان ہوئے ہیں، ان کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد ہر عقل رکھنے والا انسان یہی کہنے پر مجبور ہے کہ عزت و عظمت اور بلندی و برتری کی مالک و سزاوار وہی ذاتِ پاک ہے، ان دس جملوں میں اللہ جل شانہ کی صفاتِ کمال اور اس کی توحید کا مضمون پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ آگیا۔

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۚ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَكْفُرْ

زبردستی نہیں دین کے معاملے میں، بے شک جدا ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے، اب جو کوئی نہ مانے

بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنُ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ ۚ

گمراہ کرنے والوں اور یقین لاوے اللہ پر تو اس نے پکڑ لیا حلقہ مضبوط

لَا انْقِصَامَ لَهَا ۚ وَاللَّهُ سَبِيْعٌ عَلَيْهِمُ (۲۵۱)

جو ٹوٹنے والا نہیں، اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت کا راستہ گمراہی سے ممتاز ہو کر واضح ہو چکا۔ اس کے بعد جو شخص طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آئے گا، اس نے ایک مضبوط کنڈا تھام لیا جس کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں۔

اور اللہ خوب سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ (۲۵۱)

خلاصہ تفسیر

دین (اسلام کے قبول کرنے) میں زبردستی (کافی نفسہ کوئی موقع) نہیں (کیونکہ) ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے (یعنی اسلام کا حق ہونا دلائل سے واضح ہو چکا ہے، تو اس میں اکراہ کا موقع ہی کیا ہے، اکراہ تو غیر پسندیدہ چیز پر مجبور کرنے سے ہوتا ہے، اور جب اسلام کی خوبی یقیناً ثابت ہے) تو جو شخص شیطان سے بد اعتقاد ہو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ خوش اعتقاد (یعنی اسلام قبول کر لے) تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا جو کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے ہیں (اقوال ظاہری کے) اور خوب جاننے والے ہیں (احوال باطنی کے)۔

معارف مسائل

اسلام کو مضبوط پکڑنے والا چونکہ ہلاکت اور محرومی سے محفوظ رہتا ہے، اس لئے اس کو ایسے شخص سے تشبیہ دی جو کسی مضبوط رسی کا حلقہ ہاتھ میں مضبوط تھام کر گرنے سے مأمون رہتا ہے، اور جس طرح ایسی رسی ٹوٹ کر گرنے کا خطرہ نہیں اور یوں کوئی رسی ہی چھوڑ دے تو اور بات ہے، اسی طرح اسلام میں کسی قسم کی ہلاکت اور خسران نہیں ہے، اور خود کوئی اسلام کو ہی چھوڑ دے تو اور بات ہے۔ (بیان القرآن)

اس آیت کو دیکھتے ہوئے بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں زبردستی نہیں ہے، حالانکہ اسلام میں جہاد اور قتال کی تعلیم اس کے معارض ہے۔ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اسلام میں جہاد اور قتال کی تعلیم لوگوں کو قبول ایمان پر مجبور کرنے کے لئے نہیں ہے، ورنہ جزیہ لے کر کفار کو اپنی ذمہ داری میں رکھنے اور ان کی جان و مال و آبرو کی حفاظت کرنے کے اسلامی احکام کیسے جاری ہوتے، بلکہ دفع فساد کے لئے ہے، کیونکہ فساد اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے، جس کے درپے کافر رہتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:-

وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿٢٣﴾ (المائدة)

”یہ لوگ زمین میں فساد کرتے پھرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہاد اور قتال کے ذریعے سے ان لوگوں کے فساد کو دُور کرنے کا حکم دیا ہے، پس ان لوگوں کا قتل ایسا ہی ہے جیسے سانپ، بچھو اور دیگر موزی جانوروں کا قتل۔

اسلام نے عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور اpanچ وغیرہ کے قتل کو عین میدانِ جہاد میں بھی سختی سے روکا ہے، کیونکہ وہ فساد کرنے پر قادر نہیں ہوتے، ایسے ہی اُن لوگوں کے بھی قتل کرنے کو روکا ہے جو جزیہ ادا کرنے کا وعدہ کر کے قانون کے پابند ہو گئے ہوں۔

اسلام کے اس طرزِ عمل سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ جہاد اور قتال سے لوگوں کو ایمان قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا، بلکہ اس سے وہ دُنیا میں ظلم و ستم کو مٹا کر عدل و انصاف اور اَمْن و امان قائم رکھنا چاہتا ہے، حضرت عمرؓ نے ایک نصرانی بڑھیا کو اسلام کی دعوت دی تو اس کے جواب میں اس نے کہا: ”أَنَا عَجُوزٌ كَبِيرَةٌ وَالْمَوْتُ إِلَيَّ قَرِيبٌ“ یعنی ”میں ایک قریب المرگ بڑھیا ہوں، آخری وقت میں اپنا مذہب کیوں چھوڑوں؟“ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر اس کو ایمان پر مجبور نہیں کیا، بلکہ یہی آیت تلاوت فرمائی: لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۖ یعنی ”دین میں زبردستی نہیں ہے۔“

درحقیقت ایمان کے قبول پر جبر و اکراہ ممکن بھی نہیں ہے، اس لئے کہ ایمان کا تعلق ظاہری اعضاء سے نہیں ہے، بلکہ قلب کے ساتھ ہے، اور جبر و اکراہ کا تعلق صرف ظاہری اعضاء سے ہوتا ہے، اور جہاد و قتال سے صرف ظاہری اعضاء ہی متاثر ہو سکتے ہیں، لہذا اس کے ذریعہ سے ایمان کے قبول کرنے پر جبر ممکن ہی نہیں ہے، اس سے ثابت ہوا کہ آیاتِ جہاد و قتال آیت لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۖ کے معارض نہیں ہیں۔ (مظہری، قرطبی) ۱۱

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۖ وَالَّذِينَ

اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا، نکالتا ہے ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف، اور جو لوگ

كَفَرُوا أُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۖ يُخْرِجُهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ ۗ

کافر ہوئے اُن کے رفیق ہیں شیطان، نکالتے ہیں اُن کو روشنی سے اندھیروں کی طرف،

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۚ

یہی لوگ ہیں دوزخ میں رہنے والے، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

آسان ترجمہ قرآن

اللہ ایمان والوں کا رکھوالا ہے، وہ انہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر اپنالیا ہے، ان کے رکھوالے وہ شیطان ہیں جو انہیں روشنی سے نکال کر اندھیروں میں لے جاتے ہیں۔ وہ سب آگ کے باسی ہیں، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ (۲۵۸)

خلاصہ تفسیر

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا (الی قولہ) خُلِدُونَ ﴿۲۵۸﴾ اللہ تعالیٰ ساتھی ہی ان لوگوں کا جو ایمان لائے ان کو (کفر کی) تاریکیوں سے نکال کر یا بچا کر نور (اسلام) کی طرف لاتا ہے، اور جو لوگ کافر ہیں اُن کے ساتھی شیاطین ہیں (اُسی یا جنی) وہ ان کو نور (اسلام) سے نکال کر یا بچا کر (کفر کی) تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں، ایسے لوگ (جو اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کریں) دوزخ میں رہنے والے ہیں (اور) یہ لوگ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کور ہیں گے۔

معارف مسائل

اس آیت سے ایمان کا سب سے بڑی نعمت اور کفر کا سب سے بڑی مصیبت ہونا بھی معلوم ہوا اور یہ بھی کہ کافروں کی دوستی میں بھی ظلمت ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ

کیا نہ دیکھا تو نے اس شخص کو جس نے جھگڑا کیا ابراہیم سے اس کے رب کی بابت اس وجہ سے کہ دی تھی اللہ نے اس کو سلطنت،

إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ ۖ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ ط

جب کہا ابراہیم نے: میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، وہ بولا: میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں،

قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ

کہا ابراہیم نے: بے شک وہ لاتا ہے سورج کو مشرق سے اب تو لے آ اس کو مغرب سے،

فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ۖ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٢٥٨﴾

تب حیران رہ گیا وہ کافر، اور اللہ سیدھی راہ نہیں دکھاتا بے انصافوں کو۔

آسان ترجمہ قرآن

کیا تم نے اس شخص (کے حال) پر غور کیا جس کو اللہ نے سلطنت کیا دے دی تھی کہ وہ اپنے پروردگار (کے وجود ہی) کے بارے میں ابراہیم سے بحث کرنے لگا؟ جب ابراہیم نے کہا کہ: ”میرا پروردگار وہ ہے جو زندگی بھی دیتا ہے اور موت بھی“ تو وہ کہنے لگا کہ: ”میں بھی زندگی دیتا ہوں اور موت دیتا ہوں۔“ ابراہیم نے کہا: ”اچھا! اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تم ذرا اسے مغرب سے تو نکال کر لاؤ۔“ اس پر وہ کافر مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ ﴿۲۵۸﴾

خلاصہ تفسیر

(اے مخاطب!) کیا تجھ کو اس شخص کا قصہ تحقیق نہیں ہوا (یعنی نمرود کا) جس نے ابراہیم (علیہ السلام) سے مباحثہ کیا تھا اپنے پروردگار کے (وجود کے) بارے میں (یعنی توبہ توبہ وہ خدا کے وجود ہی کا منکر تھا) اس وجہ سے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو سلطنت دی تھی (یعنی چاہئے تو یہ تھا کہ نعمت سلطنت پر احسان ماننا اور ایمان لاتا، اس کے برعکس انکار اور کفر شروع کر دیا اور یہ مباحثہ اس وقت شروع ہوا تھا) جب ابراہیم علیہ السلام نے (اس کے پوچھنے پر کہ خدا کیسا ہے، جواب میں) فرمایا کہ میرا پروردگار ایسا ہے کہ وہ جلاتا ہے اور مارتا ہے (یعنی زندہ کرنا اور مارنا اس کی قدرت میں ہے، وہ کوڑھ مغز جلانے مارنے کا مطلب تو سمجھا نہیں) کہنے لگا کہ (یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں کہ) میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں (چنانچہ جس کو چاہوں قتل کر دوں، یہ تو مارنا ہے، اور جس کو چاہوں قتل سے معاف کر دوں، یہ جلانا ہے) ابراہیم علیہ السلام نے (جب دیکھا کہ بالکل ہی بھدی عقل کا ہے کہ اس کو جلانا اور مارنا سمجھتا ہے، حالانکہ جلانے کی حقیقت بے جان چیز میں جان ڈال دینا ہے، اسی طرح مارنے کا معاملہ سمجھو، اور قرآن سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ جلانے اور مارنے کی حقیقت سمجھے گا نہیں، اس لئے اس ضرورت سے دوسرے جواب کی طرف متوجہ ہوئے اور) فرمایا کہ (اچھا) اللہ تعالیٰ آفتاب کو (روزانہ) مشرق سے نکالتا ہے تو (ایک ہی دن) مغرب سے نکال (کر دکھلا) اس پر متحیر رہ گیا وہ کافر (اور کچھ جواب نہ بن آیا، اس کا مقتضی یہ تھا کہ وہ ہدایت کو قبول کرتا، مگر وہ اپنی گمراہی پر جمارہا اس لئے ہدایت نہ ہوئی) اور اللہ تعالیٰ (کی عادت ہے کہ) ایسے بے جا راہ

چلنے والوں کو ہدایت نہیں فرماتے۔

معارف مسائل

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کافر کو دنیاوی عزت و شرف اور ملک و سلطنت عطا کر دیں تو اس نام سے تعبیر کرنا جائز ہے، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت مناظرہ اور مجادلہ کرنا بھی جائز ہے، تاکہ حق و باطل میں فرق ظاہر ہو جائے۔ (قرطبی) ^[۱]

بعضوں کو یہ شبہ ہوا کہ اس کو یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ اگر خدا موجود ہے تو وہی مغرب سے نکالے۔ دفع اس شبہ کا یہ ہے کہ اس کے قلب میں بلا اختیار یہ بات پڑ گئی کہ خدا ضرور ہے، اور یہ مشرق سے نکالنا اسی کا فعل ہے، اور وہ مغرب سے بھی نکال سکتا ہے، اور یہ شخص پیغمبر ہے، اس کے کہنے سے ضرور ایسا ہوگا، اور ایسا ہونے سے انقلاب عظیم عالم میں پیدا ہوگا، کہیں اور لینے کے دینے نہ پڑ جائیں، مثلاً لوگ اس معجزے کو دیکھ کر مجھ سے منحرف ہو کر ان کی راہ پر ہو لیں، ذرا سی حجت میں سلطنت جاتی رہے، یہ جواب تو اس لئے نہ دیا اور دوسرا کوئی جواب تھا نہیں، اس لئے حیران رہ گیا۔ (بیان القرآن) ^[۲]

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا^ج قَالَ أَنَّى يُحْيِي هَذِهِ

کیا نہ دیکھا تو نے اس شخص کو کہ گزرا وہ ایک شہر پر اور وہ گرا پڑا تھا اپنی چھتوں پر بولا: کیونکر زندہ کرے گا اس کو

اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا^ج فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ^ط قَالَ كَمْ لَبِثْتَ^ط

اللہ مر گئے پیچھے، پھر مردہ رکھا اس شخص کو اللہ نے سو برس، پھر اٹھایا اس کو، کہا: تو کتنی دیر یہاں رہا؟

قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ^ط قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ

بولا: میں رہا ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم، کہا: نہیں بلکہ تو رہا سو برس، اب دیکھ

إِلَى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ^ج وَانْظُرْ إِلَى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَ آيَةً

اپنا کھانا اور پینا، سڑ نہیں گیا، اور دیکھ اپنے گدھے کو اور ہم نے تجھ کو نمونہ بنانا چاہا

لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِرُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْصًا ط

لوگوں کے واسطے اور دیکھ ہڈیوں کی طرف کہ ہم اُن کو کس طرح اُبھار کر جوڑ دیتے ہیں، پھر اُن پر پہناتے ہیں گوشت،

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ ۚ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۵۹﴾

پھر جب اس پر ظاہر ہوا یہ حال تو کہہ اُٹھا کہ مجھ کو معلوم ہے کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

یا (تم نے) اس جیسے شخص (کے واقعے) پر (غور کیا) جس کا ایک بستی پر ایسے وقت گذر ہوا جب وہ چھتوں کے بل گری پڑی تھی؟ اس نے کہا کہ ”اللہ اس بستی کو اس کے مرنے کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟“ پھر اللہ نے اس شخص کو سو سال تک کے لئے موت دی، اور اس کے بعد زندہ کر دیا۔ (اور پھر) پوچھا کہ تم کتنے عرصے تک (اس حالت میں) رہے ہو؟ اس نے کہا: ”ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ!“ اللہ نے کہا: ”نہیں! بلکہ تم سو سال اسی طرح رہے ہو۔ اب اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ وہ ذرا نہیں سڑیں۔ اور (دوسری طرف) اپنے گدھے کو دیکھو (کہ گل سڑ کر اس کا کیا حال ہو گیا ہے) اور یہ ہم نے اس لئے کیا تا کہ ہم تمہیں لوگوں کے لئے (اپنی قدرت کا) ایک نشان بنادیں۔ اور (اب اپنے گدھے کی) ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم کس طرح انہیں اُٹھاتے ہیں، پھر ان کو گوشت کا لباس پہناتے ہیں!“ چنانچہ جب حقیقت کھل کر اس کے سامنے آگئی تو وہ بول اُٹھا کہ ”مجھے یقین ہے اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“ ﴿۲۵۹﴾

خلاصہ تفسیر

اَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ (الی قولہ) اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾ کیا تم کو اس طرح کا قصہ بھی معلوم ہے، جیسے ایک شخص تھا کہ (چلتے چلتے) ایک بستی پر ایسی حالت میں اس کا گزر ہوا کہ اس کے مکانات اپنی چھتوں پر گر گئے تھے، (یعنی پہلے چھتیں گریں، پھر اُن کی دیواریں گر گئیں، مراد یہ ہے کہ کسی حادثہ سے وہ بستی ویران ہو گئی تھی، اور سب آدمی مر مرا گئے تھے، وہ شخص یہ حالت دیکھ کر حیرت سے) کہنے لگا کہ (معلوم نہیں) اللہ تعالیٰ اس بستی کو (یعنی اس کے مردوں کو) اس کے مرے پیچھے کس کیفیت سے (قیامت میں) زندہ کریں گے (یہ تو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں مردوں کو جلا دیں گے، مگر اس وقت کے جلانے کا جو خیال غالب ہوا تو بوجہ اس امر کے عجیب ہونے کے ایک حیرت سی دل پر غالب ہو گئی، اور

چونکہ خدا تعالیٰ ایک کام کو کئی طرح کر سکتے ہیں، اس لئے طبیعت اس کی متلاشی ہوئی کہ خدا جانے جلا دینا کس صورت سے ہوگا؟ اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس کا تماشا اس کو دنیا ہی میں دکھلا دیں، تاکہ ایک نظیر کے واقع ہو جانے سے لوگوں کو زیادہ ہدایت ہو) سو (اس لئے) اللہ تعالیٰ نے اس شخص (کی جان قبض کر کے اس کو) سو برس تک مردہ رکھا، پھر (سو برس کے بعد) اس کو زندہ اٹھایا (اور پھر) پوچھا کہ تو کتنی مدت اس حالت میں رہا؟ اس شخص نے جواب دیا کہ ایک دن رہا ہوں گا، یا ایک دن سے بھی کم (کنا یہ ہے مدتِ قلیل سے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ تو (اس حالت میں) سو برس رہا ہے، (اور اگر اپنے بدن کے اندر تغیر نہ ہونے سے تعجب ہو) تو اپنے کھانے پینے (کی) چیز کو دیکھ لے کہ (ذرا) نہیں سڑی گلی (ایک قدرت تو ہماری یہ ہے) اور (دوسری قدرت دیکھنے واسطے) اپنے (سواری کے) گدھے کی طرف نظر کر (کہ گل سڑ کر کیا حال ہو گیا ہے، اور ہم عنقریب اس کو تیرے سامنے زندہ کئے دیتے ہیں) اور (ہم نے تجھ کو اس لئے مار کر زندہ کیا ہے) تاکہ ہم تجھ کو (اپنی قدرت کی) ایک نظیر لوگوں کے لئے بنادیں (کہ اس نظیر سے بھی قیامت کے روز زندہ ہونے پر استدلال کر سکیں) اور (اب اس گدھے کی) ہڈیوں کی طرف نظر کر کہ ہم ان کو کس طرح ترکیب دیئے دیتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھا دیتے ہیں (پھر اس میں جان ڈال دیتے ہیں، غرض یہ سب اُموریوں ہی کر دیئے گئے) پھر جب یہ سب کیفیات اس شخص کو (مشاہدہ سے) واضح ہو گئی، تو (بے اختیار جوش میں آ کر) کہہ اٹھا کہ میں (دل سے) یقین رکھتا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۖ

اور یاد کر جب کہا ابراہیم نے: اے پروردگار میرے! دکھلا دے مجھ کو کیونکر زندہ کرے گا تو مردے، فرمایا: کیا تو نے یقین نہیں کیا؟

قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۖ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ

کہا: کیوں نہیں، لیکن اس واسطے کہ چاہتا ہوں کہ تسکین ہو جاوے میرے دل کو، فرمایا: تو پکڑ لے چار جانور اڑنے والے،

فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ

پھر ان کو ہلا لے اپنے ساتھ، پھر رکھ دے ہر پہاڑ پر ان کے بدن کا ایک ایک ٹکڑا پھر ان کو بلا،

يَا تَيْتَنُكَ سَعِيًّا وَاَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۚ

چلے آویں گے تیرے پاس دوڑتے ہوئے اور جان لے کہ بے شک اللہ زبردست ہے حکمت والا۔

آسان ترجمہ قرآن

اور (اس وقت کا تذکرہ سنو) جب ابراہیم نے کہا تھا کہ میرے پروردگار! مجھے دکھائیے کہ آپ مردوں کو کیسے زندہ کرتے ہیں؟ اللہ نے کہا: ”کیا تمہیں یقین نہیں؟“ کہنے لگے: ”یقین کیوں نہ ہوتا؟ مگر (یہ خواہش اس لئے کی ہے) تاکہ میرے دل کو پورا اطمینان حاصل ہو جائے۔“ اللہ نے کہا: ”اچھا! تو چار پرندے لو، اور انہیں اپنے سے مانوس کر لو، پھر (ان کو ذبح کر کے) ان کا ایک ایک حصہ ہر پہاڑ پر رکھ دو، پھر ان کو بلاؤ، وہ چاروں تمہارے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ اور جان رکھو کہ اللہ پوری طرح صاحب اقتدار بھی ہے، اعلیٰ درجے کی حکمت والا بھی۔“

خلاصہ تفسیر

اور اس وقت (کے واقعہ) کو یاد کرو جبکہ ابراہیم علیہ السلام نے (حق تعالیٰ سے) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! مجھ کو (یہ) دکھلا دیجئے کہ آپ مردوں کو (قیامت میں مثلاً) کس کیفیت سے زندہ کریں گے (یعنی زندہ کرنے کا تو یقین ہے لیکن زندہ کرنے کی بھی مختلف صورتیں اور کیفیتیں ہو سکتی ہیں، وہ معلوم نہیں، اس لئے وہ معلوم کرنے کو دل چاہتا ہے، اس سوال سے کسی کم سمجھ آدمی کو اس کا شبہ ہو سکتا تھا کہ معاذ اللہ ابراہیم علیہ السلام کو مرنے کے بعد زندہ ہونے پر ایمان و یقین نہیں، اس لئے حق تعالیٰ نے خود یہ سوال قائم کر کے بات کھول دی، چنانچہ ابراہیم علیہ السلام سے اس سوال کے جواب میں اول (ارشاد فرمایا کہ کیا تم (اس پر) یقین نہیں لاتے؟ انہوں نے (جواب میں) عرض کیا کہ یقین کیوں نہ لاتا، لیکن اس غرض سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ میرے قلب کو (معین صورت زندہ کرنے کی مشاہدہ کرنے سے) سکون ہو جاوے (ذہن دوسرے احتمالات سے چکر میں نہ پڑے) ارشاد ہوا کہ اچھا تو تم چار پرندے لو، پھر ان کو (پال کر) اپنے لئے ہلا لو (تاکہ اُن کی خوب شناخت ہو جاوے) پھر (سب کو ذبح کر کے اور ہڈیوں پر وہ سمیت ان کا قیمہ سا کر کے اس کے کئی حصے کرو اور کئی پہاڑ اپنی مرضی سے انتخاب کر کے) ہر پہاڑ پر اُن میں سے ایک ایک حصہ رکھ دو (اور) پھر اُن سب کو بلاؤ (دیکھو) تمہارے پاس (زندہ ہو کر) دوڑے دوڑے چلے آویں گے، اور خوب یقین رکھو اس بات کا کہ حق تعالیٰ زبردست (قدرت والے) ہیں (سب کچھ کر سکتے ہیں، پھر بھی بعض باتیں نہیں کرتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ) حکمت

والے (بھی) ہیں (ہر کام حکمت و مصلحت کے مطابق کرتے ہیں)۔

معارف و مسائل

حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی درخواستِ حیات بعد الموت کا مشاہدہ اور شبہات کا ازالہ

یہ تیسرا قصہ ہے جو آیت مذکورہ میں بیان فرمایا گیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے یہ درخواست کی کہ مجھے اس کا مشاہدہ کرا دیجئے کہ آپ مردوں کو کس طرح زندہ کریں گے؟ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس درخواست کی کیا وجہ ہے؟ کیا آپ کو ہماری قدرتِ کاملہ پر یقین نہیں کہ وہ ہر چیز پر حاوی ہے، ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا واقعی حال عرض کیا کہ یقین تو کیسے نہ ہوتا، کیونکہ آپ کی قدرتِ کاملہ کے مظاہر ہر لحظہ، ہر آن مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں، اور غور و فکر کرنے والے کے لئے خود اس کی ذات میں اور کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے، لیکن انسانی فطرت ہے کہ جس کام کا مشاہدہ نہ ہو خواہ وہ کتنا ہی یقینی ہو اس میں اس کے خیالات منتشر رہتے ہیں، کہ یہ کیسے اور کس طرح ہوگا؟ یہ ذہنی انتشار سکونِ قلب اور اطمینان میں خلل انداز ہوتا ہے، اس لئے یہ مشاہدہ کی درخواست کی گئی کہ احیائے موتی کی مختلف صورتوں اور کیفیتوں میں ذہنی انتشار واقع نہ ہو کہ قلب کو سکون و اطمینان حاصل ہو جائے۔

حق تعالیٰ نے ان کی درخواست قبول فرما کر ان کے مشاہدہ کی بھی ایک ایسی عجیب صورت تجویز فرمائی جس میں منکرین کے تمام شبہات و خدشات کے ازالے کا بھی مشاہدہ ہو جائے، وہ صورت یہ تھی کہ آپ کو حکم دیا گیا کہ چار پرندے جانور اپنے پاس جمع کر لیں، پھر ان کو اپنے پاس رکھ کر ہلا لیں کہ وہ ایسے ہل جائیں کہ آپ کے بلانے سے آجایا کریں، اور ان کی پوری طرح شناخت بھی ہو جائے، یہ شبہ نہ رہے کہ شاید کوئی دوسرا پرندہ آگیا ہو، پھر ان چاروں کو ذبح کر کے اور ہڈیوں اور پروں سمیت ان کا خوب قیمہ سا کر کے اس کے کئی حصے کر دیں، اور پھر اپنی تجویز سے مختلف پہاڑوں پر اس قیمے کا ایک ایک حصہ رکھ دیں، پھر ان کو بلا لیں، تو وہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ سے زندہ ہو کر دوڑے دوڑے آپ کے پاس آجائیں گے۔

تفسیر رُوح المعانی میں بسند ابن الممذر حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسا ہی کیا، پھر ان کو پکارا تو فوراً ہڈی سے ہڈی، پر سے پر، خون سے خون، گوشت سے گوشت مل ملا کر سب اپنی اپنی اصلی ہیئت میں زندہ ہو کر دوڑتے ہوئے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس آ گئے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابراہیم! قیامت کے روز اسی طرح سب اجزاء و اجساد کو جمع کر کے ایک دم سے ان میں جان ڈال دوں گا۔

قرآن کے الفاظ میں **يَا أَيُّهَا سَعِيًّا** آیا ہے، کہ یہ پرندے دوڑتے ہوئے آئیں گے، جس سے معلوم ہوا کہ اڑ کر نہیں آئیں گے، کیونکہ آسمان میں اڑ کر آنے میں نظروں سے اوجھل ہو کر بدل جانے کا شبہ ہو سکتا ہے، زمین پر چل کر آنے میں یہ بالکل سامنے رہیں گے۔ اس واقعہ میں حق تعالیٰ نے قیامت کے بعد حیات بعد الموت کا ایسا نمونہ حضرت خلیل اللہ کو دکھلادیا جس نے مشرکین اور منکرین کے سارے شبہات کا ازالہ مشاہدے سے کرادیا۔

حیات بعد الموت اور عالم آخرت کی زندگی پر سب سے بڑا اشکال منکرین کو یہی ہوتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد مٹی ہو جاتا ہے، پھر یہ مٹی کہیں ہوا کے ساتھ اڑ جاتی ہے، کہیں پانی کے ساتھ بہہ جاتی ہے، کہیں درختوں اور کھیتوں کی شکل میں برآمد ہوتی ہے، پھر اس کا ذرہ ذرہ دنیا کے اطراف بعیدہ میں پھیل جاتا ہے، ان منتشر ذروں اور اجزائے انسانی کو جمع کر دینا اور پھر ان میں رُوح ڈال دینا سطحی نظر والے انسان کی اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ سب کو اپنی قدرت و اپنی حیثیت پر قیاس کرتا ہے، وہ اپنے سے مافوق اور ناقابل قیاس قدرت میں غور نہیں کرتا۔

حالانکہ اگر وہ ذرا سا اپنے ہی وجود میں غور کر لے تو اسے نظر آئے کہ آج بھی اس کا وجود ساری دنیا میں بکھرے ہوئے اجزاء و ذرات کا مجموعہ ہے، انسان کی آفرینش جن ماں اور باپ کے ذریعے ہوتی ہے، اور جن غذاؤں سے اُن کا خون اور جسم بنتا ہے، وہ خود جہان کے مختلف گوشوں سے سمٹے ہوئے ذرات ہوتے ہیں، پھر پیدائش کے بعد انسان جس غذا کے ذریعے نشوونما پاتا ہے، جس سے اس کا خون اور گوشت پوست بنتا ہے، اس میں غور کرے تو اس کی غذاؤں میں ایک ایک چیز ایسی ہے جو تمام دنیا کے مختلف ذرات سے بنی ہوئی ہے، دودھ پیتا ہے تو وہ کسی گائے، بھینس یا بکری کے اجزاء ہیں، اور ان جانوروں میں یہ اجزاء اُس گھاس دانے سے پیدا ہوئے جو انہوں نے کھائے ہیں، یہ گھاس دانے معلوم نہیں کس کس خطہ زمین سے آئے ہیں، اور ساری دنیا میں پھرنے والی ہواؤں نے کہاں کہاں کے ذرات کو ان کی تربیت میں شامل کر دیا ہے، اسی طرح دنیا کا دانہ دانہ اور پھل اور ترکاریاں اور انسان کی تمام غذائیں اور دوائیں جو اس کے بدن کو جز و بنتی ہیں، وہ کس کس گوشہ عالم سے کس کس طرح حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور نظامِ محکم نے ایک انسان کے بدن میں جمع فرمادیئے، اگر غافل اور کوتاہ نظر انسان دنیا کو چھوڑ کر اپنے ہی بدن کی تحقیق (ریسرچ) کرنے بیٹھ جائے تو اس کو یہ نظر آئے گا کہ اس کا

وجود خود ایسے بے شمار اجزاء سے مرکب ہے، جو کوئی مشرق کا ہے، کوئی مغرب کا، کوئی جنوبی دنیا کا، کوئی شمالی حصے کا، آج بھی دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اجزاء قدرت کے نظامِ محکم نے اس کے بدن میں جمع فرمادیئے ہیں، اور مرنے کے بعد یہ اجزاء پھر اسی طرح منتشر ہو جائیں گے، تو اب دوسری مرتبہ پھر ان کا جمع فرمادینا اس کی قدرتِ کاملہ کے لئے کیا دشوار ہے جس نے پہلی مرتبہ اس کے وجود میں ان منتشر ذرات کو جمع فرمادیا تھا۔

واقعہ مذکورہ پر چند سوالات مع جوابات

آیت متذکرہ بالا کے مضمون میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں :-

اول یہ کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ سوال ہی کیوں پیدا ہوا، جبکہ وہ حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ پر ایمان لانے میں اس وقت کی ساری دنیا سے زیادہ یقین پر تھے؟

اس کا جواب اس تقریر کے ضمن میں آچکا ہے جو اوپر کی گئی ہے کہ درحقیقت حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سوال کسی شک و شبہ کی بنا پر تھا ہی نہیں، بلکہ سوال کا منشا صرف یہ تھا کہ حق تعالیٰ قیامت میں مردوں کو زندہ کریں گے، اُن کی قدرتِ کاملہ سے یہ کسی طرح بھی مستبعد یا حیرت انگیز نہیں، بلکہ یقینی ہے، لیکن مردہ کو زندہ کرنے کا کام انسان کی طاقت سے باہر ہے، اس نے کبھی کسی مردہ کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھا نہیں، اور مردہ کو زندہ کرنے کی کیفیات اور صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں، انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز اس کے مشاہدہ میں نہ ہو اس کی کیفیات کی کھوج لگانے کی فکر میں رہا کرتا ہے، اس میں اس کا خیال مختلف راہوں پر چلتا ہے، جس میں ذہنی انتشار کی تکلیف بھی برداشت کرتا ہے، اس ذہنی انتشار کو رفع کر کے قلب کو سکون مل جانے ہی کا نام اطمینان ہے، اسی کے لئے حضرت خلیل اللہ نے یہ درخواست پیش فرمائی تھی۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ”ایمان“ اور ”اطمینان“ میں کیا فرق ہے، ”ایمان“ اس اختیاری یقین کا نام ہے جو انسان کو رسول کے اعتماد پر کسی غیب کی بات کے متعلق حاصل ہو جائے، اور ”اطمینان“ سکونِ قلب کا نام ہے، بعض اوقات نظروں سے غائب کسی چیز پر یقینِ کامل تو ہوتا ہے، مگر قلب کو سکون اس لئے نہیں ہوتا کہ اس کی کیفیات کا علم نہیں ہوتا، یہ سکون صرف مشاہدہ سے حاصل ہو سکتا ہے، حضرت خلیل اللہ کو بھی حیات بعد الموت پر تو کامل ایمان و یقین تھا، سوال صرف کیفیتِ احیاء کے متعلق تھا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ جب حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سوال زندہ کرنے کی کیفیت سے متعلق تھا، اصل حیات بعد الموت میں کوئی شک و شبہ نہ تھا، تو پھر ارشادِ ربانی **أَوَلَمْ تُؤْمِنْ** یعنی ”کیا آپ کو یقین نہیں“ فرمانے کا کوئی موقع نہیں رہتا؟

جواب یہ ہے کہ جو سوال حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیش فرمایا کہ اصل واقعہ میں کوئی شک نہیں، لیکن اس سوال کا ایک مفہوم تو یہی ہے کہ زندہ کرنے کی کیفیت دریافت کرنا منظور ہے۔

انہی الفاظ سوال کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہو سکتا ہے جو اصل قدرت میں شبہ یا انکار سے پیدا ہوا کرتا ہے، جیسے آپ کسی بوجھ کے متعلق یہ یقین رکھتے ہیں کہ فلاں آدمی اس کو نہیں اٹھا سکتا اور آپ اس کا عاجز ہونا ظاہر کرنے کے لئے کہیں کہ دیکھیں تم کیسے اس بوجھ کو اٹھاتے ہو، چونکہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سوال کا یہ غلط مفہوم بھی کوئی لے سکتا تھا اس لئے حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس غلط بات سے بری ثابت کرنے کے لئے ہی یہ ارشاد فرمایا **أَوَلَمْ تُؤْمِنُ** تاکہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے جواب میں **بلی** فرما کر افترا پردازوں کی زد سے نکل جائیں۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ اس سوال ابراہیمی سے کم از کم اتنا تو معلوم ہوا کہ ان کو حیات بعد الموت پر اطمینان حاصل نہ تھا، حالانکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر عالم غیب سے پردہ اٹھا دیا جائے تو میرے یقین و اطمینان میں کوئی زیادتی نہ ہوگی، کیونکہ مجھے ایمان بالغیب ہی سے اطمینان کامل حاصل ہے۔ تو جب بعض اُمتیوں کو درجہ اطمینان حاصل ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کے خلیل کو اطمینان کا درجہ حاصل نہ ہو؟

اس کے متعلق یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اطمینان کے بھی بہت سے درجات ہیں، ایک وہ اطمینان ہے جو اولیاء اللہ اور صدیقین کو حاصل ہوتا ہے، اور ایک اس سے اعلیٰ مقام اطمینان ہے جو عام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہوتا ہے، اور ایک اس سے بھی مافوق ہے، جو خاص خاص کو بصورت مشاہدہ عطا فرمایا جاتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو جو درجہ اطمینان کا حاصل تھا، وہ بلاشبہ حضرت خلیل کو حاصل تھا، بلکہ اس سے اعلیٰ درجہ اطمینان جو مقام نبوت کے ساتھ خاص ہے، اس اطمینان میں حضرت خلیل اللہ اور سب اُمتیوں سے فائق تھے، پھر جس کو وہ طلب فرما رہے ہیں وہ سب سے اعلیٰ مقام اطمینان ہے جو خاص خاص انبیاء کو عطا فرمایا جاتا ہے، جیسے سرور کائنات سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت و دوزخ کا مشاہدہ کرا کر اطمینان خاص بخشا گیا۔

الغرض اس سوال کی وجہ سے یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اطمینان حاصل نہ تھا، یہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اطمینان کامل جو مشاہدہ سے حاصل ہوا کرتا ہے وہ نہ تھا، اسی کے لئے یہ درخواست فرمائی تھی۔

آیت کے آخر میں فرمایا: **أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ** (۲۶۰) یعنی ”اللہ تعالیٰ زبردست ہیں اور حکمت والے ہیں۔“ زبردست ہونے میں قدرت کاملہ کا بیان فرمادیا، اور حکمت والا کہہ کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ بمقتضائے حکمت ہر ایک کو حیات بعد الموت کا مشاہدہ نہیں کرایا جاتا، ورنہ حق جل شانہ کے لئے کوئی دُشوار نہیں کہ ہر انسان کو مشاہدہ کرا دیں، مگر پھر ایمان بالغیب کی جو فضیلت ہے وہ قائم نہیں رہ سکتی۔

مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَتَتْ سَبْعَ

مثال اُن لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں ایسی ہے کہ جیسے ایک دانہ اس سے اُگیں سات

سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ط وَاللَّهُ يُضْعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ ط وَاللَّهُ

بالیں، ہر بالی میں سو سو دانے، اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے چاہے، اور اللہ

وَاسِعٌ عَلَيْهِم ۝۲۶۱ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ

بے نہایت بخشش کرنے والا ہے، سب کچھ جانتا ہے۔ جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں، پھر

لَا يَتَّبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى ۝۲۶۲ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ج

خرچ کرنے کے بعد نہ احسان رکھتے ہیں اور نہ ستاتے ہیں انہی کے لئے ہے ثواب اُن کا اپنے رب کے یہاں،

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝۲۶۳ قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ

اور نہ ڈر ہے اُن پر اور نہ غمگین ہوں گے۔ جواب دینا نرم اور درگزر کرنا بہتر ہے اس

صَدَقَةٍ يَّتَّبِعُهَا أَذًى ط وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ ۝۲۶۴ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا

خیرات سے جس کے پیچھے ہو ستانا، اور اللہ بے پروا ہے نہایت تحمل والا۔ اے ایمان والو!

لَا تَبْطُلُوا صَدَقَتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى ۝۲۶۵ كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ

مت ضائع کرو اپنی خیرات احسان رکھ کر اور ایذا دے کر اس شخص کی طرح جو خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگوں کے دکھانے کو

وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ط فَشَلَّهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ

اور یقین نہیں رکھتا اللہ پر اور قیامت کے دن پر، سو اس کی مثال ایسی ہے جیسے صاف پتھر کہ اُس پر پڑی ہے کچھ مٹی

فَأَصَابَهُ وَاِبِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا ۖ لَا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا ۖ

پھر برسا اس پر زور کا میٹھ تو کر چھوڑا اس کو بالکل صاف، کچھ ہاتھ نہیں لگتا ایسے لوگوں کے ثواب اس چیز کا جو انہوں نے کمایا،

وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝۲۶۳ وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ

اور اللہ نہیں دکھاتا سیدھی راہ کافروں کو۔ اور مثال اُن کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال

ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا

اللہ کی خوشی حاصل کرنے کو اور اپنے دلوں کو ثابت کر کے، ایسی ہے جو ایک باغ ہے بلند زمین پر اس پر پڑا

وَاِبِلٌ فَاتَتْ أَكْثَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَإِن لَّمْ يُصِبْهَا وَاِبِلٌ فَطُلٌّ ۖ وَاللَّهُ

زور کا میٹھ تو لایا وہ باغ اپنا پھل دوچند، اور اگر نہ پڑا اس پر میٹھ تو پھوار ہی کافی ہے، اور اللہ

يَبَاتِعَلُونَ بِصَيْرٍ ۝۲۶۵ أَيَوَّدُ أَحَدُكُمْ أَنَّ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّنْ مَّخِيلٍ

تمہارے کاموں کو خوب دیکھتا ہے۔ کیا پسند آتا ہے تم میں سے کسی کو یہ کہ ہووے اس کا ایک باغ کھجور کا

وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۖ وَأَصَابَهُ

اور انگور کا، بہتی ہوں نیچے اس کے نہریں، اس کو اس باغ میں اور بھی سب طرح کا میوہ ہو حاصل اور آگیا اس پر

الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ ۖ فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۖ

بڑھاپا اور اس کی اولاد ہیں ضعیف تب آپڑا اس باغ پر ایک بگولا جس میں آگ تھی جس سے وہ باغ جل اٹھا،

كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ۝۲۶۶

یوں سمجھاتا ہے تم کو اللہ آیتیں تاکہ تم غور کرو۔

آسان ترجمہ قرآن

جو لوگ اللہ کے راستے میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ سات بالیں اُگائے (اور) ہر بال میں سودا نہ ہوں۔ اور اللہ جس کے لئے چاہتا ہے (ثواب میں) کئی گنا اضافہ کر دیتا ہے۔ اللہ بہت وسعت والا (اور) بڑے علم والا ہے۔ (۳۶۱) جو لوگ اپنے مال اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتلاتے ہیں اور نہ کوئی تکلیف پہنچاتے ہیں، وہ اپنے پروردگار کے پاس اپنا ثواب پائیں گے، نہ ان کو کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ کوئی غم پہنچے گا۔ (۳۶۲) بھلی بات کہہ دینا اور درگزر کرنا اس صدقے سے بہتر ہے جس کے بعد کوئی تکلیف پہنچائی جائے۔ اور اللہ بڑا بے نیاز، بہت بردبار ہے۔ (۳۶۳) اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر اس شخص کی طرح ضائع مت کرو جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ چنانچہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چکنی چٹان پر مٹی جمی ہو، پھر اس پر زور کی بارش پڑے اور اس (مٹی کو بہا کر چٹان) کو (دوبارہ) چکنی بنا چھوڑے۔ ایسے لوگوں نے جو کمائی کی ہوتی ہے وہ ذرا بھی ان کے ہاتھ نہیں لگتی۔ اور اللہ (ایسے) کافروں کو ہدایت تک نہیں پہنچاتا (۳۶۴) اور جو لوگ اپنے مال اللہ کی خوشنودی طلب کرنے کے لئے اور اپنے آپ میں پختگی پیدا کرنے کے لئے خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک باغ کسی ٹیلے پر واقع ہو، اس پر زور کی بارش برے تو وہ دُگنا پھل لے کر آئے۔ اور اگر اس پر زور کی بارش نہ بھی برے تو ہلکی پھوار بھی اس کے لئے کافی ہے۔ اور تم جو عمل بھی کرتے ہو اللہ اسے خوب اچھی طرح دیکھتا ہے۔ (۳۶۵) کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں (اور) اس کو اس باغ میں اور بھی ہر طرح کے پھل حاصل ہوں، اور بڑھاپے نے اسے آ پکڑا ہو، اور اس کے بچے ابھی کمزور ہوں، اتنے میں ایک آگ سے بھرا بگولا آ کر اس کو اپنی زد میں لے لے اور پورا باغ جل کر رہ جائے؟ اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم غور کرو۔ (۳۶۶)

خلاصہ تفسیر

جو لوگ اللہ کی راہ میں (یعنی اُمورِ خیر میں) اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اُن کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت (عند اللہ) ایسی ہے جیسے ایک دانہ کی حالت جس سے (فرض کرو) سات بالیں جمیں (اور) ہر بالی کے اندر سودا نہ ہوں (اسی طرح خدا تعالیٰ ان کا ثواب سات سو حصے تک بڑھاتا ہے) اور یہ افزونی خدا تعالیٰ جس کو چاہتا ہے (بقدر اس کے اخلاص اور مشقت کے) عطا فرماتا ہے، اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں (ان کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں، وہ

سب کو یہ افزونی دے سکتے ہیں مگر ساتھ ہی (جاننے والے) بھی ہیں (اس لئے اخلاص نیت وغیرہ کو دیکھ کر عطا فرماتے ہیں) جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ تو (جس کو دیا ہے اس پر زبان سے) احسان جتلاتے ہیں اور نہ (برتاؤ سے اس کو) آزار پہنچاتے ہیں، ان لوگوں کو ان (کے عمل) کا ثواب ملے گا اُن کے پروردگار کے پاس (جا کر) اور نہ (قیامت کے دن) ان پر کوئی خطرہ ہوگا اور نہ یہ مغموم ہوں گے (ناداری کے وقت جواب میں معقول و مناسب بات کہہ دینا اور) اگر سائل بدتمیزی سے غصہ دلاوے یا اصرار سے تنگ کرے تو اس سے) درگزر کرنا (ہزار درجہ) بہتر ہے ایسی خیرات (دینے) سے جس کے بعد آزار پہنچایا جائے، اور اللہ تعالیٰ (خود) غنی ہیں (کسی کے مال کی ان کو حاجت نہیں، جو کوئی خرچ کرتا ہے اپنے واسطے، پھر آزار کس بنا پر پہنچایا جائے اور آزار دینے پر جو فوراً سزا نہیں دیتے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ) حلیم (بھی) ہیں۔ اے ایمان والو! تم احسان جتلا کر یا ایذا پہنچا کر اپنی خیرات (کے ثواب بڑھنے) کو برباد مت کرو جس طرح وہ شخص (خود خیرات کے اصل ثواب ہی کو برباد کر دیتا ہے) جو اپنا مال خرچ کرتا ہے (محض) لوگوں کو دکھلانے کی غرض سے اور ایمان نہیں رکھتا اللہ پر اور یوم آخرت پر (مراد اس سے بقرینہ نفعی ایمان کے منافق ہے) سو اس شخص کی حالت ایسی ہے جیسے ایک چکنا پتھر (فرض کرو اس پر) جب کچھ مٹی (آگئی) ہو (اور اس مٹی میں کچھ گھاس پھونس جم آیا ہو) پھر اس پر زور کی بارش پڑ جائے سو اس کو (جیسا تھا ویسا ہی) بالکل صاف کر دے (اسی طرح اُس منافق کے ہاتھ سے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ ہو گیا جو ظاہر میں ایک نیک عمل، جس میں اُمیدِ ثواب ہو، معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کے نفاق نے اس شخص کو ویسا ہی کو را ثواب سے خالی چھوڑ دیا، چنانچہ قیامت میں) ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی (کیونکہ کمائی نیک عمل ہے اور اس کا ہاتھ لگنا ثواب کا ملنا ہے، اور ثواب ملنے کی شرط ایمان اور اخلاص ہے، اور ان لوگوں میں یہ مفقود ہے، کیونکہ ریاکار بھی ہیں اور کافر بھی ہیں) اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو (قیامت کے روز ثواب کے گھر یعنی جنت کا) راستہ نہ بتلائیں گے (کیونکہ کفر کی وجہ سے اُن کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوا جس کا ثواب آخرت میں ذخیرہ ہوتا اور وہاں حاضر ہو کر اس کے صلہ میں جنت میں پہنچائے جاتے) اور ان لوگوں کے خرچ کئے ہوئے مال کی حالت جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے (جو کہ خاص اس عمل سے ہوگی) اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں (کو اس عمل شاق کا خوگر بنا کر ان) میں پختگی پیدا کریں (تا کہ دُوسرے اعمالِ صالحہ سہولت سے پیدا ہوا کریں پس ان لوگوں کے نفقات و صدقات کی حالت) مثل حالت ایک باغ کے ہے جو کسی ٹیلے پر ہو کہ (اس جگہ کی ہوا لطیف اور بار آور ہوتی ہے اور) اس پر زور کی بارش پڑی ہو، پھر وہ (باغِ لطافت ہوا اور بارش کے سبب اور باغوں سے یا اور دفعوں سے) دونا (چوگنا) پھل لایا ہو، اور اگر ایسے زور کا مینہ نہ پڑے تو ہلکی پھوار (یعنی خفیف بارش) بھی اس کو کافی ہے (کیونکہ زمین اور موقع اس کا اچھا ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے ہیں (اس لئے جب وہ اخلاص دیکھتے ہیں ثواب بڑھادیتے ہیں)۔

بھلا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہے کہ اس کا ایک باغ ہو کھجوروں کا اور انگوروں کا (یعنی زیادہ درخت اس میں ان کے ہوں اور) اس (باغ) کے (درختوں کے) نیچے نہریں چلتی ہوں (جس سے وہ خوب سرسبز و شاداب ہوں اور) اس شخص کے یہاں اس باغ میں (علاوہ کھجوروں اور انگوروں کے) اور بھی ہر قسم کے (مناسب) میوے ہوں اور اس شخص کا بڑھا پیا آگیا ہو، (جو کہ زمانہ زیادہ احتیاج کا ہوتا ہے) اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں، جن میں (کمانے کی) قوت نہیں (اس صورت میں اہل و عیال سے بھی اس کو توقع خبر گیری کی نہیں ہوگی، بس وجہ معاش صرف وہی باغ ہوا) سو (ایسی حالت میں یہ قصہ ہو کہ) اس باغ پر ایک گولہ آئے جس میں آگ (کا مادہ) ہو پھر (اس سے) وہ باغ جل جائے (ظاہر بات ہے کسی کو اپنے لئے یہ بات پسند نہیں آسکتی، پھر اسی کے مشابہ تو یہ بات بھی ہے کہ اوّل صدقہ دیا یا کوئی اور نیک کام کیا جس کے قیامت میں کار آمد ہونے کی اُمید ہو جو کہ وقت ہوگا غایت احتیاج کا اور زیادہ مدار قبول ہوگا انہی طاعات پر پھر ایسے وقت میں معلوم ہوگا کہ ہمارے احسان جتلانے یا غریب کو ایذا دینے سے ہماری طاعات باطل یا بے برکت ہو گئیں، اس وقت کیسی سخت حسرت ہوگی کہ کیسی کیسی آرزوؤں کا خون ہو گیا، پس جب تم مثال کے واقعہ کو پسند نہیں کرتے تو ابطال طاعات کو کیسے گوارا کرتے ہو) اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمہارے (سمجھانے کے) لئے تاکہ تم سوچا کرو (اور سوچ کر اس کے موافق عمل کیا کرو)۔

معارف مسائل

یہ سورہ بقرہ کا چھتیسواں رکوع ہے جو آیت نمبر ۲۶۱ سے شروع ہوتا ہے، اب سورہ بقرہ کے پانچ رکوع باقی ہیں جن میں آخری رکوع میں تو کلیات اور اہم اصولی چیزوں کا بیان ہے، اس سے پہلے چار رکوع میں آیت نمبر ۲۶۱ سے ۲۸۳ تک کل ۲۳ آیات ہیں، جن میں مالیات سے متعلق خاص ہدایات اور ایسے ارشادات ہیں کہ اگر دُنیا آج ان پر پوری طرح عامل ہو جائے تو معاشی نظام کا وہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے جس میں آج کی دُنیا چار سو بھٹک رہی ہے، کہیں سرمایہ داری کا نظام ہے تو کہیں اس کا ردِ عمل اشتراکیت اور اشتمالیت کا نظام ہے، اور ان نظاموں کے باہمی ٹکراؤ نے دُنیا کو قتل و قتال اور جنگ و جدال کا ایک جہنم بنا رکھا ہے۔ ان آیات میں اسلام کے معاشی نظام کے ایک اہم پہلو کا بیان ہے، جس کے دو حصے ہیں:-

۱- اپنی ضرورت سے زائد مال کو اللہ کی رضا کے لئے حاجت مند، مفلس لوگوں پر خرچ کرنے کی تعلیم جس کو صدقہ و خیرات کہا جاتا ہے۔

۲- دوسرے سود کے لین دین کو حرام قرار دے کر اس سے بچنے کی ہدایات۔

ان میں سے پہلے دو رکوع صدقہ و خیرات کے فضائل اور اس کی ترغیب اور اس کے متعلقہ احکام و ہدایات پر مشتمل ہیں، اور آخری دو رکوع سودی کاروبار کی حرمت و ممانعت اور قرض اُدھار کے جائز طریقوں کے بیان میں ہیں۔

جو آیات اوپر لکھی گئی ہیں ان میں اول اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے فضائل کا بیان فرمایا گیا ہے، اس کے بعد ایسی شرائط کا بیان ہے جن کے ذریعے صدقہ خیرات اللہ کے نزدیک قابل قبول اور موجب ثواب بن جائے، پھر ایسی چیزوں کا بیان ہے جو انسان کے صدقہ و خیرات کو برباد کر کے نیکی برباد گناہ لازم کا مصداق بنا دیتی ہیں۔

اس کے بعد دو مثالیں بیان کی گئی ہیں، ایک اُن نفقات و صدقات کی جو اللہ کے نزدیک مقبول ہوں، دوسرے اُن نفقات و صدقات کی جو غیر مقبول اور فاسد ہوں۔

یہ پانچ مضمون ہیں جو اس رکوع میں بیان ہوئے ہیں۔

یہاں ان مضامین سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے کو کہیں بہ لفظ ”انفاق“ بیان فرمایا ہے، کہیں بہ لفظ ”اطعام“، کہیں بہ لفظ ”صدقہ“، اور کہیں بہ لفظ ”ایتاء الزکوٰۃ“، ان الفاظ قرآنی اور ان کے جگہ جگہ استعمال پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ: انفاق، اطعام، صدقہ عام ہیں، جو ہر قسم کے صدقہ خیرات اور رضائے الہی حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کے خرچ پر حاوی ہیں، خواہ فرض و واجب ہوں، یا نفلی اور مستحب، اور زکوٰۃ فرض کے لئے قرآن نے ایک ممتاز لفظ ”ایتاء الزکوٰۃ“ استعمال فرمایا ہے، جس میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ اس خاص صدقہ کے لئے حاصل کرنے اور خرچ کرنے دونوں میں کچھ خصوصیات ہیں۔

اس رکوع میں اکثر لفظ ”انفاق“ سے اور کہیں لفظ ”صدقہ“ سے تعبیر کی گئی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہاں عام صدقات و مبرات کا بیان ہے، اور جو احکام یہاں ذکر کئے گئے ہیں ہر قسم کے صدقات اور اللہ کے لئے خرچ کرنے کی سب صورتوں کو شامل اور حاوی ہیں۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ایک مثال

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں یعنی حج میں یا جہاد میں، یا فقراء و مساکین اور یتیموں پر یا بہ نیت امداد اپنے عزیزوں و دوستوں پر، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایک دانہ گہوں کا عمدہ زمین میں بوئے، اس دانے سے گہوں کا ایک پودا نکلے، جس میں سات خوشے گہوں کے پیدا ہوں، اور ہر خوشے میں سو دانے ہوں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دانہ سے سات سو دانے حاصل ہو گئے۔

مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے کا اجر و ثواب ایک سے لے کر سات سو تک پہنچتا ہے، ایک پیسہ

خرچ کرے تو سات سو پیسوں کا ثواب حاصل ہو سکتا ہے۔

صحیح و معتبر احادیث میں ہے کہ ایک نیکی کا ثواب اس کا دس گنا ملتا ہے، اور سات سو گنے تک پہنچ سکتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جہاد اور حج میں ایک درہم خرچ کرنے کا ثواب سات سو درہم کے برابر ہے، یہ روایت ابن کثیر نے بحوالہ مسند احمد بیان کی ہے۔^[۱]

الغرض اس آیت نے بتلایا کہ اللہ کی راہ میں ایک روپیہ خرچ کرنے والے کا ثواب سات سو روپے کے خرچ کے

برابر ملتا ہے۔

قبولیت صدقات کی مثبت شرائط

لیکن قرآن حکیم نے اس مضمون کو بجائے مختصر اور صاف لفظوں میں بیان کرنے کے دانہ گندم کی مثال کی صورت میں بیان فرمایا، جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح کاشتکار ایک دانہ گندم سے سات سو دانے اُسی وقت حاصل کر سکتا ہے جبکہ یہ دانہ عمدہ ہو خراب نہ ہو، اور دانہ ڈالنے والا کاشتکار بھی کاشتکاری کے فن سے پورا واقف ہو، اور جس زمین میں ڈالے وہ بھی عمدہ زمین ہو، کیونکہ ان میں سے اگر ایک چیز بھی کم ہوگئی تو یا یہ دانہ ضائع ہو جائے گا، ایک دانہ بھی نہ نکلے گا، اور یا پھر ایسا بار آور نہ ہوگا کہ ایک دانہ سے سات سو دانے بن جائیں۔

اسی طرح عام اعمالِ صالحہ اور خصوصاً انفاق فی سبیل اللہ کی مقبولیت اور زیادتی اجر کے لئے بھی یہی تین شرطیں ہیں کہ جو مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے وہ پاک اور حلال ہو، کیونکہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک اور حلال مال کے سوا کسی چیز کو قبول نہیں فرماتے۔

دوسرے خرچ کرنے والا بھی نیک نیت اور صالح ہو، بد نیتی یا نام و نمود کے لئے خرچ کرنے والا اس ناواقف کاشتکار کی طرح ہے جو دانے کو کسی ایسی جگہ ڈال دے کہ وہ ضائع ہو جائے۔

تیسرے جس پر خرچ کرے وہ بھی صدقہ کا مستحق ہو، کسی نا اہل پر خرچ کر کے ضائع نہ کرے، اس طرح اس مثال سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بہت بڑی فضیلت بھی معلوم ہوگئی، اور ساتھ ہی اس کی تین شرطیں بھی کہ مالِ حلال سے خرچ کرے، اور خرچ کرنے کا طریقہ بھی سنت کے مطابق ہو، اور مستحقین کو تلاش کر کے اُن پر خرچ کرے، محض جیب سے نکال ڈالنے سے یہ فضیلت حاصل نہیں ہوتی۔

دوسری آیت میں صدقہ کرنے کے صحیح اور مسنون طریقے کا بیان اس طرح فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں

خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں، اور نہ جن کو دیا گیا ہے ان کو کوئی ایذا پہنچاتے ہیں ان کا ثواب ان کے رب کے پاس محفوظ ہے، نہ اُن پر آئندہ کے لئے کوئی خطرہ ہے، اور نہ گزشتہ پر کوئی رنج و غم۔

قبولیتِ صدقہ کی منفی شرائط

اس آیت میں صدقہ کے قبول ہونے کی دو منفی شرطیں بیان فرمائی گئی ہیں، ایک یہ کہ دے کر احسان نہ جتائیں، دوسرے یہ کہ جس کو دیں اس کو عملاً ذلیل و خوار نہ سمجھیں، اور کوئی ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے وہ اپنی حقارت و ذلت محسوس کرے یا اس کو ایذا پہنچے۔

تیسری آیت **قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ** میں بھی صدقات و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ان دو شرطوں کی مزید وضاحت کی گئی ہے، جن کا بیان اس سے پہلی آیت میں ہو چکا ہے، ایک یہ کہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کر کے کسی پر احسان نہ جتائیں، دوسرے یہ کہ جس کو دیں اس کے ساتھ کوئی ایسا برتاؤ نہ کریں جس سے وہ اپنی ذلت و حقارت محسوس کرے، یا جس سے اس کو ایذا پہنچے۔

وضاحت اس طرح کی گئی کہ ناداری یا معذوری کی حالت میں سائل کے جواب میں کوئی معقول و مناسب عذر پیش کر دینا، اور اگر سائل بدتمیزی سے غصہ و لادے تو اس سے درگزر کرنا ہزار درجے بہتر ہے ایسی خیرات دینے سے جس کے بعد اس کو ایذا پہنچائی جائے، اور اللہ تعالیٰ خود غنی و حلیم ہیں، اُن کو کسی کے مال کی حاجت نہیں، جو خرچ کرتا ہے اپنے نفع کے لئے کرتا ہے، تو ایک عاقل انسان کو خرچ کرنے کے وقت اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ میرا کسی پر احسان نہیں، میں اپنے نفع کے لئے خرچ کر رہا ہوں، اور اگر لوگوں کی طرف سے کوئی ناشکری بھی محسوس کرے تو اخلاقِ الہیہ کے تابع ہو کر عفو و درگزر سے کام لے۔

چوتھی آیت میں اسی مضمون کو دوسرے عنوان سے اور بھی تاکید کے ساتھ اس طرح ارشاد فرمایا کہ اپنے صدقات کو برباد نہ کرو، زبان سے احسان جتلا کر یا برتاؤ سے ایذا پہنچا کر۔

اس سے واضح ہو گیا کہ جس صدقہ و خیرات کے بعد احسان جتلانے یا مستحقین کو ایذا پہنچانے کی صورت ہو جائے وہ صدقہ باطل کا لعدم ہے، اُس پر کوئی ثواب نہیں۔ اس آیت میں صدقہ کے قبول ہونے کی ایک اور شرط کا اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جو شخص لوگوں کے دکھاوے اور نام و نمود کے واسطے خرچ کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی صاف پتھر پر کچھ مٹی جم جائے، اور اس میں کوئی دانہ بوئے، پھر اس پر زور کی بارش پڑ جائے اور وہ اس کو بالکل صاف کر دے، ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی، اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو راستہ نہ دکھلائیں گے۔

اس سے قبولیتِ صدقہ و خیرات کی یہ شرط معلوم ہوئی کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور ثوابِ آخرت کی نیت سے خرچ کرے، دکھلاوے یا نام و نمود کی نیت سے نہ ہو، نام و نمود کی نیت سے خرچ کرنا، اپنے مال کو برباد کرنا ہے، اور آخرت پر ایمان رکھنے والا مؤمن بھی اگر کوئی خیرات محض نام و نمود اور ریا کے لئے کرتا ہے تو اس کا بھی یہی حال ہے کہ اس کو کوئی ثواب نہیں ملتا، پھر اس جگہ **وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ** کے اضافہ سے شاید اس طرف اشارہ کرنا منظور ہے کہ ”ریا کاری“ اور نام و نمود کے لئے کام کرنا اس شخص سے متصور ہی نہیں جو اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے، ریا کاری اس کے ایمان میں خلل کی علامت ہے۔

آیت کے آخر میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فر لوگوں کو راستہ نہ دکھائیں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایات اور آیات جو سب انسانوں کے لئے عام ہیں، کا فر جو ان ہدایات پر نظر نہیں کرتے بلکہ تمسخر اور استہزا کرتے ہیں، اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اُن کو توفیق سے محروم کر دیتے ہیں، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی ہدایت قبول نہیں کرتے۔

پانچویں آیت میں صدقہ مقبولہ اور انفاق مقبول کی ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ جو لوگ اپنے مال خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی نیت سے خرچ کرتے ہیں کہ اپنے نفسوں میں پختگی پیدا کریں ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی باغ ہو کسی ٹیلے پر اور اس پر زور کی بارش پڑی ہو، پھر وہ اپنا پھل لایا ہو دو چند، اور اگر ایسے زور کی بارش بھی نہ پڑے تو ہلکی پھوار بھی اس کے لئے کافی ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے جانتے ہیں۔

اس میں اخلاصِ نیت اور رعایتِ شرائطِ مذکورہ کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بڑی فضیلت اس مثال سے واضح کر دی گئی کہ نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ تھوڑا بھی خرچ کیا جائے تو وہ کافی اور موجبِ ثمراتِ آخرت ہے۔

چھٹی آیت میں صدقہ و خیرات میں شرائطِ مذکورہ کی خلاف ورزی کرنے پر صدقہ کے باطل و مردود ہونے کا بیان بھی ایک مثال میں اس طرح واضح فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہے کہ اس کا ایک باغ ہو کھجور اور انگوروں کا، اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اور اس شخص کے باغ میں ہر قسم کے میوے ہوں، اور اس شخص کا بڑھاپا آ گیا ہو، اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں جن میں قوت نہیں، ان حالات میں اس باغ پر ایک گولہ آوے جس میں آگ ہو، پھر وہ باغ جل جاوے، اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمہارے لئے تاکہ تم سوچا کرو۔

مطلب یہ ہے کہ خلافِ شرائطِ صدقہ کرنے کی مثال ایسی ہی ہے کہ بظاہر وہ صدقہ کر کے آخرت کے لئے بہت سا ذخیرہ جمع کر رہا ہے، لیکن اللہ کے نزدیک یہ ذخیرہ کچھ بھی کام نہیں آتا۔

اور اس مثال میں جو چند قیدی بڑھائی گئیں کہ اس کا بڑھاپا آ گیا، اس کے اولاد بھی ہے، اور اولاد بھی چھوٹے

بچے جو ضعیف کمزور ہیں، ان قیدوں کا مقصد یہ ہے کہ جوانی کی حالت میں کسی کا باغ یا کھیتی جل جائے تو اسے یہ اُمید ہو سکتی ہے کہ پھر باغ لگا لوں گا، اور جس شخص کے اولاد نہ ہو اور اس کو دوبارہ باغ لگانے کی اُمید بھی نہ ہو تو باغ جل جانے کے بعد بھی اس کو کوئی خاص فکر معاش کی نہیں ہوتی، اکیلا آدمی جس طرح چاہے تنگی ترشی سے گزارا کر سکتا ہے، اور اگر اولاد بھی ہو مگر جوان صالح ہوں جن سے یہ توقع کی جائے کہ وہ باپ کا ہاتھ بٹائیں گے، اور مدد کریں گے، ایسی صورت میں بھی انسان کو باغ کے جل جانے یا لٹ جانے پر بھی کچھ زیادہ صدمہ نہیں ہوتا، کیونکہ اولاد کی فکر سے فارغ ہے، بلکہ اولاد اس کا بھی بوجھ اٹھا سکتی ہے۔ غرض یہ تینوں قیدیں شدتِ احتیاج کو بیان کرنے کے لئے لائی گئیں کہ ایسا شخص جس نے اپنا مال اور محنت خرچ کر کے ایک باغ لگایا، اور وہ باغ تیار ہو کر پھل بھی دینے لگا، اور اسی حالت میں اس کا بڑھاپا اور کمزوری کا زمانہ بھی آ گیا، اور یہ شخص صاحبِ عیال بھی ہے، اور عیال بھی چھوٹے اور کمزور بچے ہیں، تو ان حالات میں اگر لگایا ہوا باغ جل جائے تو صدمہ شدید ہوگا اور تکلیف بے حد ہوگی۔

اسی طرح جس شخص نے ریاکاری سے صدقہ و خیرات کیا یہ گویا اس نے باغ لگایا، پھر موت کے بعد اس کی حالت اس بوڑھے جیسی ہو گئی جو کمانے اور دوبارہ باغ لگانے کی قدرت نہیں رکھتا، کیونکہ موت کے بعد انسان کا کوئی عمل ہی نہیں رہا، اور جس طرح عیال دار بوڑھا اس کا بہت محتاج ہوتا ہے کہ کچھ لی کمائی محفوظ ہوتا کہ ضعیفی میں کام آئے، اور اگر اس حالت میں اس کا باغ اور مال و متاع جل جائے تو اس کے دکھ اور درد کی انتہا نہ رہے گی، اسی طرح یہ صدقہ و خیرات جو ریا و نمود کے لئے کیا گیا تھا، عین ایسے وقت ہاتھ سے جاتا رہے گا جبکہ وہ اس کا بہت حاجت مند ہوگا۔

اس پوری آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی ایک بڑی شرطِ اخلاص ہے، کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے خرچ کیا جائے، کسی نام و نمود کا اس میں دخل نہ ہو۔

اب اس پورے رکوع کی تمام آیات پر مکرر نظر ڈالئے تو ان سے انفاق فی سبیل اللہ اور صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی چھ شرائط معلوم ہوں گی:-

اول اس مال کا حلال ہونا جو اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے، دوسرے طریقِ سنت کے مطابق خرچ کرنا، تیسرے صحیح مصرف پر خرچ کرنا، چوتھے خیرات دے کر احسان نہ جتلانا، پانچویں ایسا کوئی معاملہ نہ کرنا جس سے اُن لوگوں کی تحقیر ہو جن کو یہ مال دیا گیا ہے، چھٹے جو کچھ خرچ کیا جائے اخلاصِ نیت کے ساتھ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہو، نام و نمود کے لئے نہ ہو۔

دوسری شرط یعنی طریقِ سنت کے مطابق خرچ کرنا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت اس کا لحاظ رہے کہ کسی حق دار کی حق تلفی نہ ہو، اپنے عیال کے ضروری اخراجات بغیر ان کی رضا مندی کے بند یا کم کر کے صدقہ

وخیرات کرنا کوئی امرِ ثواب نہیں، حاجت مند وارثوں کو محروم کر کے سارے مال کو صدقہ و خیرات یا وقف کر دینا تعلیم سنت کے خلاف ہے، پھر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ہزاروں صورتیں ہیں۔

طریقِ سنت یہ ہے کہ مصرف کی اہمیت اور ضرورت کی شدت کا لحاظ کر کے مصرف کا انتخاب کیا جائے، عام طور پر خرچ کرنے والے اس کی رعایت نہیں کرتے۔

تیسری شرط کا حاصل یہ ہے کہ ثواب ہونے کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ اپنے خیال میں کسی کام کو نیک سمجھ کر نیک نیتی سے اس میں صرف کر دے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مصرفِ شریعت کی رُو سے جائز اور مستحسن بھی ہو، کوئی شخص ناجائز کھیل تماشوں کے لئے اپنی جائیداد وقف کر دے تو وہ بجائے ثواب کے عذاب کا مستحق ہوگا، یہی حال تمام اُن کاموں کا ہے جو شریعت کی رُو سے مستحسن نہیں ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ

اے ایمان والو! خرچ کرو سٹھری چیزیں اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے کہ جو ہم نے پیدا کیا تمہارے واسطے

مِّنَ الْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَسَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِأَخِيذِهِ إِلَّا

زمین سے اور قصد نہ کرو گندی چیز کا اس میں سے کہ اس کو خرچ کرو، حالانکہ تم اس کو کبھی نہ لو گے مگر

أَنْ تُغْضُوا فِيهِ ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ۝۲۷ الشَّيْطَانُ يُعِدُّ كُمْ

یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ، اور جان رکھو کہ اللہ بے پروا ہے خوبیوں والا۔ شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو

الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ ۚ وَاللَّهُ يُعِدُّ كُمْ مَغْفِرَةً مِنْهُ وَفَضْلًا ۖ وَاللَّهُ

تنگ دستی کا اور حکم کرتا ہے بے حیائی کا، اور اللہ وعدہ دیتا ہے تم کو اپنی بخشش اور فضل کا اور اللہ

وَاسِعٌ عَلَيْهِ ۝۲۸ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاءُ ۚ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ

بہت کشائش والا ہے سب کچھ جانتا ہے۔ عنایت کرتا ہے سمجھ جس کو چاہے، اور جس کو سمجھ ملی ہے

فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۖ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ۝۲۷۹ وَمَا

اُس کو بڑی خوبی ملی اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ اور جو

أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهَا ۖ

خرچ کرو گے تم خیرات یا قبول کرو گے کوئی منّت تو بے شک اللہ کو سب معلوم ہے،

وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ۝۲۸۰ إِنْ تَبَدُّوا لَصَادَقْتَ فَنِعْمَ هِيَ ۚ وَإِنْ

اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ اگر ظاہر کر کے دو خیرات تو کیا اچھی بات ہے، اور اگر

تُخْفُوا هَاوُتُوهَا لِقَوْمٍ آءٍ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ ۖ وَيَكْفُرْ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ ۖ

اس کو چھپاؤ اور فقیروں کو پہنچاؤ تو وہ بہتر ہے تمہارے حق میں، اور دُور کرے گا کچھ گناہ تمہارے

وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝۲۸۱ لَيْسَ عَلَيْكُمْ هُدُيُهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي

اور اللہ تمہارے کاموں سے خوب خبردار ہے۔ تیرا ذمہ نہیں اُن کو راہ پر لانا اور لیکن اللہ راہ پر لاوے

مَنْ يَشَاءُ ۖ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا يُنْفِكُمْ ۖ وَمَا تُنْفِقُونَ

جس کو چاہے، اور جو کچھ خرچ کرو گے تم مال سو اپنے ہی واسطے، جب تک کہ خرچ کرو گے

إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ ۖ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ

اللہ ہی کی رضا جوئی میں، اور جو خرچ کرو گے خیرات سو پوری ملے گی تم کو اور تمہارا

لَا تُظْلَمُونَ ۝۲۸۲ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ

حق نہ رہے گا۔ خیرات اُن فقیروں کے لئے ہے جو رُکے ہوئے ہیں اللہ کی راہ میں

لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ

جل پھر نہیں سکتے ملک میں، سمجھے ان کو ناواقف مال دار اُن کے سوال نہ کرنے سے،

تَعْرِفُهُمْ بِسَيِّئِهِمْ ۚ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِحَافًا ۖ وَمَا تَنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ

تو پہچانتا ہے اُن کو اُن کے چہرے سے، نہیں سوال کرتے لوگوں سے لپٹ کر، اور جو خرچ کر دے گا کام کی چیز وہ بے شک

اللَّهُ بِهِ عَلَيْهِمُ ۚ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا

اللہ کو معلوم ہے۔ جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں رات کو اور دن کو چھپا کر

وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

اور ظاہر میں تو اُن کے لئے ثواب ہے اُن کا اپنے رب کے پاس اور نہ ڈر ہے اُن پر

وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۚ

اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

آسان ترجمہ قرآن

اے ایمان والو! جو کچھ تم نے کمایا ہو اور جو پیداوار ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالی ہو اس کی اچھی چیزوں کا ایک حصہ (اللہ کے راستے میں) خرچ کیا کرو، اور یہ نیت نہ رکھو کہ بس ایسی خراب قسم کی چیزیں (اللہ کے نام پر) دیا کرو گے جو (اگر کوئی دوسرا تمہیں دے تو نفرت کے مارے) تم اسے آنکھیں میچے بغیر نہ لے سکو۔ اور یاد رکھو کہ اللہ ایسا بے نیاز ہے کہ ہر قسم کی تعریف اسی کی طرف لوٹتی ہے۔ ۲۷۴ شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور تمہیں بے حیائی کا حکم دیتا ہے، اور اللہ تم سے اپنی مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے۔ اللہ بڑی وسعت والا، ہر بات جاننے والا ہے۔ ۲۷۵ وہ جس کو چاہتا ہے دانائی عطا کر دیتا ہے، اور جسے دانائی عطا ہو گئی اسے وافر مقدار میں بھلائی مل گئی۔ اور نصیحت وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جو سمجھ کے مالک ہیں۔ ۲۷۶ اور تم جو کوئی خرچ کرو یا کوئی منت مانو اللہ اسے جانتا ہے۔ اور ظالموں کو کسی طرح

کے مددگار میسر نہیں آئیں گے۔ (۷۲۰) اگر تم صدقات ظاہر کر کے دوتب بھی اچھا ہے، اور اگر ان کو چھپا کر فقراء کو دوتو یہ تمہارے حق میں کہیں بہتر ہے۔ اور اللہ تمہاری بُرائیوں کا کفارہ کر دے گا، اور اللہ تمہارے تمام کاموں سے پوری طرح باخبر ہے۔ (۷۲۱) (اے پیغمبر!) ان (کافروں) کو راہِ راست پر لے آنا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے، لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے راہِ راست پر لے آتا ہے۔ اور جو مال بھی تم خرچ کرتے ہو وہ خود تمہارے فائدے کے لئے ہوتا ہے جبکہ تم اللہ کی خوشنودی طلب کرنے کے سوا کسی اور غرض سے خرچ نہیں کرتے۔ اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے تمہیں پورا پورا دیا جائے گا اور تم پر ذرا بھی ظلم نہیں ہوگا۔ (۷۲۲) (مالی امداد کے بطور خاص) مستحق وہ فقراء ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں اس طرح مقید کر رکھا ہے کہ وہ (مغاش کی تلاش کے لئے) زمین میں چل پھر نہیں سکتے۔ چونکہ وہ اتنے پاک دامن ہیں کہ کسی سے سوال نہیں کرتے، اس لئے ناواقف آدمی انہیں مال دار سمجھتا ہے۔ تم ان کے چہرے کی علامتوں سے ان (کی اندرونی حالت) کو پہچان سکتے ہو (مگر) وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔ اور تم جو مال بھی خرچ کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ (۷۲۳) جو لوگ اپنے مال دن رات خاموشی سے بھی اور علانیہ بھی خرچ کرتے ہیں وہ اپنے پروردگار کے پاس اپنا ثواب پائیں گے، اور نہ انہیں کوئی خوف لاحق ہوگا، نہ کوئی غم پہنچے گا۔ (۷۲۴)

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو! (نیک کام میں) خرچ کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور (عمدہ چیز کو) اس میں سے جو کہ ہم نے تمہارے (کام میں لانے کے) لئے زمین سے پیدا کیا اور ردی (ناکارہ) چیز کی طرف نیت مت لے جایا کرو کہ اس میں سے خرچ کر دو حالانکہ (ویسی ہی چیز اگر کوئی تم کو تمہارے حق واجب کے عوض یا سوغات میں دینے لگے تو) تم کبھی اس کے لینے والے نہیں، ہاں مگر چشم پوشی (اور رعایت) کر جاؤ (تو اور بات ہے) اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں (جو ایسی ناکارہ چیزوں سے خوش ہوں) تعریف کے لائق ہیں (یعنی ذات و صفات میں کامل ہیں تو ان کے دربار میں چیز بھی کامل تعریف کے لائق ہی پیش کرنا چاہئے) شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے، (کہ اگر خرچ کرو گے یا اچھا مال خرچ کرو گے تو محتاج ہو جاؤ گے) اور تم کو بری بات (یعنی بخل) کا مشورہ دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ کرتا ہے (خرچ کرنے پر اور اچھی چیز خرچ کرنے پر) اپنی طرف سے گناہ معاف کر دینے کا اور زیادہ دینے کا (یعنی چونکہ نیک جگہ خرچ کرنا طاعت ہے اور طاعت سے معصیت کا کفارہ ہو جاتا ہے، لہذا اس سے گناہ بھی معاف ہوتے ہیں، اور حق تعالیٰ کسی کو دنیا میں بھی اور آخرت میں تو سبھی کو خرچ کا عوض بھی زیادہ کر کے دیتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ وسعت والے ہیں (وہ سب کچھ دے سکتے ہیں) خوب جاننے والے ہیں (نیت کے موافق ثمرہ دیتے ہیں، اور یہ سب مضامین بہت ظاہر ہیں، لیکن ان کو وہی سمجھتا

ہے جس کو دین کا فہم ہو اور اللہ تعالیٰ دین کا فہم جس کو چاہتے ہیں دے دیتے ہیں اور (سچ تو یہ ہے کہ) جس کو دین کا فہم مل جاوے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی (کیونکہ دنیا کی کوئی نعمت اس کے برابر نفع نہیں) اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں (یعنی جو عقل صحیح رکھتے ہیں) اور تم لوگ جو کسی قسم کا خرچ کرتے ہو یا کسی طرح کی نذر مانتے ہو سو حق تعالیٰ کو سب کی یقیناً اطلاع ہے، اور بے جا کام کرنے والوں کا (قیامت میں) کوئی ہمراہی (حمایتی) نہ ہوگا، اگر تم ظاہر کر کے دو صدقات کو تب بھی اچھی بات ہے اور اگر ان کا اخفا کرو اور (اخفا کے ساتھ) فقیروں کو دے دو تب اخفا تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، اور اللہ تعالیٰ (اس کی برکت سے) تمہارے کچھ گناہ بھی دُور کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں کی خوب خبر رکھتے ہیں، (چونکہ بہت سے صحابہ کفار کو بائیں مصلحت خیرات نہ دیتے تھے کہ شاید اسی تدبیر سے کچھ لوگ مسلمان ہو جاویں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی رائے دی تھی اس لئے اس آیت میں دونوں طرح کے خطاب کر کے ارشاد فرماتے ہیں کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم) ان (کافروں) کو ہدایت پر لے آنا کچھ آپ کے ذمہ (فرض واجب) نہیں (جس کے لئے اتنی دُور درازا ہتمام کئے جاویں) لیکن (یہ تو) خدا تعالیٰ (کا کام ہے) جس کو چاہیں ہدایت پر لے آویں، (آپ کا کام صرف ہدایت کا پہنچا دینا ہے خواہ کوئی ہدایت پر آوے یا نہ آوے اور ہدایت کا پہنچا دینا کچھ اس ممانعت پر موقوف نہیں) اور (اے مسلمانو!) تم اور کسی غرض سے خرچ نہیں کرتے بجز رضا جوئی ذاتِ پاک حق تعالیٰ کے (کہ ثواب اس کے لوازم سے ہے اور یہ ہر حاجت مند کی رفع حاجت کرنے سے حاصل ہوتی ہے، پھر مسلمان فقیر کی تخصیص کیوں کی جاوے) اور (نیز) جو کچھ مال خرچ کر رہے ہو یہ سب (یعنی اس کا عوض اور ثواب) پورا پورا تم (ہی) کو (آخرت میں) مل جاوے گا اور تمہارے لئے اس میں ذرا کمی نہ کی جاوے گی (سو تم کو اپنے عوض سے مطلب رکھنا چاہئے، اور عوض ہر حال میں ملے گا، پھر تم کو اس سے کیا بحث کہ ہمارا صدقہ مسلمان ہی کو ملے، کافر کو نہ ملے، صدقات) اصل حق اُن حاجت مندوں کا ہے جو مقید ہو گئے ہوں اللہ کی راہ (یعنی دین کی خدمت) میں، (اور اسی خدمت دین میں مقید اور مشغول رہنے سے) وہ لوگ (طلبِ معاش کے لئے) کہیں ملک میں چلنے پھرنے کا (عادتاً) امکان نہیں رکھتے (اور) ناواقف ان کو مال دار خیال کرتا ہے اُن کے سوال سے بچنے کے سبب سے (البتہ) تم ان لوگوں کو اُن کے طرز (ہیئت) سے پہچان سکتے ہو (کیونکہ فقر و فاقہ سے چہرے اور بدن میں ایک گونہ اضمحلال ضرور آجاتا ہے اور یوں) وہ لوگوں سے لپٹ کر مانگتے نہیں پھرتے (جس سے کوئی اُن کو حاجت مند سمجھے، یعنی مانگتے ہی نہیں، کیونکہ اکثر جو لوگ مانگنے کے عادی ہیں وہ لپٹ کر ہی مانگتے ہیں) اور (ان لوگوں کی خدمت کرنے کو) جو مال خرچ کرو گے بے شک حق تعالیٰ کو اس کی خوب اطلاع ہے (اور لوگوں کو دینے سے اُن کی خدمت کافی نفسہ زیادہ ثواب دیں گے) جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو رات میں اور دن میں (یعنی بلا تخصیص اوقات) پوشیدہ اور آشکارا (یعنی بلا تخصیص حالات) سو اُن لوگوں کو ان کا ثواب ملے گا (قیامت کے

روز) ان کے رب کے پاس (جا کر) اور نہ (اس روز) اُن پر کوئی خطرہ (واقع ہونے والا) ہے اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

معارفِ مسائل

اس سے قبل کے رُکوع میں اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا بیان تھا، اب اسی سے متعلقہ امور کا مزید بیان اس رُکوع کی سات آیات میں کیا گیا ہے، جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا (الی قولہ) ^(۲۶۷) عَنْ حَيْثُ شِئْتُمْ ^(۲۶۸) شَانَ نَزُولِ سے ”طیب“ کے معنی عمدہ کے کئے گئے ہیں، کیونکہ بعض لوگ خراب چیزیں لے آتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی تھی، اور بعض نے عموم لفظ سے ”طیب“ کی تفسیر حلال سے کی ہے، کیونکہ پوری عمدہ جب ہی ہوتی ہے جب حلال بھی ہو، پس اس بنا پر آیت میں اس کی بھی تاکید ہوگی اور پہلی تفسیر پر دوسرے دلائل سے اس تاکید کو ثابت کیا جاوے گا، اور یاد رکھو کہ یہ اس شخص کے لئے ہے جس کے پاس عمدہ چیز ہو، اور پھر وہ بری کئی چیز خرچ کرے، جیسا کہ لفظ **مَا كَسَبْتُمْ** اور **أَخْرَجْنَا** اس کے موجود ہونے پر اور **وَلَا تَيْسَّبُوا** **الْعَيْشَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ** عمدہ کئی چیز کے خرچ کرنے پر دلالت کر رہا ہے، اور جس کے پاس اچھی چیز ہو، وہی نہیں وہ اس ممانعت سے بری ہے، اور اس کی وہ بری بھی مقبول ہے۔

لفظ **مَا كَسَبْتُمْ** سے بعض علماء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ والد کا اپنے بیٹے کی کمائی سے کھانا جائز ہے، لقولہ

عليه السلام:-

أَوْلَادُكُمْ مِنْ طَيِّبِ أَكْسَابِكُمْ فَكُلُوا مِنْ أَمْوَالِ أَوْلَادِكُمْ هَنِيئًا۔ (قرطبی)
 ”تمہاری اولاد تمہاری کمائی کا ایک پاکیزہ حصہ ہے، پس تم اپنی اولاد کی کمائی سے مزے سے کھاؤ۔“

عشر اراضی کے احکام

وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ ^(۲۶۹) میں لفظ **أَخْرَجْنَا** سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ عشری زمین میں عشر واجب ہے، اس آیت کے عموم سے امام ابو حنیفہؒ نے استدلال کیا ہے کہ عشری زمین کی ہر قلیل و کثیر پیداوار پر عشر واجب ہے، سورہ انعام کی آیت: **وَأَنْتُمْ أَحَقُّه يَوْمَ حَصَادِهِ** ^(۱۴۱) (الانعام: ۱۴۱) وجوب عشر میں بالکل صریح اور واضح ہے۔ ”عشر و خراج“ شریعت اسلامی کے دو اصطلاحی لفظ ہیں، ان دونوں میں ایک بات مشترک ہے کہ اسلامی حکومت کی طرف سے زمینوں پر عائد کردہ ٹیکس کی ایک حیثیت ان دونوں میں ہے، فرق یہ ہے کہ ”عشر“ فقط ٹیکس نہیں بلکہ اس میں ٹیکس سے زیادہ اصلی حیثیت عبادت مالی کی ہے، مثل زکوٰۃ کے، اسی لئے اس کو ”زکوٰۃ الارض“ بھی کہا جاتا ہے، اور ”خراج“ خالص ٹیکس

ہے، جس میں عبادت کی کوئی حیثیت نہیں، مسلمان چونکہ عبادت کے اہل اور پابند ہیں، ان سے جو زمین کی پیداوار کا حصہ لیا جاتا ہے اس کو ”عشر“ کہتے ہیں، اور غیر مسلم چونکہ عبادت کے اہل نہیں، ان کی زمینوں پر جو کچھ عائد کیا جاتا ہے اس کا نام ”خراج“ ہے۔ عملی طور پر زکوٰۃ اور عشر میں بھی یہ فرق ہے کہ سونا چاندی اور تجارت کے مال پر زکوٰۃ سال بھر گزرنے کے بعد عائد ہوتی ہے، اور عشر زمین سے پیداوار حاصل ہوتے ہی واجب ہو جاتا ہے۔

دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ اگر زمین سے کوئی پیداوار نہ ہو تو عشر ساقط ہو جاتا ہے، لیکن اموال تجارت اور سونے چاندی پر اگر کوئی نفع بھی نہ ہو تب بھی سال پورا ہونے پر ان پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔ عشر و خراج کے مسائل کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، کتب فقہ میں مذکور ہے، اور احقر نے اپنی کتاب ”نظام الاراضی“ میں بھی تفصیل سے لکھ دیا ہے، جس میں پاکستان و ہندوستان کی زمینوں کے خصوصی احکام بھی لکھے گئے ہیں۔

الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ (الی قولہ) وَمَا يَدَّ كُرًّا إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ جب کسی کے دل میں یہ خیال آئے کہ اگر خیرات کروں گا تو مفلس ہو جاؤں گا، اور حق تعالیٰ کی تاکید سن کر بھی اس کی ہمت نہ ہو، اور دل چاہے کہ اپنا مال خرچ نہ کرے، اور وعدہ الہی سے اعراض کر کے وعدہ شیطانی پر طبیعت کو میلان اور اعتماد ہو تو اس کو یقین کر لینا چاہئے کہ یہ مضمون شیطان کی طرف سے ہے، یہ نہ کہے کہ ”شیطان کی تو ہم نے کبھی صورت بھی نہیں دیکھی، حکم کرنا تو درکنار رہا۔“ اور اگر یہ خیال آوے کہ صدقہ و خیرات سے گناہ بخشے جائیں گے، اور مال میں بھی ترقی اور برکت ہوگی، تو جان لے کہ یہ مضمون اللہ کی طرف سے آیا ہے، اور خدا کا شکر کرے اور اللہ کے خزانے میں کمی نہیں، سب کے ظاہر و باطن، نیت و عمل کو خوب جانتا ہے۔

حکمت کے معنی اور تفسیر

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ لَفْظ ”حکمت“ قرآن کریم میں بار بار آیا ہے، اور ہر جگہ اس کی تفسیر میں مختلف معنی بیان کئے گئے ہیں، تفسیر ”بحر محیط“ میں اس جگہ تمام اقوال مفسرین کو جمع کیا ہے، وہ تقریباً تیس ہیں، مگر آخر میں فرمایا کہ درحقیقت یہ سب اقوال متقارب ہیں، ان میں کوئی اختلاف نہیں، صرف تعبیرات کا فرق ہے، کیونکہ لفظ حکمت، احکام بالکسر کا مصدر ہے، جس کے معنی ہیں کسی عمل یا قول کو اس کے تمام اوصاف کے ساتھ مکمل کرنا۔

اسی لئے ”بحر محیط“ میں آیت بقرہ: وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ (البقرة: ۲۵۱) جو حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق ہے، اس کی تفسیر میں فرمایا:۔

وَالْحِكْمَةُ وَضْعُ الْأُمُورِ فِي مَحَلِّهَا عَلَى الصَّوَابِ وَكَمَالُ ذَلِكَ إِنَّمَا يَحْصُلُ بِالتَّبَوُّةِ۔

”حکمت کے اصلی معنی ہر شے کو اس کے محل میں رکھنے کے ہیں، اور اس کا کمال صرف نبوت سے ہو سکتا

ہے، اس لئے یہاں حکمت کی تفسیر نبوت سے کی گئی ہے۔“

امام راغب اصفہانیؒ نے ”مفردات القرآن“ میں فرمایا کہ لفظ ”حکمت“ جب حق تعالیٰ کے لئے استعمال کیا جائے تو معنی تمام اشیاء کی پوری معرفت اور مستحکم ایجاد کے ہوتے ہیں، اور جب غیر اللہ کی طرف اس کی نسبت کی جاتی ہے تو موجودات کی صحیح معرفت اور اس کے مطابق عمل مراد ہوتا ہے۔^[۱]

اسی مفہوم کی تعبیریں مختلف الفاظ میں کی گئی ہیں، کسی جگہ اس سے مراد قرآن ہے، کسی جگہ حدیث، کسی جگہ علم صحیح، کہیں عمل صالح، کہیں قول صادق، کہیں عقل سلیم، کہیں فقہ فی الدین، کہیں اصابت رائے اور کہیں خشية اللہ، اور آخری معنی تو خود حدیث میں بھی مذکور ہیں: ”رَأْسُ الْحِكْمَةِ خَشْيَةُ اللَّهِ“ یعنی اصل حکمت خدا تعالیٰ سے ڈرنا ہے، اور آیت: ”وَيَعْلَمُ الْكُتُبَ وَالْحِكْمَةَ“ (الجمعة: ۲) میں ”حکمت“ کی تفسیر صحابہؓ و تابعینؓ سے حدیث و سنت منقول ہے، اور بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ آیت زیر نظر **يُؤْتِ الْحِكْمَةَ** میں یہ سب چیزیں مراد ہیں۔ (بحر محیط ج: ۲ ص: ۳۲۰)

اور ظاہر یہی قول ہے، اور ارشادِ قرآنی: **وَمَنْ يُؤْتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا** سے بھی اس کی طرف اشارہ نکلتا ہے، کہ معنی اس کے یہ ہیں کہ جس شخص کو حکمت دے دی گئی اس کو خیر کثیر دے دی گئی، واللہ اعلم۔

وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ (الی قولہ) وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍؑ ”کسی قسم کے خرچ کرنے میں“ سب خرچ آگئے، وہ بھی جس میں سب شرائط مذکورہ کی رعایت ہو، اور وہ بھی جس میں کل کی یا بعض کی رعایت نہ ہو، مثلاً فی سبیل اللہ نہ ہو، بلکہ معصیت میں ہو، یا انفاق میں ریا شامل ہو، یا انفاق کر کے اس پر احسان جتلا نا ہو، یا حلال یا عمدہ مال نہ ہو۔ اسی طرح ”نذر“ کے عموم میں سب نذریں آگئیں، مثلاً عبادتِ مالیہ کی نذر، اور اسی مناسبت سے انفاق کے ساتھ نذر کو لائے ہیں، یا عبادتِ بدنہ کی نذر ہو، پھر وہ مطلق ہو یا کسی امر پر معلق ہو، پھر یہ کہ اس کا ایفا کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو، اور مقصود اس کہنے سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان سب چیزوں کا علم ہے وہ اس کی جزادیں گے، یہ اس لئے سنایا تا کہ حدود و شرائط کی رعایت کی ترغیب اور عدم رعایت سے ترہیب ہو، اور بے جام کام کرنے والوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو ضروری شرائط کی رعایت نہیں کرتے، ان کو صریحاً وعید سنائی۔

إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعْمًا هِيَ (الی قولہ) وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌؑ بظاہر یہ آیت فرض اور نفل سب صدقات کو شامل ہے، اور سب میں اخفا ہی افضل ہے، اس میں دینی مصلحت بھی ہے کہ ریا سے ابعد ہے، لینے والا بھی نہیں شرماتا، اور دنیوی مصلحت بھی ہے کہ اپنے مال کی مقدار عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتی، اور مراد افضلیتِ اخفا سے آیت میں افضلیت فی نفسہ ہے، پس اگر کسی مقام پر کسی عارض سے مثلاً رفعِ تہمت یا اُمیدِ اقتدا وغیرہ سے اظہار کو ترجیح ہو جاوے تو افضلیت

فی نفسہ کے منافی نہیں۔ **وَيُكَفِّرْ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ** ۱ کفارہ سیئات کچھ اخفا کے ساتھ تو خاص نہیں، صرف اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے اخفا کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے کہ اخفا میں تجھے اگر کوئی ظاہری فائدہ نظر نہ آئے تو منقبض نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ تمہارے گناہ اللہ معاف کرتا ہے، اور یہ تمہارے لئے فائدہ عظیمہ ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ (الی قولہ) وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ۲ اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ نیت بھی تمہاری اصل میں اپنے ہی نفع حاصل کرنے کی ہے، اور واقع میں بھی حاصل خاص تم ہی کو ہوگا، پھر ان زوائد پر کیوں نظر کی جاتی ہے کہ یہ نفع خاص اسی طریق سے حاصل کیا جاوے کہ مسلمان ہی کو صدقہ دیں، اور کافر کو نہ دیں۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ اس صدقہ سے مراد صدقہ نفلی ہے جس کا ذمی کافر کو بھی دینا جائز ہے، زکوٰۃ مراد نہیں، کیونکہ وہ سوائے مسلمان کے کسی دوسرے کو دینا جائز نہیں۔ (مظہری) ۳

مسئلہ:- حربی کافر کو کسی قسم کا صدقہ وغیرہ دینا جائز نہیں۔

مسئلہ:- کافر ذمی یعنی غیر حربی کو صرف زکوٰۃ و عشر دینا جائز نہیں، اور دوسرے صدقات واجبہ و نفل سب جائز ہیں، اور آیت میں زکوٰۃ داخل نہیں۔

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ (الی قولہ) فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۴ یہاں ”فقراء“ سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو دینی مشغولیت کی وجہ سے دوسرا کوئی کام نہیں کر سکتے۔

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۵ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی فقیر قیمتی کپڑے پہنے ہوئے ہو تو اس کی وجہ سے اس کو غنی نہیں کہا جائے گا، بلکہ اس کو فقیر ہی کہا جائے گا، اور ایسے آدمی کو زکوٰۃ دینا بھی صحیح ہوگا۔ (قرطبی) ۶

تَعْرِفُهُمْ بِسَيِّئِهِمْ ۷ سے معلوم ہوا کہ علامات کو دیکھ کر حکم لگانا صحیح ہے، چنانچہ اگر کوئی مردہ اس قسم کا پایا جائے کہ اس پر زنا رہے اور اس کا ختنہ بھی نہیں کیا ہوا ہو تو اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا۔ (قرطبی) ۸

لَا يَسْتَأْذِنُ النَّاسُ الْخَافَا ۹ اس آیت سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ لپٹ کر نہیں مانگتے، لیکن بغیر لپٹ کر مانگنے کی نفی نہیں ہے چنانچہ بعض حضرات کا یہی قول ہے، لیکن جمہور کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سوال بالکل ہی نہیں کرتے، **لَا تَهُمُّ مُتَعَفِّوْنَ عَنِ الْمَسْأَلَةِ عِقَّةً تَامَةً**۔ (قرطبی) ۱۰

۱ تفسیر المظہری تحت هذه الآية ج: ۲ ص: ۳۹۱

۲ تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۳ ص: ۳۴۱

۳ بحوالہ بالا۔

۴ تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۳ ص: ۳۴۳ - ترجمہ:- کیونکہ وہ سوال کرنے سے مکمل طور پر بچتے ہیں۔

آٹھویں آیت **الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِالْئِيلِ وَالْثَّهَارِ** میں ان لوگوں کے اجرِ عظیم اور فضیلت کا بیان ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے عادی ہیں، تمام حالات و اوقات میں رات میں اور دن میں، خفیہ اور علانیہ ہر طرح فی سبیل اللہ خرچ کرتے رہتے ہیں، اس کے ضمن میں یہ بھی بتلادیا کہ صدقہ و خیرات کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں، نہ رات اور دن کی کوئی تعیین ہے، اس طرح خفیہ اور علانیہ دونوں طرح سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ثواب ہے، بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ خرچ کیا جائے، نام و نمود مقصود نہ ہو، خفیہ خرچ کرنے کی فضیلت بھی اسی حد تک ہے کہ علانیہ خرچ کرنے کے لئے کوئی ضرورت داعی نہ ہو، اور جہاں ایسی ضرورت ہو وہاں علانیہ خرچ کرنا ہی افضل ہے۔

”رُوحُ المعانی“ میں بحوالہ ابنِ عساکر نقل کیا ہے کہ حضرت صدیقِ اکبرؓ نے چالیس ہزار دینار اللہ کی راہ میں اسی طرح خرچ کئے کہ دس ہزار دن میں، دس ہزار رات میں، دس ہزار خفیہ اور دس ہزار علانیہ، بعض مفسرین نے اس آیت کا شانِ نزول اسی واقعہ صدیقِ اکبرؓ کو لکھا ہے، اس کے شانِ نزول کے متعلق اور بھی مختلف اقوال ہیں۔^[۱]

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ

جو لوگ کھاتے ہیں سود نہیں اٹھیں گے قیامت کو مگر جس طرح اٹھتا ہے وہ شخص کہ جس کے حواس کھو دیئے ہوں

الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ط ذَلِكِ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا م

جن نے لپٹ کر، یہ حالت اُن کی اس واسطے ہوگی کہ انہوں نے کہا کہ سوداگری بھی تو ایسی ہی ہے جیسے سود لینا،

وَاحِلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا ط فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَبِّهِ

حالانکہ اللہ نے حلال کیا ہے سوداگری کو اور حرام کیا ہے سود کو، پھر جس کو پہنچی نصیحت اپنے رب کی طرف سے

فَأَنْتَهَى فَلَهُ مَا سَلَفَ ط وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ ط وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ

اور وہ باز آگیا تو اس کے واسطے ہے جو پہلے ہو چکا اور معاملہ اس کا اللہ کے حوالے ہے، اور جو کوئی پھر لیوے سود تو وہی لوگ ہیں

أَصْحَابُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٤٥﴾ يَحَقُّ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرِي

دوزخ والے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ مثلاً ہے اللہ سود اور بڑھاتا ہے

الصَّدَقَاتِ ۖ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ﴿٢٤٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا

خیرات کو، اور اللہ خوش نہیں کسی ناشکر گنہگار سے۔ جو لوگ ایمان لائے

وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ

اور عمل نیک کئے اور قائم رکھا نماز کو اور دیتے رہے زکوٰۃ ان کے لئے ہے ثواب

عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٤٧﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا

اُن کے رب کے پاس، اور نہ اُن کو خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اے ایمان والو!

اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٢٤٨﴾ فَإِنْ لَّمْ

ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو کچھ باقی رہ گیا ہے سود اگر تم کو یقین ہے اللہ کے فرمانے کا۔ پس اگر نہیں

تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ

چھوڑتے تو تیار ہو جاؤ لڑنے کو اللہ سے اور اس کے رسول سے، اور اگر توبہ کرتے ہو تو تمہارے واسطے ہے

رَأْوُسُ أَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٤٩﴾ وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ

اصل مال تمہارا، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر کوئی۔ اور اگر ہے تنگ دست

فَظَرَّةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۖ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٥٠﴾

تو مہلت دینی چاہئے کشائش ہونے تک، اور بخش دو تو بہت بہتر ہے تمہارے لئے، اگر تم کو سمجھ ہے۔

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ

اور ڈرتے رہو اس دن سے جس دن لوٹائے جاؤ گے اللہ کی طرف، پھر پورا دیا جائے گا ہر شخص کو جو کچھ اس نے کمایا

وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۲۸۱﴾

اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔

آسان ترجمہ قرآن

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قیامت میں) اُنھیں گے تو اس شخص کی طرح اُنھیں گے جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنا دیا ہو۔ یہ اس لئے ہوگا کہ انہوں نے کہا تھا کہ: ”بیع بھی تو سود ہی کی طرح ہوتی ہے۔“ حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ لہذا جس شخص کے پاس اس کے پروردگار کی طرف سے نصیحت آگئی اور وہ (سودی معاملات سے) باز آ گیا تو ماضی میں جو کچھ ہوا وہ اسی کا ہے۔ اور اس (کی باطنی کیفیت) کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اور جس شخص نے لوٹ کر پھر وہی کام کیا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں۔ وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ ﴿۲۸۵﴾ اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ اور اللہ ہر اس شخص کو ناپسند کرتا ہے جو ناشکر اگنہگار ہو ﴿۲۸۶﴾ (ہاں) وہ لوگ جو ایمان لائیں، نیک عمل کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں وہ اپنے رب کے پاس اپنے اجر کے مستحق ہوں گے، نہ انہیں کوئی خوف لاحق ہوگا، نہ کوئی غم پہنچے گا۔ ﴿۲۸۷﴾ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اگر تم واقعی مومن ہو تو سود کا جو حصہ بھی (کسی کے ذمے) باقی رہ گیا ہو اسے چھوڑ دو ﴿۲۸۸﴾ پھر بھی اگر تم ایسا نہ کرو گے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو۔ اور اگر تم (سود سے) توبہ کرو تو تمہارا اصل سرمایہ تمہارا حق ہے۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے ﴿۲۸۹﴾ اور اگر کوئی تنگدست (قرض دار) ہو تو اس کا ہاتھ کھلنے تک مہلت دینی ہے۔ اور صدقہ ہی کر دو تو یہ تمہارے حق میں کہیں زیادہ بہتر ہے، بشرطیکہ تم کو سمجھ ہو ﴿۲۹۰﴾ اور ڈرو اس دن سے جب تم سب اللہ کے پاس لوٹ کر جاؤ گے، پھر ہر شخص کو جو کچھ اس نے کمایا ہے پورا پورا دیا جائے گا، اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ ﴿۲۹۱﴾

خلاصہ تفسیر

جو لوگ سود کھاتے ہیں (یعنی لیتے ہیں) نہیں کھڑے ہوں گے (قیامت میں قبروں سے) مگر جس طرح کھڑا ہوتا

ہے ایسا شخص جس کو شیطان نے خبطی بنا دیا ہو لپٹ کر (یعنی حیران مدہوش) یہ سزا اس لئے ہوگی کہ ان (سود خوار) لوگوں نے (سود کے حلال ہونے پر استدلال کرنے کے لئے) کہا تھا کہ بیع بھی تو مثل سود کے ہے (کیونکہ اس میں بھی مقصود نفع حاصل کرنا ہوتا ہے، اور بیع یقیناً حلال ہے، پھر سود بھی جو کہ اس کا مثل ہے حلال ہونا چاہئے) حالانکہ (دونوں میں کھلا فرق ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے (جو کہ مالک ہیں احکام کے) بیع کو حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام کر دیا ہے (اس سے زیادہ اور کیا فرق ہوگا) پھر جس شخص کو اس کے پروردگار کی طرف سے (اس بارے میں) نصیحت پہنچی اور وہ (اس سود کے فعل اور اس کفر کے قول سے یعنی حلال کہنے سے) باز آ گیا (یعنی حرام سمجھنے لگا اور لینا بھی چھوڑ دیا) تو جو کچھ (اس حکم کے آنے سے) پہلے (لینا) ہو چکا ہے وہ اس کا رہا (یعنی ظاہر شرع کے نزدیک اس کی یہ توبہ قبول ہوگئی، اور لیا ہوا مال اسی کی ملک ہے) اور (باطنی) معاملہ اس کا (کہ وہ دل سے باز آیا ہے یا منافقانہ توبہ کر لی ہے، یہ) خدا کے حوالے رہا، (اگر دل سے توبہ کی ہوگی عند اللہ نافع ہوگی ورنہ کالعدم ہوگی، تم کو بدگمانی کا کوئی حق نہیں) اور جو شخص (نصیحت مذکور سن کر بھی اسی قول اور اسی فعل کی طرف) پھر عود کرے تو (بوجہ اس کے کہ ان کا یہ فعل خود گناہ کبیرہ ہے) یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے (اور بوجہ اس کے کہ اُن کا یہ قول کفر ہے اس لئے) وہ اس (دوزخ) میں ہمیشہ رہیں گے (اور گو سود لینے سے فی الحال مال بڑھتا نظر آتا ہے، لیکن مالِ کار) اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں (کبھی تو دنیا ہی میں سب برباد ہو جاتا ہے، ورنہ آخرت میں تو یقینی برباد ہے، کیونکہ وہاں اس پر عذاب ہوگا) اور (برخلاف اس کے صدقہ دینے میں گو فی الحال مال گھٹتا معلوم ہوتا ہے، لیکن مالِ کار اللہ تعالیٰ) صدقات کو بڑھاتے ہیں (کبھی تو دنیا میں بھی ورنہ آخرت میں تو یقیناً بڑھتا ہے، کیونکہ وہاں اس پر بہت سا ثواب ملے گا، جیسا اُوپر آیات میں مذکور ہوا) اور اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا (بلکہ مبغوض رکھتے ہیں) کسی کفر کرنے والے کو (جو کہ قول مذکور کے مثل کلمات کفر منہ سے بکے، اور اسی طرح پسند نہیں کرتے) کسی گناہ کے کام کرنے والے کو (جو کہ فعل مذکور یعنی سود کے مثل کبار کا مرتکب ہو)۔

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے اور (بالخصوص) نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ دی، ان کے لئے ان کا ثواب ہوگا اُن کے پروردگار کے نزدیک اور (آخرت میں) ان پر کوئی خطرہ (واقع ہونے والا) نہیں ہوگا اور نہ وہ (کسی مقصود کے فوت ہونے سے) مغموم ہوں گے۔

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو، اگر تم ایمان والے ہو (کیونکہ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ کی اطاعت کی جائے) پھر اگر تم (اس پر عمل) نہ کرو گے تو اشتہار سن لو جنگ کا اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے (یعنی تمہارے خلاف جہاد ہوگا) اور اگر تم توبہ کر لو گے تو تم کو تمہارے اصل اموال مل جاویں گے (اس قانون کے بعد) نہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے (کہ تم اصل مال سے زیادہ لینے لگو) اور نہ تم پر کوئی ظلم کرنے پاوے گا (کہ تمہارا

اصل مال بھی نہ دلایا جاوے) اور اگر (قرض دار) تنگ دست ہو (اور اس لئے میعاد پر نہ دے سکے) تو (اس کو) مہلت دینے کا حکم ہے آسودگی تک (یعنی جب اس کے پاس ادا کی گنجائش ہو) اور یہ (بات) کہ (بالکل) معاف ہی کر دو اور زیادہ بہتر ہے تمہارے لئے، اگر تم کو (اس کے ثواب کی) خبر ہو۔

اور (مسلمانو!) اس دن سے ڈرو جس میں تم (سب) اللہ تعالیٰ کی پیشی میں لائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا (یعنی اس کا بدلہ) پورا پورا ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا (تو تم پیشی کے لئے اپنی کارگزاری درست رکھو، اور کسی قسم کی خلاف ورزی مت کرو)۔

معارف مسائل

ان آیات میں رباعنی سود کی حرمت اور اس کے احکام کا بیان شروع ہوا ہے، یہ مسئلہ کئی حیثیتوں سے بہت اہم ہے، ایک طرف سود و ربہ پر قرآن و سنت کی شدید وعیدیں اور دوسری طرف دنیا کی اقتصادیات میں اس کا جزء لازم بن جانا اور اس سے نجات کی مشکلات کا مسئلہ طویل الذیل ہے، اور کئی حیثیتوں سے اس پر غور کرنا ہے۔

اول اس بارے میں قرآن کی آیات کی صحیح تفسیر اور احادیث صحیحہ کے ارشادات میں غور کر کے یہ متعین کرنا کہ قرآن و سنت کی اصطلاح میں رب کیا چیز ہے، اور کن کن معاملات کو شامل ہے، اور اس کی حرمت کس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے، اس میں کس قسم کی مضرتیں ہیں۔

دوسری حیثیت اس کی عقلی اور معاشی ہے کہ کیانی الواقع سود و ربہ ایسی چیز ہے جو دنیا کی اقتصادی ترقی کی ضامن ہو سکے، اور جس کو نظر انداز کرنے کا لازمی نتیجہ تجارت اور عام اقتصادیات کی تباہی ہو، یا سارا چکر صرف خدا تعالیٰ اور آخرت سے غافل دماغوں کی پیداوار ہے، ورنہ بغیر اس کے بھی تمام معاشی مسائل حل ہو سکتے ہیں، اور نہ صرف مشکلات کا حل بلکہ دنیا میں اقتصادی امن و اطمینان سود کے چھوڑنے پر موقوف ہے، اور یہ کہ دنیا کے اقتصادی مصائب کا سب سے بڑا سبب سود و ربہ ہے۔

یہ دوسری بحث ایک معاشی اور اقتصادی مسئلہ ہے، جس کے تحت میں بہت سی اصولی اور فروعی طویل بحثیں ہیں، جن کا تعلق تفسیر قرآن سے نہیں، اس لئے اس جگہ پہلی ہی بحث پر اکتفا کیا جاتا ہے، وہ بھی خاصی طویل ہے۔

یہ چھ آیتیں ہیں جن میں سود کی حرمت اور احکام کا بیان ہے، ان میں سے پہلی آیت کے پہلے جملہ میں سود خوروں کے انجام بد اور محشر میں ان کی رسوائی اور گمراہی کا ذکر ہے، ارشاد ہے کہ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں کھڑے ہوتے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ آدمی جس کو کسی شیطان جن نے لپٹ کر خطی بنا دیا ہو، حدیث میں ہے کہ کھڑے ہونے سے مراد

محشر میں قبر سے اٹھنا ہے کہ سود خور جب قبر سے اٹھے گا تو اُس پاگل و مجنون کی طرح اٹھے گا جس کو کسی شیطان جن نے خبطی بنا دیا ہو۔

اس جملہ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ جنات و شیاطین کے اثر سے انسان بیہوش یا مجنون ہو سکتا ہے، اور اہل تجربہ کے متواتر مشاہدات اس پر شاہد ہیں، اور حافظ ابن قیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اطباء اور فلاسفہ نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے کہ صرع، بیہوشی یا جنون مختلف اسباب سے ہوا کرتا ہے، ان میں بعض اوقات جنات و شیاطین کا اثر بھی اس کا سبب ہوتا ہے، جن لوگوں نے اس کا انکار کیا ہے ان کے پاس بجز ظاہری استبعاد کے کوئی دلیل نہیں۔

دوسری بات یہ غور طلب ہے کہ قرآن نے یہ نہیں فرمایا کہ سود خور محشر میں پاگل یا مجنون ہو کر اٹھیں گے، بلکہ دیوانہ پن یا بے ہوشی کی ایک خاص صورت کا ذکر کیا ہے، کہ جیسے کسی کو شیطان نے لپٹ کر خبطی بنا دیا ہو، اس میں شاید یہ اشارہ ہے کہ بے ہوش و مجنون تو بعض اوقات چپ چاپ پڑا بھی رہتا ہے، اُن کا یہ حال نہ ہوگا، بلکہ شیطان کے خبطی بنائے ہوؤں کی طرح بکواس اور ہڈیاں اور دوسری مجنونا نہ حرکتوں کی وجہ سے پہچانے جائیں گے۔

اور شاید اس طرف بھی اشارہ ہو کہ بیماری سے بے ہوش یا مجنون ہو جانے کے بعد چونکہ احساس بالکل باطل ہو جاتا ہے، اس کو تکلیف یا عذاب کا بھی احساس نہیں رہتا، اُن کا یہ حال نہ ہوگا، بلکہ آسیب زدہ کی طرح تکلیف و عذاب کو پوری طرح محسوس کرے گا۔

اب یہاں یہ دیکھنا ہے کہ جرم و سزا میں کوئی مناسبت ہونی چاہئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا کسی شخص یا جماعت کے کسی جرم کے مقابلہ میں دی جاتی ہے، وہ یقیناً اس جرم کے مناسب ہوتی ہے، اس لئے سود خوروں کو خبطی بنا کر محشر میں اٹھانا شاید اس کا اظہار ہے کہ سود خور روپے پیسے کی حرص میں اس قدر مدہوش ہوتا ہے کہ اس کو نہ کسی غریب پر رحم آتا ہے، نہ کسی کی شرم مانع ہوتی ہے، وہ چونکہ اپنی زندگی میں درحقیقت بے ہوش تھا، اس لئے محشر میں بھی اسی حالت میں اٹھایا گیا، یا یہ سزا اس کے لئے دی گئی کہ دنیا میں اس نے عقلی رنگ میں اپنی بے عقلی کو ظاہر کیا، کہ بیع کو مثل سود قرار دیا، اس لئے اس کو بے عقل کر کے اٹھا دیا گیا۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آیت میں سود کھانے کا ذکر ہے، اور مراد مطلقاً سود لینا اور اس کا استعمال کرنا ہے، خواہ کھانے میں استعمال کرے یا لباس میں یا مکان اور اس کے فرنیچر میں، لیکن اس کو ”کھانے“ کے لفظ سے اس لئے تعبیر کیا کہ جو چیز کھائی جائے اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں رہتا، بخلاف دوسری ضرورتوں کے استعمال کے کہ اس چیز کو واپس لیا دیا جاسکتا ہے، اس لئے مکمل قبضہ اور تصرف کو کھا جانے کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور نہ صرف عربی زبان میں بلکہ اردو، فارسی وغیرہ اکثر زبانوں کا یہی محاورہ ہے۔

اس کے بعد دوسرے جملہ میں سود خوروں کی اس سزا کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ ان لوگوں نے دو جرم کئے، ایک تو بذریعہ سود کے حرام مال کھایا، دوسرے اس کو حلال سمجھا اور حرام کہنے والوں کے جواب میں یہ کہا بیع و شراء بھی تو ربا ہی کی مثل ہے، جس طرح ربا کے ذریعہ نفع حاصل کیا جاتا ہے اسی طرح بیع و شراء کے ذریعہ نفع مقصود ہے، اگر سود حرام ہے تو بیع بھی حرام ہونی چاہئے، حالانکہ اس کے حرام ہونے کا کوئی قائل نہیں۔ اس جگہ بظاہر مقتضائے مقام یہ تھا کہ لوگ یوں کہتے کہ ربا بھی تو مثل بیع کے ہے، جب بیع حلال ہے تو ربا بھی حلال ہونا چاہئے، مگر انہوں نے طرزِ بیان بدل کر حرام کہنے والوں پر ایک قسم کا استہزاء کیا کہ تم ربا کو حرام کہتے ہو تو بیع کو بھی حرام کہو۔

تیسرے جملے میں ان لوگوں کے اس قول کا جواب حق تعالیٰ نے یہ دیا کہ یہ لوگ بیع کو ربا کی مثل اور برابر قرار دیتے ہیں، حالانکہ بحکم خداوندی ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو حلال قرار دیا اور دوسرے کو حرام، پھر دونوں برابر کیسے ہو سکتے ہیں۔

اس جواب میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ان لوگوں کا اعتراض تو عقلی طور پر تھا کہ جب دونوں معاملوں کا مقصد نفع کمانا ہے تو دونوں کا حکم ایک ہی ہونا چاہئے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے عقلی شبہ کا جواب عقلی طور پر فرق بیان کر کے نہیں دیا، بلکہ حاکمانہ انداز میں یہ جواب دیا کہ مالک الملک و المملکت اللہ جل شانہ ہے، وہ ہی ہر چیز کے نفع و ضرر اور بھلے برے کو پوری طرح جانتا ہے، جب اس نے ایک کو حلال اور دوسرے کو حرام قرار دے دیا، تو سمجھ لو کہ جس چیز کو حرام کیا ہے اس میں ضرر و کوئی نقصان و ضرر اور کوئی خباثت ہے، خواہ عام انسان اس کو محسوس کرے یا نہ کرے، کیونکہ مجموعہ نظامِ عالم کی پوری حقیقت اور اس کے نفع و ضرر کا احاطہ صرف وہی علیم وخبیر کر سکتا ہے، جس کے علم سے کوئی ذرہ جہاں چھپا ہوا نہیں ہے، عالم کے افراد یا جماعتیں اپنے اپنے مصالح اور مضرتوں کو پہچان سکتے ہیں، پورے عالم کے نفع و ضرر کا احاطہ نہیں کر سکتے، بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ کسی شخص یا جماعت کے حق میں مفید نظر آتی ہیں، مگر پوری قوم یا پورے ملک کے لئے اس میں مضرت ہوتی ہے۔

اس کے بعد تیسرے جملہ میں یہ ارشاد ہے کہ سود حرام ہونے سے پہلے جس شخص نے کوئی رقم جمع کر لی تھی، لیکن جب سود کو حرام قرار دے دیا گیا، تو اگر آئندہ کے لئے اس نے توبہ کر لی اور باز آ گیا تو اس سے پہلے جمع شدہ رقم ظاہرِ شرع کے حکم سے اُسی کی ہو گئی، اور باطنی معاملہ اس کا کہ وہ دل سے باز آیا، یا منافقانہ توبہ کر لی، اس کا یہ معاملہ خدا کے حوالے رہا۔ اگر دل سے توبہ کی ہے تو عند اللہ نافع ہوگی، ورنہ کالعدم ہوگی، عام لوگوں کو بدگمانی کرنے کا حق نہیں ہے۔ اور جو شخص نصیحت سن کر بھی اسی قول و فعل کی طرف پھر عود کرے تو چونکہ یہ فعل سود خوری گناہ ہے، یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے، اور چونکہ اُن کا یہ قول کہ ”سود مثل بیع کے حلال ہے“ کفر ہے اس لئے وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

دوسری آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں، یہاں سود کے ساتھ صدقات کا ذکر ایک خاص مناسبت سے لایا گیا ہے، کہ سود اور صدقہ دونوں کی حقیقت میں بھی تضاد ہے، اور ان کے نتائج بھی متضاد ہیں، اور عموماً ان دونوں کاموں کے کرنے والوں کی غرض و نیت بھی متضاد ہوتی ہے۔

حقیقت کا تضاد تو یہ ہے کہ صدقہ میں تو بغیر کسی معاوضہ کے اپنا مال دوسروں کو دیا جاتا ہے، اور سود میں بغیر کسی معاوضہ کے دوسرے کا مال لیا جاتا ہے، ان دونوں کاموں کے کرنے والوں کی نیت اور غرض اس لئے متضاد ہے کہ صدقہ کرنے والا محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور ثوابِ آخرت کے لئے اپنے مال کو کم یا ختم کر دینے کا فیصلہ کرتا ہے، اور سود لینے والا اپنے موجودہ مال پر ناجائز زیادتی کا خواہش مند ہے۔ اور نتائج کا تضاد ہونا قرآن کریم کی اس آیت سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ سود سے حاصل شدہ مال کو یا اس کی برکت کو مٹا دیتے ہیں، اور صدقہ کرنے والے کے مال یا اس کی برکت کو بڑھاتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ مال کی ہوس کرنے والے کا مقصد پورا نہیں ہوتا، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے والا جو اپنے مال کی کمی پر راضی تھا، اس کے مال میں برکت ہو کر اس کا مال یا اس کے ثمرات و فوائد بڑھ جاتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ آیت میں سود کو مٹانے اور صدقات کو بڑھانے کا کیا مطلب ہے؟ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ مٹانا اور بڑھانا آخرت کے متعلق ہے کہ سود خور کو اس کا مال آخرت میں کچھ کام نہ آئے گا بلکہ اس پر وبال بن جائے گا، اور صدقہ خیرات کرنے والوں کا مال آخرت میں ان کے لئے ابدی نعمتوں اور راحتوں کا ذریعہ بنے گا، اور یہ بالکل ظاہر ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں، اور عامہ مفسرین نے فرمایا ہے کہ سود کا مٹانا اور صدقہ کا بڑھانا آخرت کے لئے تو ہے ہی، مگر اس کے کچھ آثار دُنیا میں بھی مشاہدہ میں آ جاتے ہیں۔

سود جس مال میں شامل ہو جاتا ہے، بعض اوقات تو وہ مال خود ہلاک و برباد ہو جاتا ہے، اور پچھلے مال کو بھی ساتھ لے جاتا ہے، جیسے کہ ربا اور سٹے کے بازاروں میں اس کا ہمیشہ مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ بڑے بڑے کروڑ پتی اور سرمایہ دار دیکھتے دیکھتے دیوالیہ اور فقیر بن جاتے ہیں۔ بے سود کی تجارتوں میں بھی نفع و نقصان کے احتمالات رہتے ہیں، اور بہت سے تاجروں کو نقصان بھی کسی تجارت میں ہو جاتا ہے، لیکن ایسا نقصان کہ کل کروڑ پتی تھا، اور آج ایک ایک پیسے کی بھیک کا محتاج ہے، یہ صرف سود اور سٹے کے بازاروں میں ہی ہوتا ہے، اور اہل تجربہ کے بے شمار بیانات اس بارے میں مشہور و معروف ہیں کہ سود کا مال فوری طور پر کتنا ہی بڑھ جائے، لیکن وہ عموماً پائیدار اور باقی نہیں رہتا، جس کا فائدہ اولاد اور نسلوں میں چلے، اکثر کوئی نہ کوئی آفت پیش آ کر اس کو برباد کر دیتی ہے۔ حضرت معمرؓ نے فرمایا کہ ہم نے بزرگوں سے سنا ہے کہ سود خور پر چالیس سال گزرنے نہیں پاتے کہ اس کے مال پر حاق (یعنی گھٹا) آ جاتا ہے۔

اور اگر ظاہری طور پر مال ضائع و برباد بھی نہ ہو تو اس کے فوائد و برکات و ثمرات سے محرومی تو یقینی اور لازمی ہے،

کیونکہ یہ بات کچھ مخفی نہیں کہ سونا چاندی خود تو نہ مقصود ہے نہ کار آمد، نہ اس سے کسی کی بھوک مٹ سکتی ہے نہ پیاس، نہ سردی نہ گرمی سے بچنے کے لئے اوڑھا بچھایا جاسکتا ہے، نہ وہ کپڑوں اور برتنوں کا کام دے سکتا ہے، پھر اس کو حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے میں ہزاروں مشقتیں اٹھانے کا منشا ایک عقل مند انسان کے نزدیک اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ سونا چاندی ذریعہ ہیں ایسی چیزوں کے حاصل کرنے کا کہ جن سے انسان کی زندگی خوشگوار بن سکے، اور وہ راحت و عزت کی زندگی گزار سکے، اور انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ یہ راحت و عزت جس طرح اسے حاصل ہوئی اس کی اولاد اور متعلقین کو بھی حاصل ہو۔

یہی وہ چیزیں ہیں جو مال و دولت کے فوائد و ثمرات کہلا سکتے ہیں، اس کے نتیجہ میں یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ جس شخص کو یہ ثمرات و فوائد حاصل ہوئے اس کا مال ایک حیثیت سے بڑھ گیا، اگرچہ دیکھنے میں کم نظر آئے، اور جس کو یہ فوائد و ثمرات کم حاصل ہوئے اس کا مال ایک حیثیت سے گھٹ گیا، اگرچہ دیکھنے میں زیادہ نظر آئے۔

اس بات کو سمجھ لینے کے بعد سود کا کاروبار اور صدقہ و خیرات کے اعمال کا جائزہ لیجئے، تو یہ بات مشاہدہ میں آجائے گی کہ سود خور کا مال اگرچہ بڑھتا ہوا نظر آتا ہے مگر وہ بڑھنا ایسا ہے کہ جیسے کسی انسان کا بدن ورم و غیرہ سے بڑھ جائے، ورم کی زیادتی بھی تو بدن ہی کی زیادتی ہے، مگر کوئی سمجھ دار انسان اس زیادتی کو پسند نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ زیادتی موت کا پیغام ہے، اسی طرح سود خور کا مال کتنا ہی بڑھ جائے، مگر مال کے فوائد و ثمرات یعنی راحت و عزت سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔

یہاں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ آج تو سود خوروں کو بڑی سے بڑی راحت و عزت حاصل ہے، وہ کوٹھیوں، بنگلوں کے مالک ہیں، عیش و آرام کے سارے سامان مہیا ہیں، کھانے، پینے، پہننے اور رہنے سہنے کی ضروریات بلکہ فضولیات بھی سب اُن کو حاصل ہیں، نوکر چاکر اور شان و شوکت کے تمام سامان موجود ہیں، لیکن غور کیا جائے تو ہر شخص سمجھ لے گا کہ ”سامانِ راحت“ اور ”راحت“ میں بڑا فرق ہے، سامانِ راحت تو فیکٹریوں اور کارخانوں میں بنتا اور بازاروں میں بکتا ہے، وہ سونے چاندی کے عوض حاصل ہو سکتا ہے، لیکن جس کا نام ”راحت“ ہے وہ نہ کسی فیکٹری میں بنتی ہے، نہ کسی منڈی میں بکتی ہے، وہ ایک ایسی رحمت ہے جو براہِ راست حق تعالیٰ کی طرف سے دی جاتی ہے، وہ بعض اوقات ہزاروں سامان کے باوجود حاصل نہیں ہو سکتی۔ ایک نیند کی راحت کو دیکھ لیجئے کہ اس کے حاصل کرنے کے لئے یہ تو کر سکتے ہیں کہ سونے کے لئے مکان کو بہتر سے بہتر بنائیں، ہوا اور روشنی کا پورا اعتدال ہو، مکان کا فرنیچر دیدہ زیب، دل خوش کن ہو، چار پائی اور گدے اور تکیے حسبِ منشا ہوں، لیکن کیا نیند کا آجانا ان سامانوں کے مہیا ہونے پر لازمی ہے؟ اگر آپ کو کبھی اتفاق نہ ہوا ہو تو ہزاروں وہ انسان اس کا جواب نفی میں دیں گے جن کو کسی عارضے سے نیند نہیں آتی۔ اب امریکا جیسے مال دار، متمدن ملک

کے متعلق بعض رپورٹوں سے معلوم ہوا کہ وہاں پچھتر فی صد آدمی خواب آور گولیوں کے بغیر سو ہی نہیں سکتے، اور بعض اوقات خواب آور دوائیں بھی جواب دے دیتی ہیں، نیند کے سامان تو آپ بازار سے خرید لائے، مگر نیند آپ کسی بازار سے کسی قیمت پر نہیں لا سکتے۔ اسی طرح دوسری راحتوں اور لذتوں کا حال ہے کہ اُن کے سامان تو روپیہ پیسے کے ذریعے حاصل ہو سکتے ہیں، مگر راحت و لذت کا حاصل ہونا ضروری نہیں۔

یہ بات سمجھ لینے کے بعد سود خوروں کے حالات کا جائزہ لیجئے تو ان کے پاس آپ کو سب کچھ ملے گا مگر ”راحت“ کا نام نہ پائیں گے، وہ اپنے کروڑ کو ڈیڑھ کروڑ، اور ڈیڑھ کروڑ کو دو کروڑ بنانے میں ایسے مست نظر آئیں گے کہ نہ ان کو اپنے کھانے پہننے کا ہوش ہے، نہ اپنی بیوی بچوں کا، کئی کئی مل چل رہے ہیں، دوسرے ملکوں سے جہاز آرہے ہیں، اُن کی ادھیڑ بن ہی میں صبح سے شام اور شام سے صبح ہو جاتی ہے،، افسوس ہے کہ ان دیوانوں نے سامانِ راحت ہی کا نام ”راحت“ سمجھ لیا ہے، اور حقیقت میں راحت سے کوسوں دُور ہیں۔

یہ حال تو ان کی راحت کا ہے، اب عزت کو دیکھ لیجئے، یہ لوگ چونکہ سخت دل اور بے رحم ہو جاتے ہیں، اُن کا پیشہ ہی یہ ہوتا ہے کہ مفلسوں کی مفلسی سے یا کم مایہ لوگوں کی کم مائیگی سے فائدہ اٹھائیں، اُن کا خون چوس کر اپنے بدن کو پالیں، اس لئے ممکن نہیں کہ لوگوں کے دلوں میں اُن کی کوئی عزت و وقار ہو، اپنے ملک کے بیوں اور ملکِ شام کے یہودیوں کی تاریخ پڑھ جائیے، اُن کے حالات کو دیکھ لیجئے، اُن کی تجوریاں کتنے ہی سونے چاندی اور جوہرات سے بھری ہوں، لیکن دُنیا کے کسی گوشہ میں انسانوں کے کسی طبقہ میں ان کی کوئی عزت نہیں، بلکہ ان کے اس عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب مفلس لوگوں کے دلوں میں اُن کی طرف سے بغض و نفرت پیدا ہوتی ہے، اور آج کل تو دُنیا کی ساری جنگیں اسی بغض و نفرت کی مظاہر ہیں، محنت و سرمایہ کی جنگ نے ہی دُنیا میں اشتراکیت اور اشتمالیت کے نظریے پیدا کئے، کمیونزم کی تخریبی سرگرمیاں اسی بغض و نفرت کا نتیجہ ہیں، جن سے پوری دُنیا قتل و قتال اور جنگ و جدال کا جہنم کدہ بن کر رہ گئی ہے، یہ حال تو اپنی راحت و عزت کا ہے، اور تجربہ شاہد ہے کہ سود کا مال سود خور کی آنے والی نسلوں کی زندگی کو بھی کبھی خوشگوار نہیں بناتا، یا ضائع ہو جاتا ہے، یا اس کی نحوست سے وہ بھی مال و دولت کے حقیقی ثمرات سے محروم و ذلیل رہتے ہیں۔ لوگ یورپ کے سود خوروں کی مثال سے شاید فریب میں آئیں کہ وہ لوگ تو سب کے سب خوش حال ہیں، اور اُن کی نسلیں بھی پھولتی پھلتی ہیں، لیکن اول تو ان کی خوش حالی کا اجمالی خاکہ عرض کر چکا ہوں۔

دوسرے ان کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی مردِ مَرْدِ خور دوسرے انسانوں کا خون چوس کر اپنا بدن پالتا ہو اور ایسے کچھ انسانوں کا جتھہ ایک محلّہ میں آباد ہو جائے، آپ کسی کو اس محلّہ میں لے جا کر مشاہدہ کرائیں کہ یہ سب کے سب بڑے صحت مند اور سرسبز و شاداب ہیں، لیکن ایک عقل مند آدمی کو جو انسانیت کی فلاح کا خواہش مند ہے صرف اس محلّہ کا دیکھنا

نہیں، بلکہ اس کے مقابل ان بستیوں کو بھی دیکھنا ہے جن کا خون چوس کر ان کو ادھ موا کر دیا گیا ہے، اس محلہ اور ان بستیوں کے مجموعہ پر نظر ڈالنے والا کبھی اس محلہ کے فربہ ہونے پر خوش نہیں ہو سکتا، اور مجموعی حیثیت سے ان کے عمل کو انسانی ترقی کا ذریعہ نہیں بتا سکتا، بلکہ اس کو انسان کی ہلاکت و بربادی ہی کہنے پر مجبور ہوگا۔

اس کے بالمقابل صدقہ خیرات کرنے والوں کو دیکھئے کہ اُن کو کبھی اس طرح مال کے پیچھے حیران و سرگرداں نہ پائیں گے، ان کو راحت کے سامان اگرچہ کم حاصل ہوں، مگر سامان والوں سے زیادہ اطمینان اور سکونِ قلب جو اصلی راحت ہے ان کو حاصل ہوگی، دُنیا میں ہر انسان ان کو عزت کی نظر سے دیکھے گا۔

يَسْحَقُ اللَّهُ الرَّبُّوَا وَيَرْبِي الصَّدَقَاتِ ۝

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا اور صدقے کو بڑھاتا ہے، یہ مضمون آخرت کے اعتبار سے تو بالکل صاف ہے ہی، دُنیا کے اعتبار سے بھی اگر ذرا حقیقت سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بالکل کھلا ہوا ہے، یہی ہے مطلب اس حدیث کا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

إِنَّ الرَّبُّوَا وَإِنْ كَثُرَ فَإِنَّ عَاقِبَتَهُ تَصِيرُ إِلَى قُلٍّ ۝

”یعنی سود اگرچہ کتنا ہی زیادہ ہو جائے مگر انجام کار نتیجہ اس کا قُلّت ہے۔“

یہ روایت مسند احمد اور ابن ماجہ میں مذکور ہے۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہے: **وَاللَّهُ لَا يُجِبُ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ** (۲۸۱) یعنی ”اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے کسی کفر کرنے والے کو، کسی گناہ کا کام کرنے والے کو۔“ اس میں اشارہ فرما دیا ہے کہ جو لوگ سود کو حرام ہی نہ سمجھیں وہ کفر میں مبتلا ہیں، اور جو حرام سمجھنے کے باوجود عملاً اس میں مبتلا ہیں وہ گنہگار فاسق ہیں۔

تیسری آیت میں مؤمنین صالحین جو نماز و زکوٰۃ کے پابند ہیں، ان کے اجرِ عظیم اور آخرت کی راحت کا ذکر ہے، چونکہ اس سے پہلی آیت میں سود خوروں کے لئے عذابِ جہنم اور اُن کی ذلت و خواری کا ذکر آیا تھا، قرآن کریم کے عام اُسلوب کے مطابق اس کے ساتھ ہی ایمان و عمل صالح کے پابند نماز و زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے ثواب اور درجاتِ آخرت کا ذکر کر دیا گیا۔

چوتھی آیت: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ** (۲۸۲) کا خلاصہ یہ ہے کہ سود و ربا کی حرمت نازل ہونے کے بعد جو سود کی بقایا رقیں کسی کے ذمے باقی تھیں ان کا لینا دینا بھی حرام کر دیا گیا۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ سود کی حرمت نازل ہونے سے پہلے عام عرب میں سود کا رواج پھیلا ہوا تھا، آیات

متذکرہ سے پہلی آیتوں میں اس کی ممانعت آئی تو حسبِ عادت تمام مسلمانوں نے سود کے معاملات ترک کر دیئے، لیکن کچھ لوگوں کے مطالبات سود کی بقایا رقموں کے دوسرے لوگوں پر تھے، اسی میں یہ واقعہ پیش آیا کہ بنی ثقیف اور بنی مخزوم کے آپس میں سودی معاملات کا سلسلہ تھا، اور بنو ثقیف کے لوگوں کا کچھ سودی مطالبہ بنی مخزوم کی طرف تھا، بنو مخزوم مسلمان ہو گئے تو اسلام لانے کے بعد انہوں نے سود کی رقم ادا کرنا جائز نہ سمجھا، ادھر بنو ثقیف کے لوگوں نے مطالبہ شروع کیا، کیونکہ یہ لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے، مگر مسلمانوں سے مصالحت کر لی تھی، بنو مخزوم کے لوگوں نے کہا کہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد ہم اپنی اسلامی کمائی کو سود کی ادائیگی میں خرچ نہ کریں گے۔

یہ جھگڑا مکہ مکرمہ میں پیش آیا، اس وقت مکہ فتح ہو چکا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مکہ کے امیر حضرت معاذؓ اور دوسری روایت میں عتاب بن اُسیدؓ تھے، انہوں نے اس جھگڑے کا قضیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بغرض دریافتِ حکم لکھ بھیجا، اس پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد سود کے تمام سابقہ معاملات ختم کر دیئے جائیں، پچھلا سود بھی وصول نہ کیا جائے، صرف راس المال وصول کیا جائے۔

یہ اسلامی قانون رائج کیا گیا تو مسلمان تو اس کے پابند تھے ہی، جو غیر مسلم قبائل بطور صلح و معاہدہ اسلامی قانون کو قبول کر چکے تھے وہ بھی اس کے پابند ہو چکے تھے، لیکن اس کے باوجود جب حجۃ الوداع کے خطبے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قانون کا اعلان کیا تو اس کا اظہار فرمایا کہ یہ قانون کسی خاص شخص یا قوم یا مسلمانوں کے مالی مفاد کے پیش نظر نہیں، بلکہ پوری انسانیت کی تعمیر اور صلاح و فلاح کے لئے جاری کیا گیا ہے، اسی لئے ہم سب سے پہلے مسلمانوں کی بہت بڑی رقم سود جو غیر مسلموں کے ذمے تھی اس کو چھوڑتے ہیں تو اب ان کو بھی اپنے بقایا سود کی رقم چھوڑنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہئے، چنانچہ اس خطبے میں ارشاد فرمایا:-

أَلَا إِنَّ كُلَّ رَبٍّ كَانَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعٌ عَنْكُمْ كُلُّهُ لَكُمْ رُؤُسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا

تُظْلَمُونَ وَأَوَّلُ رَبٍّ مَوْضُوعٌ رَبُّ الْعَبَّاسِ ابْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ كُلُّهُ۔ (ابن کثیر بحوالہ ابن ابی حاتم) ^[۱]

”یعنی زمانہ جاہلیت میں جو سودی معاملات کئے گئے، سب کا سود چھوڑ دیا گیا، اب ہر شخص کو اصل رقم ملے گی، سود کی زائد رقم نہ ملے گی، نہ تم زیادتی وصول کر کے کسی پر ظلم کر سکو گے اور نہ کوئی اصل راس المال میں کمی کر کے تم پر ظلم کر سکے گا، اور سب سے پہلے جو سود چھوڑا تھا وہ عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے، جس کی بہت بھاری رقمیں غیر مسلموں کے ذمہ بطور سود کے عائد ہوتی تھیں۔“ قرآن مجید کی آیت متذکرہ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ اور بقایا سود چھوڑنے کا حکم مذکور ہے۔

اس آیت کو شروع اس طرح کیا گیا کہ مسلمانوں کو خطاب کر کے اوّل اِتَّقُوا اللّٰهَ کا حکم سنایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اس کے بعد اصل مسئلہ کا حکم بتلایا گیا، یہ قرآن حکیم کا وہ خاص طرز ہے جس میں وہ دنیا بھر کے قانون کی کتابوں سے ممتاز ہے، کہ جب کوئی ایسا قانون بنایا جاتا ہے جس پر عمل کرنے میں لوگوں کو کچھ دشواری معلوم ہو تو اس کے آگے پیچھے خدا تعالیٰ کے سامنے پیشی اعمال کے حساب اور آخرت کے عذاب و ثواب کا ذکر کر کے مسلمانوں کے دلوں اور ذہنوں کو اس پر عمل کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے، اس کے بعد حکم سنایا جاتا ہے۔ یہاں بھی پچھلے عائد شدہ سود کی رقم کا چھوڑ دینا انسانی طبیعت پر بار ہو سکتا تھا، اس لئے پہلے اِتَّقُوا اللّٰهَ فرمایا، اس کے بعد حکم دیا: وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا یعنی چھوڑ دو بقیہ سود کو، آیت کے آخر میں فرمایا: اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۸﴾ یعنی اگر تم ایمان والے ہو، اس میں اشارہ کر دیا کہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ حکم خداوندی کی اطاعت کی جائے، اس کی خلاف ورزی ایمان کے منافی ہے، یہ حکم چونکہ طبائع پر بھاری تھا، اس لئے حکم سے پہلے اِتَّقُوا اللّٰهَ اور حکم کے بعد اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۸﴾ کے ارشادات ملا دیئے گئے۔

اس کے بعد پانچویں آیت میں اس حکم کی مخالفت کرنے والوں کو سخت وعید سنائی گئی جس کا مضمون یہ ہے کہ اگر تم نے سود کو نہ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو۔ یہ وعید شدید ایسی ہے کہ کفر کے سوا اور کسی بڑے سے بڑے گناہ پر قرآن میں ایسی وعید نہیں آئی، پھر اس آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا ہے:-

وَ اِنْ تُبْتِغُوا فَلَکُمْ رُءُوسُ اَمْوَالِکُمْ ۚ لَا تَظْلُمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۹﴾ یعنی ”اگر تم توبہ کر لو اور آئندہ کے لئے سود کی بقاء رقم چھوڑنے کا عزم کر لو تو تمہیں تمہارے اصل راس المال مل جائیں گے، نہ تم اصل راس المال سے زائد حاصل کر کے کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے اور نہ کوئی اصل راس المال میں کمی یادیر کر کے تم پر ظلم کرنے پائے گا۔“ اس میں اصل راس المال دینے کو اس شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ تم توبہ کر لو اور آئندہ کو سود چھوڑنے کا عزم کر لو، تب اصل راس المال ملے گا۔

اس سے بظاہر اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اگر سود چھوڑنے کا عزم کر کے توبہ نہ کی تو اصل راس المال بھی نہ ملے گا۔ سو اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر مسلمان ہو جانے کے باوجود سود کو حرام ہی نہ سمجھے، اس لئے سود چھوڑنے کے لئے توبہ نہیں کرتا تب تو یہ شخص اسلام سے خارج اور مرتد ہو گیا، جس کا حکم یہ ہے کہ مرتد کا مال اس کی ملک سے نکل جاتا ہے، پھر جو زمانہ اسلام کی کمائی ہے وہ اس کے مسلمان وارثوں کو مل جاتی ہے، اور جو کفر کے بعد کی کمائی ہے تو وہ بیت المال میں جمع کر دی جاتی ہے، اس لئے سود سے توبہ نہ کرنا اگر حلال سمجھنے کی بنا پر ہو تو اس کو اصل راس المال بھی نہ ملے گا، اور اگر حلال تو نہیں سمجھتا مگر عملاً باز نہیں آتا اور اس کے ساتھ جتھہ بنا کر حکومت اسلامیہ کا مقابلہ کرتا ہے تو وہ باغی ہے، اس کا بھی سب مال ضبط کر کے بیت المال میں امانت رکھا جاتا ہے، کہ جب یہ توبہ کر لے تب اس کا مال اس کو واپس دے دیا جائے۔ شاید اس قسم کی جزئیات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے بصورت شرط فرمایا گیا: وَ اِنْ تُبْتِغُوا فَلَکُمْ رُءُوسُ اَمْوَالِکُمْ ۚ یعنی اگر تم توبہ نہ

کرو گے تو تمہارے راس المال بھی ضبط ہو جائیں گے۔

اس کے بعد چھٹی آیت میں سود خوری کی انسانیت سوز حرکت کے بالمقابل پاکیزہ اخلاق اور غریبوں اور ناداروں کے ساتھ مسابقت کے سلوک کی تعلیم دی جاتی ہے، ارشاد ہوتا ہے: **وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ**، یعنی ”اگر تمہارا مدیون تنگ دست ہو، تمہارا قرض ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو حکم شرعی یہ ہے کہ اس کو فراخی اور آسودگی کے وقت تک مہلت دی جائے، اور اگر تم اس کو اپنا قرض معاف ہی کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔“

سود خوروں کی عادت تو یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مدیون مفلس ہے اور میعاد مقررہ پر وہ قرض ادا نہیں کر سکتا تو سود کی رقم اصل میں جمع کر کے سود و سود کا سلسلہ چلاتے ہیں، اور سود کی مقدار بھی اور بڑھا دیتے ہیں۔

یہاں احکم الحاکمین نے یہ قانون بنا دیا کہ اگر کوئی مدیون واقعی مفلس ہے، ادائے قرض پر قادر نہیں تو اس کو تنگ کرنا جائز نہیں، بلکہ اس کو اس وقت تک مہلت دینی چاہئے جب تک کہ وہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو جائے، ساتھ ہی اس کی ترغیب بھی دے دی کہ اس غریب کو اپنا قرض معاف کر دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔

یہاں معاف کرنے کو قرآن نے بلفظ ”صدقہ“ تعبیر فرمایا ہے، جس میں اشارہ ہے کہ یہ معافی تمہارے لئے بحکم صدقہ ہو کر موجب ثواب عظیم ہوگی۔ نیز یہ جو فرمایا کہ معاف کر دینا تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، حالانکہ بظاہر تو ان کے لئے نقصان کا سبب ہے کہ سود تو چھوڑا ہی تھا، اصل راس المال بھی گیا، مگر قرآن نے اس کو بہتر فرمایا، اس کی دو وجہ ہیں، اول تو یہ کہ یہ بہتری اس دنیا کی چند روزہ زندگی کے بعد مشاہدہ میں آجائے گی، جبکہ اس حقیر مال کے بدلہ میں جنت کی دائمی نعمتیں اس کو ملیں گی۔

دوسرے شاید اس میں اس طرف بھی اشارہ ہو کہ دنیا میں بھی تمہیں اس عمل کی بہتری کا مشاہدہ ہو جائے گا کہ تمہارے مال میں برکت ہوگی۔ ”برکت“ کی حقیقت یہ ہے کہ تھوڑے مال میں کام بہت نکل جائیں، یہ ضروری نہیں کہ مال کی مقدار یا تعداد بڑھ جائے، سو یہ مشاہدہ ہے کہ صدقہ خیرات کرنے والوں کے مال میں بے شمار برکت ہوتی ہے، ان کے تھوڑے مال سے اتنے کام نکل جاتے ہیں کہ حرام مال والوں کے بڑے بڑے اموال سے وہ کام نہیں نکلتے۔

اور جس مال میں بے برکتی ہوتی ہے اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ جس مقصد کے لئے خرچ کرتا ہے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا، یا غیر مقصود چیزوں میں مثلاً دوا، علاج اور ڈاکٹروں کی فیسوں میں ایسے مال داروں کی بڑی بڑی رقمیں خرچ ہو جاتی ہیں، جس کا غریبوں کو کبھی سابقہ نہیں پڑتا، اول تو اللہ تعالیٰ ان کو تندرستی کی نعمت عطا فرماتے ہیں، کہ علاج میں کچھ خرچ کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے، اور اگر کبھی بیماری آئی بھی تو معمولی اخراجات سے تندرستی حاصل ہو جاتی ہے، اس لحاظ سے مدیون مفلس کو قرض معاف کر دینا جو بظاہر اس کے لئے نقصان دہ نظر آتا تھا، اس قرآنی تعلیم کے پیش نظر وہ ایک مفید و نافع کام بن گیا۔

مدیون مفلس کے ساتھ نرمی و مہربانی کی تعلیم کے لئے احادیث صحیحہ میں جو ارشادات وارد ہوئے ہیں، ان کے چند جملے سنئے۔ طبرانی کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کے سر پر اس روز اللہ کی رحمت کا سایہ ہو جبکہ اس کے سوا کسی کو کوئی سایہ سر چھپانے کے لئے نہ ملے گا، تو اس کو چاہئے کہ تنگ دست مقروض کے ساتھ نرمی اور مہربانی کا معاملہ کرے، یا اس کو معاف کر دے۔^[۱]

اسی مضمون کی حدیث صحیح مسلم میں بھی ہے، اور مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی مفلس مدیون کو مہلت دے گا تو اس کو ہر روز اتنی رقم کے صدقہ کا ثواب ملے گا جتنی اس مدیون کے ذمہ واجب ہے، اور یہ حساب میعاد قرض پورا ہونے سے پہلے مہلت دینے کا ہے، اور جب میعاد قرض پوری ہو جائے اور وہ شخص ادا کرنے پر قادر نہ ہو اس وقت اگر کوئی مہلت دے گا تو اس کو ہر روز اس کی دگنی رقم صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا۔^[۲]

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کی دعا قبول ہو، یا اس کی مصیبت دور ہو تو اس کو چاہئے کہ تنگ دست مدیون کو مہلت دیدے۔^[۳]

اس کے بعد آخری آیت میں پھر روز قیامت کا خوف اور محشر کے حساب کتاب اور ثواب عذاب کے ذکر پر احکامِ سود کی آیات کو ختم کیا، ارشاد فرمایا:-

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ^(۳۸) یعنی ”اور اس روز سے جس میں تم سب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی میں لائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اپنے عمل کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔“
حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت نزول کے اعتبار سے سب سے آخری آیت ہے، اس کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی، اس کے اکتیس روز بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی، اور بعض روایات میں صرف نو دن بعد وفات ہونا مذکور ہے۔

یہاں تک ربا کے احکام سے متعلقہ سورہ بقرہ کی آیات کی تفسیر آئی ہے، ربا کی حرمت و ممانعت پر قرآن کریم میں سورہ بقرہ میں مذکورہ سات آیتیں اور سورہ آل عمران میں ایک آیت، سورہ نساء میں دو آیتیں آئی ہیں، اور ایک آیت سورہ روم میں بھی ہے، جس کی تفسیر میں اختلاف ہے، بعض حضرات نے اس کو بھی سود بیاج کے مفہوم پر محمول کیا ہے، بعض نے

[۱] المعجم الكبير للطبرانی رقم الحديث: ۸۹۴

[۲] صحيح مسلم، كتاب البيوع، باب فضل إنظار المعسر... إلخ ج: ۲ ص: ۱۸

[۳] مسند احمد رقم الحديث: ۲۱۹۶۸

[۴] مسند احمد رقم الحديث: ۳۵۱۹

دوسری تفسیر بیان کی ہے، اس طرح قرآن حکیم کی دس آیتیں ہیں، جن میں سود و ربا کے احکام مذکور ہیں۔ سود کی پوری حقیقت بتلانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن باقی آیات کا ترجمہ اور تفسیر بھی اسی جگہ لکھ دی جائے جو سورہ آل عمران اور سورہ نساء اور سورہ روم میں آئی ہیں، تاکہ تمام آیات یکجا ہو کر ربا کی حقیقت سمجھنے میں آسانی ہو۔ آل عمران کے تیرہویں رکوع کی ایک سو تیسویں آیت یہ ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۱۳۰﴾ (آل عمران)

”یعنی اے ایمان والو! سود مت کھاؤ جسے سے زائد، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اُمید ہے کہ تم کامیاب ہو۔“

اس آیت کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے کہ جاہلیت عرب میں سود خوری کا عام طور پر یہ طریق تھا کہ ایک خاص میعاد معین کے لئے اُدھار سود پر دیا جاتا تھا، اور جب وہ میعاد آگئی اور قرض دار اس کی ادائیگی پر قادر نہ ہوا تو اس کو مزید مہلت اس شرط پر دی جاتی تھی کہ سود کی مقدار بڑھادی جائے، اسی طرح دوسری میعاد پر بھی ادائیگی نہ ہوئی تو سود کی مقدار اور بڑھادی، یہ واقعہ عام کتب تفسیر میں بالخصوص لباب النقول میں بروایت مجاہد مذکور ہے۔

جاہلیت عرب کی اس ملت کش رسم کو مٹانے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی، اسی لئے اس آیت میں اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً (آل عمران: ۱۳۰) (یعنی کئی حصے زائد) فرما کر ان کے مروّجہ طریقہ کی مذمت اور ملت کشی و خود غرضی پر تنبیہ فرما کر اس کو حرام قرار دیا۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ اضعاف و مضاعف نہ ہو تو حرام نہیں، کیونکہ سورہ بقرہ اور نساء میں مطلقاً ربا کی حرمت صاف صاف مذکور ہے، اضعاف مضاعف ہو یا نہ ہو۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے قرآن کریم میں جا بجا فرمایا گیا ہے: لَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا ۚ یعنی ”میری آیتوں کے بدلے میں تھوڑی سی قیمت مت لو۔“ اس میں ”تھوڑی سی قیمت“ اس لئے فرمایا کہ آیاتِ الہیہ کے بدلے میں اگر ہفت اقلیم کی سلطنت بھی لے لے تو وہ بھی تھوڑی ہی قیمت ہوگی، اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کی آیات کے بدلے میں تھوڑی قیمت لینا تو حرام ہے اور زیادہ لینا جائز۔ اسی طرح اس آیت میں اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً (آل عمران: ۱۳۰) کا لفظ ان کے شرمناک طریقے پر فکر کرنے کے لئے لایا گیا، حرمت کی شرط نہیں۔

اور اگر سود کے مروّجہ طریقوں پر غور کیا جائے تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جب سود خوری کی عادت پڑ جائے تو پھر وہ سود تنہا سود ہی نہیں رہتا بلکہ لازماً اضعاف مضاعف ہو جاتا ہے، کیونکہ جو رقم سود سے حاصل ہو کر سود خور کے مال میں شامل ہوئی تو اب اس سود کی زائد رقم کو بھی سود پر چلائے گا تو سود مضاعف ہو جائے گا، اور یہی سلسلہ آگے چلا تو اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً (آل عمران: ۱۳۰) ہو جائے گا، اس طرح سود اضعاف مضاعف بن کر رہے گا۔

اور سورہ نساء میں دو آیتیں سود کے متعلق یہ ہیں:-

فِي ظُلُمٍ مِّنَ اللَّيْلِ هَٰذَا حَرَّمَ عَلَيْهِنَّ طَيْبَاتٍ أُحِلَّت لَّهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنِ سَبِيلِ اللَّهِ كَثِيرًا ۖ وَأَخْذِهِمْ

الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالُ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۖ وَاعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ (النساء)

”یعنی یہود کے انہی بڑے بڑے جرائم کے سبب ہم نے بہت سی پاکیزہ چیزیں جو ان کے لئے حلال تھیں ان پر حرام کر دیں، اور بسبب اس کے کہ وہ بہت آدمیوں کو رُشد کی راہ سے مانع بن جاتے تھے، اور بسبب اس کے کہ وہ سود لیا کرتے تھے، حالانکہ ان کو ان سے ممانعت کی گئی تھی، اور بسبب اس کے کہ وہ لوگوں کا مال ناحق طریقے سے کھا جاتے تھے، اور ہم نے ان لوگوں کے لئے جو ان میں کافر ہیں دردناک سزا کا سامان مقرر کر رکھا ہے۔“

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ شریعت موسویہ میں بھی سود حرام تھا، اور یہود نے جب اس کی مخالفت کی تو دنیا میں بھی ان کو یہ مناسب سزا دی گئی کہ انہوں نے حرصِ دنیا کی خاطر حرام کھانا شروع کر دیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر بعض حلال چیزیں بھی حرام فرمادیں۔

اور سورہ روم کے چوتھے رکوع کی اُن تالیسویں آیت میں ہے:-

وَمَا آتَيْتُم مِّن رِّبَا لِّيَرْبُوَ أَمْوَالُ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوا عِنْدَ اللَّهِ ۚ وَمَا آتَيْتُم مِّن زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُضَعِفُونَ ۝ (الروم)

”یعنی جو چیز تم اس لئے دو گے کہ وہ لوگوں کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہو جائے تو یہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا، اور جو زکوٰۃ دو گے جس سے اللہ کی رضا مطلوب ہو تو ایسے لوگ خدا کے پاس بڑھاتے رہیں گے۔“

بعض حضرات مفسرین نے لفظ ”ربا“ اور ”زیادتی“ پر نظر کر کے اس آیت کو بھی سود بیاج پر محمول فرمایا ہے، اور یہ تفسیر فرمائی ہے کہ سود بیاج کے لینے میں اگرچہ بظاہر مال کی زیادتی نظر آتی ہے، مگر درحقیقت وہ زیادتی نہیں، جیسے کسی شخص کے بدن پر روم ہو جائے تو بظاہر وہ اس کے جسم میں زیادتی ہے، لیکن کوئی عقل مند اس کو زیادتی سمجھ کر خوش نہیں ہوتا، بلکہ اس کو ہلاکت کا مقدمہ سمجھتا ہے، اس کے بالمقابل زکوٰۃ و صدقات دینے میں اگرچہ بظاہر مال میں کمی آتی ہے، مگر درحقیقت وہ کمی نہیں بلکہ ہزاروں زیادتیوں کا موجب ہے، جیسے کوئی شخص مادہ فاسدہ کے اخراج کے لئے مسہل لیتا ہے، یا فصد کھلوا کر خون نکلواتا ہے، تو بظاہر وہ کمزور نظر آتا ہے اور اس کے بدن میں کمی محسوس ہوتی ہے، مگر جاننے والوں کی نظر میں یہ کمی اس کی زیادتی اور قوت کا پیش خیمہ ہے۔

اور بعض علمائے تفسیر نے اس آیت کو سود بیاج کی ممانعت پر محمول ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ

جو شخص کسی کو اپنا مال اخلاص و نیک نیتی سے نہیں، بلکہ اس نیت سے دے کہ میں اس کو یہ چیز دوں گا تو وہ مجھے اس کے بدلہ میں اس سے زیادہ دے گا، جیسے بہت سی برادریوں میں ”نوتا“ کی رسم ہے کہ وہ ہدیہ کے طور پر نہیں بلکہ بدلہ لینے کی غرض سے دی جاتی ہے، یہ دینا چونکہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنی غرض کے لئے ہے اس لئے آیت میں فرمایا کہ اس طرح اگرچہ ظاہر میں مال بڑھ جائے مگر وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا، ہاں جو زکوٰۃ صدقات اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے دیئے جائیں ان میں اگرچہ بظاہر مال گھٹتا ہے، مگر اللہ کے نزدیک وہ دوگنا اور چوگنا ہوتا جاتا ہے۔

اس تفسیر پر آیت مذکورہ کا وہ مضمون ہو جائے گا جو دوسری ایک آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا ہے: وَلَا تَسْتَنْتِمْ تَسْتَكْثِرُوْا (المدثر) یعنی ”آپ کسی پر احسان اس نیت سے نہ کریں کہ اس کے بدلہ میں کچھ مال کی زیادتی آپ کو حاصل ہو جائے گی۔“

اور سورہ روم کی اس آیت میں بظاہر یہ دوسری تفسیر ہی رائج معلوم ہوتی ہے، اول تو اس لئے کہ سورہ روم مکی ہے، جس کے لئے اگرچہ ضروری نہیں کہ اس کی ہر آیت مکی ہو، مگر غالب گمان مکی ہونے کا ضرور ہے جب تک اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ ملے، اور آیت کے مکی ہونے کی صورت میں اس کو حرمت سود کے مفہوم پر اس لئے محمول نہیں کیا جاسکتا کہ حرمت سود مدینہ میں نازل ہوئی ہے، اس کے علاوہ اس آیت سے پہلے جو مضمون آیا ہے اس سے بھی دوسری تفسیر ہی کارِ حجاج معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس سے پہلے ارشاد ہے:-

فَاتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْيَسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۚ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۚ (الروم: ۳۸) ”قربابت دار کو اس کا حق دیا کرو اور مسکین کو اور مسافر کو بھی، یہ ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں۔“

اس آیت میں رشتہ داروں اور مساکین اور مسافروں پر خرچ کرنے کے ثواب ہونے کے لئے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اس میں نیت اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی ہو، تو اس کے بعد والی آیت مذکورہ میں اس کی توضیح اس طرح کی گئی کہ اگر مال کسی کو اس غرض سے دیا جائے کہ اس کا بدلہ اس کی طرف سے زیادہ ملے گا تو یہ رضا جوئی حق تعالیٰ کے لئے خرچ نہ ہو اس لئے اس کا ثواب نہ ملے گا۔

بہر حال ممانعت سود کے مسئلے میں اس آیت کو چھوڑ کر بھی مذکورہ الصدر بہت سی آیتیں آئی ہیں، جن میں سے سورہ آل عمران کی ایک آیت^[۱] میں اضعاف مضاعف سود کی حرمت بیان کی گئی ہے، اور باقی سب آیتوں میں مطلق سود کی حرمت کا بیان ہے، اس تفصیل سے یہ تو واضح ہو گیا کہ سود خواہ اضعاف مضاعف اور سود در سود ہو یا اکہر اسود، بہر حال حرام ہے، اور حرام بھی ایسا شدید کہ اس کی مخالفت کرنے پر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سنایا گیا ہے۔

مسئلہ سود و ربا کی کچھ مزید تشریح و تفصیل

آج کل ربا چونکہ نظام تجارت کا رکن اعظم اور عمود بن گیا ہے، اس لئے جب کتاب و سنت کی آیات و روایات میں اس کی حرمت و ممانعت سامنے آتی ہے تو عام طبائع اس کی حقیقت کو سمجھنے سمجھانے کے وقت اس کی حرمت سے ہچکچاتی ہیں، اور حیلہ جوئی کی طرف مائل ہوتی ہیں، مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ بحث کا تجزیہ کر کے اس کے ہر پہلو پر علیحدہ علیحدہ غور و فکر کرنا چاہئے، خلط ملط کرنے کا نتیجہ بحث کے اُلجھنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا، یہاں بحث کے تین حصے ہیں:-

اول یہ کہ قرآن و سنت میں ”ربا“ کی کیا حقیقت ہے اور وہ کن کن صورتوں پر حاوی ہے؟

دوسرے یہ کہ اس ربا کی حرمت و ممانعت کس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے؟

تیسرے یہ کہ سود و ربا کتنا ہی برا سہی، لیکن آج کل کی دنیا میں وہ نظام معاشیات و تجارت کا رکن اعظم بن چکا ہے، اگر قرآنی احکام کے ماتحت اس کو چھوڑ دیا جائے تو نظام بینک و تجارت کیسے چلے گا؟

اصل ”ربا“ کی تعریف میں کبھی کوئی ابہام نہیں رہا، ایک مغالطہ کا جواب

اب سنئے کہ لفظ ”ربا“ عربی زبان کا معروف لفظ ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نزول قرآن سے قبل جاہلیت عرب میں بھی یہ لفظ متعارف تھا، اور نہ صرف متعارف بلکہ ربا کا لین دین عام طور پر جاری تھا، بلکہ سورہ نساء کی آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ”ربا“ کا لفظ اور اس کے معاملات زمانہ توراۃ میں بھی معروف تھے، اور توراۃ میں بھی اس کو حرام قرار دیا گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ ایسا لفظ جو زمانہ قدیم سے عرب اور اس کے قرب و جوار میں معروف چلا آتا ہے اور اس پر لین دین کا رواج چل رہا ہے، اور قرآن اس کی حرمت و ممانعت بیان کرنے کے ساتھ یہ خبر بھی دیتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی امت پر بھی سود و ربا حرام کیا گیا تھا، اس لفظ کی حقیقت کوئی ایسی مبہم چیز نہیں ہو سکتی جس کے سمجھنے سمجھانے میں دشواریاں پیش آئیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۸ھ میں سورہ بقرہ کی آیات ربا کی حرمت کے متعلق نازل ہوئیں تو صحابہ کرامؓ سے کہیں منقول نہیں کہ ان کو لفظ ”ربا“ کی حقیقت سمجھنے میں کوئی اشتباہ پیش آیا ہو، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دوسرے معاملات کی طرح اس کی تحقیق کی نوبت آئی ہو، بلکہ جس طرح شراب کی حرمت نازل ہوتے ہی صحابہ کرامؓ نے اس پر عمل کیا، اسی طرح ربا کی حرمت نازل ہوتے ہی ربا کے سب معاملات ترک کر دیئے، پچھلے زمانہ کے معاملات میں مسلمانوں کو جو ربا غیر مسلموں کے ذمہ واجب الادا تھا، وہ بھی مسلمانوں نے چھوڑ دیا، اور جو غیر مسلموں کا مسلمانوں کے ذمہ واجب الادا تھا،

اور مسلمان نزولِ ممانعت کے بعد اس کو دینا نہیں چاہتے تھے اس کا جھگڑا امیرِ مکہ کی عدالت میں پیش ہوا، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دریافت کیا، تو اس کا فیصلہ سورہ بقرہ کی آیات میں آسمان سے نازل ہوا کہ پچھلے زمانے کے بقایا ربا کا لین دین بھی اب جائز نہیں۔

اور اس میں چونکہ غیر مسلموں کو یہ شکایت کا موقع مل سکتا تھا کہ ایک اسلامی حکم شرعی کی وجہ سے ہمارا روپیہ کیوں مارا جائے تو اس کے ازالہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجتہ الوداع کے خطبہ میں یہ واضح کر دیا کہ اس حکم شرعی کا اثر صرف غیر مسلموں پر نہیں، بلکہ مسلمانوں پر بھی یکساں ہے، اور سب سے پہلے جو سود کی رقم چھوڑی گئی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباسؓ کی کثیر التعداد رقم تھی۔

الغرض ربا کی ممانعت ہونے کے وقت ربا کا مفہوم کچھ مخفی نہ تھا، عام طور پر معروف تھا، وہی ربا جس کو عرب ربا کہتے تھے اور اس کا لین دین کرتے تھے، قرآن نے حرام کیا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صرف اخلاقی انداز میں نہیں، بلکہ قانونِ ملک کی حیثیت سے نافذ فرمایا، البتہ بعض ایسی صورتوں کو بھی آپ نے ربا میں شامل قرار دیا جس کو عام طور پر ربا نہیں سمجھا جاتا تھا، انہیں صورتوں کی تعیین میں حضرت فاروقِ اعظمؓ کو اشکال پیش آیا، اور انہی میں ائمہ مجتہدین کے نظریات میں اختلاف ہوا، ورنہ اصل ربا جس کو عرب ربا کہتے تھے نہ اس میں کسی کو اشتباہ کا موقع تھا، نہ اس میں کسی کا اختلاف ہوا۔

اب سنئے عرب کا مروجہ ربا کیا تھا؟ امام تفسیر ابن جریرؒ نے حضرت مجاہدؒ سے نقل کیا ہے کہ جو ربا جاہلیت میں جاری تھا، اور قرآن نے اس سے منع کیا وہ یہ تھا کہ کسی کو ایک میعادِ معین کے لئے قرض دے کر اس پر اصلِ رأس المال سے زائد مقررہ زیادتی لیتے تھے، اور اگر میعاد مقررہ پر وہ قرض ادا نہ کر سکا تو مزید میعاد اس شرط پر بڑھا دیتے تھے کہ سود میں اضافہ کیا جائے، یہی مضمون حضرت قتادہؒ اور دوسرے حضرات ائمہ تفسیر سے نقل کیا ہے۔ (تفسیر ابن جریر ج: ۳ ص: ۶۲)

اندلس کے مشہور امام تفسیر ابو حیان غرناطی کی تفسیر ”بحر محیط“ میں بھی جاہلیت کے ربا کی یہی صورت لکھی ہے کہ اُدھار دے کر اس پر نفع لیتے اور جتنی مدت اُدھار کی بڑھ جائے اتنا ہی سود اس پر بڑھا دینے کا نام ربا تھا، اسی جاہلیتِ عرب کے لوگ یہ کہتے تھے کہ جیسے بیع و شراء میں نفع لینا جائز ہے، اسی طرح اپنا روپیہ اُدھار دے کر نفع لینا بھی جائز ہونا چاہئے، قرآن کریم نے اس کو حرام قرار دیا، اور بیع و ربا کے احکام کا مختلف ہونا واضح فرمایا۔

یہی مضمون تمام مستند کتب تفسیر ابن کثیر، تفسیر کبیر اور روح المعانی وغیرہ میں معتبر روایات کے ساتھ منقول ہے۔^[۱]

ابن عربیؒ نے ”احکام القرآن“ میں فرمایا: ”الرِّبَا فِي اللُّغَةِ الرَّبَا وَهُوَ الْمُرَادُ بِهِ فِي الْآيَةِ كُلُّ زِيَادَةٍ لَا

يُقَابِلُهَا عَوْضٌ“ (ج: ۲ ص: ۱۰۱) یعنی ربا کے معنی اصل لغت میں زیادتی کے ہیں، اور آیت میں اس سے مراد وہ زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں کوئی مال نہ ہو، بلکہ محض اُدھار اور اس کی میعاد ہو۔ امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ ربا کی دو قسمیں ہیں، ایک معاملات بیع و شراء کے اندر ربا، دوسرے اُدھار کا ربا، اور جاہلیت عرب میں دوسری قسم ہی رائج اور معروف تھی کہ وہ اپنا مال کسی کو معین میعاد کے لئے دیتے تھے، اور ہر مہینہ اس کا نفع لیتے تھے، اور اگر میعاد معین پر ادائیگی نہ کر سکا، تو میعاد اور بڑھادی جاتی تھی، بشرطیکہ وہ سود کی رقم اور بڑھادیتے، یہی جاہلیت کا ربا تھا جس کو قرآن نے حرام کیا۔

امام حصّاصؒ نے ”احکام القرآن“ میں ربا کے معنی یہ بیان فرمائے ہیں:-

هُوَ الْقَرْضُ الْمَشْرُوطُ فِيهِ الْأَجَلُ وَزِيَادَةُ مَالٍ عَلَى الْمُسْتَقْرِضِ۔^[۱]

”یعنی وہ قرض ہے جس میں کسی میعاد کے لئے اس شرط پر قرض دیا جائے کہ قرض دار اس کو اصل مال سے زائد کچھ رقم ادا کرے گا۔“

حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ربا کی تعریف یہ فرمائی ہے:-

كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعًا فَهُوَ رِبَا۔^[۲] ”یعنی جو قرض نفع حاصل کرے وہ ربا ہے۔“

یہ حدیث جامع صغیر میں ہے اور عزیزی نے اس کو ”حسن“ کہا ہے۔^[۳]

خلاصہ یہ ہے کہ اُدھار دے کر اس پر نفع لینے کا نام ربا ہے جو جاہلیت عرب کے زمانے میں رائج اور معروف تھا، جس کو قرآن کریم کی آیت مذکورہ نے صراحۃً حرام قرار دیا، اور ان آیات کے نازل ہوتے ہی صحابہ کرامؓ نے اس کو چھوڑ دیا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قانونی خصومات میں اس کو نافذ فرمایا، اس میں نہ کوئی ابہام تھا نہ اجمال، نہ اس میں کسی کو کوئی اشتباہ و اشکال پیش آیا۔

البتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ربا کے مفہوم میں بیع و شراء کی چند صورتوں کو بھی داخل فرمایا جن کو عرب ربا نہ سمجھتے تھے، مثلاً چھ چیزوں کی بیع و شراء میں یہ حکم دیا کہ اگر ان کا تبادلہ کیا جائے تو برابر سراسر ہونا چاہئے، اور نقد دست بدست ہونا چاہئے، اس میں کمی بیشی کی گئی یا اُدھار کیا گیا تو وہ بھی ربا ہے، یہ چھ چیزیں: سونا، چاندی، گہو، جو، کھجور اور نمک ہیں۔ اسی اصول کے ماتحت عرب میں معاملات کی جو چند صورتیں مزابنہ^[۴] اور محافلہ کے نام سے رائج تھیں آیات ربا

[۱] احکام القرآن للخصاص، باب البیع ج: ۱ ص: ۲۶۹

[۲] کنز العمال رقم الحدیث: ۱۵۵۱۶، سبل السلام رقم الحدیث: ۸۱۲

[۳] الجامع الصغیر ج: ۳ ص: ۱۲۹۰ رقم الحدیث: ۶۳۳۶

[۴] ”مزابنہ“ یہ ہے کہ درخت پر لگے ہوئے پھل کو ٹوٹے ہوئے پھلوں کے بدلے میں اندازے سے فروخت کیا جائے، اور ”محافلہ“ یہ کہ کھڑے کھیت کے غلہ گندم، چنا وغیرہ کو خشک صاف کئے ہوئے غلہ گندم یا چنے سے اندازہ لگا کر فروخت کیا جائے، اندازے میں چونکہ کمی بیشی کا امکان رہتا ہے اس لئے اس کو منع کیا گیا۔ ۱۲ منہ

نازل ہونے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ربا میں شامل قرار دے کر منع فرمایا۔ (ابن کثیر بحوالہ مستدرک حاکم ج: ۱ ص: ۳۲۷)

اس میں یہ بات قابل غور تھی کہ ان چھ چیزوں کی خصوصیت ہے یا اُن کے علاوہ اور بھی کچھ چیزیں ان کے حکم میں ہیں، اور اگر ہیں تو ان کا ضابطہ کیا ہے، کس کس صورت کو داخلِ ربا سمجھا جائے، یہی اشکال حضرت فاروق اعظمؓ کو پیش آیا، جس کی بنا پر فرمایا:-

إِنَّ آيَةَ الرَّبِّ لَمِنْ آخِرِ مَا نَزَلَ مِنَ الْقُرْآنِ وَإِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبِضَ قَبْلَ أَنْ يُبَيِّنَهُ لَنَا فَدَعُوا الرَّبِّ لَوْا وَالرَّيْبَةَ۔ (احکام القرآن، حصّاص ص: ۵۵۱) ^۱ وتفسیر ابن کثیر بحوالہ ابن ماجہ ج: ۱ ص: ۳۲۸

”یعنی آیتِ ربا قرآن کی آخری آیتوں میں ہے، اس کی پوری تفصیلات بیان فرمانے سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی، اس لئے اب احتیاط لازم ہے، ربا کو تو چھوڑنا ہی ہے، جس صورت میں ربا کا شبہ بھی ہو اس کو بھی چھوڑ دینا چاہئے۔“

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی مراد معاملاتِ بیع و شراء کی وہ صورتیں اور ان کی تفصیلات ہیں جو جاہلیتِ عرب میں ربا نہیں سمجھی جاتی تھیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ربا میں داخل قرار دے کر حرام فرمایا، باقی اصلِ ربا جو تمام عرب میں معروف و مشہور تھا اور صحابہ کرامؓ نے اس کو چھوڑا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا قانون نافذ فرمایا، اور حجۃ الودع کے خطبہ میں اس کا اعلان کیا، اس میں فاروق اعظمؓ کو کوئی اشکال یا اشتباہ ہونے کا کوئی امکان نہیں، پھر جب فاروق اعظمؓ کو ربا کی جن خاص صورتوں میں اشتباہ پیش آیا تو اس کا حل یہ تجویز فرمایا کہ جن صورتوں میں ربا کا شبہ بھی ہو ان کو بھی چھوڑ دیا جائے۔

مگر حیرت ہے کہ آج بعض وہ لوگ جو یورپ کی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور دولت مندی اور موجودہ نظامِ تجارت وغیرہ میں سود کے رکن بن جانے سے مرعوب ہیں، انہوں نے فاروق اعظمؓ کے اس ارشاد کا یہ نتیجہ نکالا کہ ”ربا کا مفہوم ہی مجمل رہ گیا تھا، اس لئے اس میں رائے کی گنجائش ہے“ جس کے غلط ہونے کا کافی مواد سامنے آچکا ہے، ”احکام القرآن“ میں ابن عربیؒ نے ان لوگوں پر سخت انکار کیا ہے جنہوں نے اس فاروقی ارشاد کی بنا پر آیاتِ ربا کو مجمل کہا تھا۔ ابن عربیؒ نے ”احکام القرآن“ میں فرمایا:-

إِنَّ مَنْ زَعَمَ أَنَّ هَذِهِ الْآيَةَ مُجْمَلَةٌ فَلَمْ يَفْهَمْ مَقَاطِعَ الشَّرِيعَةِ فَإِنَّ اللَّهَ تَعَالَى أَرْسَلَ رَسُولَهُ

إِلَى قَوْمٍ هُوَ مِنْهُمْ بِلُغَتِهِمْ وَأَنْزَلَ عَلَيْهِ كِتَابَهُ تَمِيسِيرًا مِّنْهُ بِلِسَانِهِ وَلِسَانِهِمْ وَالرِّبَا فِي اللُّغَةِ
الرِّبَاوَةُ وَالْمُرَادُ بِهِ فِي الْآيَةِ كُلُّ زِيَادَةٍ لَا يُقَابِلُهَا عَوْضٌ^[۱]۔

”یعنی جس نے یہ کہا کہ یہ آیت مجمل ہے، اس نے شریعت کی تصریحات کو نہیں سمجھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ایسی قوم کی طرف بھیجا کہ وہ خود اسی قوم میں سے تھے، انہی کی زبان میں بھیجا، اُن پر اپنی کتاب آسانی کے لئے انہی کی زبان میں نازل فرمائی، اور لفظِ ربا کے معنی ان کی زبان میں زیادتی کے ہیں، اور مراد آیت میں وہ زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں مال نہیں بلکہ میعاد ہے۔“

اور امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں فرمایا کہ ربا کی دو قسمیں ہیں، ایک ادھار کا دوبار، دوسرے نقد بیع میں زیادہ لینے کا ربا، پہلی قسم وہ ہے جو زمانہ جاہلیت میں مشہور و معروف تھی اور اہل جاہلیت اس کا لین دین کرتے تھے، اور دوسری قسم وہ ہے جو حدیث نے بیان کی کہ فلاں فلاں چیزوں کی بیع و شراء میں کمی زیادتی ربا میں داخل ہے۔^[۲]

اور احکام القرآن جصاص میں ہے کہ ربا کی دو قسمیں ہیں، ایک بیع و شراء کے اندر، دوسری بغیر بیع و شراء کے، اور زمانہ جاہلیت کا ربا یہی دوسری قسم کا تھا، اور اس کی تعریف یہ ہے کہ وہ قرض جس میں بحساب میعاد کوئی نفع لیا جائے۔^[۳] اور یہی مضمون ابن رشدؒ نے ”بداية المجتهد“ میں لکھا ہے، اور قرض ادھار پر نفع لینے کے ربا کا حرام ہونا قرآن، سنت اور اجماع اُمت سے ثابت کیا ہے۔

امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے کلام کرتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ قرآن میں جو ربا مذکور ہے اس سے جلی اور واضح طور پر وہ ربا مراد ہے جو قرض ادھار پر لیا دیا جاتا تھا، اور اسی کو زمانہ جاہلیت میں ربا کہا جاتا تھا، اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور آپ کی سنت سے دوسری قسم کے ربا کا علم ہوا، جو خاص خاص اقسام بیع و شراء میں کمی زیادتی یا ادھار کرنے کا نام ہے، اور اس ربا کے حرام ہونے پر بھی احادیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم متواتر آئی ہیں، مگر اس قسم کے ربا کی تفصیلات پوری واضح نہ ہونے کے سبب اس میں بعض صحابہ کرامؓ کو اشکال پیش آیا، اور فقہاء کے اختلافات ہوئے۔ (معانی الآثار ج: ۲ ص: ۲۳۲)

اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ”حجة الله البالغة“ میں فرمایا ہے کہ ربا ایک حقیقی ہے اور ایک وہ جو بحکم ربا ہے، حقیقی ربا قرض ادھار پر زیادتی لینے کا نام ہے، اور بحکم ربا وہ ہے جس کا بیان حدیث میں آیا کہ بعض خاص چیزوں کی بیع میں

[۱] احکام القرآن، لابن العربی، سورة البقرة مسئلة كل زيادة لم يقابلها عوض ج: ۱ ص: ۲۸۵

[۲] التفسير الكبير تحت هذه الآية ج: ۴ ص: ۲۵

[۳] احکام القرآن، باب البيع ج: ۱ ص: ۲۶۹

زیادتی لینے کو ربا کہا گیا ہے، اور ایک حدیث میں جو آیا ہے: ”لَا رِبَا إِلَّا فِي النَّسِيئَةِ“ (رواہ البخاری) ^[۱] یعنی ربا صرف اُدھار میں ہے، اس کا یہی مطلب ہے کہ حقیقی اور اصل ربا جس کو عام طور پر ربا سمجھا اور کہا جاتا ہے وہ اُدھار پر نفع لینے کا نام ہے، اس کے سوا جتنی اقسام اس کے ساتھ ملحق کی گئی ہیں، وہ سب حکماً ربا میں داخل ہیں۔

اس تفصیل سے چند چیزیں واضح ہو گئیں

اول یہ کہ نزولِ قرآن سے پہلے ربا ایک متعارف چیز تھی، قرض اُدھار پر بحساب میعاد زیادتی لینے کو ربا کہا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ قرآن میں حرمتِ ربا نازل ہوتے ہی سب صحابہ کرامؓ نے اس ربا کو ترک کر دیا، اس کے معنی سمجھنے سمجھانے میں کسی کو نہ اشکال پیش آیا نہ اشتباہ۔

تیسرے یہ کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ چیزوں کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا کہ ان کی باہمی بیع و شراء میں برابری شرط ہے، کمی بیشی ربا میں داخل ہے، اور ان میں اُدھار کرنا بھی ربا میں داخل ہے، یہ چھ چیزیں: سونا، چاندی، گہہوں، جو، کھجور، نمک ہیں، اور اسی قانون کے تحت عرب میں مروجہ اقسام بیع مزابنہ، محاقلہ وغیرہ کو حرام قرار دیا گیا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں چھ چیزوں کی بیع و شراء میں کمی بیشی اور اُدھار کو تو صراحتاً ربا میں داخل کر کے حرام قرار دے دیا تھا، لیکن اس میں یہ بات محلِ تفقہ و اجتہاد تھی کہ یہ حکم ان چھ چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے یا دوسری اشیاء میں بھی ہے، اور اس کا ضابطہ کیا ہے؟ اس ضابطہ میں فقہاء نے اپنے اپنے غور و فکر اور اجتہاد سے مختلف صورتیں تجویز کیں، اور چونکہ یہ ضابطہ خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہ فرمایا تھا اس میں اشتباہ رہنے کے سبب حضرت فاروقِ اعظمؓ نے اس پر اظہارِ افسوس کیا کہ کاش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی اس کا کوئی ضابطہ بیان فرمادیتے تو مشتبہ حالات میں اطمینان پیدا ہو جاتا، اور پھر یہ ارشاد فرمایا کہ جہاں ربا کا شبہ بھی ہو اس سے بچنا چاہئے۔

چوتھے یہ معلوم ہوا کہ اصلی اور حقیقی ربا جس کو فقہاء نے ”ربا القرآن“ یا ”ربا القرض“ کے نام سے موسوم کیا ہے، وہی ہے جو عرب میں متعارف تھا، یعنی قرض اُدھار پر بحساب میعاد نفع لینا، دوسری قسم کے ربا جو حدیث میں بتلائے گئے وہ سب اسی ربا کے ساتھ ملحق اور اسی کے حکم میں ہیں، اور جو کچھ خلاف و اختلاف اُمت میں ہوا وہ سب اسی دوسری قسم کے معاملاتِ ربا میں ہوا، پہلی قسم کا ربا جو ”ربا القرآن“ کہلاتا ہے اس کے حرام ہونے میں پوری اُمتِ محمدیہ میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔

اور آج کل جو ربا انسانی معاشیات کا مدار سمجھا جاتا ہے، اور مسئلہ سود میں جو زیرِ بحث ہے وہ یہی ربا ہے، جس کی

حرمت قرآن کی سات آیات اور چالیس سے زیادہ احادیث اور اجماع اُمت سے ثابت ہے۔
ربا کی دوسری قسم جو بیع و شراء کے ضمن میں ہوتی ہے نہ اس کا رواج عام ہے، نہ اس میں کوئی بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

یہاں تک یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن و سنت میں ربا کی حقیقت کیا ہے جو مسئلہ سود کی پہلی بات ہے۔

حرمت سود کی حکمت و مصلحت

اس کے بعد دوسری بحث اس کی ہے کہ ربا کی حرمت و ممانعت کس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے، اور اس میں وہ کوئی روحانی یا معاشی مضرتیں ہیں جن کی وجہ سے اسلام نے اس کو اتنا بڑا گناہ قرار دیا ہے۔
اس جگہ پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ دنیا کی ساری مخلوقات اور ان کے معاملات میں ایسی کوئی چیز نہیں جس میں کوئی بھلائی یا فائدہ نہ ہو، سانپ، بچھو، بھیڑیا، شیر اور سنکھیا جیسے زہر قاتل میں بھی انسان کے لئے ہزاروں فوائد ہیں۔
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

چوری، ڈاکہ، بدکاری، رشوت ان میں کوئی ایسی چیز نہیں جس میں کچھ نہ کچھ فائدہ نہ ہو، مگر ہر مذہب و ملت اور ہر مکتب فکر میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس چیز کے منافع زیادہ اور مضرتیں کم ہیں ان کو نافع و مفید کہا جاتا ہے، اور جن کے مفاسد و مضرت زیادہ اور منافع کم ہیں ان کو مضر اور بیکار سمجھا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے بھی شراب اور قمار کو حرام قرار دیتے ہوئے اس کا اعلان فرمایا کہ ان میں بڑے گناہ بھی ہیں، اور لوگوں کے کچھ منافع بھی، مگر ان کے گناہ کا وبال منافع کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے، اس لئے ان چیزوں کو اچھا یا مفید نہیں کہا جاسکتا بلکہ ان کو نہایت مضر اور تباہ کن سمجھ کر ان سے اجتناب لازم ہے۔

ربا، یعنی سود کا بھی یہی حال ہے، اس میں سود خور کے لئے کچھ وقتی نفع ضرور نظر آتا ہے، لیکن اس کا دُنیوی اور اُخروی وبال اس نفع کے مقابلے میں نہایت شدید ہے۔

ہر چیز کے نفع و نقصان یا مفاسد و مصالح کا موازنہ کرنے میں یہ بات بھی ہر عقل مند کے نزدیک قابلِ نظر ہوتی ہے کہ اگر کسی چیز میں نفع محض وقتی اور ہنگامی ہو اور نقصان اس کا دیرپا، یاد آئی تو اس کو کوئی عقل مند مفید اشیاء کی فہرست میں شمار نہیں کر سکتا، اسی طرح اگر کسی چیز کا نفع شخصی اور انفرادی ہو اور اس کا نقصان پوری ملت اور جماعت کو پہنچتا ہو تو اس کو بھی کوئی ہوش مند انسان مفید نہیں کہہ سکتا، چوری اور ڈاکہ میں چور ڈاکو کا تو نفع کھلا ہوا ہے، مگر وہ پوری ملت کے لئے مضر اور ان کے امن و سکون کو برباد کرنے والا ہے، اسی لئے کوئی انسان چوری اور ڈاکہ کو اچھا نہیں کہتا۔

اس تمہید کے بعد مسئلہ سود پر نظر ڈالئے تو اس میں ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں سود خور کے وقتی اور ہنگامی نفع کے مقابلہ میں اس کا روحانی اور اخلاقی نقصان اتنا شدید ہے کہ وہ اس کو انسانیت سے نکال دیتا ہے، اور یہ کہ اس کا جو وقتی نفع ہے وہ بھی صرف اس کی ذات کا نفع ہے، اس کے مقابلہ میں پوری ملت کو نقصان عظیم اور معاشی بحران کا شکار ہونا پڑتا ہے، لیکن دنیا کا حال یہ ہے کہ جب اس میں کوئی چیز رواج پا جاتی ہے تو اس کی خرابیاں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں، اور صرف اس کے فوائد سامنے رہ جاتے ہیں اگرچہ وہ فوائد کتنے ہی حقیر و ذلیل اور ہنگامی ہوں، اس کے نقصانات کی طرف دھیان نہیں جاتا اگرچہ وہ کتنے ہی شدید اور عام ہوں۔

رسم و رواج طبائع انسانی کے لئے ایک کلور و فارم ہے جو اس کو بے حس بنا دیتا ہے، بہت کم افراد ہوتے ہیں جو چلے ہوئے رسم و رواج پر تحقیقی نظر ڈال کر یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس میں فائدے کتنے ہیں اور نقصان کتنا، بلکہ اگر کسی کے متنبہ کرنے سے اس کے نقصانات سامنے بھی آجائیں، تو پابندی رسم و رواج اس کو صحیح راستہ پر نہیں آنے دیتی۔

سود و ربا اس زمانہ میں ایک وبائی مرض کی صورت اختیار کر چکا ہے اور اس کا رواج ساری دنیا کو اپنی پلیٹ میں لے چکا ہے، اس نے انسانی فطرت کا ذائقہ بدل دیا ہے کہ کڑوے کو میٹھا سمجھنے لگی، اور جو چیز پوری انسانیت کے لئے معاشی بربادی کا سبب ہے، اس کو معاشی مسئلہ کا حل سمجھا جانے لگا، آج اگر کوئی مفکر محقق اس کے خلاف آواز اٹھاتا ہے تو اس کو دیوانہ سمجھا جاتا ہے۔

یہ سب کچھ ہے، لیکن وہ ڈاکٹر ڈاکٹر نہیں بلکہ انسانیت کا ڈاکو ہے جو کسی ملک میں وبا پھیل جانے کو اور علاج کے غیر موثر ہونے کا مشاہدہ کرنے کی بنا پر اب یہ طے کرے کہ لوگوں کو یہ سمجھائے کہ یہ مرض مرض ہی نہیں، بلکہ عین شفا اور عین راحت ہے۔ ماہر ڈاکٹر کا کام ایسے وقت میں بھی یہی ہے کہ لوگوں کو اس مرض اور اس کی مضرت سے آگاہ کرتا رہے، اور علاج کی تدبیریں بتاتا رہے۔

انبیاء علیہم السلام اصلاح خلق کے ذمہ دار ہو کر آتے ہیں، وہ کبھی اس کی پروا نہیں کرتے کہ کوئی ان کی بات سنے گا یا نہیں، وہ اگر لوگوں کے سننے اور ماننے کا انتظار کیا کرتے تو ساری دنیا کفر و شرک ہی سے آباد ہوتی، کلمہ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ کا ماننے والا اُس وقت کون تھا جبکہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی تبلیغ و تعلیم کا حکم منجانب اللہ ملا تھا؟

سود و ربا کو اگرچہ آج کی معاشیات میں ریڑھ کی ہڈی سمجھا جانے لگا ہے، لیکن حقیقت وہ ہے جو آج بھی بعض حکمائے یورپ نے تسلیم کی کہ وہ معاشیات کے لئے ریڑھ کی ہڈی نہیں بلکہ ریڑھ کی ہڈی میں پیدا ہو جانے والا ایک کیڑا ہے جو اس کو کھا رہا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ آج کل کے اہل علم و فن بھی کبھی رسم و رواج کے تنگ دائرے سے آزاد ہو کر اس طرف نظر نہیں

کرتے، اور سیکڑوں برس کے تجربے بھی ان کو اس طرف متوجہ نہیں کرتے کہ سودورِ با کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عام خلقِ خدا اور تمام ملت فقر و فاقہ اور معاشی بحران کا شکار ہو، اور وہ غریب سے غریب تر ہوتے چلے جائیں، اور چند سرمایہ دار پوری ملت کے مال سے فائدہ اٹھا کر، یا یوں کہئے کہ ملت کا خون چوس کر اپنا بدن بڑھاتے اور پالتے چلے جائیں، اور حیرت ہے کہ جب کبھی ان حضرات کے سامنے اس حقیقت کو بیان کیا جاتا ہے، تو اس کے جھٹلانے کے لئے ہمیں امریکا، اور انگلینڈ کے بازاروں میں لے جا کر سود کی برکات کا مشاہدہ کرانا چاہتے ہیں، اور یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ سودورِ با کی بدولت کیسے پھلے اور پھولے ہیں، لیکن اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی مردِ موروں کی کسی قوم اور ان کے عمل کی برکات کا مشاہدہ کرانے کے لئے آپ کو مردِ موروں کے محلہ میں لے جا کر یہ دکھلائے کہ یہ کتنے موٹے تازے اور تندرست ہیں، اور اس سے یہ ثابت کرے کہ ان کا یہ عمل بہترین عمل ہے۔

لیکن اس کو کسی سمجھ دار آدمی سے سابقہ پڑے تو وہ کہے گا کہ تم مردِ موروں کے عمل کی برکات مردِ موروں کے محلہ میں نہیں، دوسرے محلوں میں جا کر دیکھو جہاں سیکڑوں، ہزاروں مردے پڑے ہوئے ہیں، جن کا خون اور گوشت کھا کر یہ درندے پلے ہیں۔ اسلام اور اسلامی شریعت کبھی ایسے عمل کو درست اور مفید نہیں مان سکتی جس کے نتیجہ میں پوری انسانیت اور ملت تباہی کا شکار ہو، اور کچھ افراد یا ان کے جتنے پھولتے پھلتے چلے جائیں۔

سودورِ با کی معاشی خرابیاں

سودورِ با میں اگر کوئی دوسرا عیب بھی اس کے سوا نہ ہوتا کہ اس کے نتیجہ میں چند افراد کا نفع اور پوری انسانیت کا نقصان ہے تو یہی اس کی ممانعت اور قابلِ نفرت ہونے کے لئے کافی تھا، حالانکہ اس میں اس کے علاوہ اور بھی معاشی خرابیاں اور روحانی تباہ کاریاں پائی جاتی ہیں۔

پہلے اس کو سمجھئے کہ سود کے ذریعہ ملت کی تباہی اور خاص افراد کا نفع کیونکر ہے، سودورِ با کے مہاجنی اور فرسودہ طریقوں میں تو ایسا بھونڈا پن تھا کہ عام ملت کا ضرر اور کسی خاص فرد کا نفع ہر موٹی عقل والے کو بھی سمجھ میں آ جاتا تھا، مگر آج کل کی ”نئی روشنی“ جس کو ”نئی اندھیری“ کہنا زیادہ موزوں ہے، اس نے جس طرح شراب کو مشینوں میں صاف کر کے، چوری اور ڈاکہ کی نئی نئی صورتیں ایجاد کر کے، بدکاری و بے حیائی کے نئے نئے ڈھنگ نکال کر کے سب کو ایسا مہذب بنا لیا ہے کہ سطحی نظروالوں کو اس کی اندرونی خرابیاں نظر نہ آئیں، اسی طرح ربا اور سود کے لئے بجائے شخصی دُکانوں کے مشترک کمپنیاں بنالی ہیں جن کو ”بینک“ کہا جاتا ہے، اور اب دُنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کے لئے یہ بتلایا جاتا ہے کہ ربا کے اس جدید طریقہ سے پوری ملت کا فائدہ ہے، کیونکہ عوام جو اپنے روپے سے تجارت کرنا نہیں جانتے، یا قلتِ سرمایہ کی بنا پر

نہیں کر سکتے، ان سب کا روپیہ بینکوں میں جمع ہو کر ان میں سے ہر ایک کو گویا قلیل ہی سہی کچھ نہ کچھ نفع سود کے نام سے مل جاتا ہے، اور بڑے تاجروں کو یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ بینکوں سے سودی قرض لے کر بڑی تجارت کر کے فائدہ اٹھاتے رہیں، اس طرح سود ایسی مبارک چیز بن گئی کہ ساری ملت کے افراد کو اس سے نفع پہنچ رہا ہے۔

لیکن ذرا انصاف سے کام لیا جائے تو یہ وہ ابلہ فریبی ہے جو شراب کی گندی بھٹیوں کو صاف ستھرے ہوٹلوں میں اور عصمت فروشی کے اڈوں کو سینماؤں اور شبینہ کلبوں میں تبدیل کر کے زہر کو تریاق اور مضر کو مفید بنا کر دکھلانے کے لئے عمل میں لائی گئی ہے، اور جس طرح اہل بصیرت پر یہ بات روشن ہے کہ اخلاق سوز جرائم کو جدید غلاف پہنانے کا نتیجہ اس کے سوا نہیں کہ یہ جرائم پہلے سے زیادہ ہو گئے، اور ان کا زہر پہلے سے زیادہ تیز ہو گیا، اسی طرح سود و ربا کی اس نئی شکل نے سود کے چند آنے فی سیڑھ عوام کے منہ کو لگا کر ایک طرف ان کو اپنے جرم کا شریک کر لیا، اور دوسری طرف اپنے لئے اس جرم کے ارتکاب کا غیر محدود میدان فراہم کر لیا۔

کون نہیں جانتا کہ یہ چند آنے فی سیڑھ کا سود جو سیونگ بینکوں اور ڈاک خانہ جات سے لوگوں کو ملتا ہے، یہ کسی طرح ان کے معاش کی کفالت نہیں کر سکتا، اس لئے وہ مجبور ہیں کہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے کوئی مزدوری یا ملازمت تلاش کریں، تجارت کی طرف اول تو ان کی نظر خود نہیں جاتی، اور اگر کسی کو اس طرف توجہ بھی ہو جائے تو پوری ملت کا سرمایہ بینکوں میں جمع ہو کر جو صورت تجارت کی بن گئی ہے اس میں کسی چھوٹے سرمایہ والے کو داخل ہونا خود اپنی موت کو دعوت دینے سے کم نہیں، کیونکہ بینک کوئی بڑا سرمایہ قرض پر صرف اسی کو دے سکتے ہیں جس کی بازار میں اپنی ساکھ ہو اور بڑا کاروبار ہو، دس لاکھ کے مالک کو ایک کروڑ قرض مل سکتا ہے، وہ اپنے ذاتی روپے کی نسبت سے دس گنا زیادہ کی تجارت چلا سکتا ہے، اور تھوڑے سرمایہ والے کی نہ کوئی ساکھ ہوتی ہے، نہ بینک اس پر اعتماد کرتے ہیں، کہ ان کو دس گنا زیادہ قرض دے دیں، ایک ہزار کی مالیت کو دس ہزار تو کیا ایک ہزار ملنا بھی مشکل ہے، اور جبکہ ایک شخص جو ایک لاکھ کی ملکیت رکھنے والا ہو، نو لاکھ بینک کا سرمایہ لگا کر دس لاکھ کی تجارت کرتا ہے، اور فرض کر لیجئے کہ اس کو ایک روپیہ فی صد نفع ہوتا ہے تو گویا اس کو اپنے ایک لاکھ پر دس فی صد نفع ہوا، اس کے بالمقابل اگر کوئی شخص اپنے ذاتی روپے سے ایک لاکھ کی تجارت کرتا ہے اس کو ایک لاکھ پر صرف ایک ہی فیصد کا نفع ہوگا، جو اس کے ضروری اخراجات کے لئے بھی کافی نہ ہوں گے، اُدھر مارکیٹ میں بڑے سرمایہ والے کو خام سامان جس نرخ اور رعایت کے ساتھ ملتا ہے وہ چھوٹے سرمایہ والے کو میسر نہیں آ سکتا، اس لئے چھوٹے سرمایہ والا مفلوج اور محتاج ہو کر رہ جاتا ہے، اور اگر اس کی شامت آئی، اور اس نے بھی کسی ایسی تجارت میں ہاتھ ڈال دیا تو بڑے سرمایہ والا اس کو اپنی خدائی کا شریک سمجھ کر کچھ اپنی گرہ سے نقصان اٹھا کر بھی بازار کو ایسا ڈاؤن کر دیتا ہے کہ چھوٹے سرمایہ والا اصل اور نفع سب سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تجارت صرف ان چند افراد میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے جو

بڑے سرمایہ دار ہیں۔

۱- یہ ملت پر کتنا بڑا ظلم ہے کہ ساری ملت اصلی تجارت سے محروم ہو کر صرف بڑے سرمایہ داروں کی دست نگر بن جائے، ان کو وہ جتنا نفع دینا چاہیں بخشش کے طور پر دے دیں۔

۲- اور دوسرا اس سے بڑا نقصان جس کی زد میں پورا ملک آجاتا ہے یہ ہے کہ ایسی صورت میں اشیاء کے نرخ پر ان بڑے سرمایہ داروں کا قبضہ ہو جاتا ہے، وہ گراں سے گراں فروخت کر کے اپنی گرہ مضبوط کر لیتے اور پوری ملت کی گرہیں کھلوا لیتے ہیں، اور قیمت بڑھانے کے لئے جب چاہیں مال کی فروخت بند کر دیتے ہیں، اگر ساری ملت کا سرمایہ بینکوں کے ذریعے کھینچ کر ان خود غرض لوگوں کی پرورش نہ کی جاتی اور یہ مجبور ہوتے کہ صرف اپنے ذاتی سرمایہ سے تجارت کریں تو نہ چھوٹے سرمایہ والوں کو یہ مصیبت پیش آتی، اور نہ یہ خود غرض درندے پوری تجارت کے ناخدا بنتے، چھوٹے سرمایہ والوں کی تجارت کے منافع سامنے آتے تو دوسروں کا حوصلہ بڑھتا، تجارت کا کاروبار عام ہوتا، جس سے ہر ایک کا اسٹاف علیحدہ ہوتا، جس سے ہزاروں حاجت مندوں کی روزی پیدا ہوتی، اور تجارتی نفع بھی عام ہوتا، اور اشیاء کی ارزانی پر بھی یقینی اثر پڑتا، کیونکہ باہمی مقابلہ (کمپیشن) ہی ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ کوئی آدمی اس پر تیار ہوتا ہے کہ اپنا نفع کم کر لے، اس عیارانہ طریق کار نے پوری قوم کو ایک مہلک بیماری لگادی اور دوسرے اس کی ذہنیت خراب کر دی کہ اس بیماری ہی کو شفا سمجھے۔

۳- بینکوں کے سود سے ملت کا ایک تیسرا معاشی نقصان اور دیکھئے کہ جس شخص کا سرمایہ دس ہزار ہے، اور وہ بینک سے سودی قرض لے کر ایک لاکھ کا بیوپار کرتا ہے، اگر کہیں اس کا سرمایہ ڈوب گیا، اور تجارت میں اس کو نقصان پہنچ گیا، اور وہ دیوالیہ ہو گیا، تو غور کیجئے کہ نقصان صرف دس فی صد تو اس پر پڑا، باقی نوے فی صد نقصان پوری ملت کا ہوا، جن کا سرمایہ بینک سے لے کر اس نے لگایا تھا، اگر بینک نے دیوالیہ کے نقصان کو سر دست خود ہی برداشت کر لیا، تو یہ ظاہر ہے کہ بینک تو قوم کی جیب ہے، اس کا نقصان انجام کار قوم پر عائد ہوگا، جس کا حاصل یہ ہوا کہ سرمایہ دار کو جب تک نفع ہوتا رہا تو نفع کا وہ تنہا مالک تھا، اس میں ملت کے لئے کچھ نہ تھا، یا برائے نام تھا، اور جب نقصان آیا تو نوے فی صد نقصان پوری ملت پر پڑ گیا۔

۴- سود سے ایک معاشی نقصان یہ بھی ہے کہ سود خور جب گھائے میں آجائے تو پھر وہ چننے کے قابل نہیں رہتا، کیونکہ اتنا سرمایہ تو تھا نہیں جس کے نقصان کو یہ برداشت کر سکے، نقصان کے وقت اس پر دہری مصیبت ہوتی ہے، ایک تو اپنا نفع اور سرمایہ گیا، اور اوپر سے بینک کے قرض میں دب گیا، جس کی ادائیگی کے لئے اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں، اور بے سود کی تجارت میں اگر سارا سرمایہ بھی کسی وقت چلا جائے تو فقیر ہی ہوگا مقروض تو نہ ہوگا۔

۱۹۵۴ء میں پاکستان میں روئی کے بیوپار پر قرآنی ارشاد کے مطابق محاق کی آفت آئی اور حکومت نے کروڑوں

روپے کا نقصان اٹھا کر تاجروں کو سنبھالا، مگر کسی نے اس پر غور نہیں کیا کہ وہ سب سود کی نحوست تھی، کیونکہ کاٹن کے تاجروں نے اس کاروبار میں بیشتر سرمایہ بینکوں کا لگایا ہوا تھا، اپنا سرمایہ برائے نام تھا، بقضائے خداوندی روٹی کا بازار اتنا گر گیا کہ اس کے دام ایک سو پچیس سے گر کر دس پر آ گئے، تاجر اس قابل نہ رہے کہ بینکوں میں مارجن پوری کرنے کے لئے روپیہ واپس دیں، مجبور ہو کر مارکیٹ بند کر دی گئی، اور حکومت سے فریاد کی، حکومت نے دس کے بجائے نوے کے دام لگا کر خود مال خریدا اور کروڑوں روپے کا نقصان برداشت کر کے ان تاجروں کو دیوالیہ ہونے سے بچالیا، حکومت کا روپیہ کس کا تھا، وہی بیچاری غریب ملت و قوم کا، غرض بینکوں کے کاروبار کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ پوری ملت کے سرمایہ سے چند افراد نفع اٹھاتے ہیں اور جہاں نقصان ہو جائے تو وہ پوری قوم و ملت پر پڑے۔

خویش پروری اور ملت کشی کی ایک اور چال

سود و ربا کی ملت کشی اور افراد پروری کا اجمالی نقشہ آپ کے سامنے آچکا ہے، اس کے ساتھ ایک اور ہوشیاری اور چالاکی دیکھئے کہ سود خوروں نے جب اپنے تجربہ سے بھی اس چیز کو محسوس کیا جو قرآن کا ارشاد ہے: **يَنْهَى اللَّهُ الرِّبَا** یعنی ”سود کے مال میں محاق کی آفتیں آنا لازمی ہیں“ جس کے نتیجہ میں دیوالیہ ہونا پڑتا ہے، تو ان آفتوں سے بچنے کے لئے دو مستقل ادارے بنائے، ایک بیمہ (انشورنس) دوسرے سٹہ کا بازار، کیونکہ تجارت میں نقصان آنے کی دو وجہ ہو سکتی ہیں، ایک کوئی آسمانی آفت کہ جہاز ڈوب گیا، یا جل گیا، یا کوئی اور ایسی ہی آفت آ گئی، دوسرے یہ کہ سامان کا نرخ اس کی قیمت خرید سے کم ہو گیا، ان دونوں صورتوں میں لگا ہوا سرمایہ چونکہ اپنا نہیں بلکہ ملت کا مشترکہ سرمایہ ہے، اس لئے ان کا نقصان کم اور ملت کا زیادہ ہے، مگر انہوں نے اس تھوڑے سے نقصان کو بھی ملت ہی کے سر پر ڈالنے کے لئے، ایک طرف تو بیمہ کمپنیاں کھولیں، جس میں بینکوں کی طرح پوری ملت کا سرمایہ جمع رہتا ہے، اور جب کسی سماوی آفت سے ان سود خوروں پر کوئی نقصان آتا ہے تو بیمہ کے ذریعے وہ پورا نقصان بھی ملت کے مشترک سرمایہ پر ڈال دیتے ہیں۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ بیمہ کمپنیاں خدا کی رحمت ہیں، ڈوبتے کو سہارا دیتی ہیں، لیکن ان کی حقیقت کو دیکھیں اور سمجھیں تو یہاں بھی وہی فریب ہے کہ ناگہانی حوادث کے وقت امداد کا لالچ دے کر ملت کا سرمایہ جمع کیا گیا، مگر اس سے بھاری رقموں کا فائدہ تو صرف اُنچے سرمایہ داروں کو ملتا ہے جو بعض اوقات خود ہی اپنی فرسودہ موٹر کو آگ لگا کر، یا کہیں ٹکرا کر اور بیمہ کمپنی سے رقم لے کر نئی موٹر خریدنا چاہتے ہیں، سو میں ایک دو کوئی غریب بھی ایسا ہوتا ہوگا جس کو ناگہانی موت کے سبب کچھ پیسے مل جاویں۔

اور دوسری قسم یعنی نرخ گھٹ جانے کے خطرے سے بچنے کے لئے سٹہ کا بازار گرم کیا، اس سٹہ کے ذریعے تمام

افراد ملت کو متاثر کیا گیا، تاکہ جو نقصان ان کو قیمت گھٹ جانے کی وجہ سے ہونے والا تھا وہ پھر ملت پر منتقل کر دیں۔ اس مختصر بیان میں آپ نے اتنا سمجھ لیا ہوگا کہ بینکوں کا سود اور اس کی تجارت پوری انسانیت کے لئے فقر و فاقہ اور معاشی تنگ دستی کا موجب ہے، ہاں چند مال دار افراد کے اموال میں اس سے اضافہ بھی ہوتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ملت بگڑتی ہے اور چند افراد بنتے ہیں، اور ملک کا سرمایہ سمٹ کر اُن کے ہاتھ میں آ جاتا ہے، عام حکومتوں نے اس عظیم مفسدہ کو محسوس تو کیا، لیکن اس کا علاج یہ تجویز کیا کہ بڑے سرمایہ داروں کے لئے انکم ٹیکس کی شرح بڑھادی، یہاں تک کہ آخری شرح ایک روپیہ میں سے ساڑھے پندرہ آنے کر دی گئی، تاکہ سرمایہ اُن کے پاس سے منتقل ہو کر پھر قومی خزانے میں پہنچ جائے۔ لیکن سب کو معلوم ہے کہ اس قانون کے نتیجہ میں عام طور پر کارخانوں کے حساب فرضی اور جعلی بننے لگے، اور بہت سا سرمایہ حکومت سے چھپانے کے لئے پھر دفتروں کی شکل میں منتقل ہونے لگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دولت سمٹ کر قوم کے چند افراد میں مقید ہو جانے کی انتہائی مضرت ملک کے معاشی اور اقتصادی حالات کے لئے سب پر واضح ہے، اسی لئے انکم ٹیکس کی شرح اتنی زیادہ بڑھائی جاتی ہے، لیکن تجربہ شاہد ہے کہ یہ تدبیر مرض کا علاج ثابت نہ ہوئی، جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مرض کے اصلی سبب کو نہیں پہچانا گیا، اس لئے علاج کی مثال یہ ہو گئی کہ ۔

در بہ بست و دشمن اندر خانہ بود

دولت بڑے سرمایہ داروں کی طرف سمٹنے کا اصلی سبب صرف سودی کاروبار اور قومی سرمایہ سے خاص خاص افراد کی بے جانفع اندوزی ہے، جب تک اسلام کی تعلیمات کے مطابق اس کو بند نہ کیا جائے اور اس کا رواج نہ دیا جائے کہ ہر شخص صرف اپنے سرمایہ سے تجارت کرے اس وقت تک اس مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بینکوں کے ذریعہ پوری قوم کا سرمایہ جمع ہو کر کچھ نہ کچھ تو فائدہ عوام کو بھی ملا، وہ کتنا ہی قلیل ہو، اور بڑے سرمایہ داروں نے اس سے زیادہ فائدہ حاصل کر لیا ہو، لیکن اگر یہ بینکوں میں سرمایہ جمع کرنے کا طریقہ نہ ہو تو اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو پہلے زمانے میں تھا کہ لوگوں کا سرمایہ دفتروں اور خزانوں کی شکل میں زمین کے اندر رہا کرتا تھا، جس سے نہ اُن کو فائدہ ہوگا نہ کسی دوسرے شخص کو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام نے جس طرح سود کو حرام قرار دے کر اس کا دروازہ بند کیا ہے کہ پوری قوم کی دولت سمٹ کر خاص خاص سرمایہ داروں میں محدود ہو جائے، اسی طرح زکوٰۃ کا فریضہ سرمایہ ٹیکس کی صورت میں عائد

کر کے ہر مال دار کو اس پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے سرمایہ کو منجمد حالت میں نہ رکھے، بلکہ تجارت اور کاروبار میں لگائے، کیونکہ زکوٰۃ سرمایہ ٹیکس کی صورت میں ہونے کی بنا پر اگر کوئی شخص اپنا روپیہ یا سونا چاندی دھینے کر کے رکھتا ہے تو ہر سال اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں نکلتے نکلتے سرمایہ فنا ہو جائے گا، اس لئے ہر سمجھ دار انسان اس پر مجبور ہوگا کہ سرمایہ کو کام میں لگا کر اس سے فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو فائدہ پہنچائے، اور اسی نفع میں سے زکوٰۃ ادا کرے۔

فریضہ زکوٰۃ ایک حیثیت سے تجارت کی ترقی کا ضامن ہے

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ فریضہ زکوٰۃ ادا کرنے میں جیسے یہ عظیم الشان فائدہ مضمر ہے کہ قوم کے فقراء و مساکین کی امداد ہو، اسی طرح مسلمانوں کے معاشی حالات کو درست کرنے کے لئے بھی یہ فریضہ تجارت کی ترغیب کا ایک بہترین ذریعہ ہے، کیونکہ ہر انسان جب یہ دیکھے گا کہ نقد سرمایہ کو بند رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ نفع تو کچھ ہوا نہیں، اور سال کے ختم پر چالیسواں حصہ کم ہو گیا، تو ضرور اس کو اس طرف توجہ کرنا پڑے گی کہ اس مال کو کسی تجارت میں لگائے، اور دوسری طرف چونکہ سود ہے، روپیہ چلانا حرام ٹھہرا تو تجارت کی یہ صورت نہ رہے گی کہ لاکھوں انسانوں کے سرمایہ سے صرف ایک انسان تجارت کرے بلکہ ہر مال دار خود تجارت میں آنے کی فکر کرے گا، اور جبکہ بڑے سرمایہ دار بھی صرف اپنے ہی سرمایہ سے تجارت کریں گے تو چھوٹے سرمایہ والوں کو تجارت میں وہ مشکلات پیش نہ آئیں گی جو بینکوں سے سودی روپیہ لے کر بڑی تجارت چلانے کی صورت میں پیش آتی ہیں، اس طرح پورے ملک میں تجارت اور اس کے منافع عام ہوں گے، اور اس کے نتیجہ میں ملک کے غرباء فقراء کو فائدہ پہنچے گا۔

سود کی روحانی بیماریاں

یہاں تک سود کی معاشی اور اقتصادی تباہ کاری کا ذکر تھا، اب سنئے کہ سودی کاروبار انسان کے اخلاق اور روحانی کیفیات پر کیسے خراب اثرات ڈالتا ہے۔

۱- انسانی اخلاق میں سب سے بڑا جو ہر ایثار و سخاوت کا ہے کہ خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو راحت پہنچانے کا جذبہ ہو، سود کے کاروبار کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ جذبہ فنا ہو جاتا ہے، سود خور اپنے پاس سے کسی کو نفع پہنچانا تو کیا، دوسرے کو اپنی کوشش اور اپنے سرمایہ سے اپنے برابر آتا نہیں دیکھ سکتا۔

۲- وہ مصیبت زدہ پر رحم کھانے کے بجائے اس کی مصیبت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی فکر میں رہتا ہے۔

۳- سود خوری کے نتیجہ میں مال کی حرص اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں مست ہو کر اپنے بھلے اور برے کو بھی نہیں پہچانتا،

اس کے انجام بد سے بالکل غافل ہو جاتا ہے۔

کیا سود کے بغیر کوئی تجارت نہیں چل سکتی؟

ربا کی حقیقت اور اس کی دینی و دنیوی خرابیوں کا بیان کسی قدر تفصیل سے آچکا ہے، اب تیسری بحث یہ باقی ہے کہ ربا کی معاشی اور روحانی خرابیاں اور قرآن و سنت میں اس کی شدید حرمت و ممانعت تو واضح ہوگئی، لیکن موجودہ دور میں جبکہ ربابہی تجارت کا رکن اعظم بنا ہوا ہے، ساری دنیا کے کاروبار اسی پر چل رہے ہیں، اس سے نجات حاصل کرنے کی تدبیر کیا ہے، بینک سسٹم کو ترک کر دینا اس زمانہ میں گویا تجارت کو بند کر دینا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب کوئی مرض عام ہو کر وبا کی صورت اختیار کر لے تو علاج معالجہ دشوار ضرور ہو جاتا ہے، لیکن بے کار نہیں ہوتا، اصلاح حال کی کوششیں انجام کار کامیاب ہوتی ہیں، البتہ صبر و استقلال اور ہمت سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے، قرآن کریم ہی میں اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے:-

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ * (الحج: ۷۸)

”یعنی اللہ تعالیٰ نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں ڈالی۔“

اس لئے ضرور ہے کہ ربا سے اجتناب کا کوئی ایسا راستہ ضرور ہوگا جس میں معاشی اور اقتصادی نقصان بھی نہ ہو، اندرونی اور بیرونی تجارت کے دروازے بھی بند نہ ہوں اور ربا سے نجات بھی ہو جائے۔

اس میں پہلی بات تو یہی ہے کہ سطحی نظر میں بینکنگ کے موجودہ اصول کو دیکھتے ہوئے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بینک سسٹم کا مدار ہی سود پر ہے، اس کے بغیر بینک چل ہی نہیں سکتے، لیکن یہ خیال قطعاً صحیح نہیں، ربا کے بغیر بھی بینک سسٹم اسی طرح قائم رہ سکتا ہے، بلکہ اس سے بہتر اور نافع و مفید صورت میں آسکتا ہے، البتہ اس کے لئے ضرورت ہے کہ کچھ حضرات ماہرین شریعت اور کچھ ماہرین بینک کے مشورہ اور تعاون سے اس کے اصول از سر نو تجویز کریں، تو کامیابی کچھ دور نہیں، اور جس دن بینک سسٹم شرعی اصول پر آگیا تو ان شاء اللہ دنیا دیکھ لے گی کہ اس میں پوری قوم و ملت کی کیسی فلاح ہے، ان اصول و قواعد کی تشریح کا یہ موقع نہیں، جن کی بنا پر بینک سسٹم کو بغیر ربا کے چلایا جاسکتا ہے۔

ربا اور سود کی ایک ضرورت کچھ تجارتی اغراض کے لئے ہوتی ہے، اس کا انتظام تو بینک کے موجودہ اصول میں ترمیم کے ذریعہ ہو جائے گا، اور دوسری ضرورت سود و ربا میں مبتلا ہونے کی فقیر و حاجت مند لوگوں کی ہنگامی اور وقتی

[۱] احقر نے چند علماء کے مشورے سے بے سود بینکاری کا مسودہ عرصہ ہوا تیار کر بھی دیا تھا، اور بینکاری کے بعض ماہرین نے موجودہ دور میں قابل عمل تسلیم بھی کر لیا تھا، اور بعض حضرات نے اس کو شروع بھی کرنا چاہا مگر ابھی تک عام تاجروں کی توجہ اس طرف نہ ہونے کے سبب اور حکومت کی طرف سے اس کو منظوری حاصل نہ ہونے کے سبب وہ چل نہیں سکا، فالی اللہ المشتکی - ۱۲ منہ

ضرورتیں ہوا کرتی ہیں، اس کا بہترین علاج اسلام میں پہلے سے بصورتِ زکوٰۃ و صدقات واجبہ موجود ہے، لیکن دین اور علم دین سے بے خبری اور بے پروائی کا نتیجہ ہے جس نے آج کل نظامِ زکوٰۃ کو بھی معطل کر دیا ہے، ان میں اکثر بڑے سرمایہ والے حضرات حساب کر کے پوری زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، اور جو لوگ پوری زکوٰۃ نکالتے بھی ہیں تو وہ بس زکوٰۃ کا نکالنا ہی جانتے ہیں کہ اپنی جیب سے نکال دیں، حالانکہ حکمِ الہی زکوٰۃ کے نکالنے کا نہیں بلکہ ادا کرنے کا ہے، اور ادا کرنا جب صحیح ہو سکتا ہے جب اس کے مستحقین کو پہنچا کر ان کو مال کا نہ قبضہ دے دیا جائے، اب غور کیجئے کہ ایسے مسلمان کتنے ہیں جو مستحقین کو تلاش کرنے کی فکر کریں، پھر ان کو پہنچانے کا اہتمام کریں، مسلمان قوم کتنی ہی کم سرمایہ سہی، لیکن اگر ہر مسلمان جس پر زکوٰۃ فرض ہے وہ زکوٰۃ پوری ادا کرے، اور ادا کرنے کا صحیح طریقہ اختیار کرے کہ مستحقین کو پہنچائے اور ادا کرنے کا اہتمام کرے، تو یقیناً کسی مسلمان کو اس کی ضرورت نہ رہے کہ وہ قرض کی ضرورت سے سود و ربا میں مبتلا ہو، اور اگر شرعی قاعدہ کے مطابق اسلامی حکومتِ عادلہ بن جائے اور اس کے تحت شرعی بیت المال قائم ہو جائے، اور تمام مسلمانوں کے اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ اس میں جمع ہوا کرے تو اس بیت المال سے ہر ایک ضرورت مند کی ضرورت پوری کی جاسکتی ہے، اور اس طرح بیکار پھرنے والوں کو چھوٹی دکانیں کرا کر، یا کسی صنعت میں لگا کر بھی کام میں لگایا جاسکتا ہے، کسی یورپین ماہر نے صحیح کہا کہ مسلمانوں کا نظامِ زکوٰۃ ایسی چیز ہے کہ اگر مسلمان اس کے پابند ہو جائیں تو اس قوم میں کوئی مفلس اور مصیبت زدہ نظر نہ آئے۔

الغرض اس زمانے میں سود و ربا کے معاملات و باکی طرح پھیل جانے سے یہ سمجھ بیٹھنا صحیح نہیں کہ موجودہ زمانہ میں سود کا کاروبار چھوڑ دینا معاشی و اقتصادی خودکشی کے مرادف ہے، اور اس زمانہ کا آدمی سودی کاروبار کرنے میں معذور ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ جب تک پوری قوم یا اس کی کوئی معتد بہ جماعت یا کوئی اسلامی حکومت پوری توجہ کے ساتھ اس کام کا تہیہ نہ کر لے افراد و احاد کے لئے دشواری ضرور ہے، مگر معذور پھر بھی نہیں کہا جاسکتا۔

اس وقت ہمارے اس بیان کے دو مقصد ہیں، اول یہ کہ مسلمانوں کی جماعتیں اور حکومتیں جو اس کام کو صحیح طور پر کر سکتی ہیں اس طرف متوجہ ہوں اور مسلمانوں کو بلکہ پوری دنیا کو سود کے منحوس اثرات سے نجات دلائیں۔

دوسرے یہ کہ کم از کم علم سب کا صحیح ہو جائے، مرض کو مرض تو سمجھنے لگیں، حرام کو حلال سمجھنے کا دوسرا گناہ جو پہلے گناہ سے زیادہ عظیم ہے، کم از کم اس کے تو مرتکب نہ ہوں، عملی گناہ تو میں کچھ نہ کچھ ظاہری فائدہ بھی ہے، لیکن یہ دوسرا علمی اور عقیدہ کا گناہ کہ اس کو حلال ثابت کرنے کی کوشش کی جائے، پہلے سے عظیم تر بھی ہے، اور لغو و فضول بھی، کیونکہ سود کو حرام سمجھنے اور اپنے گناہ کا اعتراف کرنے میں تو کوئی مالی نقصان بھی نہیں ہوتا، کوئی تجارت بھی بند نہیں ہوتی، ہاں اعترافِ جرم کا

نتیجہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ کسی وقت توبہ کی توفیق ہو جانے سے اس سے بچنے کی تدبیر سوچیں۔

اس وقت اسی مقصد کے پیش نظر آخر میں چند روایات حدیث اور ارشادات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی پیش کرتا ہوں جو انہی آیات قرآنی کا بیان ہے جن میں سود و ربا کی شدید ممانعت اور اس پر سخت عذاب کی وعیدیں آئی ہیں، تاکہ گناہ کے گناہ ہونے کا احساس تو بیدار ہو، اور اس سے بچنے کی فکر ہو، کم از کم یہ صورت تو نہ رہے کہ اس حرام کو حلال بنا کر ایک گناہ کے دو گناہ بنا لیں، اور بڑے بڑے صالح دین دار مسلمان جو رات کو تہجد اور ذکر اللہ میں گزاریں صبح جب دکان یا کارخانے میں پہنچیں تو انہیں یہ خیال بھی نہ آئے کہ ہم سود و قمار کے معاملات میں مبتلا ہو کر کچھ گناہ کر رہے ہیں۔

سود کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

۱- رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سات مہلک چیزوں سے بچو! صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا: یا رسول اللہ! وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا: ایک اللہ تعالیٰ کے ساتھ (عبادت میں یا اس کی مخصوص صفات میں) کسی غیر اللہ کو شریک کرنا، دوسرے جادو کرنا، تیسرے کسی شخص کو ناحق قتل کرنا، چوتھے سود کھانا، پانچویں یتیم کا مال کھانا، چھٹے جہاد کے وقت میدان سے بھاگنا، ساتویں کسی پاک دامن عورت پر تہمت باندھنا۔ (یہ حدیث صحیح بخاری اور مسلم میں ہے) [۱]

۲- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے آج رات دو شخصوں کو دیکھا جو میرے پاس آئے، اور مجھے بیت المقدس تک لے گئے، پھر ہم آگے چلے تو ایک خون کی نہر دیکھی، جس کے اندر ایک آدمی کھڑا ہوا ہے، اور دوسرا آدمی اس کے کنارے پر کھڑا ہے، جب یہ نہر والا آدمی اس سے باہر آنا چاہتا ہے تو کنارے والا آدمی اس کے منہ پر پتھر مارتا ہے، جس کی چوٹ سے بھاگ کر پھر وہ وہیں چلا جاتا ہے جہاں کھڑا تھا، پھر وہ نکلنے کا ارادہ کرتا ہے تو پھر یہ کنارے کا آدمی یہی معاملہ کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے اُن دونوں ساتھیوں سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے جو میں دیکھ رہا ہوں؟ انہوں نے بتلایا کہ خون کی نہر میں قید کیا ہوا آدمی سود کھانے والا (اپنے عمل کی سزا پا رہا ہے)۔ (یہ حدیث صحیح بخاری کتاب البیوع میں ہے) [۲]

۳- رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود لینے والے پر بھی لعنت فرمائی، اور سود دینے والے پر بھی، اور بعض روایات میں سودی معاملہ پر گواہی دینے والے اور اس کا وثیقہ لکھنے والے پر بھی لعنت آئی ہے۔

[۱] صحیح البخاری، کتاب المحاربین من اهل الکفر والردّة، باب رمی المحصنات ج: ۲، ص: ۱۰۱۳، وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الکبائر

واکبرها ج: ۱، ص: ۶۳

[۲] صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب اکل الربا... إلخ ج: ۱، ص: ۲۷۹، ۲۸۰

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں فرمایا کہ یہ سب گناہ میں برابر ہیں۔ اور بعض روایات میں شاہد و کاتب پر لعنت اس صورت میں ہے جبکہ ان کو اس کا علم ہو کہ یہ سود کا معاملہ ہے۔

۴- اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ چار آدمی ایسے ہیں کہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ ان کو جنت میں نہ داخل کرے، اور جنت کی نعمت نہ چکھنے دے، وہ چار یہ ہیں: ۱- شراب پینے کا عادی، ۲- اور سود کھانے والا، ۳- اور یتیم کا مال ناحق کھانے والا، ۴- اور اپنے والدین کی نافرمانی کرنے والا۔ (یہ روایت مستدرک حاکم میں ہے) [۱]

۵- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی جو سود کا ایک درہم کھاتا ہے وہ چھتیس مرتبہ بدکاری کرنے سے زیادہ سخت گناہ ہے، اور بعض روایات میں ہے کہ جو گوشت مال حرام سے بنا ہو، اس کے لئے آگ ہی زیادہ مستحق ہے۔ اسی کے ساتھ بعض روایات میں ہے کہ کسی مسلمان کی آبروریزی سود سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے۔ (یہ روایت مسند احمد، طبرانی وغیرہ میں ہے) [۲]

۶- اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ پھل کو قابل استعمال ہونے سے پہلے فروخت کیا جائے، اور فرمایا کہ جب کسی بستی میں بدکاری اور سود کا کاروبار پھیل جائے تو اس نے اللہ تعالیٰ کے عذاب کو اپنے اوپر دعوت دے دی۔ (یہ روایت مستدرک حاکم میں ہے) [۳]

۷- اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی قوم میں سود کے لین دین کا رواج ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان پر ضروریات کی گرانی مسلط کر دیتا ہے، اور جب کسی قوم میں رشوت عام ہو جائے تو دشمنوں کا رعب و غلبہ ان پر ہو جاتا ہے۔ (یہ روایت مسند احمد میں ہے) [۴]

۸- اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شبِ معراج میں جب ہم ساتویں آسمان پر پہنچے تو میں نے اپنے اوپر رعد و برق کو دیکھا، اس کے بعد ہم ایک ایسی قوم پر گزرے جن کے پیٹ رہائشی مکانات کی طرح پھولے اور پھیلے ہوئے ہیں، جن میں سانپ بھرے ہیں جو باہر سے نظر آ رہے ہیں، میں نے جبریل امینؑ سے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ یہ سود خور ہیں۔ (یہ روایت مسند احمد کی ہے) [۵]

[۱] صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب الربا، ج: ۱، ص: ۲۷

[۲] مستدرک رقم الحدیث: ۲۲۲۰

[۳] مسند احمد رقم الحدیث: ۲۰۹۵۱، المعجم الكبير للطبرانی رقم الحدیث: ۱۱۰۵۳

[۴] مستدرک حاکم رقم الحدیث: ۲۲۶۱

[۵] مسند احمد رقم الحدیث: ۱۷۱۵۵

[۶] مسند احمد رقم الحدیث: ۸۲۸۶

- ۹- اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عوف بن مالک سے فرمایا کہ ان گناہوں سے بچو جو معاف نہیں کئے جاتے، ان میں سے ایک مالِ غنیمت کی چوری ہے اور دوسرے سود کھانا۔ (طبرانی) ^[۱]
- ۱۰- اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو تم نے قرض دیا ہو اس کا ہدیہ بھی قبول نہ کرو۔ (ایسا نہ ہو، اس نے یہ ہدیہ قرض کے عوض میں دیا ہو، جو سود ہے، اس لئے اس کے ہدیہ قبول کرنے سے بھی احتیاط چاہئے)۔
- ربا کی تعریف اور اس کی حقیقت اور اس کی دنیوی تباہ کاریوں کے متعلق قرآن مجید کی سات آیتیں اور احادیثِ نبویہ کے دس ارشادات اس جگہ بیان ہو چکے ہیں، سوچنے سمجھنے والے مسلمان کے لئے اتنا کافی ہے، اور اس مسئلے کے باقی ماندہ پہلوؤں پر بحث اور مکمل تحقیق کے لئے احقر کی ایک مستقل کتاب بنام ”مسئلہ سود“ شائع ہو چکی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَيْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ^ط

اے ایمان والو! جب تم آپس میں معاملہ کرو اُدھار کا کسی وقت مقررہ تک تو اس کو لکھ لیا کرو،

وَلْيَكْتُبَ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ^ص وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا

اور چاہئے کہ لکھ دے تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف سے، اور انکار نہ کرے لکھنے والا اس سے کہ لکھ دیوے جیسا

عَلَيْهِ اللَّهُ فَلْيَكْتُبْ ^ج وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ

سکھایا اس کو اللہ نے سو اس کو چاہئے کہ لکھ دے اور بتلاتا جاوے وہ شخص کہ جس پر قرض ہے اور ڈرے اللہ سے جو اس کا رب ہے

وَلَا يَبْخَسُ مِنْهُ شَيْئًا ^ط فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا

اور کم نہ کرے اس میں سے کچھ، پھر اگر وہ شخص کہ جس پر قرض ہے بے عقل ہے یا ضعیف ہے

أَوْ لَا يَسْطِيعُ أَنْ يُمْلِئَ ^ط هُوَ فَلْيُمْلِئْ وَلِيَّهُ بِالْعَدْلِ ^ط وَاسْتَشْهِدُوا

یا آپ نہیں بتلا سکتا تو بتلا دے کار گزار اس کا انصاف سے، اور گواہ کرو

۱ المعجم الكبير للطبرانی رقم الحديث: ۱۳۵۳۷

۲ شعب الإيمان للبيهقي رقم الحديث: ۵۲۹۱

شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ ۚ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتُنِ

دو شاہد اپنے مردوں میں سے، پھر اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں

مَنْ تَرَضَوْنَ مِنَ الشَّهَادَةِ أَنْ تَصِلَ أَحَدُهُمَا فِتْنًا كَرِاحُهَا

ان لوگوں میں سے کہ جن کو تم پسند کرتے ہو گواہوں میں، تاکہ اگر بھول جائے ایک اُن میں سے تو یاد دلا دے اس کو

الْأُخْرَى ۖ وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا ۗ وَلَا تَسْمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ

دوسری، اور انکار نہ کریں گواہ جس وقت بلائے جاویں، اور کاہلی نہ کرو اس کے لکھنے سے

صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ

چھوٹا ہو معاملہ یا بڑا اس کی میعاد تک، اس میں پورا انصاف ہے اللہ کے نزدیک اور بہت درست رکھنے والا ہے گواہی کو

وَأَدْنَىٰ ۖ أَلَا تَرْتَابُونَ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ

اور نزدیک ہے کہ شبہ میں نہ پڑو مگر یہ کہ سودا ہو ہاتھوں ہاتھ لیتے دیتے رہو اس کو آپس میں

فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا ۚ وَأَشْهَدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ

تو تم پر کچھ گناہ نہیں اگر اس کو نہ لکھو، اور گواہ کر لیا کرو جب تم سودا کرو،

وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ۚ وَإِنْ تَفَعَّلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ ۚ وَاتَّقُوا

اور نقصان نہ کرے لکھنے والا اور نہ گواہ اور اگر ایسا کرو تو یہ گناہ کی بات ہے تمہارے اندر، اور ڈرتے رہو

اللَّهَ ۚ وَيَعْلَمُ اللَّهُ ۚ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝۲۸۲ وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ

اللہ سے اور اللہ تم کو سکھلاتا ہے اور اللہ ہر ایک چیز کو جانتا ہے۔ اور اگر تم سفر میں ہو

وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهْنَ مَقْبُوضَهُ^ط فَإِنْ آمَنْ بِعُضُكُم بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ

اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو گرو ہاتھ میں رکھنی چاہئے، پھر اگر اعتبار کرے ایک دوسرے کا تو چاہئے کہ پورا کرے

الَّذِي أُوتِيَ اٰمَانَتَهُ وَلِيَّتِي اللّٰهُ رَبَّهُ^ط وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ^ط

وہ شخص کہ جس پر اعتبار کیا اپنی امانت کو اور دُرتا رہے اللہ سے جو رُب ہے اس کا، اور مت چھپاؤ گواہی کو

وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَاِنَّهٗ اِشْمٌ قُلْبُهُ^ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ^ع

اور جو شخص اس کو چھپا دے تو بے شک گنہگار ہے دل اس کا، اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب جانتا ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

اے ایمان والو! جب تم کسی معین میعاد کے لئے اُدھار کا کوئی معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو، اور تم میں سے جو شخص لکھنا جانتا ہو انصاف کے ساتھ تحریر لکھے، اور جو شخص لکھنا جانتا ہو، لکھنے سے انکار نہ کرے۔ جب اللہ نے اسے یہ علم دیا ہے تو اسے لکھنا چاہئے۔ اور تحریر وہ شخص لکھوائے جس کے ذمے حق واجب ہو رہا ہو، اور اسے چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈرے جو اس کا پروردگار ہے اور اس (حق) میں کوئی کمی نہ کرے۔ ہاں اگر وہ شخص جس کے ذمے حق واجب ہو رہا ہے نا سمجھ یا کمزور ہو یا (کسی اور وجہ سے) تحریر نہ لکھوا سکتا ہو تو اس کا سرپرست انصاف کے ساتھ لکھوائے۔ اور اپنے میں سے دو مردوں کو گواہ بنا لو، ہاں اگر دو مرد موجود نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان گواہوں میں سے ہو جائیں جنہیں تم پسند کرتے ہو، تاکہ اگر ان دو عورتوں میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ اور جب گواہوں کو (گواہی دینے کے لئے) بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔ اور جو معاملہ اپنی میعاد سے وابستہ ہو، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اسے لکھنے سے اُکتاؤ نہیں۔ یہ بات اللہ کے نزدیک زیادہ قرین انصاف اور گواہی کو درست رکھنے کا بہتر ذریعہ ہے، اور اس بات کی قرینی ضمانت ہے کہ تم آئندہ شک میں نہیں پڑو گے۔ ہاں اگر تمہارے درمیان کوئی نقد لین دین کا سودا ہو تو اس کو نہ لکھنے میں تمہارے لئے کچھ حرج نہیں ہے۔ اور جب خرید و فروخت کرو تو گواہ بنا لیا کرو۔ اور نہ لکھنے والے کو کوئی تکلیف پہنچائی جائے، نہ گواہ کو۔ اور اگر ایسا کرو گے تو یہ تمہاری طرف سے نافرمانی ہوگی۔ اور اللہ کا خوف دل میں رکھو۔ اللہ تمہیں تعلیم دیتا ہے، اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ (۲۸۳) اور اگر تم سفر پر ہو اور تمہیں کوئی لکھنے والا نہ ملے تو (ادائیگی کی ضمانت کے طور پر) رہن قبضے میں رکھ لئے جائیں۔ ہاں اگر تم ایک

دوسرے پر بھروسہ کرو تو جس پر بھروسہ کیا گیا ہے وہ اپنی امانت ٹھیک ٹھیک ادا کرے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا پروردگار ہے۔ اور گواہی کو نہ چھپاؤ۔ اور جو گواہی کو چھپائے وہ گنہگارِ دل کا حامل ہے۔ اور جو عمل بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے۔ (۷۸۳)

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو! جب معاملہ کرنے لگو اُدھار کا (خواہ دام اُدھار ہوں یا جو چیز خریدنا ہے وہ اُدھار ہو جیسے بیعِ سلم میں) ایک میعادِ معین تک (کے لئے) تو اس (کی یادداشت و دستاویز) کو لکھ لیا کرو اور یہ ضرور ہے کہ تمہارے آپس میں (جو) کوئی لکھنے والا (ہو وہ) انصاف کے ساتھ لکھے (یعنی کسی کی رعایت کر کے مضمون میں کمی بیشی نہ کرے) اور لکھنے والا لکھنے سے انکار بھی نہ کرے جیسا کہ خدا نے اس کو (لکھنا) سکھایا ہے، اس کو چاہئے کہ لکھ دیا کرے اور (کاتب کو) وہ شخص (بتلا دے اور) لکھوادے جس کے ذمہ وہ حق واجب ہو (کیونکہ دستاویز کا حاصل اقرار حق کا ہوتا ہے تو جس کے ذمہ حق ہے اسی کا اقرار ضرور ٹھہرا) اور (لکھاتے وقت) اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرتا رہے اور اس (حق) میں سے ذرہ برابر (بتلانے میں) کمی نہ کرے، پھر جس شخص کے ذمہ حق واجب تھا وہ اگر ضعیف العقل (یعنی معتوہ یا مجنون) ہو یا ضعیف البدن (یعنی نابالغ یا پیر فرقت) ہو یا (اور کسی اتفاقی امر سے) خود (بیان کرنے کی اور) لکھانے کی قدرت نہ رکھتا ہو (مثلاً گونگا ہے اور لکھنے والا اس کا اشارہ نہیں سمجھتا، یا مثلاً دوسرے ممالک کا رہنے والا ہے اور زبان غیر رکھتا ہے اور لکھنے والا اس کی بولی نہیں سمجھتا) تو (ایسی حالت میں) اس کا کارکن ٹھیک ٹھیک طور پر لکھوادے، اور دو شخصوں کو اپنے مردوں میں سے گواہ (بھی) کر لیا کرو اور (شرعاً اصل مدارِ ثبوتِ دعویٰ کا یہی گواہ ہیں، گو دستاویز نہ ہو، اور خالی دستاویز بدون گواہوں کے ایسے معاملات میں حجت اور معتبر نہیں، دستاویز لکھنا صرف یادداشت کی آسانی کے لئے رہے کہ اس کا مضمون دیکھ کر اور سن کر طبعی طور پر اکثر تمام واقعہ یاد آ جاتا ہے، جیسا عنقریب قرآن ہی میں آتا ہے) پھر اگر وہ دو گواہ مرد (میسر) نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں (گواہ بنائی جائیں) ایسے گواہوں میں سے جن کو تم (ان کے معتبر ہونے کی وجہ سے) پسند کرتے ہو (اور ایک مرد کی جگہ دو عورتیں اس لئے تجویز کی گئیں) تاکہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی ایک بھی (شہادت کے کسی حصہ کو خواہ ذہن سے یا شہادت کے وقت بیان کرنے سے) بھول جائے تو ایک دوسری کو یاد دلا دے (اور یاد دلانے کے بعد شہادت کا مضمون مکمل ہو جائے)، اور گواہ بھی انکار نہ کیا کریں جب (گواہ بننے کے لئے) بلائے جایا کریں (کہ اس میں اعانت ہے اپنے بھائی کی) اور تم اس (دین) کے (بار بار) لکھنے سے اکتیا مت کرو خواہ وہ (معاملہ دین کا) چھوٹا ہو یا بڑا ہو، یہ لکھ لینا انصاف کا زیادہ قائم رکھنے والا ہے اللہ کے نزدیک اور شہادت کا زیادہ درست رکھنے والا ہے، اور زیادہ سزاوار ہے اس

بات کا کہ تم (معاملہ کے متعلق) کسی شبہ میں نہ پڑو (اس لئے لکھ ہی لینا اچھا ہے) مگر یہ کہ کوئی سودا دست بدست ہو جس کو باہم لیتے دیتے ہو تو اس کے نہ لکھنے میں تم پر کوئی الزام (اور مضرت) نہیں اور (اتنا اس میں بھی ضرور کیا کرو کہ اس کے) خرید و فروخت کے وقت گواہ کر لیا کرو (شاید کل کو کوئی بات نکل آئے مثلاً بائع کہنے لگے کہ مجھ کو دام ہی وصول نہیں ہوئے، یا یہ چیز میں نے فروخت ہی نہیں کی، یا مشتری کہنے لگے کہ میں نے تو واپسی کا اختیار بھی لے لیا تھا، یا ابھی تو بیع پوری میرے پاس نہیں پہنچی) اور (جس طرح ہم نے اوپر کاتب اور گواہ کو منع کیا ہے کہ کتابت اور شہادت سے انکار نہ کریں اسی طرح ہم تم کو بھی تاکید کرتے ہیں کہ تمہاری طرف سے) کسی کاتب کو تکلیف نہ دی جائے اور نہ کسی گواہ کو (مثلاً اپنی مصلحت کے لئے ان کی کسی مصلحت میں خلل ڈالا جائے) اور اگر تم ایسا کرو گے تو اس میں تم کو گناہ ہوگا اور خدا تعالیٰ سے ڈرو (اور جن کاموں سے اس نے منع کیا ہے وہ مت کرو) اور اللہ تعالیٰ (کا تم پر احسان ہے کہ) تم کو (احکام مفیدہ کی) تعلیم فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں کے جاننے والے ہیں (تو وہ مطیع اور عاصی کو بھی جانتے ہیں کہ ہر ایک کو مناسب جزا دیں گے) اور اگر تم (دین کا معاملہ کرانے کے وقت) کہیں سفر میں ہو اور (دستاویز لکھنے کے واسطے وہاں) کوئی کاتب نہ پاؤ سو (ایسی حالت میں اطمینان کا ذریعہ) رہن رکھنے کی چیزیں (ہیں) جو (مدیون کی طرف سے صاحب حق کے) قبضہ میں دے دی جائیں اور اگر (ایسے وقت میں بھی) ایک دوسرے کا اعتبار کرتا ہو (اور اس لئے رہن کی ضرورت نہ سمجھے) تو جس شخص کا اعتبار کر لیا گیا ہے (یعنی مدیون) اس کو چاہئے کہ دوسرے کا حق (پورا پورا) ادا کر دے اور اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرے (اور اس کا حق نہ مارے) اور شہادت کا اخفا مت کرو اور جو شخص اس کا اخفا کرے گا اس کا قلب گنہگار ہوگا، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں کو خوب جانتے ہیں (سوا اگر کوئی اخفا کرے گا اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ضرور ہے، سو وہ سزا دیں گے)۔

معارف مسائل

قرض اور ادھار کے لئے اقرار نامہ لکھنے کی ہدایت اور متعلقہ احکام

آیات مذکورہ میں قانون معاملات جن کو آج کل کے قانون میں معاہدات کہا جاتا ہے اس کے اہم اصول کا بیان ہے اور اس کے بعد ضابطہ شہادت کے خاص اصول کا ذکر ہے۔

آج کل تو زمانہ لکھنے لکھانے کا ہے، اور تحریر ہی انسان کی زبان کی قائم مقام بن گئی ہے، لیکن آپ چودہ سو سال پہلے زمانہ کی طرف مڑ کر دیکھئے تو اس وقت دنیا کا سب کاروبار صرف زبانی ہوتا تھا، لکھنے لکھانے اور دستاویز مہیا کرنے کا اصول نہ تھا، سب سے پہلے قرآن نے اس طرف توجہ دلائی اور فرمایا:-

اِذَا تَدَايَيْتُمْ بِدِيْنٍ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاَكْتَبُوْهُ ۝۱۷۱ یعنی ”جب تم آپس میں اُدھار کا معاملہ کیا کرو کسی معین مدت کے لئے تو اس کو لکھ لیا کرو۔“

اس میں ایک اصول تو یہ بتلادیا کہ اُدھار کے معاملات کی دستاویز لکھنی چاہئے، تاکہ بھول چوک یا انکار کے وقت کام آئے۔

دوسرا مسئلہ یہ بیان فرمایا گیا کہ اُدھار کا معاملہ جب کیا جائے تو اس کی میعاد ضرور مقرر کی جائے، غیر معین مدت کے لئے اُدھار دینا لینا جائز نہیں، کیونکہ اس سے جھگڑے فساد کا دروازہ کھلتا ہے، اسی وجہ سے فقہاء نے فرمایا کہ میعاد بھی ایسی مقرر ہونا چاہئے جس میں کوئی ابہام نہ ہو، مہینہ اور تاریخ کے ساتھ معین کی جائے، کوئی مبہم میعاد نہ رکھیں، جیسے کھیتی کٹنے کے وقت، کیونکہ وہ موسم کے اختلاف سے آگے پیچھے ہو سکتا ہے، اور چونکہ لکھنا اس زمانے میں عام نہ تھا، اور آج بھی عام ہونے کے بعد دنیا کی بیشتر آبادی وہی ہے جو لکھنا نہیں جانتی تو یہ ممکن تھا کہ لکھنے والا کچھ کا کچھ لکھ دے، جس سے کسی کا نفع اور کسی کا نقصان ہو جائے، اس لئے اس کے بعد ارشاد فرمایا:-

وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۝۱۷۲ یعنی ”یہ ضروری ہے کہ تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔“ اس میں ایک تو اس طرف ہدایت کی گئی کہ کاتب کسی فریق کا مخصوص آدمی نہ ہو، بلکہ غیر جانب دار ہو، تاکہ کسی کو شبہ اور خلجان نہ رہے۔ دوسرے کاتب کو ہدایت کی گئی کہ انصاف کے ساتھ لکھے، دوسرے کے فانی نفع کے لئے اپنا دائمی نقصان نہ کرے۔ اس کے بعد کاتب کو اس کی ہدایت کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ ہنر دیا ہے کہ وہ لکھ سکتا ہے اس کا شکرانہ یہ ہے کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔

اس کے بعد یہ بتلایا گیا کہ دستاویز کی کتابت کس کی طرف سے ہو تو فرمایا:-

وَيُمْلِئِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ ۝۱۷۳ یعنی ”لکھوادے وہ آدمی جس کے ذمہ حق ہے“ مثلاً سودا خریدا اور قیمت کا اُدھار کیا تو جس شخص کے ذمہ اُدھار ہے وہ دستاویز کا مضمون لکھوادے کیونکہ یہ اس کی طرف سے اقرار نامہ ہوگا، اور لکھوانے میں بھی یہ احتمال تھا کہ کوئی کمی بیشی کر دے، اس لئے فرمایا: وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ۝۱۷۴ یعنی ”اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرتا رہے اور حق کے لکھوانے میں ذرہ برابر کمی نہ کرے۔“ معاملات میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس شخص پر حق عائد ہو وہ خفیف العقل یا سٹھیا ہوا بوڑھا، یا نابالغ بچہ یا گونگا ہو، یا کوئی دوسری زبان بولنے والا ہو جس کو کاتب نہیں سمجھتا، اس لئے دستاویز لکھوانے پر اس کو قدرت نہیں ہوتی، اس لئے اس کے بعد فرمایا کہ اگر ایسی صورت پیش آئے تو ان کی طرف سے ان کا ولی لکھوادے۔ مجنون اور نابالغ کی طرف سے تو ولی کا ہونا ظاہر ہے کہ ان کے سارے معاملات ولی ہی کی معرفت ہوا کرتے ہیں، اور گونگے یا دوسری زبان بولنے والے کا ولی بھی یہ کام کر سکتا ہے، اور اگر وہ کسی کو اپنا وکیل بنادے تو بھی ہو سکتا

ہے، قرآن میں اس جگہ لفظ ”ولی“ دونوں معنی پر حاوی ہے۔

ضابطہ شہادت کے چند اہم اصول

یہاں تک معاملات میں دستاویز لکھنے اور لکھوانے کے اہم اصول کا بیان تھا، آگے یہ بتلایا گیا کہ دستاویز کی صرف تحریر کو کافی نہ سمجھیں، بلکہ اس پر گواہ بھی بنالیں کہ اگر کسی وقت باہمی نزاع پیش آجائے تو عدالت میں ان گواہوں کی گواہی سے فیصلہ ہو سکے، یہی وجہ ہے کہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ محض تحریر حجت شرعی نہیں، جب تک کہ اس پر شہادت شرعی موجود نہ ہو خالی تحریر پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، آج کل کی عام عدالتوں کا بھی یہی دستور ہے کہ تحریر پر زبانی تصدیق و شہادت کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتیں۔

گواہی کے لئے دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا ضروری ہیں

اس کے بعد ضابطہ شہادت کے چند اہم اصول بتلائے گئے، مثلاً:-

۱- گواہ دو مرد یا ایک مرد و دو عورتیں ہونا ضروری ہیں، ایک اکیلا مرد یا صرف دو عورتیں عام معاملات کی گواہی کے لئے کافی نہیں۔

گواہوں کی شرائط

۲- دوسرے یہ کہ گواہ مسلمان ہوں، لفظ **مِنْ رِّجَالِكُمْ** میں اس کی طرف ہدایت کی گئی ہے۔

۳- تیسرے یہ کہ گواہ ثقہ اور عادل ہوں، جن کے قول پر اعتماد کیا جاسکے، فاسق و فاجر نہ ہوں، **وَمَنْ تَرَضَوْنَ مِنْ** الشَّهَدَاءِ میں یہ حکم مذکور ہے۔

گواہی دینے سے بلا عذر شرعی انکار کرنا گناہ ہے

اس کے بعد لوگوں کو یہ ہدایت کی گئی کہ جب ان کو کسی معاملہ میں گواہ بنانے کے لئے بلایا جائے تو وہ آنے سے انکار نہ کریں، کیونکہ شہادت ہی احیائے حق کا ذریعہ اور جھگڑے چکانے کا طریقہ ہے، اس لئے اس کو اہم قومی خدمت سمجھ کر تکلیف برداشت کریں۔ اس کے بعد پھر معاملات کی دستاویز لکھنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا سب کو لکھنا چاہئے، اس میں اکتائیں نہیں، کیونکہ معاملات کا قلم بند کر لینا انصاف کو قائم رکھنے اور صحیح شہادت دینے اور شک و شبہ سے بچنے کے لئے بہترین ذریعہ ہے، ہاں اگر کوئی معاملہ دست بدست ہو، ادھار نہ ہو، اس کو اگر نہ لکھیں تب بھی کچھ حرج نہیں، مگر اتنا اس میں بھی کیا جائے کہ معاملہ پر گواہ بنالیں کہ شاید کسی وقت فریقین میں کوئی نزاع و اختلاف پیش آجائے،

مثلاً بائع کہے کہ قیمت وصول نہیں ہوئی، یا مشتری کہے کہ مجھے بیع پوری وصول نہیں ہوئی، تو اس جھگڑے کے فیصلہ میں شہادت کام آئے گی۔

اسلام میں عدل و انصاف قائم کرنے کا اہم اُصول کہ گواہوں کو کوئی نقصان یا تکلیف نہ پہنچے

آیت کے شروع میں لکھنے والوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ لکھنے یا شاہد بننے سے انکار نہ کریں، تو یہاں یہ احتمال تھا کہ لوگ ان کو پریشان کریں گے، اس لئے آخر آیت میں فرمایا: **وَلَا يُضَارُّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ** یعنی ”کسی لکھنے والے یا گواہی دینے والے کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔“ یعنی ایسا نہ کریں کہ اپنی مصلحت اور فائدہ کے لئے اُن کی مصلحت اور فائدے میں خلل ڈالیں، پھر فرمایا: **وَأَنْ تَفْعَلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ** یعنی ”اگر تم نے لکھنے والے یا گواہ کو نقصان پہنچایا تو اس میں تم کو گناہ ہوگا۔“

اس سے معلوم ہوا کہ لکھنے والے یا گواہ کو نقصان پہنچانا حرام ہے، اسی لئے فقہاء نے فرمایا کہ اگر لکھنے والا اپنے لکھنے کی مزدوری مانگے یا گواہ اپنی آمدورفت کا ضروری خرچ طلب کرے تو یہ اس کا حق ہے، اس کو ادا نہ کرنا بھی اس کو نقصان پہنچانے میں داخل اور ناجائز ہے۔ اسلام نے اپنے نظام عدالت میں جس طرح گواہ کو گواہی دینے پر مجبور کیا ہے، اور گواہی چھپانے کو سخت گناہ قرار دیا ہے، اس طرح اس کا بھی انتظام کیا کہ لوگ گواہی سے بچنے پر مجبور نہ ہو جائیں، اسی دو طرفہ احتیاط کا یہ اثر تھا کہ ہر معاملہ میں سچے بے غرض گواہ مل جاتے اور فیصلے جلد اور آسان، حق کے مطابق ہو جاتے۔ آج کی دنیا نے اس قرآنی اُصول کو نظر انداز کر دیا ہے تو سارا نظام عدالت برباد ہو گیا، واقعہ کے اصلی اور سچے گواہ ملنا تقریباً مفقود ہو گیا، ہر شخص گواہی سے جان چرانے پر مجبور ہو گیا، وجہ یہ کہ جس کا نام گواہی میں آ گیا اگر معاملہ پولیس اور فوجداری کا ہے تو روزِ وقت بے وقت تھانیدار صاحب اس کو بلا بھیجتے ہیں، اور بعض اوقات گھنٹوں بٹھائے رکھتے ہیں، دیوانی عدالتوں میں بھی گواہ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جاتا ہے جیسے یہ کوئی مجرم ہے، پھر روزِ روز مقدمہ کی پیشیاں بدلتی ہیں، تاریخیں لگتی ہیں، گواہ بچارہ اپنا کاروبار اور مزدوری اور ضروریات چھوڑ کر آنے پر مجبور ہے، ورنہ وارنٹ کے ذریعے گرفتار کیا جائے، اس لئے کوئی شریف کاروباری آدمی کسی معاملہ کا گواہ بننا اپنے لئے ایک عذاب سمجھنے اور مقدور بھر اس سے بچنے پر مجبور کر دیا گیا، صرف پیشہ ور گواہ ملتے ہیں، جن کے ہاں جھوٹ سچ میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا، قرآن حکیم نے ان بنیادی ضروریات کو اہمیت کے ساتھ بتلا کر ان تمام خرابیوں کا انسداد فرمایا، آیت کے آخر میں ارشاد ہے: **وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ وَيَعْلَمُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ** (۲۸۳) یعنی ”دُرُو اللہ سے، اور اللہ تعالیٰ تمہیں اُصولِ صحیحہ کی تعلیم دیتا ہے (یہ اس کا احسان ہے)، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔“

چونکہ اس آیت میں بہت سے احکام آئے ہیں، بعض فقہاء نے بیس اہم مسائل فقہی اس آیت سے نکالے ہیں، اور قرآن کریم کی عام عادت ہے کہ قانون بیان کرنے سے آگے اور پیچھے خوفِ خدا اور خوفِ روزِ جزا دلا کر لوگوں کے ذہنوں کو تعمیلِ حکم کے لئے آمادہ کرتا ہے، اسی طریقہ کے مطابق اس آیت کا خاتمہ خوفِ خداوندی پر کیا اور یہ بتلایا کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں، اگر تم کسی ناجائز حیلہ سے بھی کوئی خلاف ورزی کرو گے تو خدا کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔

دوسری آیت میں دو اہم مضمون بیان فرمائے گئے، ایک یہ کہ اُدھار کے معاملہ میں اگر کوئی یہ چاہے کہ اعتماد کے لئے کوئی چیز گروی رکھ لے تو اس کی بھی اجازت ہے، مگر اس میں لفظ **مَقْبُوضَةٌ** سے اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ شئی مرہونہ سے نفع اٹھانا اس کے لئے جائز نہیں، مرہن کو صرف اتنا حق ہے کہ اپنے قرض وصول ہونے تک اس کی چیز پر اپنا قبضہ رکھے، اور منافع اس کے وہ سب اصل مالک کا حق ہیں۔

دوسرا مضمون یہ ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو کسی نزاعی معاملہ کا صحیح علم ہو وہ شہادت کو نہ چھپائے، اور اگر اس نے چھپایا تو اس کا دل گنہگار ہے، دل کو اس لئے گنہگار فرمایا کہ کوئی شخص اس کو خالی زبان ہی کا گناہ نہ سمجھے، کیونکہ اول ارادہ تو دل ہی سے ہوا ہے، اس لئے اول گناہ دل ہی کا ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۖ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ

اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اگر ظاہر کرو گے اپنے جی کی بات یا

تَخْفَوْهُ يَحْسِبْكُمْ بِهٖ اللّٰهُ ۖ فَيَغْفِرْ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيُعَذِّبْ مَنْ يَّشَاءُ ۖ

چھپاؤ گے اس کو، حساب لے گا اس کا تم سے اللہ، پھر بخشے گا جس کو چاہے اور عذاب کرے گا جس کو چاہے،

وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۸۴

اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

آسان ترجمہ قرآن

جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ اور جو باتیں تمہارے دلوں میں ہیں، خواہ تم ان کو ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تم سے ان کا حساب لے گا۔ پھر جس کو چاہے گا معاف کر دے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا۔ اور

اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ (۱۸۲)

خلاصہ تفسیر

اللہ ہی کی ملک میں ہیں سب (مخلوقات) جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں، (جیسے خود زمین و آسمان بھی اسی کی ملک میں ہیں) اور (جب وہ مالک ہیں تو ان کو اپنی مملوکہ اشیاء میں ہر طرح قانون بنانے کا حق ہے، اس میں کسی کو مجال کلام نہ ہونی چاہئے، جیسا کہ ایک قانون یہ ہے کہ) جو باتیں (عقائد فاسدہ یا اخلاق مذمومہ یا گناہوں پر پختہ عزم و ارادہ کی) تمہارے نفسوں میں ہیں، ان کو اگر تم (زبان و جوارح سے) ظاہر کرو گے (مثلاً زبان سے کلمہ کفر کہہ دیا، یا اپنے تکبر، حسد وغیرہ کا خود اظہار کر دیا، یا کسی گناہ جس کا قصد تھا اس کو کر ہی ڈالا) یا کہ (دل ہی میں) پوشیدہ رکھو گے (دونوں حالتوں میں) حق تعالیٰ تم سے (مثلاً دوسرے معاصی کے ان کا) حساب لیں گے (پھر حساب لینے کے بعد بجز کفر و شرک کے) جس کے لئے (بخشنا) منظور ہوگا، بخش دیں گے، اور جس کو (سزا دینا) منظور ہوگا سزا دیں گے، اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔

معارف و مسائل

پہلی آیت میں شہادت کے اظہار کا حکم اور چھپانے کی ممانعت مذکور تھی، یہ آیت بھی اسی مضمون کا تکملہ ہے، اس میں انسان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ شہادت کا چھپانا حرام ہے، اگر تم نے معاملہ کو جانتے ہوئے چھپایا تو ربِّ علیم و خیر تم سے اس کا حساب لے گا، حضرت ابن عباسؓ، عکرمہؓ، شعبیؓ اور مجاہدؓ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ (قرطبی)

اور عموم الفاظ کے اعتبار سے عام ہے، اور تمام اعتقادات، عبادات اور معاملات کو شامل ہے، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا مشہور قول اس آیت کی تفسیر میں یہی ہے، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ حق تعالیٰ اپنی مخلوق کے تمام اعمال کا محاسبہ فرمائیں گے، وہ عمل بھی جس کو وہ کر گزرے ہیں، اور وہ بھی جن کا دل سے پختہ ارادہ کر لیا، اور اس کو دل میں چھپا کر رکھا، مگر عمل کی نوبت نہیں آئی، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت ابن عمرؓ منقول ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ مؤمن قیامت کے روز اپنے ربِّ عز و جل و علی سے قریب کیا جائے گا یہاں تک کہ حق تعالیٰ اس کے ایک ایک گناہ کو یاد دلائیں گے، اور سوال کریں گے کہ تو جانتا ہے کہ تو نے یہ گناہ کیا تھا، بندہ مؤمن اقرار کرے گا، حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے دنیا میں بھی تیری پردہ پوشی کی، اور تیرا گناہ لوگوں میں ظاہر نہیں ہونے دیا، اور میں آج اس کو معاف کرتا

ہوں، اور حسنات کا اعمال نامہ اس کو دے دیا جائے گا، لیکن کفار اور منافقین کے گناہوں کو مجمع عام میں بیان کیا جائے گا۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا کہ یہ وہ دن ہے جس میں پوشیدہ چیزوں کا جائزہ لیا جائے گا، اور دلوں کے پوشیدہ راز کھولے جائیں گے، اور یہ کہ میرے کاتب اعمال فرشتوں نے تو تمہارے صرف وہ اعمال لکھے ہیں جو ظاہر تھے، اور میں اُن چیزوں کو بھی جانتا ہوں جن پر فرشتوں کو اطلاع نہیں، اور نہ انہوں نے وہ چیزیں تمہارے نامہ اعمال میں لکھی ہیں، اور اب وہ سب تمہیں بتلاتا ہوں، اور ان پر محاسبہ کرتا ہوں، پھر جس کو چاہوں گا بخش دوں گا، اور جس کو چاہوں گا عذاب دوں گا، پھر مومنین کو معاف کر دیا جائے گا اور کفار کو عذاب دیا جائے گا۔ (قرطبی)

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:-

إِنَّ اللَّهَ تَجَاوَزَ عَنْ أُمَّتِي عَمَّا حَدَّثَتْ أَنْفُسَهَا مَا لَمْ يَتَكَلَّمُوا أَوْ يَعْمَلُوا بِهِ۔ (قرطبی)

”اللہ تعالیٰ نے میری امت کو معاف کر دیا ہے وہ جو اُن کے دل میں خیال آیا، جب تک اس کو زبان سے نہ کہا، یا عمل نہ کیا ہو۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دل کے ارادہ پر کوئی عذاب و عتاب نہیں ہے، امام قرطبی نے فرمایا کہ یہ حدیث احکام دُنیا سے متعلق ہے، طلاق، عتاق، بیع، ہبہ وغیرہ، محض دل میں ارادہ کر لینے سے منعقد نہیں ہو جاتے، جب تک اُن کو زبان سے یا عمل سے نہ کیا جائے، اور آیت میں جو کچھ مذکور ہے وہ احکام آخرت سے متعلق ہے، اس لئے کوئی تعارض نہیں۔ اور دوسرے حضرات علماء نے اس شبہ کا جواب یہ دیا ہے کہ جس حدیث میں دل کی چھپی ہوئی چیزوں کی معافی مذکور ہے اس سے مراد وہ وساوس اور غیر اختیاری خیالات ہیں جو انسان کے دل میں بغیر قصد اور ارادے کے آ جاتے ہیں، بلکہ اُن کے خلاف کا ارادہ کرنے پر بھی وہ آتے رہتے ہیں، ایسے غیر اختیاری خیالات اور وساوس کو اس امت کے لئے حق تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے، اور آیت مذکورہ میں جس محاسبہ کا ذکر ہے اس سے مراد وہ ارادے اور نیتیں ہیں جو انسان اپنے قصد اور اختیار سے اپنے دل میں جماتا ہے، اور اس کے عمل میں لانے کی کوشش بھی کرتا ہے، پھر اتفاق سے کچھ موانع پیش آ جانے کی بنا پر اُن پر عمل نہیں کر سکتا، قیامت کے دن ان کا محاسبہ ہوگا، پھر حق تعالیٰ جس کو چاہے اپنے فضل و کرم سے بخش دیں، جس کو چاہے عذاب دیں، جیسا کہ مذکورہ حدیث بخاری و مسلم میں گزر چکا ہے، اور چونکہ آیت مذکورہ کے ظاہری الفاظ میں دونوں قسم کے خیالات داخل ہیں خواہ اختیاری ہوں یا غیر اختیاری، اس لئے جب یہ آیت نازل

۱ صحیح البخاری، ابواب المظالم والقصاص، باب قول الله تعالى: الا لعنة الله... إلخ ج: ۱ ص: ۳۳۰ و صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب في سعة رحمة

الله تعالى... إلخ ج: ۲ ص: ۳۶۰

۲ تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۳ ص: ۳۲۲

۳ صحیح مسلم، کتاب الإيمان، باب بيان تجاوز الله تعالى... إلخ ج: ۱ ص: ۷۷، ۷۸

ہوئی تو صحابہ کرامؓ کو سخت فکر و غم لاحق ہو گیا، کہ اگر غیر اختیاری خیالات و وساوس پر بھی مواخذہ ہونے لگا تو کون نجات پائے گا، صحابہ کرامؓ نے اس فکر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، تو آپ نے سب کو یہ تلقین فرمائی کہ جو کچھ حکم ربانی نازل ہوا، اس کی تعمیل و اطاعت کا پختہ قصد کرو اور کہو: سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا یعنی ”ہم نے حکم سن لیا اور تعمیل کی“ صحابہ کرامؓ نے اس کے مطابق کیا اور اس پر یہ جملہ قرآن کا نازل ہوا: لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا یعنی ”اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی قدرت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔“

جس کا حاصل یہ ہے کہ غیر اختیاری وساوس اور خیالات پر مواخذہ نہیں ہوگا، اس پر صحابہ کرامؓ کا اطمینان ہو گیا، یہ حدیث صحیح مسلم میں بروایت ابن عباسؓ نقل کی گئی ہے (قرطبی)، یہ پوری آیت آگے آرہی ہے۔

اور تفسیر مظہری میں ہے کہ انسان پر جو اعمال اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کئے گئے ہیں، یا حرام کئے گئے ہیں وہ کچھ تو ظاہری اعضاء و جوارح سے متعلق ہیں، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور تمام معاملات اسی قسم میں داخل ہیں، اور کچھ اعمال و احکام وہ بھی ہیں جو انسان کے قلب اور باطن سے تعلق رکھتے ہیں، ایمان و اعتقاد کے تمام مسائل تو اسی میں داخل ہیں، اور کفر و شرک جو سب سے زیادہ حرام و ناجائز ہیں، ان کا تعلق بھی انسان کے قلب سے ہی ہے، اخلاق صالحہ، تواضع، صبر، قناعت، سخاوت وغیرہ، اسی طرح اخلاق رذیلہ، کبر، حسد، بغض، حب دُنیا، حرص وغیرہ یہ سب چیزیں ایک درجہ میں حرام قطعی ہیں، ان سب کا تعلق بھی انسان کے اعضاء و جوارح سے نہیں بلکہ دل سے اور باطن سے ہے۔

اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے کہ جس طرح اعمال ظاہرہ کا حساب قیامت میں لیا جائے گا، اسی طرح اعمال باطنہ کا بھی حساب ہوگا، اور خطا پر بھی مواخذہ ہوگا۔ یہ آیت سورہ بقرہ کے اخیر میں لائی گئی، اس میں بڑی حکمت ہے، کیونکہ سورہ بقرہ قرآن کریم کی ایسی بڑی اور مہم سورہ ہے جس میں احکام الہیہ کا بہت بڑا حصہ آگیا ہے، اس سورہ میں اصولی اور فروعی معاش و معاد کے متعلق اہم ہدایات، نماز، زکوٰۃ، روزہ، قصاص، حج، جہاد، طہارت، طلاق، عدت، خلع، رضاعت، حرمت شراب، ربا اور قرض، لین دین کے جائز و ناجائز طریقوں کا تفصیلی بیان آگیا ہے، اسی لئے حدیث میں اس سورت کا نام ”سنام القرآن“ بھی آیا ہے، یعنی قرآن کا سب سے بلند حصہ، اور ان تمام احکام کی تعمیل میں سب کی رُوحِ اخلاص ہے، یعنی کسی کام کو کرنا یا اس سے بچنا دونوں خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہوں، ان میں نام و نمود یا دوسری نفسانی اغراض شامل نہ ہوں، اور یہ ظاہر ہے کہ اخلاص کا تعلق انسان کے باطن اور قلب سے ہے، سب کی دُستی اسی پر موقوف ہے، اس لئے سورت کے آخر میں اس آیت کے ذریعہ انسان کو تنبیہ کر دی گئی کہ فرائض کی ادائیگی یا محرمات سے پرہیز کے

۱ تفسیر القرطبی تحت هذه الآية ج: ۳ ص: ۲۲۱

۲ تفسیر المظہری تحت هذه الآية ج: ۱ ص: ۴۳۹، ۴۴۰

معاملے میں مخلوق کے سامنے تو حیلہ جوئی کے ذریعہ بھی راہ فرار اختیار کی جاسکتی ہے، مگر حق تعالیٰ علیم وخبیر ہے، اس سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں، اس لئے جو کچھ کرے یہ سمجھ کر کرے کہ رقیب و حفیظ میرے سب ظاہری اور باطنی حالات کو لکھ رہا ہے، اور سب کا حساب قیامت کے روز دینا ہے، یہی وہ روح ہے جو قرآن کریم انسانوں میں پیدا کرتا ہے کہ ہر قانون کے اول یا آخر میں خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کا ایسا محافظان کے قلوب پر بٹھاتا ہے کہ وہ رات کی اندھیری میں اور خلوتوں میں بھی کسی حکم کی خلاف ورزی کرتا ہوا ڈرتا ہے۔

أَمِنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ ۖ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ

مان لیا رسول نے جو کچھ اُترا اس پر اس کے رب کی طرف سے اور مسلمانوں نے بھی، سب نے مانا اللہ کو

وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ ۚ

اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو، کہتے ہیں کہ ہم جدا نہیں کرتے کسی کو اس کے پیغمبروں میں سے،

وَقَالُوا سُبْحٰنَآ وَ اَطَعٰنَا ۚ غُفْرٰنَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝۲۸۵

اور کہہ اُٹھے کہ ہم نے سنا اور قبول کیا، تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب! اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا كَسَبَتْ ۚ

اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے، اسی کو ملتا ہے جو اس نے کمایا اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کیا،

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا

اے ہمارے رب! نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھولیں یا چوکیں، اے رب ہمارے! اور نہ رکھ ہم پر بوجھ بھاری

كَمَا حَمَلْتَهُ عَلٰی الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحِثْ عَلَيْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ۚ

جیسا رکھا تھا ہم سے اگلے لوگوں پر، اے رب ہمارے! اور نہ اٹھوا ہم سے وہ بوجھ کہ جس کی ہم کو طاقت نہیں،

وَاَعْفُ عَنَّا ^{وقفہ} وَاغْفِرْ لَنَا ^{وقفہ} وَاَرْحَمْنَا ^{وقفہ} اَنْتَ مَوْلَانَا فَاَنْصُرْنَا

اور درگزر کر ہم سے، اور بخش ہم کو، اور رحم کر ہم پر، تو ہی ہمارا رب ہے مدد کر ہماری

عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ^ع (۲۸۶)

کافروں پر۔

آسان ترجمہ قرآن

یہ رسول (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس چیز پر ایمان لائے ہیں جو ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے، اور (ان کے ساتھ) تمام مسلمان بھی۔ یہ سب اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔ (وہ کہتے ہیں کہ) ہم اس کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے (کہ کسی پر ایمان لائیں، کسی پر نہ لائیں) اور وہ یہ کہتے ہیں کہ: ”ہم نے (اللہ اور رسول کے احکام کو توجہ سے) سن لیا ہے، اور ہم خوشی سے (ان کی) تعمیل کرتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہم آپ کی مغفرت کے طلب گار ہیں۔ اور آپ ہی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔“ (۲۸۵) اللہ کسی بھی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتا۔ اس کو فائدہ بھی اسی کام سے ہوگا جو وہ اپنے ارادے سے کرے، اور نقصان بھی اسی کام سے ہوگا جو اپنے ارادے سے کرے۔ (مسلمانو! اللہ سے یہ دُعا کیا کرو کہ:) ”اے ہمارے پروردگار! اگر ہم سے کوئی بھول چوک ہو جائے تو ہماری گرفت نہ فرمائیے۔ اور اے ہمارے پروردگار! ہم پر اس طرح کا بوجھ نہ ڈالئے جیسا آپ نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اور اے ہمارے پروردگار! ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالئے جسے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو۔ اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرمائیے، ہمیں بخش دیجئے، اور ہم پر رحم فرمائیے۔ آپ ہی ہمارے حامی و ناصر ہیں، اس لئے کافر لوگوں کے مقابلے میں ہمیں نصرت عطا فرمائیے۔“ (۲۸۶)

خلاصہ تفسیر

اعتقاد رکھتے ہیں رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اس چیز (کے حق ہونے) کا جو ان کے پاس اُن کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور (دوسرے) مومنین بھی (اس کا اعتقاد رکھتے ہیں، آگے قرآن پر اعتقاد رکھنے کی تفصیل ہے کہ کس کس چیز کے عقیدہ رکھنے کو قرآن پر اعتقاد رکھنا کہا جائے گا) سب کے سب (رسول بھی اور دوسرے

مؤمنین بھی) عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ (کہ وہ موجود ہے اور واحد ہے اور ذات و صفات میں کامل ہے) اور اس کے فرشتوں کے ساتھ (کہ وہ موجود ہیں اور گناہوں سے پاک ہیں اور مختلف کاموں پر مقرر ہیں) اور اس کی کتابوں کے ساتھ (کہ اصل میں سب سچی ہیں) اور اس کے سب پیغمبروں کے ساتھ (کہ وہ پیغمبر ہیں اور سچے ہیں اور پیغمبروں پر عقیدہ رکھنا اُن کا اس طور پر ہے کہ یہ کہتے ہیں) کہ ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں (عقیدہ رکھنے میں) تفریق نہیں کرتے (کہ کسی کو پیغمبر سمجھیں، کسی کو نہ سمجھیں) اور اُن سب نے یوں کہا کہ ہم نے (آپ کا ارشاد) سنا اور (اس کو) خوشی سے مانا، ہم آپ سے بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! اور آپ ہی کی طرف (ہم سب کو) لوٹنا ہے، (یعنی ہم نے جو پہلی آیت میں کہا کہ نفوس کی پوشیدہ باتوں پر بھی محاسبہ ہوگا اس سے مراد اُمور غیر اختیاری نہیں بلکہ صرف اُمور اختیار یہ ہیں، کیونکہ) اللہ تعالیٰ کسی کو (احکام شرعیہ میں) مکلف نہیں بناتا (یعنی ان اُمور کو واجب یا حرام نہیں فرماتا) مگر اسی کا جو اس کی طاقت (اور اختیار) میں ہو اس کو ثواب بھی اسی کا ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی کا ہوگا جو ارادہ سے کرے (اور جو وسعت سے باہر ہے اس کا مکلف نہیں کیا گیا، اور جس کے ساتھ قصد اور ارادہ متعلق نہیں اس کا نہ ثواب ہے نہ عذاب، اور وساوس طاقت سے خارج ہیں تو اُن کے آنے کو حرام اور اُن کے نہ آنے دینے کو واجب نہیں کیا، اور نہ اُن پر عذاب رکھا)، اے ہمارے رب! ہم پر دار و گیر نہ فرمائیے اگر ہم بھول جاویں یا چوک جاویں، اے ہمارے رب! (ہماری یہ بھی درخواست ہے کہ) ہم پر کوئی سخت حکم نہ بھیجے جیسے ہم سے پہلے لوگوں پر آپ نے بھیجے تھے، اے ہمارے رب! اور (ہم یہ بھی درخواست کرتے ہیں کہ) ہم پر کوئی ایسا بار (تکلیف کا دُنیا یا آخرت میں) نہ ڈالے جس کی ہم کو سہار نہ ہو، اور درگزر کیجئے ہم سے، اور بخش دیجئے ہم کو، اور رحم کیجئے ہم پر، آپ ہمارے کارساز ہیں (اور کارساز طرف دار ہوتا ہے) سو آپ ہم کو کافر لوگوں پر غالب کیجئے۔

معارف و مسائل

ان دو آیتوں کے خاص فضائل

یہ سورہ بقرہ کی آخری دو آیتیں ہیں، احادیث صحیحہ معتبرہ میں ان دو آیتوں کے بڑے بڑے فضائل مذکور ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے رات کو یہ دو آیتیں پڑھ لیں تو یہ اس کے لئے کافی ہیں۔^[۱] اور ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دو آیتیں جنت کے خزان میں سے نازل فرمائی ہیں، جس کو تمام مخلوق کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے خود رحمن نے اپنے ہاتھ سے لکھ دیا تھا، جو

شخص ان کو عشاء کی نماز کے بعد پڑھ لے تو وہ اس کے لئے قیام اللیل یعنی تہجد کے قائم مقام ہو جاتی ہیں۔ اور مستدرک حاکم اور بیہقی کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے سورہ بقرہ کو ان دو آیتوں پر ختم فرمایا ہے جو مجھے اس خزانہ خاص سے عطا فرمائی ہیں جو عرش کے نیچے ہے، اس لئے تم خاص طور پر ان آیتوں کو سیکھو اور اپنی عورتوں اور بچوں کو سکھاؤ۔ اسی لئے حضرت فاروق اعظم اور علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ ہمارا خیال یہ ہے کہ کوئی آدمی جس کو کچھ بھی عقل ہو وہ سورہ بقرہ کی ان دونوں آیتوں کو پڑھے بغیر نہ سوئے گا۔ ان دونوں آیتوں کی معنوی خصوصیات تو بہت ہیں، لیکن ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ سورہ بقرہ میں اکثر احکام شرعیہ اجمالاً و تفصیلاً ذکر کر دیئے گئے ہیں، اعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت وغیرہ آخری دو آیتوں میں سے پہلی آیت میں اطاعت شعار مومنین کی مدح کی گئی ہے، جنہوں نے اللہ جل شانہ کے تمام احکام پر لبیک کہا، اور تعمیل کے لئے تیار ہو گئے۔ اور دوسری آیت میں ایک شبہ کا جواب دیا گیا جو ان دو آیتوں سے پہلی آیت میں صحابہ کرامؓ کو پیدا ہو گیا تھا، اور ساتھ ہی اپنے فضل و رحمت بے حساب کا ذکر فرمایا گیا، وہ یہ تھا کہ جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی: **وَإِنْ تُبْدُوا مَالَكُمْ أَوْ نَفْسَكُمْ أَوْ تُخْفُوا بِهَا سَبِيَكُمْ بِهِ اللَّهُ** جو کہ تمہارے دلوں میں ہے تم اس کو ظاہر کرو یا چھپاؤ، ہر حال میں اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب لیں گے، آیت کی اصل مراد تو یہ تھی کہ اپنے اختیار و ارادہ سے جو کوئی عمل اپنے دل میں کرو گے اس کا حساب ہوگا، غیر اختیاری و سوسہ اور بھول چوک اس میں داخل ہی نہ تھی، لیکن الفاظ قرآن بظاہر عام تھے، ان کے عموم سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسان کے دل میں غیر اختیاری طور پر کوئی خیال آجائے گا تو اس کا بھی حساب ہوگا، صحابہ کرامؓ یہ سن کر گھبرا اٹھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: یا رسول اللہ! اب تک تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہم جو کام اپنے ارادہ و اختیار سے کرتے ہیں، حساب اُن ہی اعمال کا ہوگا، غیر اختیاری خیالات جو دل میں آجاتے ہیں ان کا حساب نہ ہوگا، مگر اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر خیال پر جو دل میں آئے حساب ہوگا، اس میں تو عذاب سے نجات پانا سخت دشوار ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ آیت کی صحیح مراد معلوم تھی، مگر الفاظ کے عموم کے پیش نظر آپ نے اپنی طرف سے کچھ کہنا پسند نہ فرمایا بلکہ وحی کا انتظار کیا، اور صحابہ کرامؓ کو یہ تلقین فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم آئے خواہ آسان ہو یا دشوار، مومن کا کام یہ نہیں کہ اس کے ماننے میں ذرا بھی تاہل کرے، تم کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام سن کر یہ کہو: **سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ** (۲۸۵) یعنی ”اے ہمارے پروردگار! ہم نے آپ کا حکم سنا اور اس کی اطاعت کی، اے ہمارے پروردگار! اگر حکم کی تعمیل میں ہم سے کوئی کوتاہی یا فروگزاشت ہوئی ہو تو اس کو معاف فرمادے، کیونکہ ہمارا سب کا آپ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔“ صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق ایسا ہی کیا، اگرچہ اُن کے ذہن میں یہ خیال کھٹک رہا تھا کہ بے اختیار دل میں آنے والے خیالات اور وساوس

سے بچنا تو سخت دشوار ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ بقرہ کی آخری دو آیتیں نازل فرمائیں، جن میں سے پہلی آیت میں مسلمانوں کی مدح، اور دوسری میں اس آیت کی اصلی تفسیر بتلائی گئی جس میں صحابہ کرامؓ کو اشتباہ پیش آیا تھا، اب پہلی آیت کے الفاظ دیکھئے:-

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۝ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ ۝ لَا تَفَرَّقْ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ ۝ وَقَالُوا سُبْحٰنَا وَاطْعٰنَا ۝ غُفْرٰنَكَ رَبَّنَا ۝ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ (۲۸۵)

یعنی ایمان رکھتے ہیں رسول اس چیز پر جو اُن کے پاس نازل ہوئی اُن کے رب کی طرف سے، اس میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح فرمائی اور اس میں بجائے آپ کا نام مبارک لینے کے لفظ ”رسول“ فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تشریف کو واضح کر دیا۔ اس کے بعد فرمایا: **وَالْمُؤْمِنُوْنَ** یعنی جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی وحی پر ایمان و اعتقاد ہے، اسی طرح عام مؤمنین کا بھی اعتقاد ہے، اور جو طرزِ بیان اس جملہ میں اختیار فرمایا کہ پہلے پورا جملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان کے ذکر میں لایا گیا، اس کے بعد مؤمنین کے ایمان کا علیحدہ تذکرہ کیا گیا، اس میں اشارہ ہے کہ اگرچہ نفسِ ایمان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمان شریک ہیں، لیکن درجاتِ ایمان کے اعتبار سے ان دونوں میں بڑا فرق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم مشاہدہ اور سماع کی بنا پر ہے، اور دوسرے مسلمانوں کا علم ایمان بالغیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت کی بنا پر۔

اس کے بعد اُس ایمانِ مجمل کی تفصیل بتلائی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مؤمنین میں شریک تھا، کہ وہ ایمان تھا اللہ تعالیٰ کے موجود اور ایک ہونے پر اور تمام صفاتِ کاملہ کے ساتھ متصف ہونے پر، اور فرشتوں کے موجود ہونے پر، اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور سب رسولوں کے سچے ہونے پر۔

اس کے بعد اس کی وضاحت فرمائی کہ اس اُمت کے مؤمنین پچھلی اُمتوں کی طرح ایسا نہ کریں گے کہ اللہ کے رسولوں میں باہمی تفرقہ ڈالیں کہ بعض کو نبی مانیں اور بعض کو نہ مانیں، جیسے یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی مانا مگر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی نہ مانا، اس اُمت کی یہ مدح فرمائی کہ یہ اللہ کے کسی رسول کا انکار نہیں کرتے، اور پھر صحابہ کرامؓ کے اس جملے پر ان کی تعریف کی گئی جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے موافق زبان سے کہا تھا: **سُبْحٰنَا وَاطْعٰنَا ۝ غُفْرٰنَكَ رَبَّنَا ۝ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝** (۲۸۵)۔

اس کے بعد دوسری آیت میں ایک خاص انداز سے وہ شبہ دور کیا گیا جو پچھلی آیت کے بعض جملوں سے پیدا ہو سکتا تھا، کہ دل میں چھپے ہوئے خیالات پر حساب ہو تو عذاب سے کیسے بچیں گے، ارشاد فرمایا: **لَا يَكْفِيكَ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا** یعنی ”اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زائد کام کا حکم نہیں دیتے۔“ اس لئے غیر اختیاری طور پر جو خیالات

ووسو سے دل میں آجائیں، اور پھر ان پر کوئی عمل نہ ہو تو وہ سب اللہ تعالیٰ کے نزدیک معاف ہیں، حساب اور مواخذہ صرف ان افعال پر ہوگا جو اختیار اور ارادہ سے کئے جائیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ جس طرح انسان کے اعمال و افعال جو ہاتھ، سر، آنکھ اور زبان وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں، جن کو اعمال ظاہرہ کہا جاتا ہے، ان کی دو قسمیں ہیں، ایک اختیاری جو ارادہ اور اختیار سے کئے جائیں، جیسے ارادہ سے بولنا، ارادہ سے کسی کو مارنا۔ دوسرے غیر اختیاری، جو بلا ارادہ سرزد ہو جائیں، جیسے زبان سے کہنا چاہتا تھا کچھ، اور نکل گیا کچھ، یا عرشہ سے بلا اختیار ہاتھ کی حرکت ہوئی، اس سے کسی کو تکلیف پہنچ گئی۔ ان میں سب کو معلوم ہے کہ حساب و کتاب اور جزا و سزا افعال اختیار یہ کے ساتھ مخصوص ہیں، افعال غیر اختیار یہ کا نہ انسان مکلف ہے نہ ان پر اس کو ثواب یا عذاب ہوتا ہے۔

اسی طرح وہ افعال جن کا تعلق باطن یعنی دل کے ساتھ ہے، ان کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک اختیاری جیسے کفر و شرک کا عقیدہ جس کو قصد و اختیار کے ساتھ دل میں جمایا ہے، یا سوچ سمجھ کر ارادہ کے ساتھ اپنے آپ کو بڑا سمجھنا جس کو ”تکبر“ کہا جاتا ہے، یا پختہ ارادہ کرنا کہ شراب پیوں گا۔ اور دوسرے غیر اختیاری، مثلاً بغیر قصد و ارادہ کے دل میں کسی برے خیال کا آجانا، ان میں بھی حساب و کتاب اور مواخذہ صرف اختیاری افعال پر ہے، غیر اختیاری پر نہیں۔

اس تفسیر جو خود قرآن نے بیان کر دی صحابہ کرام کو اطمینان ہو گیا کہ غیر اختیاری وساوس و خیالات کا حساب و کتاب اور ان پر عذاب و ثواب نہ ہوگا، اسی مضمون کو آخر میں اور زیادہ واضح کرنے کے لئے فرمایا ہے: **لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ** یعنی ”انسان کو ثواب بھی اس کام کا ہوتا ہے جو ارادے سے کرے، اور عذاب بھی اس کام پر ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے۔“

اور مراد یہ ہے کہ ابتداءً بلا واسطہ اس عمل کا ثواب یا عذاب ہوگا جو قصد و ارادہ سے کرے، کسی ایسے عمل کا ثواب و عذاب بالواسطہ ہو جانا جس کا اس نے ارادہ نہیں کیا اس کے منافی نہیں، اس سے اس شبہ کا جواب ہو گیا کہ بعض اوقات آدمی کو بلا قصد و ارادہ بھی ثواب یا عذاب ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن شریف کی دوسری آیات اور بہت سی روایات حدیث سے ثابت ہے، کہ جو آدمی کوئی ایسا نیک کام کرے جس سے دوسرے لوگوں کو بھی اس نیکی کی توفیق ہو جائے، تو جب تک لوگ یہ نیک کام کرتے رہیں گے اس کا ثواب اس پہلے والے کو بھی ملتا رہے گا، اسی طرح اگر کسی شخص نے کوئی طریقہ گناہ کا جاری کیا تو آئندہ جتنے لوگ اس گناہ میں مبتلا ہوں گے اس کا وبال اس شخص کو بھی پہنچے گا جس نے اول یہ برا طریقہ جاری کیا تھا۔ اسی طرح روایات حدیث سے ثابت ہے کہ کوئی شخص اپنے عمل کا ثواب دوسرے آدمی کو دینا چاہے تو اس کو یہ ثواب پہنچتا ہے، ان سب صورتوں میں بغیر قصد و ارادہ کے انسان کو ثواب یا عذاب ہو رہا ہے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ ظاہر ہے کہ یہ ثواب و عذاب بلا واسطہ اس کو نہیں پہنچا، بلکہ دوسرے کے واسطے سے پہنچا ہے، اس کے علاوہ جو واسطہ بنا ہے اس میں اس کے اپنے عمل اور اختیار کو بھی دخل ضرور ہے، کیونکہ جس شخص نے کسی کا ایجاد کیا ہوا اچھا یا برا طریقہ اختیار کیا اس میں پہلے شخص کے عمل اختیار کا دخل ضرور ہے، اگرچہ اس نے اس خاص اثر کا ارادہ نہ کیا ہو، اس طرح کوئی کسی کو ایصالِ ثواب جہی کرتا ہے جب اس نے اس پر کوئی احسان کیا ہو، اس لحاظ سے یہ دوسرے کے عمل کا ثواب و عذاب بھی درحقیقت اپنے ہی عمل کا ثواب یا عذاب ہے۔

بالکل اخیر میں قرآن کریم نے مسلمانوں کو ایک خاص دعا کی تلقین فرمائی جس میں بھول چوک اور بلا واسطہ خطا کسی فعل کے سرزد ہونے کی معافی طلب کی گئی، فرمایا: رَبَّنَا لَا تُؤْخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا ” اے ہمارے پروردگار! بھول چوک اور خطا پر ہم سے مواخذہ نہ فرما۔“ پھر فرمایا: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ” یعنی ” اے ہمارے پروردگار! ہم پر بھاری اور سخت اعمال کا بوجھ نہ ڈالے جیسا کہ ہم سے پہلے لوگوں (بنی اسرائیل) پر ڈالا گیا ہے، اور ہم پر ایسے فرائض عائد نہ فرمائے جن کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔“

اس سے مراد وہ سخت اعمال ہیں جو بنی اسرائیل پر عائد تھے کہ کپڑا پانی سے پاک نہ ہو، بلکہ کاٹنا جلانا پڑے، اور قتل کے بغیر توبہ قبول نہ ہو، یا مراد یہ ہے کہ دنیا میں ہم پر عذاب نازل نہ کیا جائے جیسا کہ بنی اسرائیل کے اعمال بد پر کیا گیا، اور یہ سب دعائیں حق تعالیٰ نے قبول فرمانے کا اظہار بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کر دیا۔ سورہ بقرہ تمام ہوئی، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اَوَّلُهُ وَاٰخِرُهُ وَظَاهِرُهُ وَبَاطِنُهُ وَهُوَ الْمُسْتَعَانُ

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۲۵ / ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ



تفسیر معارف القرآن میں قرآن کریم کی سورتوں کی فہرست

نمبر شمار	نام سورہ	جلد نمبر	صفحہ نمبر
۲۹	سُورَةُ الْعَنْكَبُوتِ	۶	۸۵۶
۳۰	سُورَةُ الرُّومِ	۶	۹۰۹
۳۱	سُورَةُ الْقُلُوبِ	۷	۲۳
۳۲	سُورَةُ السَّجْدَةِ	۷	۶۷
۳۳	سُورَةُ الْأَحْزَابِ	۷	۹۱
۳۴	سُورَةُ سَبَأٍ	۷	۲۶۹
۳۵	سُورَةُ فَاطِرٍ	۷	۳۴۰
۳۶	سُورَةُ يُسُفٍ	۷	۳۹۱
۳۷	سُورَةُ الصَّفَاتِ	۷	۴۵۲
۳۸	سُورَةُ ص	۷	۵۳۹
۳۹	سُورَةُ الزُّمَرِ	۷	۵۹۳
۴۰	سُورَةُ الْمُؤْمِنِ	۷	۶۵۱
۴۱	سُورَةُ حَمِّ السَّجْدَةِ	۷	۷۰۸
۴۲	سُورَةُ الشُّورَى	۷	۷۶۱
۴۳	سُورَةُ الزُّحُفِ	۷	۸۱۵
۴۴	سُورَةُ الدُّحَانِ	۷	۸۶۵
۴۵	سُورَةُ الْجَاثِيَةِ	۷	۸۹۲
۴۶	سُورَةُ الْأَحْقَافِ	۷	۹۱۵
۴۷	سُورَةُ مُحَمَّدٍ	۸	۲۵
۴۸	سُورَةُ الْفَتْحِ	۸	۶۷
۴۹	سُورَةُ الْحُجُرَاتِ	۸	۱۲۳
۵۰	سُورَةُ قِيَامِ	۸	۱۶۵
۵۱	سُورَةُ الدَّارِ الْاٰثِرِ	۸	۱۹۶
۵۲	سُورَةُ الطُّوْرِ	۸	۲۲۳
۵۳	سُورَةُ النَّجْمِ	۸	۲۴۳
۵۴	سُورَةُ النَّازِعَاتِ	۸	۲۸۷
۵۵	سُورَةُ الرَّحْمٰنِ	۸	۳۰۹
۵۶	سُورَةُ الْوَاقِعَةِ	۸	۳۴۰

نمبر شمار	نام سورہ	جلد نمبر	صفحہ نمبر
۱	سُورَةُ الْفَاتِحَةِ	۱	۸۵
۲	سُورَةُ الْبَقَرَةِ	۱	۱۲۱
۳	سُورَةُ آلِ عِمْرَانَ	۲	۲۵
۴	سُورَةُ الْاَنْعَامِ	۲	۳۱۹
۵	سُورَةُ الْاَنْكَادِ	۳	۱۷
۶	سُورَةُ الْاَنْعَامِ	۳	۳۰۲
۷	سُورَةُ الْاَنْعَامِ	۳	۵۶۳
۸	سُورَةُ الْاَنْعَامِ	۴	۱۹۰
۹	سُورَةُ التَّوْبَةِ	۴	۳۳۲
۱۰	سُورَةُ الْيُونُسَ	۴	۵۵۰
۱۱	سُورَةُ هُودٍ	۴	۶۵۱
۱۲	سُورَةُ الْيُونُسَ	۵	۲۱
۱۳	سُورَةُ الرَّعْدِ	۵	۱۸۳
۱۴	سُورَةُ الْاِبْرٰهِيْمَ	۵	۲۴۲
۱۵	سُورَةُ الْحَجَرِ	۵	۳۱۰
۱۶	سُورَةُ النَّحْلِ	۵	۳۵۴
۱۷	سُورَةُ الْاَنْعَامِ	۵	۴۹۳
۱۸	سُورَةُ الْكَافِ	۵	۶۲۶
۱۹	سُورَةُ مَرْيَمَ	۶	۲۵
۲۰	سُورَةُ طه	۶	۸۳
۲۱	سُورَةُ الْاَنْعَامِ	۶	۲۰۴
۲۲	سُورَةُ الْحَجِّ	۶	۲۹۱
۲۳	سُورَةُ الْمُؤْمِنُونَ	۶	۳۶۸
۲۴	سُورَةُ التَّوْرِ	۶	۴۲۹
۲۵	سُورَةُ الْفُرْقَانِ	۶	۵۶۹
۲۶	سُورَةُ الشُّعَرَاءِ	۶	۶۳۸
۲۷	سُورَةُ النَّبْلِ	۶	۷۰۳
۲۸	سُورَةُ الْقَصَصِ	۶	۷۸۰

نمبر شمار	نام سوره	جلد نمبر	صفحہ نمبر
۸۶	سُورَةُ الطَّارِقِ	۸	۹۴۲
۸۷	سُورَةُ الْأَعْلَى	۸	۹۴۹
۸۸	سُورَةُ الْغَاشِيَةِ	۸	۹۶۱
۸۹	سُورَةُ الْفَجْرِ	۸	۹۶۹
۹۰	سُورَةُ الْبَكْرِ	۸	۹۸۶
۹۱	سُورَةُ الشَّمْسِ	۸	۹۹۵
۹۲	سُورَةُ النَّازِعَاتِ	۸	۱۰۰۲
۹۳	سُورَةُ الضُّحَى	۸	۱۰۱۰
۹۴	سُورَةُ الشُّرَحِ	۸	۱۰۱۷
۹۵	سُورَةُ التِّينِ	۸	۱۰۲۴
۹۶	سُورَةُ الْعَلَقِ	۸	۱۰۳۰
۹۷	سُورَةُ الْقَدَمِ	۸	۱۰۴۶
۹۸	سُورَةُ الْبَيِّنَةِ	۸	۱۰۵۳
۹۹	سُورَةُ الزَّلْزَلِ	۸	۱۰۶۱
۱۰۰	سُورَةُ الْحَدِيدِ	۸	۱۰۶۵
۱۰۱	سُورَةُ الْقَارِعَةِ	۸	۱۰۷۰
۱۰۲	سُورَةُ الشَّكَاكِ	۸	۱۰۷۳
۱۰۳	سُورَةُ الْعَصْرِ	۸	۱۰۷۸
۱۰۴	سُورَةُ الْهَمَزَةِ	۸	۱۰۸۳
۱۰۵	سُورَةُ الْفِيلِ	۸	۱۰۸۶
۱۰۶	سُورَةُ قُرَيْشٍ	۸	۱۰۹۴
۱۰۷	سُورَةُ الْبَاعُثِ	۸	۱۰۹۹
۱۰۸	سُورَةُ الْكَوْثَرِ	۸	۱۱۰۲
۱۰۹	سُورَةُ الْكَافِرُونَ	۸	۱۱۰۸
۱۱۰	سُورَةُ النَّصْرِ	۸	۱۱۱۴
۱۱۱	سُورَةُ النَّهَبِ	۸	۱۱۱۸
۱۱۲	سُورَةُ الْإِخْلَاصِ	۸	۱۱۲۴
۱۱۳	سُورَةُ الْفَاتِحِ	۸	۱۱۲۸
۱۱۴	سُورَةُ الْثَّانِي	۸	۱۱۳۶

نمبر شمار	نام سوره	جلد نمبر	صفحہ نمبر
۵۷	سُورَةُ الْحَدِيدِ	۸	۳۷۵
۵۸	سُورَةُ الْمُجَادَلَةِ	۸	۴۲۸
۵۹	سُورَةُ الْحَشْرِ	۸	۴۵۷
۶۰	سُورَةُ الْمُمتَحِنَةِ	۸	۵۰۸
۶۱	سُورَةُ الصَّفِّ	۸	۵۳۸
۶۲	سُورَةُ الْجُثَّةِ	۸	۵۵۳
۶۳	سُورَةُ الشُّفَعَاتِ	۸	۵۷۰
۶۴	سُورَةُ التَّغَايُنِ	۸	۵۸۹
۶۵	سُورَةُ الطَّلَاقِ	۸	۶۰۴
۶۶	سُورَةُ التَّحْرِيمِ	۸	۶۳۵
۶۷	سُورَةُ الْمُلْكِ	۸	۶۵۱
۶۸	سُورَةُ الْقَلَمِ	۸	۶۷۱
۶۹	سُورَةُ الْحَاقَّةِ	۸	۶۹۷
۷۰	سُورَةُ الْغَافِرِ	۸	۷۱۱
۷۱	سُورَةُ الْزُجْرِ	۸	۷۲۶
۷۲	سُورَةُ الْيُنُسِ	۸	۷۳۸
۷۳	سُورَةُ الْمُرْمِلِ	۸	۷۵۹
۷۴	سُورَةُ الْمَدَائِرِ	۸	۷۸۳
۷۵	سُورَةُ الْقَيْمَةِ	۸	۸۰۵
۷۶	سُورَةُ الدَّهْرِ	۸	۸۲۰
۷۷	سُورَةُ الْمُرْسَلَةِ	۸	۸۳۵
۷۸	سُورَةُ النَّبَاِ	۸	۸۴۷
۷۹	سُورَةُ النَّازِعَاتِ	۸	۸۶۲
۸۰	سُورَةُ عَبَسَ	۸	۸۷۵
۸۱	سُورَةُ التَّكْوِيْنِ	۸	۸۸۷
۸۲	سُورَةُ الْاِنْفِطَارِ	۸	۸۹۷
۸۳	سُورَةُ الْمُطَفِّفِيْنَ	۸	۹۰۳
۸۴	سُورَةُ الْاِنْشِقَاقِ	۸	۹۲۰
۸۵	سُورَةُ الْاَبْرُوْجِ	۸	۹۳۳

